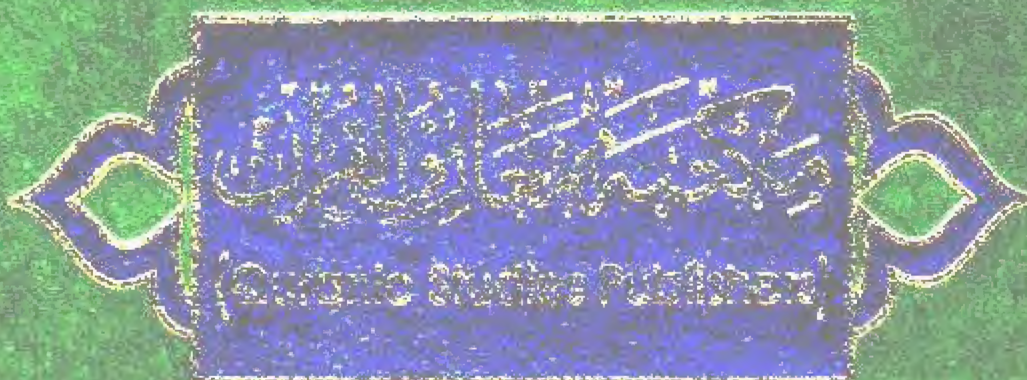
معارف القرآن

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ
مفتی اعظم پاکستان





معارف القرآن

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ
مفتی اعظم پاکستان

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴
(Quranic Studies Publishers)





نَحمَدُهُ وَنَستَعِينُهُ وَنَستَغفِرُهُ وَنُؤمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيهِ

وَنَعُوذُ بِاللهِ مِن شُرُورِ أَنفُسِنَا وَمِن سَيِّئَاتِ أَعمَالِنَا

مَن يَهدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَن يُضلِلهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ

وَنَشهَدُ أَن لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ

وَنَشهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَمَولَانَا مُحَمَّدًا عَبدُهُ وَرَسُولُهُ

صَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَيهِ وَعَلَى آلِهِ وَأَصحَابِهِ أَجمَعِينَ

تفسیر معارف القرآن میں قرآن کریم کی سورتوں کی فہرست

۱

معارف القرآن

جلد

۱

سورۃ الفاتحۃ و سورۃ البقرۃ

پارہ اوّل تا پارہ ۳ : رکوع ۸

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مفتی اعظم پاکستان

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴



[illegible]

باہتمام : محمد مشتاق سنی

طبع جدید : ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ - اپریل ۲۰۰۸ء

مطبع : شمس پرنٹنگ پریس کراچی

ناشر : ادارۃ المعارف کراچی ۱۴

فون : 5049733 - 5032020

ای میل : i_maarif@cyber.net.pk

ملنے کے پتے:

❋ ادارۃ المعارف کراچی ۱۴
فون: 5049733 - 5032020

❋ مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴
فون: 5031565 - 5031566

فہرست مضامین
مقدمہ تفسیر "معارف القرآن"

فہرست مضامین "معارف القرآن" جلد اوّل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مقدّمہ

علومِ قرآن اور علمِ تفسیر سے متعلق ضروری معلومات

از
محمّد تقی عثمانی
اُستاذِ حدیث دارالعلوم کراچی ۱۴
(فرزند حضرت مؤلف رحمۃ اللہ علیہ)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

پیش لفظ

والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کی تفسیر معارف القرآن کو اللہ تعالیٰ نے عوام و خواص میں غیر معمولی مقبولیت عطا فرمائی، اور جلد اوّل کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ ختم ہوگیا، دوسرے ایڈیشن کی طباعت کے وقت حضرت مصنف مدظلہم نے جلد اول پر مکمل طور سے نظر ثانی فرمائی، اور اس میں کافی ترمیم و اضافہ عمل میں آیا، اسی کے ساتھ حضرت موصوف مدظلہم کی خواہش تھی کہ دوسری اشاعت کے وقت جلد اوّل کے شروع میں علوم قرآن اور اصولِ تفسیر سے متعلق ایک مختصر مقدمہ بھی تحریر فرمائیں، تاکہ تفسیر کے مطالعہ سے پہلے قارئین ان ضروری معلومات سے مستفید ہو سکیں، لیکن متواتر امراض اور ضعف کی بنا پر موصوف کے لئے بذاتِ خود اس مقدمے کی تصنیف مشکل تھی، چنانچہ حضرت موصوف نے یہ ذمہ داری احقر کے سپرد فرمائی۔

احقر نے تعمیلِ حکم اور تحصیلِ سعادت کے لئے یہ کام شروع کیا تو یہ مقدمہ بہت طویل ہوگیا، اور علوم قرآن کے موضوع پر خاصی مفصل کتاب کی صورت بن گئی، اس پوری کتاب کو معارف القرآن کے شروع میں بطور مقدمہ شامل کرنا مشکل تھا، اس لئے حضرت والد صاحب مدظلہم کے ایماء پر احقر نے اس مفصل کتاب کی تلخیص کی، اور صرف وہ مباحث باقی رکھے جن کا مطالعہ تفسیر معارف القرآن کے مطالعہ کرنے والے کے لئے ضروری تھا، اور جو ایک عام قاری کے لئے دلچسپی کا باعث ہو سکتے تھے، یہ تلخیص معارف القرآن جلد اول کے زیر نظر ایڈیشن میں بطور مقدمہ شامل کی جارہی ہے، اللہ تعالیٰ اسے مسلمانوں کے لئے نافع اور مفید بنائے اور اس ناچیز کے لئے ذخیرۂ آخرت ثابت ہو۔

ان موضوعات پر مبسوط علمی مباحث احقر کی اُس مفصل کتاب میں مل سکیں گے جو انشاء اللہ عنقریب مستقل کتابی صورت میں شائع ہوگی[1] لہٰذا جو حضرات تحقیق اور تفصیل کے طالب ہوں وہ اُس کتاب کی طرف رجوع فرمائیں، وَمَا تَوۡفِیۡقِیۡٓ اِلَّا بِاللّٰہِ عَلَیۡہِ تَوَکَّلۡتُ وَاِلَیۡہِ اُنِیۡبُ ۔

احقر
محمد تقی عثمانی
۲۳ ربیع الاول ۱۳۹۴ھ

دار العلوم کورنگی
کراچی ۱۴

[1] الحمد للہ یہ کتاب "علوم القرآن" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ ناشر

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَ کَفٰی وَ سَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی،

وحی اور اُس کی حقیقت

قرآن کریم چونکہ سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعہ نازل کیا گیا ہے اس لئے سب سے پہلے وحی کے بارے میں چند ضروری باتیں سمجھ لینی چاہئیں۔

وحی کی ضرورت

ہر مسلمان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں آزمائش کے لئے بھیجا ہے، اور اس کے ذمّہ کچھ فرائض عائد کرکے پوری کائنات کو اس کی خدمت میں لگا دیا ہے، لہٰذا دنیا میں آنے کے بعد انسان کے لئے دو کام ناگزیر ہیں، ایک یہ کہ وہ اس کائنات سے اور اس میں پیدا کی ہوئی اشیاء سے ٹھیک ٹھیک کام لے، اور دوسرے یہ کہ اس کائنات کو استعمال کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے احکام کو مدِّ نظر رکھے، اور کوئی ایسی حرکت نہ کرے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو۔

ان دونوں کاموں کے لئے انسان کو "علم" کی ضرورت ہے، اس لئے کہ جب تک اُسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی کونسی چیز کے کیا خواص ہیں؟ ان سے کس طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے؟ اس وقت تک وہ دُنیا کی کوئی بھی چیز اپنے فائدے کے لئے استعمال نہیں کرسکتا، نیز جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کیا ہے؟ وہ کونسے کاموں کو پسند اور کن کو ناپسند فرماتا ہے؟ اس وقت تک اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گذارنا ممکن نہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تین چیزیں ایسی پیدا کی ہیں جن کے ذریعہ اسے مذکورہ باتوں کا علم حاصل ہوتا ہے، ایک انسان کے حواس، یعنی آنکھ، کان، مُنہ اور ہاتھ پاؤں، دوسرے عقل اور تیسرے وحی، چنانچہ انسان کو بہت سی باتیں اپنے حواس کے ذریعہ معلوم ہوجاتی ہیں، بہت سی عقل کے ذریعہ اور جو باتیں ان دونوں ذرائع سے معلوم نہیں ہوسکتیں اُن کا علم وحی کے ذریعے عطا کیا جاتا ہے۔

علم کے ان تینوں ذرائع میں ترتیب کچھ ایسی ہے کہ ہر ایک کی ایک خاص حد اور مخصوص دائرہ کار ہے، جس کے آگے وہ کام نہیں دیتا، چنانچہ جو چیزیں انسان کو اپنے حواس سے معلوم ہوجاتی ہیں اُن کا علم نری عقل سے نہیں ہوسکتا، مثلاً ایک دیوار کو آنکھ سے دیکھ کر آپ کو یہ علم ہوجاتا ہے کہ اس کا رنگ سفید ہے، لیکن اگر آپ اپنی آنکھوں کو بند کرکے صرف عقل کی مدد سے اس دیوار کا رنگ معلوم کرنا چاہیں تو یہ ناممکن ہے، اسی طرح جن چیزوں کا علم عقل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے وہ صرف حواس سے معلوم

نہیں ہو سکتیں، مثلاً آپ صرف آنکھوں سے دیکھ کر یا ہاتھوں سے چھو کر یہ پتہ نہیں لگا سکتے کہ اس دیوار کو کسی انسان نے بنایا ہے، بلکہ اس نتیجے تک پہنچنے کے لئے عقل کی ضرورت ہے۔

غرض جہاں تک حواسِ خمسہ کام دیتے ہیں وہاں تک عقل کوئی رہنمائی نہیں کرتی، اور جہاں حواسِ خمسہ جواب دیدیتے ہیں وہیں سے عقل کا کام شروع ہوتا ہے، لیکن اس عقل کی رہنمائی بھی غیر محدود نہیں ہے، یہ بھی ایک حد پر جاکر رُک جاتی ہے، اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا علم نہ حواس کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے اور نہ عقل کے ذریعہ، مثلاً اسی دیوار کے بارے میں یہ معلوم کرنا کہ اس کو کس طرح استعمال کرنے سے اللہ تعالیٰ راضی اور کس طرح استعمال کرنے سے ناراض ہوگا، یہ نہ حواس کے ذریعہ ممکن ہے نہ عقل کے ذریعہ، اس قسم کے سوالات کا جواب انسان کو دینے کے لئے جو ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے اسی کا نام وحی ہے، اور اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی کو منتخب فرما کر اسے اپنا پیغمبر قرار دیدیتا ہے اور اس پر اپنا کلام نازل فرماتا ہے، اسی کلام کو "وحی" کہا جاتا ہے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ وحی انسان کے لئے وہ اعلیٰ ترین ذریعہ علم ہے جو اسے اس کی زندگی سے متعلق اُن سوالات کا جواب مہیا کرتا ہے جو عقل اور حواس کے ذریعہ حل نہیں ہو سکتے، لیکن ان کا علم حاصل کرنا اس کے لئے ضروری ہے، اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ صرف عقل اور مشاہدہ انسان کی رہنمائی کے لئے کافی نہیں بلکہ اس کی ہدایت کے لئے وحیِ الٰہی ایک ناگزیر ضرورت ہے، اور چونکہ بنیادی طور پر وحی کی ضرورت پیش ہی اُس جگہ آتی ہے جہاں عقل کام نہیں دیتی، اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وحی کی ہر بات کا ادراک عقل سے ہو ہی جائے، بلکہ جس طرح کسی چیز کا رنگ معلوم کرنا عقل کا کام نہیں بلکہ حواس کا کام ہے، اسی طرح بہت سے دینی عقائد کا علم عطا کرنا بھی عقل کے بجائے وحی کا منصب ہے، اور ان کے ادراک کے لئے نری عقل پر بھروسہ کرنا درست نہیں۔

جو شخص (معاذ اللہ) خدا کے وجود ہی کا قائل نہ ہو اس سے تو وحی کے مسئلہ پر بات کرنا بالکل بے سود ہے، لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی قدرتِ کاملہ پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے وحی کی عقلی ضرورت، اس کے امکان اور حقیقی وجود کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں، اگر آپ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ یہ کائنات ایک قادرِ مطلق نے پیدا کی ہے، وہی اس کے مربوط اور مستحکم نظام کو اپنی حکمتِ بالغہ سے چلا رہا ہے، اور اسی نے انسان کو کسی خاص مقصد کے تحت یہاں بھیجا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد اُسے بالکل اندھیرے میں چھوڑ دیا ہو، اور اُسے یہ تک نہ بتایا ہو کہ وہ کیوں اس دنیا میں آیا ہے؟ یہاں اس کے ذمہ کیا فرائض ہیں؟ اس کی منزلِ مقصود کیا ہے؟ اور وہ کس طرح اپنے مقصدِ زندگی کو حاصل کر سکتا ہے؟ کیا کوئی شخص جس کے ہوش و حواس سلامت ہوں ایسا کر سکتا ہے کہ اپنے کسی نوکر کو ایک خاص مقصد کے تحت کسی سفر پر بھیجدے، اور اُسے نہ چلتے وقت سفر کا

مقصد بتایئے، اور نہ بعد میں کسی پیغام کے ذریعہ اُس پر یہ واضح کرے کہ اسے کس کام کے لئے بھیجا گیا ہے ؟ اور سفر کے دوران اس کی ڈیوٹی کیا ہوگی ؟ جب ایک معمولی عقل کا انسان بھی ایسی حرکت نہیں کرسکتا تو آخر اس خداوندِ قدّوس کے بارے میں یہ تصوّر کیسے کیا جاسکتا ہے جس کی حکمتِ بالغہ سے کائنات کا یہ سارا نظام چل رہا ہے ؟ یہ آخر کیسے ممکن ہو کہ جس ذات نے چاند، سورج، آسمان، زمین، ستاروں اور سیاروں کا ایسا محیّر العقول نظام پیدا کیا ہو وہ اپنے بندوں تک پیغام رسانی کا کوئی ایسا انتظام بھی نہ کرسکے جس کے ذریعہ انسانوں کو ان کے مقصدِ زندگی سے متعلق ہدایات دی جاسکیں ؟ اگر اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ پر ایمان ہو تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس نے اپنے بندوں کو اندھیرے میں نہیں چھوڑا، بلکہ ان کی رہنمائی کے لئے کوئی باقاعدہ نظام ضرور بنایا ہے، بس رہنمائی کے اسی باقاعدہ نظام کا نام وحی و رسالت ہے۔

اس سے صاف واضح ہوجاتا ہے کہ "وحی" محض ایک دینی اعتقاد ہی نہیں بلکہ ایک عقلی ضرورت ہے جس کا انکار درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کا انکار ہے۔

حضورؐ پر نزولِ وحی کے طریقے

وحی و رسالت کا یہ مقدّس سلسلہ سرکارِ دوعالم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوگیا، اب کسی انسان پر نہ وحی نازل ہوگی اور نہ اس کی ضرورت ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف طریقوں سے وحی نازل ہوتی تھی، صحیح بخاریؒ کی ایک حدیث میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت حارث بن ہشامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ پر وحی کس طرح آتی ہے ؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کبھی تو مجھے گھنٹی کی سی آواز سنائی دیتی ہے، اور وحی کی یہ صورت میرے لئے سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے، پھر جب یہ سلسلہ ختم ہوتا ہے تو جو کچھ اس آواز نے کہا ہوتا ہے، مجھے یاد ہوچکا ہوتا ہے، اور کبھی فرشتہ میرے سامنے ایک مرد کی صورت میں آجاتا ہے۔ (صحیح بخاریؒ ۱/۲)

اس حدیث میں آپؐ نے "وحی" کی آواز کو گھنٹیوں کی آواز سے جو تشبیہ دی ہے شیخ محی الدین ابن عربیؒ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ایک تو وحی کی آواز گھنٹی کی طرح مسلسل ہوتی ہے اور بیچ میں ٹوٹتی نہیں دوسرے گھنٹی جب مسلسل بجتی ہو تو عموماً سننے والے کو اس کی آواز کی سمت متعین کرنا مشکل ہوتا ہے، کیونکہ اس کی آواز ہر جہت سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اور کلامِ الٰہی کی بھی یہ خصوصیت ہو کہ اس کی کوئی ایک سمت نہیں ہوتی، بلکہ ہر جہت سے آواز سنائی دیتی ہے، اس کیفیت کا صحیح ادراک تو بغیر مشاہدہ کے ممکن نہیں، لیکن اس بات کو عام ذہنوں سے قریب کرنے کے لئے آپؐ نے اُسے گھنٹیوں کی آواز سے تشبیہ دے دی ہے (فیض الباری ۱/۱۹ و ۲۰)

جب اس طریقے سے آپؐ پر وحی نازل ہوتی تو آپؐ پر بہت زیادہ بوجھ پڑتا تھا، حضرت عائشہؓ اسی حدیث کے آخر میں فرماتی ہیں کہ میں نے سخت جاڑوں کے دن میں آپؐ پر وحی نازل ہوتے ہوئے

دیکھی ہے، ایسی سردی میں بھی جب وحی کا سلسلہ ختم ہوتا تو آپؐ کی مبارک پیشانی پسینہ سے شرابور ہو چکی ہوتی تھی، ایک اور روایت میں حضرت عائشہ رضؓ بیان فرماتی ہیں، کہ جب آپؐ پر وحی نازل ہوتی تو آپؐ کا سانس رُکنے لگتا، چہرۂ انور متغیر ہو کر کھجور کی شاخ کی طرح زرد پڑ جاتا، سامنے کے دانت سردی سے کپکپانے لگتے، اور آپؐ کو اتنا پسینہ آتا کہ اس کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے (الاتقان ۱/۴۶)

وحی کی اس کیفیت میں بعض اوقات اتنی شدت پیدا ہو جاتی کہ آپؐ جس جانور پر اُس وقت سوار ہوتے وہ آپؐ کے بوجھ سے دب کر بیٹھ جاتا، اور ایک مرتبہ آپؐ نے اپنا سرِ اقدس حضرت زیدؓ بن ثابت کے زانو پر رکھا ہوا تھا، کہ اسی حالت میں وحی نازل ہونی شروع ہو گئی، اس سے حضرت زیدؓ کی ران پر اتنا بوجھ پڑا کہ وہ ٹوٹنے لگی (زاد المعاد ۱/۱۸ و ۱۹)

بعض اوقات اس وحی کی ہلکی ہلکی آواز دوسروں کو بھی محسوس ہوتی تھی، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب آپؐ پر وحی نازل ہوتی تو آپؐ کے چہرۂ انور کے قریب شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آواز سُنائی دیتی تھی (تبویب مسند احمدؒ کتاب السیرۃ النبویۃ ۲۰/۲۱۲)

وحی کی دوسری صورت یہ تھی کہ فرشتہ کسی انسانی شکل میں آپؐ کے پاس آکر اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیتا تھا، ایسے مواقع پر عموماً حضرت جبرئیل علیہ السلام مشہور صحابی حضرت دحیہ کلبیؓ کی صورت میں تشریف لایا کرتے تھے، البتہ بعض اوقات کسی دوسری صورت میں بھی تشریف لائے ہیں، بہرکیف! جب حضرت جبرئیلؑ انسانی شکل میں وحی لے کر آتے تو نزولِ وحی کی یہ صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سب سے آسان ہوتی تھی (الاتقان ۱/۴۶)

وحی کی تیسری صورت یہ تھی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کسی انسان کی شکل اختیار کئے بغیر اپنی اصلی صورت میں دکھائی دیتے تھے، لیکن ایسا آپؐ کی تمام عمر میں صرف تین مرتبہ ہوا ہے، ایک مرتبہ اس وقت جب آپؐ نے خود حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصل شکل میں دیکھنے کی خواہش ظاہر فرمائی تھی، دوسری مرتبہ معراج میں اور تیسری بار نبوّت کے بالکل ابتدائی زمانے میں مکہ مکرّمہ کے مقام اجیاد پر، پہلے دو واقعات تو صحیح سند سے ثابت ہیں، البتہ یہ آخری واقعہ سنداً کمزور ہونے کی وجہ سے مشکوک ہے۔ (فتح الباری ۱/۱۸ و ۱۹)

چوتھی صورت براہِ راست اور بلا واسطہ اللہ تبارک و تعالیٰ سے ہمکلامی کی ہے، یہ شرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بیداری کی حالت میں صرف ایک بار، یعنی معراج کے وقت حاصل ہوا ہے، البتہ ایک مرتبہ خواب میں بھی آپؐ اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوئے ہیں (اتقان ۱/۴۶)

وحی کی پانچویں صورت یہ تھی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کسی بھی صورت میں سامنے آئے بغیر آپؐ کے قلبِ مبارک میں کوئی بات اِلقاء فرما دیتے تھے، اسے اصطلاح میں "نفث فی الروع" کہتے ہیں (ایضاً)

تاریخ نزولِ قرآن

قرآن کریم دراصل کلامِ الٰہی ہے، اس لئے ازل سے لوحِ محفوظ میں موجود ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (۸۵: ۲۱-۲۲) (بلکہ یہ قرآن مجید ہے، لوحِ محفوظ میں)[1] پھر لوحِ محفوظ سے اس کا نزول دو مرتبہ ہوا ہے، ایک مرتبہ یہ پورے کا پورا آسمانِ دنیا کے بیتِ عزّت میں نازل کر دیا گیا تھا، بیتِ عزّت (جسے البیت المعمور بھی کہتے ہیں) کعبۃ اللہ کے محاذات میں آسمان پر فرشتوں کی عبادت گاہ ہے، یہ نزول لیلۃ القدر میں ہوا تھا، پھر دوسری مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھوڑا تھوڑا کر کے حسبِ ضرورت نازل کیا جاتا رہا، یہاں تک کہ تیئیس سال میں اس کی تکمیل ہوئی، نزولِ قرآن کی یہ دو صورتیں خود قرآن کریم کے اندازِ بیان سے بھی واضح ہیں، اس کے علاوہ نسائیؒ، بیہقیؒ اور حاکمؒ وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں جن کا خلاصہ یہی ہے کہ قرآن کریم کا پہلا نزول یکبارگی آسمانِ دنیا پر ہوا اور دوسرا نزول بتدریج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر (اتقان ۱/۴۱)

قرآن کریم کو پہلی مرتبہ آسمانِ دنیا پر نازل کرنے کی حکمت امام ابوشامہؒ نے یہ بیان کی ہے کہ اس سے قرآن کریم کی رفعتِ شان کو ظاہر کرنا مقصود تھا، اور ملائکہ کو یہ بات بتانی تھی کہ یہ اللہ کی آخری کتاب ہے جو اہلِ زمین کی ہدایت کے لئے اُتاری جانے والی ہے۔

شیخ زرقانیؒ نے یہ نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ اس طرح دو مرتبہ اُتارنے سے یہ بھی جتانا مقصود تھا کہ یہ کتاب ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک کے علاوہ یہ دو جگہ اور بھی محفوظ ہے، ایک لوحِ محفوظ میں اور دوسرے بیتِ عزّت میں (مناہل العرفان ۱/۳۹) واللہ اعلم۔

اس پر تقریباً اتفاق ہے کہ قرآن کریم کا دوسرا تدریجی نزول جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر ہوا، اس کا آغاز اس وقت ہوا جب آپؐ کی عمر چالیس سال تھی، اس نزول کی ابتداء بھی صحیح قول کے مطابق لیلۃ القدر میں ہوئی ہے، اور یہی وہ تاریخ تھی جس میں چند سال بعد غزوۂ بدر پیش آیا، لیکن یہ رات رمضان کی کونسی تاریخ میں تھی؟ اس بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی، بعض روایات سے رمضان کی سترھویں، بعض سے اُنیسویں اور بعض سے ستائیسویں شب معلوم ہوتی ہے (تفسیر ابن جریرؒ ۱/۷)

سب سے پہلے نازل ہونیوالی آیت

صحیح قول یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم کی سب سے پہلی جو آیتیں اُتریں وہ سورۂ علق کی ابتدائی آیات ہیں، صحیح بخاریؒ میں حضرت عائشہؓ اس کا واقعہ یہ بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی کی ابتداء تو سچے خوابوں سے ہوئی تھی، اس کے بعد آپؐ کو خلوت میں عبادت کرنے کا شوق پیدا ہوا، اور اس دوران آپؐ غارِ حراء میں کئی کئی راتیں گذارتے، اور عبادت میں مشغول رہتے تھے، یہاں تک کہ ایک دن

---

[1] قارئین کے لئے یہ بات یقیناً سہولت اور خوشی کا باعث ہوگی کہ اس ایڈیشن میں وہ تمام آیاتِ قرآنیہ (جو حوالہ کے طور پر لکھی گئی ہیں) کا سورۃ نمبر اور آیت نمبر دیدیا گیا ہے۔ مثلاً زیرِ نظر سورۃ بروج نمبر شمار ۸۵ آیت نمبر ۲۱-۲۲ - ناشر

اسی غار میں آپؐ کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرشتہ آیا، اور اس نے سب سے پہلی بات یہ کہی کہ اِقْرَأْ (یعنی پڑھو) حضورؐ نے فرمایا کہ "میں پڑھا ہوا نہیں ہوں" اس کے بعد خود حضورؐ نے واقعہ بیان کیا کہ میرے اس جواب پر فرشتے نے مجھے پکڑا اور مجھے اس زور سے بھینچا کہ مجھ پر مشقت کی انتہا ہو گئی، پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا، اور دوبارہ کہا کہ اِقْرَأْ، میں نے جواب دیا کہ میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں" فرشتے نے مجھے پھر پکڑا اور دوبارہ اس زور سے بھینچا کہ مجھ پر مشقت کی انتہا ہو گئی، پھر اس نے مجھے چھوڑ کر کہا کہ اِقْرَأْ، میں نے جواب دیا کہ "میں پڑھا ہوا نہیں ہوں" اس پر اس نے مجھے تیسری مرتبہ پکڑا اور بھینچ کر چھوڑ دیا، پھر کہا:-

"اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الخ، (۹۶: ۱-۵)

"پڑھو اپنے اس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو منجمد خون سے پیدا کیا، پڑھو، اور تمہارا پروردگار سب سے زیادہ کریم ہے" الخ۔

یہ آپؐ پر نازل ہونے والی پہلی آیات تھیں، اس کے بعد تین سال تک وحی کا سلسلہ بند رہا، اسی زمانہ کو "فترتِ وحی" کا زمانہ کہتے ہیں، پھر تین سال کے بعد وہی فرشتہ جو غارِ حراء میں آیا تھا، آپؐ کو آسمان و زمین کے درمیان دکھائی دیا، اور اس نے سورۂ مدثر کی آیات آپؐ کو سنائیں، اس کے بعد وحی کا سلسلہ جاری ہو گیا۔

مکی اور مدنی آیات

آپ نے قرآن کریم کی سورتوں کے عنوان میں دیکھا ہوگا کہ کسی سورۃ کے ساتھ مکی اور کسی کے ساتھ مدنی لکھا ہوتا ہے، اس کا صحیح مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے مفسرین کی اصطلاح میں "مکی آیت" کا مطلب وہ آیت ہے جو آپؐ کے بغرضِ ہجرت مدینہ طیبہ پہنچنے سے پہلے پہلے نازل ہوئی، اور "مدنی آیت" کا مفہوم یہ ہے کہ وہ آپؐ کے مدینہ پہنچنے کے بعد نازل ہوئی، بعض لوگ مکی کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شہر مکہ میں نازل ہوئی، اور مدنی کا یہ کہ وہ شہر مدینہ میں اُتری لیکن یہ مطلب درست نہیں، اس لئے کہ کئی آیتیں ایسی ہیں جو شہر مکہ میں نازل نہیں ہوئیں لیکن چونکہ ہجرت سے پہلے نازل ہو چکی تھیں اس لئے انھیں مکی کہا جاتا ہے، چنانچہ جو آیات منیٰ، عرفات یا سفرِ معراج کے دوران نازل ہوئیں وہ بھی مکی کہلاتی ہیں، یہاں تک کہ جو آیتیں سفرِ ہجرت کے دوران مدینہ کے راستہ میں نازل ہوئیں ان کو بھی مکی کہا جاتا ہے، اسی طرح بہت سی آیات ایسی ہیں جو شہر مدینہ میں نازل نہیں ہوئیں، مگر وہ مدنی ہیں، چنانچہ ہجرت کے بعد آپؐ کو بہت سے سفر پیش آئے جن میں آپؐ مدینہ طیبہ سے سیکڑوں میل دور بھی تشریف لے گئے، ان تمام مقامات پر نازل ہونے والی آیتیں مدنی ہی کہلاتی ہیں، یہاں تک کہ اُن آیتوں کو بھی مدنی کہا جاتا ہے جو فتح مکہ یا غزوۂ حدیبیہ کے موقع پر خاص شہر مکہ یا اس کے مضافات میں نازل ہوئیں، چنانچہ آیتِ قرآنی اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا (۴: ۵۸) مدنی ہے، حالانکہ وہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی (البرہان ۱/۱۸۸ و مناہل العرفان ۱/۱۸۸)

پھر بعض سورتیں تو ایسی ہیں کہ وہ پوری کی پوری مکّی یا پوری کی پوری مدنی ہیں، مثلاً سورۂ مدّثر پوری مکّی ہے، اور سورۂ آلِ عمران پوری مدنی، لیکن بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا ہے کہ پوری سورت مکّی ہے، لیکن اس میں ایک یا چند آیات مدنی بھی آگئی ہیں، اور بعض مرتبہ اس کے برعکس بھی ہوا ہے، مثلاً سورۂ اعراف مکّی ہے، لیکن اس میں وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِىْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ سے لے کر وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِىْۤ اٰدَمَ الخ تک کی آیات مدنی ہیں (۷: ۱۶۳)، اسی طرح سورۂ حج مدنی ہے لیکن اس میں چار آیتیں یعنی وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِىٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى سے لیکر عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ تک مکّی ہیں۔ (۲۲: ۵۲-۵۵)

اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کسی سورت کا مکّی یا مدنی ہونا عموماً اس کی اکثر آیتوں کے اعتبار سے ہوتا ہے، اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ جس سورت کی ابتدائی آیات ہجرت سے پہلے نازل ہوگئیں اُسے مکّی قرار دیدیا گیا، اگرچہ بعد میں اس کی بعض آیتیں ہجرت کے بعد نازل ہوئیں ہوں۔ (مناہل العرفان ۱/۱۹۲)

مکّی و مدنی آیتوں کی خصوصیات

علماء تفسیر نے مکّی اور مدنی سورتوں کا استقراء کر کے انکی بعض ایسی خصوصیات بیان فرمائی ہیں جن سے پہلی نظر میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سورت مکّی ہے یا مدنی؟ ان میں سے بعض خصوصیات قاعدۂ کلیّہ کی حیثیت رکھتی ہیں، اور بعض اکثری ہیں، قواعدِ کلیّہ یہ ہیں:-

(۱) ہر وہ سورت جس میں لفظ كَلَّا (ہرگز نہیں) آیا ہے، وہ مکّی ہے، یہ لفظ پندرہ سورتوں میں ۳۳ مرتبہ استعمال ہوا ہے، اور یہ ساری آیتیں قرآن کریم کے آخری نصف حصّہ میں ہیں۔

(۲) ہر وہ سورت جس میں (حنفی مسلک کے مطابق) کوئی سجدے کی آیت آئی ہو، مکّی ہے۔

(۳) سورۂ بقرہ کے سوا ہر وہ سورت جس میں آدمؑ و ابلیس کا واقعہ مذکور ہے وہ مکّی ہے۔[۱]

(۴) ہر وہ سورت جس میں جہاد کی اجازت یا اس کے احکام مذکور ہیں، مدنی ہے۔

(۵) ہر وہ آیت جس میں منافقوں کا ذکر آیا ہے، مدنی ہے۔

اور مندرجۂ ذیل خصوصیات عمومی اور اکثری ہیں، یعنی کبھی کبھی ان کے خلاف بھی ہو جاتا ہے لیکن اکثر و بیشتر ایسا ہی ہوتا ہے۔

۱۔ مکّی سورتوں میں عموماً يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ (اے لوگو) کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے، اور مدنی سورتوں میں يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (اے ایمان والو) کے الفاظ سے۔

۲۔ مکّی آیتیں اور سورتیں عموماً چھوٹی چھوٹی اور مختصر ہیں اور مدنی آیات و سُوَر طویل اور مفصل ہیں۔

---

[۱] یہ قاعدہ اتقان وغیرہ سے ماخوذ ہے، اور یہ اس قول کے مطابق تو درست ہے جس کی رُو سے سورۂ حج مکّی ہے لیکن اگر اسے مدنی قرار دیا جائے جیسا کہ بعض صحابہؓ و تابعین سے مروی ہے تو سورۂ حج اس قاعدے سے مستثنیٰ ہوگی۔ محمد تقی عثمانی

۳۔ مکی سورتیں زیادہ تر توحید، رسالت اور آخرت کے اثبات، حشر و نشر کی منظر کشی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و تسلی کی تلقین اور پچھلی امتوں کے واقعات پر مشتمل ہیں، اور ان میں احکام و قوانین کم بیان ہوئے ہیں، اس کے برعکس مدنی سورتوں میں خاندانی اور تمدنی قوانین، جہاد و قتال کے احکام اور حدود و فرائض بیان کئے گئے ہیں۔

۴۔ مکی سورتوں میں زیادہ تر مقابلہ بت پرستوں سے ہے اور مدنی سورتوں میں اہل کتاب اور منافقین سے۔

۵۔ مکی سورتوں کا اسلوبِ بیان زیادہ پرشکوہ ہے، اس میں استعارات و تشبیہات اور تمثیلیں زیادہ ہیں، اور ذخیرۂ الفاظ بہت وسیع ہے، اس کے برخلاف مدنی سورتوں کا انداز نسبۃً سادہ ہے۔

مکی اور مدنی سورتوں کے انداز و اسلوب میں یہ فرق دراصل حالات، ماحول اور مخاطبوں کے اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، مکی زندگی میں مسلمانوں کا واسطہ چونکہ زیادہ تر عرب کے بت پرستوں سے تھا، اور کوئی اسلامی ریاست وجود میں نہیں آئی تھی، اس لئے اس دور میں زیادہ زور عقائد کی درستی، اخلاق کی اصلاح، بت پرستوں کی مدلل تردید اور قرآن کریم کی شانِ اعجاز کے اظہار پر دیا گیا، اس کے برخلاف مدینہ طیبہ میں ایک اسلامی ریاست وجود میں آچکی تھی، لوگ جوق در جوق اسلام کے سائے تلے آرہے تھے، علمی سطح پر بت پرستی کا ابطال ہو چکا تھا اور تمام تر نظریاتی مقابلہ اہلِ کتاب سے تھا، اس لئے یہاں احکام و قوانین اور حدود و فرائض کی تعلیم اور اہلِ کتاب کی تردید پر زیادہ توجہ دی گئی، اور اسی کے مناسب اسلوبِ بیان اختیار کیا گیا۔

قرآنِ کریم کا تدریجی نزول

پیچھے آچکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم دفعۃً اور یکبارگی نازل نہیں ہوا، بلکہ تھوڑا تھوڑا کرکے تقریباً تیئیس ۲۳ سال میں اُتارا گیا ہے، بعض اوقات جبرئیل علیہ السلام ایک چھوٹی سی آیت بلکہ آیت کا کوئی ایک جزء لے کر بھی تشریف لے آتے، اور بعض مرتبہ کئی کئی آیتیں بیک وقت نازل ہو جاتیں، قرآن کریم کا سب سے چھوٹا حصہ جو مستقلاً نازل ہوا وہ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ (نساء: ۹۵) ہے جو ایک طویل آیت کا ٹکڑا ہے دوسری طرف پوری سورۃ انعام ایک ہی مرتبہ نازل ہوئی ہے (ابن کثیر ۲/۱۲۲)

قرآن کریم کو یکبارگی نازل کرنے کے بجائے تھوڑا تھوڑا کرکے کیوں نازل کیا گیا؟ یہ سوال خود مشرکین عرب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا، باری تعالیٰ نے اس سوال کا جواب خود ان الفاظ میں دیا ہے:-

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً ۚ كَذَٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ ۖ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا ۝ وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا

جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ۝ (الفرقان: ۳۲ و ۳۳)

"اور کافروں نے کہا کہ آپ پر قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ اسی طرح (ہم نے قرآن کو تدریجاً اتارا ہے) تاکہ ہم آپؐ کے دل کو مطمئن کردیں، اور ہم نے اس کو رفتہ رفتہ پڑھا ہے، اور وہ کوئی بات آپ کے پاس نہیں لائیں گے، مگر ہم آپؐ کے پاس حق لائیں گے، اور (اس کی) عمدہ تفسیر پیش کریں گے"

امام رازیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں قرآن کریم کے تدریجی نزول کی جو حکمتیں بیان فرمائیں ہیں یہاں ان کا خلاصہ سمجھ لینا کافی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:-

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے، لکھتے پڑھتے نہیں تھے، اس لئے اگر سارا قرآن ایک مرتبہ نازل ہوگیا ہوتا تو اس کا یاد رکھنا اور ضبط کرنا دشوار ہوتا، اس کے برخلاف حضرت موسیٰ علیہ السلام لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اس لئے اُن پر تورات ایک ہی مرتبہ نازل کردی گئی۔

(۲) اگر پورا قرآن ایک دفعہ نازل ہوجاتا تو تمام احکام کی پابندی فوراً لازم ہوجاتی، اور یہ اُس حکیمانہ تدریج کے خلاف ہوتا جو شریعتِ محمدیؐ میں ملحوظ رہی ہے۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کی طرف سے ہر روز نئی اذیتیں برداشت کرنی پڑتی تھیں، جبرئیل علیہ السلام کا بار بار قرآن کریم لے کر آنا ان اذیتوں کے مقابلے کو آسان بنا دیتا تھا، اور آپؐ کی تقویتِ قلب کا سبب بنتا تھا۔

(۴) قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ لوگوں کے سوالات کے جواب اور مختلف واقعات سے متعلق ہے اس لئے ان آیتوں کا نزول اسی وقت مناسب تھا جس وقت وہ سوالات کئے گئے، یا وہ واقعات پیش آئے، اس سے مسلمانوں کی بصیرت بھی بڑھتی تھی، اور قرآن کریم کی غیبی خبریں بیان کرنے سے اس کی حقانیت اور زیادہ آشکار ہوجاتی تھی (تفسیر کبیر ۶/۳۳۶)

شانِ نزول

قرآن کریم کی آیتیں دو قسم کی ہیں، ایک تو وہ آیتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے از خود نازل فرمائیں، کوئی خاص واقعہ یا کسی کا کوئی سوال وغیرہ اُن کے نزول کا سبب نہیں بنا، دوسری آیات ایسی ہیں کہ جن کا نزول کسی خاص واقعہ کی وجہ سے یا کسی سوال کے جواب میں ہوا، جسے ان آیتوں کا پس منظر کہنا چاہئے، یہ پس منظر مفسرین کی اصطلاح میں "سببِ نزول" یا "شانِ نزول" کہلاتا ہے، مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۲۱ ہے:-

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ

"مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں، اور بلاشبہ ایک مؤمن کنیز ایک مشرکہ سے بہتر ہے خواہ مشرکہ تمہیں پسند ہو"

یہ آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی تھی، زمانۂ جاہلیت میں حضرت مرثد بن ابی مرثد غنوی رضؓ کے عناق نامی ایک عورت سے تعلقات تھے، اسلام لانے کے بعد یہ مدینہ طیبہ چلے آئے، اور وہ عورت مکہ مکرمہ میں رہ گئی، ایک مرتبہ حضرت مرثدؓ کسی کام سے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو عناق نے انھیں گناہ کی دعوت دی، حضرت مرثدؓ نے صاف انکار کرکے فرمایا کہ اسلام میرے اور تمھارے درمیان حائل ہوچکا ہے، لیکن اگر تم چاہو تو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت کے بعد تم سے نکاح کرسکتا ہوں، مدینہ طیبہ تشریف لاکر حضرت مرثدؓ نے آپؐ سے نکاح کی اجازت چاہی اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اور اس نے مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت کردی، (اسباب النزول للواحدیؒ، ص ۳۸)

یہ واقعہ مذکورہ بالا آیت کا "شانِ نزول" یا "سببِ نزول" ہے، قرآنِ کریم کی تفسیر میں "شانِ نزول" نہایت اہمیت کا حامل ہے، بہت سی آیتوں کا مفہوم اس وقت تک صحیح طور سے سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک اُن کا شانِ نزول معلوم نہ ہو۔

قرآنِ کریم کے سات حروف اور قراءتیں

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی تلاوت میں آسانی پیدا کرنے کے لئے امتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا السلام) کو ایک سہولت یہ عطا فرمائی ہے کہ اس کے الفاظ کو مختلف طریقوں سے پڑھنے کی اجازت دی ہے، کیونکہ بعض اوقات کسی شخص سے کوئی لفظ ایک طریقہ سے نہیں پڑھا جاتا تو اسے دوسرے طریقہ سے پڑھ سکتا ہے، صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ بنو غفار کے تالاب کے پاس تشریف فرما تھے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام آگئے، اور انھوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حکم دیا ہے کہ آپؐ اپنی امت کو حکم دیں کہ وہ قرآن کو ایک ہی حرف پر پڑھے، آپؐ نے فرمایا کہ میں اللہ سے اس کی معافی اور مغفرت طلب کرتا ہوں، میری اُمّت میں اس کی طاقت نہیں ہے، پھر جبرئیل علیہ السلام دوبارہ آپؐ کے پاس آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حکم دیا ہے کہ آپؐ کی امت قرآن کریم کو دو حرفوں پر پڑھے، آپؐ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت مانگتا ہوں میری امت میں اس کی بھی طاقت نہیں ہے، پھر وہ تیسری بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حکم دیا ہے کہ آپؐ کی اُمّت قرآن کریم کو تین حرفوں پر پڑھے، آپؐ نے پھر فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت چاہتا ہوں، میری اُمّت میں اس کی بھی طاقت نہیں ہے، پھر وہ چوتھی بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حکم دیا ہے کہ آپؐ کی اُمّت قرآن کو سات حروف پر پڑھے پس وہ ان میں سے جس حرف پر پڑھیں گے اُن کی قراءت درست ہوگی، (بحوالۂ مناہل العرفان ۱/۱۳۳)

سات حروف سے مراد سات نوعیتیں ہیں چنانچہ ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ اُنْزِلَ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ،

(صحیح بخاری مع القسطلانی ۷/۴۵۳)

"یہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے، پس ان میں سے جو تمھارے لئے آسان ہو اس طریقہ سے پڑھ لو"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں سات حروف سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں اہل علم کے مختلف اقوال ہیں[۱]، لیکن محقق علماء کے نزدیک اس میں راجح مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کی جو قراءتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں، اُن میں باہمی فرق و اختلاف کُل سات نوعیتوں پر مشتمل ہے، اور وہ سات نوعیتیں یہ ہیں:-

(۱) اسماء کا اختلاف: جس میں اِفراد، تثنیہ، جمع اور تذکیر و تانیث دونوں کا اختلاف داخل ہے، مثلاً ایک قراءت میں تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ ہے اور دوسری قراءت میں تَمَّتْ كَلِمٰتُ رَبِّكَ۔

(۲) افعال کا اختلاف: کہ کسی قراءت میں صیغۂ ماضی ہے، کسی میں مضارع اور کسی میں امر مثلاً ایک قراءت میں رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا ہے اور دوسری میں رَبَّنَا بَعَّدَ بَيْنَ اَسْفَارِنَا۔

(۳) وجوہِ اعراب کا اختلاف: جس میں اعراب یا زیر زبر پیش کا فرق پایا جاتا ہے، مثلاً لَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ کی جگہ لَا يُضَآرُّ كَاتِبٌ اور ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ کی جگہ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدِ۔

(۴) الفاظ کی کمی بیشی کا اختلاف: کہ ایک قراءت میں کوئی لفظ کم اور دوسری میں زیادہ ہو مثلاً ایک قراءت میں تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اور دوسری میں تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ۔

(۵) تقدیم و تاخیر کا اختلاف: کہ ایک قراءت میں کوئی لفظ مقدم ہے اور دوسری میں مؤخر ہے، مثلاً وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ اور وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْحَقِّ بِالْمَوْتِ۔

(۶) بدلیت کا اختلاف: کہ ایک قراءت میں ایک لفظ ہے اور دوسری قراءت میں اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ مثلاً نُنْشِزُهَا اور نَنْشُرُهَا، نیز فَتَبَيَّنُوْا اور فَتَثَبَّتُوْا، اور طَلْحٍ اور طَلْعٍ۔

(۷) لہجوں کا اختلاف: جس میں تفخیم، ترقیق، امالہ، مد، قصر، ہمز، اظہار اور ادغام وغیرہ کے اختلافات داخل ہیں، یعنی اس میں لفظ تو نہیں بدلتا، لیکن اس کے پڑھنے کا طریقہ بدل جاتا ہے، مثلاً مُوْسٰی کو ایک قراءت میں مُوْسیٰ کی طرح پڑھا جاتا ہے۔

بہر حال: اختلافِ قراءت کی ان سات نوعیتوں کے تحت بہت سی قراءتیں نازل ہوئی تھیں

---

[۱] ان اقوال کی تفصیل اور اس مسئلہ کی مبسوط تحقیق کے لئے ملاحظہ فرمائیے "علوم القرآن" احقر کی مفصل کتاب ۱۲

اور ان کے باہمی فرق سے معنی میں کوئی قابلِ ذکر فرق نہیں ہوتا تھا، صرف تلاوت کی سہولت کے لئے ان کی اجازت دی گئی تھی۔

شروع میں چونکہ لوگ قرآنِ کریم کے اسلوب کے پوری طرح عادی نہیں تھے، اس لئے اُن سات اقسام کے دائرے میں بہت سی قراءتوں کی اجازت دیدی گئی تھی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ ہر سال رمضان میں جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کریم کا دَور کیا کرتے تھے، جس سال آپؐ کی وفات ہوئی اس سال آپؐ نے دو مرتبہ دَور فرمایا، اس دَور کو "عرضۂ اخیرہ" کہتے ہیں، اس موقع پر بہت سی قراءتیں منسوخ کر دی گئیں، اور صرف وہ قراءتیں باقی رکھی گئیں جو آج تک تواتر کے ساتھ محفوظ چلی آتی ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تلاوتِ قرآن کے معاملہ میں غلط فہمیاں رفع کرنے کے لئے اپنے عہدِ خلافت میں قرآن کریم کے سات نسخے تیار کرائے، اور ان سات نسخوں میں تمام قراءتوں کو اس طرح سے جمع فرمایا، کہ قرآن کریم کی آیتوں پر نقطے اور زیر زبر پیش نہیں ڈالے، تاکہ انہی مذکورہ قراءتوں میں سے جس قراءت کے مطابق چاہیں پڑھ سکیں، اس طرح اکثر قراءتیں اس رسم الخط میں سما گئیں، اور جو قراءتیں رسم الخط میں نہ سما سکیں اُن کو محفوظ رکھنے کا طریقہ آپ نے یہ اختیار فرمایا کہ ایک نسخہ آپ نے ایک قراءت کے مطابق لکھا اور دوسرا دوسری قراءت کے مطابق، امت نے ان نسخوں میں جمع شدہ قراءتوں کو یاد رکھنے کا اس قدر اہتمام کیا کہ علم قراءت ایک مستقل علم بن گیا، اور سینکڑوں علماء، قرّاء اور حفّاظ نے اس کی حفاظت میں اپنی عمریں خرچ کر دیں۔

قراءت میں قبولیت کا معیار دراصل ہوا یہ تھا کہ جس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کے سات نسخے مختلف خطوں میں بھیجے تو ان کے ساتھ ایسے قاریوں کو بھی بھیجا تھا جو اُنکی تلاوت سکھا سکیں، چنانچہ یہ قاری حضرات جب مختلف علاقوں میں پہنچے تو انہوں نے اپنی اپنی قراءتوں کے مطابق لوگوں کو قرآن کی تعلیم دی، اور یہ مختلف قراءتیں لوگوں میں پھیل گئیں، اس موقع پر بعض حضرات نے ان مختلف قراءتوں کو یاد کرنے اور دوسروں کو سکھانے ہی کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں، اور اس طرح "علم قراءت" کی بنیاد پڑ گئی، اور ہر خطے کے لوگ اس علم میں کمال حاصل کرنے کے لئے ائمۂ قراءت سے رجوع کرنے لگے، کسی نے صرف ایک قراءت یاد کی، کسی نے دو، کسی نے تین، کسی نے سات اور کسی نے اس سے بھی زیادہ، اس سلسلے میں ایک اصولی ضابطہ پوری امت میں مسلّم تھا، اور ہر جگہ اسی کے مطابق عمل ہوتا تھا، اور وہ یہ کہ صرف وہ "قراءت" قرآن ہونے کی حیثیت سے قبول کی جائے گی جس میں تین ۳ شرائط پائی جاتی ہوں:-

(۱) مصاحفِ عثمانی کے رسم الخط میں اس کی گنجائش ہو۔

(۲) عربی زبان کے قواعد کے مطابق ہو۔ ۳

(۳) وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو، اور ائمۂ قراءت میں مشہور ہو۔

جس قراءت میں ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو اسے قرآن کا جزء نہیں سمجھا جا سکتا، اس طرح متواتر قراءتوں کی ایک بڑی تعداد نسلاً بعد نسلٍ نقل ہوتی رہی، اور سہولت کے لئے ایسا بھی ہوا کہ ایک امام نے ایک یا چند قراءتوں کو اختیار کر کے انہی کی تعلیم دینی شروع کر دی، اور وہ قراءت اُس امام کے نام سے مشہور ہو گئی، پھر علماء نے ان قراءتوں کو جمع کرنے کے لئے کتابیں لکھنا شروع کیں، چنانچہ سب سے پہلے امام ابو عبید قاسم بن سلامؒ، امام ابو حاتم سجستانیؒ، قاضی اسمٰعیلؒ اور امام ابو جعفر طبریؒ نے اس فن پر کتابیں مرتب کیں جن میں بیس سے زیادہ قراءتیں جمع تھیں، پھر علامہ ابو بکر ابن مجاہدؒ (متوفی ۳۲۴ھ) نے ایک کتاب لکھی جس میں صرف سات قاریوں کی قراءتیں جمع کی گئی تھیں، اُن کی یہ تصنیف اس قدر مقبول ہوئی کہ یہ سات قراء کی قراءتیں دوسرے قراء کے مقابلہ میں بہت زیادہ مشہور ہو گئیں، بلکہ بعض لوگ یہ سمجھنے لگے کہ صحیح اور متواتر قراءتیں صرف یہی ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ علامہ ابن مجاہدؒ نے محض اتفاقاً ان سات قراءتوں کو جمع کر دیا تھا، اُن کا منشاء یہ ہرگز نہیں تھا کہ ان کے سوا دوسری قراءتیں غلط یا ناقابلِ قبول ہیں، علامہ ابن مجاہدؒ کے اس عمل سے دوسری غلط فہمی یہ بھی پیدا ہوئی کہ بعض لوگ "سبعۃ احرف" کا مطلب یہ سمجھنے لگے کہ ان سے یہی سات قراءتیں مراد ہیں جنھیں ابن مجاہدؒ نے جمع کیا ہے، حالانکہ پیچھے بتایا جا چکا ہے کہ یہ سات قراءتیں صحیح قراءتوں کا محض ایک حصّہ ہیں، ورنہ ہر وہ قراءت جو مذکورہ بالا تین شرائط پر پوری اُترتی ہو، صحیح قابلِ قبول اور ان سات حروف میں داخل ہے جن پر قرآن کریم نازل ہوا۔

سات قرّاء بہرحال! علامہ ابن مجاہدؒ کے اس عمل سے جو سات قاری سب سے زیادہ مشہور ہوئے وہ یہ ہیں:-

(۱) نافع بن عبدالرحمٰن بن ابی نعیمؒ (متوفی ۱۶۹ھ) آپ نے ستّر ایسے تابعین سے استفادہ کیا تھا جو براہِ راست حضرت اُبی بن کعبؓ، عبداللہ بن عباسؓ اور ابوہریرہؓ رضی اللہ عنہم کے شاگرد تھے، آپ کی قراءت مدینہ طیبہ میں زیادہ مشہور ہوئی اور آپ کے راویوں میں ابو موسیٰ قالونؒ (متوفی ۲۲۰ھ) اور ابو سعید ورشؒ (متوفی ۱۹۷ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

(۲) عبداللہ بن کثیر الداریؒ (متوفی ۱۲۰ھ) آپ نے صحابہؓ میں سے حضرت انس بن مالکؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور ابو ایوب انصاریؓ کی زیارت کی تھی، اور آپ کی قراءت مکہ مکرمہ میں زیادہ مشہور ہوئی، اور آپ کی قراءت کے راویوں میں بزّیؒ اور قنبلؒ زیادہ مشہور ہیں۔

(۳) ابو عمرو زبّان بن العلاءؒ (متوفی ۱۵۴ھ) آپ نے حضرت مجاہدؒ اور سعید بن جبیرؒ کے

واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ اور اُبی بن کعبؓ سے روایت کی ہے، اور آپ کی قراءت بصرہ میں کافی مشہور ہوئی، آپ کی قراءت کے راویوں میں ابو عمر الدّوریؒ (متوفی ۲۴۶ھ) اور ابو شعیب سوسیؒ (متوفی ۲۶۱ھ) زیادہ مشہور ہیں،

(۴) عبداللہ الیحصبیؒ، جو ابن عامرؒ کے نام سے معروف ہیں (متوفی ۱۱۸ھ) آپ نے صحابہؓ میں سے حضرت نعمان بن بشیرؓ اور حضرت واثلہ بن اسقعؓ کی زیارت کی تھی، اور قراءت کا فن حضرت مغیرہ بن شہاب مخزومیؒ سے حاصل کیا تھا جو حضرت عثمانؓ کے شاگرد تھے، آپ کی قراءت کا زیادہ رواج شام میں رہا، اور آپ کی قراءت کے راویوں میں ہشامؒ اور ذکوانؒ زیادہ مشہور ہیں۔

(۵) حمزۃ بن حبیب الزیّات مولیٰ عکرمہ بن ربیع التیمیؒ (متوفی ۱۸۸ھ) آپ سلیمان اعمشؒ کے شاگرد ہیں، وہ یحییٰ بن وثابؒ کے، وہ زر بن حُبیشؒ کے اور انھوں نے حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ سے استفادہ کیا تھا، آپ کے راویوں میں خلف بن ہشام (متوفی ۱۸۸ھ) اور خلّاد بن خالدؒ (متوفی ۲۲۰ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

(۶) عاصم بن ابی النجود الاسدیؒ (متوفی ۱۲۷ھ) آپ زر بن حُبیشؒ کے واسطہ سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابو عبدالرحمٰن سُلمیؒ کے واسطہ سے حضرت علیؓ کے شاگرد ہیں، آپ کی قراءت کے راویوں میں شعبہ بن عیاشؒ (متوفی ۱۹۳ھ) اور حفص بن سلیمانؒ (متوفی ۱۸۰ھ) زیادہ مشہور ہیں آجکل عموماً تلاوت انہی حفص بن سلیمانؒ کی روایت کے مطابق ہوتی ہے۔

(۷) ابوالحسن علی بن حمزۃ الکسائی النحویؒ (متوفی ۱۸۹ھ) ان کے راویوں میں ابوالحارث مروزیؒ (متوفی ۲۴۰ھ) اور ابو عُمر الدّوریؒ (جو ابو عمروؒ کے راوی بھی ہیں) زیادہ مشہور ہیں، مؤخر الذکر تینوں حضرات کی قراءتیں زیادہ تر کوفہ میں رائج ہوئیں۔

دسؔ اور چودہؔ قراءتیں لیکن جیسا کہ پیچھے عرض کیا جاچکا ہے ان سات کے علاوہ اور بھی کئی قراءتیں متواتر اور صحیح ہیں، چنانچہ بعد میں جب یہ غلط فہمی پیدا ہونے لگی کہ صحیح قراءتیں ان سات ہی میں منحصر ہیں تو متعدد علماء (مثلاً علامہ شذائیؒ اور ابوبکر بن مہرانؒ) نے سات کے بجائے دس قراءتیں ایک کتاب میں جمع فرمائیں، چنانچہ "قراآت عشرہ" کی اصطلاح مشہور ہوگئی، ان دس قراءتوں میں مندرجہ بالا سات قرّاء کے علاوہ ان تین حضرات کی قراءتیں بھی شامل کی گئیں:-

(۱) ابوجعفر یزید بن القعقاعؒ (متوفی ۱۳۰ھ) جن کی قراءت مدینہ طیبہ میں زیادہ رائج ہوئی۔

(۲) یعقوب بن اسحٰق حضرمیؒ (متوفی ۲۰۵ھ) آپ کی قراءت زیادہ تر بصرہ میں مشہور ہوئی۔

(۳) خلف بن ہشامؒ (متوفی ۲۰۵ھ) جو حمزہؒ کی قراءت کے بھی راوی ہیں، آپ کی قراءت کوفہ میں زیادہ رائج تھی۔

اس کے علاوہ بعض حضرات نے چودہ[۱۴] قاریوں کی قراءتیں جمع کیں اور مذکورہ دس حضرات پر مندرجہ ذیل قرّاء کی قراءتوں کا اضافہ کیا:۔

(۱) حسن بصریؒ (متوفی ۱۱۰ھ) جن کی قراءت کا مرکز بصرہ تھا۔

(۲) محمد بن عبدالرحمٰن ابن محیصنؒ (متوفی ۱۲۳ھ) جن کا مرکز مکہ مکرمہ میں تھا۔

(۳) یحییٰ بن مبارک یزیدیؒ (متوفی ۲۰۲ھ) جو بصرہ کے باشندے تھے۔

(۴) ابوالفرج شنبوذیؒ (متوفی ۳۸۸ھ) جو بغداد کے باشندے تھے۔

بعض حضرات نے چودہ قاریوں میں حضرت شنبوذیؒ کے بجائے حضرت سلیمان اعمشؒ کا نام شمار کیا ہے، ان میں سے پہلی دس قراءتیں صحیح قول کے مطابق متواتر ہیں، اور ان کے علاوہ شاذ ہیں (مناہل العرفان بحوالہ منجد المقرئین لابن الجزریؒ)۔

تاریخ حفاظتِ قرآن

عہدِ رسالتؐ میں حفاظتِ قرآن

قرآن کریم چونکہ ایک ہی دفعہ پورا کا پورا نازل نہیں ہوا، بلکہ اس کی مختلف آیات ضرورت اور حالات کی مناسبت سے نازل کی جاتی رہی ہیں، اس لئے عہدِ رسالتؐ میں یہ ممکن نہیں تھا کہ شروع ہی سے اُسے کتابی شکل میں لکھ کر محفوظ کرلیا جائے چنانچہ ابتدائے اسلام میں قرآن کریم کی حفاظت کے لئے سب سے زیادہ زور حافظہ پر دیا گیا، شروع شروع میں جب وحی نازل ہوتی تو آپؐ اُس کے الفاظ کو اُسی وقت دُہرانے لگتے تھے، تاکہ وہ اچھی طرح یاد ہوجائیں، اس پر سورۂ قیامہ کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ہدایت فرمائی کہ قرآن کریم کو یاد رکھنے کے لئے آپؐ کو عین نزولِ وحی کے وقت جلدی جلدی الفاظ دُہرانے کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ خود آپؐ میں ایسا حافظہ پیدا فرمادے گا کہ ایک مرتبہ نزولِ وحی کے بعد آپؐ اُسے بھول نہیں سکیں گے، چنانچہ یہی ہوا کہ اِدھر آپؐ پر آیاتِ قرآنی نازل ہوتیں اور اُدھر وہ آپؐ کو یاد ہوجاتیں، اس طرح سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا سینۂ مبارک قرآن کریم کا سب سے زیادہ محفوظ گنجینہ تھا، جس میں کسی ادنیٰ غلطی یا ترمیم و تغیر کا امکان نہیں تھا، پھر آپؐ مزید احتیاط کے طور پر ہر سال رمضان کے مہینے میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کو قرآن سُنایا کرتے تھے، اور جس سال آپؐ کی وفات ہوئی اس سال آپؐ نے دو مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ دَور کیا۔ (صحیح بخاری مع فتح الباری، ص ۳۶ ج ۹)

پھر آپؐ صحابۂ کرامؓ کو قرآن کریم کے معانی کی تعلیم ہی نہیں دیتے تھے، بلکہ انھیں اس کے الفاظ بھی یاد کراتے تھے، اور خود صحابۂ کرامؓ کو قرآن کریم سیکھنے اور اسے یاد رکھنے کا اتنا شوق تھا کہ

ہر شخص اس معاملہ میں دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں رہتا تھا، بعض عورتوں نے اپنے شوہروں سے سوائے اس کے کوئی مہر طلب نہیں کیا کہ وہ انھیں قرآن کریم کی تعلیم دیں گے، سینکڑوں صحابہؓ نے اپنے آپ کو ہر غم ماسوا سے آزاد کر کے اپنی زندگی اسی کام کے لئے وقف کر دی تھی، وہ قرآن کریم کو نہ صرف یاد کرتے بلکہ راتوں کو نماز میں اسے دُہراتے رہتے تھے، حضرت عُبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص ہجرت کر کے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ آتا تو آپؐ اُسے ہم انصاریوں میں سے کسی کے حوالے فرما دیتے، تاکہ وہ اسے قرآن سکھائے، اور مسجدِ نبویؐ میں قرآن سیکھنے سکھانے والوں کی آوازوں کا اتنا شور ہونے لگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تاکید فرمانا پڑی کہ اپنی آوازیں پست کرو، تاکہ کوئی مغالطہ پیش نہ آئے (مناہل العرفان ۱/۲۳۴)

چنانچہ تھوڑی ہی مدت میں صحابۂ کرامؓ کی ایک ایسی بڑی جماعت تیار ہوگئی جسے قرآن کریم ازبر حفظ تھا، اس جماعت میں خلفائے راشدین کے علاوہ حضرت طلحہؓ، حضرت سعدؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت حذیفہ بن یمانؓ، حضرت سالمؓ مولیٰ ابی حذیفہؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عمرو بن عاصؓ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت عبداللہ بن السائبؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت اُمّ سلمہؓ وغیرہ بطور خاص قابلِ ذکر ہیں[1]۔

غرض ابتدائے اسلام میں زیادہ زور حفظِ قرآن پر دیا گیا، اور اس وقت کے حالات میں یہی طریقہ زیادہ محفوظ اور قابلِ اعتماد تھا، اس لئے کہ اس زمانے میں لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی، کتابوں کو شائع کرنے کے لئے پریس وغیرہ کے ذرائع موجود نہ تھے، اس لئے اگر صرف لکھنے پر اعتماد کیا جاتا تو نہ قرآن کریم کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہو سکتی، اور نہ اُس کی قابلِ اعتماد حفاظت، اس کے بجائے اللہ تعالیٰ نے اہلِ عرب کو حافظے کی ایسی قوت عطا فرما دی تھی کہ ایک ایک شخص ہزاروں اشعار کا حافظ ہوتا تھا، اور معمولی معمولی دیہاتیوں کو اپنے اور اپنے خاندان ہی کے نہیں اُن کے گھوڑوں تک کے نسب نامے یاد ہوتے تھے، اس لئے قرآن کریم کی حفاظت میں اسی قوتِ حافظہ سے کام لیا گیا، اور اسی کے ذریعہ قرآن کریم کی آیات اور سورتیں عرب کے گوشے گوشے میں پہنچ گئیں۔

کتابتِ وحی

قرآنِ کریم کو حفظ کرانے کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کو لکھوانے کا بھی خاص اہتمام فرمایا، حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ میں آپؐ کے لئے وحی کی کتابت کرتا تھا، جب آپؐ پر وحی نازل ہوتی تو آپؐ کو سخت گرمی لگتی، اور آپؐ کے جسمِ اطہر پر پسینہ

[1] مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "علوم القرآن" احقر کی مفصل کتاب۔

کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے، پھر جب آپؐ سے یہ کیفیت ختم ہو جاتی تو میں مونڈھے کی کوئی ہڈی یا (کسی اور چیز کا) ٹکڑا لے کر خدمت میں حاضر ہوتا، آپ لکھواتے رہتے، اور میں لکھتا جاتا، یہاں تک کہ جب میں لکھ کر فارغ ہوتا تو قرآن کو نقل کرنے کے بوجھ سے مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میری ٹانگ ٹوٹنے والی ہے، اور میں کبھی چل نہیں سکوں گا، بہرحال جب میں فارغ ہوتا تو آپؐ فرماتے "پڑھو" میں پڑھ کر سناتا، اگر اس میں کوئی فروگذاشت ہوتی تو آپؐ اس کی اصلاح فرما دیتے اور پھر اسے لوگوں کے سامنے لے آتے (مجمع الزوائد ۱/۱۵۶ بحوالہ طبرانی)

حضرت زید بن ثابتؓ کے علاوہ اور بھی بہت سے صحابہؓ کتابت وحی کے فرائض انجام دیتے تھے جن میں خلفائے راشدینؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زبیر بن عوامؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ، حضرت خالد بن الولیدؓ، حضرت ثابت بن قیسؓ، حضرت ابان بن سعیدؓ وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے فتح الباری ۹/۱۸ اور زاد المعاد ۱/۳۰)

حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب قرآن کریم کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپؐ کاتبِ وحی کو یہ ہدایت بھی فرما دیتے تھے کہ اسے فلاں سورت میں فلاں فلاں آیات کے بعد لکھا جائے (فتح الباری ۹/۱۸) اُس زمانے میں چونکہ عرب میں کاغذ کمیاب تھا، اس لئے یہ قرآنی آیات زیادہ تر پتھر کی سلوں، چمڑے کے پارچوں، کھجور کی شاخوں، بانس کے ٹکڑوں، درخت کے پتوں اور جانوروں کی ہڈیوں پر لکھی جاتی تھیں، البتہ کبھی کبھی کاغذ کے ٹکڑے بھی استعمال کئے گئے ہیں (ایضاً ۹/۱۱)

اس طرح عہد رسالتؐ میں قرآن کریم کا ایک نسخہ تو وہ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگرانی میں لکھوایا تھا، اگرچہ وہ مرتب کتاب کی شکل میں نہیں تھا، بلکہ متفرق پارچوں کی شکل میں تھا، اس کے ساتھ ہی بعض صحابۂ کرامؓ بھی اپنی یادداشت کے لئے آیاتِ قرآنی اپنے پاس لکھ لیتے تھے، اور یہ سلسلہ اسلام کے ابتدائی عہد سے جاری تھا، چنانچہ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے سے پہلے ہی اُن کی بہن اور بہنوئی کے ایک صحیفہ میں آیاتِ قرآنی لکھی ہوئی تھیں (سیرت ابن ہشام)

حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں جمعِ قرآن

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن کریم کے جتنے نسخے لکھے گئے تھے اُن کی کیفیت یہ تھی کہ یا تو وہ متفرق اشیاء پر لکھے ہوئے تھے کوئی آیت چمڑے پر، کوئی درخت کے پتے پر، کوئی ہڈی پر، یا وہ مکمل نسخے نہیں تھے، کسی صحابیؓ کے پاس ایک سورت لکھی ہوئی تھی، کسی کے پاس دس پانچ سورتیں اور کسی کے پاس صرف چند آیات، اور بعض صحابہؓ کے پاس آیات کے ساتھ تفسیری جملے بھی لکھے ہوئے تھے۔

اس بناء پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں یہ ضروری سمجھا کہ قرآن کریم

کہ ان منتشر حصّوں کو یک جا کرکے محفوظ کر دیا جائے، انھوں نے یہ کارنامہ جن محرکات کے تحت اور جس طرح انجام دیا اس کی تفصیل حضرت زید بن ثابتؓ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جنگِ یمامہ کے فوراً بعد حضرت ابوبکرؓ نے ایک روز مجھے پیغام بھیجکر بلوایا، میں ان کے پاس پہنچا تو وہاں حضرت عمرؓ بھی موجود تھے، حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ "عمرؓ نے ابھی آکر مجھ سے یہ بات کہی ہے کہ جنگِ یمامہ میں قرآن کریم کے حفّاظ کی ایک بڑی جماعت شہید ہو گئی، اور اگر مختلف مقامات پر قرآن کریم کے حافظ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں قرآن کریم کا ایک بڑا حصّہ ناپید نہ ہو جائے، لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ آپ اپنے حکم سے قرآن کریم کو جمع کروانے کا کام شروع کر دیں" میں نے عمرؓ سے کہا کہ جو کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ ہم کیسے کریں۔

عمرؓ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم! یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اس کے بعد عمرؓ مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے یہاں تک کہ مجھے بھی اس پر شرح صدر ہو گیا اور اب میری رائے بھی وہی ہے جو عمرؓ کی ہے، اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ "تم نوجوان اور سمجھدار آدمی ہو، ہمیں تمھارے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں ہے، تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کتابتِ وحی کا کام بھی کرتے رہے ہو لہٰذا تم قرآن کریم کی آیتوں کو تلاش کرکے انھیں جمع کرو"۔

حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم! اگر یہ حضرات مجھے کوئی پہاڑ ڈھونے کا حکم دیتے تو مجھ پر اس کا اتنا بوجھ نہ ہوتا جتنا جمعِ قرآن کے کام کا ہوا، میں نے اُن سے کہا کہ آپ وہ کام کیسے کر رہے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ خدا کی قسم! یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اس کے بعد حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ) مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ اسی رائے کے لئے کھول دیا، جو حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی رائے تھی، چنانچہ میں نے قرآنی آیات کو تلاش کرنا شروع کیا، اور کھجور کی شاخوں، پتھر کی تختیوں اور لوگوں کے سینوں سے قرآن کریم کو جمع کیا (صحیح بخاریؒ، کتاب فضائل القرآن)

جمع قرآن کے سلسلے میں حضرت زید بن ثابتؓ کا طریقِ کار

اس موقع پر جمعِ قرآن کے سلسلے میں حضرت زید بن ثابتؓ کے طریقِ کار کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے جیسا کہ پیچھے ذکر آچکا ہے، وہ خود حافظِ قرآن تھے، لہٰذا وہ اپنی یادداشت سے پورا قرآن لکھ سکتے تھے، اُن کے علاوہ بھی سینکڑوں حفّاظ اُس وقت موجود تھے، اُن کی ایک جماعت بنا کر بھی قرآن کریم لکھا جا سکتا تھا۔

نیز قرآن کریم کے جو نسخے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لکھ لئے گئے تھے حضرت زیدؓ ان سے بھی قرآنِ کریم نقل فرما سکتے تھے، لیکن انھوں نے احتیاط کے پیشِ نظر صرف کسی ایک طریقہ پر بس نہیں کیا، بلکہ ان تمام ذرائع سے بیک وقت کام لے کر اس وقت تک کوئی آیت اپنے صحیفوں میں

درج نہیں کی جب تک اس کے متواتر ہونے کی تحریری اور زبانی شہادتیں نہیں مل گئیں، اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی جو آیات اپنی نگرانی میں لکھوائی تھیں وہ مختلف صحابہؓ کے پاس محفوظ تھیں، حضرت زیدؓ نے انھیں یک جا فرمایا تاکہ نیا نسخہ ان سے ہی نقل کیا جائے، چنانچہ یہ اعلانِ عام کر دیا گیا کہ جس شخص کے پاس قرآن کریم کی جتنی آیات لکھی ہوئی موجود ہوں وہ حضرت زیدؓ کے پاس لے آئے، اور جب کوئی شخص اُن کے پاس قرآن کریم کی کوئی لکھی ہوئی آیت لے کر آتا تو وہ مندرجہ ذیل چار طریقوں سے اس کی تصدیق کرتے تھے:۔

(۱) سب سے پہلے اپنی یاد داشت سے اس کی توثیق کرتے۔

(۲) پھر حضرت عمرؓ بھی حافظِ قرآن تھے، اور روایات سے ثابت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اُن کو بھی اس کام میں حضرت زیدؓ کے ساتھ لگا دیا تھا اور جب کوئی شخص کوئی آیت لیکر آتا تھا تو حضرت زیدؓ اور حضرت عمرؓ دونوں مشترک طور پر اسے وصول کرتے تھے (فتح الباری ۱۱/۹ بحوالہ ابن ابی داؤد)۔

(۳) کوئی لکھی ہوئی آیت اُس وقت تک قبول نہیں کی جاتی تھی جب تک دو قابلِ اعتبار گواہوں نے اس بات کی گواہی نہ دیدی ہو کہ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی تھی۔ (اتقان ۶۰/۱)

(۴) اس کے بعد ان لکھی ہوئی آیتوں کا اُن مجموعوں کے ساتھ مقابلہ کیا جاتا تھا جو مختلف صحابہؓ نے تیار کر رکھے تھے (البرہان فی علوم القرآن للزرکشی ج ۱/ ۲۳۸)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جمع قرآن کا یہ طریق کار ذہن میں رہے تو حضرت زید بن ثابتؓ کے اس ارشاد کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ "سورۂ براءۃ کی آخری آیات لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ الخ مجھے صرف حضرت ابو خزیمہؓ کے پاس ملیں، ان کے سوا کسی اور کے پاس نہیں ملیں"۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ یہ آیتیں سوائے حضرت ابو خزیمہؓ کے کسی اور کو یاد نہیں تھیں، یا کسی اور کے پاس لکھی ہوئی نہ تھیں، اور اُن کے سوا کسی کو ان کا جزء قرآن ہونا معلوم نہ تھا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھوائی ہوئی متفرق آیتیں لے لے کر آرہے تھے اُن میں سے یہ آیتیں سوائے حضرت ابو خزیمہؓ کے کسی کے پاس نہیں ملیں، ورنہ جہاں تک ان آیات کے جزءِ قرآن ہونے کا تعلق ہے یہ بات تواتر کے ساتھ سب کو معلوم تھی، کیونکہ سینکڑوں صحابہؓ کو یاد بھی تھی، اور جن حضرات کے پاس آیاتِ قرآنی کے مکمل مجموعے تھے اُن کے پاس لکھی ہوئی بھی تھیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں الگ لکھی ہوئی صرف حضرت ابو خزیمہؓ کے پاس ملیں، کسی اور

کے پاس نہیں (البرہان ۱/ ۲۳۴ و ۲۳۵)

اُمّ کی خصوصیات

بہرکیف! حضرت زید بن ثابتؓ نے اس زبردست احتیاط کے ساتھ آیاتِ قرآنی کو جمع کر کے انہیں کاغذ کے صحیفوں پر مرتب شکل میں تحریر فرمایا (اتقان ۱/ ۶۰) لیکن ہر سورت علیحدہ صحیفے میں لکھی گئی، اس لئے یہ نسخہ بہت سے صحیفوں پر مشتمل تھا، اصطلاح میں اس نسخہ کو "اُمّ" کہا جاتا ہے، اور اس کی خصوصیات یہ تھیں:۔

(۱) اس نسخہ میں آیاتِ قرآنی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق مرتب تھیں، لیکن سورتیں مرتب نہیں تھیں، بلکہ ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی (اتقان، حوالۂ بالا)

(۲) اس نسخہ میں قرآن کے ساتوں حروف (جن کی تشریح پیچھے آچکی ہے) جمع تھے (مناہل العرفان ۱/ ۲۴۶، وتاریخ القرآن للکردیؒ، ص ۲۸)

(۳) اس میں وہ تمام آیتیں جمع کی گئی تھیں جن کی تلاوت منسوخ نہیں ہوئی تھی۔

(۴) اس نسخہ کو لکھوانے کا مقصد یہ تھا کہ ایک مرتب نسخہ تمام اُمّت کی اجماعی تصدیق کے ساتھ تیار ہو جائے، تاکہ ضرورت پڑنے پر اس کی طرف رجوع کیا جا سکے۔

حضرت ابوبکرؓ کے لکھوائے ہوئے یہ صحیفے آپ کی حیات میں آپ کے پاس رہے، پھر حضرت عمرؓ کے پاس رہے، حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد انھیں ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس منتقل کر دیا گیا، پھر حضرت حفصہؓ کی وفات کے بعد مروان بن الحکمؒ نے اسے اس خیال سے نذرِ آتش کر دیا کہ اس وقت حضرت عثمانؓ کے تیار کرائے ہوئے مصاحف تیار ہو چکے تھے، اور اس بات پر اُمّت کا اجماع منعقد ہو چکا تھا کہ رسم الخط اور سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے ان مصاحف کی پیروی لازم ہے، مروان بن الحکم نے سوچا کہ اب کوئی ایسا نسخہ باقی نہ رہنا چاہئے جو اس رسم الخط اور ترتیب کے خلاف ہو۔ (فتح الباری ۹/ ۱۶)

حضرت عثمانؓ کے عہد میں جمعِ قرآن

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو اسلام عرب سے نکل کر روم اور ایران کے دور دراز علاقوں تک پہنچ چکا تھا، ہر نئے علاقے کے لوگ جب مسلمان ہوتے تو وہ ان مجاہدینِ اسلام یا اُن تاجروں سے قرآن کریم سیکھتے جنکی بدولت انھیں اسلام کی نعمت حاصل ہوئی تھی، اُدھر آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا تھا، اور مختلف صحابۂ کرامؓ نے اُسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف قراءتوں کے مطابق سیکھا تھا، اس لئے ہر صحابی نے اپنے شاگردوں کو اسی قراءت کے مطابق قرآن پڑھایا، جس کے مطابق خود انھوں نے حضورؐ سے پڑھا تھا، اس طرح قراءتوں کا یہ اختلاف دور دراز ممالک تک پہنچ گیا، جب تک لوگ اس حقیقت سے واقف تھے کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، اُس وقت تک اس اختلاف سے کوئی خرابی

پیدا نہیں ہوئی، لیکن جب یہ اختلاف دور دراز ممالک میں پہنچا اور یہ بات اُن میں پوری طرح مشہور نہ ہوسکی کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، تو اس وقت لوگوں میں جھگڑے پیش آنے لگے بعض لوگ اپنی قراءت کو صحیح اور دوسرے کی قراءت کو غلط قرار دینے لگے، ان جھگڑوں سے ایک طرف تو یہ خطرہ تھا کہ لوگ قرآنِ کریم کی متواتر قراءتوں کو غلط قرار دینے کی سنگین غلطی میں مبتلا ہوں گے، دوسرے سوائے حضرت زیدؓ کے لکھے ہوئے ایک نسخہ کے جو مدینہ طیبہ میں موجود تھا، پورے عالم اسلام میں کوئی ایسا معیاری نسخہ موجود نہ تھا جو پوری امت کے لئے حجت بن سکے، کیونکہ دوسرے نسخے انفرادی طور پر لکھے ہوئے تھے، اور ان میں ساتوں حروف کو جمع کرنے کا کوئی اہتمام نہیں تھا، اس لئے ان جھگڑوں کے تصفیہ کی قابلِ اعتماد صورت یہی تھی کہ ایسے نسخے پورے عالم اسلام میں پھیلا دیئے جائیں، جن میں ساتوں حروف جمع ہوں اور انھیں دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ کونسی قراءت صحیح اور کونسی غلط ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یہی عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔

اس کارنامے کی تفصیل روایاتِ حدیث سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمانؓ آرمینیا اور آذربیجان کے محاذ پر جہاد میں مشغول تھے، وہاں انھوں نے دیکھا کہ لوگوں میں قرآن کریم کی قراءتوں کے بارے میں اختلاف ہو رہا ہے، چنانچہ مدینہ طیبہ واپس آتے ہی وہ سیدھے حضرت عثمانؓ کے پاس پہونچے، اور جاکر عرض کیا کہ امیر المؤمنین! قبل اس کے کہ یہ اُمت اللہ کی کتاب کے بارے میں یہود و نصاریٰ کی طرح اختلافات کی شکار ہو، آپ اس کا علاج کیجئے، حضرت عثمانؓ نے پوچھا بات کیا ہے؟ حضرت حذیفہ رضؓ نے جواب میں کہا کہ میں آرمینیا کے محاذ پر جہاد میں شامل تھا وہاں میں نے دیکھا کہ شام کے لوگ اُبَیّ بن کعبؓ کی قراءت پڑھتے ہیں، جو اہلِ عراق نے نہیں سُنی ہوتی، اور اہلِ عراق عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت پڑھتے ہیں جو اہلِ شام نے نہیں سنی ہوتی، اس کے نتیجہ میں ایک دوسرے کو کافر قرار دے رہے ہیں۔

حضرت عثمانؓ خود بھی اس خطرے کا احساس پہلے ہی کر چکے تھے، انھیں یہ اطلاع ملی تھی کہ خود مدینہ طیبہ میں ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ قرآن کریم کے ایک معلّم نے اپنے شاگردوں کو ایک قراءت کے مطابق قرآن پڑھایا، اور دوسرے معلّم نے دوسری قراءت کے مطابق، اس طرح مختلف اساتذہ کے شاگرد جب باہم ملتے تو ان میں اختلاف ہوتا، اور بعض مرتبہ یہ اختلاف اساتذہ تک پہنچ جاتا، اور وہ بھی ایک دوسرے کی قراءت کو غلط قرار دیتے، جب حضرت حذیفہ بن یمانؓ نے بھی اس خطرے کی طرف توجہ دلائی تو حضرت عثمانؓ نے جلیل القدر صحابہؓ کو جمع کرکے ان سے مشورہ کیا اور فرمایا کہ:- "مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ بعض لوگ ایک دوسرے سے اس قسم کی باتیں کہتے ہیں

کہ میری قراءت تمہاری قراءت سے بہتر ہے، اور یہ بات کفر کی حد تک پہونچ سکتی ہے، لہٰذا آپ لوگوں کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟ صحابہؓ نے خود حضرت عثمانؓ سے پوچھا کہ "آپ نے کیا سوچا ہے؟" حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ "میری رائے یہ ہے کہ ہم تمام لوگوں کو ایک مُصحف پر جمع کر دیں تاکہ کوئی اختلاف اور افتراق پیش نہ آئے"، صحابہؓ نے اس رائے کو پسند کرکے حضرت عثمانؓ کی تائید فرمائی۔

چنانچہ حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو جمع کرکے ایک خطبہ دیا، اور اس میں فرمایا کہ تم لوگ مدینہ طیبہ میں میرے قریب ہوتے ہوئے قرآن کریم کی قراءتوں کے بارے میں ایک دوسرے کی تکذیب اور ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہو، اس سے ظاہر ہے کہ جو لوگ مجھ سے دُور ہیں وہ تو اور بھی زیادہ تکذیب اور اختلاف کرتے ہوں گے، لہٰذا تمام لوگ مل کر قرآن کریم کا ایسا نسخہ تیار کریں جو سب کے لئے واجب الاقتداء ہو۔

اس غرض کے لئے حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ کے پاس (حضرت ابوبکرؓ کے تیار کرائے ہوئے) جو صحیفے موجود ہیں وہ ہمارے پاس بھیج دیجئے، ہم اُن کو مصاحف میں نقل کرکے آپ کو واپس کر دیں گے، حضرت حفصہؓ نے وہ صحیفے حضرت عثمانؓ کے پاس بھیج دیئے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چار صحابہؓ کی ایک جماعت بنائی، جو حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت سعید بن العاصؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشامؓ پر مشتمل تھی، اس جماعت کو اس کام پر مامور کیا گیا کہ وہ حضرت ابوبکرؓ کے صحیفوں سے نقل کرکے کئی ایسے مصاحف تیار کرے جن میں سورتیں بھی مرتب ہوں، ان چار صحابہؓ میں سے حضرت زیدؓ انصاری تھے، اور باقی تینوں حضرات قریشی، اس لئے حضرت عثمانؓ نے ان سے فرمایا کہ "جب تمہارا اور زیدؓ کا قرآن کے کسی حصہ میں اختلاف ہو (یعنی اس میں اختلاف ہو کہ کونسا لفظ کس طرح لکھا جائے؟) تو اسے قریش کی زبان کے مطابق لکھنا، اس لئے کہ قرآن کریم انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے"۔

بنیادی طور پر تو یہ کام مذکورہ چار حضرات ہی کے سپرد کیا گیا تھا، لیکن پھر دوسرے صحابہؓ کو بھی ان کی مدد کے لئے ساتھ لگا دیا گیا[۱] ان حضرات نے کتابتِ قرآن کے سلسلے میں مندرجہ ذیل کام انجام دیئے:۔

(۱) حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جو نسخہ تیار ہوا تھا اس میں سُورتیں مرتب نہیں تھیں، بلکہ ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی، ان حضرات نے تمام سورتوں کو ترتیب کے ساتھ ایک ہی مصحف میں لکھا (مستدرک ۲/۲۲۹)

(۲) قرآن کریم کی آیات اس طرح لکھیں کہ ان کے رسم الخط میں تمام متواتر قراءتیں

---

[۱] یہ پوری تفصیل اور اس سلسلے کی تمام روایات فتح الباری ص ۱۳ تا ۱۵ ج ۹ سے ماخوذ ہیں۔

سما جائیں، اسی لئے اُن پر نہ نقطے لگائے گئے اور نہ حرکات (زیر زبر پیش) تاکہ اسے تمام متواتر قراءتوں کے مطابق پڑھا جاسکے، مثلاً ننشرھا لکھا تاکہ اسے نَنْشُرُھَا اور نُنْشِزُھَا دونوں طرح پڑھا جاسکے کیونکہ یہ دونوں قراءتیں درست ہیں (مناھل العرفان ۱/۲۵۳ و ۲۵۴)

(۳) اب تک قرآن کریم کا مکمل معیاری نسخہ جو پوری امت کی اجتماعی تصدیق سے تیار کیا گیا ہو صرف ایک تھا، ان حضرات نے اس نئے مرتب مصحف کی ایک سے زائد نقلیں تیار کیں، عام طور سے مشہور یہ ہے کہ حضرت عثمان رضؓ نے پانچ مصاحف تیار کرائے تھے، لیکن ابو حاتم سجستانی رحؒ کا ارشاد ہے کہ کل سات نسخے تیار کئے گئے تھے، جن میں سے ایک مکہ مکرمہ، ایک شام، ایک یمن، ایک بحرین، ایک بصرہ اور ایک کوفہ بھیج دیا گیا، اور ایک مدینہ طیبہ میں محفوظ رکھا گیا (فتح الباری ۹/۱۷)

(۴) مذکورہ بالا کام کرنے کے لئے ان حضرات نے بنیادی طور پر تو انہی صحیفوں کو سامنے رکھا جو حضرت ابوبکر رضؓ کے زمانے میں لکھے گئے تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی مزید احتیاط کے لئے وہی طریق کار اختیار کیا جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اختیار کیا گیا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی جو متفرق تحریریں مختلف صحابہ رضؓ کے پاس محفوظ تھیں انھیں دوبارہ طلب کیا گیا اور ان کے ساتھ از سرِ نو مقابلہ کرکے یہ نسخے تیار کئے گئے، اس مرتبہ سورۂ احزاب کی ایک آیت[۲۳] مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ علیحدہ لکھی ہوئی صرف حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری رضؓ کے پاس ملی، پیچھے ہم لکھ چکے ہیں کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ آیت کسی اور شخص کو یاد نہیں تھی، کیونکہ حضرت زید رضؓ خود فرماتے ہیں کہ "مصحف لکھتے وقت سورۂ احزاب کی وہ آیت نہ ملی جو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا"۔ اس سے صاف واضح ہے کہ یہ آیت حضرت زید رضؓ اور دوسرے صحابہ رضؓ کو اچھی طرح یاد تھی، اسی طرح اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہو کہ یہ آیت کہیں اور لکھی ہوئی نہ تھی، کیونکہ حضرت ابوبکر رضؓ کے زمانے میں جو صحیفے لکھے گئے ظاہر ہے کہ یہ آیت اُن میں موجود تھی، نیز دوسرے صحابہ رضؓ کے پاس قرآنِ کریم کے جو انفرادی طور پر لکھے ہوئے نسخے موجود تھے ان میں یہ آیت بھی شامل تھی، لیکن چونکہ حضرت ابوبکر رضؓ کے زمانے کی طرح اس مرتبہ بھی اُن تمام متفرق تحریروں کو جمع کیا گیا تھا جو صحابۂ کرام رضؓ کے پاس لکھی ہوئی تھیں اس لئے حضرت زید رضؓ وغیرہ نے کوئی آیت ان مصاحف میں اُس وقت تک نہیں لکھی جب تک اُن تحریروں میں بھی وہ نہ مل گئی، اس طرح دوسری آیتیں تو متعدد صحابہ رضؓ کے پاس علیحدہ لکھی ہوئی بھی ملیں، لیکن سورۂ احزاب کی یہ آیت سوائے حضرت خزیمہ رضؓ کے کسی اور کے پاس الگ لکھی ہوئی دستیاب نہیں ہوئی۔

(۵) قرآن کریم کے یہ متعدد معیاری نسخے تیار فرمانے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ

تمام انفرادی نسخے نذرِ آتش فرما دیئے جو مختلف صحابہؓ کے پاس موجود تھے تاکہ رسم الخط، مسلّمہ قراءتوں کے اجتماع اور سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے تمام مصاحف یکساں ہوجائیں، اور ان میں کوئی اختلاف باقی نہ رہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس کارنامے کو پوری امت نے بہ نظرِ استحسان دیکھا، اور تمام صحابہؓ نے اس کام میں اُن کی تائید اور حمایت فرمائی، صرف حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو اس معاملہ میں کچھ رنجش رہی جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں[1]، حضرت علیؓ فرماتے ہیں:۔

"عثمانؓ کے بارے میں کوئی بات اُن کی بھلائی کے سوا نہ کہو، کیونکہ اللہ کی قسم! انھوں نے مصاحف کے معاملہ میں جو کام کیا وہ ہم سب کی موجودگی میں مشورے سے کیا" (فتح الباری ۹/۱۵)

تلاوت میں آسانی پیدا کرنے کے اقدامات

حضرت عثمانؓ کے مذکورہ بالا کارنامے کے بعد اُمّت کا اس پر اجماع ہوگیا کہ قرآن کریم کو رسمِ عثمانی کے خلاف کسی اور طریقے سے لکھنا جائز نہیں چنانچہ اس کے بعد تمام مصاحف اسی طریقے کے مطابق لکھے گئے، اور صحابہؓ وتابعینؒ نے مصاحفِ عثمانی کی نقول تیار کرکر کے قرآنِ کریم کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی۔

لیکن ابھی تک قرآنِ کریم کے نسخے چونکہ نقطوں اور زیر زبر پیش سے خالی تھے، اس لئے اہلِ عجم کو ان کی تلاوت میں دشواری ہوتی تھی، چنانچہ جب اِسلام عجمی ممالک میں اور زیادہ پھیلا تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس میں نقطوں اور حرکات کا اضافہ کیا جائے، تاکہ تمام لوگ آسانی سے اس کی تلاوت کرسکیں، اس مقصد کے لئے مختلف اقدامات کئے گئے جن کی مختصر تاریخ درج ذیل ہے:

نقطے

اہلِ عرب میں ابتداءً حروف پر نقطے لگانے کا رواج نہیں تھا، اور پڑھنے والے اس طرز کے اتنے عادی تھے کہ انھیں بغیر نقطوں کی تحریر پڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی، اور سیاق وسباق کی مدد سے مشتبہ حروف میں امتیاز بھی بہ آسانی ہوجاتا تھا، خاص طور سے قرآن کریم کے معاملے میں کسی اشتباہ کا امکان اس لئے نہیں تھا کہ اس کی حفاظت کا مدار کتابت پر نہیں بلکہ حافظوں پر تھا، اور حضرت عثمانؓ نے جو نسخے عالمِ اسلام کے مختلف حصّوں میں بھیجے تھے ان کے ساتھ قاری بھی بھیجے گئے تھے، جو اسے پڑھنا سکھا سکیں۔

اس میں روایات مختلف ہیں، کہ قرآن کریم کے نسخے پر سب سے پہلے کس نے نقطے ڈالے؟ بعض روایتیں یہ کہتی ہیں کہ یہ کارنامہ سب سے پہلے حضرت ابوالاسود دؤلیؒ نے انجام دیا (البرہان ۱/۲۵۰) بعض کا کہنا ہے کہ انھوں نے یہ کام حضرت علیؓ کی تلقین کے تحت کیا (صبح الاعشیٰ ۳/۱۵۵) اور بعض نے کہا ہے کہ کوفہ کے گورنر زیاد بن ابی سفیان نے ان سے یہ کام کرایا، اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ کارنامہ

[1] اس کی تفصیل کے لئے احقر کی مفصّل کتاب "علوم القرآن" ملاحظہ فرمائیے۔

حجاج بن یوسف نے حسن بصریؒ، یحییٰ بن یعمرؒ اور نصر بن عاصم لیثیؒ کے ذریعہ انجام دیا (تفسیر القرطبیؒ ۱/۶۳)

حرکات

نقطوں کی طرح شروع میں قرآن کریم پر حرکات (زیر، زبر، پیش) بھی نہیں تھیں اور اس میں بھی روایات کا بڑا اختلاف ہے کہ سب سے پہلے کس نے حرکات لگائیں؟ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ کام سب سے پہلے ابو الاسود دؤلیؒ نے انجام دیا، بعض کہتے ہیں کہ یہ کام حجاج بن یوسف نے یحییٰ بن یعمرؒ اور نصر بن عاصم لیثیؒ سے کرایا (قرطبیؒ ۱/۶۳)

اس سلسلے میں تمام روایات کو پیش نظر رکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حرکات سب سے پہلے ابو الاسود دؤلیؒ نے وضع کیں، لیکن یہ حرکات اُس طرح کی نہ تھیں جیسی آجکل رائج ہیں، بلکہ زبر کے لئے حرف کے اوپر ایک نقطہ (ـٚ) زیر کے لئے حرف کے نیچے ایک نقطہ (ـٜ) اور پیش کیلئے حرف کے سامنے ایک نقطہ (ـ۔) اور تنوین کے لئے دو نقطے (ـٚٚ یا ـٜٜ یا ـ:) مقرر کئے گئے۔ بعد میں خلیل بن احمدؒ نے ہمزہ اور تشدید کی علامتیں وضع کیں (صبح الاعشیٰ ۳/۱۶۰ و ۱۶۱)۔ اس کے بعد حجاج بن یوسف نے یحییٰ بن یعمرؒ، نصر بن عاصم لیثیؒ اور حسن بصریؒ رحمہم اللہ سے بیک وقت قرآن کریم پر نقطے اور حرکات دونوں لگانے کی فرمائش کی، اس موقع پر حرکات کے اظہار کے لئے نقطوں کے بجائے زیر، زبر، پیش کی موجودہ صورتیں مقرر کی گئیں، تاکہ حروف کے ذاتی نقطوں سے اُن کا التباس پیش نہ آئے، واللہ سبحانہ اعلم۔

احزاب یا منزلیں

صحابہؓ اور تابعینؒ کا معمول تھا کہ وہ ہر ہفتے ایک قرآن ختم کر لیتے تھے، اس مقصد کے لئے انھوں نے روزانہ تلاوت کی ایک مقدار مقرر کی ہوئی تھی جسے "حزب" یا "منزل" کہا جاتا ہے، اس طرح پورے قرآن کو کل سات احزاب پر تقسیم کیا گیا تھا (البرہان ۱/۲۵۰)

اجزاء یا پارے

آجکل قرآن کریم تیس ۳۰ اجزاء پر منقسم ہے، جنھیں تیس ۳۰ پارے کہا جاتا ہے، یہ پاروں کی تقسیم معنی کے اعتبار سے نہیں، بلکہ بچّوں کو پڑھانے کے لئے آسانی کے خیال سے تیس ۳۰ مساوی حصّوں پر تقسیم کر دیا گیا ہے، چنانچہ بعض اوقات بالکل ادھوری بات پر پارہ ختم ہو جاتا ہے، یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ تیس ۳۰ پاروں کی تقسیم کس نے کی ہے؟ بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت عثمانؓ نے مصاحف نقل کراتے وقت انھیں تیس ۳۰ مختلف صحیفوں میں لکھوایا تھا، لہٰذا یہ تقسیم آپ ہی کے زمانہ کی ہے، لیکن متقدمین کی کتابوں میں اس کی کوئی دلیل احقر کو نہیں مل سکی، البتہ علامہ بدر الدین زرکشیؒ نے لکھا ہے کہ قرآن کے تیس ۳۰ پارے مشہور چلے آتے ہیں اور مدارس کے قرآنی نسخوں میں اُن کا رواج ہے (البرہان ۱/۲۵۰ ومناہل العرفان ۱/۴۰۲) بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقسیم عہدِ صحابہؓ کے بعد تعلیم کی سہولت کے لئے کی گئی ہے، واللہ اعلم۔

اخماس اور اعشار قرونِ اُولیٰ کے قرآنی نسخوں میں ایک اور علامت کا رواج تھا، اور وہ یہ کہ ہر پانچ آیتوں کے بعد (حاشیہ پر) لفظ "خمس" یا "خ" اور ہر دس آیتوں کے بعد لفظ "عشر" یا "ع" لکھدیتے تھے، پہلی قسم کی علامتوں کو "اخماس" اور دوسری قسم کی علامتوں کو "اعشار" کہا جاتا تھا (مناہل العرفان ۱/۴۰۳) علماء متقدمین میں یہ اختلاف بھی رہا ہے کہ بعض حضرات ان علامتوں کو جائز اور بعض مکروہ سمجھتے تھے، یقینی طور سے یہ کہنا بھی مشکل ہو کہ یہ علامتیں سب سے پہلے کس نے لگائیں؟ ایک قول یہ ہو کہ اس کا موجد حجاج بن یوسف تھا، اور دوسرا قول یہ ہے کہ سب سے پہلے عباسی خلیفہ مامون نے اس کا حکم دیا تھا (البرہان ۱/۲۵۱) لیکن یہ دونوں اقوال اس لئے درست معلوم نہیں ہوتے کہ خود صحابہؓ کے زمانے میں "اعشار" کا تصور ملتا ہے، چنانچہ حضرت مسروقؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مصحف میں "اعشار" کا نشان ڈالنے کو مکروہ سمجھتے تھے (مصنف ابن ابی شیبہؒ ۲/۴۹۷)

رکوع "اخماس" اور "اعشار" کی علامتیں تو بعد میں متروک ہوگئیں، لیکن ایک اور علامت جو آج تک رائج چلی آتی ہے، رکوع کی علامت ہے، اور اس کی تعیین قرآن کریم کے مضامین کے لحاظ سے کی گئی ہے، یعنی جہاں ایک سلسلۂ کلام ختم ہوا وہاں رکوع کی علامت (حاشیہ پر حرف ع) بنادی گئی، احقر کو جستجو کے باوجود مستند طور پر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ رکوع کی ابتداء کس نے اور کس دَور میں کی؟ البتہ یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ اس علامت کا مقصد آیات کی ایسی متوسط مقدار کی تعیین ہے جو ایک رکعت میں پڑھی جاسکے، اور اس کو "رکوع" اسی لئے کہتے ہیں کہ نماز میں اس جگہ پہونچ کر رکوع کیا جائے، پورے قرآن میں ۵۴۰ رکوع ہیں، اس طرح اگر تراویح کی ہر رکعت میں ایک رکوع پڑھا جائے تو ستائیسویں شب میں قرآن کریم ختم ہوسکتا ہے (فتاویٰ عالمگیریہ فصل التراویح ۱/۹۴)

رموزِ اوقاف تلاوت اور تجوید کی سہولت کے لئے ایک اور مفید کام یہ کیا گیا کہ مختلف قرآنی جملوں پر ایسے اشارے لکھدیئے گئے جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ اس جگہ وقف کرنا (سانس لینا) کیسا ہے؟ ان اشارات کو "رموزِ اوقاف" کہتے ہیں، اور ان کا مقصد یہ ہو کہ ایک غیر عربی داں انسان بھی جب تلاوت کرے تو صحیح مقام پر وقف کرسکے، اور غلط جگہ سانس توڑنے سے معنی میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو، ان میں سے اکثر رموز سب سے پہلے علامہ ابو عبداللہ محمد

عہ فتاوٰی عالمگیریہ میں مشائخ بخارٰی کے حوالے سے رکوعات کی تعداد ۵۴۰ ہی بیان کی گئی ہے، لیکن جب ہم نے قرآن کریم کے مروجہ نسخوں میں خود گنتی کی تو رکوعات کی تعداد ۵۵۸ پائی۔ اور بعض اصحاب نے ہمیں خط میں لکھا کہ انکی گنتی کے مطابق رکوعات کی کل تعداد ۵۶۷ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ رکوع کی علامت لگانے میں بھی مختلف نسخوں میں کچھ اختلاف رہا ہو، واللہ اعلم ازناشر ۱۶، ۱۲، ۱۴۱۳ھ

بن طیفور سجاوندی رحمۃ اللہ علیہ نے وضع فرمائے (النشر فی القرآءت العشر ۱/۲۲۵) ان رموز کی تفصیل یہ ہے:

ط : یہ "وقفِ مطلق" کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں بات پوری ہو گئی ہے اس لئے یہاں وقف کرنا بہتر ہے۔

ج : یہ "وقفِ جائز" کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں وقف کرنا جائز ہے۔

ز : یہ "وقفِ مجوّز" کا مخفف ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وقف کرنا درست تو ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ وقف نہ کیا جائے۔

ص : یہ "وقفِ مرخّص" کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اس جگہ بات تو پوری نہیں ہوئی، لیکن جملہ چونکہ طویل ہو گیا ہے، اس لئے سانس لینے کے لئے دوسرے مقامات کے بجائے یہاں وقف کرنا چاہئے (المنح الفکریۃ، ص ۶۳)۔

م : یہ "وقفِ لازم" کا مخفف ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں وقف نہ کیا جائے تو آیت کے معنی میں فحش غلطی کا امکان ہے، لہٰذا یہاں وقف کرنا زیادہ بہتر ہے، بعض حضرات اسے وقفِ واجب بھی کہتے ہیں، لیکن اس سے مراد فقہی واجب نہیں جس کے ترک سے گناہ ہو، بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ تمام اوقات میں اس جگہ وقف کرنا سب سے زیادہ بہتر ہے (النشر ۱/۲۳۱)

لا : یہ "لَا تَقِفْ" کا مخفف ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ "یہاں نہ ٹھہرو" لیکن اس کا منشاء یہ نہیں کہ یہاں وقف کرنا ناجائز ہے، بلکہ اس میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں وقف کرنے میں کوئی حرج نہیں، اور اس کے بعد والے لفظ سے ابتداء کرنا بھی جائز ہے، لہٰذا اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں وقف کیا جائے تو بہتر یہ ہے کہ اسے دوبارہ لوٹا کر پڑھا جائے، اگلے لفظ سے ابتداء کرنا مستحسن نہیں (النشر، ص ۲۳۳ ج ۱) [1]

ان رموز کے بارے میں تو یقینی طور پر ثابت ہے کہ یہ علامہ سجاوندیؒ کے وضع کئے ہوئے ہیں ان کے علاوہ بھی بعض رموز قرآن کریم کے نسخوں میں موجود ہیں، مثلاً:۔

مع : یہ "معانقہ" کا مخفف ہے، یہ علامت اس جگہ لکھی جاتی ہے، جہاں ایک ہی آیت کی دو تفسیریں ممکن ہیں، ایک تفسیر کے مطابق وقف ایک جگہ ہوگا، اور دوسری تفسیر کے مطابق دوسری جگہ، لہٰذا ان میں سے کسی ایک جگہ وقف کیا جا سکتا ہے، لیکن ایک جگہ وقف کرنے کے بعد دوسری جگہ وقف کرنا درست نہیں، مثلاً ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ∴ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ ∴ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ الخ اس میں، اگر التَّوْرٰىةِ پر وقف کر لیا تو اَلْاِنْجِيْلِ پر وقف درست نہیں، اور اگر اَلْاِنْجِيْلِ پر وقف کرنا ہے تو اَلتَّوْرٰىةِ پر وقف درست نہیں، ہاں دونوں جگہ وقف نہ کریں تو درست ہے، اس کا ایک نام "مقابلہ" بھی ہے، اور اس کی سب سے پہلے نشان دہی

[1] ○ گول دائرہ یہ علامتِ آیت ہے۔ ناشر

امام ابوالفضل رازیؒ نے فرمائی ہے (النشر ص ۲۳۷ ج ۱ والاتقان ص ۸۸ ج ۱)

سکتہ : یہ "سکتہ" کی علامت ہے، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اس جگہ رُکنا چاہئے، لیکن سانس نہ ٹوٹنے پائے، یہ عموماً اس جگہ لایا جاتا ہے جہاں ملا کر پڑھنے سے معنی میں غلط فہمی کا اندیشہ ہو۔

وقفہ : اس جگہ "سکتہ" سے قدرے زیادہ دیر تک رُکنا چاہئے، لیکن سانس یہاں بھی نہ ٹوٹے۔

ق : یہ "قِیْلَ عَلَیْہِ الْوَقْفُ" کا مخفف ہے، مطلب یہ ہے کہ بعض حضرات کے نزدیک یہاں وقف ہے اور بعض کے نزدیک نہیں ہے۔

قف : یہ لفظ "قِفْ" ہے جس کے معنی ہیں "ٹھہر جاؤ" اور یہ اس جگہ لایا جاتا ہے جہاں پڑھنے والے کو یہ خیال ہو سکتا ہو کہ یہاں وقف درست نہیں۔

صلے : یہ "اَلْوَصْلُ اَوْلیٰ" کا مخفف ہے جس کے معنی ہیں کہ "ملا کر پڑھنا بہتر ہے"

صل : یہ "قَدْ یُوْصَلُ" کا مخفف ہے، یعنی یہاں بعض لوگ ٹھہرتے ہیں اور بعض ملا کر پڑھنے کو پسند کرتے ہیں۔

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم : یہ اُن مقامات پر لکھا جاتا ہے جہاں کسی روایت کی رُو سے یہ ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت کرتے ہوئے اس جگہ وقف فرمایا تھا۔

قرآن کریم کی طباعت : جب تک پریس ایجاد نہیں ہوا تھا قرآن کریم کے تمام نسخے قلم سے لکھے جاتے تھے، اور ہر دور میں ایسے کاتبوں کی ایک بڑی جماعت موجود رہی ہے جس کا کتابتِ قرآن کے سوا کوئی مشغلہ نہیں تھا، قرآنِ کریم کے حروف کو بہتر سے بہتر انداز میں لکھنے کے لئے مسلمانوں نے جو محنتیں کیں اور جس طرح اس عظیم کتاب کے ساتھ اپنے والہانہ شغف کا اظہار کیا، اس کی ایک بڑی مفصّل اور دلچسپ تاریخ ہے جس کے لئے مستقل تصنیف چاہئے، یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔

پھر جب پریس ایجاد ہوا تو سب سے پہلے ہیمبرگ کے مقام پر ۱۱۱۳ھ میں قرآن کریم طبع ہوا جس کا ایک نسخہ اب تک دارالکتب المصریہ میں موجود ہے، اس کے بعد متعدد مستشرقین نے قرآن کریم کے نسخے طبع کرائے، لیکن اسلامی دنیا میں ان کو قبولیت حاصل نہ ہو سکی، اس کے بعد مسلمانوں میں سب سے پہلے مولائے عثمان نے روس کے شہر سینٹ پیٹرس برگ میں ۱۷۸۷ء میں قرآنِ کریم کا ایک نسخہ طبع کرایا، اسی طرح قازان میں بھی ایک نسخہ چھاپا گیا، ۱۸۲۸ء میں ایران کے شہر تہران میں قرآن کریم کو پتھر پر طبع کیا گیا، پھر اس کے مطبوعہ نسخے دنیا بھر میں عام ہو گئے۔ (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو تاریخ القرآن للکردیؒ ص ۱۸۶ اور علوم القرآن، ڈاکٹر صبحی صالح اردو ترجمہ از غلام احمد حریری ص ۱۴۲)

۴

عِلمِ تفسیر

اب کچھ ضروری معلومات علمِ تفسیر کے سلسلے میں پیش خدمت ہیں، عربی زبان میں "تفسیر" کے لفظی معنی ہیں "کھولنا" اور اصطلاح میں علم تفسیر اس علم کو کہتے ہیں جس میں قرآن کریم کے معانی بیان کئے جائیں، اور اس کے احکام اور حکمتوں کو کھول کر واضح کیا جائے (البرہان) قرآن کریم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہے :-

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (۱۶: ۴۴)

"اور ہم نے قرآن آپؐ پر اُتارا تاکہ آپؐ لوگوں کے سامنے وہ باتیں وضاحت سے بیان فرمادیں جو اُن کی طرف اُتاری گئیں ہیں "

نیز قرآن کریم کا ارشاد ہے :-

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ج (۳: ۱۶۴)

"بلاشبہ اللہ نے مسلمانوں پر بڑا احسان فرمایا جبکہ اُن کے درمیان انہی میں سے ایک رسولؐ بھیجا، جو اُن کے سامنے اللہ کی آیات کی تلاوت کرے، اور انھیں پاک صاف کرے، اور انھیں اللہ کی کتاب اور دانائی کی باتوں کی تعلیم دے "

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرامؓ کو صرف قرآن کریم کے الفاظ ہی نہیں سکھاتے تھے، بلکہ اس کی پوری تفسیر بیان فرمایا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ کو ایک ایک سورت پڑھنے میں بعض اوقات کئی کئی سال لگ جاتے تھے، جس کی تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی۔

جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف فرما تھے اُس وقت تک کسی آیت کی تفسیر معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں تھا، صحابۂ کرامؓ کو جہاں کوئی دشواری پیش آتی وہ آپؐ سے رجوع کرتے اور انھیں تسلی بخش جواب مِل جاتا، لیکن آپؐ کے بعد اس بات کی ضرورت تھی کہ تفسیر قرآن کو ایک مستقل علم کی صورت میں محفوظ کیا جاتا، تاکہ اُمّت کے لئے قرآن کریم کے الفاظ کے ساتھ ساتھ اس کے صحیح معنی بھی محفوظ ہو جائیں، اور ملحد و گمراہ لوگوں کے لئے اس کی معنوی تحریف کی گنجائش باقی نہ رہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی توفیق سے اس امت نے یہ کارنامہ اس حُسن و خوبی سے انجام دیا کہ آج ہم یہ بات بلاخوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کی اس آخری کتاب کے صرف الفاظ ہی محفوظ نہیں ہیں بلکہ اس کی وہ صحیح تفسیر و تشریح بھی محفوظ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے جاں نثار صحابہؓ کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے۔

تفسیرِ قرآن کے مآخذ علمِ تفسیر کو اس اُمّت نے کس کس طرح محفوظ کیا؟ اس راہ میں انہوں نے کیسی کیسی مشقّتیں اٹھائیں؟ اور یہ جدّوجہد کتنے مراحل سے گذری؟ اس کی ایک طویل اور دلچسپ تاریخ ہے جس کا یہاں موقع نہیں[1]، لیکن یہاں مختصراً یہ بتانا ہے کہ تفسیرِ قرآن کے مآخذ کیا کیا ہیں؟ اور علمِ تفسیر پر جو بے شمار کتابیں ہر زبان میں ملتی ہیں انہوں نے قرآن کریم کی تشریح میں کن سرچشموں سے استفادہ کیا ہے، یہ سرچشمے کُل چھ ہیں:

۱۔ قرآن کریم

علمِ تفسیر کا پہلا مآخذ خود قرآن کریم ہے، چنانچہ ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ کسی آیت میں کوئی بات مجمل اور تشریح طلب ہوتی ہے تو خود قرآنِ کریم ہی کی کوئی دوسری آیت اس کے مفہوم کو واضح کر دیتی ہے، مثلاً سورۂ فاتحہ کی دُعا میں یہ جملہ موجود ہے کہ "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" یعنی ہمیں اُن لوگوں کے راستے کی ہدایت کیجئے جن پر آپ کا انعام ہوا"، اب یہاں یہ بات واضح نہیں ہے کہ وہ لوگ کون ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا، لیکن ایک دوسری آیت میں ان کو واضح طور سے متعیّن کر دیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ج۔ (۴: ۶۹)

"یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا، یعنی انبیاء، صدّیقین، شہداء اور صالح لوگ"۔

چنانچہ مفسّرینِ کرامؒ جب کسی آیت کی تفسیر کرتے ہیں تو سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر خود قرآن کریم ہی میں کسی اور جگہ موجود ہے یا نہیں؟ اگر موجود ہوتی ہے تو سب سے پہلے اسی کو اختیار فرماتے ہیں۔

۲۔ حدیث

"حدیث" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو کہتے ہیں، اور جیسا کہ پیچھے بیان کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے ساتھ آپؐ کو مبعوث ہی اس لئے فرمایا تھا کہ آپؐ لوگوں کے سامنے قرآن کریم کی صحیح تشریح کھول کھول کر بیان فرمادیں، چنانچہ آپؐ نے اپنے قول اور عمل دونوں سے یہ فریضہ بحُسن وخوبی انجام دیا، اور درحقیقت آپؐ کی پوری مبارک زندگی قرآن ہی کی عملی تفسیر ہے، اس لئے مفسّرینِ کرامؒ نے قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے دوسرے نمبر پر سب سے زیادہ زور حدیث پر دیا ہے، اور احادیث کی روشنی میں کتاب اللہ کے معنی متعیّن کئے ہیں، البتہ چونکہ حدیث میں صحیح، ضعیف اور موضوع ہر طرح کی روایات موجود ہیں، اس لئے محقق مفسّرین اس وقت تک کسی روایت کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے جب تک وہ تنقیدِ روایات کے اصولوں پر پوری نہ اُترتی ہو، لہٰذا جو روایت جہاں نظر آجائے اُسے دیکھ کر قرآن کریم

[1] اس کیلئے علوم القرآن پر احقر کی مفصّل کتاب ملاحظہ فرمایئے۔

کی کوئی تفسیر متعین کرلینا درست نہیں، کیونکہ وہ روایت ضعیف اور دوسری مضبوط روایتوں کے خلاف بھی ہوسکتی ہے، درحقیقت یہ معاملہ بڑا نازک ہے، اور اس میں قدم رکھنا انہی لوگوں کا کام ہے جنھوں نے اپنی عمریں ان علوم کو حاصل کرنے میں خرچ کی ہیں۔

۳۔ صحابہؓ کے اقوال

صحابۂ کرامؓ نے قرآن کریم کی تعلیم براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھی، اس کے علاوہ نزولِ وحی کے وقت وہ بہ نفسِ نفیس موجود تھے، اور انھوں نے نزولِ قرآن کے پورے ماحول اور پس منظر کا بذاتِ خود مشاہدہ کیا تھا، اس لئے فطری طور پر قرآن کریم کی تفسیر میں ان حضرات کے اقوال جتنے مستند اور قابلِ اعتماد ہوسکتے ہیں، بعد کے لوگوں کو وہ مقام حاصل نہیں ہوسکتا، لہٰذا جن آیتوں کی تفسیر قرآن یا حدیث سے معلوم نہیں ہوتی ان میں سب سے زیادہ اہمیت صحابۂ کرامؓ کے اقوال کو حاصل ہے، چنانچہ اگر کسی آیت کی تفسیر پر صحابہؓ کا اتفاق ہو تو مفسرین کرام اسی کو اختیار کرتے ہیں اور اس کے خلاف کوئی اور تفسیر بیان کرنا جائز نہیں، ہاں! اگر کسی آیت کی تفسیر میں صحابۂ کرامؓ کے اقوال مختلف ہوں تو بعد کے مفسرین دوسرے دلائل کی روشنی میں یہ دیکھتے ہیں کہ کونسی تفسیر کو ترجیح دی جائے؟ اس معاملہ میں اہم اصول اور قواعد اصولِ فقہ، اصولِ حدیث اور اصولِ تفسیر میں مدوّن ہیں، ان کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

۴۔ تابعینؒ کے اقوال

صحابہؓ کے بعد تابعینؒ کا نمبر آتا ہے، یہ وہ حضرات ہیں جنھوں نے قرآن کریم کی تفسیر صحابۂ کرامؓ سے سیکھی ہے، اس لئے اُن کے اقوال بھی علمِ تفسیر میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں، اگرچہ اس معاملہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ تابعینؒ کے اقوال تفسیر میں حجت ہیں یا نہیں؟ (الاتقان ۲/۱۷۹) لیکن ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

۵۔ لُغتِ عرب

قرآن کریم چونکہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے، اس لئے تفسیرِ قرآن کے لئے اس زبان پر مکمل عبور حاصل کرنا ضروری ہے، قرآن کریم کی بہت سی آیات ایسی ہیں کہ ان کے پسِ منظر میں چونکہ کوئی شانِ نزول یا کوئی اور فقہی یا کلامی مسئلہ نہیں ہوتا، اس لئے اُن کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہؓ و تابعینؒ کے اقوال منقول نہیں ہوتے، چنانچہ اُن کی تفسیر کا ذریعہ صرف لُغتِ عرب ہوتی ہے اور لغت ہی کی بنیاد پر اس کی تشریح کی جاتی ہے، اس کے علاوہ اگر کسی آیت کی تفسیر میں کوئی اختلاف ہو تو مختلف آراء میں محاکمہ کے لئے بھی علمِ لغت سے کام لیا جاتا ہے۔

۶۔ تدبّر اور استنباط

تفسیر کا آخری مأخذ "تدبّر اور استنباط" ہے، قرآن کریم کے نکات و اسرار ایک ایسا بحر

ناپیدا کنار ہے جس کی کوئی حد و نہایت نہیں، چنانچہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اسلامی علوم میں بصیرت عطا فرمائی ہو وہ جتنا جتنا اس میں غور و فکر کرتا ہے اُتنے ہی نئے نئے اسرار و نکات سامنے آتے ہیں، چنانچہ مفسرین کرامؒ اپنے اپنے تدبر کے نتائج بھی اپنی تفسیروں میں بیان فرماتے ہیں، لیکن یہ اسرار و نکات اسی وقت قابلِ قبول ہوتے ہیں جبکہ وہ مذکورہ بالا پانچ مآخذ سے متصادم نہ ہوں، لہٰذا اگر کوئی شخص قرآن کی تفسیر میں کوئی ایسا نکتہ یا اجتہاد بیان کرے جو قرآن و سنت، اجماع، لغت یا صحابہؓ و تابعینؒ کے اقوال کے خلاف ہو یا کسی دوسرے شرعی اصول سے ٹکراتا ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، بعض صوفیاءؒ نے تفسیر میں اس قسم کے اسرار و نکات بیان کرنے شروع کئے تھے، لیکن اُمّت کے محقق علماء نے انھیں قابلِ اعتبار نہیں سمجھا، کیونکہ قرآن و سنت اور شریعت کے بنیادی اصولوں کے خلاف کسی کی شخصی رائے ظاہر ہے کہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی (اتقان ۲/۱۸۴)

اسرائیلیات کا حکم

"اسرائیلیات" اُن روایتوں کو کہتے ہیں جو اہلِ کتاب یعنی یہودیوں اور عیسائیوں سے ہم تک پہنچی ہیں، پہلے زمانے کے مفسرینؒ کی عادت تھی کہ وہ کسی آیت کے ذیل میں ہر قسم کی وہ روایات لکھ دیتے تھے جو انھیں سند کے ساتھ پہنچتی تھیں، ان میں بہت سی روایتیں اسرائیلیات بھی ہوتی تھیں، اس لئے اُن کی حقیقت سے واقف ہونا بھی ضروری ہے، ان کی حقیقت یہ ہے کہ بعض صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ پہلے اہلِ کتاب کے مذہب سے تعلق رکھتے تھے، بعد میں جب وہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور قرآن کریم کی تعلیم حاصل کی تو انھیں قرآن کریم میں پچھلی اُمتوں کے بہت سے وہ واقعات نظر آئے جو انھوں نے اپنے سابقہ مذہب کی کتابوں میں بھی پڑھے تھے، چنانچہ وہ قرآنی واقعات کے سلسلے میں وہ تفصیلات مسلمانوں کے سامنے بیان کرتے تھے جو انھوں نے اپنے پُرانے مذہب کی کتابوں میں دیکھی تھیں، یہی تفصیلات اسرائیلیات کے نام سے تفسیر کی کتابوں میں داخل ہوگئی ہیں، حافظ ابن کثیرؒ نے جو بڑے محقق مفسرین میں سے ہیں، انھوں نے لکھا ہے کہ اسرائیلیات کی تین قسمیں ہیں:

(۱) وہ روایات جن کی سچائی قرآن و سنت کے دوسرے دلائل سے ثابت ہے، مثلاً فرعون کا غرق ہونا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کوہِ طور پر تشریف لے جانا وغیرہ۔

(۲) وہ روایات جن کا جھوٹ ہونا قرآن و سنت کے دوسرے دلائل سے ثابت ہے مثلاً اسرائیلی روایات میں یہ مذکور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی آخری عمر میں (معاذ اللہ) مرتد ہوگئے تھے، اس کی تردید قرآن کریم سے ثابت ہے، ارشاد ہے کہ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا (۲:۱۰۲) (اور سلیمانؑ کافر نہیں ہوئے، بلکہ شیاطین نے کفر کیا) اسی طرح مثلاً اسرائیلی روایات میں مذکور ہے کہ (معاذ اللہ) حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے سپہ سالار اوریا کی بیوی سے زنا کیا، یا اُسے مختلف تدبیروں سے مرواکر اس کی بیوی سے نکاح کرلیا، یہ بھی کھُلا جھوٹ ہے اور اس قسم کی روایتوں کو غلط سمجھنا لازم ہے۔

(۳) وہ روایات جن کے بارے میں قرآن وسنت اور دوسرے شرعی دلائل خاموش ہیں، جیسے کہ تورات کے احکام وغیرہ، ایسی روایات کے بارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ ان کے بارے میں سکوت اختیار کیا جائے، نہ اُن کی تصدیق کی جائے اور نہ تکذیب، البتہ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا ایسی روایات کو نقل کرنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ حافظ ابن کثیرؒ نے قول فیصل یہ بیان کیا ہے کہ انھیں نقل کرنا جائز تو ہے، لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ شرعی اعتبار سے وہ حجت نہیں ہے (مقدمہ تفسیر ابن کثیر)

تفسیر قرآن کے بارے میں ایک شدید غلط فہمی

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ قرآن کریم کی تفسیر ایک انتہائی نازک اور مشکل کام ہے، جس کے لئے صرف عربی زبان جان لینا کافی نہیں، بلکہ تمام متعلقہ علوم میں مہارت ضروری ہے، چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ مفسر قرآن کے لئے ضروری ہے کہ وہ عربی زبان کے نحو و صرف اور بلاغت و ادب کے علاوہ علم حدیث، اصول فقہ و تفسیر اور عقائد و کلام کا وسیع وعمیق علم رکھتا ہو، کیونکہ جب تک ان علوم سے مناسبت نہ ہو انسان قرآن کریم کی تفسیر میں کسی صحیح نتیجے تک نہیں پہونچ سکتا۔

افسوس ہے کہ کچھ عرصہ سے مسلمانوں میں یہ خطرناک وبا چل پڑی ہے کہ بہت سے لوگوں نے صرف عربی پڑھ لینے کو تفسیر قرآن کے لئے کافی سمجھ رکھا ہے، چنانچہ جو شخص بھی معمولی عربی زبان پڑھ لیتا ہے، وہ قرآن کریم کی تفسیر میں رائے زنی شروع کر دیتا ہے، بلکہ بعض اوقات ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ عربی زبان کی نہایت معمولی شُدبُد رکھنے والے لوگ جنھیں عربی پر بھی مکمل عبور نہیں ہوتا، نہ صرف من مانے طریقے پر قرآن کی تفسیر شروع کر دیتے ہیں، بلکہ پُرانے مفسرین کی غلطیاں نکالنے کے درپے ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ بعض ستم ظریف تو صرف ترجمے کا مطالعہ کر کے اپنے آپ کو قرآن کا عالم سمجھنے لگتے ہیں، اور بڑے بڑے مفسرین پر تنقید کرنے سے نہیں چُوکتے۔

خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ یہ انتہائی خطرناک طرز عمل ہے جو دین کے معاملہ میں نہایت مہلک گمراہی کی طرف لیجاتا ہے، دنیوی علوم وفنون کے بارے میں ہر شخص اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص محض انگریزی زبان سیکھ کر میڈیکل سائنس کی کتابوں کا مطالعہ کرلے تو دنیا کا کوئی صاحب عقل اُسے ڈاکٹر تسلیم نہیں کرسکتا، اور نہ اپنی جان اس کے حوالے کرسکتا ہے، جب تک کہ اس نے کسی میڈیکل کالج میں باقاعدہ تعلیم و تربیت حاصل نہ کی ہو، اس لئے کہ ڈاکٹر بننے کے لئے صرف انگریزی سیکھ لینا کافی نہیں، بلکہ باقاعدہ ڈاکٹری کی تعلیم و تربیت حاصل کرنا ضروری ہے، اسی طرح کوئی انگریزی داں انجینیرنگ کی کتابوں کا مطالعہ کرکے انجینیر بننا چاہے تو دنیا کا کوئی بھی باخبر انسان اسے انجینیر تسلیم نہیں کرسکتا، اس لئے کہ یہ کام صرف انگریزی زبان سیکھنے سے نہیں آسکتا، بلکہ اس کے لئے ماہر اساتذہ کے زیر تربیت رہ کر

ان سے باقاعدہ اس فن کو سیکھنا ضروری ہے، جب ڈاکٹر اور انجینیر بننے کے لئے یہ کڑی شرائط ضروری ہیں تو آخر قرآن و حدیث کے معاملہ میں صرف عربی زبان سیکھ لینا کیسے کافی ہو سکتا ہے، زندگی کے ہر شعبہ میں ہر شخص اس اصول کو جانتا اور اس پر عمل کرتا ہے کہ ہر علم و فن کے سیکھنے کا ایک خاص طریقہ اور اس کی مخصوص شرائط ہوتی ہیں، جنھیں پورا کئے بغیر اس علم و فن میں اس کی رائے معتبر نہیں سمجھی جاتی، تو آخر قرآن و سنت اتنے لاوارث کیسے ہوسکتے ہیں کہ ان کی تشریح و تفسیر کے لئے کسی علم و فن کے حاصل کرنے کی ضرورت نہ ہو، اور اس کے معاملہ میں جو شخص چاہے رائے زنی شروع کردے؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ :-

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ (۵۴: ۱۷)

اور بلاشبہ ہم نے قرآن کریم کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کردیا ہے "۔

اور جب قرآن کریم ایک آسان کتاب ہے تو اس کی تشریح کے لئے کسی لمبے چوڑے علم و فن کی ضرورت نہیں، لیکن یہ استدلال ایک شدید مغالطہ ہے جو خود کم فہمی اور سطحیت پر مبنی ہے، واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات دو قسم کی ہیں، ایک تو وہ آیتیں ہیں جن میں عام نصیحت کی باتیں، سبق آموز واقعات اور عبرت و موعظت کے مضامین بیان کئے گئے ہیں، مثلاً دنیا کی ناپائداری، جنت و دوزخ کے حالات، خوفِ خدا اور فکرِ آخرت پیدا کرنے والی باتیں، اور زندگی کے دوسرے سیدھے سادے حقائق، اس قسم کی آیتیں بلاشبہ آسان ہیں، اور جو شخص بھی عربی زبان سے واقف ہو وہ انھیں سمجھ کر نصیحت حاصل کرسکتا ہے، مذکورۂ بالا آیت میں اسی قسم کی تعلیمات کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ ان کو ہم نے آسان کردیا ہے، چنانچہ خود اس آیت میں لفظ لِلذِّكْرِ (نصیحت کے واسطے) اس پر دلالت کر رہا ہے۔

اس کے برخلاف دوسری قسم کی آیتیں وہ ہیں جو احکام و قوانین، عقائد اور علمی مضامین پر مشتمل ہیں، اس قسم کی آیتوں کا کماحقہ سمجھنا اور ان سے احکام و مسائل مستنبط کرنا ہر شخص کا کام نہیں جب تک اسلامی علوم میں بصیرت اور پختگی حاصل نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ کی مادری زبان اگرچہ عربی تھی، اور عربی سمجھنے کے لئے انھیں کہیں تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنے میں طویل مدتیں صرف کرتے تھے، علامہ سیوطیؒ نے امام ابو عبدالرحمٰن سلمیؒ سے نقل کیا ہے کہ جن حضرات صحابہؓ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے، مثلاً حضرت عثمان بن عفانؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ انھوں نے ہمیں بتایا کہ جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی دس آیتیں سیکھتے تو اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک ان آیتوں کے متعلق تمام علمی اور عملی باتوں کا احاطہ نہ کرلیں، وہ فرماتے تھے کہ :-

نتعلّمنا القرآن والعلم والعمل جمیعًا

"ہم نے قرآن اور علم و عمل ساتھ ساتھ سیکھا ہے" (اتقان ۲/۱۷۶)

چنانچہ مؤطا امام مالکؒ میں روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے صرف سورۂ بقرہ یاد کرنے میں پورے آٹھ سال صرف کئے، اور مسندِ احمدؒ میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے جو شخص سورۂ بقرہ اور سورۂ آلِ عمران پڑھ لیتا ہماری نگاہوں میں اُس کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا تھا (اتقان ۲/۱۷۶ نوع ۷۷)

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ حضرات صحابہؓ جن کی مادری زبان عربی تھی، جو عربی کے شعر و ادب میں مہارت تامہ رکھتے تھے، اور جن کو لمبے لمبے قصیدے معمولی توجہ سے ازبر ہو جایا کرتے تھے، انھیں قرآن کریم کو یاد کرنے اور اس کے معانی سمجھنے کے لئے اتنی طویل مدّت کی کیا ضرورت تھی کہ آٹھ آٹھ سال صرف ایک سورت پڑھنے میں خرچ ہو جائیں؟ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ قرآن کریم اور اس کے علوم کو سیکھنے کے لئے صرف عربی زبان کی مہارت کافی نہیں تھی، بلکہ اس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور تعلیم سے فائدہ اٹھانا ضروری تھا، اب ظاہر ہے کہ جب صحابۂ کرامؓ کو عربی زبان کی مہارت اور نزولِ وحی کا براہِ راست مشاہدہ کرنے کے باوجود "عالمِ قرآن" بننے کے لئے باقاعدہ حضورؐ سے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت تھی تو نزولِ قرآن کے سینکڑوں سال بعد عربی کی معمولی شُدبُد پیدا کر کے یا صرف ترجمے دیکھ کر مفسرِ قرآن بننے کا دعویٰ کتنی بڑی جسارت اور علم و دین کے ساتھ کیسا افسوسناک مذاق ہے؟ ایسے لوگوں کو جو اس جسارت کا ارتکاب کرتے ہیں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اچھی طرح یاد رکھنا چاہئے کہ:-

من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوّأ مقعدہ فی النار

"جو شخص قرآن کے معاملہ میں علم کے بغیر کوئی بات کہے تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے"

(ابوداؤدؒ، از اتقان ۲/۱۷۹)

اور:- من تکلّم فی القرآن برأیہ فأصاب فقد أخطأ

"جو شخص قرآن کے معاملے میں (محض) اپنی رائے سے گفتگو کرے اور اس میں کوئی صحیح بات بھی کہدے تب بھی اس نے غلطی کی" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ، از اتقان ۲/۱۷۹)

مشہور تفسیریں

عہدِ رسالتؐ کے بعد سے قرآن کریم کی بے شمار تفسیریں لکھی گئی ہیں، بلکہ دنیا کی کسی کتاب کی بھی اتنی خدمت نہیں کی گئی، جتنی قرآن کریم کی کی گئی ہے، ان سب تفاسیر کا تعارف کسی مفصّل کتاب میں بھی ممکن نہیں، چہ جائیکہ اس مختصر مقدمہ میں اس کا ارادہ کیا جائے، لیکن یہاں ہم اُن اہم تفسیروں کا

مختصر تعارف کرانا چاہتے ہیں جو معارف القرآن کا خاص مأخذ رہی ہیں، اور جن کا حوالہ معارف القرآن میں بار بار آیا ہے، اگرچہ معارف القرآن کی تصنیف کے دوران بہت سی تفاسیر اور سینکڑوں کتابیں پیش نظر رہی ہیں، لیکن یہاں صرف اُن تفاسیر کا تذکرہ مقصود ہے جن کے حوالے بکثرت آئیں گے۔

تفسیر ابن جریر اس تفسیر کا اصل نام "جامع البیان" ہے، اور یہ علامہ ابوجعفر محمد بن جریر طبریؒ (متوفی ۳۱۰ھ) کی تالیف ہے، علامہ طبریؒ اونچے درجے کے مفسر، محدّث اور مؤرخ ہیں منقول ہے کہ وہ چالیس سال تک مسلسل لکھنے میں مشغول رہے، اور ہر روز چالیس ورق لکھنے کا معمول تھا (البدایہ والنہایہ، ص ۱۴۵ ج ۱۱) بعض حضرات نے ان پر شیعہ ہونے کا الزام عائد کیا ہے، لیکن محققین نے اس الزام کی تردید کی ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ اہل سنت کے جلیل القدر عالم ہیں، بلکہ ان کا شمار ائمہ مجتہدین میں ہوتا ہے۔

ان کی تفسیر تیس جلدوں میں ہے، اور بعد کی تفاسیر کے لئے بنیادی مأخذ کی حیثیت رکھتی ہے، وہ آیات کی تفسیر میں علماء کے مختلف اقوال نقل کرتے ہیں، اور پھر جو قول اُن کے نزدیک راجح ہوتا ہے اسے دلائل کے ذریعہ ثابت کرتے ہیں، البتہ ان کی تفسیر میں صحیح وسقیم ہر طرح کی روایات جمع ہوگئی ہیں، اس لئے اُن کی بیان کی ہوئی ہر روایت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، دراصل اس تفسیر سے ان کا مقصد یہ تھا کہ تفسیر قرآن کے بارے میں جس قدر روایات انھیں دستیاب ہوسکیں اُن سب کو جمع کر دیا جائے، تاکہ اس جمع شدہ مواد سے کام لیا جاسکے، البتہ انھوں نے ہر روایت کے ساتھ اس کی سند بھی ذکر کی ہے، تاکہ جو شخص چاہے راویوں کی تحقیق کرکے روایت کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرسکے۔

تفسیر ابن کثیر یہ حافظ عماد الدین ابوالفداء اسمٰعیل بن کثیر دمشقی شافعی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۷۷۴ھ) کی تصنیف ہے، جو آٹھویں صدی کے ممتاز اور محقق علماء میں سے ہیں، اُن کی تفسیر چار جلدوں میں شائع ہوچکی ہے، اس میں زیادہ زور تفسیری روایات پر دیا گیا ہے، اور خاص بات یہ ہے کہ مصنفؒ روایتوں پر محدثانہ تنقید بھی کرتے ہیں، اور اس لحاظ سے یہ کتاب تمام کتب تفسیر میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔

تفسیر القرطبی اس کا پورا نام "الجامع لاحکام القرآن" ہے، اندلس کے مشہور اور محقق عالم علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح القرطبیؒ (متوفی ۶۷۱ھ) کی تصنیف ہے، جو فقہ میں امام مالکؒ کے مسلک کے پیرو تھے، اور عبادت و زہد کے اعتبار سے شہرۂ آفاق تھے، اصل میں اس کتاب کا بنیادی موضوع تو قرآن کریم سے فقہی احکام ومسائل کا استنباط تھا، لیکن اس ضمن میں انھوں نے آیتوں کی تشریح، مشکل الفاظ کی تحقیق، اعراب و بلاغت اور متعلقہ روایات کو بھی تفسیر میں خوب جمع کیا ہے، یہ کتاب بارہ جلدوں میں ہے، اور بار بار شائع ہوچکی ہے۔

تفسیر کبیر یہ امام فخر الدین رازیؒ (متوفی ۶۰۶ھ) کی تصنیف ہے، اور اس کا اصلی نام "مفاتیح الغیب" ہے، لیکن "تفسیر کبیر" کے نام سے مشہور ہے، امام رازیؒ متکلمینِ اسلام کے امام ہیں، اس لئے ان کی تفسیر میں عقلی اور کلامی مباحث اور باطل فرقوں کی تردید پر بہت زور دیا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حلِ قرآن کے لحاظ سے بھی یہ تفسیر اپنی نظیر آپ ہے، اور اس میں جس دلنشین انداز میں قرآن کریم کے معانی کی توضیح اور آیاتِ قرآنی کے باہمی ربط کی تشریح کی گئی ہے، وہ بڑا قابلِ قدر ہے، اغلب یہ ہے کہ امام رازیؒ نے سورۂ فتح تک کی تفسیر خود لکھی ہے، اس کے بعد وہ اسے پورا نہ کر سکے، چنانچہ سورۂ فتح سے آخر تک کا حصہ قاضی شہاب الدین بن خلیل الخولی الدمشقیؒ (متوفی ۶۳۹ھ) یا شیخ نجم الدین احمد بن محمد القمولیؒ (متوفی ۷۷۷ھ) نے مکمل فرمایا (کشف الظنون ۲/۴۷۷)

امام رازیؒ نے اپنے زمانے کی ضرورت کے مطابق چونکہ کلامی بحث اور باطل فرقوں کی تردید پر خاص زور دیا ہے، اور اس ضمن میں ان کی بحثیں بہت سے مقامات پر انتہائی طویل ہو گئی ہیں، اس لئے بعض حضرات نے اُن کی تفسیر پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ فِیْهِ كُلُّ شَیْءٍ اِلَّا التَّفْسِیْرَ (اس کتاب میں تفسیر کے سوا سب کچھ ہے) لیکن یہ تبصرہ تفسیر کبیر پر بڑا ظلم ہے، اور حقیقت وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی، کہ حلِ قرآن کے لحاظ سے بھی اس تفسیر کا پایہ بہت بلند ہے، البتہ چند ایک مقامات پر انھوں نے جمہورِ امت کی راہ سے ہٹ کر آیاتِ قرآنی کی تفسیر کی ہے، لیکن ایسے مقامات آٹھ ضخیم جلدوں کی اس کتاب میں خال خال ہیں۔

تفسیر البحر المحیط یہ علامہ ابو حیان غرناطی اندلسیؒ (متوفی ۷۵۴ھ) کی تصنیف ہے، جو اسلامی علوم کے علاوہ علمِ نحو و بلاغت میں خصوصی مہارت رکھتے تھے، چنانچہ ان کی تفسیر میں نحو و بلاغت کا رنگ نمایاں ہے، وہ ہر آیت کے الفاظ کی تحقیق، ترکیبوں کے اختلاف اور بلاغت کے نکات بیان کرنے پر خاص زور دیتے ہیں۔

احکام القرآن للجصاصؒ یہ امام ابوبکر جصاص رازیؒ (متوفی ۳۷۰ھ) کی تصنیف ہے، جو فقہائے حنفیہ میں ایک ممتاز مقام کے حامل ہیں، ان کی اس کتاب کا موضوع قرآن کریم سے فقہی احکام و مسائل کا استنباط ہے، اور انھوں نے مسلسل آیتوں کی تفسیر کے بجائے صرف اُن آیتوں کی فقہی تفصیلات بیان فرمائی ہیں جو فقہی احکام پر مشتمل ہیں، اس موضوع پر اور بھی متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن اس کتاب کو ان سب میں ایک نمایاں اور ممتاز مقام حاصل ہے۔

تفسیر الدر المنثور یہ علامہ جلال الدین سیوطیؒ (متوفی ۹۱۱ھ) کی تصنیف ہے، اور اس کا پورا نام "الدر المنثور فی التفسیر بالماثور" ہے، اس میں علامہ سیوطیؒ نے ان تمام روایات کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے جو قرآن کریم کی تفسیر سے متعلق ان کو ملی ہیں، ان سے پہلے بہت سے محدثین مثلاً حافظ ابن جریرؒ، امام بغویؒ، ابن مردویہؒ، ابن حبانؒ اور ابن ماجہؒ وغیرہ اپنے اپنے طور پر یہ کام کر چکے تھے،

علامہ سیوطیؒ نے ان سب کی بیان کردہ روایات کو اس کتاب میں جمع کر دیا ہے، البتہ انھوں نے روایات کے ساتھ انکی پوری سند ذکر کرنے کے بجائے صرف اس مصنف کا نام ذکر کرنے پر اکتفاء کیا ہے جس نے اس روایت کو اپنی سند سے بیان کیا ہے، تاکہ بوقتِ ضرورت اس کی مراجعت کر کے سند کی تحقیق کی جا سکے، چونکہ ان کا مقصد روایات کے ذخیرہ کو یکجا کرنا تھا، اس لئے اس کتاب میں بھی صحیح وسقیم ہر طرح کی روایتیں جمع ہو گئی ہیں، اور سند کی تحقیق کئے بغیر ان کی بیان کی ہوئی ہر روایت کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھا جا سکتا، علامہ سیوطیؒ بعض مرتبہ ہر روایت کے ساتھ یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ اس کی سند کس درجہ کی ہے، لیکن چونکہ تنقیدِ حدیث کے معاملہ میں وہ خاصے متساہل مشہور ہیں، اس لئے اس پر بھی کما حقہٗ اعتماد کرنا مشکل ہے۔

تفسیر مظہری یہ علامہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ (متوفی ۱۲۲۵ھ) کی تصنیف ہے، اور انھوں نے اپنے شیخ طریقت مرزا مظہر جانِ جاناں دھلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام پر اس تفسیر کا نام "تفسیر مظہری" رکھا ہے، ان کی یہ تفسیر بہت سادہ اور واضح ہے، اور اختصار کے ساتھ آیاتِ قرآنی کی تشریح معلوم کرنے کے لئے نہایت مفید، انھوں نے الفاظ قرآنی کی تشریح کے ساتھ متعلقہ روایات کو بھی کافی تفصیل سے ذکر کیا ہے، اور دوسری تفسیروں کے مقابلے میں زیادہ چھان پھٹک کر روایات لینے کی کوشش کی ہے۔

رُوح المعانی اس کا پورا نام "روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی" ہے، اور یہ بغداد کے آخری دور کے مشہور عالم علامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۲۷۰ھ) کی تصنیف ہے، اور تیس جلدوں پر مشتمل ہے، انھوں نے اپنی اس تفسیر کو بڑی حد تک جامع بنانے کی کوشش کی ہے لغت، نحو، ادب اور بلاغت کے علاوہ فقہ، عقائد، کلام، فلسفہ اور ہیئت، تصوّف اور متعلقہ روایات پر بھی مبسوط بحثیں کی ہیں، اور کوشش یہ کی ہے کہ آیت سے متعلق کوئی علمی گوشہ تشنہ نہ رہے، روایاتِ حدیث کے معاملے میں بھی اس کے مصنّف دوسرے مفسرین کے مقابلے میں محتاط رہے ہیں، اس لحاظ سے یہ بڑی جامع تفسیر ہے، اور اب تفسیرِ قرآن کے سلسلے میں کوئی بھی کام اس کی مدد سے بے نیاز نہیں ہو سکتا ؛

تمہید

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَدَدَ خَلْقِهٖ وَزِنَةَ عَرْشِهٖ وَمِدَادَ كَلِمَاتِهٖ وَرِضٰى نَفْسِهٖ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى صَفْوَةِ رُسُلِهٖ وَخَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَجَمِيْعِ الْاَنْبِيَاۗءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ ۝

امّا بعد

دنیا کی سب سے بڑی نعمت قرآن ہے

قرآن کریم اس جہان میں وہ نعمتِ بے بہا ہے کہ سارا جہان آسمان و زمین اور ان میں پیدا ہونے والی مخلوقات اس کا بدل نہیں بن سکتی۔

انسان کی سب سے بڑی سعادت اور خوش نصیبی اپنی مقدور بھر قرآن کریم میں اشتغال اور اس کو حاصل کرنا ہے، اور سب سے بڑی شقاوت و بدنصیبی اس سے اعراض اور اُسے چھوڑنا ہے، اس لئے ہر مسلمان کو اس کی فکر تو فرض عین اور ضروری ہے کہ قرآن کریم کو صحتِ لفظی کے ساتھ پڑھنے اور اولاد کو پڑھانے کی کوشش کرے، اور پھر جس قدر ممکن ہو اس کے معانی اور احکام کو سمجھنے اور اُن پر عمل کرنے کی فکر میں لگا رہے، اور اس کو اپنی پوری عمر کا وظیفہ بنائے، اور اپنے حوصلے اور ہمت کے مطابق اس کا جو حصّہ بھی نصیب ہو جائے اُس کو اس جہان کی سب سے بڑی نعمت سمجھے۔

مختصر سرگذشت مصنّف

ناکارۂ خلائق بندہ محمد شفیع ابن مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس نعمت کا شکر ادا نہیں کر سکتا کہ حق تعالیٰ نے اس کا مولد و وطن مرکزِ علوم اسلامیہ دیوبند کو بنا دیا، اور ایسے والد محترم کی آغوش میں پرورش کا موقع عطا فرمایا جو حافظِ قرآن اور عالمِ دین ہونے کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کے ہمعصر تھے، دارالعلوم دیوبند کے بانیان علمائے ربانی کی صحبتوں سے فیض یاب ہونے کے مواقع اُن کو ہمیشہ میسر رہے، اُن کا وجود اُن بزرگوں کا زندہ تذکرہ تھا، اور اُن کی زندگی بچپن سے وفات تک دارالعلوم دیوبند ہی میں پوری ہوئی، وہیں تعلیم حاصل کی، وہیں مدرّس ہو کر ساری عمر تعلیم کی خدمت گذاری کی۔

احقر کی ابتدا تعلیمِ قرآن والد محترم کی تجویز سے دارالعلوم کے اساتذۂ قرآن حافظ عبدالعظیم صاحب اور حافظ نامدار خان صاحب رحمۃ اللہ علیہما کے پاس ہوئی، اور پھر خود والد محترم کی خدمت میں رہ کر اردو، فارسی، حساب، ریاضی اور ابتدائی عربی کی تعلیم حاصل کی، پھر ۱۳۳۱ھ میں دارالعلوم کے درجہ عربی میں باقاعدہ داخلے کر ۱۳۳۵ھ تک درسِ نظامی کا نصاب اُن ماہرِ فن اساتذہ کی خدمت میں رہ کر پورا کیا جن کی نظیر آج دنیا کے کسی گوشے میں ملنا مشکل ہے، بچپن سے متوسط تعلیمِ عربی تک شیخ العرب و العجم سیدی حضرت مولانا محمود الحسن صاحب شیخ الہند قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضری دی، کبھی کبھی درسِ بخاری کی غیر رسمی حاضری نصیب رہی، مالٹہ جیل سے واپس تشریف لانے کے بعد انہی کے دستِ حق پرست پر بیعتِ طریقت نصیب ہوئی، اور علومِ عربیہ کی باقاعدہ تعلیم حضرات ذیل سے حاصل کی، حافظ حدیث جامع العلوم حضرت علامہ مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری، عارف باللہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب، عالمِ ربانی حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، شیخ الادب و الفقہ حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہم اجمعین، اور ماہرِ علومِ معقول و منقول حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب و حضرت مولانا محمد رسول خان صاحب۔

افسوس ہے کہ ان سطور کی تحریر کے وقت آخر الذکر دو بزرگوں کے سوا سب اس دارِ فانی سے رحلت فرما چکے ہیں، حق تعالیٰ ان دونوں بزرگوں کا سایہ تا دیر[لہ] بعافیت قائم رکھیں، اور اہلِ علم کو ان سے فیض یاب ہونے کا زیادہ سے زیادہ موقع عطا فرمائیں۔

لہ ۲۳ شعبان ۱۳۹۲ھ کو جبکہ معارف القرآن پر نظر ثانی کا کام شروع ہوا تو یہ دونوں بزرگ بھی رخصت ہو چکے ہیں، حق تعالیٰ ان کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائیں، اور درجات عالیہ نصیب فرمائیں، ۱۲ منہ

اساتذہ اور اکابرِ دارالعلوم کی نظرِ شفقت وعنایت اوّل ہی سے اس ناکارہ پر مبذول تھی، ۱۳۳۶ھ میں احقر نے فنون کی بقیہ چند کتابیں قاضی اور میرزاہد اور امور عامہ وغیرہ پڑھنا شروع کیا تھا کہ اسی سال میں اکابر دارالعلوم نے احقر کو کچھ سبق پڑھانے کے لئے دیدیئے، اس طرح ۱۳۳۶ھ میری تعلیم و تعلّم کا مشترک سال تھا، ۱۳۳۷ھ سے باقاعدہ دارالعلوم میں تدریس کی خدمت پر لگادیا گیا، بارہ سال مسلسل مختلف علوم و فنون کی متوسط اور اعلیٰ کتابوں کے درس کی خدمت انجام دی، ۱۳۴۹ھ میں مجھے صدر مفتی کی حیثیت سے دارالعلوم کا منصبِ فتویٰ سپرد کیا گیا، اس کے ساتھ کچھ کتابیں حدیث و تفسیر کی بھی زیرِ درس رہیں، اور بالآخر ۱۳۶۲ھ میں تحریک پاکستان کی جد وجہد اور کچھ دوسرے اسباب کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہوگیا۔

دارالعلوم کی چھبیس سالہ خدمتِ درس و فتویٰ کے ساتھ خاص خاص موضوعات پر تصنیف کا بھی سلسلہ جاری رہا، ان تمام مشاغل اور بزرگانِ دارالعلوم کی صحبت سے اپنے حوصلے کے مطابق قرآن و حدیث سے کچھ مناسبت ہوگئی تھی، حضرت مجدد الملۃ حکیم الامّت سیدی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضری کا شرف تو طالب علمی کے زمانے میں بھی ہوتا رہتا تھا مگر ۱۳۴۶ھ سے تجدید بیعت کے ساتھ مسلسل حاضر باشی کا شرف حاصل ہوا جو تقریباً بیس سال حضرت اقدس کی وفات رجب ۱۳۶۲ھ تک جاری رہا، حضرت قدس سرہٗ کو حق تعالیٰ نے جملہ علوم و فنون کی کامل مہارت عطا فرمائی تھی، اور اُن میں سے خصوصاً تفسیر اور تصوّف آپ کے مخصوص فن تھے ان دونوں علوم میں آپ کی تصانیف بیان القرآن، التکشّف اور التشرّف و دیگر رسائل تصوّف اس پر کافی شاہد ہیں، حضرت قدس سرہٗ نے اپنی آخری عمر میں یہ ضرورت محسوس فرمائی کہ احکام القرآن پر کوئی ایسی کتاب لکھی جائے جس میں عصرِ حاضر کے مسائل کو بھی جس قدر قرآن کریم سے ثابت ہوتے ہیں واضح کیا جائے، اس کام کو جلد پورا کرانے کے خیال سے چند اصحاب میں تقسیم فرمایا، اس کا ایک حصہ احقر کے بھی سپرد ہوا، جس کا کچھ حصہ تو حضرت قدس سرہٗ کی حیات ہی میں آپ کی زیرِ نگرانی لکھا گیا، باقی حضرت کی وفات کے بعد بعونہٖ تعالیٰ پورا ہوگیا، اور دو جلدوں میں شائع بھی ہوچکا یہ مجموعہ عربی زبان میں ہے۔

اس سلسلے نے حضرتؒ کی برکت سے بحمد اللہ قرآن کریم کے ساتھ ایک خصوصی تعلق اور طلب پیدا کر دی، اس کے بعد قضاء و قدر سے زندگی میں ایک نئے انقلاب کا دروازہ کھلا، ۱۳۶۵ھ یعنی ۱۹۴۶ء میں پاکستان کی تحریک قوی ہو کر پورے ملک میں پھیلی، حضرت قدس سرہٗ کے سابقہ ایماء اور موجودہ اکابر کے ارشاد پر اس تحریک میں حصہ لیا، اور دو سال کے شب و روز اس جد وجہد میں صرف کئے، مدراس سے پشاور تک اور مغرب میں کراچی تک پورے ملک کے دورے کئے، یہی تحریک پاکستان

اور اس کی جد وجہد بالآخر دارالعلوم دیوبند سے استعفاء دینے پر منتہی ہوئی، اور آخر کار اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی یہ دیرینہ تمنا پوری فرمادی، کہ ہندوستان تقسیم ہوکر مسلمانوں کے لئے خالص اسلام کے نام پر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت پاکستان کے نام سے وجود میں آگئی۔

اسلامی سلطنت، اسلامی نظام، اسلامی قانون کی قدیم تمنائیں اب امید کی صورت میں تبدیل ہونے لگیں، اور اس کے ساتھ وطنِ مالوف کو ترک کرنے اور پاکستان کو وطن بنانے کی کشمکش دل میں موجزن ہوئی، وطن اصلی دیوبند کے علومِ اسلامیہ کا مرکز اور منتخب علماء امت کا مرجع ہونے پر نظر جاتی تو سعدی شیرازیؒ کا یہ شعر یاد آتا ؂

تولائے مردانِ ایں پاک بوم
برانگیختم خاطر از شام و روم

لیکن جب ملک کے سیاسی حالات اور ہندوستان میں مسلمانوں اور ان کے اداروں کے مستقبل پر نظر جاتی تو کوئی روشن پہلو سامنے نہ آتا، اس کے خلاف پاکستان میں ہر طرح کی صلاح و فلاح کی امید بظاہر اسباب نظر آتی تھی، ادھر یہ کشمکش جاری تھی اور دوسری طرف پورے ملک میں بدامنی اور قتل و غارت گری کے قیامت خیز ہنگامے کھڑے ہوگئے، ہندوستان میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کردیا گیا، لاکھوں انسانوں کو بجبر پاکستان کی طرف دھکیل دیا گیا، اور پھر جانے والوں کو عافیت کے ساتھ جانے کا موقع بھی نہ دیا گیا، جابجا قتلِ عام، خوں ریزی، لوٹ مار اور اغواء کے روح فرسا نظارے تھے، کسی کا صحیح سالم پاکستان پہنچ جانا ایک اعجوبہ یا کرامت سمجھا جاتا تھا، آٹھ ماہ کے بعد یہ ہنگامے کچھ فرو ہوئے تو میرے استاذ محترم اور پھوپھی زاد بھائی شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور چند عمائد کراچی نے یہ ارادہ کیا کہ پاکستان کے لئے اسلامی دستور کا ایک خاکہ مرتب کرکے حکومت کے سامنے رکھا جائے، تاکہ جس مقصد کے لئے پاکستان بنا ہے وہ جلد سے جلد بروئے کار آسکے، اس تجویز کے لئے منجملہ چند علماء کے احقر کو بھی ہندوستان سے کراچی آنے کی دعوت دی گئی۔

۲۰ جمادی الثانیہ ۱۳۶۷ھ یکم مئی ۱۹۴۸ء میری عمر میں عظیم انقلاب کا دن تھا جس میں وطنِ مالوف مرکزِ علوم دیوبند کو خیرباد کہہ کر صرف چھوٹے بچوں اور ان کی والدہ کو ساتھ لے کر پاکستان کا رُخ کیا، والدہ محترمہ اور اکثر اولاد اور سب عزیزوں اور گھر بار کو چھوڑنے کا دل گداز منظر اور جس طرف جارہا ہوں وہاں ایک غریب الوطن کی حیثیت سے وقت گذارنے کی مشکلات کے ساتھ ایک نئی اسلامی حکومت کا وجود اور اس میں دینی رجحانات کے بروئے کار آنے کی خوش کن امیدوں کے ملے جلے تصوّرات میں غلطاں و پیچاں۔

دہلی اور چند مقامات پر اُترتے ہوئے ۲۶ جمادی الثانیہ ۱۳۶۷ھ ۶ مئی ۱۹۴۸ء کو اللہ تعالیٰ

نے حدودِ پاکستان میں پہنچا دیا اور کراچی غیر اختیاری طور پر اپنا وطن بن گیا، یہاں آئے ہوئے اس وقت پندرہ سال پورے ہو کر تین ماہ زیادہ ہو رہے ہیں، اس پندرہ سال میں کیا کیا اور کیا دیکھا، اس کی سرگذشت بہت طویل ہے، یہ مقام اُس کے لکھنے کا نہیں، جن مقاصد کے لئے پاکستان محبوب و مطلوب تھا اور اس کے لئے سب کچھ قربان کیا تھا، حکومتوں کے انقلابات نے ان کی حیثیت ایک لذیذ خواب سے زیادہ باقی نہ چھوڑی ؎

بلبل ہمہ تن خوں شد و گُل شد ہمہ تن چاک
اے وائے بہارے اگر این ست بہارے

حکومت کے راستے سے کسی دینی انقلاب اور نمایاں اصلاح کی امیدیں خواب و خیال ہوتی جاتی ہیں، تاہم عام مسلمانوں میں دینی بیداری اور امورِ دین کا احساس بحمد اللہ ابھی تک سرمایۂ زندگی بنا ہوا ہے، ان میں اہلِ صلاح و تقویٰ کی بحمد اللہ خاصی تعداد موجود ہے، اسی احساس نے یہاں دینی خدمتوں کی راہیں کھولی ہوئی ہیں۔

حکومت کے پیمانے پر اصلاحی کوششوں کے علاوہ عوامی طرز سے اصلاحی جدوجہد اور اس کے لئے کچھ اداروں کا قیام جو شروع سے پیش نظر تھا اُس کی ابتدا ۱۳۷۰ھ، ۱۹۵۰ء میں اس طرح ہوئی کہ آرام باغ کراچی کے متصل مسجد باب الاسلام میں روزانہ بعد صبح درسِ قرآن شروع ہوا اور ہر طرف سے آنے والے سوالات کے جواب میں جو فتاویٰ مسلسل لکھے جاتے اور بغیر نقل کے روانہ کر دیے جاتے تھے، اب اس کا انتظام اسی مسجد میں ایک دار الافتاء کے قیام کی صورت میں عمل میں آیا، یہ درسِ قرآن اُمید سے زیادہ مفید و مؤثر ثابت ہوا، سننے والوں کی زندگی میں انقلاب کے آثار دیکھے گئے، احقر ناکارہ کو زندگی کا ایک اچھا مشغلہ مل گیا، بعد نماز فجر روزانہ ایک گھنٹہ کے عمل سے سات سال میں بحمد اللہ یہ درسِ قرآن مکمل ہو گیا۔

یہاں تک کی تمہید ماہ صفر ۱۳۸۳ھ میں اُس وقت لکھی گئی تھی جبکہ تفسیر معارف القرآن کو کتابی صورت میں لانے کا ارادہ ہوا تھا، پھر ۱۳۸۸ھ تک یہ سلسلہ ملتوی رہا، ۸۸ھ سے اس پر کام شروع ہوا جو ۱۳۹۲ھ تک پانچ سال میں بحمد اللہ مکمل ہو گیا، اس تمہید کا آگے آنے والا حصہ تکمیلِ تفسیر کے بعد ۱۳۹۲ھ میں لکھا گیا۔

تفسیر "معارف القرآن" کی تصنیف قدرتی اسباب سے

احقر ناکارہ گناہگار بے علم و بے عمل کی یہ جرأت کبھی بھی نہ ہوتی کہ قرآن کریم کی تفسیر لکھنے کا ارادہ کرتا مگر نیرنگِ تقدیر سے اس کے اسباب اس طرح شروع ہوئے کہ ریڈیو پاکستان سے روزانہ

نشر ہونے والے درس قرآن کے متعلق مجھ سے فرمائش کی گئی جس کو چند اعذار کی بناء پر میں قبول نہ کرسکا پھر انھوں نے ایک دوسری تجویز پیش کی کہ روزانہ درس کے سلسلہ سے الگ ایک ہفتہ واری درس بنام معارف القرآن جاری کیا جائے، جس میں پورے قرآن کی تفسیر پیش نظر نہ ہو بلکہ عام مسلمانوں کی موجودہ ضرورت کے پیش نظر خاص خاص آیات کا انتخاب کرکے اُن کی تفسیر اور متعلقہ احکام بیان ہوا کریں، احقر نے اس کو اس شرط کے ساتھ منظور کرلیا کہ درس کا کوئی معاوضہ نہ لوں گا اور کسی ایسی پابندی کو بھی قبول نہ کروں گا جو میرے نزدیک درسِ قرآن کے مناسب نہ ہو، یہ شرط منظور کرلی گئی۔

بنام خدا تعالیٰ یہ درس بنام معارف القرآن ۳ رشوال ۱۳۷۳ھ ۲ جولائی ۱۹۵۴ء سے شروع ہوا اور تقریباً گیارہ سال پابندی سے جاری رہا یہاں تک کہ جون ۱۹۶۴ء میں ریڈیو پاکستان کی اپنی نئی پالیسی کے تحت اس درس کو ختم کردیا گیا، یہ درس معارف القرآن تیرہویں پارے اور سورۂ ابراہیم پر ختم ہوگیا جس میں ان تیرہ پاروں کی مکمل تفسیر نہیں بلکہ منتخب آیات کی تفسیر تھی، احقر نے ایسی درمیانی آیات کو اس میں شامل نہیں کیا تھا جو خالص علمی مضامین پر مشتمل تھی اور ریڈیائی تقریر کے ذریعہ عوام کے ذہن نشین کرنا اس کا مشکل تھا، یا وہ آیات جو مکرر آسکر آتی ہیں۔

جس وقت یہ کام شروع کر رہا تھا اس کا کوئی دور دور خیال نہ تھا کہ یہ کسی وقت کتابی صورت میں ایک مستقل تفسیر کے انداز پر شائع ہوگی، مگر ہوا یہ کہ جب یہ درس نشر ہونا شروع ہوا تو پاکستان کے سب علاقوں سے اور ان سے زیادہ غیر ممالک افریقہ یورپ وغیرہ میں بسنے والے مسلمانوں کی طرف سے بے شمار خطوط ریڈیو پاکستان کو اور خود احقر کو وصول ہوئے جن سے معلوم ہوا کہ بہت سے دیندار اور نو تعلیم یافتہ مسلمان اس درس سے بہت شغف رکھتے ہیں، افریقہ میں چونکہ یہ درس آخر شب یا بالکل صبح صادق کے وقت پہونچتا تھا وہاں کے لوگوں نے اس کو ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ محفوظ کرکے بعد میں سب کو بار بار سنانے کا اہتمام کیا، اور جگہ جگہ سے اس کا تقاضا ہوا کہ اس درس کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے، عام مسلمانوں کے اس اشتیاق نے اس ناکارہ کی ہمت بڑھادی اور امراض و ضعف کے باوجود گیارہ سال تک یہ سلسلہ بڑی پابندی سے جاری رکھا، ۱۳۸۳ھ اور ۱۹۶۴ء میں جب درس کا سلسلہ بند ہوا تو بہت سے حضرات کی طرف سے یہ تقاضا ہوا کہ جتنا ہوچکا ہے اس کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے، اور درمیان میں جو آیات چھوڑی گئی ہیں ان کی بھی تکمیل کردی جائے، بنامِ خدا یہ ارادہ کرلیا کہ موجودہ پر نظر ثانی اور درمیان سے باقی ماندہ آیات کی تکمیل کا کام شروع کیا جائے، چنانچہ ۱۶ صفر ۱۳۸۳ھ میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر پر نظر ثانی مکمل ہوگئی، اور سورۂ بقرہ پر کام شروع کیا، اس میں احکام کی آیات مشکلہ بہت ہیں جو ریڈیو پر نشری تقریر میں نہیں آئی تھیں، یہ کام بہت محنت اور فرصت کا متقاضی تھا، ہجوم

مشاغل اور امراض نے فرصت نہ دی اور تقریباً یہ کام ذہول میں پڑ گیا۔

بہ نیرنگِ تقدیر ایک شدید و طویل بیماری تکمیلِ تفسیر کا سبب بن گئی

۱۳۸۸ھ کے شعبان میں احقر کے اسفل بدن میں کچھ پھوڑے کی شکل نمودار ہوئی، اور رفتہ رفتہ بڑھتی گئی، آخر رمضان میں اس نے کھڑے ہونے سے معذور کر دیا، آخری آٹھ روزے بھی قضا ہوئے، گھر میں بیٹھ کر نماز ہونے لگی، اس کے ساتھ پاؤں میں نقرس کا پرانا درد شروع ہوا، اس کا جو علاج پہلے کارگر ہوجاتا تھا وہ بھی کامیاب نہ ہوا اور دونوں پاؤں سے معذور ہوگیا، تقریباً دس مہینے اسی طرح معذوری و بیماری کے ساتھ موت و حیات کی کشمکش میں گذرے، جب چلنے پھرنے اور ہر کام سے معذور ہوگیا، زندگی کی امید بھی مضمحل ہوگئی تو اب اس پر افسوس ہوا کہ یہ تفسیری اوراق جس قدر ہو چکے تھے اُن پر نظر ثانی اور تکمیل بھی نہ ہو سکی' اب یہ اوراق یونہی ضائع ہو جائیں گے، حق تعالیٰ نے قلب میں ہمت عطا فرمائی، اور شوال ۱۳۸۸ھ کے آخر میں بستر علالت پر ہی اللہ تعالیٰ نے اس کام کو شروع کرا دیا، اور ۲۵ ذیقعدہ ۱۳۸۸ھ کو سورۂ بقرہ کی تکمیل ہو کر کتابت و طباعت کے لئے دیدی، اس کے بعد سے عین بیماری و معذوری کی حالت میں یہ کام تدریجی رفتار سے چلتا رہا، اللہ تعالیٰ نے اس کی برکت سے دس ماہ کے بعد معذوری بھی رفع فرما دی تو رجب ۱۳۸۹ھ سے کام کسی قدر تیز ہوا، مگر اسی کے ساتھ ملک میں جدید انتخابات نے سیاسی ہنگاموں کا ایک طوفان کھڑا کر دیا، میں اگرچہ عرصۂ دراز سے سیاست سے بالکل یکسو ہو چکا تھا، مگر ان انتخابات نے پاکستان میں خالص اسلامی حکومت کے بجائے کمیونزم اور سوشل ازم پھیل جانے کے خطرات قوی کر دیئے، اور سوشل ازم کو عین اسلام باور کرانے کے لئے جدّ وجہد اور جلسے وجلوس عام ہوگئے، اس مسئلے کی نزاکت نے پھر اس پر آمادہ کر دیا کہ کم از کم اسلام اور سوشل ازم میں فرق اور سوشلزم کے خطرناک نتائج سے قوم کو آگاہ کرنے کی حد تک اس سیاسی میدان میں حصہ لیا جائے، اس کے لئے تحریری مقالے بھی لکھنے پڑے، اور مشرقی و مغربی پاکستان کے اہم مواقع میں جلسوں میں شرکت بھی کرنا پڑی؛ مسئلہ کی وضاحت تو مقدور بھر پوری ہوگئی، مگر سیاست کے میدان میں مسائل اور حقائق سے زیادہ زر و زور کام کرتے ہیں انتخابات کا نتیجہ بالکل خلاف اور برعکس نکلا، اس کے اثر سے پاکستان پر جو زوال آنا تھا وہ آ گیا، وَلِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ۔

انتخابات کے بعد احقر نے پھر سیاست سے مستعفی ہو کر اپنا یہ کام شروع کیا، اور الحمد للہ علیٰ کرمہ کہ رجب ۱۳۹۰ھ تک تیرہ ۱۳ پاروں کی معارف القرآن پر نظر ثانی اور درمیانی متروکہ آیات کی تفسیر بھی مکمل ہوگئی، اور سورۂ ابراہیم سے سورۂ نحل تک دو پاروں کی مزید تفسیر بھی لکھی گئی، اب قرآن مجید نصف کے قریب ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے ہمت عطا فرمائی، اور باقی ماندہ قرآن

کی تفسیر لکھنا شروع کیا، اس کا اس وقت کوئی تصور نہیں تھا کہ چھہتر سال کی عمر اور سقوطِ قویٰ، اس کے ساتھ مختلف قسم کے امراض کے تسلسل میں یہ تفسیر پوری ہوسکے گی، مگر یہ سمجھ کر کہ قرآن کو ختم کرنا مقصود نہیں قرآن میں اپنی عمر کو ختم کرنا ہے، اللہ کے نام پر یہ سلسلہ شروع کردیا، شعبان ۱۳۹۰ھ سے سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر شروع ہوئی، اور ۲۳ صفر ۱۳۹۱ھ کو قرآن کی چوتھی منزل سورۂ فرقان پارہ ۱۹ تک مکمل ہوگئی۔

آگے قرآن کی تین منزلیں یعنی تقریباً ایک تہائی قرآن کریم باقی تھا، عمر کے ضعف اور مختلف قسم کے امراض کی بنا پر یہ خیال آیا کہ اس سب کی تکمیل تو شاید مجھ سے نہ ہوسکے، مگر درمیانی پانچویں اور چھٹی منزل کی تفسیر احقر نے احکام القرآن میں بزبان عربی لکھدی ہے جو شائع بھی ہوچکی ہے، اگر میں اس کو نہ لکھ سکا تو میرے بعد بھی کوئی اللہ کا بندہ اسی احکام القرآن کی تفسیر کو اردو میں منتقل کرکے یہ حصہ پورا کردے گا، اور اس کی وصیت بھی چند حضرات کو کردی، اور درمیان کی یہ دو منزلیں چھوڑ کر آخری ساتویں منزل سورۂ قٓ سے لکھنا شروع کردیا، حق تعالیٰ کی مدد نے دستگیری فرمائی اور ۱۲ ربیع الاوّل ۱۳۹۱ھ سے شروع ہوکر شوال ۱۳۹۱ھ تک یہ آخری منزل پوری ہوگئی، صرف معوّذتین یعنی آخر کی دو سورتیں چھوڑ دی گئیں۔

اب درمیانی دو منزلیں سورۂ شعرا سے سورۂ حجرات تک باقی تھیں اللہ کے نام پر ان کو بھی شروع کردیا، ان میں سورۂ صٓ، صافات، زخرف تو برخوردار عزیزی مولوی محمد تقی سلمہ سے لکھوائی اور خود اس پر نظر ثانی کرکے مکمل کیا، باقی سورتیں خود لکھنا شروع کیں، اور قرآن مجید کا تقریباً ڈیڑھ پارہ باقی رہ گیا تھا کہ ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ ۸ جون ۱۹۷۲ء کو اچانک مجھے قلب کا ایک شدید مرض پیش آیا، کہ موت کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا، دیکھنے والے تھوڑی دیر کا مہمان سمجھتے تھے، کراچی میں امراضِ قلب کے ہسپتال میں غیر شعوری طور پر پہنچا دیا گیا، تین روز کے بعد ڈاکٹروں نے کچھ اطمینان کا اظہار کیا، جب کچھ ہوش و حواس درست ہوئے تو باقی ماندہ تفسیر کا خیال ایک حسرت بن کر رہ گیا، برخوردار عزیزی مولوی محمد تقی سلمہ کو وصیت کردی کہ بقیہ کی تکمیل وہ کردیں، اس طرح قلب کا کچھ بوجھ ہلکا کیا، اللہ تعالیٰ کا ہزاراں ہزار شکر کہ اس نے اس مرض سے صحت بھی عطا فرمائی، اور تین مہینے کے بعد اتنی طاقت تھی کہ کچھ لکھنے پڑھنے کی ہمت ہونے لگی، مگر تھوڑی دیر کام کرنے سے دماغ، دل و نگاہ سب تھک جاتے تھے، محض حق تعالیٰ کا فضل و کرم ہی تھا کہ اس نے اسی حالت میں یہ بقیہ تفسیر ۲۱ شعبان ۱۳۹۲ھ روز شنبہ کو مکمل کرادی اور حسنِ اتفاق سے یہی روز ۱۳۱۴ھ میں میری ولادت کا دن تھا، اس روز میری عمر کی ستتّر منزلیں پوری ہوکر اٹھتّرواں سال شروع ہوا۔

اس تفسیر کا آغاز سنہ ۱۳۸۳ھ کی شدید بیماری میں ہوا اور خاتمہ پانچ سال کے بعد سنہ ۱۳۹۲ھ کی شدید بیماری کے متصل بعد ہوا، یہ پانچ سال آخر عمر کے طبعی ضعف، مختلف قسم کے امراض کے تسلسل افکار کے ہجوم اور ملک میں انقلابی ہنگاموں کے سال تھے، انہی میں حق تعالیٰ نے اس تفسیر کے تقریباً سات[۱] ہزار صفحات اس ناکارہ کے قلم سے لکھوا دیئے، اور یہ بات آنکھوں سے دکھلا دی کہ

ان المقادیر اذا ساعدت الحقت العاجز بالقادر

"یعنی جب تقدیر الٰہی مدد کرتی ہے تو عاجز کو قادر کے ساتھ ملا دیتی ہے"

علم و عمل پہلے ہی برائے نام تھا، اس ضعف و پیری اور امراض و مشاغل و ذواہل نے وہ رہا سہا بھی رخصت کر دیا، ان حالات میں کسی تصنیف خصوصاً قرآن کریم کی تفسیر کا ارادہ کرنا بھی ایک بڑی جسارت تھی، اطمینان اس پر تھا کہ اس میں میری اپنی کوئی چیز نہیں، اکابر علماء اور سلف صالحین کی تفسیر کو آسان زبان میں اہل عصر کی طبائع کے قریب بنانا میری ساری محنت کا حاصل تھا، میں نے آخر عمر کے پانچ سال کی یہ محنت شاقہ اس تمنا میں صرف کی کہ عصر جدید کے مسلمان جو عموماً علمی اصطلاحات اور علمی زبان سے بیگانے ہو چکے ہیں اکابر کی تفسیر کو ان کے لئے اقرب الی الفہم کر دوں تو شاید اس زمانے کے مسلمانوں کو اس سے نفع پہونچے، اور میرے لئے زادِ آخرت بن جائے، علما محققین اپنی علمی تحقیقات کے کمالات دکھلاتے ہیں اس ناکارہ نے اپنی بے علمی کو اس پردہ میں چھپایا ہے، اللہ تعالیٰ مجھ سے اپنی ستاری کا معاملہ فرما دیں، اور اس ناچیز کی خدمت کو قبول فرما دیں، جس میں کسی علمی کمال کا تو کوئی دخل نہیں، البتہ اپنے آپ کو تھکایا ضرور ہے، اور یہ تھکانا بھی اللہ ہی کی توفیق سے تھا، ورنہ ایک قدم چلنے کی بھی کیا مجال تھی، کاش! اللہ تعالیٰ میرے اس تھکنے پر نظر فرمائیں اور میری تقصیرات کو جو اس کی کتاب کریم کے حقوق ادا کرنے میں ہوئی ہیں معاف فرما کر اس کو شرفِ قبولیت عطا فرما دیں ؎

نہ بحرف ساختہ سرخوشم ✻ نہ بہ نقش بستہ مشوشم

نفسے بیادِ تو مے زنم ✻ چہ عبارت و چہ معانیم

---

[۱] یہ بھی اس حال میں کہ دارالعلوم کی انتظامی ذمہ داریوں اور فتوے کی مستقل خدمات کے علاوہ دوسرے اہم موضوعات پر دس مختصر اور مفصل کتابیں اور بھی لکھی گئیں جو شائع ہو چکی ہیں؛ (۱) احکام الحج، جو مختصر اور سلیس ہونے کے ساتھ تمام ضروری احکام کو جامع بھی ہے (۲) الیواقیت فی احکام المواقیت (مواقیتِ حج اور جدہ سے احرام کی تحقیق) (۳) منیح الخیر فی الحج عن الغیر (یعنی حجِ بدل کے احکام) (۴) مقامِ صحابہؓ (مشاجرات صحابہ اور عدالتِ صحابہ کی مکمل بحث اور سلفِ صالحین کا طرزِ عمل (۵) اسلامی ذبیحہ (ذبیحہ کے شرعی احکام مفصل (یہود و نصاریٰ کے ذبیحہ کی بحث، تحریفات کی تردید) (٦) اعضاءِ انسانی کی پیوندکاری، (۷) بیمۂ زندگی (۸) پراویڈنٹ فنڈ (۹) اسلام اور سوشلزم (۱۰) اسلامی نظام میں اقتصادی اصلاحات، فللہ الحمد والمنہ ۱۲ منہ

تصنیفِ کتاب کی یہ لمبی کہانی احقر کے لئے تو ایک یادداشت اور شکر گذاری کے لئے ایک تذکرہ ہی مگر عام لوگوں کے ذوق کی چیز نہیں، اس کے باوجود اس لئے لکھا کہ لوگوں کو میری اس جسارت کا عذر معلوم ہو جائے۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ تفسیرِ قرآن پر مستقل تصنیف کے لئے جرأت کرنے کا میرے لئے دور دور بھی کوئی احتمال نہ تھا، مگر غیر ارادی طور پر اس کے اسباب ہوتے چلے گئے، البتہ زمانۂ دراز سے ایک تمنا دل میں تھی کہ حکیم الامت مجدد الملت سیدی حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کی تفسیر بیان القرآن جو ایک بے نظیر، مختصر مگر جامع تفسیر اور سلف صالحین کی تفسیر ول کا لُبِّ لُباب ہی، لیکن وہ علمی زبان اور علمی اصطلاحات میں لکھی گئی ہے آجکل کے عوام اس سے استفادہ کرنے سے قاصر ہو گئے ہیں اس کے مضامین کو سہل زبان میں پیش کر دیا جائے، مگر یہ کام بھی کافی محنت اور فرصت چاہتا تھا، پاکستان میں آنے سے پہلے کچھ شروع بھی کیا پھر رہ گیا تھا، معارف القرآن کی اس تحریر نے بحمد اللہ وہ آرزو بھی پوری کر دی، کیونکہ اس تفسیر کی بنیاد احقر نے بیان القرآن ہی کو بنایا ہے جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

معارف القرآن کی خصوصیات والتزامات

(۱) تفسیر قرآن جو عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں ہو اس میں سب سے اہم اور احتیاط کی چیز قرآن کا ترجمہ ہے، کیونکہ وہ اللہ کے کلام کی حکایت ہی، اس میں ادنیٰ سی کمی بیشی بھی اپنی طرف سے روا نہیں، اس لئے میں نے خود کوئی ترجمہ لکھنے کی ہمت نہیں کی، اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی، کیونکہ اکابر علماء یہ کام بڑی احتیاط کے ساتھ انجام دے چکے ہیں، اردو زبان میں اس خدمت کو سب سے پہلے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رح کے دو فرزند ارجمند حضرت شاہ رفیع الدین رح اور حضرت شاہ عبدالقادر رح نے اپنے اپنے طرز میں انجام دیا، اوّل الذکر ترجمہ میں بالکل تحت اللفظ ترجمہ کو اختیار کیا گیا ہی، اردو محاورہ کی بھی زیادہ رعایت نہیں رکھی گئی، اور بڑے کمال کے ساتھ قرآن کے الفاظ کو اردو میں منتقل فرمایا ہے، اور دوسرے ترجمہ میں تحت اللفظ کے ساتھ اردو محاورہ کی رعایت بھی ہے، جس کو حضرت شاہ عبدالقادر رح نے چالیس سال مسجد میں معتکف رہ کر پورا کیا ہی، یہاں تک کہ آپ کا جنازہ مسجد ہی سے نکلا ہے، دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رح کا فرمانا ہے کہ بلاشبہ یہ ترجمہ الہامی ہے، انسان کے بس کی بات نہیں کہ ایسا ترجمہ کر سکے، شیخ العرب والعجم سیدی حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رح نے اپنے وقت میں جب یہ دیکھا کہ اب بہت سے محاورات بدل جانے کی وجہ سے بعض مقامات میں

ترمیم کی ضرورت ہو تو انھوں نے اسی ترجمہ کی یہ خدمت انجام دی، جو ترجمہ شیخ الہندؒ کے نام سے معروف و مشہور ہوا، احقر نے قرآن کریم کے زیر متن اسی ترجمہ کو بعینہٖ لیا ہے۔

(۲) سیدی حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ نے اصل تفسیر بیان القرآن کو اس انداز میں لکھا ہے کہ متنِ قرآن کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ ہی اس کی تفسیر و توضیح قوسین کے درمیان فرمائی ہے، ترجمہ کو اس کے اوپر خط دے کر اور تفسیر کو بین القوسین لکھ کر ممتاز کر دیا ہے، اس طرح خط کشیدہ الفاظ میں ترجمۂ قرآن ہے، اور بین القوسین اس کی تفسیر ہے، بہت سے لوگوں نے اسی خط کشیدہ ترجمہ کو الگ کر کے قرآن مجید کے زیر متن ترجمہ حکیم الامتؒ کے نام سے خود حضرتؒ کے زمانے میں شائع بھی کر دیا تھا۔

مجھے چونکہ بیان القرآن کی تسہیل کا کام پہلے سے پیش نظر تھا اس وقت احقر نے حضرتؒ کی اس تفسیر کو بنام "خلاصۂ تفسیر" شروع میں بعینہٖ صرف ایک تصرّف کے ساتھ نقل کر دیا ہے، وہ یہ کہ اس تفسیر میں جس جگہ خاص اصطلاحی اور مشکل الفاظ آئے تھے وہاں ان کو آسان لفظوں میں منتقل کر دیا، اور اس کا نام خلاصۂ تفسیر رکھنا اس لئے موزوں ہوا کہ خود حضرتؒ نے خطبہ بیان القرآن میں اس کے متعلق فرمایا ہے کہ اس کو تفسیر مختصر یا ترجمہ مطوّل کہا جا سکتا ہے۔

اور اگر کوئی مضمون ہی خالص علمی اور مشکل تھا تو اس کو یہاں سے الگ کر کے معارف و مسائل میں اپنی آسان عبارت میں لکھ دیا، تاکہ مشغول آدمی اگر زیادہ نہ دیکھ سکے تو اس خلاصۂ تفسیر سے ہی کم از کم مفہوم قرآنی کو پورا سمجھ لے، ان دونوں چیزوں کا التزام جلد اوّل کی طبع اوّل میں پارۂ الۗمّۗ کے رُبع اوّل آیت نمبر ۴۴ معارف جلد اوّل صفحہ ۱۵۶ تک نہیں ہو سکا تھا، اب طبع ثانی میں اس حصّہ کو بھی مکمل کر کے پوری تفسیر کے مطابق کر دیا گیا ہے، البتہ ایک التزام جو جلد ثانی سے شروع ہوا کہ متنِ قرآن کے نیچے ترجمہ شیخ الہندؒ لکھا جائے یہ پہلی طباعت کی پوری جلد اوّل میں نہیں تھا، طبع ثانی میں اس کو بھی تحت المتن لکھ کر سب کے مطابق کر دیا گیا، یہ دونوں کام تو اکابر علماء کے تھے۔

(۳) تیسرا کام جو احقر کی طرف منسوب ہو وہ "معارف و مسائل" کا عنوان ہو، اس میں بھی غور کیا جائے تو احقر کی صرف اردو عبارت ہی ہے، مضامین سب علماء سلف کی تفسیر سے لئے ہوئے ہیں جن کے حوالے ہر جگہ لکھ دیئے ہیں، اس میں احقر نے چند چیزوں کا التزام کیا ہے:

(ا) علماء کے لئے تفسیر قرآن میں سب سے پہلا اور اہم کام لغات کی تحقیق، نحوی ترکیب، فنِ بلاغت کے نکات اور اختلافِ قراءت کی بحثیں ہیں جو بلاشبہ اہلِ علم کے لئے فہمِ قرآن میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اسی کے ذریعہ قرآن کے صحیح مفہوم کو پایا جا سکتا ہے

لیکن عوام تو عوام ہیں آجکل کے بہت سے اہل علم بھی ان تفصیلات میں اُلجھن محسوس کرتے ہیں، بالخصوص عوام کے لئے تو یہ بحثیں ان کی فہم سے بالا اور اصل مقصد میں مخل بنتی ہیں، وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ قرآن کو سمجھ کر پڑھنا مشکل کام ہے، حالانکہ قرآن کریم کا جو اصل مقصد ہے کہ انسان کا تعلق اپنے رب کے ساتھ قوی ہو اور اس کے نتیجے میں مادّی تعلقات اعتدال پر آجائیں کہ وہ دین کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں، دنیا سے زیادہ آخرت کی فکر پیدا ہو، اور انسان اپنے ہر قول و فعل پر یہ سوچنے کا عادی ہو جائے کہ اس میں کوئی چیز اللہ اور اس کے رسول کی مرضی کے خلاف تو نہیں، اس چیز کو قرآن نے اتنا آسان کر دیا ہے کہ معمولی لکھا پڑھا آدمی خود دیکھ کر اور بالکل اَن پڑھ جاہل سُن کر بھی یہ فائدہ حاصل کر سکتا ہے، قرآن کریم نے خود اس کا اعلان فرمادیا ہے وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۵۴: ۱۷)

تفسیر "معارف القرآن" میں عوام کی سہولت کے پیشِ نظر اُن علمی اور اصطلاحی بحثوں کی تفصیل نہیں لکھی گئی، بلکہ ائمہ تفسیر کے اقوال میں جس کو جمہور نے راجح قرار دیا ہے اس کے مطابق تفسیر لے لی گئی اور کہیں کہیں بضرورت یہ بحث بھی لی گئی ہے تو وہاں بھی اس کا لحاظ رکھا گیا کہ خالص علمی اصطلاحات اور غیر معروف اور مشکل الفاظ نہ آئیں، اور اسی لئے ایسی مباحثِ علمیہ کو بھی چھوڑ دیا گیا ہے جو عوام کے لئے غیر ضروری اور ان کی سطح سے بلند ہیں۔

(ب) مستند و معتبر تفاسیر سے ایسے مضامین کو اہمیت کے ساتھ نقل کیا گیا ہے جو انسان کے دل میں قرآن کی عظمت اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی عظمت و محبت کو بڑھائیں، اور قرآن پر عمل اور اپنے اعمال کی اصلاح کی طرف مائل کریں۔

(ج) اس پر تو مؤمن کا ایمان ہے کہ قرآن کریم قیامت تک آنے والی نسلوں کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے، اور قیامت تک پیدا ہونے والے تمام مسائل کا حل اس میں موجود ہے، بشرطیکہ قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان و تشریح کی روشنی میں دیکھا اور پڑھا جائے، اور اس میں پورے تدبّر سے کام لیا جائے، اسی لئے ہر زمانہ کے علماءِ تفسیر نے اپنی اپنی تفسیروں میں اُن جدید مسائل اور مباحث پر زیادہ زور دیا ہے جو اُن کے زمانہ میں پیدا ہوئے، یا ملحدین اہلِ باطل کی طرف سے شکوک و شبہات کی صورت میں پیدا کر دیئے گئے، اسی لئے قرونِ متوسطہ کی تفسیریں معتزلہ، جہمیہ، صفوانیہ وغیرہ فرقوں کی تردید اور ان کے شبہات کے ازالہ سے پُر نظر آتی ہیں، احقر ناکارہ نے بھی اسی اصول کے تحت ایسے ہی مسائل اور مباحث کو اہمیت دی ہے جو یا تو اس زمانے کے مشینی دَور نے نئے نئے پیدا کر دیئے، اور یا اس زمانہ کے ملحدین اور یہودی اور نصرانی مستشرقین نے مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لئے کھڑے کر دیئے، جدید مسائل کے حل کے لئے مقدور بھر اس کی کوشش کی ہے

کہ قرآن وسنت یا فقہاء امت کے اقوال میں اس کا کوئی ثبوت ملے یا کم از کم اس کی کوئی نظیر ملے، اور الحمدللہ اس میں کامیابی ہوئی، ایسے مسائل میں دوسرے علمائے عصر سے مشورہ لینے کا بھی التزام کیا گیا ہے اور ملحدانہ شکوک وشبہات کے ازالہ میں بھی مقدور بھر اس کی کوشش رہی ہے کہ جواب اطمینان بخش ہو، اور اس جواب دہی کے لئے اسلامی مسائل میں ادنیٰ ترمیم کو گوارا نہیں کیا جیسا کہ دورِ حاضر کے بعض مصنفین نے اس جواب دہی میں خود اسلامی مسائل میں تاویلیں کرکے ترمیم کرڈالنے کا طریقہ اختیار کیا ہے، یہ سب کچھ اپنی معلومات اور اپنی کوشش کی حد تک ہے، جس میں بہت سی خطاؤں اور لغزشوں کا احتمال ہے، اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں، اور ان کی اصلاح کا راستہ نکال دیں۔

مذکورالصدر التزامات نے تفسیر معارف القرآن کو مندرجہ ذیل چیزوں کا جامع بنادیا ہے:-

(۱) قرآن مجید کے دو مستند ترجمے ایک حضرت شیخ الہندؒ کا جو دراصل شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا ترجمہ ہے دوسرا حضرت حکیم الامت تھانویؒ کا ترجمہ۔

(۲) خلاصۂ تفسیر، جو درحقیقت بیان القرآن کا خلاصہ مع تسہیل ہے جس کو علیحدہ بھی قرآن مجید کے حاشیہ پر طبع کرلیا جائے تو تھوڑی فرصت والوں کے لئے فہم قرآن کا مستند اور بہترین ذریعہ ہے، اس نے ایک اور ضرورت کو پورا کردیا جس کی طرف مجھے اخی فی اللہ مولانا بدر عالم صاحب مہاجر مدینہ منورہ نے علامہ فرید وجدیؒ کی ایک مختصر تفسیر حاشیہ قرآن پر دکھلا کر توجہ دلائی تھی کہ کاش اردو میں بھی کوئی ایسی تفسیر ہوتی جو اس کی طرح مختصر اور آسان ہو، اللہ تعالیٰ نے اس سے یہ آرزو بھی پوری فرمادی، یہ دونوں چیزیں تو اکابر علماء کی مستند اور معروف ہیں۔

(۳) تیسری چیز معارف ومسائل ہیں جو میری طرف منسوب ہیں، اور میری محنت کا محور ہیں، الحمدللہ کہ اس میں بھی میرا اپنا کچھ نہیں، سب اسلافِ اُمّت ہی سے لیا ہوا ہے، آجکل کے اہلِ علم واہلِ قلم اکثر اس فکر میں رہتے ہیں کہ اپنی کوئی تحقیق اور اپنی طرف سے کوئی نئی چیز پیش کریں، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکرگذار ہوں کہ اس سب کام میں میرا اپنا کچھ نہیں ؎

این ہمہ گفتیم ولیک اندر بسیچ ॥ بے عنایاتِ خدا ہیچیم ہیچ

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اسئل الصّواب والسّداد فی المبدء والمعاد وبہ استعین من زلۃ القدم فیما علمت وما لا اعلم وایاہ اسئل ان یجعلہ خالصًا لوجہہ الکریم وان یتقبلہ منی کما تقبل من صالحی عبادہ وان ینفعنی بہ یوم لا ینفع مال ولا بنون ولہ الحمد اوّلًا وآخرًا وظاہرًا وباطنًا وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ وصفوۃ رسلہ خاتم انبیائہ وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین وبارک وسلّم تسلیمًا کثیرًا۔

بندۂ ضعیف ناکارہ محمد شفیع خادم دارالعلوم کراچی

۲۵ر شعبان ۱۳۹۲ھ

سُوْرَۃُ الفَاتِحَہ

یہ مکّی سورت ہے جس میں سات آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سورۂ فاتحہ کے فضائل اور خصوصیات

سورۂ فاتحہ کو قرآن کریم میں بہت سی خصوصیات حاصل ہیں، اوّل یہ کہ قرآن اسی سے شروع ہوتا ہے، نماز اسی سے شروع ہوتی ہے، اور نزول کے اعتبار سے بھی سب سے پہلی سورت جو مکمل طور پر نازل ہوئی یہی سورت ہے، سورۂ اقرأ، مزمل اور مدثر کی چند آیات ضرور اس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں، مگر مکمل سورت سب سے پہلے فاتحہ ہی نازل ہوئی ہے، جن حضرات صحابہؓ سے سورۂ فاتحہ کا اوّل ما نزل یعنی نزول میں سب سے پہلی سورۃ ہونا منقول ہے، اُن کا مطلب غالباً یہی ہے کہ پوری سورت اس سے پہلے اور کوئی نازل نہیں ہوئی، شاید اسی وجہ سے اس سورت کا نام بھی فاتحۃ الکتاب رکھا گیا ہے ۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ سورت ایک حیثیت سے پورے قرآن کا متن اور سارا قرآن اس کی شرح ہے، خواہ اس وجہ سے کہ پورے قرآن کے مقاصد ایمان اور عمل صالح میں دائر ہیں، اور ان دونوں چیزوں کے بنیادی اصول اس سورت میں بیان کر دیئے گئے ہیں، تفسیر روح المعانی اور روح البیان، میں اس کا تفصیلی بیان ہے، اسی وجہ سے سورۂ فاتحہ کے نام امّ القرآن، امّ الکتاب اور قرآن عظیم بھی احادیثِ صحیحہ میں آئے ہیں ۔ (قرطبی)

یا اس وجہ سے کہ اس سورت میں اس شخص کے لئے جو قرآن کی تلاوت، یا مطالعہ شروع کرے ایک خاص ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اس کتاب کو اپنے تمام پچھلے خیالات اور نظریات سے خالی الذہن ہو کر

خاص طلبِ حق اور راہِ راست کی جستجو کے لئے پڑھے اور دیکھے، اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا بھی کرے کہ صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا ہو، اور شروع سورت میں اُس ذات کی حمد و ثنار کا بیان ہے جس کی بارگاہ میں یہ درخواستِ ہدایت پیش کرتا ہے، اور اسی درخواست کا جواب پورا قرآن ہے، جو الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ سے شروع ہوتا ہے، گویا انسان نے جو اللہ تعالیٰ سے راہِ راست طلب کی تھی اس کے جواب میں ذلک الکتاب فرما کر اشارہ کر دیا گیا کہ جو تم مانگتے ہو وہ اس کتاب میں موجود ہے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ سورۂ فاتحہ کی نظیر نہ تورات میں نازل ہوئی نہ انجیل اور زبور میں اور نہ خود قرآن کریم میں کوئی دوسری سورت اس کی مثل ہے (رواہ الترمذی عن ابی ہریرۃؓ وقال حسن صحیح والحاکم وقال صحیح علیٰ شرط مسلم، من المظہری)

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورۂ فاتحہ ہر بیماری کی شفار ہے (رواہ البیہقی فی شعب الایمان بسند صحیح، مظہری)

سورۂ فاتحہ کا ایک نام حدیث میں سورۂ شفار بھی آیا ہے (قرطبی) اور صحیح بخاری میں بروایت انسؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن کریم کی سب سورتوں میں عظیم ترین الحمد للہ رب العالمین ہے۔ (قرطبی)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

بسم اللہ قرآن کی ایک آیت ہے

اس پر تمام اہلِ اسلام کا اتفاق ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم قرآن میں سورۂ نمل کا جزء ہے اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ سوائے سورۂ توبہ کے ہر سورت کے شروع میں بسم اللہ لکھی جاتی ہے، اس میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا یا تمام سورتوں کا جُزء ہے یا نہیں؟ امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ بسم اللہ بجز سورۂ نمل کے اور کسی سورت کا جزء نہیں، بلکہ ایک مستقل آیت ہے، جو ہر سورۃ کے شروع میں دو سورتوں کے درمیان فصل اور امتیاز ظاہر کرنے کے لئے نازل ہوئی ہے۔

تلاوتِ قرآن اور ہر مہم کام کو بسم اللہ سے شروع کرنے کا حکم

اہلِ جاہلیت کی عادت تھی کہ اپنے کاموں کو بتوں کے نام سے شروع کیا کرتے تھے، اس رسمِ جاہلیت کو مٹانے کے لئے قرآن کی سب سے پہلی آیت جو جبرئیل امین لے کر آئے اس میں قرآن کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کا حکم دیا گیا، اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ۔

علامہ سیوطیؒ نے فرمایا کہ قرآن کے سوا دوسری تمام آسمانی کتابیں بھی بسم اللہ سے شروع کی گئی ہیں،

اور بعض علماء نے فرمایا ہے کہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ قرآن اور امّتِ محمدیہ کی خصوصیات میں سے ہے، دونوں قول کی تطبیق یہ ہے کہ اللہ کے نام سے شروع کرنا تو تمام آسمانی کتابوں میں مشترک ہے، مگر الفاظ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ قرآن کی خصوصیت ہے، جیساکہ بعض روایات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ابتدا رمیں ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کے لئے بِاسۡمِكَ اللّٰهُمَّ کہتے اور لکھتے تھے، جب آیت بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نازل ہوئی تو انھیں الفاظ کو اختیار فرما لیا، اور ہمیشہ کے لئے یہ سنت جاری ہوگئی (قرطبی روح المعانی)

قرآن کریم میں جا بجا اس کی ہدایت ہے کہ ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کیا جائے، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مہم کام جو بِسۡمِ اللّٰہِ سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت رہتا ہے۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ گھر کا دروازہ بند کرو تو بِسۡمِ اللّٰہِ کہو، چراغ گُل کرو تو بِسۡمِ اللّٰہِ کہو، برتن ڈھکو تو بِسۡمِ اللّٰہِ کہو، کھانا کھانے، پانی پینے، وضو کرنے، سواری پر سوار ہونے اور اُترنے کے وقت بِسۡمِ اللّٰہِ پڑھنے کی ہدایات قرآن وحدیث میں بار بار آئی ہیں (قرطبی)

ہر کام کو بسم اللہ سے شروع کرنے کی حکمت

اسلام نے ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کی ہدایت دے کر انسان کی پوری زندگی کا رُخ اللہ تعالیٰ کی طرف اس طرح پھیر دیا ہے کہ وہ قدم قدم پر اس حلف وفاداری کی تجدید کرتا ہے، کہ میرا وجود اور میرا کوئی کام بغیر اللہ تعالیٰ کی مشیّت وارادے اور اس کی امداد کے نہیں ہو سکتا، جس نے اس کی ہر نقل وحرکت اور تمام معاشی اور دنیوی کاموں کو بھی ایک عبادت بنا دیا۔

عمل کتنا مختصر ہے کہ نہ اس میں کوئی وقت خرچ ہوتا ہے نہ محنت، اور فائدہ کتنا کیمیادی اور بڑا ہے کہ دنیا بھی دین بن گئی، ایک کافر بھی کھاتا پیتا ہے اور ایک مسلمان بھی، مگر مسلمان اپنے لقمے سے پہلے بسم اللہ کہہ کر یہ اقرار کرتا ہے کہ یہ لقمہ زمین سے، پیدا ہونے سے لیکر پک کر تیار ہونے تک آسمان و زمین اور سیاروں اور ہوا و فضائی مخلوقات کی طاقتیں، پھر لاکھوں انسانوں کی محنت صَرف ہو کر تیار ہوا ہے، اس کا حاصل کرنا میرے بس میں نہ تھا، اللہ ہی کی ذات ہے جس نے ان تمام مراحل سے گذار کر یہ لقمہ یا گھونٹ مجھے عطا فرمایا ہے، مومن و کافر دونوں سوتے جاگتے بھی ہیں، چلتے پھرتے بھی ہیں، مگر ہر مومن سونے سے پہلے اور بیدار ہونے کے وقت اللہ کا نام لے کر اللہ کے ساتھ اسی طرح اپنے رابطے کی تجدید کرتا ہے جس سے یہ تمام دنیاوی اور معاشی ضرورتیں ذکرِ خدا بنکر عبادت میں لکھی جاتی ہیں، مومن سواری پر سوار ہوتے ہوئے بسم اللہ کہہ کر گویا یہ شہادت دیتا ہے کہ اس سواری کا پیدا کرنا یا مہیا کرنا پھر اس کو میرے قبضے میں دیدینا انسان کی قدرت سے باہر چیز ہے، رب العزت ہی کے بناتے ہوئے نظامِ محکم کا کام ہے کہ کہیں کی لکڑی، کہیں کا لوہا، کہیں کی مختلف دھاتیں، کہیں کے کاریگر، کہیں کے چلانے والے سب کے سب

میری خدمت میں لگے ہوئے ہیں، چند پیسے خرچ کرنے سے اتنی بڑی خلق خدا کی محنت کو ہم اپنے کام میں لا سکتے ہیں، اور وہ پیسے بھی ہم اپنے ساتھ کہیں سے نہیں لائے تھے، بلکہ اس کے حاصل کرنے کے تمام اسباب بھی اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں، غور کیجئے کہ اسلام کی صرف اسی ایک ہی مختصر سی تعلیم نے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا، اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ بِسْمِ اللّٰہ ایک نسخۂ اکسیر ہے جس سے تانبے کا نہیں بلکہ خاک کا سونا بنتا ہے، فللہ الحمد علی دین الاسلام وتعلیماتہ۔

مسئلہ قرآن کی تلاوت شروع کرنے کے وقت اول أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ اور پھر بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھنا سنت ہے، اور درمیان تلاوت بھی سورۂ براءت کے علاوہ ہر سورت کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا سنت ہے۔

اس تمہید کے بعد آیت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تفسیر دیکھئے:

بسم اللہ الخ کی تفسیر بِسْمِ اللّٰهِ، یہ کلمہ تین لفظوں سے مرکب ہے، ایک حرف بآ، دوسرے اسم، تیسرے اللّٰه، حرف بآ عربی زبان میں بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوتی ہے، جن میں سے تین معنی مناسب مقام ہیں، ان میں سے ہر ایک معنی اس جگہ لئے جا سکتے ہیں:

اوّل: مصاحبت، یعنی کسی چیز کا کسی چیز سے متصل ہونا، دوسرے: استعانت، یعنی کسی چیز سے مدد حاصل کرنا، تیسرے: تبرک، یعنی کسی چیز سے برکت حاصل کرنا۔

لفظ اِسْم میں لغوی اور علمی تفصیلات بہت ہیں، جن کا جاننا عوام کے لئے ضروری نہیں، اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اردو میں اسکا ترجمہ نام سے کیا جاتا ہے۔

لفظ اللّٰه، اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سب سے بڑا اور سب سے زیادہ جامع نام ہے، اور بعض علماء نے اسی کو اسم اعظم کہا ہے، اور یہ نام اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا، اس لئے اس لفظ کا تثنیہ اور جمع نہیں آتے، کیونکہ اللہ واحد ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نام ہے اس موجود حق کا جو تمام صفات کمال کا جامع اور صفات ربوبیت کے ساتھ متصف، یکتا اور بے مثال ہے۔

اس لئے کلمۂ بسم اللہ کے معنی حرف بار کے مذکورہ تین معنی کی ترتیب سے یہ ہوئے:

اللہ کے نام کے ساتھ، اللہ کے نام کی مدد سے، اللہ کے نام کی برکت سے،

لیکن تینوں صورتوں میں یہ ظاہر ہے کہ یہ کلام نامکمل ہے، جب تک اس کام کا ذکر نہ کیا جائے جو اللہ کے نام کے ساتھ یا اس کے نام کی برکت سے کرنا مقصود ہے، اس لئے نحوی قاعدے کے مطابق یہاں کوئی فعل مناسب مقام محذوف ہوتا ہے، مثلاً "شروع کرتا ہوں یا پڑھتا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ"۔

اور مناسب یہ ہے کہ یہ فعل بھی بعد میں محذوف مانا جائے، تاکہ حقیقۃً شروع اسم اللہ ہی سے ہو، وہ فعل محذوف بھی اسم اللہ سے پہلے نہ آئے، صرف حرف بآر کا اسم اللہ سے پہلے آنا عربی زبان

کے لحاظ سے ضروری وناگزیر ہے، اس میں بھی مصحفِ عثمانی میں باجماع صحابہؓ یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ حرف بآر رسم الخط کے قاعدے سے الف کے ساتھ ملاکر لکھنا چاہئے تھا، اور لفظ اسم الگ، جس کی صورت ہوتی باسم اللہ، لیکن مصحف عثمانی کے رسم الخط میں حرف ہمزہ کو حذف کرکے حرف بآر کو سین کے ساتھ ملاکر صورۃً اسم کا جزء بنادیا، تاکہ شروع اسم اللہ سے ہوجائے، یہی وجہ ہے کہ دوسرے مواقع میں یہ حرف الف حذف نہیں کیا جاتا، جیسے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ میں ب کو الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے، یہ صرف بسم اللہ کی خصوصیت ہے کہ حرف بآر کو سین کے ساتھ ملادیا گیا ہے۔

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، رَحْمٰن کے معنی عام الرحمۃ کے اور رَحِیْم کے معنی تام الرحمۃ کے ہیں، عام الرحمۃ سے مطلب یہ ہے کہ وہ ذات جس کی رحمت سارے عالم اور ساری کائنات اور جو کچھ ابتک پیدا ہوا ہے اور جو کچھ ہوگا سب پر حاوی اور شامل ہو، اور تام الرحمۃ کا مطلب یہ ہے کہ اس کی رحمت کامل ومکمل ہو۔

یہی وجہ ہے کہ لفظ رَحْمٰن اللہ جل شانہٗ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے، کسی مخلوق کو رحمٰن کہنا جائز نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی ایسا نہیں ہوسکتا جس کی رحمت سے عالم کی کوئی چیز خالی نہ رہے، اسی لئے جس طرح لفظ "اللہ" کا جمع اور تثنیہ نہیں آتا رَحْمٰن کا بھی جمع وتثنیہ نہیں آتا، کیونکہ وہ ایک ہی ذات پاک کے ساتھ مخصوص ہے، دوسرے اور تیسرے کا وہاں احتمال ہی نہیں، (تفسیر قرطبی) بخلاف لفظ رحیم کے کہ اس کے معنی میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کا پایا جانا مخلوق میں ناممکن ہو، کیونکہ یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص کسی شخص سے پوری پوری رحمت کا معاملہ کرے۔

اسی لئے لفظ رَحِیْم انسان کیلئے بھی بولا جاسکتا ہے، قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی یہ لفظ استعمال فرمایا ہے، بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ۔

مسئلہ اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ آجکل عبدالرحمٰن، فضل الرحمٰن وغیرہ ناموں میں تخفیف کرکے رحمٰن کہتے ہیں، اور اس شخص کو اس لفظ سے خطاب کرتے ہیں یہ ناجائز وگناہ ہے۔

حکمت بسم اللہ میں اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ اور صفاتِ کمال میں سے صرف دو صفتیں ذکر کی گئی ہیں، اور وہ دونوں لفظ رحمت سے مشتق ہیں، اور وسعتِ رحمت اور کمال رحمت پر دلالت کرنے والی ہیں، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ تخلیقِ عالم اور آسمان وزمین اور تمام کائنات کے پیدا کرنے اور ان کو پالنے وغیرہ کا منشاء اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت ہے، نہ اس کو ان چیزوں کی خود کوئی ضرورت تھی نہ کوئی دوسرا ان چیزوں کے پیدا کرنے پر مجبور کرنیوالا تھا صرف اسی کی رحمت کے تقاضے سے یہ ساری چیزیں اور ان کی پرورش کے سارے انتظامات وجود میں آئے ہیں

ما نبودیم وتقاضا ما نبود ٭ لطفِ تو ناگفتۂ ما می شنود

احکام و مسائل

مسئلہ تعوذ | تعوذ کے معنی ہیں اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ پڑھنا، قرآن کریم میں ارشاد ہے فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ، "یعنی جب تم قرآن کی تلاوت کرو تو اللہ سے پناہ مانگو شیطان مردود کے شر سے"

قرأت قرآن سے پہلے تعوذ پڑھنا باجماع امت سنت ہے، خواہ تلاوت نماز کے اندر ہو یا خارج نماز (شرح منیہ)

تعوذ پڑھنا تلاوت قرآن کے ساتھ مخصوص ہے، علاوہ تلاوت کے دوسرے کاموں کے شروع میں صرف بسم اللہ پڑھی جائے، تعوذ مسنون نہیں، (عالمگیری باب رابع، من الکراہیۃ)

جب قرآن شریف کی تلاوت کی جائے اس وقت اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اور بِسْمِ اللّٰہِ دونوں پڑھی جائیں، درمیان تلاوت میں جب ایک سورت ختم ہو کر دوسری شروع ہو تو سورۂ برأت کے علاوہ ہر سورت کے شروع میں مکرر بسم اللہ پڑھی جائے، اعوذ باللہ نہیں، اور سورۂ برأت اگر درمیان تلاوت میں آجائے تو اس پر بسم اللہ نہ پڑھے، اور اگر قرآن کی تلاوت سورۂ برأت ہی سے شروع کر رہا ہے تو اس کے شروع میں اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھنا چاہئے (عالمگیریہ عن المحیط)

احکام بسم اللہ | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم قرآن مجید میں سورۂ نمل میں آیت کا جزء ہے، اور ہر دو سورتوں کے درمیان مستقل آیت ہے، اس لئے اس کا احترام قرآن مجید ہی کی طرح واجب ہے، اس کو بے وضو ہاتھ لگانا جائز نہیں (علی مختار الکرخی وصاحب الکافی والہدایہ، شرح منیہ) اور جنابت یا حیض و نفاس کی حالت میں اس کو بطور تلاوت پڑھنا بھی پاک ہونے سے پہلے جائز نہیں، ہاں کسی کام کے شروع میں، جیسے کھانے پینے سے پہلے بطور دعا، پڑھنا ہر حال میں جائز ہے (شرح منیہ کبیر)

مسئلہ | پہلی رکعت کے شروع میں اَعُوْذُ بِاللّٰہِ کے بعد بِسْمِ اللّٰہِ پڑھنا مسنون ہے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ آواز سے پڑھا جائے یا آہستہ، امام اعظم ابوحنیفہؒ اور بہت سے دوسرے ائمہ آہستہ پڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

پہلی رکعت کے بعد دوسری رکعتوں کے شروع میں بھی بسم اللہ پڑھنا چاہئے، اس کے مسنون ہونے پر سب کا اتفاق ہے، اور بعض روایات میں ہر رکعت کے شروع میں بسم اللہ پڑھنے کو واجب کہا گیا ہے (شرح منیہ)

مسئلہ | نماز میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۃ شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ نہیں پڑھنا چاہئے، خواہ جہری نماز ہو یا سری، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ سے ثابت نہیں ہے، شرح منیہ میں اسی کو امام اعظمؒ اور ابو یوسفؒ کا قول لکھا ہے اور شرح منیہ، درمختار، برہان وغیرہ میں اسی کو ترجیح دی ہے، مگر امام محمدؒ کا قول یہ ہے کہ سری نمازوں میں پڑھنا بہتر ہے، بعض روایات میں یہ قول ابوحنیفہؒ کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے، اور شامی نے بعض فقہاء سے اس کی ترجیح بھی نقل کی ہے "بہشتی زیور" میں بھی اسی کو اختیار کیا گیا ہے، اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ کوئی پڑھ لے تو مکروہ نہیں (شامی)

سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ

اٰيَاتُهَا سَبْعٌ	سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ	وَرُكُوْعُهَا وَاحِدٌ
اس میں سات آیتیں ہیں	سورۃ فاتحہ مکہ میں نازل ہوئی	اور ایک رکوع
	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○	
	شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے۔	

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝١ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝٢ مٰلِكِ

سب تعریفیں اللہ کیلئے ہیں جو پالنے والا سارے جہان کا، بیحد مہربان نہایت رحم والا، مالک

يَوْمِ الدِّيْنِ ۝٣ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝٤ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ

روزِ جزا کا، تیری ہی ہم بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں، بتلا ہم کو راہ

الْمُسْتَقِيْمَ ۝٥ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ

سیدھی، راہ اُن لوگوں کی جن پر تو نے فضل فرمایا جن پر نہ تیرا غصہ ہوا

	عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝٧	ع ۱
	اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔	

خلاصہ تفسیر

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ) سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں جو مربیّ ہیں ہر ہر عالم کے (مخلوقات الگ الگ جنس ایک ایک عالم کہلاتا ہے، مثلاً عالمِ ملائکہ، عالمِ انسان، عالمِ جن) (الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ) جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں (مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ) جو مالک ہیں روزِ جزا کے (مراد قیامت کا دن ہے جس میں ہر شخص اپنے عمل کا بدلہ پاوے گا) (اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ) ہم آپ ہی کی عبادت

کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کی کرتے ہیں، اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ بتلا دیجئے
ہم کو رستہ سیدھا (مراد دین کا رستہ ہے) صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ راستہ ان لوگوں کا
جن پر آپ نے انعام فرمایا (مراد دین کا انعام ہے) غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ نہ راستہ
ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب ہوا، اور نہ اُن لوگوں کا جو راستہ سے گم ہوگئے (راہِ ہدایت چھوٹنے
کی دو وجہ ہوا کرتی ہیں، ایک تو یہ کہ اس کی پوری تحقیق ہی نہ کرے، ضالین سے ایسے لوگ مراد ہیں،
دوسری وجہ یہ ہے کہ تحقیق پوری ہونے کے باوجود اس پر عمل نہ کرے، مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے ایسے لوگ
مراد ہیں، کیونکہ جان بوجھ کر خلاف کرنا زیادہ ناراضی کا سبب ہوتا ہے)۔

معارف و مسائل

سورۂ فاتحہ کے مضامین سورۂ فاتحہ سات آیتوں پر مشتمل ہے، جن میں سے پہلی تین آیات میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء ہے، اور آخری تین آیتوں میں انسان کی طرف سے دعاء و درخواست کا مضمون ہے، جو رب العزت نے اپنی رحمت سے خود ہی انسان کو سکھایا ہے، اور درمیانی ایک آیت میں دونوں چیزیں مشترک ہیں، کچھ حمد و ثناء کا پہلو ہے کچھ دعاء و درخواست کا۔

صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ منقول ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ نماز (یعنی سورۂ فاتحہ) میرے اور میرے بندے کے درمیان دو حصّوں میں تقسیم کی گئی ہے، نصف میرے لئے ہے اور نصف میرے بندے کے لئے، اور جو کچھ میرا بندہ مانگتا ہے وہ اس کو دیا جائیگا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ جب کہتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "میرے بندے نے میری حمد کی ہے"، اور جب وہ کہتا ہے الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "میرے بندے نے میری تعریف و ثناء بیان کی ہے"، اور جب بندہ کہتا ہے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی ہے"، اور جب بندہ کہتا ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "یہ آیت میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے"، کیونکہ اس میں ایک پہلو حق تعالیٰ کی حمد و ثناء کا ہے اور دوسرا پہلو بندے کی دعاء و درخواست کا، اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا کہ: "میرے بندے کو وہ چیز ملے گی جو اس نے مانگی"۔ پھر جب بندہ کہتا ہے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (آخر تک)، تو حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ "یہ سب میرے بندے کے لئے ہے، اور اس کو وہ چیز ملے گی جو اس نے مانگی" (مظہری)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے معنی یہ ہیں کہ سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں، یعنی دنیا میں جہاں کہیں کسی چیز کی تعریف کی جاتی ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی تعریف ہے، کیونکہ اس جہانِ رنگ و بو میں جہاں

ہزاروں حسین مناظر اور لاکھوں دلکش نظارے اور کروڑوں نفع بخش چیزیں انسان کے دامنِ دل کو ہر وقت اپنی طرف کھینچتی رہتی ہیں اور اپنی تعریف پر مجبور کرتی ہیں، اگر ذرا نظر کو گہرا کیا جائے تو ان سب چیزوں کے پردے میں ایک ہی دستِ قدرت کارفرما نظر آتا ہے، اور دنیا میں جہاں کہیں کسی چیز کی تعریف کی جاتی ہے اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں جیسے کسی نقش و نگار یا تصویر کی یا کسی صنعت کی تعریف کی جائے کہ یہ سب تعریفیں درحقیقت نقاش اور مصور کی یا صناع کی ہوتی ہیں، اس جملے نے کثرتوں کے تلاطم میں پھنسے ہوئے انسان کے سامنے ایک حقیقت کا دروازہ کھول کر یہ دکھلادیا کہ یہ ساری کثرتیں ایک ہی وحدت سے مربوط ہیں، اور ساری تعریفیں درحقیقت اسی ایک قادرِ مطلق کی ہیں ان کو کسی دوسرے کی تعریف سمجھنا نظر و بصیرت کی کوتاہی ہے ؎

حمد را با تو نسبتے است درست

بر درِ ہر کہ رفت بر درِ تست

اور یہ ظاہر ہے کہ جب ساری کائنات میں لائقِ حمد درحقیقت ایک ہی ذات ہے تو عبادت کی مستحق بھی وہی ذات ہو سکتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اگرچہ حمد و ثناء کے لئے لایا گیا ہے، لیکن اس ضمن میں ایک معجزانہ انداز سے مخلوق پرستی کی بنیاد ختم کر دی گئی، اور دلنشین طریق پر توحید کی تعلیم دی گئی ہے۔

غور کیجئے کہ قرآن کے اس مختصر سے ابتدائی جملے میں ایک طرف تو حق تعالیٰ کی حمد و ثناء کا بیان ہوا، اسی کے ساتھ مخلوقات کی رنگینیوں میں اُلجھے ہوئے دل و دماغ کو ایک حقیقت کی طرف متوجہ کرکے مخلوق پرستی کی جڑ کاٹ دی گئی، اور معجزانہ انداز سے ایمان کے سب سے پہلے رکن توحیدِ باری کا نقش اس طرح جمادیا گیا کہ جو دعویٰ ہے اسی میں غور کرو تو وہی اپنی دلیل بھی ہے، فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۔

ربِّ العالمین کی تفسیر اس مختصر ابتدائی جملے کے بعد اللہ تعالیٰ کی پہلی صفت رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ذکر کی گئی ہے، مختصر الفاظ میں اس کی بھی تشریح دیکھئے:۔

لفظ رَبّ کے معنی عربی لغت کے اعتبار سے تربیت و پرورش کرنے والے کے ہیں، اور تربیت اس کو کہتے ہیں کہ کسی چیز کو اس کے تمام مصالح کی رعایت کرتے ہوئے درجہ بدرجہ آگے بڑھایا جائے یہاں تک، کہ وہ حدِ کمال کو پہنچ جائے۔

یہ لفظ صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک کے لئے مخصوص ہے، کسی مخلوق کو بدون اضافت کے رب کہنا جائز نہیں، کیونکہ ہر مخلوق خود محتاجِ تربیت ہے وہ کسی دوسرے کی کیا تربیت کرسکتا ہے۔

اَلْعٰلَمِيْنَ عالَم کی جمع ہے، جس میں دنیا کی تمام اجناس : آسمان، چاند، سورج اور تمام ستارے اور ہوا و فضا، برق و باراں، فرشتے، جنات، زمین اور اس کی تمام مخلوقات، حیوانات، انسان

نباتات، جمادات سب ہی داخل ہیں، اس لئے رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ تمام اجناسِ کائنات کی تربیت کرنے والے ہیں، اور یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ جیسا یہ ایک عالم ہے جس میں ہم بستے ہیں اور اس کے نظام شمسی و قمری اور برق و باراں اور زمین کی لاکھوں مخلوقات کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں یہ سارا ایک ہی عالم ہو، اور اسی جیسے اور ہزاروں لاکھوں دوسرے عالم ہوں جو اس عالم سے باہر کی خلاء میں موجود ہوں، امام رازیؒ نے اپنی تفسیر کبیر میں فرمایا ہے کہ اس عالم سے باہر ایک لامتناہی خلاء کا وجود دلائلِ عقلیہ سے ثابت ہے، اور یہ بھی ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر قدرت ہے، اُس کے لئے کیا مشکل ہے کہ اُس نے اس لامتناہی خلاء میں ہمارے پیشِ نظر عالم کی طرح کے اور بھی ہزاروں لاکھوں عالم بنا رکھے ہوں۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے منقول ہے کہ "عالم چالیس ہزار ہیں، یہ دنیا مشرق سے مغرب تک ایک عالم ہے، باقی اس کے سوا ہیں"، اسی طرح حضرت مقاتلؒ امام تفسیر سے منقول ہے کہ "عالم اسی ہزار ہیں" (قرطبی) اس پر جو یہ شبہ کیا جاتا تھا کہ خلاء میں انسانی مزاج کے مناسب ہوا نہیں ہوتی، اس لئے انسان یا کوئی حیوان وہاں زندہ نہیں رہ سکتا، امام رازیؒ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ کیا ضروری ہے کہ اِس عالم سے خارج خلاء میں جو دوسرے عالم کے باشندے ہوں اُن کا مزاج بھی ہمارے عالم کے باشندوں کی طرح ہو جو خلاء میں زندہ نہ رہ سکیں، یہ کیوں نہیں ہوسکتا کہ اُن عالموں کے باشندوں کے مزاج و طبائع، ان کی غذاء و ہوا یہاں کے باشندوں سے بالکل مختلف ہوں۔

یہ مضمون تو اب سے سات سو ستتر سال پہلے کے اسلامی فلاسفر امام رازیؒ کا لکھا ہوا ہے جبکہ فضاء و خلاء کی سیر اور اس کی پیمائش کے آلات و ذرائع ایجاد نہ ہوئے تھے، آج راکٹوں اور اسپٹنکوں کے زمانے میں خلاء کے مسافروں نے جو کچھ آکر بتلایا وہ بھی اس سے زیادہ نہیں، کہ اس عالم سے باہر کی خلاء کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے، اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس غیر متناہی خلاء میں کیا کچھ موجود ہے، اس دنیا سے قریب ترین سیاروں، چاند، اور مریخ کی آبادی کے بارے میں جو قیاسات آج کے جدید ترین ماہرینِ سائنس پیش کر رہے ہیں وہ بھی یہی ہیں کہ اگر ان سیارات کے اوپر کچھ لوگ آباد ہیں تو یہ ضروری نہیں کہ وہ انھیں خصوصیات اور اسی مزاج و طبیعت کے ہوں جو اس عالم کے انسان اور حیوانات و نباتات کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں، بلکہ قرین قیاس یہ ہے کہ اُن کے مزاج و طبیعت، ان کی غذاء و ضروریات یہاں کے لوگوں سے بالکل مختلف ہوں، اس لئے ایک کو دوسرے پر قیاس کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

امام رازیؒ کی تائید اور اس سلسلے کی جدید معلومات کے لئے وہ مقالہ کافی ہے جو امریکی خلائی مسافر جان گلین نے حال میں خلاء کے سفر سے واپس آکر شائع کرایا ہے جس میں شعاعی سال کا نام دے کر ایک طویل مدت و مسافت کا پیمانہ قائم کیا، اور اس کے ذریعے اپنی وسعتِ فکر کی حد تک خلاء کا کچھ اندازہ لگا

اور بھیر یہ اقرار کیا کہ کچھ نہیں بتلایا جا سکتا کہ خلاء کی وسعت کتنی اور کہاں تک ہے۔

قرآن کے اس مختصر جملے کے ساتھ اب تمام عالم اور اس کی کائنات پر نظر ڈالئے، اور بچشمِ بصیرت دیکھئے کہ حق تعالیٰ نے تربیتِ عالم کا کیسا مضبوط اور محکم محیّر العقول نظام بنایا ہے، افلاک سے لے کر عناصر تک، سیارات و نجوم سے لے کر ذرّات تک ہر چیز اس سلسلۂ نظام میں بندھی ہوئی، اور حکیم مطلق کی خاص حکمتِ بالغہ کے ماتحت ہر چیز اپنے اپنے کام میں مصروف ہے، ایک لقمہ جو انسان کے منہ تک پہنچتا ہے، اگر اس کی پوری حقیقت پر انسان غور کرے تو معلوم ہوگا کہ اس کی تیاری میں آسمان اور زمین کی تمام قوتیں اور کروڑوں انسانوں اور جانوروں کی محنتیں شامل ہیں، سارے عالم کی قوتیں مہینوں مصروفِ خدمت رہیں جب یہ لقمہ تیار ہوا، اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ انسان اس میں غور و تدبّر سے کام لے، اور سمجھے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے لے کر زمین تک اپنی تمام مخلوقات کو اس کی خدمت میں لگا رکھا ہے، تو جس ہستی کو اس نے مخدومِ کائنات بنا رکھا ہے وہ بھی بیکار و بیہودہ نہیں ہو سکتی، اس کا بھی کوئی کام ہوگا، اس کے ذمّے بھی کوئی خدمت ہوگی ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرمانبردار شرطِ انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری

قرآن حکیم نے انسانی آفرینش اور اس کے مقصدِ حیات کو اس آیت میں واضح فرمایا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (۵۱: ۵۶) | "میں نے جن اور انسان کو اور کسی کام کے لئے نہیں بنایا بجز اس کے کہ وہ میری عبادت کریں"

تقریر مذکور سے معلوم ہوا کہ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ایک حیثیت سے پہلے جملے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کی دلیل ہے کہ جب تمام کائنات کی تربیت و پرورش کی ذمہ دار صرف ایک ذات اللہ تعالیٰ کی ہے تو حمد و ثناء کی حقیقی مستحق بھی وہی ذات ہو سکتی ہے، اس لئے پہلی آیت اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ میں حمد و ثناء کے ساتھ ایمان کے سب سے پہلے رکن توحیدِ باری تعالیٰ کا بیان بھی مؤثر انداز میں آ گیا۔

دوسری آیت میں صفتِ رحمت کا ذکر بلفظ صفت رَحْمٰن و رَحِيْم کیا گیا ہے، یہ دونوں صیغے مبالغہ کے ہیں جن میں رحمتِ خداوندی کی وسعت و کثرت اور کمال کا بیان ہے، اس صفت کے ذکر کرنے میں شاید اس طرف اشارہ ہو کہ یہ تمام کائنات و مخلوقات کی تربیت و پرورش کی ذمہ داری جو حق تعالیٰ نے اپنے ذمے رکھی ہے وہ کسی اپنی ضرورت یا دباؤ اور مجبوری سے نہیں، بلکہ یہ سب کچھ اس کی صفتِ رحمت کا تقاضا ہے، اگر پوری کائنات نہ ہو تو اس کا کچھ نقصان نہیں، اور ہو جائے تو اس پر کچھ بار نہیں ؎

نہ تنہا بدی چونکہ خلقت نبود، ٭ نہ چوں کردہ شد بر تو زحمت فزود

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ لفظ مَالِكِ مِلک سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں کسی چیز پر ایسا قبضہ کہ وہ اس میں تصرّف کرنے کی جائز قدرت رکھتا ہو (قاموس) لفظ دِیْن کے معنی جزاء دینا مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کا لفظی ترجمہ ہوا "مالک روزِ جزاء کا" یعنی روزِ جزاء میں ملکیت رکھنے والا، وہ ملکیت کس چیز پر ہوگی؟ اس کا ذکر نہیں کیا گیا، تفسیر کشاف میں ہے کہ اس میں اشارہ عموم کی طرف ہے، یعنی روزِ جزاء میں تمام کائنات اور تمام امور کی ملکیت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہوگی (کشاف)

روزِ جزاء کی حقیقت اور عقلاً اُس کی ضرورت

اب یہاں چند باتیں قابلِ غور ہیں:

اوّل یہ کہ روزِ جزاء کس دن کا نام ہے، اور اس کی کیا حقیقت ہے؟

دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کی مِلکیت تمام کائنات پر جس طرح روزِ جزاء میں ہوگی ایسے ہی آج بھی ہے، پھر روزِ جزاء کی کیا خصوصیت ہے؟

پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ روزِ جزاء اس دن کا نام ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نیک و بد اعمال کا بدلہ دینے کے لئے مقرر فرمایا ہے، لفظ "روزِ جزاء" سے ایک عظیم الشان فائدہ یہ حاصل ہوا کہ دنیا نیک و بد اعمال کی جزاء و سزا کی جگہ نہیں، بلکہ ایک دار العمل فرض ادا کرنے کا دفتر ہے، تنخواہ یا صلہ وصول کرنے کی جگہ نہیں، اس سے معلوم ہوگیا کہ دنیا میں کسی کو عیش و عشرت، دولت و راحت سے مالا مال دیکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اللہ کے نزدیک مقبول و محبوب ہے، یا کسی کو رنج و مصیبت میں مبتلا پاکر یہ نہیں قرار دیا جا سکتا کہ وہ اللہ کے نزدیک معتوب و مبغوض ہے، جس طرح دنیا کے دفتروں اور کارخانوں میں کسی کو اپنا فرض ادا کرنے میں مصروفِ محنت دیکھا جائے تو کوئی عقلمند اس کو مصیبت زدہ نہیں کہتا، اور نہ وہ خود اپنی مشقت کے باوجود اپنے آپ کو گرفتارِ مصیبت سمجھتا ہے، بلکہ وہ اس محنت و مشقت کو اپنی سب سے بڑی کامیابی تصوّر کرتا ہے، اور کوئی مہربان اُس کو اِس مشقت سے سبکدوش کرنا چاہے تو وہ اسکو اپنا بدترین دشمن خیال کرتا ہے، کیونکہ وہ اس تیس روزہ محنت کے پس پردہ اُس راحت کو دیکھ رہا ہے جو اس کو تنخواہ کی شکل میں ملنے والی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں انبیاء علیہم السلام اور ان کے بعد اولیاء اللہ سب سے زیادہ مصیبت و بلا میں مبتلا ہوتے ہیں، اور وہ اپنی اس حالت پر نہایت مطمئن اور بسا اوقات مسرور نظر آتے ہیں ؎

نشود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

الغرض دنیا کی عیش و عشرت حق و صداقت کی اور رنج و مصیبت بدعملی کی یقینی علامت نہیں ہاں کبھی کبھی کسی کسی عمل کی جزاء یا سزا کا ہلکا سا نمونہ دنیا میں بھی ظاہر کر دیا جاتا ہے، وہ اس کا پورا بدلہ نہیں ہوتا، محض متنبہ کرنے کے لئے ایک نمونہ ہوتا ہے، اس کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے:

وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ○ (۲۱:۳۲)	"یعنی ہم لوگوں کو (آخرت کے) بڑے عذاب سے پہلے (بعض اوقات) دنیا میں ایک عذاب قریب کا مزہ چکھا دیتے ہیں تاکہ وہ باز آجائیں"

اور دوسری جگہ ارشاد ہے:

كَذٰلِكَ الْعَذَابُ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○ (۶۸:۳۳)	"ایسا ہوتا ہے عذاب، اور آخرت کا عذاب بہت بڑا ہے، اگر وہ سمجھیں"

الغرض دنیا کی راحت و مصیبت بعض اوقات تو امتحان اور آزمائش ہوتی ہے، اور کبھی عذاب بھی ہوتی ہے، مگر وہ عمل کا پورا بدلہ نہیں ہوتا، بلکہ ایک نمونہ ہوتا ہے، کیونکہ یہ سب کچھ چند روزہ اور محض عارضی ہے، مدار و معیار وہ راحت و کلفت ہے جو ہمیشہ قائم رہنے والی ہے، اور جو اس عالم سے گذرنے کے بعد عالم آخرت میں آنے والی ہے، اسی کا نام روزِ جزاء ہے، اور جب یہ معلوم ہوگیا کہ نیک و بد عمل کا بدلہ یا پورا بدلہ اس دنیا میں نہیں ملتا، اور عدل و انصاف اور عقل کا تقاضا ہے کہ نیک و بد، اچھا اور بُرا برابر نہ رہے، بلکہ ہر عمل کی جزاء یا سزا ملنا چاہئے۔

اس لئے ضروری ہے کہ اس عالم کے بعد کوئی دوسرا عالم ہو، جس میں ہر چھوٹے بڑے اور اچھے بُرے عمل کا حساب اور اس کی جزاء یا سزا انصاف کے مطابق ملے، اسی کو قرآن کی اصطلاح میں روزِ جزاء یا قیامت یا آخرت کہا جاتا ہے، قرآن نے خود اس مضمون کو سورۂ مؤمن میں وضاحت سے بیان فرمایا ہے:

وَمَا يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِیْٓءُ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ○ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ (آیت نمبر ۵۸-۵۹)	"یعنی بینا اور نابینا اور (ایک) وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے اور (دوسرے) بدکردار باہم برابر نہیں ہوسکتے، تم لوگ بہت ہی کم سمجھتے ہو، قیامت تو ضرور ہی آکر رہے گی (تاکہ ہر ایک عمل کا پورا بدلہ اس کو مل جائے) اس کے آنے میں کسی طرح کا شک ہی نہیں، مگر اکثر لوگ نہیں ایمان لاتے"

مالک کون ہے؟ | مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ ہر اہلِ عقل کے نزدیک یہ بات بدیہی اور بالکل ظاہر ہے کہ حقیقی مالک تمام کائنات کے ذرّے ذرّے کی وہی ذات پاک ہے، جس نے ان کو پیدا کیا، بڑھایا، تربیت کی، اور جس کی ملکیت ہر چیز پر مکمل ہے، ظاہر پر بھی باطن پر بھی، زندہ پر بھی مُردہ پر بھی، اور جس کی ملکیت کی نہ کوئی ابتداء ہے نہ انتہاء، بخلاف انسان کی ملکیت کے کہ وہ ابتداء و انتہاء کے دائرے میں محدود ہے، پہلے نہیں تھی اور پھر نہ رہے گی، نیز اس کی ملکیت

تصرّف اشیار کے ظاہر پر ہے، باطن پر نہیں، زندہ پر ہے مُردہ پر نہیں، اس لئے ہر اہل بصیرت کے نزدیک صرف روزِ جزار کی نہیں بلکہ دنیا میں بھی تمام کائنات کی حقیقی مِلکیت صرف حق تعالیٰ ہی کی ہے، پھر اس آیت میں اللہ تعالیٰ کو خاص روزِ جزار کا مالک فرمانے میں کیا حکمت ہے ؟

سو قرآن کی دوسری آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوا کہ دنیا میں بھی اگرچہ حقیقی اور مکمل ملکیت تمام کائنات پر صرف پروردگارِ عالم ہی کی ہے، لیکن اسی نے اپنے کرم اور حکمتِ بالغہ سے ایک قسم کی ناقص مِلکیت انسان کو بھی عطا فرما رکھی ہے، اور دنیا کے قوانین میں اس کی ملکیت کا کافی احترام بھی کیا گیا ہے، آج کی دنیا میں انسان مال و دولت کا مالک ہے، زمین جائیداد کا مالک ہے، کوٹھی بنگلہ اور فرنیچر کا مالک ہے، حشم و خدم کا مالک ہے، اور یہ ناقص سی ملکیت جو اس کو محض آزمائش کے لئے دی گئی تھی، وہ اسی میں مغرور و بدمست ہو گیا، اس آیت میں حق تعالیٰ نے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ فرما کر اس مغرور و غافل انسان کو آگاہ فرمایا کہ یہ ملکیتیں اور سب تعلقات و روابط صرف چند روز کے لئے ہیں، ایک دن ایسا آنے والا ہے جس میں کوئی کسی چیز کا ظاہری طور پر بھی مالک نہ رہے گا، نہ کوئی کسی کا خادم رہے گا، نہ مخدوم، نہ کوئی کسی کا آقا رہے گا نہ غلام، تمام کائنات کی مِلک اور مُلک صرف ایک ذات پاک اللہ تعالیٰ ہی کی ہو گی۔

اس آیت کی پوری تفسیر اور روزِ جزار کی وضاحت سورۂ مؤمن کی اِن آیات میں ہے:

يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ ۚ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ۭ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۭ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ○ اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ۭ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ○ (آیت نمبر ۱۶-۱۷)

اس میں روزِ جزار کا بیان کرتے ہوئے فرمایا:

”جس دن سب لوگ (خدا کے) سامنے آموجود ہوں گے (کہ) ان کی کوئی بات خدا سے (صورۃً) بھی مخفی نہ رہے گی، آج کے روز کس کی حکومت ہو گی؟ بس اللہ ہی کی ہو گی، جو یکتا اور غالب ہے، آج ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ دیا جائے گا، آج کسی پر ظلم نہ ہو گا، اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والے ہیں“

سورۂ فاتحہ کے شروع میں بیان کیا گیا تھا کہ اس سورۃ کی تین ابتدائی آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنار کا بیان ہے، یہ تینوں آیتیں آچکیں، اور ان کی تفسیر میں آپ یہ بھی معلوم کر چکے کہ پہلی دو آیتوں میں حمد و ثنار کے ضمن میں ایمان کے بنیادی اصول، اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید کا بیان بھی ایک معجزانہ انداز میں آگیا ہے، اس تیسری آیت کی تفسیر میں آپ نے اب معلوم کر لیا، کہ اس کے صرف دو لفظوں میں حمد و ثنار کے ساتھ اسلام کے عظیم الشان انقلابی عقیدہ یعنی قیامت و آخرت

کا بیان بھی مع دلیل کے آگیا، اب چوتھی آیت کا بیان آتا ہے:

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ اس آیت میں ایک پہلو حمد و ثنا، کا اور دوسرا دعا، و درخواست کا ہے، نَعْبُدُ عبادت سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں کسی کی انتہائی تعظیم و محبت کی وجہ سے اس کے سامنے اپنی انتہائی عاجزی اور فرمانبرداری کا اظہار، نَسْتَعِيْنُ استعانت سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں کسی سے مدد مانگنا، آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں" انسان پر تین حالات گذرتے ہیں، ماضی، حال، مستقبل، پچھلی تین آیتوں میں سے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اور اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ میں انسان کو اس پر متنبہ کر دیا گیا کہ وہ اپنے ماضی اور حال میں صرف اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے، کہ اس کو ماضی میں نابود سے بود کیا، اور اس کو تمام کائنات سے زیادہ بہترین شکل و صورت اور عقل و بصیرت عطا فرمائی، اور حال میں اس کی پرورش اور تربیت کا سلسلہ جاری ہے، اور مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں یہ بتا دیا کہ مستقبل میں بھی وہ خدا ہی کا محتاج ہے، کہ روزِ جزاء میں اس کے سوا کسی کا کوئی مددگار نہیں ہو سکتا، اور جب ان تینوں آیتوں نے یہ واضح کر دیا کہ انسان اپنی زندگی کے تینوں دَور میں خدا ہی کا محتاج ہے تو اس کا طبعی اور عقلی تقاضا یہ ہوا کہ عبادت بھی صرف اسی کی کی جائے، کیونکہ عبادت جو انتہائی تعظیم و محبت کے ساتھ اپنی انتہائی عاجزی اور تذلّل کا نام ہے، وہ کسی دوسری ہستی کے لائق نہیں، اس کا نتیجہ لازمی یہ ہے کہ ایک عاقل انسان پکار اٹھے کہ ہم تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے، اسی مقتضائے طبع کو اِيَّاكَ نَعْبُدُ میں ظاہر فرمایا گیا ہے، اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ حاجت روا صرف ایک ہی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے تو اقتضائے عقل و طبعی یہ ہے کہ اپنے کاموں میں مدد بھی صرف اسی سے مانگنا چاہئے، اسی اقتضائے عقل و طبع کو وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں ذکر فرمایا گیا ہے۔ (روح البیان)

غرض اس چوتھی آیت میں ایک حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء ہے کہ عبادت و اعانت کے لائق صرف وہی ہے، اور دوسری حیثیت سے انسان کی دعاء و درخواست ہے کہ ہماری مدد فرمائے اور تیسری حیثیت اور بھی ہے کہ اس میں انسان کو اس کی تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرے، اور حقیقی طور پر اللہ کے سوا کسی کو حاجت روا نہ سمجھے، اور کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرے، کسی نبی یا ولی وغیرہ کو وسیلہ قرار دے کر اللہ تعالیٰ سے دعاء مانگنا اس کے منافی نہیں۔

اس آیت میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ارشاد یہ ہے کہ "ہم تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں" کس کام میں مدد مانگتے ہیں اس کا ذکر نہیں، جمہور مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کا ذکر نہ کرنے میں عموم کی طرف اشارہ ہے، کہ ہم اپنی عبادت اور ہر دینی و دنیوی کام اور ہر مقصد میں صرف آپ ہی کی مدد چاہتے ہیں۔

پھر عبادت صرف نماز روزے کا نام نہیں، امام غزالیؒ نے اپنی کتاب اربعین میں عبادت کی

دس قسمیں لکھی ہیں: نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، تلاوتِ قرآن، ہر حالت میں اللہ کا ذکر کرنا، حلال روزی کے لئے کوشش کرنا، پڑوسی اور ساتھی کے حقوق ادا کرنا، لوگوں کو نیک کاموں کا حکم کرنا اور بُرے کاموں سے منع کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کا اتباع کرنا۔

اس لئے عبادت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنے کے معنیٰ یہ ہوگئے کہ نہ کسی کی محبت اللہ تعالیٰ کے برابر ہو، نہ کسی کا خوف اس کے برابر ہو، نہ کسی سے امید اس کی طرح ہو، نہ کسی پر بھروسہ اللہ کے مثل ہو، نہ کسی کی اطاعت و خدمت اور کام کو اتنا ضروری سمجھے جتنا اللہ تعالیٰ کی عبادت کو، نہ اللہ تعالیٰ کی طرح کسی کی نذر اور منّت مانے، نہ اللہ تعالیٰ کی طرح کسی دوسرے کے سامنے اپنی مکمل عاجزی اور تذلّل کا اظہار کرے، نہ وہ افعال کسی دوسرے کے لئے کرے جو انتہائی تذلّل کی علامات ہیں، جیسے رکوع وسجدہ۔

آخری تین آیتیں جن میں انسان کی دعاء و درخواست کا مضمون ہے اور ایک خاص دعاء کی تلقین ہے یہ ہیں: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۵ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ○ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ: "بتلا دیجئے ہم کو راستہ سیدھا، راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا، نہ راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا، اور نہ اُن لوگوں کا جو راستہ سے گم ہوگئے"۔

ان تینوں آیات میں چند باتیں قابلِ غور ہیں:

تکمیل الدرایہ فی تفصیل درجات الہدایہ یہاں پہلی بات قابلِ غور یہ ہے کہ صراطِ مستقیم کی ہدایت کے لئے دعاء جو اس آیت میں تعلیم فرمائی گئی ہے اس کے مخاطب جس طرح تمام انسان اور عامۂ مؤمنین ہیں، اسی طرح اولیاء اللہ اور حضرات انبیاء علیہم السلام بھی اس کے مامور ہیں، جو بلاشبہ ہدایت یافتہ بلکہ دوسروں کے لئے ہدایت کا سرچشمہ ہیں، پھر اس حاصل شدہ چیز کی بار بار دعاء مانگنے کا کیا مطلب ہے؟

اس کا جواب ہدایت کی پوری حقیقت معلوم کرنے پر موقوف ہے، اس کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے، جس سے سوال مذکور کے علاوہ ان تمام اشکالات کا بھی جواب معلوم ہو جائیگا جو مفہوم ہدایت کے متعلق قرآن کریم کے بہت سے مقامات میں عموماً پیش آتے ہیں، اور ہدایت کی حقیقت سے ناآشنا قرآن کی بہت سی آیات میں باہمی تضاد و اختلاف محسوس کرنے لگتا ہے۔

لفظ ہدایت کی بہترین تشریح امام راغب اصفہانیؒ نے مفرداتُ القرآن میں تحریر فرمائی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہدایت کے اصلی معنی ہیں کسی شخص کو منزلِ مقصود کی طرف مہربانی کے ساتھ رہنمائی کرنا، اور ہدایت کرنا حقیقی معنی میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کا فعل ہے، جس کے مختلف درجات ہیں:

ایک درجہ ہدایت کا عام ہے، جو کائنات و مخلوقات کی تمام اقسام جمادات، نباتات،

حیوانات وغیرہ کو شامل ہے، یہاں آپ یہ خیال نہ کریں کہ ان بے جان، بے شعور چیزوں کو ہدایت سے کیا کام؟

کیونکہ قرآنی تعلیمات سے یہ واضح ہے کہ کائنات کی تمام اقسام اور ان کا ذرّہ ذرّہ اپنے اپنے درجے کے موافق حیات واحساس بھی رکھتا ہے اور عقل وشعور بھی، یہ دوسری بات ہے کہ یہ جوہر کسی نوع میں کم کسی میں زیادہ ہے، اسی وجہ سے جن اشیاء میں یہ جوہر بہت کم ہے اُن کو بے جان، بے شعور سمجھا اور کہا جاتا ہے، احکامِ الٰہیہ میں بھی اُن کے ضعفِ شعور کا اتنا اثر آیا کہ ان کو احکام کا مکلف نہیں بنایا گیا، **جن مخلوقات میں حیات کے آثار تو نمایاں ہیں مگر عقل وشعور نمایاں نہیں**، ان کو ذی حیات، جاندار مگر بے عقل وشعور کہا جاتا ہے، اور جن میں حیات کے ساتھ عقل وشعور کے آثار بھی نمایاں نظر آتے ہیں اُن کو ذوی العقول کہا جاتا ہے، اور اسی اختلاف درجات اور عقل وشعور کی کمی بیشی کی وجہ سے تمام کائنات میں احکامِ شرعیہ کا مکلف صرف انسان اور جنّات کو قرار دیا گیا ہے، کہ ان میں عقل وشعور بھی مکمل ہے، مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ دوسری انواع واقسام میں حیات واحساس یا عقل وشعور بالکل نہیں، کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ ۭ (سورۂ بنی اسرائیل: ۴۴)

"یعنی کوئی چیز ایسی نہیں جو تعریف کے ساتھ اس کی پاکی (قالاً یا حالاً) بیان نہ کرتی ہو لیکن تم لوگ اُن کی پاکی بیان کرنے کو سمجھتے نہیں ہو"۔

اور سورۂ نور میں ارشاد ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ ۭ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِیْحَهٗ ۭ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِمَا یَفْعَلُوْنَ ۝ (آیت نمبر ۴۱)

"یعنی کیا تجھ کو معلوم نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتے ہیں سب جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں (مخلوقات) ہیں اور (بالخصوص) پرندے جو پر پھیلائے ہوئے اُڑتے پھرتے ہیں، سب کو اپنی اپنی دعاء اور تسبیح معلوم ہے، اور اللہ تعالیٰ کو ان لوگوں کے سب افعال کا پورا علم ہے"۔

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء اور اس کی پاکی بیان کرنا اللہ تعالیٰ کی معرفت پر موقوف ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ہی سب سے بڑا علم ہے، اور یہ علم بدون عقل شعور کے نہیں ہو سکتا اس لئے ان آیات سے ثابت ہوا کہ تمام کائنات کے اندر روح وحیات بھی ہے، ادراک واحساس بھی، عقل وشعور بھی، مگر بعض کائنات میں یہ جوہر اتنا کم اور مخفی ہے کہ عام دیکھنے والوں کو اس کا احساس نہیں ہوتا، اسی لئے عرف میں ان کو بے جان یا بے عقل کہا جاتا ہے، اور اس بناء پر اُن کو احکامِ شرعیہ کا مکلف بھی نہیں بنایا گیا، قرآن کا یہ فیصلہ اُس وقت کا ہے جب دنیا میں نہ کہیں کوئی فلسفی تھا، نہ

کوئی فلسفہ مدوّن تھا، بعد میں آنے والے فلاسفروں نے بھی اپنے اپنے وقت میں اس کی تصدیق کی، قدیم فلاسفہ میں بھی اس خیال کے کچھ لوگ گذرے ہیں، اور جدید فلاسفہ اور اہل سائنس نے تو پوری وضاحت کے ساتھ اس کو ثابت کیا ہے۔

الغرض ہدایتِ خداوندی کا یہ درجۂ اولیٰ تمام مخلوقات، جمادات، نباتات، حیوانات، انسان اور جنّات کو شامل ہے، اسی ہدایت عامّہ کا ذکر قرآن کریم کی آیت اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝ (۲۰: ۵۰) میں فرمایا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو اس کی خِلقت عطا فرمائی، پھر اس خِلقت کے مناسب اس کو ہدایت دی"، اور یہی مضمون سورۂ اعلیٰ میں ان الفاظ سے ارشاد ہوا:

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝ "یعنی آپ اپنے پروردگار عالی شان کی تسبیح کیجئے جس نے ساری مخلوقات کو بنایا، پھر ٹھیک بنایا، اور جس نے تجویز کیا، پھر راہ بتائی"۔

یعنی جس نے تمام مخلوقات کے لئے خاص خاص مزاج اور خاص خاص خدمتیں تجویز فرما کر ہر ایک کو اس کے مناسب ہدایت کردی۔

اسی ہدایتِ عامہ کا نتیجہ ہے کہ کائنات عالم کے تمام انواع و اصناف اپنا اپنا مقررہ فرض نہایت سلیقہ سے ادا کر رہے ہیں، جو چیز جس کام کے لئے بنادی ہے وہ اس کو ایسی خوبی کے ساتھ ادا کر رہی ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے، حضرت مولانا رومیؒ نے اسی مضمون کو بیان فرمایا ہے ؎

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند
بامن و تو مردہ ، باحق زندہ اند

زبان سے نکلی ہوئی آواز کے معنی کا ادراک نہ ناک کرسکتی ہے نہ آنکھ، حالانکہ یہ زبان سے زیادہ قریب ہیں اس ادراک کا فریضہ اللہ تعالیٰ نے کانوں کے سپرد کیا ہے، وہی زبان کی بات کو لیتے ہیں اور ادراک کرتے ہیں، دانائے رومؒ نے خوب فرمایا ؎

مر زباں را مشتری جز گوش نیست
واقفِ این رازِ جز بے ہوش نیست

اسی طرح کانوں سے دیکھنے یا سونگھنے کا کام نہیں لیا جاسکتا، ناک سے دیکھنے یا سننے کا کام نہیں لیا جاسکتا، سورۂ مریم میں اسی مضمون کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۝ (۱۹: ۹۳) "یعنی کوئی نہیں آسمان اور زمین میں جو نہ آوے رحمٰن کا بندہ ہوکر"۔

دوسرا درجہ ہدایت کا اس کے مقابلے میں خاص ہے، یعنی صرف اُن چیزوں کے ساتھ مخصوص

ہی جو عرف میں ذوی العقول کہلاتی ہیں، یعنی انسان اور جن، یہ ہدایت انبیاء اور آسمانی کتابوں کے ذریعہ ہر انسان کو پہنچتی ہے، پھر کوئی اس کو قبول کر کے مؤمن و مسلم ہو جاتا ہے کوئی رَد کر کے کافر ٹھہرتا ہے۔

تیسرا درجہ ہدایت کا اس سے بھی زیادہ خاص ہے کہ صرف مؤمنین و متقین کے ساتھ مخصوص ہے، یہ ہدایت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاواسطہ انسان پر فائض ہوتی ہے، اس ہدایت کا دوسرا نام توفیق ہے، یعنی ایسے اسباب اور حالات پیدا کر دینا کہ قرآنی ہدایات کا قبول کرنا اور اُن پر عمل کرنا آسان ہو جائے، اور اُن کی خلاف ورزی دشوار ہو جائے، اس تیسرے درجے کی وسعت غیر محدود اور اس کے درجات غیر متناہی ہیں، یہی درجہ انسان کی ترقی کا میدان ہے، اعمالِ صالحہ کے ساتھ ساتھ اس درجۂ ہدایت میں زیادتی ہوتی رہتی ہے، قرآن کریم کی متعدد آیات میں اس زیادتی کا ذکر ہے، مثلاً: وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (۴۷: ۱۷)، وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ "جو شخص اللہ پر ایمان لائے اس کے دل کو ہدایت کر دیتے ہیں"۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۹: ۶۹)	"جو لوگ ہمارے راستے میں مجاہدہ کرتے ہیں ہم اُن کو اپنے راستوں کی مزید ہدایت کر دیتے ہیں"۔

یہی وہ میدان ہے جہاں ہر بڑے سے بڑا نبی ؑ و رسول اور ولی اللہ آخر عمر تک زیادتِ ہدایت و توفیق کا طالب نظر آتا ہے، اسی مقامِ ہدایت کے متعلق مولانا رومی ؒ نے فرمایا ؎

اے برادر بے نہایت درگہے ست
ہر چہ بروے میرسی بروے مایست

اور سعدی شیرازی ؒ نے فرمایا ؎

نگویم کہ برآب قادر نیند
کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

درجات ہدایت کی اس تشریح سے آپ نے سمجھ لیا ہو گا کہ ہدایت ایک ایسی چیز ہے جو سب کو حاصل بھی ہے، اور اس کے مزید درجاتِ عالیہ حاصل کرنے سے کسی بڑے سے بڑے انسان کو استغنا بھی نہیں، اسی لئے سورۂ فاتحہ کی اہم ترین دعاء ہدایت کو قرار دیا گیا، جو ایک ادنیٰ مؤمن کے لئے بھی مناسب حال ہے، اور بڑے سے بڑے رسول ؑ اور ولی ؒ کے لئے بھی اُتنی ہی اہم ہے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخر عمر میں سورۂ فتح کے اندر فتح مکہ کے فوائد و ثمرات بتلاتے ہوئے یہ بھی ارشاد ہوا کہ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا، یعنی مکہ مکرمہ اس لئے آپ ؐ کے ہاتھوں فتح کرایا گیا تاکہ آپ ؐ کو صراطِ مستقیم کی ہدایت ہو" ظاہر ہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے نہ صرف ہدایت یافتہ بلکہ دوسروں کے لئے بھی ہدایت مجسم تھے، پھر اس موقع پر آپ ؐ کو ہدایت ہونے کے اس کے سوا کوئی معنی نہیں ہو سکتے کہ ہدایت

کا کوئی بہت اعلیٰ مقام آپؐ کو اس وقت حاصل ہوا۔

ہدایت کی اس تشریح سے آپ کے لئے فہمِ قرآن میں بہت سے فوائد حاصل ہوگئے۔

اوّل یہ کہ قرآن میں کہیں تو ہدایت کو ہر مؤمن و کافر کے لئے بلکہ کل مخلوقات کے لئے عام فرمایا گیا ہے، اور کہیں اس کو محض متقین کے ساتھ مخصوص لکھا گیا، جس میں ناواقف کو تعارض کا شبہ ہوسکتا ہے، ہدایت کے عام وخاص درجات معلوم ہونے کے بعد یہ شبہ خود بخود رفع ہوجاتا ہے کہ ایک درجہ سب کو عام اور شامل ہے، اور دوسرا درجہ مخصوص ہے۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ قرآن میں ایک طرف تو جگہ جگہ یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالمین یا فاسقین کو ہدایت نہیں فرماتے، اور دوسری طرف مکرّر سکرّر یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت فرماتے ہیں، اس کا جواب بھی درجات کی تفصیل سے واضح ہوگیا کہ ہدایتِ عامہ سب کو کی جاتی ہے، اور ہدایت کا تیسرا مخصوص درجہ ظالمین وفاسقین کو نصیب نہیں ہوتا۔

تیسرا فائدہ:۔ یہ ہے کہ ہدایت کے تین درجات میں سے پہلا اور تیسرا درجہ بلاواسطہ حق تعالیٰ کا فعل ہے، اس میں کسی نبی یا رسول کا دخل نہیں، انبیاء علیہم السلام اور رسولوں کا کام صرف دوسرے درجۂ ہدایت سے متعلق ہے۔

قرآن کریم میں جہاں کہیں انبیاء علیہم السلام کو ہادی قرار دیا ہے وہ اسی دوسرے درجے کے اعتبار سے ہے، اور جہاں یہ ارشاد ہے: اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ (۲۸: ۵۶) یعنی "آپؐ ہدایت نہیں کرسکتے جسکو چاہیں"، تو اس میں ہدایت کا تیسرا درجہ مراد ہے یعنی توفیق دینا آپؐ کا کام نہیں۔

الغرض اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ایک جامع اور اہم ترین دعا ہے جو انسان کو سکھلائی گئی ہے، انسان کا کوئی فرد اِس سے بے نیاز نہیں، دین اور دنیا دونوں میں صراط مستقیم کے بغیر فلاح و کامیابی نہیں، دنیا کی اُلجھنوں میں بھی صراطِ مستقیم کی دعا نسخۂ اکسیر ہے، مگر لوگ توجہ نہیں کرتے، ترجمہ اس آیت کا یہ ہے کہ "بتلا دیجئے ہم کو راستہ سیدھا"۔

صراطِ مستقیم کونسا راستہ ہے؟ سیدھا راستہ وہ ہے جس میں موڑ نہ ہوں، اور مراد اس سے دین کا وہ راستہ ہے جس میں افراط اور تفریط نہ ہو، افراط کے معنی حد سے آگے بڑھنا اور تفریط کے معنی کوتاہی کرنا، پھر اس کے بعد کی دو آیتوں میں اُس صراطِ مستقیم کا پتہ دیا گیا ہے جسکی دعا اس آیت میں تلقین کی گئی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ "یعنی راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا"، اور وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا ان کی تفصیل ایک دوسری آیت میں اس طرح آئی ہے: اَلَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ۚ "یعنی وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا، یعنی انبیاء اور صدّیقین اور شہداء اور صالحین"، مقبولانِ بارگاہِ الٰہی

کے یہ چار درجات ہیں، جن میں سب سے اعلیٰ انبیاء علیہم السلام ہیں، اور صدیقین وہ لوگ ہیں جو انبیاءؑ کی امت میں سب سے زیادہ رتبے کے ہوتے ہیں، جن میں کمالاتِ باطنی بھی ہوتے ہیں، عرف میں اُن کو اولیاء کہا جاتا ہے، شہداء وہ ہیں جنھوں نے دین کی محبت میں اپنی جان تک دیدی، اور صلحاء وہ ہیں جو شریعت کے پورے متبع ہوتے ہیں، واجبات میں بھی مستحبات میں بھی، جن کو عرف میں نیک دیندار کہا جاتا ہے۔

اس آیت میں پہلے مثبت اور ایجابی طریق سے صراطِ مستقیم کو متعین کیا گیا ہے کہ ان چار طبقوں کے حضرات جس راستے پر چلیں وہ صراطِ مستقیم ہے، اس کے بعد آخر کی آیت میں سلبی اور منفی صورت سے اس کی تعیین کی گئی ہے، ارشاد ہے:

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ "یعنی نہ راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا، اور نہ اُن لوگوں کا جو راستے سے گم ہوگئے"، مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے وہ لوگ مراد ہیں جو دین کے احکام کو جاننے پہچاننے کے باوجود شرارت یا نفسانی اغراض کی وجہ سے اُن کی خلاف ورزی کرتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں احکامِ الٰہیہ کی تعمیل میں کوتاہی (یعنی تفریط) کرتے ہیں، جیسے عام طور پر یہود کا حال تھا، کہ دنیا کے ذلیل مفاد کی خاطر دین کو قربان کرتے اور انبیاءؑ کی توہین کرتے تھے، اور ضَآلِّيْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو ناواقفیت اور جہالت کے سبب دین کے معاملے میں غلط راستے پر پڑگئے، اور دین کی مقررہ حدود سے نکل کر افراط اور غلو میں مبتلا ہوگئے، جیسے عام طور پر نصاریٰ تھے، کہ نبی کی تعظیم میں اتنے بڑھے کہ انھیں کو خدا بنالیا، ایک طرف یہ ظلم کہ اللہ کے انبیاءؑ کی بات نہ مانیں، اُنھیں قتل تک کرنے سے گریز نہ کریں، اور دوسری طرف یہ زیادتی کہ ان کو خدا بنالیں۔

آیت کا حاصل مطلب یہ ہوا کہ ہم وہ راستہ نہیں چاہتے جو اغراضِ نفسانی کے تابع بدعمل اور دین میں تفریط کرنے والوں کا ہے، اور نہ وہ راستہ چاہتے ہیں جو جاہل گمراہ اور دین میں غلو (افراط) کرنے والوں کا ہے، بلکہ اُن کے درمیان کا سیدھا راستہ چاہتے ہیں، جس میں نہ افراط ہے نہ تفریط، اور جو شہوات اور اغراضِ نفسانی کے اتباع سے نیز شبہات اور عقائدِ فاسدہ سے پاک ہے۔

سورۂ فاتحہ کی ساتوں آیات کی تفسیر ختم ہوگئی، اس پوری سورت کا خلاصہ اور حاصل مطلب دعاء ہے کہ یا اللہ ہمیں صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا فرما، اور چونکہ دنیا میں صراطِ مستقیم کا پہچاننا ہی سب سے بڑا علم اور بڑی کامیابی ہے، اور اسی کی پہچان میں غلطی ہونے سے اقوامِ عالم تباہ ہوتی ہیں، ورنہ خدا طلبی اور اس کے لئے مجاہدات کی تو بہت سے کفار میں بھی کوئی کمی نہیں، اسی لئے قرآن نے صراطِ مستقیم کو پوری وضاحت کے ساتھ ایجابی اور سلبی دونوں پہلوؤں سے واضح فرمایا ہے۔

صراطِ مستقیم کتاب اللہ اور رجال اللہ دونوں کے مجموعہ سے ملتا ہے

یہاں ایک بات قابلِ غور ہے اور اسمیں غور کرنے سے ایک بڑے علم کا دروازہ کھلتا ہے وہ یہ کہ صراطِ مستقیم کی تعیین کیلئے بظاہر صاف بات یہ تھی کہ صراط الرسولؐ یا صراط القرآن فرمادیا جاتا

جو مختصر بھی تھا اور واضح بھی، کیونکہ پورا قرآن درحقیقت صراطِ مستقیم کی تشریح ہے، اور پوری تعلیماتِ رسولؐ اسی کی تفصیل، لیکن قرآن کی اس مختصر سورت میں اختصار اور وضاحت کے اس پہلو کو چھوڑ کر صراطِ مستقیم کی تعیین کے لئے اللہ تعالیٰ نے مستقل دو آیتوں میں ایجابی اور سلبی پہلوؤں سے صراطِ مستقیم کو اس طرح متعین فرمایا کہ اگر سیدھا راستہ چاہتے ہو تو ان لوگوں کو تلاش کرو اور ان کے طریق کو اختیار کرو، قرآن کریم نے اس جگہ نہ یہ فرمایا کہ قرآن کا راستہ اختیار کرو، کیونکہ محض کتاب انسانی تربیت کے لئے کافی نہیں، اور نہ یہ فرمایا کہ رسولؐ کا راستہ اختیار کرو، کیونکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بقاء اس دنیا میں دائمی نہیں، اور آپؐ کے بعد کوئی دوسرا رسول اور نبی نہیں، اس لئے صراطِ مستقیم جن لوگوں کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے اُن میں نبیّین کے علاوہ ایسے حضرات بھی شامل کر دیئے گئے، جو تا قیامت ہمیشہ موجود رہیں گے، مثلاً صدیقین، شہداء اور صالحین۔

خلاصہ یہ ہے کہ سیدھا راستہ معلوم کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے کچھ رجال اور انسانوں کا پتہ دیا، کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا، ایک حدیث میں ہے کہ جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کرامؓ کو خبر دی کہ پچھلی امتوں کی طرح میری امت بھی سترّ فرقوں میں بٹ جائے گی، اور صرف ایک جماعت ان میں حق پر ہوگی، تو صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا کہ وہ کونسی جماعت ہے؟ اس پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جواب دیا ہے اس میں بھی کچھ رجال اللہ ہی کا پتہ دیا گیا ہے، فرمایا: "ما انا علیہ و اصحابی" یعنی حق پر وہ جماعت ہوگی جو میرے اور میرے صحابہؓ کے طرز پر ہو۔

اس خاص طرز میں شاید اس کی طرف اشارہ ہو کہ انسان کی تعلیم و تربیت محض کتابوں اور روایتوں سے نہیں ہو سکتی، بلکہ رجال ماہرین کی صحبت اور ان سے سیکھ کر حاصل ہوتی ہے، یعنی درحقیقت انسان کا معلّم اور مربّی انسان ہی ہو سکتا ہے، محض کتاب معلّم اور مربّی نہیں ہو سکتی، بقول اکبر مرحوم ؎

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں
آدمی، آدمی بناتے ہیں

اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو دنیا کے تمام کاروبار میں مشاہد ہے، کہ محض کتابی تعلیم سے نہ کوئی کپڑا سینا سیکھ سکتا ہے، نہ کھانا پکانا، نہ ڈاکٹری کی کتاب پڑھ کر کوئی ڈاکٹر بن سکتا ہے، نہ انجینیری کی کتابوں کے محض مطالعے سے کوئی انجینیئر بنتا ہے، اسی طرح قرآن و حدیث کا محض مطالعہ انسان کی تعلیم اور اخلاقی تربیت کے لئے ہرگز کافی نہیں ہو سکتا، جب تک اس کو کسی محقق ماہر سے باقاعدہ حاصل نہ کیا جائے، قرآن و حدیث کے معاملے میں بہت سے لکھے پڑھے آدمی اس مغالطے میں مبتلا ہیں کہ محض ترجمے یا تفسیر دیکھ کر وہ قرآن کے ماہر ہو سکتے ہیں، یہ بالکل فطرت کے خلاف تصور ہے، اگر محض کتاب کافی ہوتی تو رسولوںؑ کے بھیجنے کی ضرورت نہ تھی، کتاب کے ساتھ رسولؐ کو معلّم بنا کر بھیجنا اور

صراط مستقیم کو متعین کرنے کے لئے اپنے مقبول بندوں کی فہرست دینا اس کی دلیل ہے کہ محض کتاب کا مطالعہ تعلیم و تربیت کے لئے کافی نہیں، بلکہ کسی ماہر سے سیکھنے کی ضرورت ہے۔

معلوم ہوا کہ انسان کی صلاح و فلاح کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں، ایک کتاب اللہ جس میں انسانی زندگی کے ہر شعبے سے متعلقہ احکام موجود ہیں، دوسرے رجال اللہ، یعنی اللہ والے، ان سے استفادے کی صورت یہ ہے کہ کتاب اللہ کے معروف اصول پر رجال اللہ کو پرکھا جائے، جو اس معیار پر نہ اُتریں، ان کو رجال اللہ ہی نہ سمجھا جائے، اور جب رجال اللہ صحیح معنی میں حاصل ہوجائیں، تو ان سے کتاب اللہ کا مفہوم سیکھنے اور عمل کرنے کا کام لیا جائے۔

فرقہ وارانہ اختلافات کا بڑا سبب

یہی ہے کہ کچھ لوگوں نے صرف کتاب اللہ کو لے لیا، رجال اللہ سے قطع نظر کرلی، اُن کی تفسیر و تعلیم کو کوئی حیثیت نہ دی، اور کچھ لوگوں نے صرف رجال اللہ کو معیارِ حق سمجھ لیا، اور کتاب اللہ سے آنکھ بند کرلی، اور ان دونوں طریقوں کا نتیجہ گمراہی ہے۔

سُورۂ فاتحہ کے متعلق احکام و مسائل

سورۂ فاتحہ میں پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء ہے، پھر صرف اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کا اقرار اور اس کا اظہار ہے کہ ہم اسکے سوا کسی کو اپنا حاجت روا نہیں سمجھتے، یہ گویا حلف وفاداری ہے جو انسان اپنے رب کے ساتھ کرتا ہے، اس کے بعد پھر ایک اہم دعاء ہے جو تمام انسانی مقاصد وضروریات پر حاوی ہے، اور اس میں بہت سے فوائد اور مسائل ضمنی آئے ہیں، ان میں سے چند اہم مسائل کو لکھا جاتا ہے:۔

دعاء کرنے کا طریقہ

(۱) اس خاص اسلوب کلام کے ذریعہ انسان کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جب اللہ جل شانہٗ سے کوئی دعاء و درخواست کرنا ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کی حمد و ثناء کا فرض بجالاکر پھر حلفِ وفاداری اس بات کا کرو کہ ہم اسکے سوا نہ کسی کو لائق عبادت سمجھتے ہیں اور نہ کسی کو حقیقی معنی میں مشکل کشا اور حاجت روا مانتے ہیں، اس کے بعد اپنے مطلب کی دعاء کرو، اس طریقہ سے جو دعاء کی جائیگی اس کے قبول ہونے کی قوی امید ہے (احکامِ جصاص)

اور دعاء میں بھی ایسی جامع دعاء اختیار کرو جس میں اختصار کے ساتھ انسان کے تمام مقاصد داخل ہوجائیں، جیسے ہدایتِ صراط مستقیم کہ دنیا و دین کے ہر کام میں اگر انسان کا راستہ سیدھا ہوجائے تو کہیں ٹھوکر لگنے اور نقصان پہونچنے کا خطرہ نہیں رہتا، غرض اس جگہ خود حق تعالیٰ کی طرف سے اپنی حمد و ثناء بیان کرنے کا اصل مقصد انسان کو تعلیم دینا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء انسان کا فطری فرض ہے

(۲) اس سورت کے پہلے جملے میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرنے کی تعلیم و ترغیب ہے، مگر حمد کسی نعمت یا صفت کی بناء پر ہوا کرتی ہے، یہاں کسی نعمت یا صفت

کا ذکر نہیں، اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بے شمار ہیں، اُن کا کوئی انسان احاطہ نہیں کرسکتا، جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے: وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (۱۴: ۳۴) یعنی "اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو نہیں کرسکتے" انسان اگر سارے عالم کو چھوڑ کر اپنے ہی وجود پر نظر ڈال لے تو معلوم ہوگا کہ اس کا وجود خود ایک عالمِ اصغر ہے جس میں عالمِ اکبر کے سارے نمونے موجود ہیں، اس کا بدن زمین کی مثال ہے، اُس پر اُگنے والے بال نباتات کی مثال ہیں، اُس کی ہڈیاں پہاڑوں کی شبیہ ہیں، اس کے بدن کی رگیں جس میں خون رواں ہے زمین کے نیچے بہنے والے چشموں اور نہروں کی مثال ہیں۔

انسان دو جز سے مرکب ہے، ایک بدن دوسرے رُوح، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قدر و قیمت کے اعتبار سے روح اصل، اعلیٰ اور افضل ہے، بدن محض اس کے تابع اور ادنیٰ درجہ رکھتا ہے، اس ادنیٰ جز کے متعلق بدن انسان کی تحقیق کرنے والے اطباء اور اہلِ تشریح نے بتلایا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے تقریباً پانچ ہزار مصالح اور منافع رکھے ہیں، اس کے بدن میں تین سو سے زیادہ جوڑ ہیں، ہر ایک جوڑ کو اللہ تعالیٰ ہی کی قدرتِ کاملہ نے ایسا مستحکم بنایا ہے کہ ہر وقت کی حرکت کے باوجود نہ وہ گھستا ہے، نہ اس کی مرمت کی ضرورت ہوتی ہے، عادۃً انسان کی عمر ساٹھ ستر سال ہوتی ہے، پوری عمر اس کے یہ نرم و نازک اعضاء اور اُن کے سب جوڑ اکثر اوقات اس طرح حرکت میں رہتے ہیں کہ فولاد بھی ہوتا تو گھس جاتا، مگر حق تعالیٰ نے فرمایا: نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ (۷۶: ۲۸)، یعنی "ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا، اور ہم نے ہی اس کے جوڑ بند مضبوط کئے" اسی قدرتی مضبوطی کا نتیجہ ہے کہ عام عادت کے مطابق یہ نرم و نازک جوڑ ستر برس اور اس سے بھی زیادہ عرصہ تک کام دیتے ہیں، انسانی اعضاء میں صرف ایک آنکھ ہی کو لے لیجئے، اس میں جو اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی حکمت بالغہ کے مظاہر موجود ہیں، انسان کو عمر بھر خرچ کرکے بھی اُن کا پورا ادراک آسان نہیں۔

پھر اس آنکھ کے صرف ایک مرتبہ کے عمل کو دیکھ کر یہ حساب لگائیے کہ اس ایک منٹ کے عمل میں حق تعالیٰ کی کتنی نعمتیں کام کر رہی ہیں، تو حیرت ہوتی ہے، کیونکہ آنکھ اُٹھی اور اس نے کسی چیز کو دیکھا، اس میں جس طرح آنکھ کی اندرونی طاقتوں نے عمل کیا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی بیرونی مخلوقات کا اس میں بڑا حصہ ہے، اگر آفتاب کی روشنی نہ ہو تو آنکھ کے اندر کی روشنی کام نہیں دے سکتی، پھر آفتاب کے لئے بھی ایک فضاء کی ضرورت ہوتی ہے، انسان کے دیکھنے اور آنکھ کو کام میں لانے کے لئے غذاء، ہوا وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ ایک مرتبہ نظر اُٹھ کر جو کچھ دیکھتی ہے اس میں پورے عالم کی طاقتیں کام کرتی ہیں، یہ ایک مرتبہ کا عمل ہوا، پھر آنکھ دن میں کتنی مرتبہ دیکھتی اور سال میں کتنی مرتبہ، عمر میں کتنی مرتبہ، یہ ایسا سلسلہ ہے جس کے اعداد و شمار انسانی طاقت سے خارج ہیں۔

اسی طرح کان، زبان، ہاتھ، پاؤں کے جتنے کام ہیں اُن سب میں پورے عالم کی قوتیں شامل

ہو کر کام پورا ہوتا ہے، یہ تو وہ نعمت ہے جو ہر زندہ انسان کو میسّر ہے، اُس میں شاہ و گدا، امیر و غریب کا کوئی امتیاز نہیں، اور اللہ جل شانہٗ کی بڑی بڑی نعمتیں سب ایسی ہی وقف عام ہیں کہ ہر فرد انسانی اُن سے نفع اٹھاتا ہے، آسمان، زمین ان دونوں میں اور اُن کے درمیان پیدا ہونے والی تمام کائنات، چاند، سورج، ثوابت اور سیارے، ہوا، فضاء کا نفع ہر جاندار کو پہونچ رہا ہے۔

اس کے بعد اللہ جل شانہٗ کی نعمائے خاصّہ جو انسان کے افراد میں بتقاضائے حکمت کم و بیش کر کے عطاء ہوتی ہیں، مال اور دولت، عزّت اور جاہ، راحت اور آرام سب اسی قسم میں داخل ہیں، اور اگرچہ یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ نعمائے عامّہ جو تمام انسانوں میں مساوی طور پر مشترک ہیں، جیسے آسمان، زمین اور ان کی تمام مخلوقات یہ نعمتیں بہ نسبت نعمائے خاصّہ مال، دولت وغیرہ کے زیادہ اہم اور اشرف ہیں، مگر بھولا بھالا انسان تمام افرادِ انسان میں عام ہونے کی بناء پر کبھی ان عظیم الشان نعمتوں کی طرف التفات بھی نہیں کرتا، کہ یہ کوئی نعمت ہے، صرف گرد و پیش کی معمولی چیزیں کھانے، پینے، رہنے سہنے کی خصوصی چیزوں ہی پر اس کی نظر رُک جاتی ہے۔

بہرحال یہ ایک سرسری نمونہ ہے اُن نعمتوں کا جو ہر انسان پر ہر وقت مبذول ہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا ہی چاہئے کہ انسان اپنی مقدور بھر ان احسانات و انعامات کرنے والے کی حمد و ثناء کرے، اور کرتا رہے، اسی کے تقاضائے فطرت کی تلقین کے لئے قرآن کی سب سے پہلی سورت کا سب سے پہلا کلمہ اَلْحَمْدُ لایا گیا ہے، اور اللہ کی حمد و ثناء کو عبادت میں بڑا درجہ دیا گیا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو کوئی نعمت عطا فرمائیں اور وہ اس پر الحمد للہ کہے تو ایسا ہو گیا کہ گویا جو کچھ اس نے لیا ہے اس سے افضل چیز دیدی (قرطبی از ابن ماجہ بروایت انسؓ)

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ اگر ساری دنیا کی نعمتیں کسی ایک شخص کو حاصل ہو جائیں اور وہ اس پر الحمد للہ کہہ لے تو یہ الحمد للہ اُن ساری دنیا کی نعمتوں سے افضل ہے، قرطبیؒ نے بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ الحمد للہ زبان سے کہنا بھی اللہ ہی کی ایک نعمت ہے، اور یہ نعمت ساری دنیا کی نعمتوں سے افضل ہے، اور حدیث صحیح میں ہے کہ الحمد للہ سے میزانِ عمل کا آدھا پلّہ بھر جاتا ہے، اور حمد کی حقیقت حضرت شقیق بن ابراہیمؒ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تمھیں کوئی چیز عطا فرمائے تو اوّل اس کے دینے والے کو پہچانو، پھر جو کچھ اس نے دیا ہے اس پر راضی ہو جاؤ، پھر جب تک تمھارے جسم میں اس کی عطاء کی ہوئی قوت و طاقت موجود ہے اس کی نافرمانی کے قریب نہ جاؤ (قرطبیؒ)

دوسرا کلمہ لِلّٰہِ ہے، اِس میں لفظ اللہ کے ساتھ شروع میں حرف لام لگا ہوا ہے، جس کو عربیت کے قاعدے سے لامِ اختصاص کہا جاتا ہے، جو کسی حکم یا وصف کی خصوصیت پر دلالت کرتا ہے، اس جگہ

معنی یہ ہیں کہ صرف یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء انسان کا فرض ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حمد و ثناء صرف اُسی کی ذاتِ قدوس کے ساتھ مخصوص ہے، حقیقی طور پر اس کے سوا عالم میں کوئی مستحق حمد و ثناء کا نہیں ہو سکتا، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ہاں اس کے ساتھ یہ بھی اس کا انعام ہے کہ انسان کو تہذیبِ اخلاق سکھانے کے لئے اس کو یہ بھی حکم دیدیا کہ میری نعمت و احسان جن واسطوں سے تمہارے ہاتھ آئے ان کا بھی شکر ادا کرو، کیونکہ جو شخص اپنے محسن انسان کا شکر ادا کرنے کا خوگر نہ ہو وہ خدا کا بھی شکر ادا نہیں کرے گا۔

خود اپنی مدح و ثناء کسی انسان کے لئے جائز نہیں

(۳) خود اپنی حمد و ثناء کا بیان کرنا کسی مخلوق کے لئے جائز نہیں، قرآن کریم میں ارشاد ہے:-

فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۝ (۵۳ : ۳۲)

"یعنی تم اپنی پاکی اور صفائی کا دعویٰ نہ کرو، اللہ ہی جانتا ہے کہ کون تقویٰ شعار ہے"

مطلب یہ ہے کہ انسان کی تعریف اور مدح کا مدار تقویٰ پر ہے، اور اس کا حال اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ کس کا تقویٰ کس درجے کا ہے، اور حق تعالیٰ نے جو اپنی حمد و ثنا خود بیان فرمائی، اس کی وجہ یہ ہے کہ بیچارہ انسان اس کی استعداد نہیں رکھتا کہ بارگاہِ عزّت و جلال کی حمد و ثناء کیسے بیان کرے، اور کسی کی تو کیا مجال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان حمد و ثناء کر سکے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَآ اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْكَ، "یعنی میں آپ کی ثناء کما حقہٗ نہیں کر سکتا"، اس لئے اللہ جل شانہٗ نے خود ہی حمد و ثناء کا طریقہ انسان کو تعلیم فرما دیا۔

لفظ ربّ اللہ تعالیٰ کا خاص نام ہے، غیر اللہ کو ربّ کہنا جائز نہیں

(۴) لفظ ربّ کو ایسے شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی چیز کا مالک ہو اور اس کی تربیت و اصلاح کی تدبیر اور پوری نگرانی بھی کرتا ہو اور یہ ظاہر ہے کہ ساری کائنات و مخلوقات کا ایسا رب سوائے خدا تعالیٰ کے اور کوئی نہیں ہو سکتا، اس لئے یہ لفظ اپنے اطلاق کے وقت حق تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، غیر اللہ کو ربّ کہنا جائز نہیں، صحیح مسلم کی حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے، کہ کوئی غلام یا نوکر اپنے آقا کو ربّ کہے، البتہ کسی خاص چیز کی طرف اضافت کر کے انسان وغیرہ کے لئے بھی یہ لفظ بولا جا سکتا ہے، مثلاً رَبُّ الْمَالِ، رَبُّ الدَّارِ وغیرہ (قرطبی)

استعانت کے معنی کی تشریح اور مسئلۂ توسّل کی تحقیق

(۵) اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کے معنی مفسّر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ بیان فرمائے ہیں کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں، تیرے سوا کسی سے نہیں مانگتے (ابن جریرؒ، ابن ابی حاتمؒ)

بعض سلفِ صالحین نے فرمایا کہ سورۂ فاتحہ پورے قرآن کا راز (خلاصہ) ہے، اور آیت اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ پوری سورۂ فاتحہ کا راز (خلاصہ) ہے، کیونکہ اس کے پہلے جملے میں شرک سے بَری ہونے کا اعلان ہے، اور دوسرے جملے میں اپنی قوت و قدرت سے بَری ہونے کا اظہار ہے کہ بندہ عاجز بغیر اللہ تعالیٰ کی مدد کے کچھ نہیں کرسکتا، جس کا نتیجہ اپنے سب کاموں کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا ہے، جس کی ہدایت قرآن کریم میں جابجا آئی ہے: فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ (ھود: ۱۲۳) قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا (سورۂ ملک: ۲۹)، رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا۔ (مزمل: ۹)

ان تمام آیات کا حاصل یہی ہے کہ مؤمن اپنے ہر عمل میں اعتماد اور بھروسہ نہ اپنی قابلیت پر کرے نہ کسی دوسرے کی مدد پر، بلکہ کلّی اعتماد صرف اللہ تعالیٰ ہی پر ہونا چاہئے، وہی کارسازِ مطلق ہے۔

اس سے دو مسئلے اصولِ عقائد کے ثابت ہوئے، اوّل یہ کہ:۔

اللہ کے سوا کسی کی عبادت روا نہیں اس کی عبادت میں کسی کو شریک کرنا حرام اور ناقابلِ معافی جرم ہے

عبادت کے معنی اوپر معلوم ہو چکے ہیں کہ کسی ذات کی انتہائی عظمت و محبت کی بناء پر اس کے سامنے اپنی انتہائی عاجزی اور تذلّل کا اظہار ہے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی مخلوق کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے، تو یہی شرک کہلاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ شرک صرف اسی کو نہیں کہتے کہ بت پرستوں کی طرح کسی پتھر کی مورتی وغیرہ کو خدائی اختیارات کا مالک سمجھے، بلکہ کسی کی عظمت، محبت، اطاعت کو وہ درجہ دینا جو اللہ تعالےٰ ہی کا حق ہے یہ بھی شرک جلی میں داخل ہے، قرآن مجید میں یہود و نصاریٰ کے شرک کا بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۹: ۳۱) | "یعنی ان لوگوں نے اپنے دینی عالموں کو اپنا رب بنالیا ہے"

حضرت عدی بن حاتمؓ جو مسلمان ہونے سے پہلے نصرانی تھے انھوں نے اس آیت کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم تو اپنے علماء کی عبادت نہیں کرتے تھے، پھر قرآن میں ان کو معبود بنانے کا الزام ہم پر کیسے لگایا گیا، آپؐ نے فرمایا کیا ایسا نہیں ہے کہ تمھارے علماء بہت سی ایسی چیزوں کو حرام قرار دیدیتے ہیں جن کو اللہ نے حلال کیا ہے، اور تم اپنے علماء کے کہنے پر ان کو حرام ہی سمجھتے ہو، اور بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے تمھارے علماء ان کو حلال کر دیتے ہیں، تو تم ان کے کہنے کا اتباع کر کے حلال کر لیتے ہو، عدی بن حاتمؓ نے عرض کیا کہ بیشک ایسا تو ہے، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی تو اُن کی عبادت ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کے حلال یا حرام قرار دینے کا حق صرف حق تعالیٰ کا ہے، جو شخص اس

میں کسی دوسرے کو شریک قرار دے اور اللہ تعالیٰ کے احکام حرام و حلال معلوم ہونے کے باوجود ان کے خلاف کسی دوسرے کے قول کو واجب الاتباع سمجھے وہ گویا اس کی عبادت کرتا ہے، اور شرک میں مبتلا ہے۔

عام مسلمان جو قرآن و سنت کو براہِ راست سمجھنے کی اور ان سے احکامِ شرعیہ نکالنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اس لئے کسی امام مجتہد، یا عالم و مفتی کے قول پر اعتماد کر کے عمل کرتے ہیں اُن کا اِس آیت سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ وہ درحقیقت قرآن و سنت ہی پر عمل ہے اور احکامِ خداوندی ہی کی اطاعت ہے، اور خود قرآن کریم نے اس کی ہدایت فرمائی ہے:

فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۶: ۴۳)	"یعنی اگر تم خود احکامِ الٰہیہ کو نہیں جانتے، تو اہلِ علم سے پوچھ لو۔"

اور جس طرح احکام حلال و حرام میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو شریک کرنا شرک ہے اسی طرح کسی کے نام کی نذر (منت) ماننا بھی شرک میں داخل ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو حاجت روا مشکل کشا سمجھ کر اُس سے دعاء مانگنا بھی شرک ہے، کیونکہ حدیث میں دعاء کو عبادت فرمایا گیا ہے۔

اسی طرح ایسے اعمال و افعال جو علاماتِ شرک کی سمجھے جاتے ہیں ان کا ارتکاب بھی بحکمِ شرک ہے، جیسے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ (مسلمان ہونے کے بعد) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو میرے گلے میں صلیب پڑی ہوئی تھی، آپؐ نے مجھ سے فرمایا کہ اس بُت کو اپنے گلے سے نکال دو۔

اگرچہ اُس وقت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کا عقیدہ صلیب کے متعلق وہ نہ تھا جو نصرانیوں کا ہوتا ہے، مگر ظاہری طور پر بھی علامتِ شرک سے اجتناب کو ضروری سمجھ کر یہ ہدایت کی گئی، افسوس کہ آجکل ہزاروں مسلمان ریڈ کراس کا صلیبی نشان لگائے ہوئے پھرتے ہیں، اور کوئی پروا نہیں کرتے، کہ بلا وجہ ایک مشرکانہ جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں، اسی طرح کسی کو رکوع، سجدہ کرنا، یا بیت اللہ کے سوا کسی دوسری چیز کے گرد طواف کرنا، یہ سب علامات شرک ہیں جن سے اجتناب اِيَّاكَ نَعْبُدُ کے اقرار یا حلف وفاداری کا جُزء ہے، دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ استعانت اور استغاثہ صرف اللہ تعالیٰ ہی سے کرنا ہے کسی دوسرے سے جائز نہیں۔

مسئلہ استعانت و توسل کی تحقیق اور احکام کی تفصیل

یہ دوسرا مسئلہ کسی سے مدد مانگنے کا ذرا تشریح طلب ہے، کیونکہ ایک مدد تو مادّی اسباب کے ماتحت ہر انسان دوسرے انسان سے لیتا ہے، اس کے بغیر اس دنیا کا نظام چل ہی نہیں سکتا، صنعت کار اپنی صنعت کے ذریعہ ساری مخلوق کی خدمت کرتا ہے، مزدور، معمار، بڑھئی، لوہار سب مخلوق کی مدد میں لگے ہوئے ہیں، اور ہر شخص ان سے مدد لینے مانگنے پر مجبور ہے، ظاہر ہے کہ یہ کسی دین اور شریعت میں ممنوع نہیں، وہ اُس استعانت میں داخل نہیں، جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے، اسی طرح غیر مادّی اسباب کے ذریعہ کسی نبی یا ولی سے دعاء کرنے

کی مدد مانگنا یا ان کا وسیلہ دے کر براہِ راست اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا روایاتِ حدیث اور اشاراتِ قرآن سے اس کا بھی جواز ثابت ہے، وہ بھی اُس استعانت میں داخل نہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص اور غیر اللہ کے لئے حرام و شرک ہے۔

اب وہ مخصوص استعانت و امداد جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور غیر اللہ کے لئے شرک ہے کونسی ہے اس کی دو قسمیں ہیں، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی فرشتے یا پیغمبر یا ولی یا کسی اور انسان کو خدا تعالیٰ کی طرح قادرِ مطلق اور مختار مطلق سمجھ کر اس سے اپنی حاجت مانگے، یہ تو ایسا کھلا ہوا کفر ہے کہ عام مشرکین بُت پرست بھی اس کو کفر سمجھتے ہیں، اپنے بُتوں، دیوتاؤں کو بالکل خدا تعالیٰ کی مثل قادرِ مطلق اور مختارِ مطلق یہ کفار بھی نہیں مانتے۔

دوسری قسم وہ ہے جس کو کفار اختیار کرتے ہیں، اور قرآن اور اسلام اس کو باطل و شرک قرار دیتا ہے، اِیَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں یہی مراد ہے، کہ ایسی استعانت و امداد ہم اللہ کے سوا کسی سے نہیں چاہتے، وہ یہ ہے کہ اللہ کی کسی مخلوق فرشتے یا پیغمبر یا ولی یا کسی دیوتا کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ اگرچہ قادرِ مطلق اللہ تعالیٰ ہی ہے اور کامل اختیارات اسی کے ہیں، لیکن اس نے اپنی قدرت و اختیار کا کچھ حصہ فلاں شخص کو سونپ دیا ہے، اور اُس دائرے میں وہ خود مختار ہے یہی وہ استعانت و استمداد ہے جو مومن و کافر میں فرق اور اسلام و کفر میں امتیاز کرتی ہے، قرآن اس کو شرک و حرام قرار دیتا ہے، بت پرست مشرکین اس کے قائل اور اس پر عامل ہیں۔

اس معاملے میں دھوکہ یہاں سے لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بہت سے فرشتوں کے ہاتھوں دنیوی نظام کے بہت سے کام جاری کرتے ہیں، دیکھنے والا اس مغالطے میں پڑ سکتا ہے کہ اس فرشتے کو اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار سپرد کر دیا ہے، یا انبیاء علیہم السلام کے ذریعے بہت سے ایسے کام وجود میں آتے ہیں جو عام انسانوں کی قدرت سے خارج ہیں، جن کو معجزات کہا جاتا ہے، اسی طرح اولیاء اللہ کے ذریعے بھی ایسے ہی بہت سے کام وجود میں آتے ہیں، جن کو کرامات کہا جاتا ہے، یہاں سرسری نظر والوں کو یہ مغالطہ لگ جاتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کاموں کی قدرت و اختیار ان کو سپرد نہ کرتا تو اُن کے ہاتھ سے یہ کیسے وجود میں آتے؟ اس سے وہ ان انبیاء و اولیاء کے ایک درجے میں مختار کار ہونے کا عقیدہ بنا لیتے ہیں حالانکہ حقیقت یوں نہیں، بلکہ معجزات اور کرامات براہِ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، صرف اس کا ظہور پیغمبرؑ یا ولیؒ کے ہاتھوں پر ان کی عظمت ثابت کرنے کے لئے کیا جاتا ہے، پیغمبرؑ اور ولیؒ کو اس کے وجود میں لانے کا کوئی اختیار نہیں ہوتا، قرآن مجید کی بے شمار آیات اس پر شاہد ہیں، مثلاً آیت وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۸: ۱۷) میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معجزے کا ذکر ہے جس میں آپؐ نے دشمن کے لشکر کی طرف ایک مٹھی کنکریوں کی پھینکی، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے

وہ سارے لشکر کی آنکھوں میں جا لگیں، اس کے متعلق ارشاد ہے کہ یہ آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھی"، جس سے معلوم ہوا کہ معجزہ جو نبیؑ کے واسطہ سے صادر ہوتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کو جب اُن کی قوم نے کہا کہ اگر آپ سچے ہیں تو جس عذاب سے ڈرا رہے ہیں وہ بلا لیجئے، تو انھوں نے فرمایا:- اِنَّمَا یَاْتِیْکُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ (ہود: ۳۳) "یعنی معجزہ کے طور پر آسمانی عذاب نازل کرنا میرے قبضے میں نہیں، اللہ تعالیٰ اگر چاہے گا تو یہ عذاب آجائے گا پھر تم اس سے بھاگ نہ سکو گے"۔

سورۂ ابراہیم میں انبیاءؑ و رسلؑ کی ایک جماعت کا یہ قول ذکر فرمایا ہے وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۱۴: ۱۱) یعنی کسی معجزہ کا صادر کرنا ہمارے ہاتھ میں نہیں، اللہ تعالیٰ کے اذن و مشیت کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا" اسی وجہ سے کوئی پیغمبر یا کوئی ولی جب چاہے جو چاہے معجزہ یا کرامات دکھادے یہ قطعاً کسی کے بس میں نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاءؑ سے بہت سے معین معجزات کا مطالبہ مشرکین نے کیا، مگر جس کو اللہ تعالیٰ نے چاہا ظاہر کردیا جس کو نہ چاہا نہیں ہوا، پورا قرآن اس کی شہادتوں سے بھرا ہوا ہے۔

ایک محسوس مثال سے اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ آپ جس کمرے میں بیٹھے ہیں اس میں بجلی کی روشنی بلب سے اور ہوا برقی پنکھے سے آپ کو پہونچ رہی ہے، مگر یہ بلب اور پنکھا اس روشنی اور ہوا پہنچانے میں قطعاً خود مختار نہیں، بلکہ ہر آن اس جوڑ (کنکشن) کے محتاج ہیں جو تار کے ذریعے پاور ہاؤس کے ساتھ اُن کو حاصل ہے، ایک سیکنڈ کے لئے یہ جوڑ ٹوٹ جائے، تو نہ بلب آپ کو روشنی دے سکتا ہے، نہ پنکھا ہوا دے سکتا ہے، کیونکہ درحقیقت وہ عمل بلب اور پنکھے کا ہے ہی نہیں، بلکہ بجلی کی رَو کا ہے، جو پاور ہاؤس سے یہاں پہنچ رہی ہے، انبیاءؑ و اولیاءؒ اور سب فرشتے ہر عمل میں ہر کام میں ہر آن حق تعالیٰ کے محتاج ہیں، اسی کی قدرت و مشیت سے سب کام وجود میں آتے ہیں، اگرچہ ظہور اس کا بلب اور پنکھے کی طرح انبیاءؑ و اولیاءؒ کے ہاتھوں پر ہوتا ہے۔

اس مثال سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ ان چیزوں کے صدور اور وجود میں اگرچہ اختیار انبیاءؑ و اولیاءؒ کا نہیں مگر اُن کا وجود باجود اُن سے بالکل بے دخل بھی نہیں، جیسے بلب اور پنکھے کے بغیر آپ کو روشنی اور ہوا نہیں پہونچ سکتی یہ معجزات و کرامات بھی انبیاءؑ و اولیاءؒ کے بغیر نہیں ملتے، اگرچہ یہ فرق ضرور ہو کہ پوری فٹنگ اور کنکشن درست ہونے کے باوجود آپ کو بغیر بلب کے روشنی اور بغیر پنکھے کے ہوا کا ملنا عادۃً ناممکن ہے، اور معجزات و کرامات میں حق تعالیٰ کو سب کچھ قدرت ہے، کہ بغیر واسطہ کسی پیغمبرؑ و ولیؒ کے بھی اس کا ظہور فرمادیں، مگر عادۃ اللہ یہی ہے کہ اُن کا صدور بغیر واسطۂ اولیاءؒ و انبیاءؑ کے

نہیں ہوتا، کیونکہ ایسے خوارق عادات کے اظہار سے جو مقصد ہو وہ اس کے بغیر پورا نہیں ہوتا۔

اس لئے معلوم ہوا کہ عقیدہ تو یہی رکھنا ہو کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیت سے ہو رہا ہے، اس کے ساتھ انبیاءؑ و اولیاءؒ کی عظمت و ضرورت کا بھی اعتراف ضروری ہے، اس کے بغیر رضائے الٰہی اور طاعتِ احکامِ خداوندی سے محروم رہے گا، جس طرح کوئی شخص بلب اور پنکھے کی قدر نہ پہچانے اور ان کو ضائع کر دے تو روشنی اور ہوا سے محروم رہتا ہے۔

وسیلہ، استعانت اور استمداد کے مسئلے میں بکثرت لوگوں کو اشکال رہتا ہے، امید ہو کہ اس تشریح سے اصل حقیقت واضح ہو جائے گی، اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ انبیاءؑ و اولیاءؒ کو وسیلہ بنانا نہ مطلقاً جائز ہے اور نہ مطلقاً ناجائز، بلکہ اس میں وہ تفصیل ہے جو اوپر ذکر کی گئی ہے کہ کسی کو مختار مطلق سمجھ کر وسیلہ بنایا جائے تو شرک و حرام ہے، اور محض واسطہ اور ذریعہ سمجھ کر کیا جائے تو جائز ہے، اس میں عام طور پر لوگوں میں افراط و تفریط کا عمل نظر آتا ہے۔

واللہ اسأل الصواب والسداد وبیدہ المبدأ والمعاد

صراطِ مستقیم کی ہدایت دنیا و دین میں کلیدِ کامیابی ہے

(۶) اصل تفسیر میں یہ بات وضاحت سے آگئی ہے کہ قرآن کریم نے جس دعاء کو ہر شخص کے لئے ہر کام کے لئے ہر حال میں انتخاب فرمایا ہو وہ صراطِ مستقیم کی ہدایت کی دُعاء ہے، جس طرح آخرت کی کامیابی اُس صراطِ مستقیم پر موقوف ہو جو انسان کو جنت کی طرف لیجائے اسی طرح دُنیا کے سارے کاموں میں بھی غور کرو تو کامیابی کا مدار صراطِ مستقیم ہی ہے، جس کام میں وہ آلات و ذرائع اختیار کئے گئے، جس کے نتیجے میں مقصد کا حصول عادۃً لازمی ہو تو کامیابی عادۃً لازمی ہوتی ہے، جہاں کہیں انسان اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا تو اگر وہ غور کرے تو معلوم ہو جائے گا کہ کام کے کسی مرحلے میں اس نے غلطی کی ہے، صحیح راستہ ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا، اس لئے ناکامیابی ہوئی۔

اس کا حاصل یہ ہو کہ صراطِ مستقیم کی ہدایت صرف آخرت اور دین کے کاموں کے ساتھ مخصوص نہیں، دنیا کے سب کاموں کی درستی اور کامیابی بھی اسی پر موقوف ہے، اس لئے یہ دعاء ایسی ہو کہ مؤمن کو ہر وقت حرزِ جان بنانے کے قابل ہے، شرط یہ ہو کہ استحضار اور نیت کے ساتھ کی جائے، محض الفاظ کا پڑھ لینا نہ ہو، واللہ الموفق والمعین۔

بعونہٖ تعالیٰ تفسیر سورۂ فاتحہ ختم ہوئی،

و للہ الحمد اوّلہ وآخرہ وظاہرہ و باطنہٗ

۲

سُورَةُ الْبَقَرَة

نام اور تعداد آیات اس سورت کا نام سورۂ بقرہ ہے، اور اسی نام سے حدیث اور آثارِ صحابہؓ میں اس کا ذکر موجود ہے، جس روایت میں سورۂ بقرہ کہنے کو منع کیا ہے وہ صحیح نہیں (ابن کثیر) تعداد آیات دو سو چھیاسی (۲۸۶) ہیں اور کلمات چھ ہزار دو سو اکیس اور حروف پچیس ہزار پانسو ہیں (ابن کثیر)

زمانۂ نزول یہ سورت مدنی ہے، یعنی ہجرتِ مدینۂ طیبہ کے بعد نازل ہوئی، اگرچہ اس کی بعض آیات مکہ مکرمہ میں حج کے وقت نازل ہوئی ہیں، مگر وہ بھی باصطلاح مفسرین مدنی کہلاتی ہیں۔

سورۂ بقرہ قرآن کریم کی سب سے بڑی سورت ہے، اور مدینہ طیبہ میں سب سے پہلے اس کا نزول شروع ہوا، اور مختلف زمانوں میں مختلف آیتیں نازل ہوتی رہیں، یہاں تک کہ رِبا یعنی سود کے متعلق جو آیات ہیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری عمر میں فتح مکہ کے بعد نازل ہوئیں، اور اس کی ایک آیت **وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ** (۲:۲۸۱) **تو قرآن کی بالکل آخری آیت ہے**، جو سنہ ۱۰ ہجری میں ۱۰ ذی الحجہ کو منیٰ کے مقام پر نازل ہوئی، جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے فرائض ادا کرنے میں مشغول تھے، (قرطبی) اور اس کے اسّی نوّے دن کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، اور وحیِ الٰہی کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔

فضائل سورۂ بقرہ یہ قرآن کریم کی سب سے بڑی سورت اور بہت سے احکام پر مشتمل ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: "سورۂ بقرہ کو پڑھا کرو، کیونکہ اس کا پڑھنا برکت ہے، اور اس کا چھوڑنا حسرت اور بدنصیبی ہے، اور اہلِ باطل اس پر قابو نہیں پا سکتے"

قرطبی نے حضرت معاویہؓ سے نقل کیا ہے کہ اس جگہ اہلِ باطل سے مراد جادوگر ہیں، مراد یہ ہے کہ اس سورت کے پڑھنے والے پر کسی کا جادو نہ چلے گا (قرطبی از مسلم بروایت ابو امامہ باہلی)

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس گھر میں سورۂ بقرہ پڑھی جائے شیطان وہاں سے بھاگ جاتا ہے (ابن کثیر از حاکم)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سورۂ بقرہ سنام القرآن اور ذروۃ القرآن ہے"، سنام اور ذروہ ہر چیز کے اعلیٰ و افضل حصہ کو کہا جاتا ہے، اس کی ہر آیت کے نزول کے وقت اسّی فرشتے اس کے جلو میں نازل ہوئے ہیں (ابن کثیر از مسند احمد) اور حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث میں ہے کہ اس سورت میں ایک آیت ایسی ہے جو تمام آیات قرآن میں اشرف و افضل ہے، اور وہ آیت الکرسی ہے (ابن کثیر از ترمذی)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ: "سورۂ بقرہ کی دس آیتیں ایسی ہیں کہ اگر کوئی شخص اُن کو رات میں پڑھ لے تو اس رات کو جن، شیطان گھر میں داخل نہ ہوگا، اور اس کو اور اس کے اہل عیال کو اس رات میں کوئی آفت، بیماری، رنج و غم وغیرہ ناگوار چیز پیش نہ آئے گی، اور اگر یہ آیتیں کسی مجنون پر پڑھی جائیں تو اس کو افاقہ ہوجائے گا" وہ دس آیتیں یہ ہیں: چار آیتیں شروع سورۂ بقرہ کی پھر تین آیتیں درمیانی یعنی آیۃ الکرسی اور اس کے بعد کی دو آیتیں، پھر آخر سورۂ بقرہ کی تین آیتیں۔

احکام و مسائل

مضامین و مسائل کے اعتبار سے بھی سورۂ بقرہ کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے، ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بزرگوں سے سُنا ہے کہ سورۂ بقرہ میں ایک ہزار امر اور ایک ہزار نہی اور ایک ہزار حکمتیں، ایک ہزار خبر اور قصص ہیں (قرطبی و ابن کثیر) یہی وجہ ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے جب سورۂ بقرہ کو تفسیر کے ساتھ پڑھا تو اس کی تعلیم میں بارہ سال خرچ ہوئے، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے یہ سورت آٹھ سال میں پڑھی (قرطبی)

سورۂ فاتحہ درحقیقت پورے قرآن کا خلاصہ ہے، اس کے بنیادی مضامین تین ہیں: اوّل اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، یعنی پروردگارِ عالم ہونے کا بیان، دوسرے اس کا مستحق عبادت ہونا، اور اس کے سوا کسی کا لائق عبادت نہ ہونا، تیسرے طلبِ ہدایت، سورۂ فاتحہ کا آخری مضمون صراطِ مستقیم کی ہدایت طلب کرنا ہے اور درحقیقت پورا قرآن اس کے جواب میں ہے، کہ جو شخص صراطِ مستقیم چاہتا ہو قرآن ہی میں ملے گا۔

اسی لئے فاتحہ کے بعد پہلی سورت سورۂ بقرہ رکھی گئی، اور اس کو ذٰلِكَ الْكِتٰبُ سے شروع کر کے اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ جس صراطِ مستقیم کو تم ڈھونڈتے ہو وہ یہ کتاب ہے۔

اس کے بعد اس سورت میں اوّل ایمان کے بنیادی اصول: توحید، رسالت، آخرت اجمالی طور پر اور آخر سورت میں ایمان مفصل بیان فرمایا گیا ہے، اور درمیان میں ہر شعبۂ زندگی: عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاق، اصلاح ظاہر و باطن کے متعلق ہدایات کے بنیادی اصول اور اُن کے ساتھ بہت سی جزئیات بیان ہوئی ہیں۔

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ اٰيَاتُهَا ۲۸۶، رُكُوْعَاتُهَا ۴۰

سورۃ بقرہ مدنی ہے، اس میں ۲۸۶ آیتیں ہیں اور ۴۰ رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓ ① ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ②

اس کتاب میں کچھ شک نہیں راہ بتلاتی ہے ڈرنے والوں کو،

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ

جو کہ یقین کرتے ہیں بے دیکھی چیزوں کا اور قائم رکھتے ہیں نماز کو اور جو ہم نے روزی دی ہے

يُنْفِقُوْنَ ③ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ

اُن کو اس میں سے خرچ کرتے ہیں، اور وہ لوگ جو ایمان لائے اس پر کہ جو کچھ نازل ہوا تیری طرف اور اس پر

مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ④ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى

کہ جو کچھ نازل ہوا تجھ سے پہلے اور آخرت کو وہ یقینی جانتے ہیں، وہی لوگ ہیں ہدایت پر اپنے

مِّنْ رَّبِّهِمْ ۙ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ⑤

پروردگار کی طرف سے اور وہی ہیں مراد کو پہنچنے والے۔

خلاصۂ تفسیر

یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں (یعنی قرآن کے منجانب اللہ ہونے میں کسی شبہ

کی گنجائش نہیں، اگرچہ کوئی نافہم اس میں شبہ رکھتا ہو، کیونکہ یقینی بات کسی کے شبہ کرنے سے بھی حقیقت میں یقینی ہی رہتی ہے) راہ بتلانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو جو یقین لاتے ہیں چھپی ہوئی چیزوں پر (یعنی جو چیزیں اُن کے حواس وعقل سے پوشیدہ ہیں صرف اللہ و رسولؐ کے فرمانے سے ان کو صحیح مان لیتے ہیں) اور قائم رکھتے ہیں نماز کو (قائم رکھنا یہ ہے کہ اس کو پابندی کے ساتھ اس کے وقت میں پورے شرائط وارکان کے ساتھ ادا کریں) اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں (یعنی نیک کاموں میں) اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں اس کتاب پر بھی جو آپ کی طرف اتاری گئی ہے اور اُن کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے اُتاری جاچکی ہیں (مطلب یہ ہے کہ اُن کا ایمان قرآن پر بھی ہے اور پہلی کتابوں پر بھی، اور ایمان سچا سمجھنے کو کہتے ہیں عمل کرنا دوسری بات ہے، جتنی کتابیں اللہ نے پہلے انبیاءؑ پر نازل فرمائی ہیں ان کو سچا سمجھنا فرض اور شرط ایمان ہے، یعنی یہ سمجھے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی تھیں وہ صحیح ہیں خودغرض لوگوں نے جو اس میں تبدیل وتحریف کی ہے وہ غلط ہے، رہ گیا عمل سو وہ صرف قرآن پر ہوگا، پہلی کتابیں سب منسوخ ہوگئیں، اُن پر عمل جائز نہیں) اور آخرت پر بھی وہ لوگ یقین رکھتے ہیں، بس یہ لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو اُن کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب (یعنی ایسے لوگوں کو دنیا میں تو یہ نعمت ملی کہ راہِ حق ملی اور آخرت میں، ہر طرح کی کامیابی اُن کے لئے ہے)

حلِ لُغات

ذٰلِكَ کسی دُور کی چیز کی طرف اشارہ کے لئے استعمال ہوتا ہے، رَيْبَ شک وشبہ، هُدًى ہدایت سے بنا ہے، اور ہدایت کے معنی رہنمائی، مُتَّقِيْنَ جن میں صفت تقویٰ ہو، تقویٰ کے لفظی معنی بچنے کے ہیں، مراد اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنا ہے، غَيْبِ لفظی معنی ہر وہ چیز جو انسان کی نظر اور دوسرے حواس سماعت وغیرہ سے باہر ہو، يُقِيْمُوْنَ اقامت سے بنا ہے، جس کے معنی سیدھا کرنے کے ہیں، اور نماز کا سیدھا کرنا یہ ہے کہ آداب اور خشوع خضوع کے ساتھ ادا کی جائے، رَزَقْنٰهُمْ رزق سے بنا ہے، جس کے معنی ہیں روزی اور گذارے کا سامان دینا، يُنْفِقُوْنَ انفاق سے بنا ہے، خرچ کرنے کے معنی میں آتا ہے، اٰخِرَةُ لغت میں مؤخر اور بعد میں آنے والی چیز کو آخرۃ کہا جاتا ہے، اس جگہ عالمِ دنیا کے مقابلے میں عالمِ آخرت بولا گیا، يُوْقِنُوْنَ ایقان سے ہے اور وہ یقین سے بنا ہے، اور یقین اس کو کہتے ہیں جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ ہو، مُفْلِحُوْنَ افلاح سے ہے اور وہ فلاح سے بنا ہے، فلاح کے معنی پوری کامیابی۔

معارف ومسائل

حروفِ مقطعہ جو بہت سی سورتوں کے شروع میں آتے ہیں اُن کی تحقیق

الٓمّٓ، بہت سی سورتوں کے شروع میں چند حرفوں سے مرکب ایک کلمہ لایا گیا ہے جیسے الٓمّٓ، حٰمٓ، الٓمّٓصٓ وغیرہ، ان کو

اصطلاح میں حروف مقطعہ کہا جاتا ہے، انمیں سے ہر حرف جُدا جُدا ساکن پڑھا جاتا ہے، الف، لام، میم۔

حروف مقطعہ جو اوائل سُوَر میں آئے ہیں، اُن کے متعلق بعض مفسّرین نے فرمایا کہ یہ اُن سورتوں کے نام ہیں، بعض حضرات نے فرمایا کہ اسماءِ الٰہیہ کے رموز ہیں، مگر جمہور صحابہؓ و تابعینؒ اور علماءِ امت کے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہ حروف رموز و اسرار ہیں، جس کا علم سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کو نہیں اور ہو سکتا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم بطور ایک راز کے دیا گیا ہو، جس کی تبلیغ اُمت کے لئے روک دی گئی ہو، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان حروف کی تفسیر و تشریح میں کچھ منقول نہیں، امام تفسیر قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار فرمایا ہے، اُن کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

"عامر شعبی، سفیان ثوریؒ اور ایک جماعت محدثین نے فرمایا ہے کہ ہر آسمانی کتاب میں اللہ تعالیٰ کے کچھ خاص رموز و اسرار ہوتے ہیں، اسی طرح یہ حروف مقطعہ قرآن میں حق تعالیٰ کا راز ہے، اس لئے یہ اُن متشابہات میں سے ہیں جن کا علم صرف حق تعالیٰ ہی کو ہے، ہمارے لئے ان میں بحث و گفتگو بھی جائز نہیں، مگر اس کے باوجود وہ ہمارے فائدے سے خالی نہیں، اوّل تو اُن پر ایمان لانا پھر اُن کا پڑھنا ہمارے لئے ثوابِ عظیم ہے، دوسرے اُن کے پڑھنے کے معنوی فوائد و برکات ہیں، جو اگرچہ ہمیں معلوم نہ ہوں مگر غیب سے وہ ہمیں پہونچتے ہیں"

پھر فرمایا:-

"حضرت صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ، عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ جمہور صحابہؓ کا ان حروف کے متعلق یہی عقیدہ تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسرار ہیں، ہمیں اُن پر ایمان لانا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں، اور جس طرح آئے ہیں اُن کی تلاوت کرنا چاہئے، مگر معنی معلوم کرنے کی فکر میں پڑنا درست نہیں"

ابن کثیرؒ نے بھی قرطبیؒ وغیرہ سے نقل کر کے اسی مضمون کو ترجیح دی ہے، اور بعض اکابر علماء سے جو اِن حروف کے معنی منقول ہیں اس سے صرف تمثیل و تنبیہ اور تسہیل مقصود ہے، یہ نہیں کہ مراد حق تعالیٰ یہ ہے، اس لئے اس کو بھی غلط کہنا تحقیقِ علماء کے خلاف ہے۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ لفظ ذٰلِكَ کسی دُور کی چیز کی طرف اشارے کے لئے آتا ہے، اور کِتَابٌ سے مراد قرآن کریم ہے، رَيْبٌ کے معنی شک و شبہ، معنے یہ ہیں کہ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں، یہ موقع بظاہر اشارۂ بعید کا نہیں تھا، کیونکہ اسی قرآن کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو لوگوں کے سامنے ہے، مگر اشارۂ بعید سے اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ سورۂ فاتحہ میں جس صراطِ مستقیم کی درخواست کی گئی تھی یہ سارا قرآن اس درخواست کا جواب بصورتِ قبولیت اور صراطِ مستقیم کی تشریح و تفصیل ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے یہ دعا سُن لی اور قرآن

بھیج دیا، جو ہدایت کا آفتاب ہو، جو شخص ہدایت چاہتا ہے وہ اس کو پڑھے، سمجھے اور اس کے مقتضیٰ پر عمل کرے۔

اور پھر اس کے متعلق ارشاد ہے کہ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں، کیونکہ کسی کلام میں شک وشبہ کی دو صورتیں ہوتی ہیں، ایک یہ کہ خود کلام میں غلطی ہو، تو وہ کلام محلِ شک وشبہ ہو جاتا ہے، دوسرے یہ کہ سمجھنے والے کی فہم میں غلطی ہو، اس صورت میں کلام محلِ شک وشبہ نہیں ہوتا، گو کج فہمی یا کم فہمی کی وجہ سے کسی کو شبہ ہو جائے، جس کا ذکر قرآن کریم میں چند آیتوں کے بعد اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ میں آیا ہے۔

اس لئے ہزاروں کم فہموں یا کج فہموں کے شبہات واعتراضات کے باوجود یہ کہنا صحیح ہو کہ اس کتاب میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ، ہدایت ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لئے، یعنی مخصوص ہدایت جو نجاتِ آخرت کا ذریعہ بنے، وہ متقین ہی کا حصّہ ہے، اگرچہ قرآن کی ہدایت نہ صرف نوعِ بشر کے لئے بلکہ تمام کائناتِ عالم کے لئے عام ہے، سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ ہدایت کے تین درجے ہیں، ایک درجہ تمام نوعِ انسان بلکہ تمام حیوانات وغیرہ کے لئے بھی عام اور شامل ہے، دوسرا درجہ مؤمنین کے لئے خاص اور تیسرا درجہ مقربین خاص کے لئے مخصوص ہے، پھر اس کے درجات کی کوئی حد وانتہا نہیں، قرآن کریم کے مختلف مواقع میں کہیں ہدایتِ عامہ کا ذکر آیا ہے کہیں ہدایت خاصّہ کا، اِس جگہ ہدایت خاصّہ کا ذکر ہے، اس لئے متقین کی تخصیص کی گئی ہو، اس پر یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ ہدایت کی زیادہ ضرورت تو ان لوگوں کو ہے جو متقی نہیں، کیونکہ مذکورہ تحقیق سے معلوم ہو گیا کہ اس جگہ متقین کی خصوصیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن غیر متقی لوگوں کے لئے ہدایت نہیں ہے۔

متقین کی خاص صفات اس کے بعد دو آیتوں میں متقین کی مخصوص صفات وعلامات بیان کرکے یہ بتلا دیا گیا ہے کہ یہ جماعت ہدایت یافتہ ہے، انھیں کا راستہ صراطِ مستقیم ہے، جس کو سیدھا راستہ مطلوب ہو، اس جماعت میں شامل ہو جائے اُن کے ساتھ رہے، اُن کے عقائد ونظریات اور اعمال واخلاق کو اپنا نصب العین بنائے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ متقین کی مخصوص صفات بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ، یعنی یہی لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو اُن کے رب کی طرف سے ملی ہے، اور یہی لوگ ہیں پورے کامیاب۔

متقین کی صفات جو ان دو آیتوں میں بیان ہوئی ہیں ان میں ایمان کی اجمالی تعریف اور اس کے بنیادی اصول بھی آگئے ہیں، اور عملِ صالح کے بنیادی اصول بھی، اس لئے ان صفات کو ذرا وضاحت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

"یعنی خدا سے ڈرنے والے لوگ ایسے ہیں کہ یقین کرتے ہیں بے دیکھی چیزوں کا، اور قائم رکھتے ہیں نماز کو، اور جو ہم نے روزی دی ہے اُس میں سے کچھ خرچ کرتے ہیں"۔

اس آیت میں متقین کی تین صفات بیان کی گئی ہیں: ایمان بالغیب، اقامتِ صلوٰۃ، اللہ کی راہ میں خرچ کرنا، اس کے ضمن میں بہت سے اہم مسائل آگئے ہیں، ان کو کسی قدر تفصیل سے لکھا جاتا ہے۔

پہلا مسئلہ: ایمان کی تعریف ایمان کی تعریف کو قرآن نے یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کے صرف دو لفظوں میں پورا بیان کر دیا ہے، لفظ ایمان اور غیب کے معنی سمجھ لئے جاویں تو ایمان کی پوری حقیقت اور تعریف سمجھ میں آجاتی ہے۔

لغت میں کسی کی بات کو کسی کے اعتماد پر یقینی طور سے مان لینے کا نام ایمان ہے، اسی لئے محسوسات و مشاہدات میں کسی کے قول کی تصدیق کرنے کو ایمان نہیں کہتے، مثلاً کوئی شخص سفید کپڑے کو سفید یا سیاہ کو سیاہ کہہ رہا ہے اور دوسرا اس کی تصدیق کرتا ہے اس کو تصدیق کرنا تو کہیں گے ایمان لانا نہیں کہا جائے گا، کیونکہ اس تصدیق میں قائل کے اعتماد کو کوئی دخل نہیں، بلکہ یہ تصدیق مشاہدہ کی بناء پر ہے، اور اصطلاحِ شرع میں خبرِ رسول کو بغیر مشاہدہ کے محض رسُولؐ کے اعتماد پر یقینی طور سے مان لینے کا نام ایمان ہے، لفظ غیب لغت میں ایسی چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے جو نہ بدیہی طور پر انسان کو معلوم ہوں، اور نہ انسان کے حواس خمسہ اس کا پتہ لگا سکیں، یعنی نہ وہ آنکھ سے نظر آئیں، نہ کان سے سنائی دیں، نہ ناک سے سونگھ کر یا زبان سے چکھ کر اُن کا علم ہو سکے، اور نہ ہاتھ سے چُھو کر اُن کو معلوم کیا جا سکے۔

قرآن میں لفظ غیب سے وہ تمام چیزیں مراد ہیں جن کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے، اور ان کا علم بداہتِ عقل اور حواس خمسہ کے ذریعہ نہیں ہو سکتا، اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات بھی آجاتی ہیں، تقدیری امور، جنت و دوزخ کے حالات، قیامت اور اس میں پیش آنیوالے واقعات بھی، فرشتے، تمام آسمانی کتابیں اور تمام انبیاء سابقینؑ بھی جس کی تفصیل اسی سورۃ بقرہ کے ختم پر اٰمَنَ الرَّسُوْلُ میں بیان کی گئی ہے، گویا یہاں ایمان مجمل کا بیان ہوا ہے، اور آخری آیت میں ایمانِ مفصّل کا۔

تو اب ایمان بالغیب کے معنے یہ ہو گئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ہدایات و تعلیمات لے کر آئے ہیں اُن سب کو یقینی طور پر دل سے ماننا، شرط یہ ہے کہ اس تعلیم کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہونا قطعی طور پر ثابت ہو، جمہور اہل اسلام کے نزدیک ایمان کی یہی تعریف ہے (عقیدۂ طحاوی عقائد نسفی وغیرہ)

اس تعریف میں ماننے کا نام ایمان بتلایا گیا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ محض جاننے کو ایمان

نہیں کہتے، کیونکہ جہاں تک جاننے کا تعلق ہے وہ تو ابلیس و شیطان اور بہت سے کفار کو بھی حاصل ہے، کہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق کا یقین تھا، مگر اس کو مانا نہیں اس لئے وہ مؤمن نہیں۔

دوسرا مسئلہ! اقامتِ صلوٰۃ اقامت کے معنی محض نماز پڑھنے کے نہیں، بلکہ نماز کو ہر جہت اور ہر حیثیت سے درست کرنے کا نام اقامت ہے، جس میں نماز کے تمام فرائض، واجبات، مستحبات، اور پھر اُن پر دوام والتزام، یہ سب اقامت کے مفہوم میں داخل ہیں، اور صحیح یہ ہے کہ اس جگہ نماز سے کوئی خاص نماز مراد نہیں، بلکہ فرائض وواجبات اور نفلی نمازوں کو یہ لفظ شامل ہے، خلاصۂ مضمون یہ ہوا کہ وہ لوگ جو نمازوں کی پابندی بھی قواعدِ شرعیہ کے مطابق کرتے ہیں، اور اُن کے پورے آداب بھی بجالاتے ہیں۔

تیسرا مسئلہ! اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اس میں بھی صحیح اور تحقیقی بات جس کو جمہور مفسرین نے اختیار فرمایا ہے، یہی ہے کہ ہر قسم کا وہ خرچ داخل ہے جو اللہ کی راہ میں کیا جائے، خواہ فرض زکوٰۃ ہو، یا دوسرے صدقات واجبہ یا نفلی صدقات وخیرات، کیونکہ قرآن کریم میں جہاں کہیں لفظ انفاق استعمال ہوا عموماً نفلی صدقات میں یا عام معنی میں استعمال کیا گیا ہے، زکوٰۃ فرض کے لئے عموماً لفظ زکوٰۃ ہی آیا ہے۔

اس مختصر جملہ میں لفظ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ پر غور کیجئے تو ایک طرف یہ لفظ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا ایک قوی داعیہ شریف انسان کے دل میں پیدا کر دیتا ہے کہ جو کچھ مال ہمارے پاس ہے یہ سب خدا ہی کا عطا کیا ہوا اور اسی کی امانت ہے، اگر ہم اس تمام مال کو بھی اللہ کی راہ میں اس کی رضا کے لئے خرچ کر دیں تو حق اور بجا ہے، اس میں بھی ہمارا کوئی احسان نہیں ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس پر مزید اضافہ لفظ مِمَّا نے کر دیا، جس کے معنے یہ ہیں کہ ہمارے دیئے ہوئے مال کو بھی پورا خرچ کرنا نہیں، بلکہ اس کا کچھ حصہ خرچ کرنا ہے۔

یہاں متقین کی صفات کا بیان کرتے ہوئے اوّل ایمان بالغیب کا ذکر فرمایا گیا، پھر اقامتِ نماز اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا، ایمان کی اہمیت تو سب کو معلوم ہے، کہ وہی اصل الاصول اور سارے اعمال کی مقبولیت کا دار ومدار ہے، لیکن جب ایمان کے ساتھ اعمال کا بیان کیا جائے تو ان کی فہرست طویل اور فرائض وواجبات کی تعداد کثیر ہے، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اعمال میں سے صرف دو عمل نماز اور انفاقِ مال کے ذکر پر اکتفاء کرنے میں کیا راز ہے؟

اس میں غالباً اسی طرف اشارہ ہے کہ جتنے اعمال انسان پر فرض یا واجب ہیں ان کا تعلق

یا انسان کی ذات اور بدن سے ہے یا اس کے مال سے، بدنی اور ذاتی عبادات میں سب سے اہم نماز ہے. اس کا ذکر کرنے پر اکتفا کیا گیا، اور مالی عبادات سب کی سب لفظ انفاق میں داخل ہیں، اس لئے درحقیقت یہ تنہا دو اعمال کا ذکر نہیں، بلکہ تمام اعمال و عبادات اُن کے ضمن میں آگئے، اور پوری آیت کے یہ معنی ہوگئے کہ متقین وہ لوگ ہیں جن کا ایمان بھی کامل ہے اور عمل بھی، اور ایمان وعمل کے مجموعہ کا نام ہی اسلام ہے، گویا اس آیت میں ایمان کی مکمل تعریف کے ساتھ اسلام کے مفہوم کی طرف بھی اشارہ ہوگیا، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس جگہ اس کی بھی وضاحت کر دی جائے کہ ایمان اور اسلام میں کیا فرق ہے؟

ایمان اور اسلام میں فرق

لغت میں ایمان کسی چیز کی دل سے تصدیق کرنے کا نام ہے، اور اسلام اطاعت و فرمانبرداری کا، ایمان کا محل قلب ہے، اور اسلام کا بھی قلب اور سب اعضاء وجوارح لیکن شرعاً ایمان بغیر اسلام کے اور اسلام بغیر ایمان کے معتبر نہیں، یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ کی محض دل میں تصدیق کر لینا شرعاً اس وقت تک معتبر نہیں جب تک زبان سے اس تصدیق کا اظہار اور اطاعت و فرمانبرداری کا اقرار نہ کرے، اسی طرح زبان سے تصدیق کا اظہار یا فرمانبرداری کا اقرار اُس وقت تک معتبر نہیں جب تک دل میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی تصدیق نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ لغت کے اعتبار سے ایمان اور اسلام الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں، اور قرآن وحدیث میں اسی لغوی مفہوم کی بناء پر ایمان اور اسلام میں فرق کا ذکر بھی ہے، مگر شرعاً ایمان بدون اسلام کے اور اسلام بدون ایمان کے معتبر نہیں۔

جب اسلام یعنی ظاہری اقرار و فرمانبرداری کے ساتھ دل میں ایمان نہ ہو تو اس کو قرآن کی اصطلاح میں نفاق کا نام دیا گیا ہے، اور اس کو کھلے کفر سے زیادہ شدید جرم ٹھہرایا ہے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ج (۴: ۱۴۸)	"یعنی منافقین جہنم کے سب سے نیچے کے طبقہ میں رہیں گے"

اسی طرح ایمان یعنی تصدیق قلبی کے ساتھ اگر اقرار و اطاعت نہ ہو تو اس کو بھی قرآنی

نصوص میں کفر ہی قرار دیا ہے، ارشاد ہے:- يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (۲: ۱۴۶) "یعنی یہ کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی حقانیت کو ایسے یقینی طریق پر جانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں"

اور دوسری جگہ ارشاد ہے:-

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (۲۷: ۱۴) "یعنی یہ لوگ ہماری آیات کا انکار کرتے ہیں، حالانکہ اُن کے دلوں میں اُن کا یقین کامل ہے، اور اُن کی یہ حرکت محض ظلم و تکبر کی وجہ سے ہے"

میرے استاذ محترم حضرت العلّامہ سیّد محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، اس مضمون کو اس طرح بیان فرماتے تھے کہ ایمان اور اسلام کی مسافت ایک ہی، فرق صرف ابتداء و انتہاء میں ہے، یعنی ایمان قلب سے شروع ہوتا ہے اور ظاہر عمل پر پہونچ کر مکمل ہوتا ہے، اور اسلام ظاہر عمل سے شروع ہوتا ہے اور قلب پر پہونچ کر مکمل سمجھا جاتا ہے، اگر تصدیقِ قلبی ظاہری اقرار و اطاعت تک نہ پہونچے وہ تصدیقِ ایمان معتبر نہیں، اسی طرح اگر ظاہری اطاعت و اقرار تصدیق قلبی تک نہ پہونچے تو وہ اسلام معتبر نہیں۔

امام غزالیؒ اور امام سبکیؒ کی بھی یہی تحقیق ہے، اور امام ابن ہمام نے مسامرہ میں اس تحقیق پر تمام اہلِ حق کا اتفاق ذکر کیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ یعنی "متقین ایسے ہیں کہ ایمان رکھتے ہیں اُس کتاب پر بھی جو آپ کی طرف اُتاری گئی اور اُن کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے اُتاری جاچکی ہیں اور آخرت پر بھی وہی لوگ یقین رکھتے ہیں"۔

اس آیت میں متقین کی باقی صفات کا بیان ہے جس میں ایمان بالغیب کی کچھ تفصیل اور ایمان بالآخرت کا ذکر ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ عہدِ رسالتؐ میں مومنینِ متقین دو طرح کے حضرات تھے، ایک وہ جو پہلے مشرکین میں سے تھے، پھر مشرف باسلام ہوئے، دوسرے وہ جو پہلے اہلِ کتاب یہودی یا نصرانی تھے، پھر مسلمان ہوگئے، اس سے پہلی آیت میں پہلے طبقہ کا ذکر تھا، اور اس آیت میں دوسرے طبقہ کا ذکر ہے، اسی لئے اس آیت میں قرآن پر ایمان لانے کے ساتھ پچھلی آسمانی کتابوں پر ایمان لانے کی بھی تصریح فرمائی گئی کہ وہ حسبِ تصریح حدیث دوہرے ثواب کے مستحق ہیں، ایک پچھلی کتابوں کے زمانے میں ان پر ایمان لانے اور عمل کرنے کا ثواب، دوسرے قرآن کے زمانے میں قرآن پر ایمان لانے اور عمل کرنے کا ثواب، پچھلی آسمانی کتابوں پر ایمان لانا آج بھی ہر مسلمان کے لئے لازم ہے، فرق اتنا ہے

۸

کہ آج ان کتابوں پر ایمان اس طرح ہوگا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اُن کتابوں میں نازل فرمایا تھا وہ سب حق ہے، اور اُس زمانے کے لئے وہی واجب العمل تھا، مگر قرآن نازل ہونے کے بعد چونکہ پچھلی کتابیں اور شریعتیں سب منسوخ ہوگئیں، تو اب عمل صرف قرآن ہی پر ہوگا۔

مسئلہ ختم نبوت کی ایک واضح دلیل

آیت کے اس طرزِ بیان سے ایک اہم اصولی مسئلہ بھی نکل آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں، اور آپؐ کی وحی آخری وحی، کیونکہ اگر قرآن کے بعد کوئی اور کتاب یا وحی بھی نازل ہونے والی ہوتی تو جس طرح اس آیت میں پچھلی کتابوں اور وحی پر ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا ہے اسی طرح آئندہ نازل ہونے والی کتاب اور وحی پر ایمان لانے کا ذکر بھی ضروری ہوتا، بلکہ اس کی ضرورت زیادہ تھی، کیونکہ تورات وانجیل اور تمام کتبِ سابقہ پر ایمان لانا تو پہلے سے جاری اور معلوم تھا، اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی سلسلۂ وحی اور نبوت جاری ہوتا تو ضرورت اس کی تھی کہ اس کتاب اور اس نبی کا ذکر زیادہ اہتمام سے کیا جاتا جو بعد میں آنے والے ہوں تاکہ کسی کو اشتباہ نہ رہے۔

مگر قرآن نے جہاں ایمان کا ذکر کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نازل ہونے والی وحی اور پہلے انبیاءؑ کا ذکر فرمایا، بعد میں آنے والی کسی وحی یا نبی کا کہیں قطعاً ذکر نہیں، پھر صرف اسی آیت میں نہیں بلکہ قرآن کریم میں یہ مضمون اوّل سے آخر تک مختلف مقامات میں چالیس پچاس آیتوں میں آیا ہے، سب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیاءؑ، پہلی وحی، پہلی کتابوں کا ذکر ہے، کسی ایک آیت میں اس کا اشارہ تک نہیں کہ آئندہ بھی کوئی وحی یا نبی آنے والا ہے، جس پر ایمان لانا ہے، مثلاً ارشاد ہے:

(۱) وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ (سورۂ نحل: ۴۳) (۲) وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ (سورۂ مومن: ۷۸) (۳) وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا (سورۂ روم: ۴۷) (۴) وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (سورۂ نساء: ۶۰) (۵) وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ (سورۂ زمر: ۶۵) (۶) كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ (سورۂ شوریٰ: ۳) (۷) كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (بقرہ: ۱۸۳) (۸) سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا (اسرائیل: ۷۷)

ان آیات میں اور ان کی امثال دوسری آیات میں جہاں کہیں نبی یا رسول یا وحی وکتاب بھیجنے کا ذکر ہے سب کے ساتھ مِنْ قَبْلِ اور مِنْ قَبْلِكَ کی قید لگی ہوئی ہے، کہیں مِنْ بَعْدِ کا اشارہ تک نہیں، اگر ختمِ نبوّت اور انقطاعِ وحی کا دوسری آیات میں صراحۃً ذکر نہ ہوتا تو قرآن کا یہ طرز ہی اس مضمون کی شہادت کے لئے کافی تھا، مسئلہ ختمِ نبوت پر قرآنی تصریحات اور احادیثِ متواترہ کی شہادت اور امت کا اجماع تفصیل کے ساتھ دیکھنا ہو تو میرا رسالہ "ختمِ نبوّت" دیکھا جائے۔

متقین کی تفسیر میں صفتِ ایمان بالآخرۃ

اس آیت میں متقین کی دوسری صفت یہ بیان فرمائی گئی کہ وہ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، آخرت سے مراد وہ دارِ آخرت ہے جس کو قرآن میں دار القرار، دار الحیوان اور عقبیٰ کے نام سے بھی ذکر کیا گیا ہے، اور پورا قرآن اس کے ذکر اور اس کے ہولناک حالات سے بھرا ہوا ہے۔

آخرت پر ایمان ایک انقلابی عقیدہ ہے

آخرت پر ایمان لانا اگرچہ ایمان بالغیب کے لفظ میں آچکا ہے، مگر اس کو پھر صراحۃً اس لئے ذکر کیا گیا کہ یہ اجزائے ایمان میں اس حیثیت سے سب میں اہم جزء ہے کہ مقتضائے ایمان پر عمل کا جذبہ پیدا کرنا اسی کا اثر ہے۔

اور اسلامی عقائد میں یہی وہ انقلابی عقیدہ ہے جس نے دنیا کی کایا پلٹ کر کے دی، اور جس نے آسمانی تعلیم پر عمل کرنے والوں کو پہلے اخلاق و اعمال میں اور پھر دنیا کی سیاست میں بھی تمام اقوامِ عالم کے مقابلے میں ایک امتیازی مقام عطا فرمایا، اور جو عقیدہ توحید و رسالت کی طرح تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام شرائع میں مشترک اور متفق علیہ چلا آتا ہے۔

وجہ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے سامنے صرف دنیا کی زندگی اور، اسی کی عیش و عشرت ان کا انتہائی مقصود ہے، اسی کی تکلیف کو تکلیف سمجھتے ہیں، آخرت کی زندگی اور اعمال کے حساب کتاب اور جزاء و سزا کو وہ نہیں مانتے، وہ جب جھوٹ، سچ اور حلال حرام کی تفریق کو اپنی عیش و عشرت میں خلل انداز ہوتے دیکھیں تو اُن کو جرائم سے روکنے والی کوئی چیز باقی نہیں رہتی، حکومت کے تعزیری قوانین قطعاً انسدادِ جرائم اور اصلاحِ اخلاق کے لئے کافی نہیں، عادی مجرم تو اُن سزاؤں کے عادی ہو ہی جاتے ہیں، کوئی شریف انسان اگر تعزیری سزا کے خوف سے اپنی خواہشات کو ترک بھی کرے تو اسی حد تک کہ اس کو حکومت کی دار و گیر کا خطرہ ہو، خلوتوں میں اور رازدارانہ طریقوں پر جہاں حکومت اور اس کے قوانین کی رسائی نہیں، اُسے کون مجبور کر سکتا ہے کہ اپنی عیش و عشرت اور خواہش کو چھوڑ کر پابندیوں کا طوق اپنے گلے میں ڈال لے۔

ہاں وہ صرف عقیدۂ آخرت اور خوفِ خدا ہی ہے جس کی وجہ سے انسان کی ظاہری اور باطنی حالت جلوت و خلوت میں یکساں ہو سکتی ہے، وہ یہ یقین رکھتا ہے کہ مکان کے بند دروازوں اور اُن پر پہرہ چوکیوں میں اور رات کی تاریکیوں میں بھی کوئی دیکھنے والا مجھے دیکھ رہا ہے، کوئی لکھنے والا میرے اعمال کو لکھ رہا ہے۔

یہی وہ عقیدہ تھا جس پر پورا عمل کرنے کی وجہ سے اسلام کے ابتدائی دور میں ایسا پاکباز معاشرہ پیدا ہوا کہ مسلمانوں کی صورت دیکھ کر، چال چلن دیکھ کر لوگ دل و جان سے اسلام کے گرویدہ ہو جاتے تھے، یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ اس آیت میں بِالْاٰخِرَةِ کے ساتھ لفظ یُؤْمِنُوْنَ

نہیں، بلکہ یُوْقِنُوْنَ استعمال فرمایا گیا ہے، کیونکہ ایمان کا مقابل تکذیب ہے، اور ایقان کا مقابل شک و تردد، اس میں اشارہ ہے کہ آخرت کی زندگی کی محض تصدیق کرنا مقصد کو پورا نہیں کرتا، بلکہ اس کا ایسا یقین ضروری ہے جیسے کوئی چیز آنکھوں کے سامنے ہو، مُتَّقِین کی یہی صفت ہے کہ آخرت میں حق تعالیٰ کے سامنے پیشی اور حساب کتاب، پھر جزاء وسزاء کا نقشہ ہر وقت اُن کے سامنے رہتا ہے۔

وہ شخص جو دوسروں کا حق غصب کرنے کے لئے جھوٹے مقدمے لڑتا ہے، جھوٹی گواہی دے رہا ہے، اللہ تعالیٰ کے فرمان کے خلاف حرام مال کمانے اور کھانے میں لگا ہوا ہے، یا دنیا کے ذلیل مقاصد حاصل کرنے کے لئے خلافِ شرع ذرائع اختیار کر رہا ہے، وہ ہزار بار آخرت پر ایمان لانے کا اقرار کرے اور ظاہر شریعت میں اس کو مؤمن کہا بھی جائے، لیکن قرآن جس ایقان کا مطالبہ کرتا ہے وہ اسے حاصل نہیں، اور وہی انسان کی زندگی میں انقلاب لانیوالی چیز ہے، اُسی کے نتیجے میں متقین کو ہدایت اور کامیابی کا وہ انعام دیا گیا ہے جس کا ذکر سورۂ بقرہ کی پانچویں آیت میں ہے، اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ یعنی "بس یہی لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو اُن کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے، اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب"۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ

بیشک جو لوگ کافر ہو چکے برابر ہے اُن کو تو ڈرائے یا نہ ڈرائے، وہ

لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝٦ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى

ایمان نہ لائیں گے، مہر کر دی اللہ نے اُن کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور

ع ۱
اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ؗ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝٧ ع

ان کی آنکھوں پر پردہ ہے، اور اُن کے لئے بڑا عذاب ہے

خُلاصۂ تفسیر

بیشک جو لوگ کافر ہو چکے ہیں برابر ہے اُن کے حق میں خواہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہ لاویں گے (یہ بات اُن کافروں کے متعلق ہے جن کی نسبت خدا تعالیٰ کو معلوم ہے کہ ان کا خاتمہ کفر پر ہوگا، عام کا فر مراد نہیں، ان میں بہت سے لوگ بعد میں مسلمان ہو گئے) بند لگا دیا ہے اللہ نے انکے دلوں پر اور اُن کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے، اور ان کے لئے سزا بڑی ہے۔

معارف و مسائل

خلاصۂ مضمون مع ربط سورۂ بقرہ کی پہلی پانچ آیتوں میں قرآن کریم کا کتابِ ہدایت اور ہر شک و شبہ سے بالاتر ہونا بیان کرنے کے بعد اُن خوش نصیب لوگوں کا ذکر تھا، جنھوں نے اس کتابِ ہدایت سے پورا فائدہ اُٹھایا، جن کو قرآن کی اصطلاح میں مؤمنین اور متقین کا لقب دیا گیا ہے، اور ان حضرات کی مخصوص صفات و علامات بھی بیان کی گئیں، اس کے بعد پندرہ آیتوں میں اُن لوگوں کا ذکر ہے جنھوں نے اس ہدایت کو قبول نہیں کیا، بلکہ انکار و عناد سے پیش آئے۔

پھر اُن لوگوں میں دو گروہ تھے، ایک وہ جنھوں نے کھل کر انکار و مخالفت کا راستہ اختیار کیا جن کو قرآن کی اصطلاح میں کافر کہا گیا، دوسرے وہ لوگ جو اپنی اخلاقی پستی اور دنیا کی ذلیل اغراض کی بنا پر یہ جرأت بھی نہ کرسکے کہ اپنے ضمیر کی آواز اور دلی عقیدے کو صاف طور پر ظاہر کر دیتے، بلکہ دھوکہ اور فریب کی راہ اختیار کی، مسلمانوں سے یہ کہتے کہ ہم مسلمان ہیں، قرآن اور اس کی ہدایات کو مانتے ہیں، تمہارے ساتھ ہیں، اور دلوں میں اُن کے کفر و انکار تھا، کفار کی مجلسوں میں جاکر یہ کہتے کہ ہم تمہارے عقیدے پر اور تمہارے ساتھ ہیں، مسلمانوں کو دھوکہ دینے اور ان کے راز معلوم کرنے کے لئے ہم اُن سے ملتے ہیں۔

اس گروہ کا نام قرآن کی اصطلاح میں منافق ہے، یہ پندرہ آیتیں ہیں جو قرآن کو نہ ماننے والوں کے متعلق نازل ہوئی ہیں، ان میں سے مذکورہ دو آیتوں میں کھلے کافروں کا ذکر ہے، اور آگے تیرہ آیتوں میں منافقین کا ذکر اور ان کے متعلقہ حالات و علامات اور ان کا انجام مذکور ہے۔

ان تمام آیات کی تفصیل پر یکجائی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم نے سورۂ بقرہ کی ابتدائی بیس آیتوں میں ایک طرف توچشمۂ ہدایت کا پتہ دیدیا، کہ وہ قرآن ہے، اور دوسری طرف تمام اقوامِ عالم کو اسی ہدایت کے قبول یا انکار کے معیار سے دو حصّوں میں تقسیم کر دیا، ایک ہدایت یافتہ جن کو مؤمنین و متقین کہا جاتا ہے، دوسرے ہدایت سے انحراف و انکار کرنے والے جن کو کافر یا منافق کہا جاتا ہے۔

پہلی قسم وہ ہے جن کا راستہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں طلب کیا گیا ہے، اور دوسری قسم وہ ہے جن کے راستہ سے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ، میں پناہ مانگی گئی ہے۔

قرآن کریم کی اِس تعلیم سے ایک اصولی مسئلہ یہ بھی نکل آیا کہ اقوامِ عالم کے حصّوں یا گروہوں میں ایسی تقسیم جو اصول پر اثر انداز ہوسکے وہ صرف اصول و نظریات ہی کے اعتبار سے ہوسکتی ہے،

نسب، وطن، زبان، رنگ اور جغرافیائی حالات ایسی چیزیں نہیں جن کے اشتراک یا اختلاف سے قوموں کے ٹکڑے کئے جاسکیں، قرآن کریم کا اس بارے میں واضح فیصلہ بھی سورۂ تغابن میں مذکور ہے:

خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ط (۶۴ : ۲)	"یعنی اللہ نے تم سب کو پیدا کیا، پھر کچھ لوگ تم میں سے مؤمن اور کچھ کافر ہوگئے۔"

مذکور الصدر دو آیتوں میں حق تعالیٰ نے اُن کافروں کا ذکر فرمایا ہے جو اپنے کفر و انکار میں ضد اور عناد تک پہنچ گئے تھے، اور اس ضد کی وجہ سے وہ کسی حق بات کو سننے اور روشن دلیل کو دیکھنے کے لئے بھی تیار نہ تھے، ایسے لوگوں کے بارے میں سُنّۃ اللہ یہی ہے کہ ان کو ایک سزا اسی جہان میں نقدیہ دی جاتی ہے کہ اُن کے دلوں پر مُہر لگادی جاتی ہے، کانوں، آنکھوں کو حق و صدق کے قبول کرنے سے بند کردیا جاتا ہے، اُن کا حال حق و صدق کے بارے میں ایسا ہوجاتا ہے کہ گویا نہ اُن کو سمجھنے کی عقل، نہ دیکھنے کے لئے آنکھیں نہ سننے کے لئے کان۔

آخر آیت میں ایسے لوگوں کا عذابِ عظیم میں مبتلا ہونا ذکر کیا گیا ہے۔

کفر کی تعریف کفر کے لفظی معنی چھپانے کے ہیں، ناشکری کو بھی کفر اس لئے کہتے ہیں کہ محسن کے احسان کو چھپانا ہے، اصطلاحِ شریعت میں جن چیزوں پر ایمان لانا فرض ہے ان میں سے کسی چیز کے انکار کا نام کفر ہے، مثلاً ایمان کا خلاصہ یہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں اور اس کا ثبوت قطعی و یقینی ہے اُن سب چیزوں کی دل سے تصدیق کرنا، اور حق سمجھنا، اس لئے جو شخص رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُن تعلیمات میں سے جن کا ثبوت یقینی اور قطعی ہو کسی ایک کو بھی حق نہ سمجھے اور اس کی تصدیق نہ کرے وہ کافر کہلائے گا۔

اِنذار کے معنٰی لفظ انذار، ایسی خبر دینا جس سے خوف پیدا ہو، جیسا کہ ابشار ایسی خبر دینے کو کہتے ہیں جس سے سرور پیدا ہو، اردو زبان میں اس کا ترجمہ "ڈرانے" سے کیا جاتا ہے، مگر درحقیقت مطلقاً ڈرانے کو انذار نہیں کہتے، بلکہ ایسا ڈرانا جو شفقت و رحمت کی بنا پر ہو، جیسے اولاد کو آگ سے، سانپ بچھو اور درندوں سے ڈرایا جاتا ہے، اسی لئے جو ڈاکو، چور، ظالم، کسی انسان کو دھمکاتے ڈراتے ہیں اس کو انذار اور ان لوگوں کو نذیر نہیں کہا جاتا، انبیاء علیہم السلام کو خصوصیت سے نذیر کا لقب دیا جاتا ہے، کہ وہ ازراہِ شفقت آئندہ آنے والے مصائب سے ڈراتے ہیں، انبیاء علیہم السلام کے لئے اس لفظ کو اختیار کرنے میں اس کی ہدایت ہے کہ مصلح، مبلغ کے لئے ضروری ہے کہ مخاطب کی خیرخواہی کے ساتھ ہمدردی سے گفتگو کرے، محض ایک کلمہ پہنچا دینا مقصد نہ ہو۔

اس آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلّی دینے کے لئے یہ بتلایا گیا ہے، کہ یہ ضدی اور

معاند کفار جو حقیقت کو پہچاننے کے باوجود کفر و انکار پر جمے ہوئے ہیں، یا اپنے تکبر اور کج رائی کی بنا پر کسی حق بات کو سننے اور روشن دلائل کو دیکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں، ان کی اصلاح اور ایمان کے متعلق جو آپ کوشش کرتے ہیں اُن کے لئے مؤثر ثابت نہ ہوگی، بلکہ آپ کا کوشش کرنا اور نہ کرنا اُن کے حق میں برابر ہے۔

اس کی وجہ اگلی آیت میں یہ بتلائی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں اور کانوں پر مہر لگادی ہے، اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے، سوچنے سمجھنے کے جتنے راستے تھے وہ سب بند ہیں، اس لئے ان سے اصلاح کی توقع رکھنا دردسری ہے۔

کسی چیز پر مُہر اس لئے لگائی جاتی ہے کہ باہر سے کوئی چیز اس میں داخل نہ ہوسکے، ان کے دلوں اور کانوں پر مُہر لگانے کا یہی مطلب ہے کہ ان میں قبولِ حق کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

اُن کی اس حالت کو دلوں اور کانوں پر تو مُہر کرنے سے تعبیر فرمایا ہے، مگر آنکھوں کے لئے مُہر کے بجائے پردہ پڑنے کا ذکر کیا گیا، اس میں حکمت یہ ہے کہ دلوں میں آنے والا کوئی مضمون یا کوئی فکر و خیال کسی ایک سمت سے نہیں آتا، ہر طرف سے آسکتا ہے، اسی طرح کانوں میں پہنچنے والی آواز بھی ہر سمت اور ہر جہت سے آسکتی ہے، ان کی بندش جب ہی ہوسکتی ہے جب اُن پر مُہر کردی جائے بخلاف آنکھوں کے کہ ان کا ادراک صرف ایک سمت یعنی سامنے سے ہوسکتا ہے، اور جب سامنے پردہ پڑجائے تو آنکھوں کا ادراک ختم ہوجاتا ہے۔ (مظہری)

(۱) گناہوں کی دنیوی سزا سلبِ توفیق

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ کفر اور ہر گناہ کی اصل سزا تو آخرت میں ملیگی مگر بعض گناہوں کی کچھ سزا دنیا میں بھی مل جاتی ہے، پھر یہ دنیا کی سزا بعض اوقات یہ شکل اختیار کرتی ہے کہ اصلاح حال کی توفیق سلب ہوجاتی ہے، انسان آخرت کے حساب و کتاب سے بے فکر ہوکر اپنی نافرمانیوں اور گناہوں میں بڑھتا چلا جاتا ہے، اور اس کی بُرائی کا احساس بھی اس کے دل سے جاتا رہتا ہے، ایسے حال کے متعلق بعض بزرگوں کا ارشاد ہے اِنَّ مِنْ جَزَاءِ السَّيِّئَةِ السَّيِّئَةُ بَعْدَهَا وَاِنَّ مِنْ جَزَاءِ الْحَسَنَةِ الْحَسَنَةُ بَعْدَهَا "یعنی گناہ کی ایک سزا یہ بھی ہوتی ہے کہ ایک گناہ دوسرے گناہ کو کھینچ لاتا ہے جس طرح نیکی کا نقد بدلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک نیکی دوسری نیکی کو کھینچ لاتی ہے"۔

اور حدیث میں ہے کہ انسان جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے اور جس طرح سفید کپڑے پر ایک سیاہ نقطہ انسان کو ناگوار نظر آتا ہے، پہلے نقطۂ گناہ سے بھی انسان پریشان ہوتا ہے، لیکن اگر اس نے اس گناہ سے توبہ نہ کی اور دوسرا گناہ کرلیا تو ایک دوسرا نقطۂ سیاہ لگ جاتا ہے، اور اسی طرح ہر گناہ پر سیاہ نقطے لگتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ یہ سیاہی سارے قلب پر محیط ہوجاتی

ہے، اور اب اس کا یہ حال ہوجاتا ہے کہ وہ نہ کسی اچھی چیز کو اچھا سمجھ سکتا ہے نہ بُری چیز کو بُرا غرض نیکی بدی کا امتیاز اس کے دل سے اُٹھ جاتا ہے، اور پھر فرمایا کہ اسی ظلمت وسیاہی کا نام قرآن کریم میں ران یا رین آیا ہے، كَلَّا بَلْ سكتہ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (مشکوٰۃ از مسند احمد و ترمذی) اور ترمذی نے سند صحیح کے ساتھ بروایت ابو ہریرہؓ نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کا دل سیاہ ہوجاتا ہے، پھر اگر وہ توبہ کرلے تو صاف ہوجاتا ہے (قرطبی)

(۲) نصیحت ناصح کے لئے ہر حال میں مفید ہے، مخاطب قبول کرے یا نہ کرے اس آیت میں ازلی کافروں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وعظ ونصیحت کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر قرار دیئے گئے ہیں، مگر اُنکے ساتھ عَلَيْهِمْ کی قید لگا کر بتلادیا کہ یہ برابری کفار کے حق میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں نہیں، بلکہ اُن کو تو تبلیغ وتعلیم اور اصلاحِ خلق کی کوشش کا ثواب بہرحال ملے گا، اسی لئے پورے قرآن کریم کی کسی آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے لوگوں کو بھی دعوتِ ایمان دینے سے روکا نہیں گیا، اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص دعوتِ دین اور اصلاح کا کام کرتا ہے خواہ مؤثر ہو یا نہ ہو اس کو بہرحال اپنے عمل کا ثواب ملتا ہے۔

ایک شبہ کا جواب اس آیت کا مضمون وہی ہے جو سورۂ مطففین کی اس آیت کا ہے: كَلَّا بَلْ سكتہ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (۸۳: ۱۴) "یعنی ایسا نہیں، بلکہ اُن کے دلوں پر ان کے اعمال کا زنگ بیٹھ گیا ہے" جس میں حقیقت واضح کردی گئی ہے کہ ان کی بداعمالیاں اور سرکشی ہی ان کے دلوں کا زنگ بن گیا ہے، اسی زنگ کو آیتِ مذکورہ میں مُہر یا پردہ کے لفظوں سے تعبیر کیا گیا ہے، اس لئے اس پر یہ شبہ نہیں ہوسکتا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہی اُن کے دلوں پر مہر کردی، اور حواس کو ماؤف کردیا ہے تو یہ اپنے کفر میں معذور ہوگئے، پھر اُن کو عذاب کیسا؟ وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے شرارت وعناد کرکے باختیارِ خود اپنی استعداد برباد کرلی ہے، اس لئے اس تباہیِ استعداد کے فاعل اور مسبب یہ خود ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے تمام افعال کے خالق ہونے کی حیثیت سے اس جگہ مہر کرنے کو اپنی طرف نسبت کرکے یہ بتلادیا کہ جب ان لوگوں نے قبولِ حق کی صلاحیت واستعداد کو اپنے اختیار سے تباہ کرنا چاہا تو سنتِ الٰہیہ کے مطابق ہم نے وہ بداستعداد کی کیفیت اُن کے قلوب اور حواس میں پیدا کردی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۸

وقف لازم

اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور دن قیامت پر اور وہ ہرگز مومن نہیں،

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا

دغابازی کرتے ہیں اللہ سے اور ایمان والوں سے اور دراصل کسی کو دغا نہیں دیتے مگر اپنے آپ کو

يَشْعُرُوْنَ ۹ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ

اور نہیں سوچتے۔ اُن کے دلوں میں بیماری ہے پھر بڑھا دی اللہ نے اُن کی بیماری اور اُن کیلئے

عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ ۙ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۱۰ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا

عذاب دردناک ہے اس بات پر کہ جھوٹ کہتے تھے ، اور جب کہا جاتا ہے اُن کو فساد نہ ڈالو

فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۱۱ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ

ملک میں تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ، جان لو وہی ہیں خرابی کرنے والے

وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۱۲ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ

لیکن نہیں سمجھتے ، اور جب کہا جاتا ہے ان کو ایمان لاؤ جس طرح ایمان لائے

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَاۤءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاۤءُ وَلٰكِنْ

سب لوگ تو کہتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں جس طرح ایمان لائے بیوقوف جان لو وہی ہیں بیوقوف لیکن

لَّا يَعْلَمُوْنَ ۱۳ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ښ وَاِذَا خَلَوْا

نہیں جانتے ، اور جب ملاقات کرتے ہیں مسلمانوں سے تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب تنہا

اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۱۴

ہوتے ہیں اپنے شیطانوں کے پاس تو کہتے ہیں کہ بیشک ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو ہنسی کرتے ہیں (یعنی مسلمانوں سے)

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۱۵ اُولٰۗىِٕكَ

اللہ ہنسی کرتا ہے اُن سے اور ترقی دیتا ہے اُن کو انکی سرکشی میں (اور) حالت یہ ہے کہ وہ عقل کے اندھے ہیں، یہ

الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا

وہی ہیں جنھوں نے مول لی گمراہی ہدایت کے بدلے سو نافع نہ ہوئی انکی سوداگری اور

كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۱۶ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ

نہ ہوئے راہ پانے والے ، اُن کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی پھر جب

أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا

روشن کر دیا آگ نے اس کے آس پاس کو تو زائل کر دی اللہ نے اُنکی روشنی اور چھوڑا ان کو اندھیروں میں

يُبْصِرُونَ ﴿١٧﴾ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿١٨﴾ أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ

کہ کچھ نہیں دیکھتے، بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں سو وہ نہیں لوٹیں گے یا انکی مثال ایسی ہے

السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ ج يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي

جیسے زور سے مینہ پڑ رہا ہو آسمان سے اس میں اندھیرے ہیں اور گرج اور بجلی دیتے ہیں انگلیاں اپنے

آذَانِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ط وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ﴿١٩﴾

کانوں میں مارے کڑک کے موت کے ڈر سے اور اللہ احاطہ کرنیوالا ہے کافروں کا،

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ط كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ ق

قریب ہے کہ بجلی اُچک لے اُن کی آنکھیں، جب چمکتی ہے اُن پر تو چلنے لگتے ہیں اس کی روشنی میں

وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ط وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ط

اور جب اندھیرا ہوتا ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں اور اگر چاہے اللہ تو لیجائے انکے کان اور آنکھیں

۲ ع ۳ ۲ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٠﴾ ع

بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخری دن پر حالانکہ وہ بالکل ایمان والے نہیں (بلکہ) چالبازی کرتے ہیں اللہ سے اور ان لوگوں سے جو ایمان لاچکے ہیں، اور واقع میں کسی کے ساتھ بھی چالبازی نہیں کرتے بجز اپنی ذات کے اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے (یعنی اس چالبازی کا انجام بر خود اپنے ہی کو بھگتنا پڑے گا) اُن کے دلوں میں بڑا مرض ہے، سو اور بھی بڑھا دیا اللہ نے اُن کا مرض (اس مرض میں اُن کی بداعتقادی اور اسلام اور مسلمانوں کی ترقی دیکھ کر حسد میں جلنا اور ہر وقت اپنا کفر ظاہر ہو جانے کی فکر و خلجان سب داخل ہیں، مسلمانوں کی ترقی سے اُن کا مرضِ حسد اور بڑھنا واضح ہے) اور انکے لئے سزائے دردناک

ہے اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے (یعنی ایمان کا جھوٹا دعویٰ کیا کرتے تھے) اور جب
ان سے کہا جاتا ہے کہ فساد مت کرو زمین میں تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح ہی کرنے والے ہیں (ان کی
دو رُخی روش سے جب فتنے فساد واقع ہونے لگے اور کسی خیر خواہ نے فہمائش کی کہ ایسی کارروائی
موجب فساد ہوا کرتی ہے اس کو چھوڑ دو تو اس کے جواب میں یہ اپنے آپ کو بجائے مفسد کے مصلح
بتاتے ہیں یعنی اپنے فساد ہی کو اصلاح سمجھتے ہیں) یاد رکھو بے شک یہی لوگ مفسد ہیں لیکن وہ
اس کا شعور نہیں رکھتے (یہ تو ان کی جہالت اور غباوت کا بیان ہے، کہ اپنے عیب ہی کو ہنر
سمجھتے ہیں، آگے دوسری جہالت کا بیان ہے کہ دوسروں کے ہنر کو یعنی ایمان خالص کو عیب اور
حقیر سمجھتے ہیں) اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی ایمان لے آؤ جیسا ایمان لائے
ہیں اور لوگ، تو کہتے ہیں کہ کیا ہم ایمان لاویں گے جیسا ایمان لے آئے ہیں یہ بیوقوف، یاد رکھو کہ بلاشک
یہی ہیں بیوقوف لیکن اس کا علم نہیں رکھتے (یہ منافق ایسی کھلی ہوئی بات بظاہر غریب
مسلمانوں کے سامنے کرلیتے ہوں گے جن سے اُن کو کوئی اندیشہ نہ تھا، ورنہ عام طور پر تو وہ اپنے
کفر کو چھپاتے پھرتے تھے) اور جب ملتے ہیں وہ منافقین اُن لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں تو
کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب خلوت میں پہونچتے ہیں اپنے شریر سرداروں کے پاس
تو کہتے ہیں کہ ہم بے شک تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم تو (مسلمانوں سے) صرف استہزاء کیا کرتے ہیں
(یعنی ہم مسلمانوں سے بطور تمسخر کہہ دیتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں ورنہ ہم تو تمہارے ہم مشرب
ہیں، آگے اُن کے استہزاء کا جواب ہے کہ) اللہ تعالیٰ ہی استہزاء کر رہے ہیں ان کے ساتھ اور
ڈھیل دیتے چلے جاتے ہیں اُن کو کہ وہ اپنی سرکشی میں حیران و سرگرداں ہو رہے ہیں (وہ اللہ
کا استہزاء یہی ہے کہ ان کو مہلت دی جارہی ہے جب وہ خوب کفر میں کامل ہو جاویں اور
جُرم سنگین ہو جاوے اس وقت اچانک پکڑ لئے جاویں گے، چونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ فعل اُن کے
استہزاء کے مقابلہ میں تھا اس لئے اس کو استہزاء کے عنوان سے تعبیر کر دیا گیا) یہ وہ لوگ ہیں
کہ انھوں نے گمراہی لے لی بجائے ہدایت کے تو نفع بخش نہ ہوئی اُن کی یہ تجارت اور نہ یہ ٹھیک
طریقہ پر چلے (یعنی اُن کو تجارت کا سلیقہ نہ ہوا کہ ہدایت جیسی قیمتی چیز کے بدلہ میں گمراہی لیلی)
اُن کی حالت اُس شخص کی حالت کے مشابہ ہے جس نے کہیں آگ جلائی ہو پھر جب روشن
کر دیا ہو اس آگ نے اس شخص کے گرداگرد کی سب چیزوں کو ایسی حالت میں سلب کر لیا ہو
اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی کو اور چھوڑ دیا ہو ان کو اندھیروں میں کہ کچھ دیکھتے بھالتے نہ ہوں،
(تو جس طرح یہ شخص اور اس کے ساتھی روشنی کے بعد اندھیرے میں رہ گئے اسی طرح منافقین
حق واضح ہو کر سامنے آجانے کے بعد گمراہی کے اندھیرے میں جا پھنسے اور جس طرح آگ جلانے

والوں کی آنکھ، کان، زبان، اندھیرے میں بیکار ہوگئے، اسی طرح گمراہی کے اندھیرے میں پھنس کر ان کی یہ حالت ہوگئی کہ گویا وہ) بہرے ہیں گونگے ہیں، اندھے ہیں سو یہ اب رجوع نہ ہوں گے، (کہ ان کے حواس حق کو دیکھنے سننے سمجھنے کے قابل نہ رہی، یہ مثال تو اُن منافقین کی تھی جو خوب دل کھول کر کفر پر جمے ہوئے ہیں، کبھی ایمان کا دھیان بھی دل میں نہیں آتا، آگے منافقین کے اُس گروہ کی مثال ہے جو فی الواقع تردد میں تھے، کبھی کبھی اسلام کی حقانیت دیکھ کر اس کی طرف مائل ہونے لگتے، پھر جب اغراضِ نفسانی کا غلبہ ہوتا تو یہ میلان بدل جاتا تھا) یا اُن منافقوں کی ایسی مثال ہے جیسے آسمان کی طرف سے بارش ہو اس میں اندھیری بھی ہو اور رعد برق بھی ہو جو لوگ اس بارش میں چل رہے ہیں وہ ٹھونسے لیتے ہیں اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں کڑک کے سبب اندیشۂ موت سے، اور اللہ تعالیٰ احاطہ میں لئے ہوئے ہے کافروں کو، برق کی یہ حالت ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ان کی بینائی اس نے لے لی جہاں ذرا اُن کو بجلی کی چمک ہوئی تو اس کی روشنی میں چلنا شروع کر دیا، اور جب اُن پر تاریکی ہوئی پھر کھڑے کے کھڑے رہ گئے، اور اگر اللہ تعالیٰ ارادہ کرتے تو ان کے کان اور آنکھ سب سلب کر لیتے بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں (تو جس طرح یہ لوگ کبھی طوفانِ باد و باراں میں کبھی چلنے سے رہ جاتے ہیں، کبھی موقع پا کر آگے چلنے لگتے ہیں یہی حال ان متردد منافقین کا ہے)۔

معارف و مسائل

رَبطِ آیات جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے کہ سورۃ بقرہ کے شروع میں قرآن کریم کا شک و شبہ سے بالاتر ہونا بیان کرنے کے بعد بیس[۲۰] آیتوں میں اُس کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے حالات کا ذکر کیا گیا ہے، اوّل پانچ آیتوں میں ماننے والوں کا تذکرہ متقین کے عنوان سے ہے، پھر دو آیتوں میں ایسے نہ ماننے والوں کا ذکر ہے جو کھلے طور پر قرآن کا معاندانہ انکار کرتے تھے، ان تیرہ آیتوں میں ایسے منکرین و کفار کا ذکر ہے جو ظاہر میں اپنے آپ کو مؤمن مسلمان کہتے تھے، مگر حقیقت میں مومن نہ تھے، اِن لوگوں کا نام قرآن میں منافقین رکھا گیا ہے

مذکورہ بالا آیات میں پہلی دو آیتوں میں منافقین کے متعلق فرمایا کہ "لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر، حالانکہ وہ بالکل ایمان والے نہیں، بلکہ وہ چالبازی کرتے ہیں اللہ سے اور اُن لوگوں سے جو ایمان لا چکے ہیں، اور واقع میں کسی کے ساتھ بھی چالباز نہیں کرتے بجز اپنی ذات کے، اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے"

اس میں اُن کے دعوئ ایمان کو غلط اور جھوٹ قرار دیا گیا، اور یہ کہ ان کا یہ دعویٰ محض فریب ہے،

یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی فریب نہیں دے سکتا، اور غالباً یہ لوگ بھی ایسا نہ سمجھتے ہوں گے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دے سکتے ہیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے ساتھ اُن کی چالبازی کو ایک حیثیت سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ چالبازی قرار دے کر فرمایا گیا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ چالبازی کرتے ہیں (قرطبی عن الحسن)

اسی لئے اس کا نتیجہ یہ بتلایا گیا کہ یہ بے وقوف اپنے سوا اور کسی کے ساتھ چالبازی نہیں کر رہے ہیں، کیونکہ اللہ جل شانہٗ تو ہر دھوکہ و فریب سے بالاتر ہیں ہی، ان کے رسولؐ اور مؤمنین بھی وحیِ الٰہی کی وجہ سے ہر دھوکہ، فریب سے محفوظ ہو جاتے ہیں، کوئی نقصان اُن کو نہیں پہونچتا، البتہ ان کے دھوکہ، فریب کا وبال دنیا و آخرت میں خود انھیں پر پڑتا ہے۔

تیسری آیت میں فرمایا کہ "اُن کے دلوں میں بڑا مرض ہے، سو اور بھی بڑھا دیا اللہ نے اُن کے مرض کو"، مرض اور بیماری اس کیفیت کو کہتے ہیں جس سے انسان اپنے اعتدالِ مناسب سے نکل جائے، اور اس کے افعال میں خلل پیدا ہو جائے، جس کا آخری نتیجہ ہلاکت اور موت ہوتا ہے۔

قرآن و حدیث کی اصطلاح میں اُن نفسانی کیفیات کو بھی مرض کہا جاتا ہے جو نفسِ انسانی کے کمال میں خلل انداز ہوں، اور جن کی وجہ سے انسان اپنے انسانی اعمال سے محروم ہوتا چلا جائے جس کا آخری نتیجہ روحانی موت و ہلاکت ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دلوں کے امراض خواہشاتِ نفسانی کے اتباع سے پیدا ہوتے ہیں، جیسے بدنِ انسان کے امراض اخلاطِ انسان کی بے اعتدالی سے پیدا ہوتے ہیں، اس آیت میں اُن کے دلوں میں مخفی کفر کو مرض فرمایا گیا ہے جو روحانی اور جسمانی دونوں اعتبار سے بڑا مرض ہے، رُوحانی مرض ہونا تو ظاہر ہے کہ اوّل تو اپنے پیدا کرنے والے پالنے والے کی ناشکری اور اس کے احکام سے سرکشی جس کا نام کفر ہے، یہ خود روحِ انسانی کے لئے سب سے بڑا مرض اور شرافتِ انسانی کے لئے بدترین داغ ہے، دوسرے دنیا کی ذلیل اغراض کی خاطر اس کو چھپاتے رہنا اور اپنے دل کی بات کو ظاہر کرنے کی بھی جرأت نہ ہونا، یہ دوسری دنارت ہے جو روح کا بہت بڑا مرض ہے، اور نفاق کا جسمانی مرض ہونا اس بنا پر ہے کہ منافق کے دل میں ہمیشہ یہ دغدغہ رہتا ہے کہ کہیں میرا اصلی حال نہ کھُل جائے، شب و روز اس کی فکر میں رہنا خود ایک جسمانی مرض ہے، اِس کے علاوہ اس مرض کا لازمی نتیجہ حسد ہے، کہ مسلمانوں کی ترقی کو دیکھ کر منافق کو جلن ہوگی، مگر وہ مسکین اپنے دل کی سوزش کا اظہار بھی نہیں کر سکتا، یہ اسباب اُن کے جسمانی مرض بھی بن جاتے ہیں۔

اور یہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا مرض اور بھی بڑھا دیا، اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ لوگ اسلام اور مسلمانوں کی ترقی سے جلتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کو یہ ترقی دینا ہے، اور ہر وقت اس کے مشاہدات

ہوتے رہتے ہیں، اس لئے اُن کا یہ مرض بڑھتا ہی رہتا ہے۔

چوتھی اور پانچویں آیتوں میں منافقین کا یہ مغالطہ مذکور ہے کہ فساد کو اصلاح سمجھتے اور اپنے آپ کو مصلح کہتے تھے، قرآن کریم نے واضح کیا کہ فساد و اصلاح زبانی دعووں پر دائر نہیں ہوتے، ورنہ کوئی چور ڈاکو بھی اپنے آپ کو مفسد کہنے کو تیار نہیں، بلکہ مدار کار اس کام پر ہے جو کیا جا رہا ہے، وہ فساد ہو تو کرنے والے کو مفسد ہی کہا جائے گا، خواہ اس کی نیت فساد کی نہ ہو۔

چھٹی آیت میں منافقین کے سامنے صحیح ایمان کا ایک معیار رکھا گیا کہ 'اٰمِنُوْا کَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ' یعنی ایمان لاؤ جیسے ایمان لائے اور لوگ" اس میں لفظ ناس سے مراد باتفاق مفسرین صحابۂ کرامؓ ہیں، کیونکہ وہی حضرات ہیں جو نزولِ قرآن کے وقت ایمان لائے تھے، کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف وہی ایمان معتبر ہے جو صحابۂ کرامؓ کے ایمان کی طرح ہو، جن چیزوں میں جس کیفیت کے ساتھ ان کا ایمان ہو اسی طرح کا ایمان دوسروں کا ہوگا تو ایمان کہا جائے گا، ورنہ نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ صحابۂ کرامؓ کا ایمان ایک کسوٹی ہے، جس پر باقی ساری امت کے ایمان کو پرکھا جائے گا، جو اس کسوٹی پر صحیح نہ ہو اس کو شرعاً ایمان اور ایسا کرنے والے کو مؤمن نہ کہا جائے گا، اس کے خلاف کوئی عقیدہ اور عمل خواہ ظاہر میں کتنا ہی اچھا نظر آئے اور کتنی ہی نیک نیتی سے کیا جائے اللہ کے نزدیک ایمان معتبر نہیں، ان لوگوں نے صحابۂ کرامؓ کو سفہاء یعنی بیوقوف کہا، اور یہی ہر زمانے کے گمراہوں کا طریقہ رہا ہے، کہ جو اُن کو صحیح راہ بتلائے اس کو بیوقوف جاہل قرار دیتے ہیں، مگر قرآن کریم نے بتلا دیا کہ درحقیقت وہ خود ہی بیوقوف ہیں کہ ایسی کھلی نشانیوں پر ایمان نہیں رکھتے۔

ساتویں آیت میں منافقین کے نفاق اور دو رُخی پالیسی کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ یہ لوگ جب مسلمانوں سے ملتے تو کہتے تھے کہ ہم مؤمن مسلمان ہوگئے، اور جب اپنی قوم کے کافر لوگوں سے ملتے تو کہتے تھے کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ ہیں، اور تمہاری قوم کے فرد ہیں، اور مسلمانوں کے ساتھ تو محض تمسخر و استہزاء کے لئے، یعنی ان کو بیوقوف بنانے کے لئے ملتے ہیں۔

آٹھویں آیت میں اُن کی اس احمقانہ گفتگو کا جواب ہے کہ یہ بے شعور سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمانوں سے استہزاء کرتے ہیں، اور ان کو بیوقوف بنا رہے ہیں، حالانکہ درحقیقت خود بیوقوف بن رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے حلم و کرم سے اُن کو ڈھیل دے کر خود انہی کے استہزاء کا سامان کر دیا ہے، کہ ظاہر میں کسی عذاب کے نہ آنے سے وہ اور غفلت میں پڑ گئے، اور اپنی سرکشی میں بڑھتے چلے گئے، یہاں تک کہ ان کا جرم اور سنگین ہوگیا، پھر دفعۃً پکڑ لئے گئے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ عمل چونکہ اُن کے استہزاء کے جواب میں تھا اس لئے اس عمل کو بھی استہزاء سے تعبیر کیا گیا۔

نویں آیت میں منافقین کے اس حال کا ذکر ہے کہ انھوں نے اسلام کو بھی قریب سے دیکھا

اس کا ذائقہ بھی چکھا، اور کفر میں تو پہلے سے مبتلا ہی تھے، پھر کفر و اسلام دونوں کو دیکھنے سمجھنے کے بعد انھوں نے اپنی ذلیل دنیا وی اغراض کی خاطر اسلام کے بدلے کفر ہی کو ترجیح دی، اُن کے اس عمل کو قرآن کریم نے تجارت (بیوپار) کا نام دے کر یہ بتلایا کہ ان لوگوں کو بیوپار کا بھی سلیقہ نہ آیا، کہ بہترین قیمتی چیز یعنی ایمان دے کر ردی اور تکلیف دہ چیز یعنی کفر خرید لیا۔

آخری چار آیتوں میں منافقین کے حال کی دو مثالیں دے کر اس کا قابلِ نفرت ہونا بیان فرمایا گیا، دو مثالیں اس بنا پر دی گئیں کہ منافقین میں دو طرح کے آدمی تھے، ایک وہ جو اپنے کفر میں بالکل پختہ تھے، ایمان کا اظہار صرف دنیوی مصلحت کی وجہ سے کرتے تھے، ایمان و اسلام سے اُن کو کوئی واسطہ نہ تھا، دوسرے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اسلام کی حقانیت سے متاثر ہو کر کبھی کبھی سچے مسلمان ہونے کا ارادہ بھی کر لیتے تھے، مگر پھر دنیوی اغراض سامنے آکر ان کو اس ارادہ سے روک دیتی تھیں، اسی طرح وہ ایک تذبذب اور تردد کے حال میں رہتے۔

اسی مضمون کے ضمن میں ان ظالموں کو یہ تنبیہ بھی کر دی گئی کہ وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے احاطۂ قدرت سے باہر نہیں، ہر وقت ہر حال میں ہلاک بھی کر سکتے ہیں، اور بینائی و شنوائی کی طاقتیں بھی سلب کر سکتے ہیں۔

یہ تیرہ آیتیں منافقین کے حال و مثال پر مشتمل ہیں، ان میں بہت سے احکام و مسائل اور اہم ہدایات بھی ہیں۔

(۱) کیا کفر و نفاق عہدِ نبوی کے ساتھ مخصوص تھا، یا اب بھی موجود ہے؟ اس معاملہ میں صحیح یہ ہے کہ منافق کے نفاق کو پہچاننا اور اس کو منافق قرار دینا دو طریقوں سے ہوتا تھا، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی بتلا دیا کہ فلاں شخص دل سے مسلمان نہیں منافق ہے، دوسرے یہ کہ اُس کے کسی قول و فعل سے کسی عقیدۂ اسلام کے خلاف کوئی بات یا اسلام کی مخالفت کا کوئی عمل ظاہر اور ثابت ہو جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انقطاعِ وحی کے سبب اُن کے پہچاننے کی پہلی صورت تو باقی نہ رہی، مگر دوسری صورت اب بھی موجود ہے، جس شخص کے کسی قول و فعل سے اسلامی قطعی عقائد کی مخالفت یا اُن پر استہزاء یا تحریف ثابت ہو جائے، مگر وہ اپنے ایمان و اسلام کا مدعی بنے تو وہ منافق سمجھا جائے گا، ایسے منافق کا نام قرآن کی اصطلاح میں ملحد ہے، اَلَّذِیۡنَ یُلۡحِدُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا (۴۱: ۴۰)، اور حدیث میں اُس کو زندیق کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، مگر چونکہ اس کا کفر دلیل سے ثابت اور واضح ہو گیا، اس لئے اس کا حکم سب کفار جیسا ہو گیا، الگ کوئی حکم اس کا نہیں ہے، اسی لئے علماءِ امت نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد منافقین کا قضیہ ختم ہو گیا، اب جو مؤمن نہیں وہ کافر کہلائے گا۔

حضرت امام مالکؒ سے "عمدۃ" شرح بخاری میں نقل کیا گیا ہے کہ بعد زمانۂ نبوّت کے نفاق کی یہی صورت ہے، جس کو پہچانا جاسکتا ہے، اور ایسا کرنے والے کو منافق کہا جاسکتا ہے۔

(۲) ایمان و کفر کی حقیقت | آیات مذکورہ میں غور کرنے سے ایمان واسلام کی پوری حقیقت واضح ہوجاتی ہے، اور اس کے بالمقابل کفر کی بھی، کیونکہ ان آیات میں منافقین کی طرف سے ایمان کا دعوٰی اٰمَنَّا بِاللّٰہِ میں، اور قرآن کریم کی طرف سے اُن کے اس دعوے کا غلط ہونا وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ میں ذکر کیا گیا ہے، یہاں چند باتیں غور طلب ہیں:

اوّل یہ کہ جن منافقین کا حال قرآن کریم میں بیان فرمایا گیا ہے وہ اصل میں یہودی تھے، اور اللہ تعالیٰ اور روزِ قیامت پر ایمان لانا یہود کے مذہب میں بھی ثابت اور مسلّم ہے، اور جو چیز اُن کے عقیدہ میں نہیں تھی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوّت کو ماننا اور آپؐ پر ایمان لانا اس کو انھوں نے اپنے بیان میں ذکر نہیں کیا، بلکہ صرف دو چیزیں ذکر کیں، ایمان باللہ، ایمان بالیوم الآخر، جس میں اُن کو جھوٹا نہیں کہا جاسکتا، پھر قرآن کریم میں اُن کو جھوٹا قرار دینا اور اُن کے ایمان کا انکار کرنا کس بنا پر ہے؟

بات یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنی من مانی صورتوں میں خدا تعالیٰ یا آخرت کا اقرار کرلینا ایمان نہیں، یوں تو مشرکین بھی کسی نہ کسی انداز سے اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں اور سب سے بڑا قادرِ مطلق مانتے ہیں، اور مشرکینِ ہندوستان تو پرلو کا نام دے کر قیامت کا ایک نمونہ بھی تسلیم کرتے ہیں، مگر قرآن کی نظر میں یہ ایمان نہیں، بلکہ صرف وہ ایمان معتبر ہے جو اس کی بتلائی ہوئی تمام صفات کے ساتھ ہو، اور آخرت پر ایمان وہ معتبر ہے جو قرآن کریم اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے حالات واوصاف کے ساتھ ہو۔

ظاہر ہے کہ یہود اس معنی کے اعتبار سے نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر، کیونکہ ایک طرف تو وہ حضرت عُزَیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں، اور آخرت کے معاملہ میں بھی یہ غلط اعتقاد رکھتے ہیں کہ انبیاء کی اولاد کچھ بھی کرتی رہے وہ بہرحال اللہ تعالیٰ کی محبوب ہے، اُن سے آخرت میں کوئی باز پرس ہوگی، اور کچھ عذاب ہوا بھی تو بہت معمولی ہوگا، اس لئے قرآنی اصطلاح کے اعتبار سے اُن کا یہ کہنا کہ ہم اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان لائے ہیں غلط اور جھوٹ ہوا۔

(۳) کفر و ایمان کا ضابطہ | قرآن کی اصطلاح میں ایمان وہ ہے جس کا ذکر اوپر سورۂ بقرہ کی تیرہویں آیت میں آچکا ہے کہ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ، جس سے معلوم ہوا کہ ایمان کا دعوٰی صحیح یا غلط کے جانچنے کا معیار صحابۂ کرامؓ کا ایمان ہے، جو اس کے مطابق نہیں وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ایمان نہیں۔

اگر کوئی شخص قرآنی عقیدہ کا مفہوم قرآنی تصریح یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح

کے خلاف قرار دے کر یہ کہے کہ میں تو اس عقیدہ کو مانتا ہوں تو یہ ماننا شرعاً معتبر نہیں، جیسا کہ آجکل قادیانی گروہ کہتا ہے کہ ہم بھی عقیدۂ ختمِ نبوّت کو مانتے ہیں، مگر اس عقیدہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریحات اور صحابۂ کرامؓ کے ایمان سے بالکل مختلف تحریف کرتے ہیں، مرزا غلام احمد کی نبوّت کیلئے جگہ نکالتے ہیں، قرآن کریم کی اس تصریح کے مطابق وہ اسی کے مستحق ہیں کہ ان کو مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ کہا جائے، یعنی وہ ہرگز مؤمن نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایمانِ صحابہؓ کے خلاف کوئی شخص کسی عقیدہ کا نیا مفہوم بنائے، اور اس عقیدہ کا پابند ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو مؤمن مسلمان بتلائے اور مسلمانوں کے نماز روزہ میں شریک بھی ہو، مگر جب تک وہ قرآن کے اس بتلائے ہوئے معیار کے مطابق ایمان نہیں لائے گا، اس وقت تک وہ قرآن کی اصطلاح میں مؤمن نہیں کہلائے گا۔

ایک شبہ کا ازالہ حدیث و فقہ کا یہ مشہور مقولہ کہ "اہلِ قبلہ کو کافر نہیں کہا جا سکتا" اس کا مطلب بھی آیتِ مذکورہ کے تحت میں یہ متعین ہو گیا کہ اہلِ قبلہ سے مراد صرف وہ لوگ ہیں جو ضروریاتِ دین میں سے کسی چیز کے منکر نہیں، ورنہ یہ منافقین بھی تو قبلہ کی طرف سب مسلمانوں کی طرح نماز پڑھتے تھے، مگر یہ صرف رُو بقبلہ نماز پڑھنا اُن کے ایمان کے لئے اس بناء پر کافی نہ ہوا کہ ان کا ایمان صحابۂ کرامؓ کی طرح تمام ضروریاتِ دین پر نہیں تھا۔

(۴) جھوٹ ایک گھناؤنی چیز ہے یہاں منافقین کے قول اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ میں غور کیجئے کہ یہ لوگ پرلے درجے کے کافر ہونے کے باوجود اپنی دانست میں جھوٹ بولنے سے اجتناب کرتے ہیں، کیونکہ دعوئ ایمان کے لئے صرف اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان کا ذکر کرتے ہیں، ایمان بالرسول کا ذکر اس لئے نہیں کرتے کہ جھوٹ نہ ہو جائے، اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹ ایسی گندی اور گھناؤنی چیز ہے کہ کوئی شریف آدمی خواہ کافر فاسق ہو جھوٹ بولنا پسند نہیں کرتا۔

یہ دوسری بات ہے کہ ان کا دعوئ ایمان باللہ و بالیوم الآخر بھی قرآنی اصطلاح کے خلاف ہونے کی وجہ سے نتیجۃً جھوٹ ثابت ہوا۔

(۵) انبیاءؑ و اولیاءؒ کے ساتھ برا سلوک کرنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ بُرائی کرنا ہے آیاتِ مذکورہ میں منافقین کا ایک حال یہ بتلایا ہے يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینا چاہتے اور اس کے ساتھ چالبازی کرتے ہیں، حالانکہ گروہ منافقین میں شاید کوئی بھی ایسا نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینے کا قصد رکھتا ہو، یا یہ سمجھتا ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کو فریب دے سکتا ہے، بلکہ حقیقت یہ تھی کہ یہ لوگ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین کو دھوکہ دینے کے قصد سے شنیع حرکتیں کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے آیت مذکورہ میں اس کو اللہ کو دھوکہ دینا قرار دے کر یہ بتلا دیا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے کسی رسول یا ولی کے ساتھ

کوئی بُرا معاملہ کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ ایسا معاملہ کرنے کے حکم میں ہے، دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفعتِ شان کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ آپؐ کی شان میں کوئی گستاخی کرنا ایسا ہی جرم ہے جیسا اللہ جل شانہٗ کی شان میں گستاخی جرم ہے۔

(۶) جھوٹ بولنے کا وبال | آیاتِ مذکورہ میں منافقین کے عذابِ الیم کی وجہ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ یعنی اُن کے جھوٹ بولنے کو قرار دیا ہے، حالانکہ ان کے کفر و نفاق کا جرم سب سے بڑا تھا، اور دوسرے جرائم مسلمانوں سے حسد، اُن کے خلاف سازشیں بھی بڑے جرائم تھے، مگر عذاب الیم کا سبب ان کے جھوٹ بولنے کو قرار دیا، اس میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ جھوٹ بولنے کی عادت ان کا اصلی جرم تھا، اسی بُری عادت نے اُن کو کفر و نفاق تک پہونچا دیا تھا، اس لئے جرم کی حیثیت اگرچہ کفر و نفاق کی بڑھی ہوئی ہے مگر ان سب خرابیوں کی جڑ اور بنیاد جھوٹ بولنا ہے، اسی لئے قرآن کریم نے جھوٹ بولنے کو بُت پرستی کے ساتھ جوڑ کر اس طرح ارشاد فرمایا ہے:

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۝ (۲۲: ۳۰)	"یعنی بچو بُت پرستی کی نجاست سے اور بچو جھوٹ بولنے سے۔"

(۷) اصلاح و فساد کی تعریف اور مصلح و مفسد کی پہچان | آیاتِ مذکورہ میں گذر چکا ہے کہ جب کوئی ان منافقین سے یہ کہتا کہ اپنے نفاق کے ذریعہ زمین میں فساد نہ پھیلاؤ تو وہ بڑے زور اور تاکید سے کہتے تھے اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ اس میں لفظ اِنَّمَا جو حصر و انحصار کے لئے بولا جاتا ہے اس کی وجہ سے معنی اس جملہ کے یہ ہیں کہ ہم تو مصلح ہی ہیں، یعنی ہمارے کسی عمل کا فساد سے کوئی واسطہ نہیں، مگر قرآن کریم نے اُن کے جواب میں فرمایا اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ "یعنی یاد رکھو کہ یہی لوگ مفسد ہی ہیں مگر ان کو اس کا شعور نہیں۔"

اس میں دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ منافقین کی حرکات حقیقۃً زمین میں فتنہ و فساد پھیلنے کا سبب تھیں، دوسری بات یہ کہ منافقین فتنہ و فساد پھیلانے کی نیت اور قصد سے یہ کام نہ کرتے تھے بلکہ ان کو معلوم بھی نہ تھا کہ اس کا نتیجہ فتنہ و فساد ہے، جیسا کہ قرآن کی تصریح وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ سے معلوم ہوتا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ زمین میں فتنہ و فساد جن چیزوں سے پھیلتا ہے اُن میں کچھ تو ایسی چیزیں ہیں جن کو ہر شخص فتنہ و فساد سمجھتا ہے، جیسے قتل، غارتگری، چوری، دھوکہ، فریب، اغواء، بدکاری وغیرہ ہر سمجھدار آدمی ان کو شر و فساد سمجھتا ہے، اور ہر شریف آدمی ان سے بچتا ہے، اور کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو اپنی ظاہری سطح کے اعتبار سے کوئی فتنہ و فساد نہیں ہوتیں، مگر اُن کی وجہ سے انسانوں کے اخلاق برباد ہوتے ہیں، اور انسانوں کی اخلاقی گراوٹ سارے فتنوں اور فسادوں کے دروازے کھول دیتی

ہے، ان منافقین کا بھی یہی حال تھا کہ چوری، ڈاکہ، بدکاری وغیرہ سے بچتے تھے، اسی لئے بڑی زور سے اپنے مفسد ہونے کا انکار اور مصلح ہونے کا اثبات کیا۔

مگر نفاق اور کینہ وحسد اور اس کے ماتحت دشمنوں سے سازشیں، یہ چیزیں انسان کے اخلاق کو ایسا تباہ کر دیتی ہیں کہ انسان بہت سے حیوانوں کی سطح سے بھی نیچے آجاتا ہے، اور ایسے کام کرنے پر اُتر آتا ہے جو کبھی کسی بھلے مانس سے متصوّر نہیں ہوتے، اور جب انسان اپنے انسانی اخلاق کھو بیٹھا، تو انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں فساد ہی فساد آجاتا ہے، فساد بھی ایسا عظیم جو نہ درندے جانوروں سے متوقع ہے نہ ڈاکوؤں اور چوروں سے، کیونکہ ان کے فساد کو قانون اور حکومت کی طاقت سے روکا جاسکتا ہے، مگر قانون تو انسان ہی جاری کرتے ہیں، جب انسان انسان نہ رہا تو قانون کی جوگت بنے گی اس کا تماشا آج کھلی آنکھوں ہر شخص ہر محکمہ اور ہر ادارہ میں دیکھتا ہے، آج دنیا کا تمدن ترقی پذیر ہے، تعلیم وتعلّم کے اداروں کا جال گاؤں گاؤں تک پھیلا ہوا ہے، تہذیب تہذیب کے الفاظ ہر شخص کی زبان پر ہیں، قانون سازی کی مجلسوں کا بازار گرم ہے، تنفیذ قانون کے بے شمار ادارے اربوں روپے کے خرچ سے قائم ہیں، دفتری انتظامات کی بھول بھلیاں ہے، مگر جرائم اور فتنے فساد روز بروز بڑھتے ہی جاتے ہیں، وجہ اس کے سوا نہیں کہ کوئی قانون خود کار مشین نہیں ہوتا، بلکہ اس کو انسان چلاتے ہیں، جب انسان اپنی انسانیت کھو بیٹھا تو پھر اس فساد کا علاج نہ قانون سے ہوسکتا ہے نہ حکومت اور محکموں کے چکر سے، اسی لئے انسانیت کے عظیم ترین محسن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمامتر توجہ اس پر مرکوز فرمائی ہے کہ انسان کو صحیح معنی میں انسان بنا دیں، تو پھر فساد وجرائم خود بخود ختم ہوجاتے ہیں، نہ پولیس کی زیادہ ضرورت رہتی ہے نہ عدالتوں کے اس پھیلاؤ کی جو دنیا میں پایا جاتا ہے، اور جب تک دنیا کے جس حصہ میں آپؐ کی تعلیمات وہدایات پر عمل ہوتا رہا دنیا نے وہ امن وامان دیکھا جس کی نظیر نہ پہلے کبھی دیکھی گئی نہ ان تعلیمات کو چھوڑنے کے بعد متوقع ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کی رُوح ہے اللہ تعالیٰ کا خوف، اور قیامت کے حساب کتاب کی فکر، اس کے بغیر کوئی قانون ودستور اور کوئی محکمہ اور کوئی مدرسہ اور یونیورسٹی انسان کو جرائم سے باز رکھنے پر مجبور نہیں کرسکتی۔

آج کی دنیا میں جن لوگوں کے ہاتھ میں اختیار کی باگ ہے وہ جرائم کے انسداد کے لئے نئے سے نئے انتظام کو تو سوچتے ہیں، مگر اس رُوحِ انتظام یعنی خوفِ خدا سے نہ صرف غفلت برتتے ہیں بلکہ اس کو فنا کرنے کے اسباب مہیا کرتے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ ہمیشہ یہی سامنے آتا رہتا ہے کہ ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

کھلے طور پر فساد مچانے والے چوروں، غارت گروں کا علاج سہل ہے، مگر اُن انسانیت فراموش

انسانوں کا فساد ہمیشہ برنگِ اصلاح ہوتا ہے، وہ کوئی دلچسپ دلفریب اصلاحی اسکیم بھی سامنے رکھ لیتے ہیں، اور خالص ذاتی اغراض فاسدہ کو اصلاح کا رنگ دے کر اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ کے نعرے لگاتے رہتے ہیں، اسی لئے حق تعالیٰ سُبحانہ نے جہاں فساد سے روکا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (۲: ۲۲۰)، یعنی "اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ مفسد کون ہے اور مصلح کون؟" جس میں اشارہ فرمایا کہ فساد و صلاح کی اصل حقیقت حق تعالیٰ ہی جانتے ہیں جو دلوں کے حال اور نیتوں سے بھی واقف ہیں، اور ہر عمل کے خواص و نتائج کو بھی جانتے ہیں کہ اس کا نتیجہ صلاح ہوگا یا فساد، اس لئے اصلاح کے لئے صرف نیتِ اصلاح کافی نہیں، بلکہ عمل کا رُخ بھی شریعت کے مطابق صحیح ہونا ضروری ہے، بعض اوقات کوئی عمل پوری نیک نیتی اور اصلاح کے قصد سے کیا جاتا ہے مگر اس کا اثر فساد و فتنہ ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ

اے لوگو بندگی کرو اپنے رب کی جس نے پیدا کیا تم کو اور ان کو جو تم سے پہلے

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٢١﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ

تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ، جس نے بنایا واسطے تمہارے زمین کو بچھونا اور آسمان کو

بِنَاءً وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا

چھت اور اتارا آسمان سے پانی پھر نکالے اس سے میوے تمہارے کھانے

لَّكُمْ ۖ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٢﴾

کے واسطے سو نہ ٹھہراؤ کسی کو اللہ کے مقابل اور تم تو جانتے ہو

خلاصۂ تفسیر

اے لوگو! عبادت اختیار کرو اپنے پروردگار کی جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں عجب نہیں کہ تم دوزخ سے بچ جاؤ (شاہی محاورہ میں عجب نہیں کا لفظ وعدہ کے موقع پر بولا جاتا ہے) وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے بنایا تمھارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت اور برسایا آسمان سے پانی، پھر (پردۂ عدم سے) نکالا بذریعہ اس پانی کے پھلوں سے غذا کو تم لوگوں کے واسطے، اب تو مت ٹھہراؤ اللہ پاک کے مقابل اور تم تو جانتے بوجھتے ہو، (یعنی یہ جانتے ہو کہ یہ تمام تصرفات خدا تعالیٰ کے سوا کوئی کرنے والا نہیں، پھر خدا کے مقابلہ میں دوسری چیزوں کو معبود بنانا کیسے درست ہوسکتا ہے)۔

معارف ومسائل

ربطِ آیات
سورۂ بقرہ کی دوسری آیت میں اُس دعاء و درخواست کا جواب تھا جو سورۂ فاتحہ میں آئی ہے، یعنی اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ یعنی جو صراطِ مستقیم تم طلب کرتے ہو وہ اس کتاب میں ہے، کیونکہ قرآن کریم اوّل سے آخر تک صراطِ مستقیم ہی کی تشریح ہے۔

اس کے بعد قرآنی ہدایات کو قبول کرنے اور نہ کرنے کے اعتبار سے انسان کے تین گروہوں کو بیان کیا گیا، پہلی تین آیات میں مؤمنین متقین کا ذکر ہوا، جنھوں نے ہدایاتِ قرآنی کو اپنا نصب العین بنالیا، بعد کی دو آیتوں میں اُس گروہ کا ذکر کیا جس نے کھلے طور پر اُس ہدایت کی مخالفت کی، اس کے بعد تیرہ آیتوں میں اُس خطرناک گروہ کے حالات بیان کئے گئے جو حقیقت میں تو قرآنی ہدایات کے مخالف تھے، مگر دنیا کی ذلیل اغراض یا مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے خیال سے اپنے کفر و مخالفت کو چھپا کر مسلمانوں میں شامل رہتے اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے۔

اسی طرح سورۂ بقرہ کی ابتدائی بیس آیتوں میں ہدایت کے قبول کرنے اور نہ کرنے کے معیار پر کُل انسانوں کو تین گروہوں میں بانٹ دیا گیا، جس میں اس طرف بھی اشارہ پایا گیا کہ انسانوں کی گروہی اور قومی تقسیم نسب اور وطن یا زبان اور رنگ کی بنیادوں پر معقول نہیں، بلکہ اس کی صحیح تقسیم مذہب کی بنیاد پر ہی، کہ اللہ تعالیٰ اور اس کی ہدایات کو ماننے والے ایک قوم اور نہ ماننے والے دوسری قوم جن کو سورۂ مجادلہ میں "حزب اللہ" اور "حزب الشیطان" کا نام دیا گیا۔

غرض سورۂ بقرہ کی ابتدائی بیس آیتوں میں قرآنی ہدایات کو ماننے یا نہ ماننے کی بنیاد پر انسان کو تین قوموں میں تقسیم کرکے ہر ایک کا کچھ حال بیان فرمایا گیا۔

اس کے بعد مذکورہ اکیسویں اور بائیسویں آیتوں میں تینوں گروہوں کو خطاب کرکے وہ دعوت پیش کی گئی ہے جس کے لئے قرآن نازل ہوا، اس میں مخلوق پرستی سے باز آنے اور ایک خدا کی عبادت کرنے کی طرف دعوت ایسے انداز سے دی گئی ہے، کہ اس میں دعویٰ کے ساتھ اس کے واضح دلائل بھی موجود ہیں، جن میں ادنیٰ سمجھ بوجھ والا انسان بھی ذرا سا غور کرے تو توحید کے اقرار پر مجبور ہو جائے۔

پہلی آیت میں يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ سے خطاب شروع ہوا، لفظ اَلنَّاسُ عربی زبان میں مطلق انسان کے معنی میں آتا ہے، اس لئے مذکورہ تینوں گروہ اس میں داخل ہیں، جن کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ، عبادت کے معنی ہیں اپنی پوری طاقت مکمل فرمانبرداری میں صرف کرنا، اور خوف وعظمت کے پیش نظر نافرمانی سے دُور رہنا (روح البیان

ص ۴ ، ج ۱) اور لفظ رَبّ کے معنی "پروردگار" کے ہیں، جس کی پوری تشریح پہلے گذر چکی ہے، ترجمہ یہ ہوا کہ "عبادت کرو اپنے رب کی"

یہاں پر لفظ "رب" کی جگہ لفظ "اللہ" یا اسماء حسنیٰ میں سے کوئی اور نام بھی لایا جا سکتا تھا، مگر ان میں سے اس جگہ لفظ "ربّ" کا انتخاب کرنے میں یہ حکمت ہو کہ اس مختصر سے جملے میں دعوے کے ساتھ دلیل بھی آگئی، کیونکہ عبادت کی مستحق صرف وہ ذات ہو سکتی ہے جو انسان کی پرورش کی کفیل ہو، جو اس کو ایک قطرہ سے تدریجی تربیت کے ساتھ ایک بھلا چنگا، سمیع و بصیر، عقل و ادراک والا ماہر انسان بنا دے، اور اس کی بقاء و ارتقاء کے وسائل مہیا کرے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ انسان کتنا ہی جاہل ہو، اور اپنی بصیرت کو برباد کر چکا ہو، جب بھی ذرا غور کرے گا تو اس کا یقین کرنے میں اُسے ہرگز تامّل نہیں ہوگا، کہ یہ شانِ ربوبیت بجز حق تعالیٰ کے اور کسی میں نہیں، اور انسان پر یہ مربیانہ انعامات نہ کسی پتھر کے تراشے ہوئے بُت نے کئے ہیں اور نہ کسی اور مخلوق نے، اور وہ کیسے کرتے جب کہ وہ سب خود اپنے وجود اور بقاء میں اُسی "ذاتِ واحد" کے محتاج ہیں، ایک محتاج دوسرے محتاج کی کیا حاجت روائی کر سکتا ہے؟ اور اگر ظاہری طور پر کری بھی تو وہ بھی درحقیقت اُسی ذات کی تربیت ہوگی، جس کی طرف یہ دونوں محتاج ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس جگہ لفظ "رب" لاکر یہ واضح کر دیا گیا کہ جس ذات کی عبادت کی طرف دعوت دی گئی ہے، اس کے سوا کوئی دوسری ہستی عبادت کی مستحق ہو ہی نہیں سکتی۔

اس جملہ میں انسانوں کے تینوں گروہوں کو خطاب ہے، اور ہر مخاطب کیلئے اس جملہ کا معنی و مطلب جدا ہے، مثلاً جب کہا گیا کہ اپنے رب کی عبادت کرو، تو کفار کے لئے اس خطاب کے معنی یہ ہوئے کہ مخلوق پرستی چھوڑ کر توحید اختیار کرو، اور منافقین کے لئے اس کے یہ معنی ہوئے کہ نفاق چھوڑ کر اخلاص پیدا کرو گناہگار مسلمانوں کے لئے معنی یہ ہوئے کہ گناہ سے باز آؤ اور کامل اطاعت اختیار کرو، اور متقی مسلمانوں کے لئے اس جملہ کے یہ معنی ہوئے کہ اپنی طاعت و عبادت پر ہمیشہ قائم رہو، اور اس میں ترقی کی کوشش کرو (روح البیان)

اس کے بعد "ربّ" کی چند صفاتِ خاصہ کا ذکر کر کے اس مضمون کی مزید توضیح فرما دی گئی، ارشاد ہوتا ہے اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ "یعنی تمھارا پروردگار وہ ہے جس نے تمھیں پیدا کیا، اور ان قوموں کو بھی جو تم سے پہلے گذر چکی ہیں" اس میں "رَبّ" کی وہ صفت بتلائی گئی ہو جو اللہ جل شانہٗ کے سوا کسی مخلوق میں پائے جانے کا کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا، کہ نیست سے ہست اور نابود سے بود کرنا، پھر بطنِ مادر کی تاریکیوں اور گندگیوں میں ایسا حسین و جمیل، پاک و صاف انسان بنا دینا کہ فرشتے بھی اس کی پاکی پر رشک کریں، یہ سوائے اُس ذاتِ حق کے کس کا کام ہو سکتا

ہو جو کسی کا محتاج نہیں، اور سب اُس کے محتاج ہیں۔

اس آیت میں خَلَقَكُمْ کے ساتھ اَلَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ کا اضافہ کر کے ایک تو یہ بتلا دیا کہ تم اور تمہارے آباء و اجداد یعنی تمام بنی نوع انسان کا خالق وہی پروردگار ہے، دوسرے صرف مِنْ قَبْلِكُمْ کا ذکر فرمایا، مِنْ بَعْدِكُمْ، یعنی بعد میں پیدا ہونے والے لوگوں کا ذکر نہیں کیا، اس میں اس کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ امّتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کے بعد کوئی دوسری امت یا دوسری ملّت نہیں ہو گی، کیونکہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نہ کوئی نبی مبعوث ہو گا، نہ اس کی کوئی جدید اُمت ہو گی۔

اس کے بعد اسی آیت کا آخری جملہ ہے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ یعنی دنیا میں گمراہی اور آخرت میں عذاب سے نجات پانے کی امید تمہارے لئے صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ توحید کو اختیار کر لو اور شرک سے باز آؤ۔

کائناتِ زمین و آسمان میں قدرتِ حق کے مظاہر

پھر دوسری آیت میں "ربّ" کی دوسری صفات کا بیان اس طرح فرمایا گیا ہے: اَلَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ

"یعنی رب وہ ذات ہے جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو فرش، اور آسمان کو چھت اور برسایا آسمان سے پانی، پھر اس پانی کے ذریعہ پردۂ عدم سے نکالی پھلوں کی غذا تمہارے لئے"۔

پہلی نعمت اس سے پہلی آیت میں اُن انعامات کا ذکر تھا جو انسان کی ذات سے متعلق ہیں، اور اس آیت میں اُن انعامات کا ذکر ہے جو انسان کے گرد و پیش کی چیزوں سے متعلق ہیں، یعنی پہلی آیت میں "انفسی" اور دوسری میں "آفاقی" نعمتوں کا ذکر فرما کر تمام اقسامِ نعمت کا احاطہ فرما یا گیا۔

ان "آفاقی" نعمتوں میں سے زمین کی پیدائش کا ذکر ہے، کہ اس کو انسان کے لئے فرش بنا دیا، نہ پانی کی طرح نرم ہے، جس پر قرار نہ ہو سکے، اور نہ لوہے، پتھر کی طرح سخت ہو کہ ہم اسے اپنی ضرورت کے مطابق آسانی سے استعمال نہ کر سکیں، بلکہ نرمی اور سختی کے درمیان ایسا بنایا گیا جو عام انسانی ضروریاتِ زندگی میں کام دے سکے۔

فِرَاشًا کے لفظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ زمین گول نہ ہو، کیونکہ زمین کا یہ عظیم الشان کرہ گول ہونے کے باوجود دیکھنے میں ایک سطح نظر آتا ہے، اور قرآن کا عام طرز یہی ہے کہ ہر چیز کی وہ کیفیت بیان کرتا ہے جس کو ہر دیکھنے والا عالم، جاہل، شہری، دیہاتی سمجھ سکے۔

دوسری نعمت یہ ہے کہ آسمان کو ایک مزین اور نظر فریب چھت بنا دیا، تیسری نعمت یہ ہو کہ آسمان سے پانی برسایا، پانی آسمان سے برسانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ بادل کا واسطہ درمیان میں نہ ہو

بلکہ محاورات میں ہر اوپر سے آنے والی چیز کو آسمان سے آنا بولتے ہیں۔

خود قرآن کریم نے متعدد مقامات میں بادلوں سے پانی برسانے کا ذکر فرمایا ہے، مثلاً ارشاد ہے:

ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ؕ (واقعہ: ۶۹)	"کیا بارش کا پانی سفید بادلوں سے تم نے اتارا ہے یا ہم اس کے اُتارنے والے ہیں"

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَ اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا (نبأ: ۱۴)	"ہم نے اُتارا پانی بھرے ہوئے بادلوں سے پانی کا ریلا"۔

چوتھی نعمت اس پانی کے ذریعہ پھل پیدا کرنا اور پھلوں سے انسان کی غذا پیدا کرنا ہے، پروردگارِ عالم کی چار مذکورہ صفات میں سے پہلی تین باتیں تو ایسی ہیں کہ ان میں انسان کی سعی و عمل تو کیا خود اس کے وجود کو بھی دخل نہیں، بیچارے انسان کا نام و نشان بھی نہ تھا، جب زمین اور آسمان پیدا ہو چکے تھے اور بادل اور بارش اپنا کام کر رہے تھے، ان کے متعلق تو کسی بیوقوف جاہل کو بھی یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہ کام سوائے حق جل شانہٗ کے کسی انسان یا بُت یا کسی اور مخلوق نے کئے ہونگے

ہاں زمین سے پھل اور پھلوں سے انسانی غذا نکالنے میں کسی سادہ لوح اور سطحی نظر رکھنے والے کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ یہ انسانی سعی و عمل اور اس کی دانشمندانہ تدبیروں کا نتیجہ ہیں کہ وہ زمین کو نرم کرنے اور کمانے میں، پھر بیج ڈالنے اور جمانے میں، پھر اس کی تربیت اور حفاظت میں اپنی محنت خرچ کرتا ہے۔

لیکن قرآن کریم نے دوسری آیات میں اس کو بھی صاف کر دیا کہ انسان کی سعی اور محنت کو درخت اُگانے یا پھل نکالنے میں قطعاً کوئی دخل نہیں، بلکہ اس کی ساری تدبیروں اور محنتوں کا حاصل "رکاوٹوں کو دور کرنے" سے زیادہ کچھ نہیں، یعنی انسان کا کام صرف اتنا ہے کہ پیدا ہونے والے درخت کی راہ سے رُکاوٹیں دور کرے اور بس۔

غور کیجئے کہ زمین کا کھودنا، اس میں ہل چلانا، اس میں سے جھاڑ جھنکاڑ کو دُور کرنا، اس میں کھاد ڈال کر زمین کو نرم کرنا جو کاشتکاروں کا ابتدائی کام ہے، اس کا حاصل اس کے سوا کیا ہے کہ بیج یا گٹھلی کے اندر سے جو نازک کونپل قدرتِ خداوندی سے نکلے گی زمین کی سختی یا کوئی جھاڑ جھنکاڑ اس کی راہ میں حائل نہ ہو جائیں، بیج میں سے کونپل نکالنے اور اس میں پھول پتّیاں پیدا کرنے میں اس بیچارے کاشتکار کی محنت کا کیا دخل ہے۔

اسی طرح کاشتکار کا دوسرا کام زمین میں بیج ڈالنا، پھر اس کی حفاظت کرنا، پھر جو کونپل نکلے اس کی سردی گرمی اور جانوروں سے حفاظت کرنا ہے، اس کا حاصل اس کے سوا کیا ہو کہ قدرتِ خداوندی سے پیدا ہونے والے کونپلوں کو ضائع ہونے سے بچایا جائے، ان سب کاموں کو کسی درخت

کے نکلنے یا پھلنے پھولنے میں بجز رفعِ موانع کے اور کیا دخل ہے ؟ ہاں پانی سے جمنے والے بیج کی اور اس سے نکلنے والے درخت کی غذا تیار ہوتی ہے، اور اسی سے وہ پھلتا پھولتا ہے، لیکن پانی کاشتکار کا پیدا کیا ہوا نہیں، اس میں بھی کاشتکار کا کام صرف اتنا ہے کہ قدرت کے پیدا کئے ہوئے پانی کو قدرت ہی کے پیدا کئے ہوئے درخت تک ایک مناسب وقت میں اور مناسب مقدار میں پہنچا دے۔

آپ نے دیکھ لیا کہ درخت کی پیدائش اور اس کے پھلنے پھولنے میں اوّل سے آخر تک انسان کی محنت اور تدبیر کا اس کے سوا کوئی اثر نہیں کہ نکلنے والے درخت کے راستے سے روڑے ہٹا دے، یا اس کو ضائع ہونے سے بچالے، باقی رہی درخت کی پیدائش، اس کا بڑھنا، اس میں پتے اور شاخیں پھر پھول اور پھل پیدا کرنا سو اس میں سوائے خدا تعالیٰ کی قدرت کے اور کسی کا کوئی دخل نہیں۔

اسی مضمون کو قرآن کریم نے اس طرح بیان فرمایا ہے :-

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ (واقعہ: ۶۳-۶۴)	بتلاؤ جو کچھ تم بوتے ہو، اُسے تم اُگاتے ہو ؟ یا ہم اُگانے والے ہیں ؟"

قرآن کے اس سوال کا جواب انسان کے پاس بجز اس کے اور کیا ہے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی ان سب درختوں کو اُگانے والے ہیں۔

اِس تفصیل سے یہ واضح ہوگیا کہ جس طرح زمین اور آسمان کی پیدائش اور برق و باراں کے منظم سلسلۂ کار میں انسانی سعی و محنت کا کوئی دخل نہیں، اسی طرح کھیتی اور درختوں کے پیدا ہونے اور ان سے پھول پھل نکلنے، اور ان سے انسان کی غذائیں تیار ہونے میں بھی اس کا دخل صرف برائے نام ہے، اور حقیقت میں یہ سب کاروبار صرف حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور حکمتِ بالغہ کا نتیجہ ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ کی ایسی چار صفات کا بیان ہے جو سوائے اس کے اور کسی مخلوق میں پائی ہی نہیں جاسکتیں، اور جب ان دونوں آیتوں سے یہ معلوم ہوگیا کہ انسان کو عدم سے وجود میں لانا اور پھر اس کی بقاء و ترقی کے سامان زمین اور آسمان، بارش اور پھل پھول کے ذریعے مہیا کرنا سوائے ذاتِ حق جل شانہٗ کے اور کسی کا کام نہیں، تو ہر ادنیٰ سمجھ بوجھ رکھنے والے انسان کو اس پر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ عبادت و اطاعت کے لائق اور مستحق بھی صرف وہی ذات ہے، اور اس سے بڑا کوئی ظلم نہیں کہ انسان کے بود و وجود اور اس کے بقاء و ارتقاء کے سارے سامان تو اللہ تعالیٰ پیدا کرے، اور غافل انسان دوسروں کی چوکھٹوں پر سجدہ کرتا پھرے، دوسری چیزوں کی بندگی میں مشغول ہو جائے، مولانا رومیؒ نے اسی غافل انسان کی زبان پر فرمایا ہے ؎

نعمتت را خوردہ عصیاں میکنم
نعمت از تو من بغیرے می تنم

اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی ساری مخلوقات کا سردار اس لئے بنایا تھا کہ ساری کائنات اس کی خدمت کرے، اور یہ صرف ربّ کائنات کی خدمت اور عبادت میں مشغول رہے، اور کسی کی طرف نظر نہ رکھے، اس کا یہ رنگ ہو جائے ؎

بگذر از یادِ گل و گلبن کہ ہیچم یاد نیست
در زمین و آسماں جز ذکر حق آباد نیست

لیکن غافل انسان نے اپنی حماقت سے اللہ تعالیٰ ہی کو بھلا دیا تو اسے ایک خدا کی غلامی کے بجائے ستر کروڑ دیوتاؤں کی غلامی کرنا پڑی ؎

ایک در چھوڑ کے ہم ہو گئے لاکھوں کے غلام
ہم نے آزادیِ عرفی کا نہ سوچا انجام

اسی غیروں کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے اس آیت کے آخر میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ "اب تو مت ٹھہراؤ اللہ کا مقابل اور تم تو جانتے بوجھتے ہو" یعنی جب تم نے یہ جان لیا کہ تم کو نیست سے ہست کرنے والا، تمھاری تربیت اور پرورش کے سارے سامان مہیا کر کے ایک قطرہ سے حسین و جمیل، حساس اور عاقل انسان بنانے والا، تمھارے رہن سہن کے لئے زمین اور دوسری ضروریات کے لئے آسمان بنانے والا، آسمان سے پانی برسانیوالا پانی سے پھل اور پھل سے غذا مہیا کرنے والا بجز حق تعالیٰ کے کوئی نہیں تو عبادت و بندگی کا مستحق دوسرا کون ہو سکتا ہے کہ اس کو خدا کا مقابل یا سہیم و شریک ٹھہرایا جائے، اگر ذرا بھی غور کیا جائے تو اس جہان میں اس سے بڑھ کر کوئی ظلم اور بیوقوفی و بے عقلی نہیں ہو سکتی کہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر مخلوق سے دل لگایا جائے اور اس پر بھروسہ کیا جائے ؎

آنانکہ بجز روی تو جائے نگرانند
کوتہ نظرانند چہ کوتہ نظرانند

خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں اس چیز کی دعوت دی گئی ہے جو تمام آسمانی کتابوں کے اور تمام انبیاء کے بھیجنے کا اصل مقصد ہے یعنی صرف ایک خدا کی عبادت و بندگی جس کا نام توحید ہے۔

اور یہ وہ انقلابی نظریہ ہے جو انسان کے تمام اعمال و احوال اور اخلاق و معاشرت پر گہرا اثر رکھتا ہے، کیونکہ جو شخص یہ یقین کرے کہ تمام عالم کا خالق و مالک اور تمام نظامِ عالم میں متصرف اور تمام چیزوں پر قادر صرف ایک ذات ہے، بغیر اس کی مشیت اور ارادے کے نہ کوئی ذرہ حرکت کر سکتا ہے، نہ کوئی کسی کو نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہے، تو اس کی پوری توجہ ہر مصیبت و راحت اور ہر تنگی و فراخی میں صرف ایک ذات کی طرف ہو جائے گی، اور اس کو وہ بصیرت حاصل ہو جائے گی

جس کے ذریعہ وہ اسباب ظاہرہ کی حقیقت کو پہچان لے گا کہ یہ سلسلۂ اسباب درحقیقت ایک پردہ ہے جس کے پیچھے دستِ قدرت کارفرما ہے۔

برق اور بھاپ کے پُوجنے والے دانایانِ یورپ اگر اس حقیقت کو سمجھ لیں تو انھیں معلوم ہو جائے کہ برق اور بھاپ سے آگے بھی کوئی حقیقت ہے، اور حقیقی پاور اور طاقت نہ برق میں ہے نہ بھاپ میں، بلکہ سب طاقتوں اور قوتوں کا سرچشمہ اسی ذاتِ حق تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، جس نے یہ برق اور بھاپ پیدا کئے، اس کو سمجھنے کے لئے بصیرت چاہئے، اور جس نے اس حقیقت کو نہیں سمجھا وہ دنیا میں کتنا ہی دانشمند و فلاسفر کہلاتا ہو مگر اس کی مثال اس دیہاتی بیوقوف کی سی ہے جو کسی ریلوے اسٹیشن پر پہونچا اور دیکھا کہ گارڈ کے ہاتھ میں دو جھنڈیاں سُرخ اور سبز ہیں، سبز کے دکھلانے سے ریل چلنے لگتی ہے، اور سُرخ جھنڈی دکھلانے سے ریل تھم جاتی ہے، یہ دیکھ کر وہ اِن جھنڈیوں ہی کو ڈنڈوت کرنے لگے، اور سمجھے کہ یہ جھنڈیاں ہی طاقت کی مالک ہیں کہ اتنی بڑی تیز رفتار پہاڑ کی طرح بوجھل گاڑی کو چلانا اور روکنا ان کا کام ہے، جس طرح دنیا اس دیہاتی پر ہنستی ہے کہ اس جاہل کو یہ خبر نہیں کہ جھنڈیاں محض علامت ہیں اور کام درحقیقت ڈرائیور کا ہے، کہ وہ ریل کو چلاتا ہے اور روکتا ہے، بلکہ اس کا بھی نہیں مشین کے کل پرزوں کا ہے، اور جس نے ذرا نگاہ کو اور گہرا کر لیا تو اُسے یہ نظر آجاتا ہے کہ درحقیقت اُس کا چلانا نہ ڈرائیور کا کام ہے، نہ انجن کے کل پُرزوں کا، بلکہ اصل طاقت اس اسٹیم کی ہے جو انجن کے اندر پیدا ہو رہی ہے، اسی طرح ایک موحّد انسان ان سب عقلمندوں پر ہنستا ہے کہ حقیقت کو تم نے بھی نہیں پایا، فکر و نظر کی منزل ابھی اور آگے ہے، ذرا نگاہ کو تیز کرو اور غور سے کام لو، تو معلوم ہوگا کہ اسٹیم اور آگ و پانی بھی کچھ نہیں، طاقت و قوت صِرف اسی ذات کی ہے جس نے آگ اور پانی پیدا کئے ہیں، اور اسی کی مشیت و امر کے ماتحت یہ سب چیزیں اپنی ڈیوٹی ادا کر رہی ہیں ؎

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند
با من و تو مردہ، با حق زندہ اند

کسی کا عمل اس کی نجات اور جنّت کا یقینی سبب نہیں

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ، اس جملہ میں لفظ لَعَلَّ استعمال فرمایا ہے جو رجاء یعنی امید کے معنی میں آتا ہے، اور ایسے مواقع پر بولا جاتا ہے جہاں کسی فعل کا وقوع یقینی نہ ہو، حکمِ ایمان و توحید کے نتیجہ میں نجات اور جنت کا حصُول وعدۂ الٰہیہ کے مطابق یقینی ہے، مگر اس یقینی شے کو امید و رجاء کے عنوان سے بیان کرنے میں حکمت یہ بتلانا ہے کہ انسان کا کوئی عمل اپنی ذات میں نجات و جنّت کی قیمت نہیں بن سکتا، بلکہ فضلِ خداوندی اس کا اصل سبب ہے، ایمان و عمل کی توفیق ہونا اس فضلِ خداوندی کی علامت ہے، علّت نہیں۔

عقیدۂ توحید ہی دنیا میں امن و امان اور سکون و اطمینان کا ضامن ہے

عقیدۂ توحید جو اسلام کا سب سے پہلا بنیادی عقیدہ ہے، یہ صرف ایک نظریہ نہیں، بلکہ انسان کو صحیح معنی میں انسان بنانے کا واحد ذریعہ ہے جو انسان کی تمام مشکلات کا حل، اور ہر حالت میں اس کے لئے پناہ گاہ، اور ہر غم و فکر میں اس کا غمگسار ہے، کیونکہ عقیدۂ توحید کا حاصل یہ ہے کہ عناصر کے کون و فساد اور ان کے سارے تغیرات صرف ایک ہستی کی مشیّت کے تابع اور اس کی حکمت کے مظاہر ہیں ؎

ہر تغیّر ہے غیب کی آواز
ہر تجدّد میں ہیں ہزار دں راز

اور ظاہر ہے کہ جب یہ عقیدہ کسی کے قلب و دماغ پر چھا جائے اور اس کا حال بن جائے تو یہ دنیا ہی اس کے لئے جنّت بن جائے گی، سارے جھگڑے فساد اور ہر فساد کی بنیادیں ہی منہدم ہو جائیں گی، کیونکہ اس کے سامنے یہ سبق ہو گا ؎

از خدا داں خلافِ دشمن و دوست
کہ دل ہر دو در تصرّفِ اوست

اس عقیدہ کا مالک ساری دنیا سے بے نیاز ہر خوف و خطر سے بالاتر زندگی گذارتا ہے، اُس کا حال یہ ہوتا ہے ؎

موحّد چہ بر پائے ریزی زرش　؛　چہ فولادِ ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد ز کس　؛　ہمین است بنیادِ توحید و بس

کلمۂ لا الٰہ الا اللہ جو کلمۂ توحید کہلاتا ہے اس کا یہی مفہوم ہے، مگر یہ ظاہر ہے کہ توحید کا محض زبانی اقرار اس کے لئے کافی نہیں، بلکہ سچے دل سے اس کا یقین اور یقین کے ساتھ استحضار ضروری ہے، کیونکہ توحیدِ خدا　واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

کلمہ لا الٰہ الّا اللہ کے پڑھنے والے تو آج دنیا میں کروڑوں ہیں، اور اتنے ہیں کہ کسی زمانے میں اتنے نہیں ہوئے، لیکن عام طور پر یہ صرف زبانی جمع خرچ ہے، توحید کا رنگ ان میں رچا نہیں ورنہ اُن کا بھی وہی حال ہوتا جو پہلے بزرگوں کا تھا، کہ نہ کوئی بڑی سے بڑی قوت و طاقت ان کو مرعوب کر سکتی تھی، اور نہ کسی قوم کی عددی اکثریت اُن پر اثر انداز ہو سکتی تھی، نہ کوئی بڑی سے بڑی دولت و سلطنت اُن کے قلوب کو خلافِ حق اپنی طرف جھکا سکتی تھی، ایک پیغمبرؑ کھڑا ہو کر ساری دنیا کو للکار کر کہہ دیتا تھا کہ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے،　کِیۡدُوۡنِ فَلَا تُنۡظِرُوۡنِ، انبیاءؑ کے بعد صحابہؓ و تابعینؒ جو تھوڑی سی مدّت میں دنیا پر چھا گئے اُن کی طاقت و قوت اسی حقیقی توحید میں مضمر تھی، اللہ تعالیٰ ہمیں اور سب مسلمانوں کو یہ دولت نصیب فرمائے۔

رسالتِ محمدیؐ کا اثبات

بذریعہ اعجازِ قرآن [1]

وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن

اور اگر تم شک میں ہو اس کلام سے جو اُتارا ہم نے اپنے بندے پر تو لے آؤ ایک سورت

مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٢٣﴾

اس جیسی اور بلاؤ اس کو جو تمھارا مددگار ہو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو،

فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَ

پھر اگر ایسا نہ کرسکو اور ہرگز نہ کرسکو گے تو پھر بچو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور

الْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ﴿٢٤﴾

پتھر ہیں تیار کی ہوئی ہے کافروں کے واسطے۔

خُلاصۂ تفسیر

اگر تم لوگ کچھ خلجان میں ہو اس کتاب کی نسبت جو ہم نے نازل فرمائی ہے اپنے بندے خاص پر تو اچھا پھر تم بنا لاؤ ایک محدود ٹکڑا جو اس کا ہم پلہ ہو کیونکہ تم بھی عربی زبان جانتے ہو اور اس کی نظم و نثر کے مشاق ہو، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کوئی مشق بھی نہیں کی، اور جب اس کے باوجود تم قرآن کے ایک ٹکڑے کی بھی مثل نہ بنا سکو تو بشرطِ انصاف بے تامل ثابت ہو جاوے گا کہ یہ معجزہ منجانب اللہ ہے اور آپؐ اللہ کے پیغمبر ہیں) اور بلا لو اپنے حمائیتیوں کو (جو) خدا سے الگ (الگ تجویز کر رکھے ہیں) اگر تم سچے ہو، پھر اگر تم یہ کام نہ کرسکو اور قیامت تک بھی نہ کرسکو گے تو پھر ذرا بچتے رہیو دوزخ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، تیار رکھی ہوئی ہے کافروں کے واسطے۔

معارف و مسائل

رَبطِ آیات و خلاصۂ مضمون یہ سورۂ بقرہ کی تیئیسویں اور چوبیسویں آیتیں ہیں، اس سے پہلی دو آیتوں میں توحید کا ثبوت تھا، ان دونوں آیتوں میں رسالتِ

[1] الحمدللہ یہ مضمون کتابی شکل میں علیحدہ شائع ہو چکا ہے۔ ناشر

محمدیؐ کا اثبات ہے، (علیہ الصلوٰۃ والسلام) وہ ہدایت جو قرآن لے کر آیا ہے اس کے دو عمود ہیں: توحید اور رسالت، پہلی دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے چند مخصوص کام ذکر کر کے توحید ثابت کی گئی تھی، ان دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ کا کلام پیش کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ثابت فرمائی گئی ہے، اور طریقِ اثبات دونوں کا ایک ہی ہے، کہ پہلی دو آیتوں میں چند ایسے کام مذکور تھے جو سوائے حق تعالیٰ کے کوئی نہیں کر سکتا، مثلاً زمین اور آسمان کا پیدا کرنا، آسمان سے پانی اُتارنا، پانی سے پھل پھول پیدا کرنا۔

اور خلاصۂ استدلال یہ تھا کہ جب یہ کام اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تو مستحقِ عبادت بھی اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، اور ان دونوں آیتوں میں ایک ایسا کلام پیش کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا، اور نہ کوئی انسانی فرد یا جماعت اس کی مثال و نظیر لا سکتی ہے، جس طرح زمین و آسمان کی بناوٹ، پانی برسانے اور اس سے پھل پھول نکالنے سے انسانی طاقت کا عاجز ہونا اس کی دلیل تھی کہ یہ کام صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں، اسی طرح کلامِ الٰہی کا مثل یا نظیر پیش کرنے سے پوری مخلوق کا عاجز رہنا اس کی دلیل ہے، کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ ہی کا ہے، کسی مخلوق کا نہیں، اس آیت میں قرآن نے پوری دنیا کے انسانوں کو خطاب کر کے چیلنج دیا ہے کہ اگر تم اس کلام کو اللہ کا کلام نہیں، بلکہ کسی انسان کا کلام سمجھتے ہو تو تم بھی انسان ہو، تمھیں بھی ایسا کلام پیش کرنے پر قدرت ہونا چاہئے، پورا کلام تو کیا تم اس کلام کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کی نظیر و مثال بنا کر دکھلا دو، اور اس پر تمھارے لئے یہ مزید آسانی دی جاتی ہے کہ تنہا کوئی آدمی نہ بنا سکے تو تمھیں اختیار ہے سارے جہان سے اپنے حمایتی اور مددگار جمع کر لو، اور ایک بین العالمی کانفرنس کر کے اس قرآن کی چھوٹی سی سورت کی مثال بنا لاؤ۔

پھر اسی پر بس نہیں کیا دوسری آیت میں اُن کو غیرت دلائی کہ تمھاری مجال نہیں کہ اس جیسی ایک سورت بنا سکو، پھر عذاب سے ڈرایا کہ جب تم اس کلام کی مثال بنانے سے اپنا عجز محسوس کرتے ہو، اور یہ صاف اس کی دلیل ہے کہ یہ انسان کا کلام نہیں، بلکہ ایسی ہستی کا کلام ہے جو تمام مخلوق سے مافوق اور بلند و بالا ہے، جس کی قدرتِ کاملہ سب پر حاوی ہے، تو پھر اس پر ایمان نہ لانا اپنے ہاتھوں جہنم میں اپنا ٹھکانا کرنا ہے اس سے بچو۔

حاصل یہ ہو کہ ان دونوں آیتوں میں قرآن کریم کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلیٰ معجزہ بتلا کر آپؐ کی رسالت اور سچائی کا ثبوت پیش کیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات تو ہزاروں ہیں اور بڑے بڑے حیرت انگیز ہیں، لیکن اُن سب میں سے اس جگہ آپؐ کے علمی معجزے یعنی قرآن کے ذکر پر اکتفاء کر کے یہ بتلا دیا گیا کہ آپؐ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے، اور اس معجزہ کو انبیاء علیہم السلام

کے عام معجزات میں بھی ایک خاص امتیاز یہ حاصل ہے کہ عام دستور یہ ہے کہ ہر نبیؑ و رسولؑ کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے کچھ معجزات ظاہر فرماتے ہیں، مگر یہ معجزات ان رسولوں کے ہاتھوں ظاہر ہوتے ہیں انھیں کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں، مگر قرآن حکیم ایک ایسا معجزہ ہے جو قیامت تک باقی رہنے والا ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ، لفظ رَیب کا ترجمہ اردو میں شک کا کیا جاتا ہے، مگر امام راغب اصفہانی نے فرمایا کہ درحقیقت رَیب ایسے تردّد اور وہم کو کہا جاتا ہے جس کی بنیاد کوئی نہ ہو، ذرا غور و تامّل کرنے سے رفع ہو جائے، اسی لئے قرآن کریم میں اہلِ علم سے رَیب کی نفی کی گئی ہے اگرچہ وہ مسلمان نہ ہوں، جیسے ارشاد ہے، وَلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (۷۴: ۳۱)، یہی وجہ ہے کہ شروع سورۂ بقرہ میں قرآن کریم کے متعلق فرمایا لَا رَيْبَ فِيْهِ کہ اس میں کسی رَیب کی گنجائش نہیں، اور اس آیت میں فرمایا وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ "یعنی اگر ہو تم کسی تردّد میں" جس کا حاصل یہ ہے، کہ اگرچہ قرآن کریم اپنے واضح اور معجزانہ دلائل کی بناء پر کسی شک و تردّد کا محل نہیں ہے، لیکن اپنی ناواقفیت سے پھر بھی تمھیں کوئی تردّد ہی تو سُن لو، فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ، لفظ سورہ کے معنی محدود قطعہ کے ہیں، اور سورتِ قرآن اس خاص حصہ قرآن کو کہا جاتا ہے، جو بذریعہ وحی ممتاز اور علٰحدہ کر دیا گیا ہے۔

پورے قرآن میں اس طرح ایک سوچودہ سورتیں چھوٹی بڑی ہیں، اور اس جگہ لفظ سورت بغیر الف لام کے لانے سے اس طرف اشارہ پایا گیا کہ چھوٹی سے چھوٹی سورت بھی اس حکم میں شامل ہے، معنی یہ ہیں کہ اگر تمھیں اس قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں کوئی تردّد ہے، اور یہ سمجھتے ہو کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی دوسرے انسان نے خود بنا لیا ہے تو اس کا فیصلہ بڑی آسانی سے اس طرح ہو سکتا ہے کہ تم بھی اس قرآن کی کسی چھوٹی سے چھوٹی سورت کی مثال بنا لاؤ، اگر تم اس کی مثال بنانے میں کامیاب ہو گئے تو بیشک تمھیں حق ہو گا کہ اس کو بھی کسی انسان کا کلام قرار دو، اور اگر تم عاجز ہو گئے تو سمجھ لو کہ یہ انسان کی طاقت سے بالاتر خالص اللہ جل شانہٗ کا کلام ہے۔

یہاں کوئی کہہ سکتا تھا کہ ہمارا عاجز ہو جانا تو اس کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ سبھی انسان عاجز ہیں، ہو سکتا ہے کہ کوئی دوسرا آدمی یا جماعت یہ کام کرلے، اس لئے ارشاد فرمایا، وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ، شہداء، شاہد کی جمع ہے، جس کے معنی حاضر کے آتے ہیں، گواہ کو بھی شاہد اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کا حاضرِ عدالت ہونا ضروری ہے، اس جگہ شہداء سے مراد یا تو عام حاضرین ہیں، کہ سارے جہان میں جس جس سے تم اس کام میں مدد لینا چاہو لے سکتے ہو، اور یا اس سے مراد اُن کے بُت ہیں، جن کے بارے میں ان کا یہ خیال تھا کہ قیامت کے روز یہ ہمارے لئے گواہی دیں گے۔

دوسری آیت میں ان کو ڈرایا گیا کہ اگر تم یہ کام نہ کرسکو تو پھر جہنم کی ایسی سخت آگ سے بچنے کا سامان کرو جس کے انگارے آدمی اور پتھر ہوں گے، اور وہ تم ہی جیسے انکار کرنے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے، اور اسی جملہ کے بیچ میں جو واقعہ ہونے والا تھا، اُس کی خبر بھی دیدی، وَلَنْ تَفْعَلُوْا یعنی خواہ تم کتنا ہی انفرادی اور اجتماعی زور لگاؤ تمھاری مجال نہیں کہ اس کی مثال بناسکو۔

اس پر غور کیا جائے کہ جو قوم اسلام اور قرآن کی مخالفت اور اس کو گرانے مٹانے کے لئے اپنی جان، مال، آبرو، اولاد سب کچھ قربان کرنے کے لئے تُلی ہوئی تھی، اس کو یہ آسان موقع دیا جاتا ہے، کہ قرآن کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کی مثال بنالاؤ تو تم اپنے مطلب میں کامیاب ہوسکتے ہو، اور یہ کہکر ان کی غیرت کو جوش میں لایا جاتا ہے، کہ تم ہرگز یہ کام نہ کرسکو گے، مگر پوری قوم میں کوئی بھی اس کام کے لئے آگے نہ بڑھا، اس سے بڑھ کر کونسا اعتراف اپنے عجز کا اور قرآن کریم کے کلام اللہ ہونے کا ہوسکتا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا کھلا ہوا معجزہ ہے، جس نے تمام سرکشوں کی گردنیں جھکادیں۔

قرآن ایک زندہ اور قیامت تک باقی رہنے والا معجزہ ہے

تمام انبیاء علیہم السلام کے معجزات صرف اُن کی حیات تک معجزہ ہوتے، لیکن قرآن کا معجزہ بعد وفات رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح معجزہ کی حیثیت میں باقی ہے، آج بھی ایک ادنیٰ مسلمان ساری دنیا کے اہلِ علم و دانش کو للکار کر دعویٰ کرسکتا ہے کہ اس کی مثال نہ کوئی پہلے لاسکا نہ آج لاسکتا ہے، اور جس کو ہمت ہو پیش کرکے دکھلائے۔

شیخ جلال الدین سیوطیؒ مفسر جلالین نے اپنی کتاب خصائص کبریٰ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو معجزوں کے متعلق بحوالہ حدیث لکھا ہے کہ قیامت تک باقی ہیں، ایک قرآن کا معجزہ، دوسرے یہ کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہؐ ایام حج میں تینوں جمرات پر لاکھوں آدمی تین روز تک مسلسل کنکریاں پھینکتے ہیں پھر کوئی اُن کنکریوں کے ڈھیر کو یہاں سے اُٹھاتا بھی نظر نہیں آتا، اور ایک مرتبہ پھینکی ہوئی کنکر کو دوبارہ استعمال کرنا بھی ممنوع ہے، اس لئے ہر حاجی اپنے لئے مزدلفہ سے کنکریاں نئی لے کر آتا ہے، اس کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ جمرات کے گرد ایک ہی سال میں ٹیلہ لگ جاتا جس میں جمرات چھپ جاتے اور چند سال میں تو پہاڑ ہوجاتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہاں مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو مقرر کر رکھا ہے کہ جس جس شخص کا حج قبول ہوا اس کی کنکریاں اٹھالی جائیں، تو اب اس جگہ صرف اُن کم نصیبوں کی کنکریاں باقی رہ جاتی ہیں، جن کا حج قبول نہیں ہوا، اس لئے اس جگہ پڑی ہوئی کنکریاں بہت کم نظر آتی ہیں، اور اگر ایسا نہ ہوتا تو یہاں پہاڑ کھڑا ہوگیا ہوتا، یہ روایت سننِ

بیہقی میں موجود ہے۔

یہ ایک ایسی حدیث ہے جس کے ذریعہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کی تصدیق ہر سال اور ہر زمانے میں ہوسکتی ہے، کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ حج میں لاکھوں آدمی ہر سال جمع ہوتے ہیں، اور ہر شخص ہر جمرہ پر ہر روز سات سات کنکریاں پھینکتا ہے، اور بعض جاہل تو بڑے بڑے پتھر پھینکتے ہیں، اور یہ بھی یقینی طور پر معلوم ہے کہ ان کنکریوں کو یہاں سے اٹھانے اور صاف کرنے کا حکومت یا کوئی جماعت بھی روزانہ انتظام نہیں کرتی، نہ اٹھائی جاتی ہیں، اور جیسا قدیم سے دستور چلا آتا ہے کہ اس جگہ سے کنکریاں اٹھائی ہی نہیں جاتیں، تو اگلے سال اس کا دُوگنا اور تیسرے سال تگنا ہو جائے گا، پھر کیا شبہ ہے کہ چند سال میں یہ حصّۂ زمین مع جمرات کے اُن کنکریوں میں چھُپ جائے گا، اور بجائے جمرات کے ایک پہاڑ کھڑا نظر آئے، مگر مشاہدہ اس کے خلاف ہے، اور یہ مشاہدہ ہر زمانے میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق اور آپؐ پر ایمان لانے کے لئے کافی ہے، سُنا ہے کہ اب یہاں سے کنکریاں اٹھانے کا کچھ انتظام ہونے لگا ہے، مگر تیرہ سو برس تک کا عمل بھی اس مضمون کی تصدیق کے لئے کافی ہے۔

اسی طرح معجزۂ قرآن ایک زندہ اور ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ ہے جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں اس کی نظیر یا مثال پیش نہیں کی جاسکی، آج بھی نہیں کی جاسکتی۔

اعجازِ قرآنی کی تشریح

اس اجمالی بیان کے بعد آپ کو یہ معلوم کرنا ہے کہ قرآن کریم کو کس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ قرار دیا گیا، اور اس کا اعجاز کن کن وجوہ سے ہے، اور کیوں ساری دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہوگئی۔

دوسرے یہ کہ مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ چودہ سو برس کے عرصہ میں قرآن کی زبردست تحدّی (چیلنج) کے باوجود کوئی اس کی یا اس کے کسی ٹکڑے کی مثال پیش نہیں کرسکا، یہ تاریخی حیثیت سے کیا وزن رکھتا ہے، یہ دونوں باتیں طویل الذکر اور تفصیل کی طالب ہیں۔

وجوہِ اعجازِ قرآنی

پہلی بات کہ قرآن کو معجزہ کیوں کہا گیا؟ اور وہ کیا وجوہ ہیں جن کے سبب ساری دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے، اس پر قدیم و جدید علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، اور ہر مفسّر نے اپنے اپنے طرز میں اس مضمون کو بیان کیا ہے، میں اختصار کے ساتھ چند ضروری چیزیں عرض کرتا ہوں۔

اس جگہ سب سے پہلے غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ یہ عجیب و غریب کُل علوم کی جامع کتاب، کس جگہ، کس ماحول میں، اور کس پر نازل ہوئی؟ اور کیا وہاں کچھ ایسے علمی سامان موجود تھے، جن کے ذریعہ دائرۂ اسباب

میں ایسی جامع بے نظیر کتاب تیار ہوسکے، جو علوم اوّلین و آخرین کی جامع، اور انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کے متعلق بہترین ہدایت پیش کرسکے، جس میں انسان کی جسمانی اور رُوحانی تربیت کا مکمل نظام ہو، اور تدبیرِ منزل سے لے کر سیاستِ ممالک تک ہر نظام کے بہترین اصول ہوں۔

جس سرزمین اور جس ذات پر یہ کتاب مقدس نازل ہوئی اس کی جغرافیائی کیفیت اور تاریخی حالات معلوم کرنے کے لئے آپ کو ایک ریگستانی خشک اور گرم علاقہ سے سابقہ پڑے گا جس کو بطحاء مکہ کہتے ہیں اور جو نہ زرعی ملک ہے نہ صنعتی، نہ اس ملک کی آب و ہوا ہی کچھ ایسی خوشگوار ہے جس کے لئے باہر کے آدمی وہاں پہونچنے کی رغبت کریں، نہ راستے ہی کچھ ہموار ہیں جن سے وہاں تک پہونچنا آسان ہو، اکثر دنیا سے کٹا ہوا ایک جزیرہ نما ہے، جہاں خشک پہاڑوں اور گرم ریگ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، اور دور تک کہیں بستی نظر آتی ہے نہ کوئی کھیت نہ درخت۔

اس پورے خطۂ ملک میں کچھ بڑے شہر بھی نہیں، چھوٹے چھوٹے گاؤں اور ان میں اونٹ بکریاں پال کر اپنی زندگی گذارنے والے انسان بستے ہیں، اس کے چھوٹے دیہات کا تو دیکھنا کیا، جو برائے نام چند شہر کہلاتے ہیں ان میں بھی کسی قسم کے علم و تعلیم کا کوئی چرچا نہیں، نہ وہاں کوئی اسکول اور کالج ہے نہ کوئی بڑی یونیورسٹی یا دارالعلوم، وہاں کے باشندوں کو اللہ تعالیٰ نے محض قدرتی اور پیدائشی طور پر فصاحت و بلاغت کا ایک فن ضرور دیدیا ہے، جس میں وہ ساری دنیا سے فائق اور ممتاز ہیں، وہ نثر اور نظم میں ایسے قادر الکلام ہیں کہ جب بولتے ہیں تو رعد کی طرح کڑکتے اور بادل کی طرح برستے ہیں، ان کی ادنیٰ ادنیٰ چھوکریاں ایسے فصیح و بلیغ شعر کہتی ہیں کہ دنیا کے ادیب حیران رہ جائیں۔

لیکن یہ سب کچھ اُن کا فطری فن ہے، جو کسی مکتب یا مدرسہ میں حاصل نہیں کیا جاتا، غرض نہ وہاں تعلیم و تعلّم کا کوئی سامان ہے، نہ وہاں کے رہنے والوں کو اُن چیزوں سے کوئی لگاؤ یا دلبستگی ہے، اُن میں کچھ لوگ شہری زندگی بسر کرنے والے ہیں تو وہ تجارت پیشہ ہیں، مختلف اجناسِ مال کی درآمد برآمد ان کا مشغلہ ہے۔

اس ملک کے قدیم شہر مکّہ کے ایک شریف گھرانہ میں وہ ذات مقدّس پیدا ہوتی ہے جو مہبطِ وحی ہے، جس پر قرآن اُترا ہے، اب اُس ذاتِ مقدس کا حال سنئے:

ولادت سے پہلے ہی والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، پیدا ہونے سے پہلے یتیم ہوگئے، ابھی سات سال کی بھی عمر نہ تھی کہ والدہ کی بھی وفات ہوگئی، آغوشِ مادر کا گہوارہ بھی نصیب نہ رہا، شریف آباء و اجداد کی فیاضی اور بے مثل سخاوت نے اپنے گھر میں کوئی اندوختہ نہ چھوڑا تھا، جس سے یتیم کی پرورش اور آئندہ زندگی کا سامان ہوسکے، نہایت عُسرت کی زندگی پھر ماں باپ کا سایہ سر پر نہیں، ان حالات میں آپؐ نے پرورش پائی، اور عمر کا ابتدائی حصہ گذارا جو تعلیم و تعلّم کا اصلی وقت ہے، اس وقت اگر مکہ میں

کوئی دار العلوم یا اسکول و کالج بھی ہوتا تو بھی آپ کے لئے اس سے استفادہ مشکل تھا، مگر معلوم ہو چکا کہ وہاں سرے سے یہ علمی مشغلہ اور اس سے دلچسپی ہی کسی کو نہ تھی، اسی لئے یہ پوری قوم عرب امیین کہلاتے تھے، قرآن کریم نے بھی اُن کے متعلق یہ لفظ استعمال کیا ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ آپ ہر قسم کی تعلیم و تعلّم سے بے خبر رہے، وہاں کوئی بڑا عالم بھی ایسا نہ تھا جس کی صحبت میں رہ کر یہ علوم حاصل کر پاسکیں جن کا قرآن حامل ہے، پھر قدرت کو تو ایک خرق العادۃ معجزہ دکھلانا تھا، آپ کے لئے خصوصی طور پر ایسے سامان ہوئے معمولی نوشت و خواند جو ہر جگہ کے لوگ کسی نہ کسی طرح سیکھ ہی لیتے ہیں آپ نے وہ بھی نہ سیکھی، بالکل اُمّی محض رہے، کہ اپنا نام تک بھی نہ لکھ سکتے تھے، عرب کا مخصوص فن شعر و سخن تھا، جس کے لئے خاص خاص اجتماعات کئے جاتے اور مشاعرے منعقد ہوتے، اور اس میں ہر شخص مسابقت کی کوشش کرتا تھا، آپ کو حق تعالیٰ نے ایسی فطرت عطا فرمائی تھی کہ ان چیزوں سے بھی دلچسپی نہ لی، نہ کبھی کوئی شعر یا قصیدہ لکھا، نہ کسی ایسی مجلس میں شریک ہوئے۔

ہاں اُمّی محض ہونے کے ساتھ بچپن سے ہی آپ کی شرافتِ نفس، اخلاق فاضلہ، فہم و فراست کے غیر معمولی آثار دیانت و امانت کے اعلیٰ ترین شاہکار آپ کی ذاتِ مقدس میں ہر وقت مشاہدہ کئے جاتے تھے، جس کا نتیجہ یہ **تھا کہ عرب کے بڑے** بڑے مغرور و متکبر سردار آپ کی تعظیم کرتے تھے، اور سارے مکہ میں آپ کو امین کے لقب سے **پکارا جاتا تھا۔**

یہ اُمّی محض چالیس سال تک مکہ میں اپنی برادری کے سامنے رہتے ہیں، کسی دوسرے ملک کا سفر بھی نہیں کرتے، جس سے یہ خیال پیدا ہو سکے کہ وہاں جا کر علوم حاصل کئے ہوں گے، صرف ملکِ شام کے دو تجارتی سفر ہوئے، وہ بھی گنے چنے چند دن کے لئے جس میں اس کا کوئی امکان نہیں۔

اس اُمّی محض ذاتِ مقدس کی زندگی کے چالیس سال مکہ میں اپنی برادری میں اس طرح گذری کہ نہ کبھی کسی کتاب یا قلم کو ہاتھ لگایا، نہ کسی مکتب میں گئے، نہ کسی مجلس میں کوئی نظم و قصیدہ ہی پڑھا، ٹھیک چالیس سال کے بعد اُن کی زبان مبارک پر وہ کلام آنے لگا جس کا نام قرآن ہے جو اپنی لفظی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اور معنوی علوم و فنون کے لحاظ سے محیّر العقول کلام ہے، اگر صرف اتنا ہی ہوتا تو بھی اس کے معجزہ ہونے میں کسی انصاف پسند کو کیا شبہ رہ سکتا ہے، مگر یہاں یہی نہیں بلکہ اس نے ساری دنیا کو تحدّی کی، چیلنج دیا کہ کسی کو اس کے کلامِ الٰہی ہونے میں شبہ ہو تو اس کا مثل بنا لائے۔

اب ایک طرف قرآن کی یہ تحدّی اور چیلنج اور دوسری طرف ساری دنیا کی مخالف طاقتیں جو اسلام اور پیغمبر اسلام کو شکست دینے کے لئے اپنی مال جان، اولاد، آبرو سب گنوانے کو تیار ہیں، مگر اتنا کام کرنے کے لئے کوئی جرأت نہیں کرتا، کہ قرآن کی ایک چھوٹی سی سورت کی مثال بنا لائے، فرض کر لیجئے کہ یہ کتاب بے مثال و بے نظیر بھی نہ ہوتی، جب بھی ایک اُمّیِ محض کی زبان سے اس کا ظہور اعجاز

قرآن اور وجوہِ اعجاز کی تفصیل میں جائے بغیر بھی قرآن کریم کے معجزہ ہونے کے لئے کم نہیں جس کو ہر عالم و جاہل سمجھ سکتا ہے۔

اعجازِ قرآن کی دوسری وجہ اب اعجازِ قرآن کی دوسری وجہ دیکھئے، یہ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن اور اس کے احکام ساری دنیا کے لئے آئے، لیکن اس کے بلاواسطہ اور پہلے مخاطب عرب تھے، جن کو اور کوئی علم و فن آتا تھا یا نہیں مگر فصاحت و بلاغت ان کا فطری ہنر اور پیدائشی وصف تھا جس میں وہ اقوامِ دنیا سے ممتاز سمجھے جاتے تھے، قرآن اُن کو مخاطب کر کے چیلنج کرتا ہے کہ اگر تمھیں میرے کلام الٰہی ہونے میں کوئی شبہ ہے تو تم میری ایک سورت کی مثال بنا کر دکھلا دو، اگر قرآن کی یہ تحدّی (چیلنج) صرف اپنے حُسن معنوی یعنی حکیمانہ اصول اور علمی معارف و اسرار ہی کی حد تک ہوتی تو قوم امیّین کے لئے اس کی نظیر پیش کرنے سے عذر معقول ہوتا، لیکن قرآن نے صرف حُسنِ معنوی ہی کے متعلق تحدّی نہیں کی، بلکہ لفظی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی پوری دنیا کو چیلنج دیا ہے، اس چیلنج کو قبول کرنے کے لئے اقوام عالم میں سب سے زیادہ مستحق عرب ہی تھے، اگر فی الواقع یہ کلام قدرتِ بشر سے باہر کسی مافوق قدرت کا کلام نہیں تھا تو بلغاءِ عرب کے لئے کیا مشکل تھا کہ ایک امّی شخص کے کلام کی مثال بلکہ اس سے بہتر کلام فوراً پیش کر دیتے، اور ایک دو آدمی یہ کام نہ کرسکتے تو قرآن نے ان کو یہ سہولت بھی دی تھی کہ ساری قوم مل کر بنا لائے، مگر قرآن کے اس بلند بانگ دعوے اور پھر طرح طرح سے غیرت دلانے پر بھی عرب کی غیور قوم پوری کی پوری خاموش ہے، چند سطریں بھی مقابلہ پر نہیں پیش کرتی۔

عرب کے سرداروں نے قرآن اور اسلام کے مٹانے اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو مغلوب کرنے میں جس طرح اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگایا، وہ کسی لکھے پڑھے آدمی سے مخفی نہیں، شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے گنے چنے رفقاء کو طرح طرح کی ایذائیں دے کر چاہا کہ وہ کلمۂ اسلام کو چھوڑ دیں، مگر جب دیکھا کہ "یاں وہ نشہ نہیں جسے ترشی اُتار دے" تو خوشامد کا پہلو اختیار کیا عرب کا سردار عتبہ ابن ربیعہ قوم کا نمائندہ بن کر آپؐ کے پاس حاضر ہوا، اور عرب کی پوری دولت و حکومت اور بہترین حُسن و جمال کی لڑکیوں کی پیشکش اس کام کے لئے کی کہ آپ اسلام کی تبلیغ چھوڑ دیں، آپؐ نے اس کے جواب میں قرآن کی چند آیتیں سنا دینے پر اکتفاء فرمایا، جب یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی تو جنگ و مقابلہ کے لئے تیار ہو کر قبل از ہجرت اور بعد از ہجرت جو قریشِ عرب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے مقابلہ میں سر دھڑ کی بازی لگائی، جان، مال، اولاد، آبرو، سب کچھ اس مقابلہ میں خرچ کرنے کے لئے تیار ہوئے، یہ سب کچھ کیا، مگر یہ کسی سے نہ ہو سکا کہ قرآن کے چیلنج کو قبول کرتا، اور چند سطریں مقابلہ پر پیش کر دیتا، کیا ان حالات میں سارے عرب کا اس کے مقابلہ سے سکوت اور عجز اس کی کھلی ہوئی شہادت

نہیں کہ یہ انسان کا کلام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، جس کے کام یا کلام کی نظیر انسان کیا ساری مخلوق کی قدرت سے باہر ہے۔

پھر صرف اتنا ہی نہیں کہ عرب نے اس کے مقابلہ سے سکوت کیا، بلکہ اپنی خاص مجلسوں میں سب نے اس کے بےمثل ہونے کا اعتراف کیا، اور جو ان میں سے منصف مزاج تھے انھوں نے اس اعتراف کا اظہار بھی کیا، پھر اُن میں سے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے، اور کچھ اپنی آبائی رسوم کی پابندی یا بنی عبد مناف کی ضد کی وجہ سے اسلام قبول کرنے سے باوجود اعتراف کے محروم رہے، قریشِ عرب کی تاریخ ان واقعات پر شاہد ہے، میں اس میں سے چند واقعات اس جگہ بیان کرتا ہوں، جس سے اندازہ ہو سکے کہ پورے عرب نے اس کلام کے بے مثل، بے نظیر ہونے کو تسلیم کیا، اور اس کی مثال پیش کرنے کو اپنی رسوائی کے خیال سے چھوڑ دیا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا چرچا مکہ سے باہر حجاز کے دوسرے مقامات میں ہونے لگا، اور حج کا موسم آیا تو قریشِ مکہ کو اس کی فکر ہوئی کہ اب اطرافِ عرب سے حجاج آئیں گے، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کلام سنیں گے، تو فریفتہ ہو جائیں گے اور غالب خیال یہ ہے کہ مسلمان ہو جائیں گے، اس کے انسداد کی تدبیر سوچنے کے لئے قریش نے ایک اجلاس منعقد کیا، اس اجلاس میں عرب کے بڑے بڑے سردار موجود تھے، اُن میں ولید بن مغیرہ عمر میں سب سے بڑے اور عقل میں ممتاز سمجھے جاتے تھے، سب نے ولید بن مغیرہ کو یہ مشکل پیش کی کہ اب اطرافِ ملک سے لوگ آئیں گے، اور ہم سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق پوچھیں گے تو ہم کیا کہیں؟ ہمیں آپ کوئی ایسی بات بتلایئے کہ ہم سب وہ ہی بات کہہ دیں، ایسا نہ ہو کہ خود ہمارے بیانات میں اختلاف ہو جائے، ولید بن مغیرہ نے کہا کہ تم ہی کہو کیا کہنا چاہئے؟

لوگوں نے کہا کہ ہمارے خیال میں ہم سب یہ کہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) معاذ اللہ مجنون ہیں، اُن کا کلام مجنونانہ بڑ ہے، ولید بن مغیرہ نے کہا کہ تم ایسا ہرگز نہ کہنا، کیونکہ یہ لوگ جب اُن کے پاس جائیں گے، اور اُن سے ملاقات و گفتگو کریں گے، اور ان کو ایک فصیح و بلیغ عاقل انسان پائیں گے تو انھیں یقین ہو جائے گا کہ تم نے جھوٹ بولا ہے، پھر کچھ لوگوں نے کہا کہ اچھا ہم ان کو یہ کہیں کہ وہ ایک شاعر ہیں، ولید نے اس سے بھی منع کیا، اور کہا کہ جب لوگ ان کا کلام سنیں گے وہ تو شعر و شاعری کے ماہر ہیں، انھیں یقین ہو جائے گا کہ یہ شعر نہیں اور نہ آپ شاعر ہیں، نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ سب لوگ تمھیں جھوٹا سمجھیں گے، پھر کچھ لوگوں نے کہا کہ تو پھر ہم ان کو کاہن قرار دیں، جو شیاطین و جنات سے سُن کر غیب کی خبریں دیا کرتے ہیں، ولید نے کہا یہ بھی غلط ہے، کیونکہ جب لوگ اُن کا کلام سنیں گے تو پتہ چل جائے گا کہ یہ کلام کسی کاہن کا نہیں ہے، وہ پھر بھی تمھیں ہی جھوٹا سمجھیں گے، اس کے بعد قرآن کے بارے میں جو ولید بن مغیرہ کے تاثرات تھے اُن کو ان الفاظ میں بیان کیا:

"خدا کی قسم! تم میں کوئی آدمی شعر و شاعری اور اشعارِ عرب سے میرے برابر واقف نہیں، خدا کی قسم! اس کلام میں خاص حلاوت ہے، اور ایک خاص رونق ہے، جو میں کسی شاعر یا فصیح و بلیغ کے کلام میں نہیں پاتا"۔

پھر اُن کی قوم نے دریافت کیا کہ آپ ہی بتلایئے پھر ہم کیا کریں؟ اور اُن کے بارے میں لوگوں سے کیا کہیں؟ ولید نے کہا میں غور کرنے کے بعد کچھ جواب دوں گا، پھر بہت سوچنے کے بعد کہا کہ اگر کچھ کہنا ہی ہے تو تم اُن کو ساحر کہو، کہ اپنے جادو سے باپ بیٹے اور میاں بیوی میں تفرقہ ڈال دیتے ہیں۔

قوم اس پر مطمئن اور متفق ہوگئی، اور سب نے یہی کہنا شروع کیا، مگر خدا کا چراغ کہیں پھونکوں سے بجھنے والا تھا؟ اطرافِ عرب کے لوگ آئے قرآن سُنا اور بہت سے مسلمان ہوگئے، اور اطرافِ عرب میں اسلام پھیل گیا (خصائص کبریٰ)

اسی طرح ایک قریشی سردار نضر بن حارث نے ایک مرتبہ اپنی قوم کو خطاب کرکے کہا:

"اے قوم قریش! آج تم ایک مصیبت میں گرفتار ہو کہ اس سے پہلے کبھی ایسی مصیبت سے سابقہ نہیں پڑا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہاری قوم کے ایک نوجوان تھے، اور تم سب اُن کے عادات و اخلاق کے گرویدہ اور اپنی قوم میں اُن کو سب سے زیادہ سچا اور سب سے زیادہ امانت دار جانتے اور کہتے تھے اب جب کہ اُنؐ کے سر میں سفید بال آنے لگے، اور انھوںؐ نے ایک بےمثل کلام اللہ کی طرف سے پیش کیا تو تم ان کو جادوگر کہنے لگے، خدا کی قسم وہ جادوگر نہیں، ہم نے جادوگروں کو دیکھا اور برتا ہے، اُن کے کلام سنے ہیں، اور طریقوں کو سمجھا ہے، وہ بالکل اس سے مختلف ہیں۔

اور کبھی تم ان کو کاہن کہنے لگے، خدا کی قسم! وہ کاہن بھی نہیں، ہم نے بہت کاہنوں کو دیکھا اور اُن کے کلام سنے ہیں، ان کو ان کے کلام سے کوئی مناسبت نہیں۔

اور کبھی تم ان کو شاعر کہنے لگے، خدا کی قسم! وہ شاعر بھی نہیں، ہم نے خود شعر شاعری کے تمام فنون کو سیکھا سمجھا ہے، اور بڑے بڑے شعراء کے کلام ہمیں یاد ہیں، اُن کے کلام سے اُس کو کوئی مناسبت نہیں، پھر کبھی تم ان کو مجنون بتاتے ہو، خدا کی قسم! وہ مجنون بھی نہیں، ہم نے بہت سے مجنونوں کو دیکھا بھالا، ان کی بکواس سُنی ہے، اُن کے مختلف اور مختلط کلام سُنے ہیں، یہاں یہ کچھ نہیں، اے میری قوم تم انصاف کے ساتھ اُن کے معاملہ میں غور کرو، یہ سرسری ٹلادینے کی چیز نہیں"۔ (خصائص کبریٰ ص ۱۱۴ ج ۱)

حضرت ابو ذر صحابیؓ فرماتے ہیں کہ میرا بھائی اُنیس ایک مرتبہ مکہ معظمہ گیا، اُس نے واپس آکر مجھے بتلایا کہ مکہ میں ایک شخص ہیں جو یہ کہتا ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے، میں نے پوچھا کہ وہاں کے لوگ اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ بھائی نے کہا کہ کوئی ان کو شاعر کہتا ہے، کوئی کاہن بتلاتا ہے، کوئی جادوگر کہتا ہے، میرا بھائی اُنیس خود بڑا شاعر اور کہانت وغیرہ سے واقف آدمی تھا، اس نے مجھ سے

کہا کہ جہاں تک میں نے غور کیا لوگوں کی یہ سب باتیں غلط ہیں، اُن کا کلام نہ شعر ہے نہ کہانت ہی، نہ مجنونانہ کلمات ہیں، بلکہ مجھے وہ کلام صادق نظر آتا ہے۔

ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ بھائی سے یہ کلمات سنکر میں نے مکّہ کا سفر کیا، اور مسجدِ حرام میں آکر پڑ گیا تیس روز میں نے اس طرح گذارے کہ سوائے زمزم کے پانی کے میرے پیٹ میں کچھ نہیں گیا، اس تمام عرصہ میں نہ مجھے بھوک کی تکلیف معلوم ہوئی نہ کوئی ضعف محسوس کیا (خصائص ص ۱۱۶ ج ۱)

واپس گئے تو لوگوں سے کہا کہ میں نے رُوم اور فارس کے فصحاء و بلغاء کے کلام بہت سنے ہیں، اور کاہنوں کے کلمات اور حِمیَر کے مقالات بہت سُنے ہیں، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کلام کی مثال میں نے آج تک کہیں نہیں سُنی، تم سب میری بات مانو، اور آپؐ کا اتباع کرو، چنانچہ فتحِ مکہ کے سال میں اُن کی پوری قوم کے تقریباً ایک ہزار آدمی مکہ پہونچ کر مسلمان ہوگئے (خصائص ص ۱۱۶ ج ۱)

اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل اور اخنس بن شریق وغیرہ بھی لوگوں سے چھپ کر قرآن سُنا کرتے، اور اس کے عجیب و غریب، بے مثل و بے نظیر اثرات سے متاثر ہوتے تھے، مگر جب قوم کے کچھ لوگوں نے ان کو کہا کہ جب تم اس کلام کو ایسا بے نظیر پاتے ہو تو اس کو قبول کیوں نہیں کرتے؟ تو ابوجہل کا جواب یہ تھا کہ تمھیں معلوم ہے کہ بنی عبد مناف میں اور ہمارے قبیلہ میں ہمیشہ سے رقابت اور معاصرانہ مقابلہ چلتا رہتا ہے، وہ جس کام میں آگے بڑھنا چاہتے ہیں ہم بھی اس کا جواب دیتے ہیں، اب جبکہ ہم اور وہ دونوں برابر حیثیت کے مالک ہیں تو اب وہ یہ کہنے لگے کہ ہم میں ایک نبی پیدا ہوا ہے جس پر آسمان سے وحی آتی ہے اب ہم اس میں کیسے اُن کا مقابلہ کریں، میں تو کبھی اس کا اقرار نہ کروں گا (خصائص)

خلاصۂ کلام یہ ہی کہ قرآن کے اس دعوے اور چیلنج پر صرف یہی نہیں کہ پورے عرب نے ہار مان لی اور سکوت کیا، بلکہ اس کے بے مثل و بے نظیر ہونے اور اپنے عجز کا کھلے طور پر اعتراف بھی کیا ہے، اگر یہ کسی انسان کا کلام ہوتا تو اس کی کوئی وجہ نہ تھی کہ سارا عرب بلکہ ساری دنیا اس کا مثل لانے سے عاجز ہو جاتی۔

قرآن اور پیغمبرِ قرآن کے مقابلہ میں جان و مال، اولاد و آبرو سب کچھ قربان کرنے کے لئے تو وہ تیار ہوگئے، مگر اس کے لئے کوئی آگے نہ بڑھا کہ قرآن کے چیلنج کو قبول کرکے دو سطریں اس کے مقابلہ میں پیش کر دیتا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ اپنے جاہلانہ اعمال و افعال کے باوجود منصف مزاج تھے، جھوٹ کے پاس نہ جاتے تھے، جب انھوں نے قرآن کو سُنکر یہ سمجھ لیا کہ جب درحقیقت اس کلام کی مثل ہم نہیں لاسکتے تو محض دھاندلی اور کٹھ حجتی کے طور پر کوئی کلام پیش کرنا اپنے لئے عار سمجھا، کیونکہ وہ یہ بھی جانتے

تھے کہ ہم نے کوئی چیز پیش بھی کردی تو پورے عرب کے فصحاء و بلغاء اس امتحانی مقابلہ میں ہمیں فیل کردیں گے، اور خواہ مخواہ رُسوائی ہوگی، اسی لئے پوری قوم نے سکوت اختیار کیا، اور جو زیادہ منصف مزاج تھے انھوں نے صاف طور پر اقرار و تسلیم بھی کیا جسکے کچھ وقائع پہلے بیان ہوچکے ہیں۔

اسی سلسلہ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ عرب کے سردار اسعد بن زرارہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ کے سامنے اقرار کیا کہ:

"ہم نے خواہ مخواہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت کرکے اپنے رشتے ناتے توڑے اور تعلقات خراب کئے، میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ بلا شبہ اللہ کے رسول ہیں، ہرگز جھوٹے نہیں اور جو کلام وہ لائے ہیں بشر کا کلام نہیں ہوسکتا۔"

(خصائص، ص ۱۱٦ ج ۱)

قبیلہ بنی سلیم کا ایک شخص مسمیٰ قیس بن نسیبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ سے قرآن سُنا، اور چند سوالات کئے جن کا جواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمایا تو یہ اُسی وقت مسلمان ہوگئے، اور پھر اپنی قوم میں واپس گئے، تو لوگوں سے کہا:

"میں نے روم و فارس کے فصحاء و بلغاء کے کلام سُنے ہیں، بہت سے کاہنوں کے کلمات سُننے کا تجربہ ہوا ہے، حِمیَرؔ کے مقالات سنتا رہا ہوں، مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی مثل میں نے آج تک کہیں نہیں سُنا، تم سب میری بات مانو اور ان کا اتباع کرو۔" انھیں کی تحریک و تلقین پر ان کی قوم کے ایک ہزار آدمی فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر مشرف باسلام ہوگئے۔"

(خصائص ۱۱٦ ج ۱)

یہ اقرار و تسلیم صرف ایسے ہی لوگوں سے منقول نہیں جو آپ کے معاملات سے یکسو اور غیر جانبدار تھے، بلکہ وہ لوگ جو ہر وقت ہر طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں لگے ہوئے تھے قرآن کے متعلق ان کا بھی یہی حال تھا، مگر اپنی ضد اور حسد کی وجہ سے اس کا اظہار لوگوں پر نہ کرتے تھے۔

علامہ سیوطیؒ نے خصائص کبریٰ میں بحوالۂ بیہقی نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ ابوجہل اور ابوسفیان اور اخنس بن شریق رات کو اپنے اپنے گھروں سے اس لئے نکلے کہ چھپکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سنیں، ان میں ہر ایک علیٰحدہ علیٰحدہ نکلا، ایک کی دوسرے کو خبر نہ تھی، اور علیٰحدہ علیٰحدہ گوشوں میں چھپکر قرآن سننے لگے، تو اس میں ایسے محو ہوئے کہ ساری رات گذر گئی، جب صبح ہوگئی تو سب

واپس ہوئے، اتفاقاً راستہ میں مل گئے، اور ہر ایک نے دوسرے کا قصہ سُنا، تو سب آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے، کہ تم نے یہ بُری حرکت کی، اور کسی نے یہ بھی کہا کہ آئندہ کوئی ایسا نہ کرے، کیونکہ اگر عرب کے عوام کو اس کی خبر ہوگئی تو وہ سب مسلمان ہو جائیں گے۔

یہ کہہ سُنکر سب اپنے اپنے گھر چلے گئے، اگلی رات آئی تو پھر اُن میں سے ہر ایک کے دل میں یہی ٹیس اٹھی کہ قرآن سُنیں، اور پھر اسی طرح چھُپ چھُپ کر ہر ایک نے قرآن سُنا، یہانتک کہ رات گذر گئی، اور صبح ہوتے ہی یہ لوگ واپس ہوئے، تو پھر آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے، اور اس کے ترک پر سب نے اتفاق کیا، مگر تیسری رات آئی تو پھر قرآن کی لذت و حلاوت نے انھیں چلنے اور سننے پر مجبور کر دیا، پھر پہونچے اور رات بھر قرآن سُنکر لوٹنے لگے، تو پھر راستہ میں اجتماع ہو گیا، تو اب سب نے کہا کہ آؤ آپس میں معاہدہ کرلیں کہ آئندہ ہم ہرگز ایسا نہ کریں گے، چنانچہ اس معاہدہ کی تکمیل کی گئی، اور سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے، صبح کو اخنس بن شُریق نے اپنی لاٹھی اٹھائی، اور پہلے ابوسفیان کے پاس پہونچا، کہ بتلاؤ اس کلام کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟ اُس نے دبے دبے لفظوں میں قرآن کی حقانیت کا اعتراف کیا، تو اخنس نے کہا کہ بخدا میری بھی یہی رائے ہے، اس کے بعد وہ ابوجہل کے پاس پہونچا، اور اُس سے بھی یہی سوال کیا کہ تم نے محمدؐ کے کلام کو کیسا پایا؟

ابوجہل نے کہا کہ صاف بات یہ ہے کہ ہمارے خاندان اور بنو عبد مناف کے خاندان میں ہمیشہ سے چشمک چلی آتی ہے، قوم کی سیادت و قیادت میں وہ جس محاذ پر آگے بڑھنا چاہتے ہیں ہم ان کا مقابلہ کرتے ہیں، انھوں نے سخاوت و بخشش کے ذریعہ قوم پر اپنا اثر جمانا چاہا تو ہم نے اُن سے بڑھ کر یہ کام کر دکھایا، انھوں نے لوگوں کی ذمہ داریاں اپنے سر لے لیں تو ہم اس میدان میں بھی ان سے پیچھے نہیں رہے، یہاں تک کہ پورا عرب جانتا ہے کہ ہم دونوں خاندان برابر حیثیت کے مالک ہیں۔

ان حالات میں اُن کے خاندان سے یہ آواز اٹھی کہ ہمارے میں ایک نبی پیدا ہوا ہے جس پر آسمان سے وحی آتی ہے، اب ظاہر ہے کہ اس کا مقابلہ ہم کیسے کریں، اس لئے ہم نے تو یہ طے کر لیا ہے کہ ہم زور اور طاقت سے اُن کا مقابلہ کریں گے، اور ہرگز ان پر ایمان نہ لائیں گے (خصائص، ص ۱۱۵ ج ۱)

یہ ہے قرآن کا وہ کھلا ہوا معجزہ جس کا دشمنوں کو بھی اعتراف کرنا پڑا ہے، یہ تمام واقعات علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے خصائص کبریٰ میں نقل کئے ہیں۔

تیسری وجہ

تیسری وجہ اعجاز قرآنی کی یہ ہے کہ اس میں غیب کی اور آئندہ پیش آنے والے واقعات کی بہت سی خبریں ہیں جو قرآن نے دیں، اور ہو بہو اسی طرح واقعات

پیش آئے جس طرح قرآن نے خبر دی تھی، مثلاً قرآن نے خبر دی کہ روم و فارس کے مقابلہ میں ابتداءً اہل فارس غالب آئیں گے اور رومی مغلوب ہوں گے، لیکن ساتھ ہی یہ خبر دی کہ دس سال گذرنے نہ پائیں گے کہ پھر رومی اہلِ فارس پر غالب آجائیں گے، مکہ کے سرداروں نے قرآن کی اس خبر پر حضرت صدیق اکبرؓ سے ہار جیت کی شرط کرلی اور پھر ٹھیک قرآن کی خبر کے مطابق رومی غالب آگئے تو سب کو اپنی ہار ماننا پڑی، اور ہارنے والے پر جو مال دینے کی شرط کی تھی، وہ مال ان کو دینا پڑا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مال کو قبول نہیں فرمایا، کیونکہ وہ ایک قسم کا جُوا تھا۔ اسی طرح اور بہت سے واقعات اور خبریں ہیں جو امورِ غیبیہ کے متعلق قرآن میں دیگئیں اور ان کی سچائی بالکل روز روشن کی طرح واضح ہوگئی۔

چوتھی وجہ چوتھی وجہ اعجازِ قرآنی کی یہ ہے کہ اس میں پچھلی اُمتوں اور ان کی شرائع اور تاریخی حالات کا ایسا صاف تذکرہ ہے کہ اُس زمانہ کے بڑے بڑے علماء یہود و نصارٰی جو پچھلی کتابوں کے ماہر سمجھے جاتے تھے ان کو بھی اتنی معلومات نہ تھیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کبھی نہ کسی مکتب میں قدم رکھا نہ کسی عالم کی صحبت اٹھائی، نہ کسی کتاب کو ہاتھ لگایا، پھر یہ ابتداء دنیا سے آپؐ کے زمانہ تک تمام اقوامِ عالم کے تاریخی حالات اور نہایت صحیح اور سچے سوانح اور ان کی شریعتوں کی تفصیلات کا بیان ظاہر ہے، کہ بجز اس کے نہیں ہوسکتا کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ ہی کا ہو، اور اللہ تعالیٰ نے ہی آپ کو یہ خبریں دی ہوں۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ اس کی متعدد آیات میں لوگوں کے دل کی چھپی ہوئی باتوں کی اطلاع دی گئی اور پھر اُن کے اقرار سے ثابت ہوگیا کہ وہ بات صحیح اور سچی تھی، یہ کام بھی عالم الغیب والشہادۃ ہی کرسکتا ہے، کسی بشر سے عادۃً ممکن نہیں، مثلاً ارشاد قرآنی ہے:

اِذْ هَمَّتْ طَّآىِٕفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا (۳ : ۱۲۲)	"جب تمہاری دو جماعتوں نے دل میں ارادہ کیا کہ پسپا ہوجائیں"

اور یہ ارشاد کہ:۔

يَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ۭ (۵۹ : ۸)	"وہ لوگ اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ ہمارے انکار کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا"

یہ سب باتیں ایسی ہیں جن کو انھوں نے کسی سے ظاہر نہیں کیا، قرآن کریم نے ہی ان کا انکشاف کیا۔

چھٹی وجہ چھٹی وجہ اعجازِ قرآنی کی، وہ آیات ہیں جن میں قرآن نے کسی قوم یا فرد کے متعلق یہ پیشینگوئی کی کہ وہ فلاں کام نہ کرسکیں گے، اور پھر وہ لوگ باوجود ظاہری قدرت کے اس کام کو نہ کرسکے، جیسے یہود کے متعلق قرآن نے اعلان کیا کہ اگر وہ فی الواقع اپنے آپ کو اللہ کے

دوست اور ولی سمجھتے ہیں تو انھیں اللہ کے پاس جانے سے محبّت ہونا چاہئے، وہ ذرا موت کی تمنا کرکے دکھائیں اور پھر ارشاد فرمایا:

وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا (۲: ۹۵)	"وہ ہرگز موت کی تمنا نہ کرسکیں گے"

موت کی تمنا کرنا کسی کے لئے مشکل نہ تھا، خصوصاً اُن لوگوں کے لئے جو قرآن کو جھٹلاتے تھے، قرآن کے ارشاد کی وجہ سے اُن کو تمنائے موت میں خوف و ہراس کی کوئی وجہ نہ تھی، یہود کے لئے تو مسلمانوں کو شکست دینے کا یہ موقع بڑا غنیمت تھا کہ فوراً تمنائے موت کا ہر مجلس و محفل میں اعلان کرتے۔

مگر یہود ہوں یا مشرکین زبان سے کتنا ہی قرآن کو جھٹلائیں ان کے دل جانتے تھے کہ قرآن سچا ہے، اس کی کوئی بات غلط نہیں ہوسکتی، اگر موت کی تمنا ہم اِس وقت کریں گے تو فوراً مرجائیں گے اس لئے قرآن کے اس کھلے ہوئے چیلنج کے باوجود کسی یہودی کی ہمت نہ ہوئی کہ ایک مرتبہ زبان سے تمنائے موت کا اظہار کردے۔

ساتویں وجہ وہ خاص کیفیت ہے جو قرآن کے سننے سے ہر خاص وعام اور مؤمن و کافر پر طاری ہوتی ہے، جیسے حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کو اسلام لانے سے پہلے پیش آیا کہ اتفاقاً انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز مغرب میں سورۂ طور پڑھتے ہوئے سُنا، جب آپ آخری آیات پر پہونچے تو جبیرؓ کہتے ہیں کہ میرا دل گویا اُڑنے لگا، اور یہ سب پہلا دن تھا کہ میرے دل میں اسلام نے اثر کیا، وہ آیات یہ ہیں:

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ○ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ○ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ○ (۵۲: ۳۵-۳۷)	"کیا وہ بن گئے ہیں آپ ہی آپ، یا وہی ہیں بنانے والے، یا انھوں نے بنائے ہیں آسمان اور زمین! کوئی نہیں، پر یقین نہیں کرتے، کیا اُن کے پاس ہیں خزانے تیرے رب کے، یا وہی داروغہ ہیں"

آٹھویں وجہ یہ ہے کہ اس کو بار بار پڑھنے اور سُننے سے کوئی اُکتاتا نہیں، بلکہ جتنا زیادہ پڑھا جاتا ہے اُس کا شوق اور بڑھتا ہے، دنیا کی کوئی بہتر سے بہتر اور مرغوب کتاب لے لیجئے اس کو دو چار مرتبہ پڑھا جائے تو انسان کی طبیعت اُکتا جاتی ہے، پھر نہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے نہ سننے کو یہ صرف قرآن کا خاصہ ہے کہ جتنا کوئی اس کو زیادہ پڑھتا ہے اُتنا ہی اس کو شوق و رغبت بڑھتا جاتا ہے، یہ بھی قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے ہی کا اثر ہے۔

نویں وجہ یہ ہے کہ قرآن نے اعلان کیا ہے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے،

وہ قیامت تک بغیر کسی ادنیٰ تغیر و ترمیم کے باقی رہے گا، اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدے کو اس طرح پورا فرمایا کہ جب سے قرآن نازل ہوا ہے آج چودہ سو برس کے قریب ہونے کو آئے ہیں ہر قرن ہر زمانے میں لاکھوں انسان ایسے رہے ہیں اور رہیں گے جن کے سینوں میں پورا قرآن اس طرح محفوظ رہا کہ ایک زیر و زبر کی غلطی کا امکان نہیں، ہر زمانے میں مرد، عورت، بچے، بوڑھے اس کے حافظ ملتے ہیں بڑے سے بڑا عالم اگر کہیں ایک زیر و زبر کی غلطی کر جائے تو ذرا ذرا سے بچے وہیں غلطی پکڑ لیں گے، دنیا کا کوئی مذہب اپنی مذہبی کتاب کے متعلق اس کی مثال تو کیا اس کا دسواں حصّہ بھی پیش نہیں کر سکتا بہت سے مذاہب کی کتابوں میں تو آج یہ پتہ چلانا بھی مشکل ہو گیا ہے کہ اس کی اصل کس زبان میں آئی تھی، اور اس کے کتنے اجزاء تھے۔

کتاب کی صورت میں بھی ہر قرن ہر زمانے میں جتنی اشاعت قرآن کی ہوئی شاید دنیا کی کسی کتاب کو یہ بات نصیب نہیں، حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ ہر زمانے میں مسلمانوں کی تعداد دنیا میں بہ نسبت منکرین اور کافروں کے بہت کم رہی، اور ذرائع نشر و اشاعت بھی جتنے غیر مسلموں کو حاصل رہے ہیں مسلمانوں کو اس کا کوئی معتد بہ حصّہ نصیب نہ تھا، مگر ان باتوں کے باوجود کسی قوم کسی مذہب کی کوئی کتاب دنیا میں اتنی شائع نہیں ہوئی جتنا قرآن شائع ہوا۔

پھر قرآن کی حفاظت کو اللہ تعالیٰ نے صرف کتابوں اور صحیفوں پر موقوف نہیں رکھا جن کے جل جانے اور محو ہو جانے کا امکان ہو، بلکہ اپنے بندوں کے سینوں میں بھی محفوظ کر دیا، اگر آج ساری دنیا کے قرآن (معاذ اللہ) نابود کر دیئے جائیں، تو اللہ کی یہ کتاب پھر بھی اسی طرح محفوظ رہیگی، چند حافظ مل کر بیٹھ جائیں تو چند گھنٹوں میں پھر ساری کی ساری لکھی جا سکتی ہے، یہ بے نظیر حفاظت بھی صرف قرآن ہی کا خاصہ اور اس کے کلام الٰہی ہونے کا نمایاں ثبوت ہے، کہ جس طرح اللہ کی ذات ہمیشہ باقی رہنے والی ہے اس پر کسی مخلوق کا تصرّف نہیں چل سکتا اسی طرح اس کا کلام بھی ہمیشہ تمام مخلوقات کی دستبرد اور تصرّفات سے بالاتر ہو کر ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گا، قرآن کی یہ پیشینگوئی چودہ سو برس تک مشاہدہ میں آچکی ہے، اور تا قیامت انشاء اللہ تعالیٰ آتی رہے گی، اس کھلے معجزے کے بعد قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں کیا کسی کو شک و شبہ کی گنجائش رہ سکتی ہے۔

دسویں وجہ وہ علوم و معارف ہیں جن کا احاطہ نہ آج تک کسی کتاب نے کیا ہے نہ آئندہ امکان ہے کہ اتنے مختصر حجم اور محدود کلمات میں اتنے علوم و فنون جمع کئے جا سکیں جو تمام کائنات کی دائمی ضروریات کو حاوی اور انسان کی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر حال سے متعلق پورا مرتب اور بہترین نظام پیش کر سکے، شخصی پھر عائلی زندگی سے لے کر قبائلی اور شہری زندگی تک اور پھر عمرانیات و اجتماعیات اور سیاستِ ممالک کے ہر پہلو پر حاوی نظام پیش کر دے۔

پھر صرف نظری اور علمی طور پر نظام پیش کرنا ہی نہیں عملی طور پر اس کا رواج پانا اور تمام نظامہائے دنیا پر غالب آکر قوموں کے مزاج، اخلاق، اعمال، معاشرت اور تمدن میں وہ انقلاب عظیم پیدا کرنا جس کی نظیر نہ قرونِ اُولیٰ میں مل سکتی ہے نہ قرونِ ما بعد میں، یہ حیرت انگیز انقلاب کیا کسی انسان کی قدرت اور اس کی حکمت عملی کا نتیجہ ہو سکتا ہے؟ خصوصاً جبکہ وہ انسان بھی اُمّی اور اس کی قوم بھی اُمّی ہو سہ

مخدرات سراپردہائے قرآنی
چہ دلبرند کہ دل می برند پنہانی

یہی وہ محیرّ العقول تاثیرات ہیں کہ جن کی وجہ سے قرآن کو کلامِ الٰہی ماننے پر ہر وہ شخص مجبور ہو جس کی عقل و بصیرت کو تعصب و عناد نے بالکل ہی برباد نہ کر دیا ہو۔

یہاں تک کہ اس دَور مادّہ پرستی کے مسیحی مصنفین جنھوں نے کچھ بھی قرآن میں غور و فکر سے کام لیا اس اقرار پر مجبور ہوگئے کہ یہ ایک بے مثل و بے نظیر کتاب ہے۔

فرانس کا مشہور مستشرق ڈاکٹر مارڈرس جس کو حکومتِ فرانس کی وزارتِ معارف نے قرآن حکیم کی باسٹھ سورتوں کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کرنے پر مامور کیا تھا اس نے اعتراف کیا ہے جس کا اردو ترجمہ یہ ہے:-

"بے شک قرآن کا طرزِ بیان خالق جلّ و علا کا طرزِ بیان ہے، بلاشبہ جن حقائق و معارف پر یہ کلام حاوی ہے وہ ایک کلامِ الٰہی ہی ہو سکتا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ اس میں شک و شبہ کرنے والے بھی جب اس کی تاثیرِ عظیم کو دیکھتے ہیں تو تسلیم و اعتراف پر مجبور ہوتے ہیں، پچاس کروڑ مسلمان جو سطحِ زمین کے ہر حصہ پر پھیلے ہوئے ہیں اُن میں قرآن کی خاص تاثیر کو دیکھ کر مسیحی مشن میں کام کرنے والے بالاجماع اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں کیا جاسکتا کہ جس مسلمان نے اسلام اور قرآن کو سمجھ لیا وہ کبھی مرتد ہوا یا قرآن کا منکر ہوگیا ہو"

مسلمانوں میں تاثیرِ قرآنی کا یہ اعتراف اس مسیحی مستشرق سے ایک ایسے دَور میں ہو رہا ہے جبکہ خود مسلمان اسلام اور قرآن سے بیگانہ اس کی تعلیمات سے دور، اس کی تلاوت سے غافل ہو چکے ہیں، کاش! یہ مصنف اسلام اور قرآن کے اُس دَور کو دیکھتا جب کہ مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ میں قرآن کا عمل تھا اور انکی زبانوں پر قرآن کی آیات تھیں۔

اسی طرح دوسرے مسیحی مصنفین نے بھی جو منصف مزاج ہیں اسی قسم کے اعتراف کئے ہیں مسٹر ولیم میور نے اپنی کتاب "حیاتِ محمدؐ" میں واضح طور پر اس کا اعتراف کیا ہے، اور ڈاکٹر شبلی شمیل نے اس پر ایک مستقل مقالہ لکھا ہے۔

قرآن کے کلامِ الٰہی اور معجزۂ نبویؐ ہونے پر دسؔ وجوہ آپ سُن چکے ہیں، آخر میں ایک اجمالی نظر اس پر ڈالیے کہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پیدائشی یتیم ہو کر دنیا میں تشریف لائے ہیں، عمر بھر کسی مکتب میں قدم نہیں رکھتے، قلم اور کتاب کو ہاتھ نہیں لگاتے، اپنا نام بھی خود نہیں لکھ سکتے، اسی میں جوان ہوتے ہیں، آپؐ کی طبیعت عزلت پسند ہے، کسی کھیل، تماشہ، جلسوں، ہنگاموں میں جانے کے بھی عادی نہیں، شعر و سخن سے بھی مناسبت نہیں، کسی قومی اجتماع میں کبھی کوئی خطبہ دینے یا تقریر کرنے کا بھی عمر بھر اتفاق نہیں ہوتا، چالیسؔ سال ہونے کے بعد جب کہ ادھیڑ عمر میں پہونچ جاتے ہیں، اور عادۃً کسی علم کے سیکھنے سکھانے کا وقت ختم ہو جاتا ہے اُس وقت آپؐ کی زبانِ مبارک پر ایک ایسا محیر العقول، جامع حقائق فصاحت و بلاغت میں اعجاز نما کلام آنے لگتا ہے، جو کسی بڑے سے بڑے عالم، ماہر اور فصیح و بلیغ سے بھی ممکن نہیں جس کے ذریعہ آپؐ عرب کے بڑے بڑے فصحاء و بلغاء کو خطاب فرماتے ہیں، ان کے جلسوں میں پہونچ کر خطبے دیتے ہیں، اور پوری دنیا کے لئے عموماً عرب کے لئے خصوصاً یہ چیلنج سناتے ہیں کہ کوئی اس کے کلامِ الٰہی ہونے میں شبہ کرے تو اس کے کسی چھوٹے سے حصہ کی مثال بنا کر دکھلا دے، اس پر پوری قوم مثال پیش کرنے سے عاجز ہو جاتی ہے۔

پوری قوم جو آپؐ کو پہلے امین کے لقب سے پکارتی اور تعظیم کرتی تھی، آپؐ کی مخالف ہو جاتی ہے اس کلام کی تبلیغ سے باز رکھنے کے لئے دولت، حکومت اور ہر انسانی خواہش کی چیزیں پیش کرتی ہے آپؐ ان میں سے کسی چیز کو قبول نہیں کرتے، پوری قوم آپؐ کو اور آپؐ کے رفقاء کو ستانے، ظلم کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے، آپؐ یہ سب کچھ برداشت کرتے ہیں، مگر اس کلام کی تبلیغ نہیں چھوڑتے قوم آپؐ کے قتل کی سازشیں کرتی ہے، جنگ و جدل پر آمادہ ہو جاتی ہے، آپؐ کو اپنا وطن چھوڑ کر مدینہ جانا پڑتا ہے، آپؐ کی قوم آپؐ کو وہاں بھی سکون سے نہیں بیٹھنے دیتی۔

سارا عرب اور اہلِ کتاب آپؐ کی مخالفت پر جمع ہو جاتا ہے، آئے دن مدینہ پر حملے ہوتے ہیں آپؐ کے مخالفین یہ سب کچھ کرتے ہیں، مگر قرآن کے چیلنج کو قبول کر کے ایک چھوٹی سی سورت قرآن کی مثل بنا کر پیش نہیں کرتے، قرآن ان کو غیرت دلاتا ہے اس پر بھی ان کی رگِ حمیت میں حرکت نہیں ہوتی

صرف یہی نہیں کہ پورا عرب قرآن کی مثال پیش کرنے سے عاجز رہا، بلکہ خود وہ ذاتِ اقدس جس پر یہ قرآن نازل ہوا، وہ بھی اس کی مثال اپنی طرف سے پیش نہیں کر سکتے، ان کا سارا کلام یعنی حدیث جس طرح کا ہے قرآن کا کلام یقیناً اس سے ممتاز ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْٓ	"جو لوگ آخرت میں ہمارے سامنے آنے کے منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اسی جیسا ایک اور قرآن بنا دیجئے یا اسی کو بدل دیجئے، تو

اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ج (۱۰: ۱۵)	آپ فرما دیجئے کہ میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ میں اپنی طرف سے اس کو بدل ڈالوں"

ایک طرف تو قرآن کے یہ کھلے کھلے معجزات ہیں جو اس کے کلام الٰہی ہونے پر شاہد ہیں، دوسری طرف اس کے مضامین و مضمرات اور حقائق و معارف پر نظر ڈالئے تو وہ اس سے زیادہ محو حیرت بنا دینے والی چیز ہے۔

نزولِ قرآن کے ابتدائی دَور کے چند سال تو اس حالت میں گذرے کہ قرآنی تعلیمات کو کھلے طور پر پیش کرنا بھی ممکن نہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خفیہ طور پر لوگوں کو اصولِ قرآنی کی طرف دعوت دیتے تھے، پھر بے شمار مزاحمتوں اور مخالفتوں کے نرغہ میں کچھ علانیہ دعوت بھی شروع کی جاتی ہے، مگر قرآن کریم کے مجوزہ قانون کی تنفیذ کا کوئی امکان نہ تھا۔

ہجرت مدینہ کے بعد صرف دس سال ایسے ملے جن کو مسلمانوں کے لئے آزادی کا زمانہ کہا جا سکتا ہے، جس میں قرآنی نظام کی مکمل تعلیم اور تنفیذ کی کوشش اور کوئی تعمیری کام کیا جا سکتا تھا۔

لیکن اُن دس سال میں بھی آپ تاریخ اسلام پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ابتدائی چھ سال دشمنوں کے نرغہ اور منافقین اور یہود مدینہ کی سازشوں سے کس کو فرصت تھی کہ کوئی تعمیری کام اور ایسا نظام جو ساری دنیا کے نظاموں سے مختلف ہے، عملی طور پر نافذ کرسکے، مسلمانوں کے خلاف سب بڑے بڑے معرکے انھیں چھ سال کے اندر پیش آئے، غزوۂ بدر، اُحد، احزاب وغیرہ سب اسی مدت کے اندر ہوئے، ہجرت کے چھٹے سال دس سال کے لئے حدیبیہ کا صلح نامہ لکھا گیا اور صرف ایک سال اس معاہدہ پر قریشِ عرب قائم رہے، اس کے بعد انھوں نے اس کو بھی توڑ ڈالا، اور پھر جنگ و جہاد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

ظاہر اسباب میں صرف یہ ایک دو سال ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کام کے لئے ملے، کہ قرآن کی دعوت کو عام کرسکیں، اور اس کے نظام کو نافذ کرنے کی کوشش کرسکیں، اسی عرصہ میں آپ نے بڑے بڑے سلاطینِ دنیا کو خطوط لکھے، قرآن کی دعوت اُن کو پہونچائی، قرآنی نظام کو قائم کرنے پھیلانے کی سعی فرمائی، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخر عمر مبارک تک اس آزادی کے صرف چار سال ہوتے ہیں جن میں فتح مکہ کا جہاد بھی پیش آیا اور مکہ مکرمہ فتح ہوا۔

اب اس چار سال کی قلیل مدت کو دیکھئے، اور قرآن کے اس نفوذ و اثر پر نظر ڈالئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تقریباً پورے جزیرۃ العرب پر قرآن کی حکومت تھی، ایک طرف سرحدِ روم تک اور دوسری طرف عراق تک، تیسری طرف عدن تک پہونچ چکی تھی۔

اگر اس سے بھی قطع نظر کرلی جائے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے اس کو بھی نظر انداز کیا جائے کہ آپؐ کی قوم ایک ایسی قوم تھی کہ جس نے کبھی کسی بادشاہ کی اطاعت قبول نہ کی تھی، اس کو بھی بھول جائیے کہ ساری دنیا آپؐ کے خلاف تھی، اور مشرکین عرب یہود و نصاریٰ سب کے سب مل کر آپؐ کو اور قرآن کو دنیا سے مٹانے پر تُلے ہوئے تھے، بالکل سازگار فضا مان لیجئے تو بھی ایک نئے نظام، نئے قانون اور نئے اصول کی پہلے تو تدوین و ترتیب پھر اس کی تعلیم و تفہیم پھر اس کی عملی تنفیذ اور اس کے ذریعہ ایک پاکباز معاشرہ، اور ملک بھر میں امن و سکون پیدا کرنے کے لئے کتنی مدّت، کتنا سرمایہ، کتنے آدمی درکار ہیں، اور کیا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کو حاصل تھے؟ آج کے نظاموں کو سامنے رکھ کر حساب لگائیے تو ایک اندھے کی بھی آنکھیں کھل جائیں گی کہ یہ نفوذ و اثر یہ رُوحانی تاثیر بجز خاص قدرتِ الٰہیہ کے کسی طرح ظاہر نہیں ہوسکتی۔

اعجازِ قرآنی کے پورے وجوہ اور اُن کی تفصیلات کا بیان ایک نہایت طویل بحث ہے، علماء اُمت نے اس پر بیسیوں مستقل کتابیں ہر زمانہ میں مختلف زبانوں میں تصنیف فرمائی ہیں۔

سب سے پہلے تیسری صدی ہجری میں جاحظ نے نظم القرآن کے نام سے مستقل کتاب لکھی پھر چوتھی صدی کے اوائل میں ابوعبداللہ واسطی نے بنام اعجاز القرآن ایک کتاب تصنیف کی، پھر اسی صدی میں ابن عیسیٰ ربانی نے ایک مختصر رسالہ بنام اعجاز القرآن لکھا، قاضی ابوبکر باقلانی نے پانچویں صدی کے اوائل میں اعجاز القرآن کے نام سے ایک مفصّل و مبسوط کتاب لکھی، علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے اتقان اور خصائص کبریٰ میں امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں، قاضی عیاضؒ نے شفاء میں بڑی شرح و بسط کے ساتھ اس مضمون کی تفصیل لکھی، آخری دور میں مصطفےٰ صادق رافعی مرحوم نے اعجاز القرآن کے نام سے اور جناب سید رشید رضا مصری نے الوحی المحمدی کے نام سے مستقل، جامع اور مبسوط کتابیں لکھیں، اردو زبان میں استاذ محترم شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے ایک رسالہ بنام اعجاز القرآن تصنیف فرمایا۔

یہ بھی قرآن مجید کی خصوصیات میں سے ہے کہ اس کے ایک ایک مسئلہ پر مکمل تفسیروں کے علاوہ مستقل رسائل و کتابیں اتنی لکھی گئی ہیں کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

عرض کرنا یہ ہے کہ یہ مضمون اپنی پوری تفصیل کے ساتھ تو اس جگہ بیان نہیں ہوسکتا، لیکن جتنا بیان ہوچکا ہے وہ بھی ایک منصف مزاج انسان کو اس پر مجبور کردینے کے لئے کافی ہے کہ قرآن کو اللہ تعالیٰ کا کلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم الشان معجزہ تسلیم کرلے۔

چند شبہات اور جوابات

بعض لوگوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ بہت ممکن ہو کہ قرآن کے مقابلہ میں کتابیں اور مقالات لکھے گئے مگر وہ محفوظ نہ رہے ہوں۔

لیکن اگر ذرا بھی انصاف سے کام لیا جائے تو اس احتمال کی کوئی گنجائش نہیں رہتی، کیونکہ دنیا جانتی ہے کہ جب سے قرآن نازل ہوا، پوری دنیا میں قرآن کے ماننے والے کم اور منکرین زیادہ رہے ہیں، اور یہ بھی معلوم ہو کہ ذرائع نشر و اشاعت جتنے منکرین قرآن کو حاصل رہے ہیں قرآن کے ماننے والوں کو اکثر قرنوں میں اس کا کوئی قابلِ ذکر حصہ حاصل نہیں رہا، قرآن اتنا بلند بانگ دعویٰ اپنے مخالفین کے سامنے کرتا ہے، اُن کو چیلنج دیتا ہے، غیرتیں دلاتا ہے، اور مخالفینِ اسلام اس کے مقابلہ میں جان، مال اور اولاد سب کچھ قربان کرنے کے لئے آمادہ ہوتے ہیں، اگر انھوں نے قرآن کا چیلنج قبول کرکے کوئی چیز مقابلہ کے لئے پیش کی ہوتی تو کیسے ممکن تھا کہ وہ ساری دنیا میں شائع نہ ہوتی، اور ہر زمانہ میں منکرینِ قرآن مسلمانوں کے مقابلہ میں اس کو پیش نہ کرتے، اور مسلمانوں کی طرف سے اس پر جرح و قدح میں سینکڑوں کتابیں نہ لکھی گئی ہوتیں۔

اسلام کے قرنِ اوّل میں صرف ایک واقعہ مسیلمہ کذاب یمامی کا پیش آیا کہ اس نے کچھ چند بے حیائی کے اُلٹے سیدھے کلمات لکھ کر یہ کہا تھا کہ یہ وحیِ آسمانی قرآن کی مثل ہے، مگر دنیا جانتی ہو کہ اُن کلمات کا کیا حشر ہوا، خود اس کی قوم نے اس کے مُنہ پر مار دیئے، وہ کلمات ایسے شرمناک غیر مہذب تھے کہ کسی مہذب سوسائٹی میں ان کو بیان بھی نہیں کیا جا سکتا، اور بہر حال جیسے بھی تھے وہ آج تک کتابوں میں نقل ہوتے چلے آئے ہیں، اگر کسی اور شخص نے کوئی اچھا کلام قرآن کے مقابلہ میں پیش کیا ہوتا، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ دنیا کی تاریخ اس کو یکسر بھلا دیتی، اور منکرینِ قرآن اس کو ہر قیمت پر باقی رکھنے کی کوشش نہ کرتے۔

وہ لوگ، جو قرآن کے مقابلہ پر ہر وقت سینہ سپر تھے قرآن کے اس چیلنج کے جواب میں انھوں نے طرح طرح کی باتیں کیں جن کو قرآن میں نقل کرکے جواب دیا گیا، مگر اس کا ایک واقعہ نہیں کہ کوئی کلام مقابلہ پر پیش کرکے اس کے قرآن کا مثل ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہو، ایک رومی غلام جو مدینہ میں لوہار کا کام کیا کرتا تھا اور کچھ تورات و انجیل پڑھا ہوا تھا، کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا تھا، عرب کے کچھ جاہلوں نے تعصب و عناد سے یہ مشہور کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ قرآنی مضامین اس نے سکھائے ہیں قرآن نے اُن کا یہ اعتراض نقل کرکے خود جواب دیا کہ جس شخص کی طرف سکھانے کی نسبت کرتے ہیں وہ تو خود عجمی ہے، عربی زبان کی بلاغت کو کیا جانے، اور یہ قرآن عربی کی انتہائی بلیغ کتاب ہو سورۂ نحل کی آیت نمبر ۱۰۳ دیکھئے:

لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ (ہم جانتے ہیں کہ یہ مخالفینِ اسلام یہ کہتے ہیں

11

اَعۡجَمِیٌّ وَّھٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیۡنٌ ۝ (۱۶ : ۱۰۳)	آپ کو یہ قرآن ایک آدمی سکھاتا ہو حالانکہ وہ جس آدمی کی طرف نسبت کرتے ہیں وہ عجمی ہے، اور قرآن ایک بلیغ عربی زبان میں ہے"

کچھ لوگوں نے قرآن کی تحدی کے جواب میں یہ کہا کہ:

لَوۡ نَشَآءُ لَقُلۡنَا مِثۡلَ ھٰذَاۤ لا (۸ : ۳۱)	"اگر ہم چاہتے تو ہم بھی قرآن کے مثل کلام کہدیتے"

لیکن کوئی ان سے پوچھے کہ پھر چاہا کیوں نہیں؟ قرآن کے مقابلہ کے لئے سارا ایڑی چوٹی کا زور تو خرچ کیا، جان و مال کی قربانی دی، اگر تمھیں اس کا مِثل کلام لکھنے یا کہنے کی قدرت تھی تو قرآن کی اس تحدّی کے بعد تم نے اس کی مثل کلام بنا کر فتح کا سہرا اپنے سر کیوں نہ لیا؟

خلاصہ یہ ہو کہ قرآن کے اس دعوٰی کے بعد مخالفین نے کچھ شریفانہ سکوت نہیں کر لیا بلکہ جو کچھ اُن کے مُنہ پر آیا اس کے مقابلہ پر کہتے رہے، لیکن یہ پھر بھی کسی نے نہ کہا کہ ہم میں سے فلاں آدمی نے قرآن جیسا فلاں کلام لکھا ہے، اس لئے قرآن کا یہ دعوٰیٔ یکتائی (معاذ اللہ) غلط ہے۔

بعض معاندین کو یہ سُوجھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو قبل از نبوّت چند روز کے لئے ملک شام تشریف لے گئے، اور راستہ میں بحیرا۔ راہب سے ملاقات ہوئی وہ تورات کا ماہر تھا، اس سے آپ نے علوم سیکھے، مگر کوئی ان سے پوچھے کہ ایک دن کی ایک ملاقات میں اس سے یہ سارے علوم و معارف فصاحت و بلاغت کا اعجاز، اخلاقی تربیت، نظامِ خانگی، نظامِ مملکت کیسے سیکھ لئے۔

آجکل کے بعض معترضین نے کہا کہ کسی کلام کی مثل نہ بنایا جانا اس کی دلیل نہیں ہوسکتی کہ وہ خدا کا کلام یا معجزہ ہو، ہو سکتا ہے کہ ایک اعلیٰ درجہ کا ماہرِ بلاغت کوئی نثر یا نظم ایسی لکھے کہ دوسرے آدمی اس کی نظیر نہ لا سکیں۔

سعدی شیرازی کی گلستاں، فیضی کی تفسیر بے نقط کو عام طور پر بے مثل و بے نظیر کتابیں کہا جاتا ہے تو کیا وہ بھی معجزہ ہیں؟

لیکن اگر ذرا غور کریں تو انھیں معلوم ہوگا کہ سعدی اور فیضی کے پاس سامانِ تعلیم و تالیف کس قدر موجود تھا، کتنے عرصہ تک انھوں نے تعلیم حاصل کی، برسوں مدرسوں میں پڑے رہے، راتوں جاگے، مدّتوں محنتیں کیں، بڑے بڑے علماء کے سامنے زانوئے ادب طے کئے، سالہا سال کی محنتوں اور دماغ سوزیوں کے نتیجہ میں اگر بالفرض فیضی یا حریری یا متنبّی یا کوئی اور عربی زبان میں اور سعدی فارسی میں اور ملٹن انگریزی میں یا ہومر یونانی میں یا کالی داس سنسکرت میں ایسے ہوئے ہیں کہ ان کا کلام دوسروں کے کلام سے فائق ہوگیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

معجزہ کی تعریف تو یہ ہو کہ وہ اسبابِ متعارفہ کے توسّط کے بغیر وجود میں آئے، کیا ان

لوگوں کی باقاعدہ تحصیلِ علوم، استادوں کے ساتھ طویل ملازمت و صحبت، وسیع مطالعہ، مدتوں کی مشاق ان کی علمی مہارت کے کھلے ہوئے اسباب نہیں ہیں؟ اگر ان کے کلام دوسروں سے ممتاز ہوں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ جس نے کبھی کتاب و قلم کو ہاتھ نہ لگایا ہو، کسی مدرسہ و مکتب میں قدم نہ رکھا ہو، وہ ایسی کتاب دنیا کے سامنے پیش کرے کہ ہزاروں سعدی اور لاکھوں فیضی اس پر قربان ہو جانے کو اپنا سرمایۂ فخر سمجھیں، اور ان کو جو کچھ علم و حکمت حاصل ہوئی اس کو بھی آپ ہی کے فیضِ تعلیم کا اثر قرار دیں، اس کے علاوہ سعدیؔ اور فیضیؔ کے کلام کا مثل پیش کرنے کی کسی کو ضرورت بھی کیا تھی؟ کیا انھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا، اور اپنے کلام کے بے مثل و بے نظیر ہونے کو اپنا معجزہ کہا تھا، اور دنیا کو اس کا چیلنج دیا تھا کہ ہمارے کلام کی کوئی مثال پیش نہیں کی جا سکتی جس کے نتیجہ میں لوگ اس کا مقابلہ کرنے اور مثال پیش کرنے کے لئے مجبور ہوتے۔

پھر قرآن کی صرف فصاحت و بلاغت اور نظم و ترتیب ہی بے مثال نہیں، لوگوں کے دل و دماغ پر اس کی تاثیراتِ عجیبہ اس سے زیادہ بے مثال اور حیرت انگیز ہیں، جن کی وجہ سے قوموں کے مزاج بدل گئے، انسانی اخلاق میں ایک کایا پلٹ ہوگئی، عرب کے تندخو، گنوار، حلم و اخلاق اور علم و حکمت کے استاد مانے گئے، ان حیرت انگیز انقلابی تاثیرات کا اقرار صرف مسلمان نہیں موجودہ زمانے کے سینکڑوں غیر مسلموں نے بھی کیا ہے، یورپ کے مستشرقین کے مقالات اس بارے میں جمع کئے جائیں تو ایک مستقل کتاب ہو جائے، اور حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب بنام شہادۃ الاقوام علیٰ صدق الاسلام تحریر فرمائی ہے اس جگہ چند حوالے نقل کئے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر گستاولی بان نے اپنی کتاب تمدنِ عرب میں صفائی سے اس حیرت انگیزی کا اعتراف کیا، اُن کے الفاظ کا ترجمہ اردو میں یہ ہے:

"اس پیغمبرِ اسلام اس نبی اُمّی کی بھی ایک حیرت انگیز سرگذشت ہے، جس کی آواز نے ایک قوم ناہنجار کو جو اُس وقت تک کسی ملک گیر کے زیر حکومت نہ آئی تھی رام کیا، اور اس درجہ پر پہنچا دیا کہ اس نے عالم کی بڑی بڑی سلطنتوں کو زیر و زبر کر ڈالا، اور اس وقت بھی وہی نبی اُمّی اپنی قبر کے اندر سے لاکھوں بندگانِ خدا کو کلمۂ اسلام پر قائم رکھے ہوئے ہے۔"

مسٹر ڈوڈول جس نے قرآن مجید کا ترجمہ اپنی زبان میں کیا ہے لکھتا ہے کہ:

"جتنا بھی ہم اس کتاب (یعنی قرآن) کو الٹ پلٹ کر دیکھیں اُسی قدر پہلے مطالعہ میں اس کی نامرغوبی نئے نئے پہلوؤں سے اپنا رنگ جماتی ہے، لیکن فوراً ہمیں مسخر کر لیتی ہے، متحیّر بنا دیتی ہے، اور آخر میں ہم سے تعظیم کرا کر چھوڑتی ہے، اس کا طرز بیان باعتبار اس کے مضامین و اغراض کے،

عفیف، عالی شان اور تہدید آمیز ہو اور جا بجا اس کے مضامین سخن کی غایت رفعت تک پہنچ جاتے ہیں، غرض یہ کتاب ہر زمانہ میں اپنا پُر زور اثر دکھاتی رہے گی"۔ (شہادۃ الاقوام، ص ۱۳)

مصر کے مشہور مصنّف احمد فتحی بک زا غلول نے ۱۸۹۸ء میں مسٹر کونٹ ہنروی کی کتاب الاسلام کا ترجمہ عربی میں شائع کیا تھا، اصل کتاب فرنچ زبان میں تھی، اس میں مسٹر کونٹ نے قرآن کے متعلق اپنے تاثرات ان الفاظ میں ظاہر کئے ہیں:

"عقل حیران ہے کہ اس قسم کا کلام ایسے شخص کی زبان سے کیونکر ادا ہو جو بالکل اُمّی تھا، تمام مشرق نے اقرار کر لیا ہے کہ نوعِ انسانی لفظاً و معنیً ہر لحاظ سے اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، یہ وہی کلام ہے جس کی بلند انشار پردازی نے عمر بن خطاب کو مطمئن کر دیا، اُن کو خدا کا معترف ہونا پڑا، یہ وہی کلام ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے متعلق اس کے جملے جعفر بن ابی طالبؓ نے حبشہ کے بادشاہ کے دربار میں پڑھے تو اس کی آنکھوں سے بیساختہ آنسو جاری ہوگئے، اور بشپ چِلّا اٹھا کہ یہ کلام اُسی سرچشمہ سے نکلا ہے جس سے عیسیٰ علیہ السلام کا کلام نکلا تھا"

(شہادۃ الاقوام ص ۱۴)

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، جلد ۱۶ ص ۵۹۹ میں ہے:

"قرآن کے مختلف حصص کے مطالب ایک دوسرے سے بالکل متفاوت ہیں، بہت سی آیات دینی و اخلاقی خیالات پر مشتمل ہیں، مظاہر قدرت، تاریخ، الہاماتِ انبیاءؑ کے ذریعہ اس میں خدا کی عظمت، مہربانی اور صداقت کی یاد دلائی گئی ہے، بالخصوص حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے واسطہ سے خدا کو واحد اور قادرِ مطلق ظاہر کیا گیا ہے، بُت پرستی اور مخلوق پرستی کو بلا لحاظ ناجائز قرار دیا گیا ہے، قرآن کی نسبت یہ بالکل بجا کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا بھر کی موجودہ کتابوں میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے"

انگلستان کے نامور مورّخ ڈاکٹر گبن اپنی مشہور تصنیف (سلطنتِ روما کا انحطاط و زوال) کی جلد ۵ بابؔ ۵۰ میں لکھتے ہیں:

"قرآن کی نسبت بحر اٹلانٹک سے لے کر دریائے گنگا تک نے مان لیا ہے کہ یہ پارلیمنٹ کی رُوح ہے، قانونِ اساسی ہے، اور صرف اصولِ مذہب ہی کے لئے نہیں، بلکہ احکامِ تعزیرات کے لئے اور قوانین کے لئے بھی ہے جن پر نظام کا مدار ہے جن سے نوعِ انسان کی زندگی وابستہ ہے، جن کو حیاتِ انسانی کی ترتیب و تنسیق سے گہرا تعلق ہے، حقیقت یہ ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شریعت سب پر حاوی ہے، یہ شریعت ایسے دانشمندانہ اصول اور اس قسم کے قانونی انداز پر مرتب ہوئی ہے کہ سارے جہان میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی"

اس جگہ مستشرقین یورپ کے اقوال و اعترافات کا استیعاب کرنا نہیں کہ اس کی گنجائش نہیں، نمونہ کے طور پر چند اقوال نقل کئے گئے ہیں، جن سے واضح ہوتا ہے کہ باعتبار فصاحت و بلاغت کے اور باعتبار اغراض و مقاصد کے اور باعتبار علوم و معارف کے قرآن کے بے نظیر و بے مثل ہونے کا اقرار صرف مسلمانوں نے نہیں ہر زمانہ کے منصف مزاج غیر مسلموں نے بھی کیا ہے۔

قرآن نے ساری دنیا کو اپنی مثال لانے کا چیلنج دیا تھا اور کوئی نہ لا سکا، آج بھی ہر مسلمان دنیا کے ماہرین علم و سیاست کو چیلنج کر کے کہہ سکتا ہے کہ پوری دنیا کی تاریخ میں ایک واقعہ ایسا دکھلا دو کہ ایک بڑے سے بڑا ماہر حکیم فیلسوف کھڑا ہو اور ساری دنیا کے عقائد و نظریات اور رسوم و عادات کے خلاف ایک نیا نظام پیش کرے، اور اس کی قوم بھی اتنی جاہل گنوار ہو، پھر وہ اتنے قلیل عرصہ میں اس کی تعلیم کو بھی عام کر دے اور عملی تنفیذ کو بھی اس حد پر پہنچا دے کہ اس کی نظیر آج کے مضبوط و مستحکم نظاموں میں ملنا ناممکن ہے۔

دنیا کی پہلی تاریخ میں اگر اس کی کوئی نظیر نہیں تو آج تو بڑی روشنی، روشن خیالی، بڑی تیز رفتاری کا زمانہ ہے، آج کوئی کر کے دکھلا دے، اکیلا کوئی نہ کر سکے تو اپنی قوم کو بلکہ دنیا کی ساری اقوام کو جمع کر کے اس کی مثال پیدا کر دے۔

فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ○

"اگر تم اس کی مثال نہ لاسکے اور ہرگز نہ لا سکو گے تو پھر اس جہنم کی آگ سے ڈرو، جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، جو منکروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔"

وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي

اور خوش خبری دے اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے کہ اُن کے واسطے باغ ہیں کہ

مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِن ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوا

بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں جب ملے گا ان کو وہاں کا کوئی پھل کھانے کو تو کہیں گے یہ

هَٰذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِن قَبْلُ ۖ وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا ۖ وَلَهُمْ فِيهَا

تو وہی ہے جو ملا تھا ہم کو اس سے پہلے اور دیئے جائیں گے اُن کو پھل ایک صورت کے اور ان کیلئے وہاں

أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۖ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٥﴾

عورتیں ہوں گی پاکیزہ اور وہ وہیں ہمیشہ رہیں گے۔

خُلاصۂ تفسِیر

اور خوش خبری سُنا دیجئے آپؐ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور کام کئے اچھے اس بات کی کہ بے شک ان کے واسطے بہشتیں ہیں کہ چلتی ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں جب کبھی دیئے جاویں گے وہ لوگ ان بہشتوں میں سے کسی پھل کی غذا تو ہر بار میں یہی کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہم کو ملا تھا اس سے پہلے اور ملے گا بھی اُن کو دونوں بار کا پھل ملتا جُلتا اور ان کے واسطے ان بہشتوں میں بیبیاں ہوں گی صاف پاک کی ہوئی اور وہ لوگ ان بہشتوں میں ہمیشہ کو بسنے والے ہوں گے (ہر بار میں ملتا جُلتا پھل ملنا لطف کے واسطے ہوگا کہ دونوں مرتبہ پھلوں کی صورت ایک سی ہوگی، جس سے وہ سمجھیں گے کہ یہ پہلی ہی قسم کا پھل ہے مگر کھانے میں مزہ دوسرا ہوگا جس سے حظ دوسرا زیادہ ہوگا)

رَبط آیات اس سے پہلی آیت میں قرآن کریم کو نہ ماننے والوں کے عذاب کا بیان تھا، اس آیت میں ماننے والوں کے لئے بشارت اور خوشخبری مذکور ہے جس میں جنت کے عجیب غریب پھلوں کا اور حورانِ جنت کا ذکر ہے۔

معارف ومسائل

اہلِ جنت کو مختلف پھل ایک ہی شکل وصورت میں پیش کرنے سے مقصد بھی ایک تفریح اور لطف کا سامان بنانا ہوگا، اور بعض مفسّرین نے فرمایا کہ پھلوں کے متشابہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ جنت کے پھل صورت شکل میں دنیا کے پھلوں کی طرح ہوں گے، جب اہلِ جنت کو ملیں گے تو کہیں گے کہ یہ تو وہی پھل ہیں جو دنیا میں ہمیں ملا کرتے تھے، مگر ذائقہ اور لذّت میں دنیا کے پھلوں سے اُن کو کوئی نسبت نہ ہوگی، صرف نام کا اشتراک ہوگا۔

جنت میں اُن لوگوں کو پاک صاف بیبیاں ملنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا کی تمام ظاہری اور اخلاقی گندگیوں سے پاک ہوں گی، بول وبراز، حیض ونفاس اور ہر ایسی چیز سے پاک ہوں گی جن سے انسان کو نفرت ہوتی ہے، اسی طرح کج خلقی، بیوفائی معنوی عیوب سے بھی پاک ہوں گی۔

آخر میں فرمایا کہ پھر جنت کی نعمتوں کو دنیا کی آنی فانی نعمتوں کی طرح نہ سمجھو جن کے فنا ہو جانے یا سلب ہو جانے کا ہر وقت خطرہ لگا رہتا ہے، بلکہ یہ لوگ ان نعمتوں میں ہمیشہ ہمیشہ خوش وخرم رہیں گے۔

یہاں مومنین کو جنت کی بشارت دینے کے لئے ایمان کے ساتھ عمل صالح کی بھی قید لگائی ہے

کہ ایمان بغیر عمل صالح کے انسان کو اس بشارت کا مستحق نہیں بناتا، اگرچہ صرف ایمان بھی جہنم میں خلود اور دوام سے بچانے کا سبب ہے، اور مومن کتنا بھی گناہگار ہو کسی نہ کسی وقت میں وہ جہنم سے نکالا جائے گا، اور جنت میں پہونچے گا، مگر عذابِ جہنم سے بالکل نجات کا بغیر عمل صالح کے کوئی مستحق نہیں ہوتا (روح البیان، قرطبی)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ

بے شک اللہ شرماتا نہیں اس بات سے کہ بیان کرے کوئی مثال مچھر کی یا اس چیز کی جو اس سے بڑھکر ہے

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ

سو جو لوگ مؤمن ہیں وہ یقیناً جانتے ہیں کہ یہ مثال ٹھیک ہے جو نازل ہوئی اُن کے رب کی طرف سے اور جو کافر

كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ

ہیں سو کہتے ہیں کیا مطلب تھا اللہ کا اس مثال سے گمراہ کرتا ہے خدائے تعالیٰ اس مثال سے بہتیروں کو

وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ

اور ہدایت کرتا ہے اس سے بہتیروں کو اور گمراہ نہیں کرتا اس مثال سے مگر بدکاروں کو جو توڑتے ہیں خدا

عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ

کے معاہدہ کو مضبوط کرنے کے بعد اور قطع کرتے ہیں اس چیز کو جس کو اللہ نے فرمایا ملانے

يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

کو اور فساد کرتے ہیں ملک میں وہی ہیں ٹوٹے والے۔

وقف لازم

خلاصۂ تفسیر

(بعض مخالفین نے قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر یہ اعتراض کیا تھا کہ اس میں بہت ہی حقیر و ذلیل چیزوں کا ذکر تمثیلات میں کیا گیا ہے جیسے مچھر، مکھی وغیرہ، اگر یہ خدا کا کلام ہوتا تو ایسی حقیر چیزوں کا ذکر اس میں نہ ہوتا، اس کا جواب دیا گیا کہ) ہاں واقعی اللہ تعالیٰ تو نہیں شرماتے کہ بیان کر دیں کوئی مثال بھی خواہ مچھر ہو خواہ اس سے بھی بڑھی ہوئی ہو (یعنی حقیر ہونے میں مچھر سے بھی بڑھی ہوئی ہو) سو جو لوگ ایمان لائے ہوئے ہیں (خواہ کچھ ہی ہو) وہ تو یہی یقین کریں گے کہ بیشک یہ مثال بہت

ہی موقع کی ہے ان کے رب کی جانب سے اور رہ گئے وہ لوگ جو کافر ہو چکے ہیں سو چاہے کچھ ہی ہو جائے وہ یوں ہی کہتے رہیں گے کہ وہ کونسا مطلب ہوگا جس کا قصد کیا ہوگا اللہ تعالیٰ نے اس حقیر مثال سے گمراہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس مثال کی وجہ سے بہتوں کو اور ہدایت کرتے ہیں اس کی وجہ سے بہتوں کو اور گمراہ نہیں کرتے اللہ تعالیٰ اس مثال سے کسی کو مگر صرف نافرمانی کرنے والوں کو جو کہ توڑتے رہتے ہیں اس معاہدہ کو جو اللہ سے کر چکے تھے اس کے استحکام کے بعد (یعنی عہدِ ازل جس میں سب کی ارواح نے اللہ تعالیٰ کے رب ہونے کا اقرار کیا تھا) اور قطع کرتے رہتے ہیں اُن تعلقات کو کہ حکم دیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو جوڑنے کا (اس میں تمام تعلقات شرعیہ داخل ہیں خواہ وہ تعلقات ہوں جو بندہ اور خدا کے درمیان ہیں یا وہ جو اس کے اور اقرباء اور رشتہ داروں کے درمیان ہیں اور عام اہلِ اسلام کے درمیان ہیں اور جو عام انسانوں کے درمیان ہیں) اور فساد کرتے رہتے ہیں زمین میں (کفر و شرک خود بھی فساد ہوا اور دوسروں پر ظلم اور ناحق شناسی جو کفر کے لوازم میں سے ہے، وہ بھی اس فساد میں شامل ہے) بس یہ لوگ ہیں پورے خسارہ میں پڑنے والے (کہ دنیا کی راحت اور آخرت کی نعمت سب ہاتھ سے دے بیٹھے، کیونکہ حاسد کی دنیوی زندگی بھی ہمیشہ تلخ ہی رہتی ہے)۔

معارف و مسائل

ربطِ آیات: چند آیات پہلے قرآن کریم کا یہ دعویٰ مذکور ہے کہ قرآن کریم میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، اور اگر کسی کو کوئی شک اس کے کلام الٰہی ہونے میں ہو تو وہ اس کی چھوٹی سی سورت کی مثل بنا کر دکھلا دے، ان آیات میں منکرینِ قرآن کا ایک شبہ ذکر کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے، شبہ یہ تھا کہ قرآن کریم میں مکھی اور مچھر جیسے حقیر جانوروں کا ذکر آیا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی اور اس کے کلام کی عظمت کے خلاف ہے، اگر یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہوتا تو اس میں ایسی حقیر گھناؤنی چیزوں کا ذکر نہ ہوتا، کیونکہ بڑے لوگ ایسی چیزوں کے ذکر سے شرم و حیا محسوس کرتے ہیں۔

جواب یہ دیا گیا کہ جب کسی حقیر و ذلیل چیز کی مثال دینی ہو تو کسی ایسی ہی حقیر چیز سے مثال دینا مقتضائے عقل و بلاغت ہے، اس غرض کے لئے کسی حقیر گھناؤنی چیز کا ذکر کرنا شرم و حیاء کے قطعاً منافی نہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ ایسی چیزوں کے ذکر سے نہیں شرماتے، اور یہ بھی بتلا دیا کہ ایسے احمقانہ شبہات صرف اُن لوگوں کو پیدا ہوا کرتے ہیں جن کے قلوب اور دماغوں سے اُن کے کفر کی وجہ سے سمجھنے بوجھنے کی صلاحیت مفقود ہو گئی ہو، ایمان والوں کو کبھی ایسے شبہات دامنگیر نہیں ہوتے۔

اس کے بعد اس کی ایک اور حکمت بھی بتلادی کہ ایسی مثالوں سے لوگوں کا ایک امتحان بھی ہوتا ہے، نظر و فکر کرنے والوں کے لئے یہ مثالیں ہدایت کا سامان پیدا کرتی ہیں، اور بے پروائی برتنے والوں کے لئے اور زیادہ گمراہی کا سبب بنتی ہیں، اس کے بعد یہ بھی بتلادیا کہ قرآن کریم کی ان مثالوں سے صرف ایسے سرکش لوگ گمراہ ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد کو توڑتے ہیں، اور جن تعلقات و روابط کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے یہ لوگ اُن کو توڑتے ہیں، جس کا نتیجہ زمین میں فساد پھیلانا ہوتا ہے۔

بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا اس لفظ کے معنی یہ ہیں کہ مچھر ہو یا اس سے بھی زیادہ اس جگہ زیادہ سے مراد یہ ہو کہ حقارت میں زیادہ ہو۔ (مظہری)

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا، قرآن اور اس کی مثالوں کے ذریعہ بہت سی مخلوق کو ہدایت کرنا تو ظاہر ہے، مگر اس کے ذریعہ بہت سے لوگوں کو گمراہ کرنے کا مطلب یہ ہو کہ جس طرح یہ قرآن اس کے ماننے والوں اور اس پر عمل کرنے والوں کے لئے ذریعۂ ہدایت ہے اسی طرح اس کا انکار کرنے والوں اور مخالفت کرنے والوں کے لئے ذریعۂ گمراہی بھی ہے۔

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۔ فاسقین، فسق کے لفظی معنی خروج اور باہر نکل جانے کے ہیں، اصطلاحِ شرع میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکل جانے کو فسق کہتے ہیں، اور اطاعتِ الٰہیہ سے نکل جانا کفر و انکار کے ذریعہ بھی ہوتا ہے، اور عملی نافرمانی کے ذریعہ بھی، اس لئے لفظ فاسق کافر کے لئے بھی بولا جاتا ہے، قرآن کریم میں بیشتر لفظ فاسقین کافروں ہی کے لئے استعمال ہوا ہے، اور مؤمن گناہگار کو بھی فاسق کہا جاتا ہے، فقہاء کی اصطلاح میں عموماً لفظ فاسق اسی معنی کیلئے استعمال ہوا ہو انکی اصطلاح میں فاسق کو کافر کے بالمقابل اس کی قسیم قرار دیا گیا ہے، جو شخص کسی کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرے اور پھر اس سے توبہ بھی نہ کرے، یا صغیرہ گناہ پر اصرار کرے، اس کی عادت بنالے وہ فقہاء کی اصطلاح میں فاسق کہلاتا ہے، (مظہری) اور جو شخص یہ فسق کے کام اور گناہ علانیہ جرأت کے ساتھ کرتا پھرے اس کو فاجر کہا جاتا ہے۔

معنیٰ آیت کے یہ ہیں کہ قرآن کی ان مثالوں سے بہت سے لوگوں کو ہدایت ہوتی ہے، اور بہت سے لوگوں کے حصہ میں گمراہی آتی ہے، مگر ان مثالوں سے گمراہی صرف انہی لوگوں کا حصہ ہوتا ہے جو فاسق یعنی اطاعتِ خداوندی سے نکل جانے والے ہیں، اور جن میں کچھ بھی خدا تعالیٰ کا خوف ہوتا ہو وہ تو ہدایت ہی حاصل کرتے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ، عہد اس صورتِ معاملہ اور معاہدے کو کہا جاتا ہے جو دو شخصوں کے درمیان طے ہو جائے، اور میثاق ایسے معاہدے کو کہتے ہیں

جو قسم کے ساتھ مضبوط و مستحکم کیا جائے۔

اس آیت میں پہلی آیت کے مضمون کی مزید تشریح ہے اور منکرینِ قرآن کے انجامِ بد کا ذکر ہے کہ قرآن کی ان مثالوں سے جن پر مشرکین نے اعتراض کیا ہے صرف وہی لوگ گمراہ ہوتے ہیں جو حق تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری سے سرکشی کرتے ہیں، جس کی دو وجہ ہیں:

اوّل یہ کہ ایسا کرنے والے اُس ازلی معاہدے کو توڑ ڈالتے ہیں جو تمام انسانوں نے اپنے رب سے باندھا تھا، جبکہ تمام انسانوں کی اس عالم میں پیدائش سے پہلے حق تعالیٰ نے تمام پیدا ہونیوالے انسانوں کی ارواح کو جمع کرکے ایک سوال فرمایا تھا کہ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ "یعنی کیا میں تمہارا رب اور پروردگار نہیں ہوں؟" اُس پر سب نے یک زبان ہو کر کہا تھا بَلٰى "یعنی آپ رب کیوں نہ ہوتے" جس میں بڑی تاکید کے ساتھ اس کا اقرار ہے کہ اللہ جل شانہ ہمارے رب اور پروردگار ہیں، اور اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ہم اس کی اطاعت سے سرِمُو تجاوز نہ کریں، اس لئے یہ عہدِ ازلی انسان اور اللہ جل شانہٗ کے درمیان ہو چکا، اب دنیا میں پیدا ہونے کے بعد تمام انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں اسی عہد کی تجدید اور یاددہانی اور اس پر عمل کی تفصیلات بتلانے کے لئے آتے ہیں، جس نے اس معاہدے ہی کو توڑ ڈالا، اس سے کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ کسی پیغمبرؑ یا آسمانی کتاب سے فائدہ اٹھائے؟

دوسری وجہ یہ کہ ان لوگوں نے اُن تمام تعلقات کو قطع کر ڈالا ہے جن کو جوڑے رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا، ان تعلقات میں وہ تعلق بھی داخل ہے جو بندے اور اللہ کے درمیان ہے، اور وہ تعلق بھی جو انسان کا اپنے ماں باپ اور دوسرے عزیزوں سے ہے، اور وہ تعلق بھی جو ایک انسان کا اپنے پڑوسی اور دوسرے شرکار کار کے ساتھ ہے، اور وہ تعلق بھی جو عام مسلمانوں یا عام انسانوں کے ساتھ ہے، ان تمام تعلقات کے پورے حقوق ادا کرنے ہی کا نام اسلام، یا شریعتِ اسلام ہے، اور انہی میں کوتاہی کرنے سے ساری زمین میں فساد آتا ہے، اسی لئے اس جملے کے بعد فرمایا وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ، "یعنی یہ لوگ زمین میں فساد مچاتے ہیں،" آخر آیت میں ان کے انجامِ بد کا ذکر فرمایا کہ یہ لوگ بڑے خسارے میں ہیں۔

مثال میں کسی حقیر و ذلیل یا شرمناک چیز کا ذکر کرنا کوئی عیب نہیں ہے

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ سے ثابت ہوا کہ کسی مفید مضمون کی توضیح میں کسی حقیر ذلیل یا شرمناک چیز کا ذکر کرنا نہ کوئی عیب و گناہ ہے، اور نہ قائل کی عظمتِ شان کے منافی ہے، قرآن و سنت اور علماءِ سلف کے اقوال میں بکثرت ایسی مثالیں بھی مذکور ہیں جو عرفاً شرمناک سمجھی جاتی ہیں، مگر قرآن و سنت نے اس عرفی شرم و حیاء کی پرواہ کئے بغیر اصل مقصد پر نظر رکھ کر ان مثالوں سے اجتناب گوارا نہیں کیا۔

یَنْقُضُوْنَ عَھْدَ اللّٰہِ سے ثابت ہوا کہ عہد و معاہدہ کی خلاف ورزی شدید گناہ ہے، جس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تمام نیکیوں سے محروم ہو جائے۔

تعلقات کے حقوق شرعیہ ادا کرنا واجب ہے، اس کے خلاف کرنا گناہ عظیم

وَیَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ سے معلوم ہوا کہ جن تعلقات کو قائم رکھنے کا شریعتِ اسلام نے حکم دیا ہے ان کا قائم رکھنا ضروری اور قطع کرنا حرام ہے، غور کیا جائے تو دین و مذہب نام ہی ان حدود و قیود کا ہے جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کے لئے مقرر کی گئی ہیں، اور اس عالم کا صلاح و فساد انھیں تعلقات کو درست رکھنے یا توڑنے پر موقوف ہے، اسی لئے ان تعلقات کے قطع کرنے کو یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ کے الفاظ میں وجہِ فسادِ عالم بتلایا ہے۔

اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ میں خسارۂ اصلی اسی شخص کو قرار دیا ہے جو مذکورہ احکام کی خلاف ورزی کرے، اس میں اشارہ ہے کہ اصل خسارہ اور نقصان آخرت ہی کا ہے، دنیا کا خسارہ کوئی قابلِ توجہ چیز نہیں۔

کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَکُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ

کس طرح کافر ہوتے ہو خدائے تعالیٰ سے حالانکہ تم بے جان تھے پھر جلایا تم کو پھر ماریگا تم کو

ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾ ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی

پھر جلائے گا تم کو پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے، وہی ہے جس نے پیدا کیا تمھارے واسطے جو

الْاَرْضِ جَمِیْعًا ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰھُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ

کچھ زمین میں ہے سب پھر قصد کیا آسمان کی طرف سو ٹھیک کر دیا اُن کو سات آسمان

وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۹﴾ ع ۳

اور خدا تعالیٰ ہر چیز سے خبردار ہے۔

خلاصۂ تفسیر

بھلا کیوں کر ناشکری کرتے ہو اللہ کے ساتھ (کہ اس کے احسانات کو بھلا دیتے ہو، اور غیروں کا کلمہ پڑھتے ہو) حالانکہ (اس پر دلائلِ واضحہ قائم ہیں کہ صرف ایک اللہ ہی مستحقِ عبادت ہے

مثلاً یہ کہ) تھے تم بے جان (یعنی نطفہ میں جان پڑنے سے پہلے) سو تم کو جاندار کیا پھر تم کو موت دیں گے پھر زندہ کریں گے (یعنی قیامت کے دن) پھر انہی کے پاس لے جائے جاؤ گے (یعنی میدانِ قیامت میں حساب کتاب کے لئے حاضر کئے جاؤ گے) وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے فائدہ کے لئے جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے سب کا سب (یہ فائدہ عام ہے کھانے پینے کا ہو یا پہننے اور برتنے کا یا نکاح اور روح کو تازگی بخشنے کا، اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جس سے انسان کو فائدہ نہ پہونچتا ہو، اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر چیز کا ہر استعمال حلال ہو، جیسے سمیاتِ قاتلہ بھی فائدۂ انسان سے خالی نہیں، مگر اُن کا کھالینا عقلاء کے نزدیک ممنوع ہے) پھر توجہ فرمائی آسمان کی طرف (یعنی اس کی تخلیق و تکمیل کی طرف) تو درست کرکے بنا دیئے ان کو سات آسمان اور وہ تو سب چیزوں کے جاننے والے ہیں ؛

معارف و مسائل

ربط آیات پچھلی آیتوں میں خدا تعالیٰ کے وجود، توحید اور رسالت کے دلائلِ واضحہ اور منکرین و مخالفین کے خیالاتِ باطلہ کا رَد مذکور تھا، مذکورہ دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے احسانات اور انعامات کا ذکر کرکے اس پر اظہارِ تعجب کیا گیا ہے کہ اتنے احسانات کے ہوتے ہوتے کیسے یہ ظالم کفر و انکار میں مبتلا ہیں جس میں اس پر تنبیہ ہو کہ اگر دلائل میں غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے تو کم از کم محسن کا احسان ماننا، اس کی تعظیم و اطاعت کرنا تو ہر شریف انسان کا طبعی اور فطری تقاضا ہے، اسی راستے سے تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر آجاؤ۔

پہلی آیت میں اُن مخصوص نعمتوں کا ذکر ہے جو ہر انسان کی ذات اور نفس کے اندر موجود ہیں کہ پہلے وہ بے جان ذرّات کی صورت میں تھا، پھر اس میں اللہ تعالیٰ نے زندگی پیدا فرمائی،

دوسری آیت میں اُن عام نعمتوں کا ذکر ہے جن سے انسان اور تمام مخلوقات فائدہ اٹھاتی ہیں، اور وہ انسان کی زندگی اور بقاء کے لئے ضروری ہیں، ان میں پہلے زمین اور اس کی پیداوار کا ذکر کیا گیا، جس سے انسان کا قریبی تعلق ہے، پھر آسمانوں کا ذکر کیا گیا جن کے ساتھ زمین کی حیات اور پیداوار وابستہ ہے۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ (کیسے اللہ کا انکار کرتے ہو) ان لوگوں نے اگرچہ بظاہر خدا کا انکار نہیں کیا، مگر رسولِ خدا کے انکار کو خدا ہی کا انکار قرار دے کر ایسا خطاب کیا گیا ہے۔

كُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ، اموات، میّت کی جمع ہے، مُردہ اور بے جان چیز کو کہا جاتا ہے، مراد یہ ہو کہ انسان اپنی اصل حقیقت پر غور کرے تو معلوم ہوگا کہ اس کے وجود کی ابتداء وہ بیجان ذرّات ہیں، جو کچھ منجمد چیزوں کی شکل میں کچھ بہنے والی چیزوں میں کچھ غذاؤں کی صورت میں تمام دنیا میں پھیلے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے اُن بے جان ذرّات کو کہاں کہاں سے جمع فرمایا، پھر اُن میں جان ڈالی، ان کو زندہ انسان بنا دیا، یہ اس کی ابتداء پیدائش کا ذکر ہے۔

ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ " یعنی جس نے پہلی مرتبہ تمھارے بے جان ذرّات کو جمع کرکے اُن میں جان پیدا کی، وہ اس عالم میں تمھاری عمر کا مقررہ وقت پورا ہونے کے بعد پھر تمھیں موت دے گا، اور پھر ایک عرصہ کے بعد قیامت میں اسی طرح تمھارے جسم کے بے جان اور منتشر ذرّات کو جمع کرکے تمھیں زندہ کرے گا" اس طرح ایک موت یعنی بے جان ہونا تمھاری ابتداء میں تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے تمھیں زندہ کیا، دُوسری موت دنیا کی پوری عمر ہونے کے وقت اور دوسری زندگی قیامت کے روز ہوگی۔

پہلی موت اور زندگی کے درمیان چونکہ کوئی فاصلہ نہ تھا، اس لئے اس میں حرف فاء استعمال کیا گیا، فَأَحْيَاكُمْ ، اور چونکہ دنیا کی حیات اور موت کے درمیان اور اسی طرح اُس موت اور قیامت کی زندگی کے درمیان خاصا فاصلہ تھا، اس لئے وہاں لفظ ثُمَّ اختیار کیا گیا، ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ - کیونکہ لفظ ثُمَّ بُعدِ مدّت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ط " یعنی پھر تم اُسی ذات پاک کی طرف پھر کر جاؤ گے" اس سے مراد حشر و نشر اور قیامت کا وقت ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اُس انعام و احسان کا ذکر کیا ہو جو ہر انسان کی اپنی ذات سے متعلق ہے، اور جو سارے انعامات و احسانات کا مدار ہے، یعنی زندگی، دنیا و آخرت اور زمین و آسمان کی جتنی نعمتیں انسان کو حاصل ہیں وہ سب اِسی زندگی پر موقوف ہیں، زندگی نہ ہو تو کسی نعمت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا، زندگی کا نعمت ہونا تو ظاہر ہے، مگر اس آیت میں موت کو بھی نعمتوں کی فہرست میں شمار اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ دنیا کی موت دروازہ ہے اُس دائمی زندگی کا جس کے بعد موت نہیں، اِس لحاظ سے یہ موت بھی ایک نعمت ہے۔

مسئلہ: آیت مذکورہ سے ثابت ہوا کہ :

جو شخص رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا منکر ہو، یا قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کا منکر ہو وہ اگرچہ بظاہر خدا کے وجود و عظمت کا انکار نہ کرے مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ منکرینِ خدا ہی کی فہرست میں شمار ہے۔

حیاتِ برزخی اس آیت میں دنیا کی زندگی اور موت کے بعد صرف ایک حیات کا ذکر ہے، جو قیامت کے روز ہونے والی ہے، قبر کی زندگی جس کے ذریعہ قبر کا سوال وجواب اور قبر میں ثواب وعذاب ہونا قرآن کریم کی متعدد آیات اور حدیث کی متواتر روایات سے ثابت ہو اس کا ذکر نہیں۔

وجہ یہ ہے کہ یہ برزخی زندگی اُس طرح کی زندگی نہیں ہو جو انسان کو دنیا میں حاصل ہے، یا آخرت میں پھر ہوگی، بلکہ ایک درمیانی صورت مثل خواب کی زندگی کے ہے، اس کو دنیا کی زندگی کا تکملہ بھی کہا جا سکتا ہے، اور آخرت کی زندگی کا مقدمہ بھی، اس لئے کوئی مستقل زندگی نہیں، جس کا جداگانہ ذکر کیا جائے۔

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا، "اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے، سب کا سب"، یہ اُس نعمتِ عامہ کا ذکر ہو جس میں تمام انسان بلکہ حیوانات وغیرہ بھی شریک ہیں، اور ایک لفظ میں اُن تمام نعمتوں کا اجمال آ گیا، جو دنیا میں کسی انسان کو حاصل ہوئیں یا ہو سکتی ہیں کیونکہ انسان کی غذا، لباس، مکان، اور دوا اور راحت کے کُل سامان زمین ہی کی پیداوار ہیں۔

ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ۝

استواء کے لفظی معنی سیدھا ہونے کے ہیں، مراد یہ ہے کہ زمین کی پیدائش کے بعد اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کی تخلیق کا قصد راست فرمایا جس میں کوئی حائل اور مانع نہ ہو سکے، یہاں تک کہ سات آسمانوں کی تخلیق مکمل فرما دی، اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے، اس لئے تخلیقِ کائنات اس کے لئے کوئی مشکل کام نہیں۔

دنیا کی ہر چیز نفع بخش ہے کوئی شے بیکار نہیں اس آیت میں زمین کی تمام چیزوں کو انسان کے لئے پیدا فرمانے کا بیان ہوا ہے:

اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جس سے انسان کو کسی نہ کسی حیثیت سے بلا واسطہ یا بالواسطہ فائدہ نہ پہونچتا ہو، خواہ یہ فائدہ دنیا میں استعمال کرنے کا ہو، یا آخرت کے لئے عبرت ونصیحت حاصل کرنے کا، بہت سی چیزوں کا فائدہ تو انسان محسوس کرتا ہے، اس کی غذا یا دوا یا استعمال میں براہِ راست آتی ہیں، اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ انسان کو ان سے فائدہ پہونچتا ہی، مگر اس کو خبر بھی نہیں ہوتی، یہاں تک کہ جو چیزیں انسان کے لئے مضر سمجھی جاتی ہیں جیسے زہریلی اشیاء، زہریلے جانور وغیرہ، غور کریں تو وہ کسی نہ کسی حیثیت سے انسان کے لئے نفع بخش بھی ہوتی ہیں، جو چیزیں انسان کے لئے ایک طرح سے حرام ہیں دوسری کسی طرح اور حیثیت سے ان کا نفع بھی انسان کو پہنچتا ہے ؎

نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانے میں کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

عارف باللہ ابن عطاء نے اس آیت کے تحت فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات کو تمھارے واسطے اس لئے پیدا فرمایا کہ ساری کائنات تمھاری ہو اور تم اللہ کے لئے ہو، اس لئے عقلمند کا کام یہ ہے کہ جو چیز اسی کے لئے پیدا ہوئی ہے وہ تو اس کو ملے گی، اس کی فکر میں لگ کر اُس ذات سے غافل نہ ہو جس کے لئے یہ پیدا ہوا ہے۔ (بحر محیط)

اشیاءِ عالم میں اصل اباحت ہے یا حرمت

اس آیت سے بعض علماء نے اس پر استدلال کیا ہے کہ دنیا کی تمام چیزوں میں اصل یہ ہے کہ وہ انسان کے لئے حلال و مباح ہوں، کیونکہ وہ اسی کے لئے پیدا کی گئی ہیں، بجز اُن چیزوں کے جن کو شریعت نے حرام قرار دیدیا، اس لئے جب تک کسی چیز کی حرمت قرآن و سنت سے ثابت نہ ہو اس کو حلال سمجھا جائے گا۔

اس کے بالمقابل بعض علماء نے یہ قرار دیا کہ انسان کے فائدے کے لئے کسی چیز کے پیدا ہونے سے اس کا حلال ہونا ثابت نہیں ہوتا، اس لئے اصل اشیاء میں حرمت ہے، جب تک قرآن و سنت کی کسی دلیل سے جواز ثابت نہ ہو ہر چیز حرام سمجھی جائے گی۔

بعض حضرات نے توقّف فرمایا۔

تفسیر بحر محیط میں ابن حیانؒ نے فرمایا کہ صحیح یہ ہے کہ اس آیت میں اقوالِ مذکورہ میں سے کسی کے لئے حجت نہیں، کیونکہ خَلَقَ لَكُمْ میں حرف لام سببیت بتلانے کے لئے آیا ہے، کہ تمھارے سبب سے یہ چیزیں پیدا کی گئی ہیں، اس سے نہ انسان کے لئے اُن چیزوں کے حلال ہونے پر کوئی دلیل قائم ہو سکتی ہے نہ حرام ہونے پر، بلکہ حلال و حرام کے احکام جداگانہ قرآن و سنت میں بیان ہوئے ہیں انھیں کا اتباع لازم ہے۔

اس آیت میں زمین کی پیدائش پہلے اور آسمانوں کی پیدائش بعد میں ہونا بلفظ ثُمَّ بیان کیا گیا ہے، اور یہی صحیح ہے، اور سورۂ والنازعات میں جو یہ ارشاد ہے وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا (۷۹: ۳۰) "یعنی زمین کو آسمانوں کے پیدا کرنے کے بعد بچھایا" اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ زمین کی پیدائش آسمانوں کے بعد ہوئی ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین کی درستی اور اس میں سے پیداوار نکالنے وغیرہ کے تفصیلی کام آسمانوں کی پیدائش کے بعد ہوئے، اگرچہ اصل زمین کی تخلیق آسمانوں سے پہلے ہو چکی تھی (بحر محیط وغیرہ)

اس آیت سے آسمانوں کی تعداد سات ہونا ثابت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ علم ہیئت والوں کا آسمانوں کی تعداد نو بتلانا غلط، بے دلیل اور محض خیالات پر مبنی ہے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوٓا

اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو کہ میں بنانے والا ہوں زمین میں ایک نائب، کہا فرشتوں نے

اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ

کیا قائم کرتا ہے تو زمین میں اس کو جو فساد کرے اس میں اور خون بہائے اور ہم پڑھتے رہتے ہیں تیری خوبیاں

بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۭ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۳۰ وَ

اور یاد کرتے ہیں تیری پاک ذات کو، فرمایا بے شک مجھ کو معلوم ہے جو تم نہیں جانتے ، اور

عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاۗءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰۗىِٕكَةِ ۙ فَقَالَ

سکھلا دیئے اللہ نے آدمؑ کو نام سب چیزوں کے پھر سامنے کیا اُن سب چیزوں کو فرشتوں کے، پھر فرمایا

اَنْۢبِـُٔــوْنِىْ بِاَسْمَاۗءِ هٰٓؤُلَاۗءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۳۱ قَالُوْا

بتاؤ مجھ کو نام ان کے اگر تم سچّے ہو ، بولے

سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝۳۲

پاک ہے تو ہم کو معلوم نہیں مگر جتنا تونے ہمکو سکھلایا بیشک تو ہی ہے اصل جاننے والا حکمت والا ،

قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَاۗىِٕهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَھُمْ بِاَسْمَاۗىِٕهِمْ ۙ

فرمایا اے آدم بتادے فرشتوں کو اُن چیزوں کے نام پھر جب بتادیئے اس نے ان کے نام

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ

فرمایا کیا نہ کہا تھا میں نے تم کو کہ میں خوب جانتا ہوں چھپی ہوئی چیزیں آسمانوں کی اور زمین کی اور جانتا ہوں

مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝۳۳

جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو ۔

خُلاصۂ تفسیر

اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے (تاکہ وہ اپنی رائے ظاہر کریں جس میں حکمت و مصلحت تھی مشورہ کی حاجت سے تو حق تعالیٰ بالا و برتر ہیں، غرض اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ) ضرور میں بناؤں گا زمین میں ایک نائب (یعنی وہ میرا نائب ہوگا کہ اپنے احکامِ شرعیہ کے اجراء و نفاذ کی خدمت اس کے سپرد کروں گا) کہنے لگے کیا آپ پیدا

کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جو فساد کریں گے اس میں اور خوں ریزیاں کریں گے اور ہم برابر تسبیح کرتے رہتے ہیں بحمد اللہ اور آپ کی پاکی بیان کرتے رہتے ہیں (فرشتوں کی یہ گذارش نہ بطور اعتراض اور نہ اپنا استحقاق جتانے کے لئے، بلکہ فرشتوں کو کسی طرح یہ معلوم ہوگیا تھا کہ جو نئی مخلوق زمین سے بنائی جائے گی ان میں نیک و بد ہر طرح کے لوگ ہوں گے، بعض لوگ اس نیابت کے کام کو اور زیادہ خراب کریں گے، اس لئے نیازمندانہ عرض کیا کہ ہم سب کے سب ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں، اور گروہ ملائکہ میں کوئی گناہ کرنے والا بھی نہیں، اس لئے کوئی نیا عملہ بڑھانے اور نئی مخلوق پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، خصوصاً جبکہ اس نئی مخلوق میں یہ بھی احتمال ہے کہ وہ آپ کی مرضی کے خلاف کام کریں گے جس سے آپ ناخوش ہوں، ہم ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں اور ہماری خدمت آپ کی مرضی کے مطابق ہی ہوگی) حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میں جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم نہیں جانتے (یعنی جو چیز تمہاری نظر میں تخلیقِ بنی آدم سے مانع ہے کہ ان میں بعض فساد بھی پھیلائیں گے وہی چیز درحقیقت ان کی تخلیق کا اصلی سبب ہے، کیونکہ اجراءِ احکام و انتظام تو جبھی وقوع میں آسکتا ہے جب کوئی اعتدال سے تجاوز کرنے والا بھی ہو، یہ مقصود تم فرمانبرداروں کے جمع ہونے سے پورا نہیں ہوسکتا، اور اعتدال سے تجاوز کر جانے والی ایک مخلوق جنّات پہلے سے موجود تھی، اس سے یہ کام کیوں نہ لیا گیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کام کے لئے موزوں وہ مخلوق ہوسکتی ہے جن میں شر و فساد کا عنصر موجود تو ہو مگر غالب نہ ہو، جنات میں یہ عنصر غالب تھا، اس لئے تخلیقِ آدم کی تجویز فرمائی، آگے اسی حکمتِ الٰہیہ کی مزید توضیح اس طرح کی گئی کہ نیابتِ خداوندی کے لئے ایک خاص علم کی ضرورت ہے، وہ علم ملائکہ کی استعداد سے خارج ہے، اس لئے فرمایا کہ) اور علم دیدیا اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو (ان کو پیدا کرکے) سب چیزوں کے اسماء کا (یعنی سب چیزوں کے نام اور ان کے خواص و آثار سب کا علم آدمؑ کو دیدیا گیا) پھر وہ چیزیں فرشتوں کے روبرو کردیں پھر فرمایا کہ بتلاؤ مجھ کو اسماء ان چیزوں کے (یعنی مع ان کے آثار و خواص کے) اگر تم سچے ہو (یعنی اپنے اس قول میں سچے ہو کہ ہم خلافتِ ارضی کا کام اچھا انجام دے سکیں گے) فرشتوں نے عرض کیا کہ آپ تو پاک ہیں (اس الزام سے کہ آدم علیہ السلام پر اس علم کو ظاہر فرمادیا ہم سے پوشیدہ رکھا کیونکہ کسی آیت یا روایت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ آدم علیہ السلام کو علمِ اسماء کی تعلیم فرشتوں سے الگ کرکے دی گئی، اس سے ظاہر یہ ہے کہ تعلیم تو سب کے سامنے یکساں دی گئی مگر آدم علیہ السلام کی فطرت میں اس علم کے حاصل کرلینے کی صلاحیت تھی انھوں نے حاصل کرلیا، فرشتوں کی طبیعت اس کی متحمل نہ تھی ان کو یہ علم حاصل نہ ہوا) مگر ہم کو ہی علم نہیں مگر وہی جو کچھ آپ نے ہم کو علم دیا

۱۱

بیشک آپ بڑے علم والے ہیں حکمت والے ہیں (کہ جس قدر جس کے لئے مصلحت جانا اسی قدر علم و فہم اس کو عطا فرمایا، اس سے فرشتوں کا یہ اعتراف تو ثابت ہوگیا کہ وہ اُس کام سے عاجز ہیں جو نائب کے سپرد کرنا ہے، آگے حق تعالیٰ کو یہ منظور ہوا کہ آدم علیہ السلام میں اس علم خاص کی مناسبت کو فرشتوں کے سامنے آشکارا فرما دیں، اس لئے) حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے آدم تم بتلا دو ان کو ان چیزوں کے اسماء (یعنی مع حالات و خواص کے جب آدم علیہ السلام نے یہ سب فرشتوں کے روبرو بتلا دیا تو فرشتے اتنا سمجھ گئے کہ آدم علیہ السلام اس علم کے ماہر ہوگئے ہیں) سو جب بتلا دیئے اُن کو آدم علیہ السلام نے اُن چیزوں کے اسماء تو حق تعالیٰ نے فرمایا (دیکھو) میں تم سے نہ کہتا تھا کہ بیشک میں جانتا ہوں تمام پوشیدہ چیزیں آسمانوں کی اور زمین کی اور جانتا ہوں جس بات کو ظاہر کر دیتے ہو اور جس کو دل میں رکھتے ہو۔

معارف و مسائل

ربطِ آیات پچھلی آیات میں اللہ جل شانہٗ کی خاص و عام نعمتوں کا ذکر کر کے انسان کو ناشکری اور نافرمانی سے بچنے کی ہدایت کی گئی،

اس آیت سے آخر رکوع تک دس آیتوں میں آدم علیہ السلام کا قصہ بھی اسی سلسلہ میں ذکر فرمایا ہے، کیونکہ نعمت دو قسم کی ہوتی ہے، ایک صوری یعنی محسوس، جیسے کھانا، پینا، روپیہ پیسہ، مکان جائداد دوسری معنوی، جیسے عزت و آبرو، مسرت، علم، پچھلی آیات میں صوری اور ظاہری نعمتوں کا ذکر تھا، اور ان گیارہ آیتوں میں معنوی نعمتوں کا ذکر ہے، کہ ہم نے تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو دولتِ علم دی، اور مسجودِ ملائکہ بنانے کی عزت دی، اور تم کو ان کی اولاد میں ہونے کا فخر عطا کیا۔

خلاصۂ مضمون آیت کا یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے جب تخلیقِ آدمؑ اور دنیا میں اس کی خلافت قائم کرنے کا ارادہ کیا، تو فرشتوں سے بظاہر ان کا امتحان لینے کے لئے اس ارادے کا ذکر فرمایا، جس میں اشارہ یہ تھا کہ وہ اس معاملے میں اپنی رائے کا اظہار کریں، فرشتوں نے رائے یہ پیش کی کہ انسانوں میں تو ایسے لوگ بھی ہوں گے جو فساد اور خوں ریزی کریں گے، اُن کو زمین کی خلافت اور انتظام سپرد کرنا سمجھ میں نہیں آتا، اس کام کے لئے تو فرشتے زیادہ انسب معلوم ہوتے ہیں، کہ

نیکی ان کی فطرت ہے، بُرائی کا صدور ہی اُن سے ممکن نہیں، وہ مکمل اطاعت گذار ہیں، دنیا کے انتظامات بھی وہ درست کرسکیں گے، اللہ تعالیٰ نے ان کی رائے کے غلط ہونے کا اظہار اوّل ایک حاکمانہ طرز سے دیا کہ خلافتِ ارضی کی حقیقت اور اس کی ضروریات سے تم واقف نہیں، اس کو میں ہی مکمل طور پر جانتا ہوں۔

پھر دوسرا جواب حکیمانہ انداز سے آدم علیہ السلام کی فرشتوں پر ترجیح، اور مقامِ علم میں آدمؑ کے تفوّق کا ذکر کرکے دیا گیا، اور بتلایا گیا کہ خلافتِ ارض کے لئے زمینی مخلوقات کے نام اور اُن کے خواص و آثار کا جاننا ضروری ہے اور فرشتوں کی استعداد اس کی متحمل نہیں۔

تخلیقِ آدم کی گفتگو فرشتوں سے کس مصلحت پر مبنی تھی

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ حضرت حق جلّ وعلا شانہٗ کا فرشتوں کی مجلس میں اس واقعہ کا اظہار کس حیثیت سے تھا؟ کیا اُن سے مشورہ لینا مقصود تھا؟ یا محض ان کو اطلاع دینا پیشِ نظر تھا؟ یا فرشتوں کی زبان سے اُن کی رائے کا اظہار کرانا اس کا منشاء تھا؟

سو یہ بات ظاہر ہے کہ مشورہ کی ضرورت تو وہاں پیش آتی ہے جہاں مسئلہ کے سب پہلو کسی پر روشن نہ ہوں، اور اپنے علم و بصیرت پر مکمل اطمینان نہ ہو، اس لئے دوسرے عقلاء و اہلِ دانش سے مشورہ کیا جاتا ہے، یا ایسی صورت میں جہاں حقوق دوسروں کے بھی مساوی ہوں تو اُن کی رائے لینے کے لئے مشورہ ہوتا ہے، جیسے دنیا کی عام کونسلوں میں رائج ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ یہاں دونوں صورتیں نہیں ہوسکتیں، اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ خالقِ کائنات ہیں، ذرہ ذرہ کا علم رکھتے ہیں اور ظاہر و باطن ہر چیز اُن کے علم و بصر کے سامنے برابر ہے، اُن کو کیا ضرورت کہ کسی سے مشورہ لیں؟

اسی طرح یہاں یہ بھی نہیں کہ کوئی پارلیمانی حکومت ہو، جس میں تمام ارکان کے مساوی حقوق ہیں، اور سب سے مشورہ لینا ضروری ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی سب کے خالق اور مالک ہیں، فرشتے ہوں یا جنّ و انس سب اُن کی مخلوق و مملوک ہیں، کسی کو حق نہیں کہ اُن کے کسی فعل کے متعلق سوال بھی کرسکے کہ آپ نے یہ کیوں کیا اور فلاں کام کیوں نہیں کیا، لَا یُسْـَٔلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُمْ یُسْـَٔلُوْنَ ٥ (۲۱: ۲۳)

(اللہ تعالیٰ سے اس کے کسی فعل کے متعلق سوال نہیں کیا جاسکتا اور سب سے ان کے اعمال کا سوال کیا جائے گا)

بات یہی ہو کہ درحقیقت یہاں مشورہ لینا مقصود نہیں اور نہ اُس کی ضرورت ہے، مگر صورت مشورہ کی بنائی گئی، جس میں مخلوق کو سنتِ مشورہ کی تعلیم کا فائدہ ہوسکتا ہے، جیسے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابۂ کرامؓ سے مشورہ لینے کی ہدایت قرآن میں فرمائی گئی، حالانکہ آپؐ تو صاحبِ وحی ہیں، تمام معاملات اور اُن کے تمام پہلو آپؐ کو بذریعہ وحی بتلائے جاسکتے تھے،

مگر آپ کے ذریعہ مشورہ کی سنت جاری کرنے اور امت کو سکھانے کے لئے آپ کو بھی مشورے کی تاکید فرمائی گئی۔

غرض فرشتوں کی مجلس میں اس واقعہ کے اظہار سے ایک فائدہ تو تعلیمِ مشورہ کا حاصل ہوا (کمافی روح البیان) دوسرا فائدہ خود الفاظِ قرآنی کے اشارہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی پیدائش سے پہلے فرشتے یہ سمجھتے تھے کہ ہم سے زیادہ افضل و اعلم کوئی مخلوق اللہ تعالیٰ پیدا نہیں کریں گے۔

اور تفسیر ابن جریر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک روایت میں اس کی تصریح بھی ہے کہ خِلقتِ آدم علیہ السلام سے پہلے فرشتے آپس میں کہتے تھے کہ: لَنْ یَّخْلُقَ اللّٰہُ خَلْقًا اَکْرَمَ عَلَیْہِ مِنَّا وَلَا اَعْلَمَ (یعنی اللہ تعالیٰ کوئی مخلوق ہم سے افضل اور اعلم پیدا نہ فرماویں گے) حضرت حق جل شانہٗ کے علم میں تھا کہ ایک ایسی مخلوق بھی پیدا کرنا ہے جو تمام مخلوقات سے زیادہ افضل و اعلم ہوگی، اور جس کو اپنی خلافت و نیابت کا خلعت عطا کیا جائے گا۔

اس لئے فرشتوں کی مجلس میں آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے اور زمین کے نائب بنانے کا ذکر کیا گیا کہ وہ اپنے خیال کا اظہار کریں۔

چنانچہ فرشتوں نے اپنے علم و بصیرت کے مطابق نیازمندی کے ساتھ رائے کا اظہار کیا کہ جس مخلوق کو آپ خلیفۂ زمین بنا رہے ہیں، اس میں تو شر و فساد کا مادّہ بھی ہے، وہ دوسروں کی اصلاح اور زمین میں امن و امان کا انتظام کیسے کرسکتا ہے، جبکہ وہ خود خوں ریزی کا بھی مرتکب ہوگا، اس کے بجائے آپ کے فرشتوں میں شر و فساد کا کوئی مادّہ نہیں، وہ خطاؤں سے معصوم ہیں، اور ہر وقت آپ کی تسبیح و تقدیس اور عبادت و اطاعت میں لگے ہوتے ہیں، وہ بظاہر اس خدمت کو اچھی طرح انجام دے سکتے ہیں۔

غرض اس سے معاذ اللہ حضرت حق جل شانہٗ کے فعل پر اعتراض نہیں، کیونکہ فرشتے ایسے خیالات و حالات سے معصوم ہیں، بلکہ مقصد محض دریافت کرنا تھا، کہ ایک ایسی معصوم جماعت کے موجود ہوتے ہوئے دوسری غیر معصوم مخلوق پیدا کرکے یہ کام اُس کے حوالے کرنا اور اس کو ترجیح دینا کس حکمت پر مبنی ہے؟

چنانچہ اس کے جواب میں پہلے تو حق تعالیٰ نے اجمالی طور پر یہ فرمایا کہ: اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ، یعنی تم خلافتِ الٰہیہ کی حقیقت اور اس کے لوازم سے واقف نہیں، اس لئے یہ سمجھ رہے ہو کہ ایک معصوم مخلوق ہی اس کو انجام دے سکتی ہے، اس کی پوری حقیقت کو ہم ہی جانتے ہیں۔

اس کے بعد فرشتوں کو اس کا کچھ تفصیلی علم کرانے کے لئے ایک خاص واقعہ کا اظہار کیا گیا کہ تمام کائناتِ عالم کے نام اور ان کے خواص و آثار جن کے علم کی صلاحیت صرف آدم علیہ السلام ہی میں ودیعت کی گئی تھی، فرشتوں کی فطرت و جبلّت اس کے مناسب نہ تھی، وہ سب آدم علیہ السلام کو سکھائے اور بتلائے گئے تھے، مثلاً دنیا کی نافع و مضر چیزیں اور ان کے خواص و آثار، ہر جاندار اور ہر قوم کے مزاج و طبائع اور ان کے آثار، ان چیزوں کے معلوم کرنے کے لئے طبیعت مَلَکی متحمل نہیں، فرشتہ کیا جانے کہ بھوک کیا ہوتی ہے، پیاس کی تکلیف کیسی ہوتی ہے، نفسانی جذبات کا کیا اثر ہوتا ہے، کسی چیز سے نشہ کس طرح پیدا ہوتا ہے، سانپ اور بچھو کا زہر کس بدن پر کیا اثر کرتا ہے۔

غرض زمینی مخلوقات کے نام اور خواص و آثار کی دریافت فرشتوں کے مزاج اور مخصوص طبیعت سے بالکل علیحدہ چیز تھی، یہ علم صرف آدمؑ ہی کو سکھلایا جا سکتا تھا، انہی کو سکھلایا گیا، پھر قرآن کی کسی تصریح یا اشارہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آدم علیہ السلام کو یہ تعلیم کسی تنہائی میں فرشتوں سے علیحدہ دی گئی، اس لئے ہو سکتا ہے کہ تعلیم سب کے لئے عام ہی ہو، مگر اس تعلیم سے فائدہ اٹھانا آدم علیہ السلام کی طبیعت میں تھا وہ سیکھ گئے، فرشتوں کی فطرت میں تھا وہ نہ سیکھ سکے، اسی لئے یہاں تعلیم کو آدمؑ کی طرف منسوب کیا گیا، اگرچہ یہ تعلیم فی نفسہٖ عام تھی، آدمؑ اور ملائکہ دونوں کو شامل تھی، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ظاہری تعلیم کی صورت ہی عمل میں نہ آئی ہو، بلکہ آدم علیہ السلام کی فطرت میں اُن چیزوں کا علم ابتداءِ آفرینش سے ودیعت کر دیا گیا ہو، جیسے بچہ ابتداءِ ولادت میں ماں کا دُودھ پینا جانتا ہے، بطخ کا بچہ تیرنا جانتا ہے، اس میں کسی ظاہری تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اب رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تو سب کچھ ہے، وہ فرشتوں کا مزاج اور طبیعت بدل کر اُن کو بھی یہ چیزیں سکھا سکتے تھے، تو اُن کو کیوں نہ سکھایا گیا؟ مگر اس کا حاصل تو یہ ہوا کہ فرشتوں کو ہی انسان کیوں نہ بنا دیا، کیونکہ اگر فرشتوں کی جبلّت و فطرت کو بدلا جاتا تو پھر وہ فرشتے نہ رہتے، بلکہ انسان ہی ہو جاتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ زمینی مخلوقات کے اسماء اور اُن کے خواص و آثار کا آدم علیہ السلام کو علم دیا گیا، جو فرشتوں کے بس کا نہیں تھا، اور پھر اُن مخلوقات کو فرشتوں کے سامنے کر کے سوال کیا گیا کہ اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ ہم سے زیادہ کوئی مخلوق اعلم و افضل پیدا نہیں ہوگی، یا یہ کہ زمین کی خلافت و نیابت کے لئے فرشتے بہ نسبت انسان کے زیادہ موزوں ہیں تو اُن چیزوں کے نام اور خواص بتلاؤ جن پر خلیفۂ زمین کو حکومت کرنا ہے۔

یہاں سے یہ فائدہ بھی حاصل ہوگیا کہ حاکم کے لئے ضروری ہو کہ اپنی محکوم رعایا کے مزاج وطبائع سے اور ان کے خواص وآثار سے پورا واقف ہو، اس کے بغیر وہ اُن پر عدل وانصاف کے ساتھ حکمرانی نہیں کرسکتا، جو شخص یہ نہیں جانتا کہ بھوک سے کیسی اور کتنی تکلیف ہوتی ہے، اگر اس کی عدالت میں کوئی دعویٰ کسیکو بھوکا رکھنے کے متعلق پیش ہو تو وہ اس کا فیصلہ کیا اور کس طرح کرے گا؟

غرض اسی واقعہ سے حق تعالیٰ نے فرشتوں کو یہ تبلادیا کہ زمین کی نیابت کے لئے معصوم ہونے کو دیکھنا نہیں، بلکہ اس کو دیکھنا ہے کہ وہ زمین کی چیزوں سے پورا واقف ہو، اُن کے استعمال کے طریقوں اور اُن کے ثمرات کو جانتا ہو، اگر تمھارا یہ خیال صحیح ہو کہ فرشتے اس خدمت کے لئے زیادہ موزوں ہیں، تو ان چیزوں کے نام اور خواص بتلاؤ۔

فرشتوں کا اظہار رائے چونکہ کسی اعتراض یا فخر وغرور یا اپنا استحقاق جتلانے کے لئے نہیں، بلکہ محض اپنے خیال کا اظہار ایک نیاز مند خادم کی طرح اپنی خدمات پیش کرنے کے لئے تھا، اس لئے فوراً بول اٹھے: سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝ (پاک ہیں آپ، ہم کو علم نہیں، مگر وہی جو آپنے عطا فرمایا، بے شک آپ بڑے علم وحکمت والے ہیں) جس کا حاصل اپنے خیال سے رجوع اور اس کا اقرار تھا کہ زیادہ اعلم وافضل مخلوق بھی موجود ہے، اور یہ کہ زمین کی نیابت کے لئے وہی موزوں ہیں۔

دوسرا سوال اس جگہ یہ ہو کہ فرشتوں کو اس کی کیسے خبر ہوئی کہ انسان خوں ریزی کرے گا، کیا انھیں علمِ غیب تھا؟ یا محض اٹکل اور تخمینہ سے انھوں نے یہ سمجھا تھا؟

اس کا جواب جمہورِ محققین کے نزدیک یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ہی ان کو انسان کے حالات اور اس کے ہونے والے معاملات بتلا دیئے تھے، جیسا کہ بعض آثار میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے آدم علیہ السلام کو خلیفہ زمین بنانے کا ذکر فرمایا، تو فرشتوں نے اللہ تعالیٰ ہی سے اس خلیفہ کا حال دریافت کیا، اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہی نے اُن کو بتلایا (روح المعانی) اس سے فرشتوں کو تعجب ہوا کہ جب انسان کا یہ حال ہے کہ وہ فساد وخوں ریزی بھی کرے گا تو اس کو نیابت زمین کے لئے منتخب فرمانا کس حکمت پر مبنی ہے۔

اسی کا ایک جواب تو حضرتِ حق جل شانہٗ کی طرف سے آدم علیہ السلام کے علمی تفوق کا اظہار فرما کر دیدیا گیا، اور فساد وخوں ریزی سے جو شبہ اس کے استحقاقِ نیابت پر کیا گیا تھا، اس کا جواب اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ میں اجمالاً دیدیا گیا، جس میں اشارہ ہے کہ جس چیز کو تم نیابت وخلافت کے منافی سمجھ رہے ہو درحقیقت وہ ہی اس کی اہلیت کا بڑا سبب ہے، کیونکہ نیابتِ زمین کی ضرورت ہی رفعِ فساد کے لئے ہے، جہاں فساد نہ ہو وہاں خلیفہ اور نائب

بھیجنے کی ضرورت ہی نہیں، غرض یہ تبلا دیا گیا کہ منشائے الٰہی یہ ہے کہ جس طرح اس نے ایک ایسی مقدس معصوم مخلوق فرشتے پیدا کر دیئے جس سے کسی گناہ خطاء کا صدور ہو ہی نہیں سکتا، اور جس طرح اس نے شیاطین پیدا کر دیئے جن میں نیکی اور بھلائی کی صلاحیت نہیں، اسی طرح ایک ایسی مخلوق بھی پیدا کرنا منشاء خداوندی ہے، جس میں خیر و شر نیکی اور بدی کا مخلوط مجموعہ ہو، اور جس میں خیر و شر کے دونوں جذبات ہوں، اور جو جذباتِ شر کو مغلوب کرکے خیر کے میدان میں آگے بڑھے، اور رضائے خداوندی کا خلعت حاصل کرے۔

واضعِ لغت خود حق تعالیٰ ہیں اس قصہ آدم علیہ السلام اور تعلیمِ اسماء کے واقعہ سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ زبان اور لغت کے اصل واضع خود حق سبحانہٗ وتعالیٰ ہیں، پھر اس میں مخلوق کے استعمالات سے مختلف صورتیں اور مختلف زبانیں پیدا ہو گئیں، امام اشعریؒ نے اسی آیت سے استدلال کرکے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہی کو واضع لغت قرار دیا ہے۔

آدم علیہ السلام کا تفوق فرشتوں پر اس واقعہ میں قرآن حکیم کے یہ بلیغ الفاظ بھی قابلِ نظر ہیں کہ جب فرشتوں کو خطاب کرکے فرمایا کہ ان چیزوں کے نام بتلاؤ تو لفظ اَنۡۢبِـُٔوۡنِىۡ ارشاد فرمایا کہ مجھے بتلاؤ، اور جب آدم علیہ السلام کو اسی چیز کا خطاب ہوا تو لفظ اَنۡۢبِئۡهُمۡ فرمایا گیا، یعنی آدم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ فرشتوں کو یہ اسماء بتلائیں۔

اس طرزِ بیان کے فرق سے واضح ہو گیا کہ آدم علیہ السلام کو معلّم کا درجہ دیا گیا، اور فرشتوں کو طالب علم کا، جس میں آدم علیہ السلام کی فضیلت وتفوق کا ایک اہم صورت سے اظہار کیا گیا ہے۔

اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فرشتوں کے علوم میں بھی کمی اور زیادتی ہو سکتی ہے کیونکہ جس چیز کا ان کو علم نہیں تھا، آدم علیہ السلام کے ذریعہ اُن کو بھی اُن چیزوں کا اجمالی طور پر کسی نہ کسی درجہ میں علم دیدیا گیا۔

خلافتِ ارض کا مسئلہ زمین کا انتظام اور اس میں خدا کا قانون نافذ کرنے کے لئے اس کی طرف سے کسی نائب کا مقرر ہونا، جو ان آیات سے معلوم ہوا، اس سے دستورِ مملکت کا اہم باب نکل آیا، کہ اقتدارِ اعلیٰ تمام کائنات اور پوری زمین پر صرف اللہ تعالیٰ کا ہے، جیسا کہ قرآن مجید کی بہت سی آیات اس پر شاہد ہیں: اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۶: ۵۷) اور لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (۲: ۱۰۷) اور اَلَا لَهُ الۡخَلۡقُ وَالۡاَمۡرُ (۷: ۵۴) وغیرہ زمین کے انتظام کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نائب آتے ہیں، جو باذنِ خداوندی زمین پر سیاست وحکومت اور بندگانِ خدائے تعالیٰ کی تعلیم وتربیت کا کام کرتے اور احکامِ الٰہیہ کو نافذ کرتے ہیں، اس خلیفہ ونائب کا تقرر بلا واسطہ خود حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اس میں کسی کے کسب عمل کا کوئی دخل

نہیں، اسی لئے پوری اُمّت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ نبوّت کسبی چیز نہیں، جس کو کوئی اپنی سعی و عمل سے حاصل کر سکے، بلکہ حق تعالیٰ ہی خود اپنے علم و حکمت کے تقاضے سے خاص خاص افراد کو اس کام کیلئے چُن لیتے ہیں، جن کو اپنا نبی و رسول یا خلیفہ و نائب قرار دیتے ہیں، قرآن حکیم نے جگہ جگہ اس کا اظہار فرمایا ہے، ارشاد ہے:

اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ۚ (۲۲ : ۷۵)	"اللہ تعالیٰ انتخاب کرلیتا ہے فرشتوں میں سے اپنے رسول کو اور انسانوں میں سے، بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا دیکھنے والا ہے"

نیز ارشاد ہے:

اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ ؕ (۶ : ۱۲۴)	"اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں کہ اپنی رسالت کس کو عطا فرما دیں"

یہ خلیفۃ اللہ بلاواسطہ حق تعالیٰ سے اس کے احکام معلوم کرتے، اور پھر اُن کو دنیا میں نافذ کرتے ہیں، یہ سلسلۂ خلافت و نیابتِ الٰہیہ کا آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک ہی انداز میں چلتا رہا، یہاں تک کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اس زمین پر اللہ تعالیٰ کے آخری خلیفہ ہو کر بہت ہی اہم خصوصیات کے ساتھ تشریف لائے۔

ایک خصوصیت یہ تھی کہ آپؐ سے قبل انبیاءؑ خاص خاص قوموں یا ملکوں کی طرف مبعوث ہوتے تھے، اُن کا حلقۂ حکومت و اختیار اُنہی قوموں اور ملکوں میں محدود ہوتا تھا، ابراہیم علیہ السلام ایک قوم کی طرف، لوطؑ علیہ السلام دوسری قوم کی طرف مبعوث ہوئے، حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام اور ان کے درمیان آنے والے انبیاءؑ بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زمین میں اللہ کے آخری خلیفہ ہیں اور آپؐ کی خصوصیات،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے عالم اور اس کی دونوں قوم جنّات و انسان کی طرف بھیجا گیا، آپؐ کا اختیار و اقتدار پوری دنیا کی دونوں قوموں پر حاوی فرمایا گیا، قرآن کریم نے آپؐ کی بعثت و نبوّت کے عام ہونے کا اعلان اس آیت میں فرمایا:

قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعَا ۨالَّذِیْ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ (۷ : ۱۵۸)	"آپؐ کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں اللہ کا رسول ہوں، تم سب کی طرف، اللہ وہ ذات ہے جس کے قبضہ میں ہے ملک آسمانوں اور زمین کا"

اور صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے تمام انبیاء

علیہم السلام پر چھ چیزوں میں خاص فضیلت بخشی گئی ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ کو تمام عالم کا نبی و رسول بنا کر بھیجا گیا۔

دوسری خصوصیت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ پچھلے انبیاء کی خلافت و نیابت جس طرح خاص خاص ملکوں اور قوموں میں محدود ہوتی تھی اسی طرح ایک خاص زمانے کے لئے مخصوص ہوتی تھی، اُس کے بعد دوسرا رسول آجاتا، تو پہلے رسول کی خلافت و نیابت ختم ہو کر آنے والے رسول کی خلافت قائم ہو جاتی تھی۔

ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے خاتم الانبیاءؑ بنا دیا، کہ آپ کی خلافت و نیابت قیامت تک قائم رہے گی، اُس کا زمانہ بھی کوئی مخصوص زمانہ نہیں، بلکہ جب تک زمین و آسمان قائم اور زمانہ کا وجود ہے وہ بھی قائم ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات و شریعت ایک زمانہ تک محفوظ رہتی اور چلتی تھی، رفتہ رفتہ اُس میں تحریفات ہوتے ہوئے وہ کالعدم ہو جاتی تھیں، اُس وقت کوئی دوسرا رسول اور دوسری شریعت بھیجی جاتی تھی۔

ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ کا دین آپ کی شریعت قیامت تک محفوظ رہے گی، قرآن مجید جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اس کے تو الفاظ اور معانی سب چیزوں کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لے لی، اور ارشاد فرمایا:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (۱۵ : ۹)	"ہم نے ہی قرآن نازل فرمایا اور ہم اس کے محافظ ہیں"

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ارشادات جن کو حدیث کہا جاتا ہے، اس کی حفاظت کا بھی اللہ تعالیٰ نے ایک خاص انتظام فرما دیا، کہ قیامت تک آپ کی تعلیمات اور ارشادات کو جان سے زیادہ عزیز سمجھنے والی ایک جماعت باقی رہے گی، جو آپ کے علوم و معارف اور آپ کے شرعی احکام صحیح صحیح لوگوں کو پہونچاتی رہے گی، کوئی اس جماعت کو مٹا نہ سکیگا اللہ تعالیٰ کی تائید غیبی اُن کے ساتھ رہے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کی کتابیں اور صحیفے سب مسخ و محرّف ہو جاتے، اور بالآخر دنیا سے گم ہو جاتے، یا غلط سلط باقی رہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی کتاب قرآن اور آپ کی بتلائی ہوئی ہدایات حدیث سب کی سب اپنے اصلی خد و خال کے ساتھ قیامت تک موجود و محفوظ رہیں گی، اسی لئے اس زمین پر آپ کے بعد نہ کسی نئے نبی اور رسول کی ضرورت ہے، نہ کسی اور خلیفۃ اللہ کی گنجائش۔

چوتھی خصوصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ پچھلے انبیاءؑ کی خلافت ونیابت جو محدود زمانے کے لئے ہوتی تھی، ہر نبی و رسول کے بعد دوسرا رسول منجانب اللہ مقرر ہوتا اور نیابت کا کام سنبھالتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نظامِ خلافت

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانۂ خلافت ونیابت تا قیامت ہے، اس لئے قیامت تک آپؐ ہی اس زمین میں خلیفۃ اللہ ہیں، آپؐ کی وفات کے بعد نظامِ عالم کیلئے جو نائب ہوگا وہ خلیفۃ الرسول اور آپکا نائب ہوگا، صحیح بخاری مسلم کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

كَانَتْ بَنُوْ إِسْرَائِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْأَنْبِيَاءُ كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ وَإِنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ وَسَيَكُوْنُ خُلَفَاءُ فَيَكْثُرُوْنَ	"بنی اسرائیل کی سیاست، و حکومت اُن کے انبیاء کرتے تھے، ایک نبی فوت ہوتا تو دوسرا نبیؑ آجاتا تھا، اور خبردار رہو کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں، ہاں میرے خلیفہ ہوں گے اور بہت ہوں گے،"

پانچویں خصوصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ آپؐ کے بعد آپؐ کی امّت کے مجموعے کو اللہ تعالیٰ نے وہ مقام عطا فرمایا جو انبیاء علیہم السلام کا ہوتا ہے، یعنی امّت کے مجموعے کو معصوم قرار دیدیا، کہ آپؐ کی پوری امّت کبھی گمراہی اور غلطی پر جمع نہ ہوگی، یہ پوری امّت جس مسئلہ پر اجماع و اتفاق کرے وہ حکمِ خداوندی کا مظہر سمجھا جائے گا، اسی لئے کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ صؐ کے بعد اسلام میں تیسری حجت اجماعِ امّت قرار دی گئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لَنْ تَجْتَمِعَ أُمَّتِيْ عَلَى الضَّلَالَةِ	"میری امّت کبھی گمراہی پر مجتمع نہ ہوگی"

اس کی مزید تفصیل اُس حدیث سے معلوم ہوتی ہے جس میں یہ ارشاد ہے کہ میری اُمّت میں ہمیشہ ایک جماعت حق پر قائم رہے گی، دنیا کتنی ہی بدل جائے، حق کتنا ہی مضمحل ہو جائے، مگر ایک جماعت حق کی حمایت ہمیشہ کرتی رہے گی، اور انجام کار وہی غالب رہے گی۔

اس سے بھی واضح ہوگیا کہ پوری امّت کبھی گمراہی اور غلطی پر جمع نہ ہوگی، اور جب کہ امت کا مجموعہ معصوم قرار دیا گیا تو خلیفۂ رسولؐ کا انتخاب بھی اُسی کے سپرد کر دیا گیا، اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نیابتِ زمین اور نظمِ حکومت کے لئے انتخاب کا طریقہ مشروع ہوگیا، یہ امّت جسے خلافت کے لئے منتخب کردے وہ خلیفۂ رسولؐ کی حیثیت سے نظامِ عالم کا واحد ذمہ دار ہوگا، اور خلیفہ سارے عالم کا ایک ہی ہو سکتا ہے۔

خلفائے راشدینؓ کے آخری عہد تک یہ سلسلۂ خلافت صحیح اصول پر چلتا رہا، اور اسی لئے اُن کے فیصلے صرف دینی اور ہنگامی فیصلوں کی حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ ایک محکم دستاویز

اور ایک درجہ میں امّت کے لئے حجت مانے جاتے ہیں، کیونکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق فرمایا:

علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الرّاشدین	"میری سنت کو لازم پکڑو اور خلفاء راشدین کی سنت کو"

خلافتِ راشدہ کے بعد خلافتِ راشدہ کے بعد کچھ طوائف الملوکی کا آغاز ہوا، مختلف خطوں میں مختلف امیر بنائے گئے، ان میں سے کوئی بھی خلیفہ کہلانے کا مستحق نہیں، ہاں کسی ملک یا قوم کا امیر خاص کہا جاسکتا ہے، اور جب پوری دنیا کے مسلمانوں کا اجتماع کسی ایک فرد پر متعذر ہو گیا، اور ہر ملک، ہر قوم کا علیٰحدہ علیٰحدہ امیر بنانے کی رسم چل گئی، تو مسلمانوں نے اس کا تقرر اسی اسلامی نظریہ کے تحت جاری رکھا، کہ ملک کے مسلمانوں کی اکثریت جس کو امیر منتخب کرے وہ ہی اس ملک کا امیر اور اولوا الامر کہلائے، قرآن مجید کے ارشاد وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲: ۳۸) کے عموم سے اس پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔

مغربی جمہوریت اور اسلامی شورائیت میں فرق اسمبلیاں اسی طرزِ عمل کا ایک نمونہ ہیں، فرق اتنا ہی کہ عام جمہوری ملکوں کی اسمبلیاں اور ان کے ممبران بالکل آزاد و خود مختار ہیں، محض اپنی رائے سے جو چاہیں اچھا یا بُرا قانون بناسکتے ہیں، اسلامی اسمبلی اور اس کے ممبران اور منتخب کردہ امیر سب اس اصول و قانون کے پابند ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اُن کو ملا ہے، اس اسمبلی یا مجلسِ شوریٰ کی ممبری کے لئے بھی کچھ شرائط ہیں، اور جس شخص کو یہ منتخب کریں اس کے لئے بھی کچھ حدود و قیود ہیں، پھر اُن کی قانون سازی بھی قرآن و سنت کے بیان کردہ اصول کے دائرہ میں ہوسکتی ہے، اس کے خلاف کوئی قانون بنانے کا ان کو اختیار نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو مخاطب کرکے جو ارشاد فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں، اس سے دستورِ مملکت کی چند اہم دفعات پر روشنی پڑتی ہے۔

آیت مذکورہ سے دستورِ مملکت کی چند اہم دفعات کا ثبوت اوّل: یہ کہ آسمان اور زمین میں اقتدارِ اعلیٰ اللہ جل مجدہٗ کا ہے، دوسرے: یہ کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی تنفیذ کے لئے اس کا نائب و خلیفہ اس کا رسول ہوتا ہے، اور ضمنی طور پر یہ بھی واضح ہو گیا کہ خلافتِ الٰہیہ کا سلسلہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا، تو اب خلافتِ رسولؐ کا سلسلہ اُس کے قائم مقام ہوا، اور اس خلیفہ کا تقرر ملت کے انتخاب سے قرار پایا۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ط

اور جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب سجدہ میں گر پڑے، مگر شیطان

أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ ۚ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾
اس نے نہ مانا اور تکبر کیا، اور تھا وہ کافروں میں کا

خلاصۂ تفسیر

اور جس وقت حکم دیا ہم نے سب فرشتوں کو (اور جنوں کو بھی جیسا کہ بعض روایات میں حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہو، غرض ان سب کو یہ حکم دیا گیا کہ) سجدہ میں گر جاؤ آدمؑ کے سامنے، سو سب سجدہ میں گر پڑے بجز ابلیس کے کہ اس نے کہنا نہ مانا اور غرور میں آگیا، اور ہوگیا کافروں میں سے۔

معارف و مسائل

ربطِ آیات پچھلے واقعہ میں جب آدم علیہ السلام کی فضیلت فرشتوں پر ظاہر ہو چکی، اور دلائل سے یہ امر ثابت ہوگیا کہ صلاحیتِ خلافت کے لئے جن علوم کی ضرورت ہے وہ آدم علیہ السلام میں سب مجتمع ہیں، اور ملائکہ کو ان میں سے بعض علوم حاصل ہیں، اور جنوں کو تو بہت ہی کم حصہ ان علوم کا حاصل ہے، جیسا کہ اوپر تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے، اور اس حیثیت خاص سے کہ ملائکہ و جن ہر دو گروہ کے علوم کے یہ جامع ہیں، اُن کا شرف ہر دو گروہ پر ظاہر ہوگیا، اب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اس مقدمہ کو معاملہ سے بھی ظاہر فرما دیا جاوے، اور ملائکہ اور جنوں سے ان کی کوئی خاص تعظیم کرائی جاوے، جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ اُن دونوں سے کامل اور مصداق ؎

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

کے ہیں، اور آدم علیہ السلام ان علوم خاصہ میں ملائکہ اور جن ہر دو گروہ سے کامل اور دونوں کے علوم و قویٰ کو جامع ہیں، جیسا کہ مفصل طور پر مذکور ہوا، اب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ ان غیر کاملوں سے اُس کامل کی کوئی ایسی تعظیم کرائی جاوے کہ عملاً بھی یہ امر ظاہر ہو جاوے کہ یہ اُن دونوں سے کامل اور جامع ہیں، جب تو یہ دونوں ان کی تعظیم کر رہے ہیں، اور گویا بزبانِ حال کہہ رہے ہیں کہ جو اوصاف ہم میں الگ الگ ہیں وہ ان کے اندر یک جا ہیں، اس لئے جو عمل تعظیمی تجویز فرمایا گیا ہے اس کی حکایت ذکر فرماتے ہیں کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدمؑ کو سجدہ کریں، سب فرشتوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے سجدے سے انکار کیا، اور غرور میں آگیا۔

کیا سجدہ کا حکم جنّات کو بھی تھا

اس آیت میں جو بات صراحۃً مذکور ہے وہ تو یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم فرشتوں کو دیا گیا، مگر آگے جب استثنار کرکے یہ بتلا دیا گیا کہ سب فرشتوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے نہیں کیا تو اس سے ثابت ہوا کہ سجدۂ آدمؑ کا حکم اُس وقت کی تمام ذوی العقول مخلوقات کے لئے عام تھا، جن میں فرشتے اور جنّات سب داخل ہیں، مگر حکم میں صرف فرشتوں کے ذکر پر اس لئے اکتفار کیا گیا کہ وہ سب سے افضل اور اشرف تھے، جب آدم علیہ السلام کی تعظیم کا حکم ان کو دیا گیا تو جنّات کا بدرجۂ اولیٰ اس حکم میں شامل ہونا معلوم ہو گیا۔

سجدۂ تعظیمی پہلی اُمتوں میں جائز تھا اسلام میں ممنوع ہے

اس آیت میں فرشتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں اور سورۂ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کے والدین اور بھائیوں کا مصر پہنچنے کے بعد یوسف علیہ السلام کو سجدہ کرنا مذکور ہے وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا (۱۲: ۱۰۰) یہ تو ظاہر ہے کہ یہ سجدہ عبادت کے لئے نہیں ہو سکتا کیونکہ غیر اللہ کی عبادت شرک وکفر ہے، جس میں یہ احتمال ہی نہیں کہ کسی وقت کسی شریعت میں جائز ہو سکے، اس کے سوا کوئی احتمال نہیں کہ قدیم انبیارؑ کے زمانے میں سجدے کا بھی وہی درجہ ہوگا جو ہمارے زمانے میں سلام، مصافحہ، معانقہ اور دست بوسی یا تعظیم کے لئے کھڑے ہو جانے کا ہے۔

امام جصّاصؒ نے احکام القرآن میں یہی فرمایا ہے کہ انبیارؑ سابقین کی شریعت میں بڑوں کی تعظیم اور تحیہ کے لئے سجدہ مباح تھا، شریعت محمدیہ میں منسوخ ہو گیا، اور بڑوں کی تعظیم کے لئے صرف سلام، مصافحہ کی اجازت دی گئی، رکوع، سجدہ اور بہیئت نماز ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے کو ناجائز قرار دیدیا گیا۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ اصل کفر و شرک اور غیر اللہ کی عبادت تو اصولِ ایمان کے خلاف ہے، وہ کبھی کسی شریعت میں جائز نہیں ہو سکتے، لیکن کچھ افعال و اعمال ایسے ہیں جو اپنی ذات میں شرک وکفر نہیں، مگر لوگوں کی جہالت اور غفلت سے وہ افعال ذریعہ شرک وکفر کا بن سکتے ہیں ایسے افعال کو انبیار سابقینؑ کی شریعتوں میں مطلقاً منع نہیں کیا گیا، بلکہ ان کو ذریعۂ شرک بنانے سے روکا گیا، جیسے جانداروں کی تصویر بنانا اور استعمال کرنا اپنی ذات میں کفر و شرک نہیں، اس لئے پچھلی شریعتوں میں جائز تھا، حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصہ میں مذکور ہے:

يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَ تَمَاثِيْلَ (۳۴: ۱۳)	"یعنی جنّات اُن کے لئے بڑی محرابیں اور تصویریں بنایا کرتے تھے"۔

اسی طرح سجدۂ تعظیمی پچھلی شریعتوں میں جائز تھا، لیکن آخر کار لوگوں کی جہالت سے یہی چیزیں شرک و بت پرستی کا ذریعہ بن گئیں، اور اسی راہ سے انبیار علیہم السلام کے دین و شریعت

میں تحریف ہوگئی، اور پھر دوسرے انبیاء ؑ اور دوسری شریعتوں نے آکر اس کو مٹایا، شریعت محمدیہؐ چونکہ دائمی اور ابدی شریعت ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت و رسالت ختم اور آپؐ کی شریعت آخری شریعت ہے، اس لئے اس کو مسخ و تحریف سے بچانے کے لئے ہر ایسے سوراخ کو بند کر دیا گیا جہاں سے شرک و بت پرستی آسکتی تھی، اسی سلسلہ میں وہ تمام چیزیں اس شریعت میں حرام قرار دیدی گئیں جو کسی زمانے میں شرک و بُت پرستی کا ذریعہ بنی تھیں۔

تصویر سازی اور اس کے استعمال کو اس وجہ سے حرام کیا گیا، سجدۂ تعظیمی اسی وجہ سے حرام ہوا ایسے اوقات میں نماز پڑھنے کو حرام کر دیا گیا جن میں مشرکین اور کفار اپنے معبودوں کی عبادت کیا کرتے تھے، کہ یہ ظاہری مطابقت کسی وقت شرک کا ذریعہ نہ بن جائے۔

صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آقاؤں کو یہ حکم دیا کہ اپنے غلام کو عبد یعنی اپنا بندہ کہہ کر نہ پکاریں، اور غلاموں کو یہ حکم دیا کہ وہ آقاؤں کو اپنا رب نہ کہیں، حالانکہ لفظی معنی کے اعتبار سے بندہ کے معنی غلام کے اور رب کے معنی پالنے والے اور تربیت کرنیوالے کے ہیں، ایسے الفاظ کا استعمال ممنوع نہ ہونا چاہئے تھا، مگر محض اس لئے کہ یہ الفاظ موہم شرک ہیں، کسی وقت جہالت سے یہی الفاظ آقاؤں کی پرستش کا دروازہ نہ کھولدیں اس لئے ان الفاظ کے استعمال کو روک دیا گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو فرشتوں کا سجدہ اور یوسف علیہ السلام کو ان کے والدین اور بھائیوں کا سجدہ جو قرآن میں مذکور ہے، یہ سجدۂ تعظیمی تھا، جو اُن کی شریعت میں سلام، مصافحہ، اور دست بوسی کا درجہ رکھتا تھا، اور جائز تھا، شریعتِ محمدیہؐ کو کفر و شرک کے شائبہ سے بھی پاک رکھنا تھا، اس لئے اس شریعت میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بقصد تعظیم بھی سجدہ یا رکوع کرنا جائز نہیں رکھا گیا۔

بعض علماء نے فرمایا کہ نماز جو اصل عبادت ہے اس میں چار طرح کے افعال ہیں، کھڑا ہونا بیٹھنا، رکوع، سجدہ، ان میں سے پہلے دو یعنی کھڑا ہونا اور بیٹھنا تو ایسے کام ہیں جو عادۃً بھی انسان اپنی ضرورتوں کے لئے کرتا ہے، اور عبادۃً بھی نماز میں کئے جاتے ہیں، مگر رکوع اور سجدہ ایسے فعل ہیں جو انسان عادۃً نہیں کرتا، وہ عبادت ہی کے ساتھ مخصوص ہیں، اس لئے ان دونوں کو شریعتِ محمدیہؐ میں عبادت ہی کا حکم دے کر غیر اللہ کے لئے ممنوع کر دیا۔

اب یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے، کہ سجدۂ تعظیمی کا جواز تو قرآن کی مذکورہ آیات سے ثابت ہے، شریعتِ محمدیہؐ میں اس کا منسوخ ہونا کس دلیل سے ثابت ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث متواترہ مشہورہ سے سجدۂ

تعظیمی کا حرام ہونا ثابت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں غیر اللہ کے لئے سجدۂ تعظیمی کو جائز قرار دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ شوہر کو سجدہ کیا کرے، (مگر اس شریعت میں سجدۂ تعظیم مطلقاً حرام ہے، اس لئے کسی کو کسی کے لئے جائز نہیں)

یہ حدیث بیس ۲۰ صحابۂ کرام کی روایت سے ثابت ہے، اصولِ حدیث کی معروف کتاب تدریب الراوی میں ہے کہ جس روایت کو دس صحابۂ کرام نقل فرمادیں تو وہ حدیث متواتر ہوجاتی ہے، جو قرآن کی طرح قطعی ہے، یہاں تو بیس صحابۂ کرام سے منقول ہے، یہ بیس صحابہ کی روایتیں حاشیہ بیان القرآن میں حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جمع فرمادی ہیں، ضرورت ہو تو وہاں دیکھا جاسکتا ہے۔

ابلیس کا کفر محض عملی نافرمانی کا نتیجہ نہیں

مسئلہ:۔ ابلیس کا کفر محض عملی نافرمانی کا نتیجہ نہیں، کیونکہ کسی فرض کو عملاً ترک کردینا اصولِ شریعت میں فسق و گناہ ہے، کفر نہیں، ابلیس کے کفر کا اصل سبب حکم ربانی سے معارضہ اور مقابلہ کرنا ہے کہ آپ نے جس کو سجدہ کرنے کا مجھے حکم دیا ہے وہ اس قابل نہیں کہ میں اس کو سجدہ کروں، یہ معارضہ بلاشبہ کفر ہے۔

ابلیس کو طاؤس الملائکہ کہا جاتا تھا

مسئلہ:۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ابلیس علم و معرفت میں یہ مقام رکھتا تھا کہ اس کو طاؤس الملائکہ کہا جاتا تھا، پھر اس سے یہ حرکت کیسے صادر ہوئی؟ بعض علماء نے فرمایا کہ اس کے تکبر کے سبب اللہ تعالیٰ نے اس سے اپنی دی ہوئی معرفت اور علم و فہم کی دولت سلب کرلی، اس لئے ایسی جہالت کا کام کر بیٹھا، بعض نے فرمایا کہ حُبِ جاہ اور خودپسندی نے حقیقت شناسی کے باوجود اس بلا میں مبتلا کردیا، تفسیر روح المعانی میں اس جگہ ایک شعر نقل کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ بعض اوقات کسی گناہ کے وبال سے تائیدِ حق انسان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے، تو اس کی ہر کوشش اور عمل اس کو گمراہی کی طرف دھکیل دیتا ہے، شعر یہ ہے، ؎

إِذَا لَمْ يَكُنْ عَوْنٌ مِّنَ اللّٰهِ لِلْفَتٰى

فَاَوَّلُ مَا يَجْنِيْ عَلَيْهِ اِجْتِهَادُهٗ

روح المعانی میں اس سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ انسان کا ایمان وہی معتبر ہے جو آخر عمر اور اوّل منازلِ آخرت تک ساتھ رہے، موجودہ ایمان و عمل اور علم و معرفت پر غرہ نہ ہونا چاہئے (روح)

وَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا

اور ہم نے کہا اے آدم رہا کر تو اور تیری عورت جنت میں اور کھاؤ اس میں جو چاہو

حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾

جہاں کہیں سے چاہو اور پاس مت جانا اس درخت کے پھر تم ہوجاؤ گے ظالم،

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا
پھر ہلا دیا ان کو شیطان نے اس جگہ سے پھر نکالا ان کو اس عزت و راحت سے کہ جس میں تھے اور ہم نے کہا تم سب اُترو
بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾
تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے اور تمہارے واسطے زمین میں ٹھکانا ہے اور نفع اٹھانا ایک وقت تک

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے حکم دیا کہ اے آدم رہا کرو تم اور تمہاری بی بی (جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے آدم علیہ السلام کی پسلی سے کوئی مادہ لے کر بنا دیا تھا) بہشت میں پھر کھاؤ دونوں اس میں سے بافراغت جس جگہ سے چاہو اور نزدیک نہ جائیو اس درخت کے ورنہ تم بھی انہی میں شمار ہو جاؤ گے جو اپنا نقصان کر بیٹھے ہیں (خدا جانے وہ کیا درخت تھا، مگر اس کے کھانے سے منع فرما دیا، اور پھر آقا کو اختیار ہے کہ اپنے گھر کی چیزوں سے غلام کو جس چیز کے برتنے کی چاہے اجازت دیدے، اور جس چیز کو چاہے منع کر دے) پس لغزش دیدی آدم و حوّا کو شیطان نے اس درخت کی وجہ سے سو برطرف کر کے رہا ان کو اس عیش سے جس میں وہ تھے اور ہم نے کہا کہ نیچے اترو تم میں سے بعضے بعضوں کے دشمن رہیں گے اور تم کو زمین پر کچھ عرصہ ٹھہرنا ہے اور کام چلانا ایک میعاد معیّن تک (یعنی وہاں جا کر بھی دوام نہ ملے گا کچھ عرصہ کے بعد وہ گھر بھی چھوڑنا پڑے گا)۔

معارف و مسائل

یہ آدم علیہ السلام کے قصّہ کا تکملہ ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ جب آدمؑ کی فضیلت اور خلافتِ ارضی کیلئے صلاحیت فرشتوں پر واضح کر دی گئی، انھوں نے تسلیم کر لیا، اور ابلیس اپنے تکبّر اور معارضہ کی وجہ سے کافر ہو کر نکال دیا گیا، تو آدم علیہ السلام اور ان کی زوجہ حوّا کو یہ حکم ملا کہ تم دونوں جنّت میں رہو، اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ، مگر ایک معیّن درخت کے لئے یہ ہدایت کی کہ اس کے پاس نہ جانا، یعنی اس کے کھانے سے مکمل پرہیز کرنا، شیطان جو آدمؑ کی وجہ سے مردود ہوا وہ خار کھائے ہوئے تھا اُس نے کسی طرح موقع پا کر اور مصلحتیں بتلا کر اُن دونوں کو اُس درخت کے کھانے پر آمادہ کر دیا، اُن کی لغزش کی وجہ سے اُن کو بھی یہ حکم ملا کہ اب تم زمین پر جا کر رہو، اور یہ بھی بتلا دیا کہ زمین کی رہائش جنّت کی طرح بے غل و غش نہ ہوگی، بلکہ وہاں آپس میں اختلافات اور دشمنیاں بھی ہوں گی جس سے زندگی کا لطف پورا نہ رہے گا۔

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ، "اور ہم نے کہا کہ اے آدم! ٹھہرو تم اور تمہاری زوجہ جنت میں" ــــ یہ واقعہ حضرت آدمؑ کی تخلیق اور ملائکہ کے سجدہ کے بعد کا ہے، بعض حضرات نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہو کہ یہ تخلیق اور سجدہ کا واقعہ جنت سے باہر کہیں ہوا ہے، اس کے بعد جنت میں داخل کیا گیا، لیکن ان الفاظ میں یہ مفہوم یقینی نہیں، بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تخلیق بھی جنت میں ہوئی، اور سجدے کا واقعہ بھی جنت میں پیش آیا، مگر اس وقت تک اُن کو کوئی فیصلہ اس کے متعلق نہیں سُنایا گیا تھا کہ آپ کا مسکن و مستقر کہاں ہوگا، اس واقعہ کے بعد یہ فیصلہ سُنایا گیا۔

وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا۔ رَغَدًا کے معنی عربی لغت میں اُس نعمت و رزق کے ہیں جس کے حاصل کرنے میں کوئی محنت و مشقت بھی نہ ہو، اور وہ اتنی کثیر اور وسیع ہو کہ اس کے کم یا ختم ہو جانے کا خطرہ نہ ہو، معنی یہ ہوئے کہ آدم و حوّاء علیہما السلام کو فرمایا کہ جنت کے پھل بافراغت استعمال کرتے رہو، نہ اُن کے حاصل کرنے میں تمہیں کسی محنت کی ضرورت ہوگی، اور نہ یہ فکر کہ یہ غذا ختم یا کم ہو جائے گی۔

وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ کسی خاص درخت کی طرف اشارہ کر کے فرمایا گیا کہ اس کے قریب نہ جاؤ، اصل مقصد تو یہ تھا کہ اس کا پھل نہ کھاؤ، مگر تاکید کے طور پر عنوان یہ اختیار کیا گیا کہ اس کے پاس بھی نہ جاؤ، اور مراد یہی ہو کہ کھانے کے لئے اس کے پاس نہ جاؤ، یہ درخت کونسا تھا قرآن کریم نے متعین نہیں کیا، اور کسی مستند حدیث میں بھی اس کی تعیین مذکور نہیں، ائمہ تفسیر میں سے کسی نے گندم کا درخت قرار دیا، کسی نے انگور کا، کسی نے انجیر کا، مگر جس کو قرآن و حدیث نے مبہم چھوڑا ہے اس کو متعین کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے (قرطبی)

فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ، یعنی اگر آپ نے اس شجرِ ممنوعہ کو کھایا تو آپ ظالموں میں داخل ہو جائیں گے۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا۔ زَلَّةٌ کے معنی عربی لغت میں لغزش کے ہیں، اِزْلَال کے معنی کسی کو لغزش دینا، معنی یہ ہیں کہ شیطان نے آدم و حوّاء کو لغزش دیدی، قرآن کے یہ الفاظ صاف اس کا اظہار کر رہے ہیں کہ حضرت آدم و حوّا کی یہ خلاف ورزی اس طرح کی نہ تھی جو عام گناہگاروں کی طرف سے ہوا کرتی ہے، بلکہ شیطانی تلبیس سے کسی دھوکہ فریب میں مبتلا ہو کر ایسے اقدام کی نوبت آگئی، کہ جس درخت کو ممنوع قرار دیا تھا اُس کا پھل وغیرہ کھا بیٹھے، عَنْهَا میں لفظ عَنْ بمعنی سبب ہو، یعنی اُس درخت کے سبب و ذریعہ سے شیطان نے آدم و حوّاء کو لغزش میں مبتلا کر دیا۔

یہاں ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ جب شیطان کو سجدے سے انکار کی بناء پر پہلے ہی مردود کر کے جنت سے نکال دیا گیا تھا، تو یہ آدم و حوا۔ کو بہکانے کے لئے جنت میں کیسے پہنچا؟ اس کا بے غبار جواب یہ ہے کہ شیطان کے بہکانے اور وہاں تک پہنچنے کی بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں، یہ بھی ممکن ہو کہ بغیر ملاقات کے اُن کے دل میں وسوسہ ڈالا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ شیطان جنات میں سے ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جنات کو بہت سے ایسے تصرفات پر قدرت دی ہے جو عام طور پر انسان نہیں کر سکتے، ان کو مختلف شکلوں میں متشکل ہوجانے کی بھی قدرت دی ہے، ہوسکتا ہو کہ اپنی قوتِ جنّیہ کے ذریعہ مسمریزم کی صورت سے آدم و حواء کے ذہن کو متاثر کیا ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی دوسری شکل میں مثلاً سانپ وغیرہ کی شکل میں متشکل ہوکر جنت میں داخل ہوگیا ہو، اور شاید یہی سبب ہوا کہ آدم علیہ السلام کو اس کی دشمنی کی طرف دھیان نہ رہا، قرآن مجید کی آیت وَقَاسَمَهُمَآ إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِينَ (۷: ۲۱) سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے صرف وسوسہ اور ذہنی اثر ڈالنے سے کام نہیں لیا، بلکہ آدم و حواء سے زبانی گفتگو کر کے اور قسمیں کھا کر متاثر کیا۔

فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ۔ یعنی شیطان نے اس دھوکہ اور لغزش کے ذریعہ آدم و حواء علیہما السلام کو ان نعمتوں سے نکال دیا جن میں وہ آرام سے گذر بسر کر رہے تھے، یہ نکالنا اگرچہ بحکم خداوندی ہوا، مگر سبب اس کا شیطان تھا، اس لئے نکالنے کی نسبت اُس کی طرف کر دی گئی۔

وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ۔ یعنی ہم نے حکم دیا کہ نیچے اُتر جاؤ، اس طرح کہ تم میں بعضے بعضوں کے دشمن رہیں گے، اس حکم کے مخاطب حضرت آدم و حواء ہیں، اور شیطان کو اس وقت تک آسمانوں سے باہر نہیں کیا گیا تھا تو وہ بھی اسی خطاب میں شامل ہے، اس صورت میں باہم عداوت ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ شیطان کے ساتھ تمھاری عداوت کا سلسلہ دنیا میں بھی جاری رہے گا، اور اگر بقول بعض اس واقعہ کے وقت سے پہلے ہی شیطان نکالا جاچکا تھا، تو پھر اس کلام کا رُخ آدم و حواء اور اُن کی اولاد کی طرف ہوگا، کہ ان کو بطور عتاب کے یہ جتلایا گیا کہ ایک سزا تو یہ ہو کہ جنت سے زمین پر اُتارا گیا، دوسری سزا اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ آپ کی اولاد کے درمیان باہم عداوتیں بھی ہوں گی، اور ظاہر ہے کہ اولاد کے باہم عداوت ہونے سے والدین کا لطفِ زندگی بھی رخصت ہوجاتا ہے، تو یہ بھی ایک قسم کی معنوی اور روحانی سزا ہوگی۔ (بیان القرآن)

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلٰى حِينٍ۔ یعنی آدم و حواء علیہما السلام کو یہ بھی ارشاد ہوا کہ تم کو زمین پر کچھ عرصہ ٹھہرنا ہے اور ایک میعادِ معیّن تک کام چلانا ہے، یعنی زمین پر جاکر بھی دوام نہ ملے گا، کچھ مدت کے بعد اس گھر کو بھی چھوڑنا پڑے گا۔

آیاتِ مذکورہ سے متعلق مسائل و احکامِ شرعیہ

اُسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ میں حضرت آدم و حوا علیہما السلام دونوں کے لئے جنّت کو مسکن بنانے کا ارشاد ہے، جس کو مختصر لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے اُسْكُنَا الْجَنَّةَ۔ یعنی آپ دونوں جنت میں رہیں، جیسا کہ اس کے بعد كُلَا اور لَا تَقْرَبَا میں دونوں کو ایک ہی صیغہ میں جمع کیا گیا ہے، مگر یہاں اس کے خلاف اَنْتَ وَزَوْجُكَ کے الفاظ کو اختیار کرنے میں مخاطب صرف حضرت آدمؑ کو قرار دیا اور انہی سے فرمایا کہ آپ کی زوجہ بھی جنّت میں رہے، اس میں دو مسئلوں کی طرف اشارہ ہے:۔

مسئلہ: اوّل یہ کہ بیوی کے لئے رہائش کا انتظام شوہر کے ذمہ ہے، دوسرے یہ کہ سکونت میں بیوی شوہر کے تابع ہے، جس مکان میں شوہر رہے اس میں اس کو رہنا چاہئے۔

مسئلہ: لفظ اُسْكُنْ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اس وقت ان دونوں حضرات کے لئے جنت کا قیام محض عارضی تھا، دائمی قیام جو شان ملکیت کی ہوتی ہے وہ نہ تھی، کیونکہ لفظ اُسْكُنْ کے معنی یہ ہیں کہ اس مکان میں رہا کرو، یہ نہیں فرمایا کہ یہ مکان تمہیں دیدیا گیا یہ تمہارا مکان ہے، وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ آئندہ ایسے حالات پیش آئیں گے کہ آدم و حوا علیہما السّلام کو جنت کا مکان چھوڑنا پڑے گا، نیز جنت کا استحقاق ملکیت ایمان اور عمل صالح کر کے معاوضہ میں حاصل ہوتا ہے جو قیامت کے بعد ہوگا، اسی سے حضرات فقہاء نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو کہے کہ میرے گھر میں رہا کرو یا یہ کہ میرا گھر تمہارا مسکن ہے، اس سے مکان کی ملکیت اور دائمی استحقاق اس شخص کو حاصل نہیں ہوتا (قرطبی)

غذا، و خوراک میں بیوی شوہر کے تابع نہیں

وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا "یعنی کھاؤ تم دونوں جنت سے بافراغت" اس میں بطرز مذکور سابق خطاب صرف آدم علیہ السلام کو نہیں کیا گیا بلکہ دونوں کو ایک ہی لفظ میں شریک کر کے كُلَا مِنْهَا فرمایا اس میں اشارہ اس کی طرف ہو سکتا ہے کہ غذاء اور خوراک میں بیوی شوہر کے تابع نہیں، وہ اپنی ضرورت و خواہش کے وقت اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرے اور یہ اپنی خواہش کے مطابق۔

ہر جگہ چلنے پھرنے کی آزادی انسان کا فطری حق ہے

رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا لفظ رَغَدًا، ماکولات میں وسعت و کثرت کی طرف اشارہ ہو کہ جو چیز جتنی چاہیں کھا سکتے ہیں بجز ایک درخت کے اور کسی چیز میں کاٹ اور ممانعت نہیں، اور لفظ شِئْتُمَا میں مقامات کی وسعت کا بیان ہے، کہ پوری جنّت میں جہاں چاہیں جس طرح چاہیں کھائیں، کوئی خطہ ممنوع نہیں، اس میں اشارہ ہے کہ چلنے پھرنے اور مختلف مقامات سے اپنی ضروریات حاصل کرنے کی آزادی انسان کا فطری حق ہے، ایک محدود و معیّن مقام یا مکان میں اگرچہ ضرورت و خواہش کی ساری چیزیں مہیا کر دی جائیں، مگر وہاں سے باہر جانا ممنوع ہو تو یہ بھی ایک قسم کی قید ہے اس لئے حضرت آدم علیہ السلام کو کھانے پینے کی تمام چیزیں بکثرت و فراغت عطا کر دینے پر اکتفاء نہیں کیا گیا، بلکہ حَيْثُ شِئْتُمَا فرما کر ان کو چلنے پھرنے اور ہر جگہ جانے کی آزادی بھی دی گئی۔

سدِّ ذرائع کا مسئلہ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ "یعنی اس درخت کے قریب بھی نہ جاؤ"۔ ظاہر ہے کہ اصل مقصد تو یہ تھا کہ اس درخت یا اس کے پھل کو نہ کھاؤ، مگر احتیاطی حکم یہ دیا گیا کہ اس کے قریب بھی نہ جاؤ اس سے اصولِ فقہ کا مسئلہ سدِّ ذرائع ثابت ہوا، یعنی بعض چیزیں اپنی ذات میں ناجائز یا ممنوع نہیں ہوتیں، لیکن جب یہ خطرہ ہو کہ ان چیزوں کے اختیار کرنے سے کسی حرام ناجائز کام میں مبتلا ہو جائے گا تو اس جائز چیز کو بھی روک دیا جاتا ہے، جیسے درخت کے قریب جانا ذریعہ بن سکتا تھا اس کے پھل پھول کھانے کا، اُس ذریعہ کو بھی منع فرما دیا گیا، اسی کا نام اصولِ فقہ کی اصطلاح میں "سدِّ ذرائع" ہے۔

مسئلہ عصمتِ انبیاءؑ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو کسی خاص درخت کے کھانے سے منع فرمایا گیا تھا، اور اس پر بھی متنبہ کر دیا گیا تھا کہ شیطان تمہارا دشمن ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں گناہ میں مبتلا کر دے، اس کے باوجود آدم علیہ السلام نے اُس درخت سے کھا لیا جو بظاہر گناہ ہے، حالانکہ انبیاء علیہم السلام گناہ سے معصوم ہوتے ہیں، تحقیق یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت تمام گناہوں سے عقلاً اور نقلاً ثابت ہے، ائمہ اربعہ اور جمہور امت کا اس پر اتفاق ہے، کہ انبیاء علیہم السلام تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے معصوم و محفوظ ہوتے ہیں اور بعض لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ صغیرہ گناہ اُن سے بھی سرزد ہو سکتے ہیں، جمہورِ اُمت کے نزدیک صحیح نہیں (قرطبی)

وجہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو لوگوں کا مقتدا بنا کر بھیجا جاتا ہے، اگر ان سے بھی کوئی کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف خواہ گناہ کبیرہ ہو یا صغیرہ صادر ہو سکے تو انبیاءؑ کے اقوال و افعال سے امن اُٹھ جائے گا، اور وہ قابلِ اعتماد نہیں رہیں گے، جب انبیاءؑ ہی پر اعتماد و اطمینان نہ رہے تو دین کا کہاں ٹھکانا ہے۔

البتہ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں متعدد انبیاءؑ کے متعلق ایسے واقعات مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے گناہ سرزد ہوا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن پر عتاب بھی ہوا، حضرت آدم علیہ السلام کا یہ قصہ بھی اسی میں داخل ہے۔

ایسے واقعات کا حاصل باتفاق امت یہ ہے کہ کسی غلط فہمی یا خطاء و نسیان کی وجہ سے ان کا صدور ہو جاتا ہے، کوئی پیغمبر جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے خلاف عمل نہیں کرتا، غلطی اجتہادی ہوتی ہے، یا خطاء و نسیان کے سبب قابلِ معافی ہوتی ہے، جس کو اصطلاح شرع میں گناہ نہیں کہا جا سکتا، اور یہ سہو و نسیان کی غلطی اُن سے ایسے کاموں میں نہیں ہو سکتی جن کا تعلق تبلیغ و تعلیم اور

تشریع سے ہو، بلکہ اُن سے ذاتی افعال اور اعمال میں ایسا سہو نسیان ہو سکتا ہے (تفسیر بحر المحیط)

مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انبیا علیہم السلام کا مقام نہایت بلند ہے، اور بڑوں سے چھوٹی سی غلطی بھی ہو جائے تو بہت بڑی غلطی سمجھی جاتی ہے، اس لئے قرآن حکیم میں ایسے واقعات کو معصیت اور گناہ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اس پر عتاب بھی کیا گیا ہے، اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے وہ گناہ ہی نہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کے اس واقعہ کے متعلق علماء تفسیر نے بہت سی توجیہات لکھی ہیں ان میں چند یہ ہیں:

اوّل یہ کہ جس وقت آدم علیہ السلام کو منع کیا گیا تھا، تو ایک خاص درخت کی طرف اشارہ کر کے منع کیا گیا کہ اس کے قریب نہ جاؤ، اور مراد خاص یہی درخت نہیں تھا، بلکہ اس کی جنس کے سارے درخت مراد تھے، جیسے حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ریشمی کپڑا اور ایک ٹکڑا سونے کا ہاتھ میں لیکر ارشاد فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں میری امت کے مردوں پر حرام ہیں، ظاہر ہے کہ حرمت صرف اُس کپڑے اور سونے کے ساتھ مخصوص نہیں تھی، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک میں تھے، بلکہ تمام ریشمی کپڑے اور سونے کا یہی حکم ہے، لیکن یہاں کسی کو یہ وہم بھی ہو سکتا ہے کہ ممانعت صرف اُس کپڑے اور سونے کے ساتھ وابستہ ہے جو اُس وقت آپ کے دستِ مبارک میں تھے، اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کو یہ خیال ہو گیا کہ جس درخت کی طرف اشارہ کر کے منع کیا گیا تھا ممانعت اسی کے ساتھ خاص ہے، شیطان نے یہی وسوسہ اُن کے دل میں مزین اور مستحکم کر دیا، اور قسمیں کھا کر یہ باور کرایا کہ میں تمھارا خیر خواہ ہوں، تمھیں کسی ایسے کام کا مشورہ نہیں دے رہا جو تمہارے لئے ممنوع یا مضر ہو، جس درخت کی ممانعت کی گئی ہے وہ دوسرا ہے، اس درخت کی ممانعت نہیں ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ شیطان نے یہ وسوسہ دل میں ڈالا ہو کہ اس درخت کی ممانعت صرف آپ کی ابتداء پیدائش کے وقت کے ساتھ مخصوص تھی، جیسے چھوٹے بچوں کو اوّلِ عمر میں قوی غذاء سے روکا جاتا ہے، ہلکی غذاء دی جاتی ہے، اور قوت پیدا ہو جانے کے بعد ہر غذاء کی اجازت ہو جاتی ہے تو اب آپ قوی ہو چکے ہیں، اس لئے وہ ممانعت باقی نہیں رہی۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جس وقت شیطان نے اس درخت کے کھانے کے منافع بتلائے کہ اس کے کھانے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جنت کی نعمتوں میں رہنے کا اطمینان ہو جائے گا، اُس وقت اُن کو وہ ممانعت یاد نہ رہی ہو جو ابتداء آفرینش کے وقت اس درخت کے متعلق کی گئی تھی، قرآن مجید کی آیت فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا (۲۰: ۱۱۵) یعنی آدم علیہ السلام

بھول گئے اور ہم نے ان میں پختگی نہ پائی" یہ اسی احتمال کی تائید کرتی ہے۔

بہرحال اس طرح کے متعدد احتمالات ہوسکتے ہیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ جان بوجھ کر نافرمانی کا صدور حضرت آدم علیہ السلام سے نہیں ہوا، بھول ہوگئی، یا اجتہادی لغزش، جو درحقیقت گناہ نہیں، مگر آدم علیہ السلام کی شانِ نبوت اور قربِ خداوندی کے مقامِ عالی کے اعتبار سے یہ لغزش بھی بڑی سمجھی گئی، اور قرآن میں اس کو معصیت کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا، اور آدم علیہ السلام کی توبہ و استغفار کے بعد معاف کرنے کا ذکر فرمایا گیا۔

اور یہ بحث فضول ہے کہ جب شیطان کو جنت سے مردود کرکے نکال دیا گیا تھا تو پھر وہ آدم علیہ السلام کو بہکانے کے لئے وہاں کس طرح پہنچا؟ کیونکہ شیطان کے بہکانے اور وسوسہ ڈالنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جنت میں داخل ہوکر ہی وسوسہ ڈالے، جنات و شیاطین کو حق تعالیٰ نے یہ قدرت دی ہے کہ وہ دُور سے بھی دل میں وسوسہ ڈال سکتے ہیں، اور اگر داخل ہوکر بالمشافہ گفتگو ہی کو تسلیم کیا جائے تو اس کے بھی مختلف احتمالات ہوسکتے ہیں جس کی تحقیق میں پڑنا بے فائدہ اور لایعنی بحث ہے۔

اسی طرح یہ سوال کہ آدم و حوا علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی متنبہ کردیا تھا، اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمَا عَدُوٌّ، کہ "شیطان تمہارا دشمن ہے" ایسا نہ ہو کہ یہ کوئی ایسا کام کرادے جس کی وجہ سے تمہیں جنت سے نکلنا پڑے، پھر حضرت آدم علیہ السلام اس کے دھوکہ میں کس طرح آگئے، اس کا جواب بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنات و شیاطین کو مختلف شکلوں میں ظاہر ہونے کی قدرت عطا فرمائی ہے، ممکن ہے کہ وہ کسی ایسی صورت میں سامنے آیا ہو جس کی وجہ سے آدم علیہ السلام یہ نہ پہچان سکے کہ یہ شیطان ہے۔

فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ

پھر سیکھ لیں آدم نے اپنے رب سے چند باتیں پھر متوجہ ہوگیا اللہ اس پر بیشک وہی ہے توبہ قبول کرنیوالا

الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ

مہربان ، ہم نے حکم دیا نیچے جاؤ یہاں سے تم سب ، پھر اگر تم کو پہنچے میری طرف سے کوئی

هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾

ہدایت تو جو چلا میری ہدایت پر نہ خوف ہوگا اُن پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے ،

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ

اور جو لوگ منکر ہوئے اور جھٹلایا ہماری نشانیوں کو وہ ہیں دوزخ میں جانے والے وہ

فِيهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٣٩﴾ ع

اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

خلاصۂ تفسیر

بعد ازاں حاصل کرلئے آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے چند الفاظ (یعنی معذرت کے کلمات کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی سے حاصل ہوئے تھے، حضرت آدم علیہ السلام کی ندامت پر اللہ تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوئی اور خود ہی معذرت کے الفاظ تلقین فرما دیتے) تو اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی اُن پر (یعنی توبہ قبول کرلی) بیشک وہی ہیں بڑی توبہ قبول کرنیوالے بڑے مہربان (اور حضرت حوّا کی توبہ کا بیان سورۂ اعراف میں ہے، قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا جس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی توبہ اور قبولِ توبہ میں آدم علیہ السلام کے ساتھ شریک رہیں، مگر معاف فرمانے کے بعد بھی زمین پر جانے کے حکم کو منسوخ نہیں فرمایا کیونکہ اس میں ہزاروں حکمتیں اور مصلحتیں مضمر تھیں، البتہ اس کا طرز بدل دیا کہ پہلا حکم زمین پر اُترنے کا حاکمانہ طور پر بطرز سزا تھا، اب یہ حکم حکیمانہ انداز سے اس طرح ارشاد ہوا قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا الآیہ یعنی) ہم نے حکم فرمایا کہ نیچے جاؤ اس بہشت سے سب کے سب، پھر اگر آوے تمہارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت (یعنی احکام شرعیہ بذریعہ وحی) سو جو شخص پیروی کریگا میری اس ہدایت کی تو نہ کچھ اندیشہ ہوگا ان پر اور نہ ایسے لوگ غمگین ہوں گے (یعنی اُن پر کوئی خوفناک واقعہ نہ پڑے گا اور قیامت کے ہولناک واقعات سے اُن کا بھی خوف زدہ ہونا اس کے منافی نہیں، جیسا کہ احادیث صحیحہ میں سب پر ہول اور خوف کا عام ہونا معلوم ہوتا ہے، حزن وہ کیفیت ہے جو کسی مضرت و مصیبت کے واقع ہو جانے کے بعد قلب میں پیدا ہوتی ہے، اور خوف ہمیشہ قبل وقوع ہوا کرتا ہے، یہاں حق تعالیٰ نے حزن وغم دونوں کی نفی فرما دی، کیونکہ اُن پر کوئی آفت و کلفت واقع نہ ہوگی جس سے حزن یا خوف ہو، آگے ان لوگوں کا حال بیان کیا ہے جو اس ہدایت کی پیروی نہ کریں، فرمایا) اور جو لوگ کفر کریں گے اور تکذیب کریں گے ہمارے احکام کی یہ لوگ ہوں گے دوزخ والے وہ اس میں ہمیشہ کو رہیں گے۔

معارف و مسائل

ربطِ آیات پچھلی آیات میں شیطانی وسوسہ اور حضرت آدمؑ کی لغزش اور اسکے نتیجہ میں جنت سے نکلنے اور زمین پر اُترنے

کا حکم مذکور تھا، حضرت آدم علیہ السلام نے ایسے خطاب و عتاب کہاں سُنے تھے، نہ ایسے سنگدل تھے کہ اس کی سہار کر جاتے، بے چین ہوگئے، اور فوراً ہی معافی کی التجا کرنے لگے، مگر پیغمبرانہ معرفت اور اس کی وجہ سے انتہائی ہیبت سے کوئی بات زبان سے نہ نکلتی تھی، یا اس خوف سے کہ معافی کی التجا کہیں خلافِ شان ہو کر مزید عتاب کا سبب نہ بن جائے، زبان خاموش تھی، اللہ رب العزت دلوں کی بات سے واقف اور رحیم و کریم ہیں' یہ حالت دیکھ کر خود ہی معافی کے لئے کچھ کلمات ان کو سکھا دیئے، اس کا بیان ان آیات میں ہے کہ: آدم علیہ السلام نے حاصل کر لئے اپنے رب سے چند الفاظ، تو اللہ تعالیٰ نے اُن پر رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی، (یعنی اُن کی توبہ قبول کر لی) بے شک وہی ہیں بڑے توبہ قبول کرنے والے مہربان مگر چونکہ روئے زمین پر آنے میں اور بھی ہزاروں حکمتیں اور مصلحتیں مضمر تھیں' مثلاً ان کی نسل سے فرشتوں اور جنات کے درمیان ایک نئی نوعِ انسان کا وجود میں آنا اور ان کو ایک طرح کا اختیار دے کر احکامِ شرعیہ کا مکلف بنانا پھر ان میں خلافتِ الٰہیہ قائم کرنا، حدود اور احکامِ شرعیہ نافذ کرنا، تاکہ یہ نئی مخلوق ترقی کر کے اس مقام پر پہونچ سکے جو بہت سے فرشتوں کو بھی نصیب نہیں' اور ان مقاصد کا ذکر تخلیقِ آدم علیہ السلام سے پہلے ہی کر دیا گیا تھا، اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً۔

اس لئے خطا معاف کرنے کے بعد بھی زمین پر اُترنے کا حکم منسوخ نہیں فرمایا، البتہ اس کا طرز بدل دیا، کہ پہلا حکم حاکمانہ اور زمین پر اُترنا بطور سزا کے تھا، اب یہ ارشاد حکیمانہ اور زمین پر آنا خلافتِ الٰہیہ کے اعزاز کے ساتھ ہوا، اس لئے بعد کی آیات میں اُن فرائضِ منصبی کا بیان ہے جو ایک خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے اُن پر عائد کئے گئے تھے، اسی لئے زمین پر اُترنے کے حکم کو پھر مکرر بیان کر کے فرمایا کہ: ہم نے حکم فرمایا کہ نیچے جاؤ اس جنت سے سب کے سب پھر اگر آوے تمہارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت، یعنی احکامِ شرعیہ بذریعہ وحی کے، تو جو شخص پیروی کرے گا میری اس ہدایت کی، تو نہ کچھ اندیشہ ہوگا ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے، یعنی نہ کسی گذشتہ چیز کے فوت ہونے کا غم ہوگا، نہ آئندہ کسی تکلیف کا خطرہ۔

تَلَقّٰی، تلقی کے معنی ہیں شوق اور رغبت کے ساتھ کسی کا استقبال کرنا، اور اس کو قبول کرنا (روح، کشاف) مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب اُن کو توبہ کے کلمات کی تلقین کی گئی تو آدم علیہ السلام نے اہتمام کے ساتھ اُن کو قبول کیا۔

کَلِمٰتٍ، وہ کلمات جو حضرت آدم علیہ السلام کو بغرض توبہ بتلائے گئے کیا تھے، اس میں مفسرینِ صحابہؓ سے کئی روایات منقول ہیں، مشہور قول حضرت ابن عباسؓ کا ہے کہ وہ کلمات وہی ہیں جو قرآن مجید میں دوسری جگہ منقول ہیں، یعنی رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ

لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۔ (۷ : ۲۳)

تَابَ، توبہ کے اصل معنی رجوع کرنے کے ہیں، اور جب توبہ کی نسبت بندہ کی طرف کی جاتی ہے تو اس کے معنی تین چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے، اوّل اپنے کئے ہوئے گناہ کو گناہ سمجھنا اور اس پر نادم و شرمندہ ہونا، دوسرے اس گناہ کو بالکل چھوڑ دینا، تیسرے آئندہ کے لئے دوبارہ نہ کرنے کا پختہ عزم و ارادہ کرنا، اگر ان تین چیزوں میں سے ایک کی بھی کمی ہوئی تو وہ توبہ نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ محض زبان سے "اللہ توبہ" کے الفاظ بول دینا نجات کے لئے کافی نہیں جب تک یہ تینوں چیزیں جمع نہ ہوں، یعنی گذشتہ پر ندامت اور حال میں اُس کا ترک، اور مستقبل میں اس کے نہ کرنے کا عزم و ارادہ، تَابَ عَلَيْهِ یہاں توبہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اس کے معنی ہیں توبہ قبول کرنا،

——— بعض سلف سے پوچھا گیا کہ جس شخص سے کوئی گناہ سرزد ہوجائے وہ کیا کرے تو فرمایا وہی کام کرے جو اس کے پہلے والدین آدم و حوّا علیہما السلام نے کیا، کہ اپنے کئے پر ندامت، اور آئندہ نہ کرنے کے عزم کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے معافی کے لئے عرض کیا، رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (یعنی ہمارے پروردگار ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کرلیا ہے، اگر آپ معاف نہ کریں اور ہم پر رحم نہ کریں تو ہم سخت خسارہ والوں میں داخل ہوجائیں گے) اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ (۲۸ : ۱۶) "یعنی اے میرے پالنے والے میں نے اپنی جان پر ظلم کرلیا ہے، تو آپ ہی میری مغفرت فرمائیے"۔ اور حضرت یونس علیہ السلام سے جب لغزش ہوگئی تو عرض کیا: لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۲۱ : ۸۷) "یعنی اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، آپ ہر برائی سے پاک ہیں، میں ظلم کرنے والوں میں داخل ہوگیا ہوں" (مطلب یہ کہ مجھ پر رحم فرمائیے) (قرطبی)

فائدہ: حضرت آدم و حوّا سے جو اجتہادی لغزش یا بھول صادر ہوئی ہے، اوّلاً تو قرآن کریم نے دونوں ہی کی طرف اس کی نسبت کی ہے، فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا۔ اور زمین پر اُترنے کے حکم میں بھی حضرت حوّا کو شریک کرکے لفظ اِهْبِطُوْا فرمایا ہے، مگر بعد میں توبہ اور قبول توبہ میں بہ لفظ مفرد صرف آدم علیہ السلام کا ذکر ہے، حضرت حوّا کا نہیں، اس مقام کے علاوہ بھی اس لغزش کا ذکر صرف آدم علیہ السلام کی طرف کرکے کیا گیا ہے، عَصٰٓى اٰدَمُ وغیرہ۔

ہوسکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ رعایت ہو کہ عورت کو اللہ تعالیٰ نے مستور رکھا ہے، اس لئے بطور پردہ پوشی کے گناہ اور عتاب کے ذکر میں اس کا ذکر صراحۃً نہیں فرمایا، اور ایک جگہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا میں دونوں کی توبہ کا ذکر بھی دیا گیا، تاکہ کسی کو یہ شبہ نہ رہے کہ حضرت حوّا

کا قصور معاف نہیں ہوا، اس کے علاوہ عورت چونکہ اکثر احوال میں مرد کے تابع ہے، اس لئے اس کے مستقل ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ (قرطبی)

توّاب اور تائب میں فرق امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ لفظ توّابٌ بندہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے جیسے اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ (۲: ۲۲۲) اور اللہ تعالیٰ کیلئے بھی جیسے اس آیت میں هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ، جب بندے کے لئے استعمال ہوتا ہے تو معنی ہوتے ہیں گناہ سے اطاعت کی طرف رجوع کرنے والا، اور جب اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہوتا ہے تو معنی ہوتے ہیں توبہ قبول کرنے والا، یہ صرف لفظ توّابٌ کا حکم ہے، اسی معنی کا دوسرا لفظ تَائِبٌ ہے، اس کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لئے جائز نہیں، اگرچہ لغوی معنی کے اعتبار سے وہ بھی غلط نہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی شان میں صرف وہی صفات اور القاب استعمال کرنا جائز ہیں، جن کا ذکر قرآن وسنت میں وارد ہے، باقی دوسرے الفاظ اگرچہ معنی کے اعتبار سے صحیح ہوں، مگر اللہ تعالیٰ کے لئے اس کا استعمال درست نہیں۔

گناہ سے توبہ قبول کرنیکا اختیار خدا تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ توبہ قبول کرنے اور گناہ معاف کرنے کا اختیار سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو نہیں، یہود ونصاریٰ اس قاعدہ سے غفلت کی بناء پر سخت فتنہ میں مبتلا ہوگئے، کہ پادریوں اور پیروں کے پاس جاتے، اور اُن کو کچھ ہدیہ دے کر اپنے گناہ معاف کرا لیتے، اور سمجھتے تھے کہ انھوں نے معاف کر دیا تو اللہ کے نزدیک بھی معاف ہوگیا، آج بھی بہت سے ناواقف مسلمان اس طرح کے غلط اور خام عقیدے رکھتے ہیں، جو سراسر غلط ہیں، کوئی عالم یا مرشد کسی کے گناہ کو معاف نہیں کرسکتا، زیادہ سے زیادہ دعاء کرسکتا ہے۔

آدمؑ کا زمین پر اُترنا سزا کے طور پر نہیں، بلکہ ایک مقصد کی تکمیل کے لئے تھا قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا، جنت سے زمین پر اُترنے کا حکم اس سے پہلی آیت میں آچکا ہے، اس جگہ پھر اس کو مکرر لانے میں غالباً حکمت یہ ہے کہ پہلی آیت میں زمین پر اُتارنے کا ذکر بطور عتاب اور سزا کے آیا تھا، اسی لئے اس کے ساتھ انسانوں کی باہمی عداوت کا بھی ذکر کیا گیا، اور یہاں زمین پر اُتارنے کا ذکر ایک خاص مقصد خلافتِ الٰہیہ کی تکمیل کے لئے اعزاز کے ساتھ ہے، اسی لئے اس کے ساتھ ہدایت بھیجنے کا ذکر ہے جو خلافتِ الٰہیہ کے فرائضِ منصبی میں سے ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگرچہ زمین پر اُترنے کا ابتدائی حکم بطور عتاب اور سزا کے تھا، مگر بعد میں جب خطا معاف کر دی گئی تو دوسری مصالح اور حکمتوں کے پیشِ نظر زمین پر بھیجنے کے حکم کو اس کی حیثیت بدل کر برقرار رکھا گیا، اور اب ان کا نزول زمین کے حاکم اور خلیفہ کی حیثیت سے ہوا، اور یہ وہی حکمت ہے جس کا ذکر تخلیقِ آدمؑ کے وقت ہی فرشتوں سے کیا جا چکا تھا، کہ زمین کے لئے اُن کو خلیفہ بنانا ہے۔

رنج وغم سے نجات صرف اُن لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو اللہ کے فرمانبردار ہیں

فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ اس آیت میں آسمانی ہدایات کی پیروی کرنے والوں کے لئے دو انعام مذکور ہیں، ایک یہ کہ اُن پر کوئی خوف نہ ہوگا، دوسرے وہ غمگین نہ ہوں گے۔

خَوْفٌ، آئندہ پیش آنے والی کسی تکلیف ومصیبت کے اندیشہ کا نام ہے اور حُزْن کسی مقصد ومراد کے فوت ہوجانے سے پیدا ہونے والے غم کو کہا جاتا ہے، غور کیا جائے تو عیش وراحت کی تمام انواع واقسام کا ان دو لفظوں میں ایسا احاطہ کردیا گیا ہے کہ آرام وآسائش کا کوئی فرد اور کوئی قسم اس سے باہر نہیں، پھر ان دونوں لفظوں کی تعبیر میں ایک خاص فرق کیا گیا ہے کہ خوف کی نفی تو عام انداز میں کردی گئی، مگر حزن کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ لَاحُزْنَ عَلَيْهِمْ، بلکہ بصیغہ فعل لایا گیا، اور اُس کی ضمیر فاعل کو مقدم کرکے وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ فرمایا گیا، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ کسی چیز یا مراد کے فوت ہونے کے غم سے آزاد ہونا صرف انہی اولیاء اللہ کا مقام ہے جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایات کی مکمل پیروی کرنے والے ہیں، ان کے سوا کوئی انسان اس غم سے نہیں بچ سکتا خواہ وہ ہفت اقلیم کا بادشاہ ہو یا دنیا کا بڑے سے بڑا مالدار، کیونکہ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہوتا جس کو اپنی طبیعت اور خواہش کے خلاف کوئی بات پیش نہ آئے اور اس کا غم نہ ہو، جیسا کہ کہا گیا ہے ؎

دریں دنیا کسے بے غم نباشد
وگر باشد بنی آدم نباشد

بخلاف اولیاء اللہ کے کہ وہ اپنی مرضی اور ارادے کو اللہ رب العزت کی مرضی اور ارادے میں فنا کردیتے ہیں، اس لئے ان کو کسی چیز کے فوت ہونے کا غم نہیں ہوتا، قرآن مجید میں دوسری جگہ بھی اس کو ظاہر کیا گیا ہے، کہ خاص اہلِ جنت ہی کا یہ حال ہوگا کہ وہ جنت میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کا اس پر شکر کریں گے کہ ان سے غم دور کردیا گیا، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (۳۵: ۳۴) اس سے معلوم ہوا کہ اس دنیا میں کچھ نہ کچھ غم ہونا ہر انسان کے لئے ناگزیر ہے، بجز اس شخص کے جس نے اپنا تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ مکمل اور مضبوط کرلیا ہو، خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ نے خوب فرمایا ہے ؎

جو بچنا ہو غموں سے آپ کا دیوانہ ہو جائے

اس آیت میں اللہ والوں سے خوف وغم کی نفی کرنے سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی کسی تکلیف یا کسی خواہش ومراد پر اُن کو خوف وغم نہ ہوگا، آخرت کی فکر وغم اور اللہ جل شانہٗ کی ہیبت وجلال تو اُن پر اور سب سے زیادہ ہوتی ہے، اسی لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں یہ آیا ہے کہ آپ اکثر غمگین اور متفکر رہتے تھے، وجہ یہ ہے کہ آپ کا یہ فکر وغم کسی دنیوی نعمت کے فوت ہونے یا کسی مصیبت کے خطرہ سے نہیں، بلکہ اللہ جل شانہٗ کی ہیبت وجلال سے اور امت

کے حالات کی وجہ سے تھا۔

نیز اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ دنیا میں جو چیزیں خوفناک سمجھی جاتی ہیں ان سے انبیاء واولیاء کو بشری طور پر طبعی خوف نہ ہو، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جب لاٹھی کا سانپ بن گیا تو ان کا ڈر جانا قرآن مجید میں مذکور ہے۔ فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی (۲۰: ۶۷) کیونکہ یہ فطری اور طبعی خوف ابتداءِ حال میں تھا، جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا تَخَفْ تو یہ ڈر بالکل نکل گیا۔

اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ خوف عام انسانوں کی طرح اس بنیاد پر نہ تھا کہ یہ سانپ ان کو کوئی تکلیف پہنچائے گا، بلکہ اس لئے تھا کہ بنی اسرائیل اس سے کہیں گمراہی میں نہ پڑجائیں تو یہ خوف ایک قسم کا اخروی خوف تھا۔

آخری آیت وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا سے یہ بتلا دیا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت کی پیروی نہیں کریں گے اُن کا ٹھکانا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم ہوگا، اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس ہدایت کو ہدایت سمجھنے اور اس کی پیروی کرنے سے انکار کردیں یعنی کفار، اور مؤمنین جو ہدایت کو ہدایت ماننے کا اقرار کرتے ہیں وہ عملاً کیسے بھی گنہگار ہوں اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد بالآخر جہنم سے نکال لئے جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَوْفُوْا

اے بنی اسرائیل یاد کرو میرے وہ احسان جو میں نے تم پر کئے اور تم پورا کرو

بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِکُمْ ۚ وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾ وَاٰمِنُوْا بِمَآ

میرا اقرار تو میں پورا کروں تمہارا اقرار اور مجھ ہی سے ڈرو ، اور مان لو اس کتاب

اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمْ وَلَا تَکُوْنُوْٓا اَوَّلَ کَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَ

کو جو میں نے اتاری ہے سچ بتانیوالی ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے اور مت ہو سب میں اوّل منکر اس کے اور

لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ۡ وَّاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَلَا تَلْبِسُوا

نہ لو میری آیتوں پر مول تھوڑا اور مجھ ہی سے بچتے رہو ، اور مت ملاؤ

الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَکْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾

صحیح میں غلط اور مت چھپاؤ سچ کو جان بوجھ کر۔

خلاصۂ تفسیر

اے بنی اسرائیل (یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد)

یاد کرو تم لوگ میرے اُن احسانوں کو جو کئے ہیں میں نے تم پر (تاکہ حقِ نعمت سمجھ کر ایمان لانا تمہارے لئے آسان ہو جاوے، آگے اس یاد کرنے کی مراد بتلاتے ہیں) اور پورا کرو تم میرے عہد کو (یعنی تم نے جو توریت میں مجھ سے عہد کیا تھا جس کا بیان قرآن کی اس آیت میں ہے وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا (الآیہ) (۵: ۱۲) پورا کروں گا میں تمہارے عہد کو (یعنی میں نے جو عہد تم سے کیا تھا ایمان لانے پر جیسا کہ آیت مذکورہ میں ہے لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ) اور صرف مجھ ہی سے ڈرو (اپنے عوام معتقدین سے نہ ڈرو کہ ان کا اعتقاد نہ رہے گا اور ان سے آمدنی بند ہو جاوے گی) اور ایمان لے آؤ اس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے (یعنی قرآن پر) ایسی حالت میں کہ وہ سچ بتلانے والی ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے، (یعنی تورات کے کتابِ الٰہی ہونے کی تصدیق کرتی ہے، اور جو اس میں تحریفات کی گئی ہیں وہ خود تورات و انجیل ہونے ہی سے خارج ہیں ان کی تصدیق اس سے لازم نہیں آتی) اور مت ہو تم پہلے انکار کرنے والے اس قرآن کے (یعنی تمہیں دیکھ کر جو دوسرے لوگ انکار کریں گے اُن سب میں اوّل بانی انکار و کفر کے تم ہو گے اس لئے قیامت تک اُن کے کفر و انکار کا وبال تمہارے نامہ اعمال میں ہی درج ہوتا رہے گا) اور مت لو بمقابلہ میرے احکام کے معاوضہ حقیر اور خاص مجھ ہی سے پورے طور پر ڈرو، (یعنی میرے احکام چھوڑ کر یا اُن کو بدل کر یا چھپا کر عوام الناس سے دنیائے ذلیل و قلیل کو وصول مت کرو، جیسا کہ اُن کی عادت تھی جس کی تصریح آگے آتی ہے وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ) اور مخلوط مت کرو حق کو ناحق کے ساتھ اور پوشیدہ بھی مت کرو حق کو جس حالت میں کہ تم جانتے بھی ہو (کہ حق کو چھپانا بُری بات ہے)۔

معارف و مسائل

ربطِ آیات سورۂ بقرہ قرآن کے ذکر سے شروع کی گئی، اور یہ بتلایا گیا کہ قرآن کی ہدایت اگرچہ ساری مخلوق کے لئے عام ہے مگر اس سے نفع صرف مؤمنین اٹھائیں گے، اس کے بعد اُن لوگوں کے عذابِ شدید کا ذکر فرمایا جو اس پر ایمان نہیں لائے، ان میں ایک طبقہ کھلے کافروں اور منکروں کا تھا، دوسرا منافقین کا، دونوں کا مع ان کے کچھ حالات اور غلط کاریوں کے ذکر کیا گیا، اس کے بعد مؤمنین، مشرکین، منافقین کے تینوں طبقوں کو خطاب کر کے سب کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی تاکید کی گئی، اور قرآن مجید کے اعجاز کا ذکر کر کے سب کو دعوتِ ایمان دی گئی پھر تخلیقِ آدم علیہ السلام کا ذکر کر کے انسان کی اصلیت و حقیقت اور اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ واضح کی گئی تاکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت کی ترغیب اور نافرمانی سے بچنے کی فکر ہو۔

پھر کفار کی دو جماعتیں جن کا ذکر اوپر آیا ہے کھلے کافر اور منافق، ان دونوں میں دو طرح کے لوگ تھے، ایک تو بت پرست مشرکین جو محض باپ دادوں کی رسوم کی پیروی کرتے تھے کوئی علم قدیم یا جدید ان کے پاس نہ تھا، عام طور پر ان پڑھ اُمّی تھے، جیسے عام اہلِ مکہ، اسی لئے قرآن میں ان لوگوں کو اُمیّین کہا گیا ہے۔

دوسرے وہ لوگ تھے جو پچھلے انبیاءؑ پر ایمان لائے، اور پہلی آسمانی کتابوں تورات و انجیل وغیرہ کا علم اُن کے پاس تھا، لکھے پڑھے لوگ کہلاتے تھے، ان میں بعض حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے، عیسیٰ علیہ السلام پر نہیں، ان کو یہود کہا جاتا تھا، اور بعض عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بحیثیت نبی معصوم نہیں مانتے تھے، یہ نصاریٰ کہلاتے تھے، ان دونوں کو قرآن میں اس بناء پر اہلِ کتاب کہا گیا ہے کہ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی آسمانی کتاب تورات یا انجیل پر ایمان رکھتے تھے، یہ لوگ لکھے پڑھے اہلِ علم ہونے کی وجہ سے لوگوں کی نظر میں معزز اور قابلِ اعتماد مانے جاتے تھے، ان کی بات اُن پر اثرانداز ہوتی تھی، یہ راستے پر آجائیں تو دوسروں کے مسلمان ہونے کی توقع بڑی تھی، مدینہ طیبہ اور اس کے قرب و جوار میں ان لوگوں کی کثرت تھی۔

سورۂ بقرہ چونکہ مدنی سورت ہے، اس لئے اس میں مشرکین و منافقین کے بیان کے بعد اہل کتاب کو خصوصیت اور اہتمام کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے، چالیسویں آیت سے شروع ہو کر ایک سو تئیس آیات آخر پارہ الٓمّٓ تک انہی لوگوں سے خطاب ہے، جس میں ان کو مانوس کرنے کے لئے اوّل ان کی خاندانی شرافت اور اس سے دنیا میں حاصل ہونیوالے اعزاز کا پھر اللہ تعالیٰ کی مسلسل نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے، پھر اُن کی بے راہی اور غلط کاری پر متنبہ کیا گیا، اور صحیح راستہ کی طرف دعوت دی گئی، ان میں سے پہلی سات آیتوں میں اجمالی خطاب ہے، جن میں سے تین میں دعوتِ ایمان اور چار میں اعمالِ صالحہ کی تلقین ہے، اس کے بعد بڑی تفصیل سے ان کو خطاب کیا گیا، تفصیلی خطاب کے شروع میں اور بالکل ختم پر، پھر اہتمام کے لئے یٰبَنِیْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ فرما کر انھیں الفاظ کا اعادہ کیا گیا ہے جن سے شروع کیا گیا تھا، جیسا کہ کلام کو مؤثر اور وقیع بنانے کے لئے ایسا کرنے کا دستور ہے۔

یٰبَنِیْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ۔ اسرائیل عبرانی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی عبداللہ ہیں، یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا دوسرا نام ہے ______ بعض علماء نے فرمایا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور نبی کے نام متعدد نہیں ہیں، صرف حضرت یعقوب علیہ السلام کے دو نام ہیں، یعقوب اور اسرائیل، قرآن میں اس جگہ ان کو بنی یعقوب کہہ کر خطاب

نہیں کیا، بلکہ دوسرا نام اسرائیل کا استعمال کیا، اس میں حکمت یہ ہے کہ خود اپنے لقب اور نام ہی سے ان کو معلوم ہو جائے کہ ہم عبد اللہ یعنی اللہ کی عبادت گذار بندے کی اولاد ہیں، ہمیں بھی ان کے نقش قدم پر چلنا چاہئے، اس آیت میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ:۔

اور پورا کرو تم میرے عہد کو، یعنی تم نے جو مجھ سے عہد کیا تھا، توریت میں جس کا بیان بقول قتادہؓ و مجاہدؒ اس آیت میں ہے: وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَبَعَثْنَا مِنْھُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا (الیٰ) قَرْضًا حَسَنًا۔ (پارہ ۶، سورۂ مائدہ، آیت ۱۲) اس میں سب سے اہم معاہدہ تمام رسولوں پر ایمان لانے کا شامل ہے، جن میں ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خصوصیت سے داخل ہیں، نیز نماز، زکوٰۃ، اور صدقات بھی اس عہد میں شامل ہیں، جس کا خلاصہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور آپ کا مکمل اتباع ہے، اسی لئے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس عہد سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے (ابن جریر بسند صحیح)

پورا کروں گا میں تمہارے عہد کو، یعنی اسی آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ جو لوگ اس عہد کو پورا کریں گے تو ان کے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے، اور جنّت میں داخل کیا جائے گا، تو حسب وعدہ ان لوگوں کو جنّت کی نعمتوں سے سرفراز کیا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اے بنی اسرائیل تم میرا عہد محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا پورا کرو، تو میں اپنا عہد تمہاری مغفرت اور جنّت کا پورا کر دوں گا، اور صرف مجھ سے ہی ڈرو، اور عوام الناس معتقدین سے نہ ڈرو کہ ان کی منشاء کے خلاف کلمۂ حق کہیں گے تو وہ معتقد نہ رہیں گے، آمدنی بند ہو جائے گی۔

(۱) اُمتِ محمدیہ کی ایک خاص فضیلت

تفسیر قرطبی میں ہے کہ اللہ جل شانہ نے بنی اسرائیل کو اپنی نعمتیں اور احسانات یاد دلا کر اپنی یاد اور اطاعت کی طرف دعوت دی ہے، اور امتِ محمدیہ کو جب اسی کام کے لئے دعوت دی تو احسانات و انعامات کے ذکر کے بغیر فرمایا فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ "یعنی تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد رکھوں گا" اس میں امتِ محمدیہ کی خاص فضیلت کی طرف اشارہ ہے، کہ ان کا تعلق محسن و منعم سے بلا واسطہ ہے، یہ محسن کو پہچان کر احسان کو پہچانتے ہیں، بخلاف دوسری اُمتوں کے کہ وہ احسانات کے ذریعہ محسن کو پہچانتے ہیں۔

(۲) ایفائے عہد واجب اور عہد شکنی حرام ہے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ عہد و معاہدے کو پورا کرنا ضروری ہے، اور عہد شکنی حرام ہے، سورۂ مائدہ کی پہلی آیت میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ مضمون آیا ہے: اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عہد شکنی کرنے والوں کو جو سزا آخرت میں ملیگی

اس سے پہلے ہی ایک سزا یہ دی جائے گی کہ محشر کے میدان میں جہاں تمام اوّلین وآخرین کا اجتماع ہوگا عہد شکنی کرنے والے پر ایک جھنڈا بطور علامت کے لگا دیا جائے گا، اور جیسی بڑی عہد شکنی کی ہے اُتنا ہی یہ جھنڈا بلند ہوگا، اس طرح ان کو میدانِ حشر میں رُسوا اور شرمندہ کیا جائے گا (صحیح مسلم عن سعید)

(۳) جو شخص کسی گناہ یا ثواب کا سبب بنتا ہے، اس پر بھی کرنے والوں کا گناہ یا ثواب لکھا جاتا ہے

اَوَّلَ کَافِرٍۢ بِهٖ، کافر ہونا خواہ سب سے پہلے ہو یا بعد میں بہرحال انتہائی ظلم اور جرم ہے، مگر اس آیت میں یہ فرمایا کہ پہلے کافر نہ بنو، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ جو شخص اوّل کفر اختیار کرے گا تو بعد میں اس کو دیکھ کر جو بھی کفر میں مبتلا ہوگا اس کا وبال جو اس شخص پر پڑے گا، اس پہلے کافر پر بھی اس کا وبال آئے گا، اس طرح یہ پہلا کافر اپنے کفر کے علاوہ بعد کے لوگوں کے کفر کا سبب بنکر اُن سب کے وبالِ کفر کا بھی ذمہ دار ٹھہرے گا، اور اس کا عذاب چند در چند ہو جائے گا۔

فائدہ:۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص دنیا میں دوسروں کے لئے کسی گناہ میں مبتلا ہونے کا سبب بنتا ہے تو جتنے آدمی اس کے سبب سے مبتلائے گناہ ہوں گے ان سب کا گناہ ان لوگوں کو بھی ہوگا اور اس شخص کو بھی، اسی طرح جو شخص دوسروں کے لئے کسی نیکی کا سبب بن جائے تو جتنے آدمی اس کے سبب سے نیک عمل کریں گے، اس کا ثواب جیسا اُن لوگوں کو ملے گا ایسا ہی اس شخص کے نامۂ اعمال میں بھی لکھا جائے گا، قرآن مجید کی متعدد آیات اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث میں یہ مضمون بار بار آیا ہے۔

(۴) وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَـمَنًا قَلِيْلًا، اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی آیات کے بدلے میں قیمت لینے کی ممانعت کا مطلب وہ ہی ہے جو آیت کے سباق وسیاق سے معلوم ہوتا ہے، کہ لوگوں کی مرضی اور ان کی اغراض کی خاطر اللہ تعالیٰ کی آیات کا مطلب غلط بتلا کر یا چھپا کر لوگوں سے پیسے لئے جائیں، یہ فعل باجماع امّت حرام ہے۔

(۵) تعلیم قرآن پر اجرت لینا جائز ہے

رہا یہ معاملہ کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کی آیات صحیح صحیح بتلا کر یا پڑھا کر اس کی اجرت لینا کیسا ہے؟ اس کا تعلق آیت مذکورہ سے نہیں، خود یہ مسئلہ اپنی جگہ قابلِ غور وبحث ہے کہ تعلیم قرآن پر اجرت ومعاوضہ لینا جائز ہے یا نہیں، فقہاءِ امّت کا اس میں اختلاف ہے، امام مالکؒ شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ جائز قرار دیتے ہیں، اور امام اعظم ابو حنیفہؒ اور بعض دوسرے ائمہؒ منع فرماتے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو ذریعہ کسبِ معاش کا بنانے سے منع فرمایا ہے۔

لیکن متاخرین حنفیہ نے بھی جب ان حالات کا مشاہدہ کیا کہ قرآن مجید کے معلمین کو اسلامی بیت المال سے گزارہ ملا کرتا تھا، اب ہر جگہ اسلامی نظام میں فتور کے سبب ان معلمین

کو عموماً کچھ نہیں ملتا، یہ اگر اپنے معاش کے لئے کسی محنت مزدوری یا تجارت وغیرہ میں لگ جائیں تو بچوں کو تعلیم قرآن کا سلسلہ یکسر بند ہو جائے گا، کیونکہ وہ دن بھر کا مشغلہ چاہتا ہے، اس لئے تعلیم قرآن پر تنخواہ لینے کو بضرورت جائز قرار دیا، جیسا کہ صاحب ہدایہ نے فرمایا ہے کہ آجکل اسی پر فتویٰ دینا چاہئے، کہ تعلیم قرآن پر اُجرت و تنخواہ لینا جائز ہے، صاحب ہدایہ کے بعد آنے والے دوسرے فقہاء نے بعض ایسے ہی دوسرے وظائف جن پر تعلیم قرآن کی طرح دین کی بقاء موقوف ہو، مثلاً امامت واذان اور تعلیم حدیث و فقہ وغیرہ کو تعلیم قرآن کے ساتھ ملحق کر کے ان کی بھی اجازت دی (در مختار، شامی)

(۶) ایصالِ ثواب کے لئے ختم قرآن پر اجرت لینا باتفاق جائز نہیں

علامہ شامیؒ نے درمختار کی شرح میں اور اپنے رسالہ شفاء العلیل میں بڑی تفصیل اور قوی دلائل کے ساتھ یہ بات واضح کر دی ہے کہ تعلیم قرآن وغیرہ پر اجرت لینے کو جن متاخرین فقہاء نے جائز قرار دیا ہے اس کی علت ایک ایسی دینی ضرورت ہے جس میں خلل آنے سے دین کا پورا نظام مختل ہو جاتا ہے، اس لئے اس کو ایسی ہی ضرورت کے مواقع میں محدود رکھنا ضروری ہے، اس لئے مُردوں کو ایصالِ ثواب کیلئے ختم قرآن کرانا یا کوئی دوسرا وظیفہ پڑھوانا اجرت کے ساتھ حرام ہے، کیونکہ اُس پر کسی عام دینی ضرورت کا مدار نہیں، اور اجرت لیکر پڑھنا حرام ہوا تو اس طرح پڑھنے والا اور پڑھوانے والا دونوں گناہگار ہوئے، اور جب پڑھنے والے ہی کو کوئی ثواب نہ ملا تو میت کو وہ کیا پہنچائے گا، علامہ شامیؒ نے اس بات پر فقہاء کی بہت سی تصریحات تاج الشریعۃ، عینیؒ شرح ہدایہ، حاشیہ خیر الدین بر بحر الرائق وغیرہ سے نقل کی ہیں، اور خیر الدین رملی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ایصالِ ثواب کے لئے قبر پر قرآن پڑھوانا یا اجرت دے کر ختم قرآن کرانا صحابہؓ و تابعینؒ اور اسلاف امتؒ سے کہیں منقول نہیں، اس لئے بدعت ہے (شامی، ص ۳۴، ج ۱)

(۷) حق بات کو چھپانا یا اس میں خلط ملط کرنا حرام ہے

آیت وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ الخ سے ثابت ہوا کہ حق بات کو غلط باتوں کے ساتھ گڈمڈ کر کے اس طرح پیش کرنا جس سے مخاطب مغالطہ میں پڑ جائے جائز نہیں، اسی طرح کسی خوف یا طمع کی وجہ سے حق بات کا چھپانا بھی حرام ہے، مسئلہ واضح ہے، اس میں کسی تفصیل کی ضرورت نہیں، امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں حق کو چھپانے سے پرہیز کرنے کا ایک واقعہ اور مفصل مکالمہ حضرت ابو حازمؒ تابعی اور خلیفہ سلیمان بن عبد الملکؒ کا نقل کیا ہے، جو بہت سے فوائد کی وجہ سے قابلِ ذکر ہے۔

حضرت ابو حازمؒ تابعی سلیمان ابن عبد الملکؒ کے دربار میں

مسند دارمی میں سند کے ساتھ مذکور ہے کہ ایک مرتبہ سلیمان بن عبد الملکؒ مدینہ طیبہ پہنچے اور چند روز قیام کیا تو لوگوں سے دریافت کیا کہ مدینہ طیبہ میں اب کوئی ایسا آدمی موجود ہے جس نے

کسی صحابیؓ کی صحبت پائی ہو؟ لوگوں نے بتلایا، ہاں ابو حازمؒ ایسے شخص ہیں، سلیمان نے اپنا آدمی بھیج کر اُن کو بُلوالیا، جب وہ تشریف لائے تو سلیمانؒ نے کہا کہ اے ابو حازمؒ یہ کیا بے مروتی اور بیوفائی ہے؟ ابو حازمؒ نے کہا، آپنے میری کیا بے مروتی اور بیوفائی دیکھی ہے؟ سلیمانؒ نے کہا کہ مدینہ کے سب مشہور لوگ مجھ سے ملنے آئے، آپ نہیں آئے، ابو حازمؒ نے کہا، امیرالمؤمنین میں آپ کو اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں اس سے کہ آپ کوئی ایسی بات کہیں جو واقعہ کے خلاف ہے، آج سے پہلے نہ آپ مجھ سے واقف تھے اور نہ میں نے کبھی آپ کو دیکھا تھا، ایسے حالات میں خود ملاقات کے لئے آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بیوفائی کیسی؟

سلیمانؒ نے جواب سنکر ابن شہاب زہریؒ اور حاضرین مجلس کی طرف التفات کیا، تو امام زہریؒ نے فرمایا کہ ابو حازم نے صحیح فرمایا، آپ نے غلطی کی۔

اس کے بعد سلیمانؒ نے رُوئے سخن بدل کر کچھ سوالات شروع کئے اور کہا اے ابو حازمؒ! یہ کیا بات ہے کہ ہم موت سے گھبراتے ہیں؟ آپ نے فرمایا وجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی آخرت کو ویران اور دنیا کو آباد کیا ہے، اس لئے آبادی سے ویرانہ میں جانا پسند نہیں۔

سلیمانؒ نے تسلیم کیا، اور پوچھا کہ کل اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری کیسے ہوگی؟ فرمایا کہ نیک عمل کرنے والا تو اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح جائے گا جیسا کوئی مسافر سفر سے واپس اپنے گھر والوں کے پاس جاتا ہے، اور بُرے عمل کرنے والا اس طرح پیش ہوگا، جیسا کوئی بھاگا ہوا غلام پکڑ کر آقا کے پاس حاضر کیا جائے۔

سلیمانؒ یہ سُنکر رو پڑے، اور کہنے لگے کاش ہمیں معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے کیا صورت تجویز کر رکھی ہے، ابو حازم نے فرمایا کہ اپنے اعمال کو اللہ کی کتاب پر پیش کرو تو پتہ لگ جائیگا

سلیمانؒ نے دریافت کیا کہ قرآن کی کس آیت سے یہ پتہ لگے گا؟ فرمایا اس آیت سے:
اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ وَّ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ (۸۳: ۱۳-۱۴) "یعنی بلاشبہ نیک عمل کرنے والے جنّت کی نعمتوں میں ہیں، اور نافرمان، گناہ شعار دوزخ میں"

سلیمان نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تو بڑی ہے، وہ بدکاروں پر بھی حاوی ہے، فرمایا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ (۷: ۵۶) "یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت نیک عمل کرنے والوں سے قریب ہے"

سلیمانؒ نے پوچھا اے ابو حازمؒ اللہ کے بندوں میں سب سے زیادہ کون عزت والا ہے؟ فرمایا وہ لوگ جو مروّت اور عقل سلیم رکھنے والے ہیں۔

پھر پوچھا کہ کونسا عمل افضل ہے؟ تو فرمایا کہ فرائض و واجبات کی ادائیگی حرام چیزوں

سے بچنے کے ساتھ۔

پھر دریافت کیا کہ کونسی دعاء زیادہ قابل قبول ہے؟ تو فرمایا کہ جس شخص پر احسان کیا گیا ہو اس کی دعاء اپنے محسن کے لئے اقرب الی القبول ہے۔

پھر دریافت کیا کہ صدقہ کونسا افضل ہے؟ تو فرمایا کہ مصیبت زدہ سائل کے لئے باوجود اپنے افلاس کے جو کچھ ہو سکے، اس طرح خرچ کرنا کہ نہ اس سے پہلے احسان جتائے اور نہ ٹال مٹول کر کے ایذاء پہونچائے۔

پھر دریافت کیا کہ کلام کونسا افضل ہے؟ تو فرمایا کہ جس شخص سے تم کو خوف ہو یا جس سے تمھاری کوئی حاجت ہو اور امید وابستہ ہو اس کے سامنے بغیر کسی رورعایت کے حق بات کہدینا۔

پھر دریافت کیا کہ کونسا مسلمان سب سے زیادہ ہوشیار ہے؟ فرمایا وہ شخص جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے تحت کام کیا ہو، اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دی ہو۔

پھر پوچھا کہ مسلمانوں میں کون شخص احمق ہے؟ فرمایا وہ آدمی جو اپنے کسی بھائی کی اس کے ظلم میں امداد کرے، جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اس نے دوسرے کی دنیا درست کرنے کے لئے اپنا دین بیچ دیا، سلیمانؒ نے کہا کہ صحیح فرمایا۔

اس کے بعد سلیمانؒ نے اور واضح الفاظ میں دریافت کیا کہ ہمارے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ ابوحازمؒ نے فرمایا کہ مجھے اس سوال سے معاف رکھیں تو بہتر ہے، سلیمانؒ نے کہا کہ نہیں، آپ ضرور کوئی نصیحت کا کلمہ کہیں۔

ابوحازمؒ نے فرمایا: اے امیر المؤمنین تمھارے آباء واجداد نے بزور شمشیر لوگوں پر تسلط کیا، اور زبردستی ان کی مرضی کے خلاف ان پر حکومت قائم کی، اور بہت سے لوگوں کو قتل کیا، اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے، کاش! آپ کو معلوم ہوتا کہ اب وہ مرنے کے بعد کیا کہتے ہیں، اور ان کو کیا کہا جاتا ہے۔

حاشیہ نشینوں میں سے ایک شخص نے بادشاہ کے مزاج کے خلاف ابوحازمؒ کی اس صاف گوئی کو سنکر کہا کہ ابوحازمؒ تم نے یہ بہت بُری بات کہی ہے، ابوحازمؒ نے فرمایا کہ تم غلط کہتے ہو، بُری بات نہیں کہی، بلکہ وہ بات کہی جس کا ہم کو حکم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے علماء سے اس کا عہد لیا ہے کہ حق بات لوگوں کو بتلائیں گے چھپائیں گے نہیں، لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ - (۳: ۱۸۷)

یہی وہ بات ہے جس کے لئے یہ طویل حکایت امام قرطبی نے آیتِ مذکورہ کی تفسیر میں درج فرمائی ہے۔

سلیمانؒ نے پھر سوال کیا کہ اچھا اب ہمارے درست ہونے کا کیا طریقہ ہے؟ فرمایا کہ

تکبر چھوڑ دو، مروت اختیار کرو، اور حقوق والوں کو ان کے حقوق انصاف کے ساتھ تقسیم کر دو۔

سلیمانؒ نے کہا کہ ابو حازمؒ کیا ہو سکتا ہے کہ آپ ہمارے ساتھ رہیں، فرمایا: خدا کی پناہ سلیمانؒ نے پوچھا یہ کیوں؟ فرمایا کہ اس لئے کہ مجھے خطرہ یہ ہے کہ میں تمہارے مال و دولت اور عزت وجاہ کی طرف کچھ مائل ہو جاؤں جس کے نتیجہ میں مجھے عذاب بھگتنا پڑے۔

پھر سلیمانؒ نے کہا کہ اچھا آپ کی کوئی حاجت ہو تو بتلائیے کہ ہم اس کو پورا کریں؟ فرمایا: ہاں ایک حاجت ہے کہ جہنم سے نجات دلا دو اور جنت میں داخل کر دو، سلیمانؒ نے کہا کہ یہ تو میرے اختیار میں نہیں فرمایا کہ پھر مجھے آپ سے اور کوئی حاجت مطلوب نہیں۔

آخر میں سلیمانؒ نے کہا کہ اچھا میرے لئے دعاء کیجئے، تو ابو حازمؒ نے یہ دعاء کی، یا اللہ اگر سلیمان آپ کا پسندیدہ ہے تو اس کے لئے دنیا و آخرت کی بہتری کو آسان بنا دے، اور اگر وہ آپ کا دشمن ہے تو اس کے بال پکڑ کر اپنی مرضی اور محبوب کاموں کی طرف لے آ۔

سلیمانؒ نے کہا کہ مجھے کچھ وصیت فرما دیں، ارشاد فرمایا کہ مختصر یہ ہے کہ اپنے رب کی عظمت و جلال اس درجہ میں رکھو، کہ وہ تمہیں اس مقام پر نہ دیکھے جس سے منع کیا ہے، اور اس مقام سے غیر حاضر نہ پائے جس کی طرف آنے کا اس نے حکم دیا ہے۔

سلیمان نے اس مجلس سے فارغ ہونے کے بعد سو گنیاں بطور ہدیہ کے ابو حازم کے پاس بھیجیں، ابو حازم نے ایک خط کے ساتھ اُن کو واپس کر دیا، خط میں لکھا تھا کہ اگر یہ سو دینار میرے کلمات کا معاوضہ ہیں تو میرے نزدیک خون اور خنزیر کا گوشت اس سے بہتر ہے، اور اگر اس لئے بھیجا ہے کہ بیت المال میں میرا حق ہے تو مجھ جیسے ہزاروں علماء اور دین کی خدمت کرنے والے ہیں، اگر سب کو آپ نے اتنا ہی دیا ہے تو میں بھی لے سکتا ہوں، ورنہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

ابو حازم کے اس ارشاد سے کہ اپنے کلماتِ نصیحت کا معاوضہ لینے کو خون اور خنزیر کی طرح قرار دیا ہے اس مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ کسی طاعت و عبادت کا معاوضہ لینا اُن کے نزدیک جائز نہیں۔

وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ وَآتُوا الزَّكَوٰةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ﴿٤٣﴾

اور قائم رکھو نماز　اور دیا کرو زکوٰۃ　اور جھکو نماز میں　جھکنے والوں کے ساتھ

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُمْ وَأَنتُمْ تَتْلُونَ

کیا حکم کرتے ہو لوگوں کو نیک کام کا　اور بھولتے ہو اپنے آپ کو　اور تم تو پڑھتے ہو

الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَ	
کتاب پھر کیوں نہیں سوچتے ہو، اور مدد چاہو صبر سے اور نماز سے اور	
اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ	
البتہ وہ بھاری ہے مگر انہی عاجزوں پر جن کو خیال ہے کہ وہ روبرو ہونے والے	
مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾ ع	
ہیں اپنے رب کے اور یہ کہ اُن کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ۔	

خلاصۂ تفسیر

اور قائم کرو تم لوگ نماز کو (یعنی مسلمان ہو کر) اور دو زکوٰۃ کو اور عاجزی کرو عاجزی کرنے والوں کے ساتھ (علماء بنی اسرائیل کے بعض اقارب مسلمان ہوگئے تھے جب ان سے گفتگو ہوتی تو خفیہ طور پر یہ علماء اُن سے کہتے تھے کہ بیشک محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول برحق ہیں ہم لوگ تو کسی مصلحت سے مسلمان نہیں ہوتے، مگر تم اس مذہب اسلام کو نہ چھوڑنا، اسی بناء پر حق تعالیٰ نے فرمایا) کیا غضب ہے کہ کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کام کرنے کو (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور آپ کی اطاعت کرنے کو) اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ تم تلاوت کرتے رہتے ہو کتاب کی (یعنی توریت کی جس میں جابجا ایسے عالم بے عمل کی مذمتیں مذکور ہیں) تو پھر کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے اور مدد لو (یعنی اگر تم کو حُبِّ مال و حُبِّ جاہ کی وجہ سے ایمان لانا دشوار معلوم ہوتا ہو تو مدد لو) صبر اور نماز سے (یعنی ایمان لاکر صبر اور نماز کا التزام کرو تو یہ حُبِّ مال وجاہ دل سے نکل جائے گی، اور اگر کوئی کہے کہ خود نماز اور صبر کا التزام بہت دشوار ہے تو سُن لے کہ) اور بیشک وہ نماز دشوار ضرور ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہو اُن پر کچھ بھی دشوار نہیں، وہ خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بیشک ملنے والے ہیں اپنے رب سے اور اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں (تو اس وقت اس کا حساب کتاب بھی دینا ہوگا، ان دونوں خیالوں سے رغبت بھی پیدا ہوگی خوف بھی اور یہی دو چیزیں ہر عمل کی رُوح ہیں)۔

معارف ومسائل

ربطِ آیات | بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتیں اور احسانات یاد دلاکر ایمان اور عمل صالح

کی طرف دعوت دی ہے، پچھلی تین آیتوں میں ایمان وعقائد سے متعلق ہدایات تھیں، اور ان چار آیتوں میں اعمالِ صالحہ کی تلقین ہے، اور ان میں جو اعمال سب سے زیادہ اہم ہیں ان کا ذکر ہے، اور حاصلِ مطلب آیات کا یہ ہے کہ ـــــــ اور اگر تم کو حبِ مال وجاہ کے غلبہ سے ایمان لانا دشوار معلوم ہوتا ہو تو اس کا علاج یہ ہو کہ صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو، صبر سے حُبِ مال گھٹ جائے گی، کیونکہ مال اسی وجہ سے مطلوب و محبوب ہے کہ وہ ذریعہ ہے لذات و شہوات کے پورا کرنے کا، جب ان لذات و شہوات کی مطلق العنانی چھوڑنے پر ہمت باندھ لوگے، تو پھر مال کی فراوانی کی نہ ضرورت رہے گی نہ اُس کی محبت ایسی غالب آئے گی کہ اپنے نفع نقصان سے اندھا کر دے، اور نماز سے حبِ جاہ کم ہو جائے گی، کیونکہ نماز میں ظاہری اور باطنی ہر طرح کی پستی اور عاجزی ہی ہے، جب نماز کو صحیح صحیح ادا کرنے کی عادت ہو جائے گی تو حبِ جاہ و منصب اور تکبر و غرور گھٹے گا، اصل مادۂ فساد جس کے سبب ایمان لانا دشوار تھا یہی مال وجاہ کی محبت تھی، جب یہ مادۂ فساد گھٹ گیا تو ایمان لانا آسان ہو جائے گا۔

اب سمجھئے کہ صبر میں تو صرف غیر ضروری خواہشات اور شہوات کا ترک کرنا ہے، اور نماز میں بہت سے افعال کا واقع کرنا بھی ہے، اور بہت سی جائز خواہشات کو بھی وقتی طور پر ترک کرنا ہو مثلاً کھانا، پینا، کلام کرنا، چلنا پھرنا، اور دوسری انسانی ضروریات جو شرعاً جائز و مباح ہیں ان کو بھی نماز کے وقت ترک کرنا ہے، اور وہ بھی اوقات کی پابندی کے ساتھ دن رات میں پانچ مرتبہ، اس لئے نماز نام ہو کچھ افعال معینہ کا، اور معیّن اوقات میں تمام ناجائز و جائز چیزوں سے صبر کرنے کا۔

غیر ضروری خواہشات کے ترک کرنے پر انسان ہمت باندھ لے تو چند روز کے بعد طبعی تقاضا بھی ختم ہو جاتا ہے، کوئی دشواری نہیں رہتی، لیکن نماز کے اوقات کی پابندی اور اس کے تمام شرائط کی پابندی اور ضروری خواہشات سے بھی ان اوقات میں پرہیز کرنا یہ انسانی طبیعت پر بہت بھاری اور دشوار ہے، اس لئے یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ایمان کو آسان بنانے کا جو نسخہ تجویز کیا گیا کہ صبر اور نماز سے کام لو، اس نسخہ کا استعمال خود ایک دشوار چیز ہو خصوصاً نماز کی پابندیوں کا، تو اس دشواری کا کیا علاج ہوگا؟ اس کے لئے ارشاد فرمایا، بیشک وہ نماز دشوار ضرور ہے، مگر جن کے قلوب میں خشوع ہو ان پر کچھ بھی دشوار نہیں، اس میں نماز کے آسان کرنے کی ترکیب بتلادی گئی۔

حاصل یہ ہو کہ نماز میں دشواری کی وجہ اور سبب پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ انسان کا قلب خوگر ہو میدانِ خیال میں آزاد پھرنے کا، اور سب اعضاء انسانی قلب کے تابع ہیں، اس لئے قلب کا تقاضا یہی ہوتا ہو کہ اس کے سب اعضاء بھی آزاد رہیں، اور نماز سراسر اس آزادی کے خلاف

ہے، کہ نہ ہنسو نہ بولو نہ کھاؤ، نہ پیو، نہ چلو، وغیرہ وغیرہ، اس لئے قلب ان تقیدات سے تنگ ہوتا ہے، اوراس کے تابع اعضائے انسانی بھی اس سے تکلیف محسوس کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہو کہ سبب اس دشواری اورگرانی کا قلب کی حرکتِ فکریہ ہے، تو اس کا علاج سکون سے ہونا چاہئے، اس لئے خشوع کو نماز کے آسان ہونے کا ذریعہ بتایا گیا، کیونکہ خشوع کے معنی ہی سکونِ قلب کے ہیں، اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سکونِ قلب یعنی خشوع کس طرح حاصل ہو تو یہ بات تجربہ سے ثابت ہو کہ اگر کوئی شخص اپنے قلب سے مختلف افکار وخیالات کو براہِ راست نکالنا چاہے تو اس میں کامیابی قریب بمحال ہو، بلکہ اس کی تدبیر یہ ہو کہ نفسِ انسانی چونکہ ایک وقت میں دو طرف متوجہ نہیں ہوسکتا، اس لئے اگر اس کو کسی ایک خیال میں محو ومستغرق کر دیا جائے تو دوسرے خیالات اور افکار خود بخود دل سے نکل جائیں گے، اس لئے تلقین خشوع کے بعد وہ خیال بتلاتے ہیں جس میں مستغرق ہوجانے سے دوسرے خیالات دفع ہوں، اور اُن کے دفع ہونے سے حرکتِ فکریہ قلب کی منقطع ہوکر سکون حاصل ہو، اور سکون سے نماز میں آسانی ہوکر اس پر مداومت اور پابندی نصیب ہو، اور اس پابندی سے کبر وغرور اور حبِّ جاہ کم ہو، تاکہ ایمان کے رستہ میں جو حائل ہے وہ دور ہوکر ایمان کامل ہوجائے، سبحان اللہ کیا مرتب علاج اور مطب ہے۔

اب اس خیال مذکور کی تلقین وتعیین اس طرح فرمائی: وہ خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بے شک ملنے والے ہیں اپنے رب سے، تو اس وقت اس خدمت کا خوب انعام ملے گا، اور اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں، تو اس وقت اس کا حساب وکتاب بھی دینا ہوگا، ان دونوں خیالوں سے رغبت ورہبت یعنی امید اور خوف پیدا ہوں گے، اوّل تو ہر خیالِ محمود میں مستغرق ہوجانا قلب کو نیک کام پر جما دیتا ہو، خصوصاً امید وبیم کا خیال، اس کو تو خاص طور پر دخل ہے نیک کام میں مستعد کر دینے کے لئے۔

اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ، صلوٰۃ کے لفظی معنیٰ دعاء کے ہیں، اصطلاح شرع میں وہ خاص عبادت ہے جس کو نماز کہا جاتا ہے، قرآن کریم میں عموماً نماز کی جتنی مرتبہ تاکید کی گئی ہے لفظ اقامت کے ساتھ آئی ہے، مطلق نماز پڑھنے کا ذکر صرف ایک دو جگہ آیا ہے، اس لئے اقامتِ صلوٰۃ کی حقیقت کو سمجھنا چاہئے، اقامت کے لفظی معنی سیدھا کرنے اور ثابت رکھنے کے ہیں، اور عادۃً جو عمود یا دیوار یا درخت وغیرہ سیدھا کھڑا ہوتا ہو وہ قائم رہتا ہے، گر جانے کا خطرہ کم ہوتا ہو، اس لئے اقامت کے معنی دائم اور قائم کرنے کے بھی آتے ہیں۔

قرآن وسنت کی اصطلاح میں اقامتِ صلوٰۃ کے معنی نماز کو اس کے وقت میں پابندی کے ساتھ اس کے پورے آداب وشرائط کی رعایت کرکے ادا کرنا ہیں، مطلق نماز پڑھ لینے کا نام اقامتِ

صلوٰۃ نہیں ہے، نماز کے جتنے فضائل اور آثار و برکات قرآن و حدیث میں آئے ہیں وہ سب اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ مقید ہیں، مثلاً قرآن کریم میں ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ۔ (۲۹: ۴۵)	"یعنی نماز انسان کو ہر بے حیائی اور ہر بُرے کام سے روک دیتی ہے۔"

نماز کا یہ اثر اسی وقت ظاہر ہوگا جب کہ نماز کی اقامت اس معنی سے کرے جو ابھی ذکر کئے گئے ہیں، اس لئے بہت سے نمازیوں کو بُرائیوں اور بے حیائیوں میں مبتلا دیکھ کر اس آیت پر کوئی شبہ نہ کرنا چاہئے، کیونکہ ان لوگوں نے نماز پڑھی تو ہے مگر اس کو قائم نہیں کیا۔

اٰتُوا الزَّکوٰۃَ، لفظ زکوٰۃ کے معنی لغت میں دو آتے ہیں، پاک کرنا اور بڑھنا، اصطلاحِ شریعت میں مال کے اس حصّہ کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے جو شریعت کے احکام کے مطابق کسی مال میں سے نکالا جائے اور اس کے مطابق صرف کیا جائے۔

اگرچہ یہاں خطاب موجودہ بنی اسرائیل کو ہے جس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نماز اور زکوٰۃ اسلام سے پہلے بنی اسرائیل پر فرض تھی، مگر سورۂ مائدہ میں وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ج وَبَعَثْنَا مِنْھُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا ط وَقَالَ اللّٰہُ اِنِّیْ مَعَکُمْ ط لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ (۵: ۱۲) الخ سے ثابت ہے کہ نماز اور زکوٰۃ بنی اسرائیل پر فرض تھی، اگرچہ اس کی کیفیت اور ہیئت وغیرہ میں فرق ہو۔

وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ۔ رکوع کے لغوی معنی جھکنے کے ہیں، اور اسی معنی کے اعتبار سے یہ لفظ سجدہ پر بھی بولا جاسکتا ہے، کیونکہ وہ بھی جھکنے کا انتہائی درجہ ہے، مگر اصطلاحِ شرع میں اس خاص جھکنے کو رکوع کہتے ہیں جو نماز میں معروف و مشہور ہے۔

آیت کے معنیٰ یہ ہیں کہ "رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ" یہاں ایک بات یہ قابلِ غور ہے کہ نماز کے تمام ارکان میں سے اس جگہ رکوع کی تخصیص کیوں کی گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں نماز کا ایک جزء بول کر کُل نماز مراد لی گئی ہے، جیسے قرآن مجید میں ایک جگہ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ فرما کر پوری نماز فجر مراد ہے، اور بعض روایات حدیث میں سجدہ کا لفظ بول کر پوری رکعت یا نماز مراد لی گئی ہے، اس لئے مراد آیت کی یہ ہوگئی کہ نماز پڑھو نماز پڑھنے والوں کے ساتھ، لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ نماز کے بہت سے ارکان میں سے رکوع کی تخصیص میں کیا حکمت ہے؟

جواب یہ ہے کہ یہود کی نماز میں سجدہ وغیرہ تو تھا، مگر رکوع نہیں تھا، رکوع اسلامی نماز کی خصوصیات میں سے ہے، اس لئے راکعین کے لفظ سے امتِ محمدیہ کے نمازی مراد ہوں گے، جن کی نماز میں رکوع بھی ہے، اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم بھی امتِ محمدیہ کے نمازیوں کے ساتھ نماز ادا کرو، یعنی اوّل ایمان قبول کرو پھر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرو۔

باجماعت نماز کے احکام نماز کا حکم اور اس کا فرض ہونا تو لفظ "اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" سے معلوم ہوچکا تھا، اس جگہ مَعَ الرّٰکِعِیْنَ کے لفظ سے نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

یہ حکم کس درجہ کا ہے؟ اس میں علماء فقہاء کا اختلاف ہے، ایک جماعت صحابہؓ وتابعینؒ اور فقہائے امت کی جماعت کو واجب قرار دیتی ہے، اور اس کے چھوڑنے کو سخت گناہ اور بعض صحابہ کرامؓ تو اس نماز ہی کو جائز قرار نہیں دیتے جو بلا عذر شرعی کے بدون جماعت پڑھی جائے، یہ آیت ظاہری الفاظ کے اعتبار سے ان حضرات کی حجت ہے، جو وجوبِ جماعت کے قائل ہیں۔

اس کے علاوہ چند روایاتِ حدیث سے بھی جماعت کا واجب ہونا سمجھا جاتا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ:

لَاصَلٰوۃَ لِجَارِ الْمَسْجِدِ اِلَّا فِی الْمَسْجِدِ (رواہ ابوداؤد)

"یعنی مسجد کے قریب رہنے والے کی نماز صرف مسجد ہی میں جائز ہے"

اور مسجد کی نماز سے ظاہر ہے کہ جماعت کی نماز مراد ہے، تو الفاظِ حدیث سے یہ مطلب نکلا کہ مسجد کے قریب رہنے والے کی نماز بغیر جماعت کے جائز نہیں۔

مسجد کے سوا کسی اور جگہ جماعت اور صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ منقول ہے کہ ایک نابینا صحابیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے ساتھ کوئی ایسا آدمی نہیں جو مجھے مسجد تک پہنچا دیا اور لیجایا کرے، اس لئے اگر آپؐ اجازت دیں تو میں نماز گھر میں پڑھ لیا کروں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اوّل تو ان کو اجازت دیدی، مگر جب وہ جانے لگے تو سوال کیا کہ کیا اذان کی آواز تمہارے گھر تک پہونچتی ہے؟ انھوں نے عرض کی کہ اذان کی آواز تو میں سنتا ہوں، آپؐ نے فرمایا پھر تو آپ کو مسجد میں آنا چاہئے، اور بعض روایات میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ پھر میں آپ کے لئے کوئی گنجائش اور رخصت نہیں پاتا (اخرجہ ابوداؤد)

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ سَمِعَ النِّدَاءَ فَلَمْ یُجِبْ فَلَاصَلٰوۃَ لَہٗ اِلَّا مِنْ عُذْرٍ (صححہ القرطبی)

"یعنی جو شخص اذان کی آواز سنتا ہے اور جماعت مسجد میں نہیں آتا تو اس کی نماز نہیں ہوتی مگر یہ کہ اس کو کوئی عذر شرعی ہو"

ان احادیث کی بناء پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابوموسیٰ اشعریؓ وغیرہ حضرات صحابہؓ نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ جو شخص مسجد سے اتنا قریب رہتا ہے کہ اذان کی آواز وہاں تک پہونچتی ہے تو اگر وہ بلا عذر کے جماعت میں حاضر نہ ہوا تو اس کی نماز ہی نہیں ہوتی (آواز سننے سے مراد یہ ہے کہ متوسط آواز والے آدمی کی آواز وہاں پہونچ سکے، آلہ مکبر الصوت یا غیر معمولی بلند آواز کا اس میں اعتبار نہیں)،

یہ سب روایات ان حضرات کی دلیل ہیں جو جماعت کو واجب قرار دیتے ہیں، مگر جمہور امت علماء و فقہاء صحابہؓ و تابعینؒ کے نزدیک جماعت سنت مؤکدہ ہے، مگر سنن مؤکدہ میں سنت فجر کی طرح سب سے زیادہ مؤکد اور قریب بوجوب ہے، ان سب حضرات نے قرآن کریم کے امر وَارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ کو دوسری آیات اور روایات کی بناء پر تاکید کے لئے قرار دیا ہے۔

اور جن احادیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے قریب رہنے والے کی نماز بغیر جماعت کے ہوتی ہی نہیں، اس کا یہ مطلب قرار دیتے ہیں کہ یہ نماز کامل اور مقبول نہیں، اس معاملے میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بیان بہت واضح اور کافی ہے جس کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے:

فقیہ الامت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ کل (محشر میں) اللہ تعالیٰ سے مسلمان ہونے کی حالت میں ملے تو اس کو چاہئے کہ ان (پانچ) نمازوں کے ادا کرنے کی پابندی اس جگہ کرے جہاں اذان دی جاتی ہے، (یعنی مسجد) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کچھ ہدایت کے طریقے بتلائے ہیں، اور ان پانچ نمازوں کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا انہی سنن ہدیٰ میں ہے، اور اگر تم نے یہ نمازیں اپنے گھر میں پڑھ لیں، جیسے یہ جماعت سے الگ رہنے والا اپنے گھر میں پڑھ لیتا ہے (کسی خاص شخص کی طرف اشارہ کر کے فرمایا) تو تم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑ بیٹھو گے، اور اگر تم نے اپنے نبیؐ کی سنت کو چھوڑ دیا تو تم گمراہ ہو جاؤ گے (اور جو شخص وضو کرے اور اچھی طرح پاکی حاصل کرے) پھر کسی مسجد کا رُخ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر قدم پر نیکی اس کے نامۂ اعمال میں درج فرماتے ہیں، اور اس کا ایک درجہ بڑھا دیتے ہیں، اور ایک گناہ معاف کر دیتے ہیں، اور ہم نے اپنے مجمع کو ایسا پایا ہے کہ منافق بیّن النفاق کے سوا کوئی آدمی جماعت سے الگ نماز نہ پڑھتا تھا، یہاں تک کہ بعض حضرات کو عذر اور بیماری میں بھی دو آدمیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر مسجد میں لایا جاتا اور صف میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔

اس بیان میں جس طرح باجماعت نماز کی پوری تاکید اور اہمیت و ضرورت کا ذکر ہے اسی کے ساتھ اس کا یہ درجہ بھی بیان فرما دیا کہ وہ سنن ہُدیٰ میں سے ہے جس کو فقہاء سنتِ مؤکدہ کہتے ہیں، چنانچہ اگر کوئی شخص عذر شرعی مثلاً مرض وغیرہ کے بغیر تنہا نماز پڑھ لے، اور جماعت میں شریک نہ ہو تو اس کی نماز تو ہو جائے گی، مگر سنتِ مؤکدہ کے ترک کی وجہ سے مستحق عتاب ہوگا، اور اگر ترکِ جماعت کی عادت بنالے تو سخت گنہگار ہے، خصوصاً اگر ایسی صورت ہو جائے کہ مسجد ویران رہے اور لوگ گھروں میں نماز پڑھیں تو یہ سب شرعاً مستحق سزا ہیں، اور قاضی عیاضؒ نے فرمایا کہ ایسے لوگ اگر سمجھانے سے باز نہ آئیں تو ان سے قتال کیا جائے (قرطبی ۲۹۸ ج ۱)

بے عمل واعظ کی مذمت | اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ، اس آیت میں خطاب اگرچہ علمائے یہود سے ہے، ان کو ملامت کی جارہی ہے، کہ وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو یہ تلقین کرتے تھے کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کرتے رہو، اور دینِ اسلام پر قائم رہو (جو علامت ہے اس بات کی کہ علمائے یہود دین اسلام کو یقینی طور پر حق سمجھتے تھے) مگر خود نفسانی خواہشات سے اتنے مغلوب تھے کہ اسلام قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے، لیکن معنی کے اعتبار سے یہ ہر اُس شخص کی مذمت ہے جو دوسروں کو تو نیکی اور بھلائی کی ترغیب دے، مگر خود عمل نہ کرے، دوسروں کو خدا سے ڈرائے، مگر خود نہ ڈرے، ایسے شخص کے بارے میں احادیث میں بڑی ہولناک وعیدیں آئی ہیں، حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شبِ معراج میرا گذر کچھ لوگوں پر ہوا جن کے ہونٹ اور زبانیں آگ کی قینچیوں سے کترے جارہے تھے میں نے جبرئیلؑ سے پوچھا یہ کون ہیں؟ جبرئیل نے بتایا کہ یہ آپؐ کی امت کے دنیادار واعظ ہیں، جو لوگوں کو تو نیکی کا حکم کرتے تھے، مگر اپنی خبر نہ لیتے تھے (ابن کثیر)

ابن عساکرؒ نے ذکر کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بعض جنتی بعض دوزخیوں کو آگ میں دیکھکر پوچھیں گے کہ تم آگ میں کیونکر پہنچ گئے؟ حالانکہ ہم تو بخدا انہی نیک اعمال کی بدولت جنّت میں داخل ہوئے ہیں جو ہم نے تم سے سیکھے تھے، اہلِ دوزخ کہیں گے: "ہم زبان سے کہتے ضرور تھے، لیکن خود عمل نہیں کرتے تھے" (ابن کثیر)

کیا فاسق وعظ و نصیحت نہیں کرسکتا؟ | لیکن مذکورہ بیان سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ بے عمل یا فاسق کے لئے دوسروں کو وعظ و نصیحت کرنا جائز نہیں، اور جو شخص کسی گناہ میں مبتلا ہو وہ دوسروں کو اس گناہ سے باز رہنے کی تلقین نہ کرے، کیونکہ کوئی اچھا عمل الگ نیکی ہے، اور اس اچھے عمل کی تبلیغ دوسری مستقل نیکی ہے، اور ظاہر ہے کہ ایک نیکی کو چھوڑنے سے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ دوسری نیکی بھی چھوڑ دی جائے، جیسے ایک شخص اگر نماز نہیں پڑھتا تو اس کے لئے یہ لازم نہیں کہ وہ روزہ بھی ترک کردے، بالکل اسی طرح اگر کوئی شخص نماز نہیں پڑھتا تو اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ دوسروں کو نماز پڑھنے کے لئے بھی نہ کہے، اسی طرح کسی ناجائز فعل کا ارتکاب الگ گناہ ہے، اور اپنے زیرِ اثر لوگوں کو اس ناجائز فعل سے نہ روکنا دوسرا گناہ ہے، اور ایک گناہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرا گناہ بھی ضرور کیا جائے۔ (روح المعانی)

چنانچہ امام مالکؒ نے حضرت سعید بن جبیرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر ہر ایک شخص یہ سوچکر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑدے کہ میں خود گنہگار ہوں، جب گناہوں سے خود پاک ہو جاؤں گا تو لوگوں کو تبلیغ کروں گا، تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ تبلیغ کرنے والا کوئی بھی باقی نہ رہے گا، کیونکہ ایسا کون ہے جو گناہوں سے بالکل پاک ہو؟ حضرت حسنؒ کا ارشاد ہے کہ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ لوگ اسی غلط خیال میں پڑکر تبلیغ کا فریضہ

چھوڑ بیٹھیں (قرطبی) بلکہ حضرت سیدی حکیم الامت تھانویؒ تو فرمایا کرتے تھے کہ جب مجھے اپنی کسی بُری عادت کا علم ہوتا ہے تو میں اس عادت کی مذمت اپنے مواعظ میں خاص طور سے بیان کرتا ہوں، تاکہ وعظ کی برکت سے یہ عادت جاتی رہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بے عمل آدمی کو وعظ کہنا جائز نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ واعظ کو بے عمل نہیں ہونا چاہئے، اور دونوں میں فرق واضح ہے، مگر یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ بے عمل ہونا نہ تو واعظ کیلئے جائز ہے نہ غیر واعظ کیلئے پھر واعظ کی تخصیص کیوں؟ جواب یہ ہے کہ نا جائز تو دونوں کے لئے ہے، مگر واعظ کا جرم غیر واعظ کے جرم کے مقابلے میں زیادہ سنگین اور زیادہ قابلِ ملامت ہے، کیونکہ واعظ جرم کو جرم سمجھتے ہوئے جان بوجھ کر کرتا ہے، اس کے پاس یہ عذر نہیں ہوتا کہ مجھے اس کا جرم ہونا معلوم نہ تھا، برخلاف غیر واعظ کے اور اَن پڑھ جاہل کے کہ اس کو خواہ علم حاصل نہ کرنے کا الگ گناہ ہو، لیکن ارتکابِ گناہ میں اس کے پاس کسی درجہ میں عذر موجود ہوتا ہے، کہ مجھے معلوم نہ تھا، اس کے علاوہ عالم اور واعظ اگر کوئی جرم کرتا ہے تو یہ دین کے ساتھ ایک قسم کا استہزاء ہے، چنانچہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جتنا اَن پڑھ لوگوں کو معاف کرے گا اتنا علماء کو معاف نہیں کریگا۔

دو نفسیاتی بیماریاں اور اُن کا علاج حُبِّ مال اور حُبِّ جاہ، یہ دونوں قلب کی ایسی بیماریاں ہیں جن کے باعث انسان کی دنیاوی زندگی اور اخروی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے، اور غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانی تاریخ میں اب تک جتنی انسانیت سوز لڑائیاں لڑی گئیں، اور جو فساد برپا ہوئے، ان میں سے اکثر و بیشتر کو انہی دو بیماریوں نے جنم دیا تھا۔

حُبِّ مال کے نتائج یہ نکلتے ہیں:

۱۔ کنجوسی اور بخل پیدا ہوتا ہے، جس کا ایک قومی نقصان تو یہ ہوتا ہے کہ اس کی دولت قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی، دوسرا نقصان خود اس کی ذات کو پہنچتا ہے، کہ معاشرہ میں کوئی ایسے شخص کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔

۲۔ خود غرضی پیدا ہوتی ہے جو مال کی ہوس کو پورا کرنے کے لئے اُسے اشیاء میں ملاوٹ، ناپ تول میں کمی، رشوت ستانی، مکر و فریب اور دغا بازی کے نت نئے حیلے سُجھاتی ہے، وہ اپنی تجوری پہلے سے زیادہ بھرنے کے لئے دوسروں کا خون نچوڑ لینا چاہتا ہے، بالآخر سرمایہ دار اور مزدور کے جھگڑے جنم لیتے ہیں۔

۳۔ ایسے شخص کو کتنا ہی مال مل جائے لیکن مزید کمانے کی دُھن ایسی سوار ہوتی ہے کہ تفریح اور آرام کے وقت بھی یہی بے چینی اُسے کھائے جاتی ہے کہ کسی طرح اپنے سرمایہ میں زیادہ سے زیادہ

اضافہ کروں، بالآخر جو مال اس کے آرام و راحت کا ذریعہ بنتا وہ اس کے لئے وبالِ جان بن جاتا ہے۔
۴ حق بات خواہ کتنی ہی روشن ہو کر سامنے آجائے، مگر وہ ایسی کسی بات کو ماننے کی ہمت نہیں کرتا، جو اس کی ہوس مال سے متصادم ہو، یہ تمام چیزیں بالآخر پورے معاشرہ کا امن و چین برباد کر ڈالتی ہیں۔

غور کیا جائے تو قریب قریب یہی حال حُبِّ جاہ کا نظر آئے گا، کہ اس کے نتیجہ میں تکبر، خود غرضی حقوق کی پامالی، ہوسِ اقتدار اور اس کے لئے خوں ریز لڑائیاں، اور اسی طرح کی بے شمار انسانیت سوز خرابیاں جنم لیتی ہیں، جو بالآخر دنیا کو دوزخ بناکر چھوڑتی ہیں، ان دونوں بیماریوں کا علاج قرآن کریم نے یہ تجویز فرمایا: وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (اور مدد لو صبر اور نماز سے) یعنی صبر اختیار کرو، یعنی اپنی لذات و شہوات پر قابو حاصل کرلو، اس سے حُبّ مال گھٹ جائے گی، کیونکہ مال کی محبت اسی لئے پیدا ہوتی ہے کہ مال لذات و شہوات کو پورا کرنے کا ذریعہ ہے، جب ان لذات وخواہشات کی اندھا دھند پیروی چھوڑنے پر ہمت باندھ لوگے تو شروع میں اگرچہ شاق گذریگا، لیکن رفتہ رفتہ یہ خواہشات اعتدال پر آجائیں گی، اور اعتدال تمہاری عادت بن جائے گا، تو پھر مال کی فراوانی کی ضرورت نہ رہے گی، نہ اُس کی محبت ایسی غالب آئے گی کہ اپنے نفع نقصان سے اندھا کردے۔

اور نماز سے حبِ جاہ کم ہوجائے گی، کیونکہ نماز میں ظاہری اور باطنی ہر طرح کی عاجزی اور پستی ہے، جب نماز کو صحیح صحیح ادا کرنے کی عادت ہوجائے گی تو ہر وقت اللہ کے سامنے اپنی عاجزی اور پستی کا تصور رہنے لگے گا، جس سے تکبّر و غرور اور حبِ جاہ گھٹ جائے گی۔

خشوع کی حقیقت اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِيْنَ، قرآن و سنت میں جہاں خشوع کی ترغیب مذکور ہے اس سے مراد وہ قلبی سکون و انکساری ہے، جو اللہ کی عظمت اور اس کے سامنے اپنی حقارت کے علم سے پیدا ہوتی ہے، اس کے نتیجہ میں طاعت آسان ہوجاتی ہے، کبھی اس کے آثار بدن پر بھی ظاہر ہونے لگتے ہیں کہ وہ باادب متواضع اور شکستہ قلب نظر آتا ہے، اگر دل میں خوف خدا اور تواضع نہ ہو تو خواہ وہ ظاہر میں کتنا ہی باادب اور متواضع نظر آئے وہ خشوع کا حامل نہیں۔

بلکہ آثار خشوع کا قصداً اظہار کرنا بھی پسندیدہ نہیں، حضرت عمرؓ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ سر جھکائے بیٹھا ہے، فرمایا: سر اٹھا خشوع دل میں ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم نخعیؒ کا ارشاد ہے کہ "موٹا پہننے، موٹا کھانے اور سر جھکانے کا نام خشوع نہیں خشوع تو یہ ہے کہ تم حق کے معاملہ میں شریف و رذیل کے ساتھ یکساں سلوک کرو، اور اللہ نے جو تم پر فرض کیا ہے اُسے ادا کرنے میں اللہ کے لئے قلب کو فارغ کرلو"۔

حضرت حسنؒ کا ارشاد ہے کہ: حضرت عمرؓ جب بات کرتے تو سُنا کرتے تھے، جب چلتے تو

تیز چلتے، اور جب مارتے تو زور سے مارتے تھے، حالانکہ بلاشبہ وہ خشوع رکھنے والے تھے۔

خلاصہ یہ کہ اپنے قصد و اختیار سے خاشعین کی سی صورت بنانا شیطان اور نفس کا دھوکہ ہے اور مذموم ہے، ہاں اگر بے اختیار یہ کیفیت ظاہر ہوجائے تو معذور ہے۔ (قرطبی)

فائدہ: خشوع کے ساتھ ایک دوسرا لفظ خضوع بھی استعمال ہوتا ہے، قرآن کریم میں بھی بار بار آیا ہے، یہ دونوں لفظ تقریباً ہم معنی ہیں، لیکن خشوع کا لفظ اصل کے اعتبار سے آواز اور نگاہ کی پستی اور تذلّل کے لئے بولا جاتا ہے، جب کہ وہ مصنوعی نہ ہو بلکہ قلبی خوف اور تواضع کا نتیجہ ہو، قرآن کریم میں ہے خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ (آوازیں پست ہوگئیں) اور خضوع کا لفظ بدن کی تواضع اور انکساری کے لئے استعمال ہوتا ہے، قرآن حکیم میں ہے:

فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ (۴:۲۶) | "پس اُن کی گردنیں اس کے سامنے جھک گئیں"

نماز میں خشوع کی فقہی حیثیت

نماز میں خشوع کی تاکید قرآن و سنت میں بار بار آئی ہے، قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (۲۰:۱۴) | "اور نماز قائم کر مجھے یاد کرنے کے لئے"

اور ظاہر ہے کہ غفلت یاد کرنے کی ضد ہے، جو نماز میں اللہ جلّ شانہٗ سے غافل ہے وہ اللہ کو یاد کرنے کا فریضہ ادا نہیں کر رہا۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ (۷:۲۰۵) | "اور تو غافلوں میں سے نہ ہو"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "نماز تو صرف تمسکن اور تواضع ہی ہے" جس کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ جب تمسکن اور تواضع دل میں نہ ہو تو وہ نماز نہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جس کی نماز اسے بے حیائی اور برائیوں سے نہ روک سکے وہ اللہ سے دور ہی ہوتا جاتا ہے، اور غافل کی نماز بے حیائی سے اور برائیوں سے نہیں روکتی، معلوم ہوا کہ غفلت کے ساتھ نماز پڑھنے والا اللہ سے دور ہی ہوتا جاتا ہے[1]۔

امام غزالیؒ نے مذکورہ آیات و روایات اور دوسرے دلائل پیش کر کے فرمایا ہے کہ ان کا یہ تقاضا ہے کہ خشوع نماز کے لئے شرط ہو، اور نماز کی صحت اُس پر موقوف ہو، پھر فرمایا کہ سفیان ثوریؒ، حسن بصریؒ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا مذہب یہی تھا کہ خشوع کے بغیر نماز ادا نہیں ہوتی، بلکہ فاسد ہے

لیکن ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء نے خشوع کو شرطِ صلوٰۃ قرار نہیں دیا، بلکہ اُسے نماز کی روح قرار دینے کے باوجود صرف اتنا شرط کیا ہے کہ تکبیر تحریمہ کے وقت قلب کو حاضر کر کے اللہ کے لئے نماز کی

[1] یہ سب احادیث امام غزالیؒ کی احیاء العلوم سے ماخوذ ہیں ۱۲ رف

نیت کرے، باقی نماز میں اگر خشوع حاصل نہ ہو تو اگرچہ اتنی نماز کا ثواب اُسے نہیں ملے گا جتنے حصہ میں خشوع نہیں رہا، لیکن فقہ کی رُو سے وہ تارکِ صلوٰۃ نہیں کہلائے گا، اور نہ اُس پر تعزیر وغیرہ کے وہ احکام مرتب ہوں گے جو تارکِ صلوٰۃ پر لگتے ہیں۔

امام غزالیؒ نے اس کی یہ وجہ بیان فرمائی ہے کہ فقہاء باطنی احوال اور قلبی کیفیات پر حکم نہیں لگاتے، بلکہ وہ تو صرف اعضائے ظاہرہ کے اعمال پر ظاہری احکام بیان کرتے ہیں، یہ بات کہ فلاں عمل کا ثواب آخرت میں ملے گا یا نہیں، یہ فقہ کی حدود سے خارج ہے، تو چونکہ باطنی کیفیات پر حکم لگانا ان کی بحث سے خارج ہے، اور خشوع ایک باطنی کیفیت ہے، اس لئے انھوں نے خشوع کو پوری نماز میں شرط قرار نہیں دیا، بلکہ خشوع کے ادنیٰ مرتبہ کو شرط کہا، اور وہ یہ کہ کم از کم تکبیر تحریمہ کے وقت محض اللہ کی عبادت و تعظیم کی نیت کرلے۔

خشوع کو پوری نماز میں شرط قرار نہ دینے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن حکیم کی دوسری آیات میں تشریع احکام کا یہ واضح اصول بتادیا گیا ہے، کہ انسانوں پر کوئی ایسی چیز فرض نہیں کی جاتی جو انکی طاقت و امکان سے باہر ہو، اور پوری نماز میں خشوع برقرار رکھنے سے ماسوا چند خاص افراد کے اکثر لوگ عاجز ہوتے ہیں، اس لئے تکلیف مالایُطاق سے بچنے کے لئے پوری نماز کی بجائے صرف ابتداءِ صلوٰۃ میں خشوع کو شرط قرار دیدیا گیا۔

نماز خشوع کے بغیر بھی بالکل بے فائدہ نہیں

امام غزالیؒ آخر میں ارشاد فرماتے ہیں کہ خشوع کی اس غیر معمولی اہمیت کے باوجود ہمیں اللہ سے یہی امید ہے کہ غفلت کے ساتھ نماز پڑھنے والا بھی بالکلیہ تارکِ صلوٰۃ کے درجہ میں نہیں، کیونکہ بہرحال اُس نے ادائے فرض کا اقدام تو کیا ہے، اور تھوڑی سی دیر کے لئے قلب کو اللہ کے لئے فارغ بھی کیا، کہ کم از کم نیت کے وقت تو صرف اللہ ہی کا دھیان تھا، ایسی نماز کا کم سے کم فائدہ یہ ضرور ہے کہ اس کا نام نافرمانوں اور بے نمازوں کی فہرست سے نکل گیا۔

مگر دوسری حیثیت سے یہ خوف بھی ہے کہ کہیں غافل کی حالت تارک سے بھی زیادہ بُری نہ ہو، کیونکہ جو غلام آقا کی خدمت میں حاضر ہوکر آقا سے بے توجہی برتتا اور تحقیر آمیز لہجہ میں کلام کرتا ہے اس کی حالت اُس غلام سے زیادہ شدید ہے جو خدمت میں حاضر ہی نہیں ہوتا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ معاملہ بیم و رجا کا ہے، عذاب کا خوف بھی ہے اور بخشش کی امید بھی، اس لئے غفلت و تساہل کو چھوڑنے کے لئے اپنی مقدور بھر کوشش کرتے رہنا چاہئے، وَمَا تَوْفِيقُنَا إِلَّا بِاللَّهِ۔

يَٰبَنِيٓ إِسْرَٰٓءِيلَ ٱذْكُرُوا۟ نِعْمَتِيَ ٱلَّتِيٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ

اے بنی اسرائیل! یاد کرو میرے احسان جو میں نے تم پر کئے اور اس کو کہ میں نے تم کو بڑائی دی

عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا

تمام عالم پر، اور ڈرو اس دن سے کہ کام نہ آئے کوئی شخص کسی کے کچھ بھی اور قبول نہ ہو اس کی

شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾

طرف سے سفارش اور نہ لیا جائے اس کی طرف سے بدلہ اور نہ اُن کو مدد پہنچے۔

خلاصۂ تفسیر

اے اولاد یعقوب! (علیہ السلام) کی تم لوگ میری اس نعمت کو یاد کرو (تاکہ شکر اور اطاعت کی تحریک ہو) جو میں نے تم کو انعام میں دی تھی، اور اس (بات) کو (یاد کرو) کہ میں نے تم کو (خاص خاص برتاؤ میں) تمام دنیا جہان والوں پر فوقیت دی تھی، (اور ایک ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "میں نے تم کو ایک بڑے حصۂ مخلوق پر فوقیت دی تھی" مثلاً اس زمانہ کے لوگوں پر۔

فائدہ:۔ اس آیت میں خطاب چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہودیوں کو ہے، اور عموماً ایسا ہوتا ہے، کہ باپ دادا پر جو احسان و اکرام کیا جائے اس سے اس کی اولاد بھی فائدہ حاصل کرتی ہے، جس کا عام طور پر مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، اس لئے اُن کو بھی اس آیت میں مخاطب سمجھا جاسکتا ہے۔

اور ڈرو تم ایسے دن سے کہ (جس میں) نہ تو کوئی شخص کسی شخص کی طرف سے کچھ مطالبہ ادا کرسکتا ہے، اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہوسکتی ہے، (جبکہ خود اس شخص میں ایمان نہ ہو جس کی سفارش کرتا ہے) اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی معاوضہ لیا جاسکتا ہے، اور نہ اُن لوگوں کی طرفداری چل سکے گی۔

فائدہ:۔ آیت میں جس یوم کا ذکر ہے اس سے قیامت کا دن مراد ہے، مطالبہ ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً کسی کے ذمہ نماز روزہ کا مطالبہ ہو، اور دوسرا کہہ دے کہ میرا نماز روزہ لے کر اس کا حساب بیباق کردیا جائے، اور معاوضہ یہ کہ کچھ مال وغیرہ داخل کرکے بچا لاوے، سو دونوں باتیں نہ ہوں گی، اور بدون ایمان کے سفارش قبول نہ ہونے کو جو فرمایا ہے تو اور آیتوں سے معلوم ہوا کہ اس کی صورت یہ ہوگی کہ ایسوں کی خود سفارش ہی نہ ہوگی، جو قبول کی گنجائش ہو، اور طرفداری کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کوئی زوردار، حمایت کرکے زبردستی نکال لاوے۔

غرض یہ کہ دنیا میں مدد کرنے کے جتنے طریقے ہوتے ہیں بدون ایمان کے کوئی طریقہ بھی نہ ہوگا۔

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ

اور یاد کرو اس وقت کو جبکہ رہائی دی ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے جو کرتے تھے تم کو بڑا عذاب، ذبح کرتے تھے

اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِىْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ

تمھارے بیٹوں کو اور زندہ چھوڑتے تھے تمھاری عورتوں کو اور اس میں آزمائش تھی تمھارے رب کی

	عَظِيمٌ ﴿٤٩﴾	
	طرف سے بڑی	

خلاصۂ تفسیر اوپر جن خاص برتاؤں کا حوالہ دیا ہے اب یہاں سے اُن کی تفصیل بیان کرنی شروع کی، پہلا معاملہ تو یہ ہے کہ: اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب کہ رہائی دی ہم نے تم (لوگوں کے آباء و اجداد) کو متعلقینِ فرعون سے جو فکر میں لگے رہتے تھے تمہاری دل آزاری کے، گلے کاٹتے تھے تمہاری اولاد (ذکور) کے اور زندہ چھوڑ دیتے تھے تمہاری عورتوں کو (لڑکیوں کو کہ زندہ رہ کر بڑی عورتیں ہو جائیں) اور اس (واقعہ) میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارا ایک بڑا بھاری امتحان تھا۔

فائدہ: کسی نے فرعون سے پیشینگوئی کر دی تھی کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا ایسا پیدا ہوگا جس کے ہاتھوں تیری سلطنت جاتی رہے گی، اس لئے اس نے نوزائیدہ لڑکوں کو قتل کرنا شروع کر دیا، اور چونکہ لڑکیوں سے کوئی اندیشہ نہ تھا اس لئے اُن سے کچھ تعرض نہیں کیا، دوسرے اس میں اس کا اپنا ایک مطلب بھی تھا، کہ اُن عورتوں سے ماماگری اور خدمت گاری کا کام لیتا تھا، سو یہ عنایت بھی اپنے مطلب کے لئے تھی۔

اور اس واقعہ سے یا تو یہ ذبح و قتل مذکور مراد ہے، اور مصیبت میں صبر کا امتحان ہوتا ہے، اور یا رہائی دینا مراد ہو جو کہ ایک نعمت ہے، اور نعمت میں شکر کا امتحان ہوتا ہے، اور اس نجات دینے کی تفصیل آگے بیان فرمائی۔

وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ

اور جب پھاڑ دیا ہم نے تمہاری وجہ سے دریا کو پھر بچا دیا ہم نے تم کو اور ڈبو دیا فرعون کے لوگوں کو اور تم

تَنْظُرُونَ ﴿٥٠﴾ وَإِذْ وَاعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ

دیکھ رہے تھے اور جب ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے چالیس رات کا پھر تم نے بنا لیا

الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ﴿٥١﴾

بچھڑا موسیٰؑ کے بعد اور تم ظالم تھے

خلاصۂ تفسیر اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب کہ شق کر دیا ہم نے تمہارے (رستہ دینے کی) وجہ سے دریائے شور کو پھر ہم نے (ڈوبنے سے) بچا لیا تم کو اور غرق کر دیا متعلقین فرعون

۱۷

کو (مع فرعون کے) اور تم (اس کا) معائنہ کر رہے تھے۔

فائدہ :۔ یہ قصہ اس وقت ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام پیدا ہو کر پیغمبر ہو گئے، اور مدتوں فرعون کو سمجھاتے رہے، جب وہ کسی طرح نہ مانا تو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو خفیہ طور پر لے کر یہاں سے چلے جاؤ، راستہ میں دریا حائل ہوا، اور اسی وقت پیچھے سے فرعون بھی مع لشکر آ پہنچا، حق تعالیٰ کے حکم سے دریا شق ہو گیا اور بنی اسرائیل کو گذرنے کا راستہ مل گیا، یہ تو پار ہو گئے، فرعون کے پہنچنے تک دریا اسی طرح رہا، وہ بھی تعاقب کی غرض سے اس میں گھس گیا، اس وقت سب طرف سے دریا سمٹ کر اپنی سابق حالت پر ہو گیا، اور فرعون اور اس کے ساتھی سب وہاں ہی غرق ہو کر ختم ہو گئے۔

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جبکہ وعدہ کیا تھا ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے (توریت دینے کا ایک مدت گذرنے پر جس میں دس رات کا اضافہ ہو کر) چالیس رات کا (زمانہ ہو گیا تھا) پھر تم لوگوں نے (پرستش کے لئے) تجویز کر لیا گوسالہ کو موسیٰ (علیہ السلام) کے (جانے کے) بعد اور تم نے (اس تجویز میں صریح) ظلم پر کمر باندھ رکھی تھی (کہ ایسی بے جابات کے قائل ہو گئے تھے)۔

فائدہ :۔ یہ قصہ اس وقت ہوا جب فرعون کے غرق ہونے کے بعد بنی اسرائیل بقول بعض، مصر میں واپس آ کر رہنے لگے، یا بقول بعض کسی اور مقام پر ٹھہر گئے تو موسیٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل نے عرض کیا، کہ اب ہم بالکل مطمئن ہو گئے، اگر کوئی شریعت ہمارے لئے مقرر ہو تو اس کو اپنا دستور العمل بنائیں، موسیٰ علیہ السلام کی عرض پر حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ تم کوہِ طور پر آ کر ایک مہینہ ہماری عبادت میں مشغول رہو، ایک کتاب تم کو دیں گے، آپ نے ایسا ہی کیا، اور توراۃ آپ کو مل گئی، مگر دس روز مزید عبادت میں مشغول رہنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک ماہ روزہ رکھنے کے بعد افطار فرما لیا تھا، اللہ تعالیٰ کو روزہ دار کے منہ کا رائحہ (جو خلوئے معدہ کی تبخیر سے پیدا ہو جاتا ہے) پسند ہے، اس لئے موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ دس روزے اور رکھیں تاکہ وہ رائحہ پھر پیدا ہو جائے، اس طرح یہ چالیس روزے پورے ہو گئے، موسیٰ علیہ السلام تو یہاں رہے، اور وہاں ایک شخص سامری نامی تھا، اس نے چاندی یا سونے کا ایک بچھڑے کا قالب بنا کر اس کے اندر وہ مٹی جو اس نے جبرئیل علیہ السلام کے گھوڑے کے قدم کے نیچے سے اٹھا کر اپنے پاس محفوظ رکھی ہوئی تھی ڈال دی، اُس بچھڑے میں جان پڑ گئی، اور جہلاء بنی اسرائیل نے اس کی پرستش شروع کر دی۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾

پھر معاف کیا ہم نے تم کو اس پر بھی تاکہ تم احسان مانو۔

خلاصۂ تفسیر پھر بھی ہم نے (تمہاری توبہ کرنے پر) درگذر کیا، تم سے اتنی بڑی بات ہوتے

پیچھے اس توقع پر کہ تم احسان مانوگے۔

فائدہ :۔ اس توبہ کا بیان آگے کی تیسری آیت میں مذکور ہے، اللہ تعالیٰ کے اس توقع رکھنے کا مطلب نعوذ باللہ یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ کو شک تھا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ درگذر کرنا ایسی چیز ہے کہ دیکھنے والوں کو شکرگذاری کی توقع کا گمان ہوسکتا ہے۔

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور جب دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حق کو ناحق سے جدا کرنیوالے احکام تاکہ تم سیدھی راہ پاؤ

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب (توریت) دی اور فیصلہ کی چیز، اس توقع پر کہ تم راہ چلتے رہو۔

فائدہ :۔ فیصلہ کی چیز یا تو اُن احکام شرعیہ کو کہا جو توریت میں لکھے ہیں، (کیونکہ) شرع سے تمامتر اعتقادی اور عملی اختلافات کا فیصلہ ہوجاتا ہے، یا معجزوں کو کہا کہ ان سے سچے، جھوٹے دعویٰ کا فیصلہ ہوتا ہے، یا خود توریت ہی کو کہدیا کہ اس میں کتاب ہونے کی صفت بھی ہے اور فیصل ہونے کی صفت بھی۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے اے قوم تم نے نقصان کیا اپنا

بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ

یہ بچھڑا بنا کر سو اب توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف اور مار ڈالو اپنی اپنی جان

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ

یہ بہتر ہے تمھارے لئے تمھارے خالق کے نزدیک پھر متوجہ ہوا تم پر بیشک وہی ہے

التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾

معاف کرنیوالا نہایت مہربان۔

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم بے شک تم نے اپنا بڑا نقصان کیا اس گوسالہ (پرستی) کی تجویز سے، سو تم اب اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو، پھر بعض آدمی (جنھوں نے گوسالہ پرستی نہیں کی) بعض آدمیوں کو (جنھوں نے

گوسالہ پرستی کی) قتل کرو، یہ (عمل درآمد) تمہارے لئے بہتر ہوگا، تمہارے خالق کے نزدیک، پھر (اس عملدرآمد کرنے سے) حق تعالیٰ تمہارے حال پر (اپنی عنایت سے) متوجہ ہوئے، بے شک وہ تو ایسے ہی ہیں کہ توبہ قبول کرلیتے ہیں اور عنایت فرماتے ہیں۔

فائدہ:۔ یہ اس طریق کا بیان ہے جو اُن کی توبہ کے لئے تجویز ہوا، یعنی مجرم لوگ قتل کئے جائیں، جیسا ہماری شریعت میں بھی بعض گناہوں کی سزا باوجود توبہ کے بھی قتل وجان ستانی مقرر ہے، مثلاً قتلِ عمد کے عوض قتل اور ثبوت زنا بالشہادۃ پر رجم، کہ توبہ سے یہ سزا ساقط نہیں ہوتی، چنانچہ ان لوگوں نے اس پر عمل کیا، جس کی وجہ سے آخرت میں موردِ رحمت وعنایت ہوگئے۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ

اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز یقین نہ کریں گے تیرا جب تک کہ نہ دیکھ لیں اللہ کو سامنے پھر آلیا

الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾

تم کو بجلی نے اور تم دیکھ رہے تھے

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں نے (یوں) کہا کہ اے موسیٰ ہم تمہارے کہنے سے ہرگز نہ مانیں گے (کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے) یہاں تک کہ ہم (خود) اللہ تعالیٰ کو علانیہ طور پر دیکھ لیں، سو (اس گستاخی پر) تم پر کڑک بجلی کی آپڑی، اور تم (اس بجلی کا آنا) آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

فائدہ:۔ اس کا قصہ اس طرح ہوا تھا کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے کوہِ طور سے توریت لاکر پیش کی، کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، تو بعض گستاخ لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ خود ہم سے کہہ دے کہ یہ ہماری کتاب ہے تو بے شک ہم کو یقین آجائے گا، موسیٰ علیہ السلام نے باذنِ الٰہی فرمایا کہ کوہِ طور پر چلو، یہ بات بھی ہوجائے گی، بنی اسرائیل نے اس کام کے لئے ستر آدمی منتخب کرکے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہِ طور پر روانہ کئے، وہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کا کلام ان لوگوں نے خود سنا، تو اس وقت اور رنگ لائے کہ ہم کو تو کلام سننے سے قناعت نہیں ہوتی، خدا جانے کون بول رہا ہوگا، اگر خدا کو دیکھ لیں تو بے شک مان لیں، چونکہ دنیا میں کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی قوت نہیں رکھتا، اس لئے اس گستاخی پر اُن پر بجلی آپڑی، اور سب ہلاک ہوگئے، (ہلاکت کے متعلق اگلی آیت میں بیان ہے)

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

پھر اُٹھا کھڑا کیا ہم نے تم کو مرگئے پیچھے تاکہ تم احسان مانو۔

خلاصۂ تفسیر پھر ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے) تم کو زندہ کر اٹھایا تمہارے مرجانے کے بعد اس توقع پر کہ تم احسان مانو گے۔

فائدہ:۔ موت کے لفظ سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس بجلی سے مرگئے تھے، اُن کے دوبارہ زندہ کئے جانے کا قصہ یہ ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ بنی اسرائیل یوں ہی بدگمان رہتے ہیں، اب وہ یہ سمجھیں گے کہ میں نے اُن کو کہیں لیجا کر کسی تدبیر سے ان کا کام تمام کرا دیا ہوگا، مجھ کو اس تہمت سے محفوظ رکھئے، اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اُن کو پھر زندہ کر دیا۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ط

اور سایہ کیا ہم نے تم پر ابر کا اور اُتارا تم پر مَنّ اور سلویٰ

كُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ط وَمَا ظَلَمُونَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا أَنْفُسَهُمْ

کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو دیں اور انھوں نے ہمارا کچھ نقصان نہ کیا بلکہ اپنا ہی

يَظْلِمُونَ ﴿٥٧﴾

نقصان کرتے رہے

خلاصۂ تفسیر اور سایہ فگن کیا ہم نے تم پر ابر کو (میدان تیہ میں) اور (خزانۂ غیب سے) پہنچایا ہم نے تمہارے پاس ترنجبین اور بٹیریں (اور تم کو اجازت دی کہ) کھاؤ نفیس چیزوں سے جو کہ ہم نے تم کو دی ہیں، (مگر وہ لوگ اس میں بھی خلاف بات کر بیٹھے) اور (اس سے) انھوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا، لیکن اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

فائدہ:۔ دونوں قصے وادیِ تیہ میں واقع ہوئے، وادیِ تیہ کی حقیقت یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا اصلی وطن ملکِ شام ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے وقت میں مصر آئے تھے، اور یہاں ہی رہ پڑے، اور ملکِ شام میں عمالقہ نامی قوم کا تسلط ہو گیا، فرعون جب غرق ہو گیا اور یہ لوگ مطمئن ہو گئے، تو اللہ تعالیٰ کا ان کو حکم ہوا کہ عمالقہ سے جہاد کرو، اور اپنی اصلی جگہ کو اُن کے قبضہ سے چھڑا لو، بنی اسرائیل اس ارادہ پر مصر سے چلے، اور اُن کی حدود میں پہنچ کر جب عمالقہ کے زور و قوت کا حال معلوم ہوا تو ہمت ہار بیٹھے اور جہاد سے صاف انکار کر دیا، اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس انکار کی یہ سزا دی کہ چالیس برس تک ایک میدان میں سرگرداں و پریشاں پھرتے رہے، گھر پہنچنا بھی نصیب نہ ہوا۔

یہ میدان کچھ بہت بڑا رقبہ نہ تھا، بلکہ مصر اور شام کے درمیان پانچ چھ کوس یعنی تقریباً دس میل

کا رقبہ تھا، روایت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے وطن مصر جانے کے لئے دن بھر سفر کرتے، اور رات کو کسی منزل پر اُترتے صبح کو دیکھتے کہ جہاں سے چلے تھے وہیں ہیں، اسی طرح چالیس سال سرگرداں و پریشاں اس میدان میں پھرتے رہے، اسی لئے اس میدان کو وادیٔ تیہ کہا جاتا ہے، تیہ کے معنی ہیں سرگردانی اور پریشانی کے۔

یہ وادیٔ تیہ ایک کھلا میدان تھا، نہ اس میں کوئی عمارت تھی نہ درخت جس کے نیچے دھوپ اور سردی اور گرمی سے بچا جا سکے، اور نہ یہاں کوئی کھانے پینے کا سامان تھا، نہ پہننے کے لئے لباس، مگر اللہ تعالیٰ نے معجزہ کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اسی میدان میں اُن کی تمام ضروریات کا انتظام فرما دیا، بنی اسرائیل نے دھوپ کی شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے ایک سفید رقیق ابر کا سایہ کر دیا، اور بھوک کا تقاضا ہوا تو منّ وسلویٰ نازل فرما دیا، یعنی درختوں پر ترنجبین جو ایک شیریں چیز ہے بکثرت پیدا کر دی، یہ لوگ اس کو جمع کر لیتے، اسی کو منّ کہا گیا ہے، اور بٹیریں اُن کے پاس جمع ہو جاتیں، اُن سے بھاگتی نہ تھیں، یہ اُن کو پکڑ لیتے، اور ذبح کر کے کھاتے، اسی کو سلویٰ کہا گیا ہے، یہ لوگ دونوں لطیف چیزوں سے پیٹ بھر لیتے، چونکہ ترنجبین کی کثرت معمول سے زائد تھی، اور بٹیروں کا وحشت نہ کرنا یہ بھی معمول کے خلاف ہے، لہٰذا اس حیثیت سے دونوں چیزیں خزانۂ غیب سے قرار دی گئیں، اُن کو پانی کی ضرورت پیش آئی تو موسیٰ علیہ السلام کو ایک پتھر پر لاٹھی مارنے کا حکم دیا گیا اس پتھر سے چشمے پھوٹ پڑے، جیسا کہ دوسری آیاتِ قرآنی میں مذکور ہے، ان لوگوں نے رات کی اندھیری کا شکوہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے غیب سے ایک روشنی عمودی شکل میں ان کے محلّہ کے درمیان قائم فرما دی، کپڑے میلے ہوئے اور پھٹنے لگے اور لباس کی ضرورت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے بطور اعجاز یہ صورت کر دی کہ اُن کے کپڑے نہ میلے ہوں نہ پھٹیں، اور بچوں کے بدن پر جو کپڑے ہیں وہ ان کے بدن کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اسی مقدار سے بڑھتے رہیں۔ (تفسیر قرطبی)

اور اُن لوگوں کو یہ بھی حکم ہوا تھا کہ بقدر خرچ لے لیا کریں، آئندہ کے لئے جمع کر کے نہ رکھیں، مگر ان لوگوں نے حرص کے مارے اس میں بھی خلاف کیا، تو رکھا ہوا گوشت سڑنا شروع ہو گیا، اسی کو فرمایا ہے کہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ

اور جب ہم نے کہا داخل ہو اس شہر میں اور کھاتے پھرو اس میں جہاں چاہو

رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ط

فراغت سے اور داخل ہو دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے اور کہتے جاؤ بخش دے تو معاف کر دینگے ہم تمہارے قصور

	وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٨﴾	
	اور زیادہ بھی دیں گے نیکی والوں کو	

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے حکم کیا کہ تم لوگ اس آبادی کے اندر داخل ہو پھر کھاؤ (اس کی چیزوں میں) سے جس جگہ تم رغبت کرو بے تکلفی سے، اور (یہ بھی حکم دیا کہ جب اندر جانے لگو تو) دروازہ میں داخل ہونا (عاجزی سے) جھکے جھکے اور (زبان سے یہ) کہتے جانا کہ توبہ ہے (توبہ ہے) ہم معاف کر دیں گے تمہاری (پچھلی) خطائیں (تو سب کی) اور مزید برآں اور دیں گے دل سے نیک کام کرنے والوں کو۔

فائدہ:۔ بقول شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ قصہ بھی زمانہ وادیِ تیہ کا ہے، کہ جب من وسلویٰ کھاتے کھاتے اُکتا گئے اور اپنے معمولی کھانے کی درخواست کی (جیسا آگے کی چوتھی آیت میں آرہا ہے) تو ان کو ایک شہر میں جانے کا حکم ہوا تھا، کہ وہاں کھانے پینے کی اور معمولی چیزیں ملیں گی، سو یہ حکم اس شہر کے اندر جانے کے متعلق ہے، اس میں قولی اور فعلی ادب داخل ہونے کے متعلق بیان کیا گیا، اور اندر جاکر کھانے پینے میں توسیع کی گئی، اس قول پر بہت سے بہت یہ کہا جاسکے گا کہ قصہ کے بیان میں تقدم و تاخر ہو گیا، کہ بعد کا قصہ پہلے بیان ہوا اور پہلے کا بعد میں، تو یہ اشکال اُس وقت ہوتا جب قرآن مجید میں خود قصوں کا بیان کرنا مقصود اصلی ہوتا، اور جب نظر نتائج پر ہے تو اگر ایک قصہ کے اجزاء میں ہر جزو کا نتیجہ جدا ہو، اور اُن نتائج کے کسی اثر کا لحاظ کر کے جزو مقدم کو مؤخر اور جزو مؤخر کو مقدم کر دیا جائے تو اس میں نہ کوئی مضائقہ ہے، اور نہ کوئی اشکال۔

دیگر مفسرین حضرات نے اس حکم کو اس شہر سے متعلق سمجھا ہے جس پر جہاد کرنے کا حکم ہوا تھا، اور بعد مدّت تیہ کے پھر اس پر جہاد ہوا، اور وہ فتح ہوا، اس وقت یوشع علیہ السلام نبی تھے، یہ حکم ان کی معرفت اس شہر کے بارے میں ہوا تھا۔

قول اوّل کی بناء پر پچھلی خطاؤں میں وہ درخواست بھی داخل کر لینا مناسب ہے جو من وسلویٰ چھوڑ کر معمولی کھانوں کے متعلق کی گئی تھی، مطلب یہ ہوگا کہ یہ درخواست تھی گستاخی، لیکن خیر، اب اگر اس ادب اور حکم کو بجالائے تو اس کو معاف کر دیں گے، اور ہر قول پر یہ معافی تو سب کہنے والوں کے لئے عام ہوگی، اور جو اخلاص سے اعمالِ صالحہ کریں گے اُن کا انعام اس کے علاوہ ہے۔

فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَنْزَلْنَا عَلَى
پھر بدل ڈالا ظالموں نے بات کو خلاف اس کے کہ جو کہہ دی گئی تھی ان سے پھر اُتارا ہم نے

ع ۱۳

اَلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾

ظالموں پر عذاب آسمان سے اُن کی عدول حکمی پر۔

خلاصۂ تفسیر

سو بدل ڈالا اُن ظالموں نے ایک اور کلمہ جو خلاف تھا اس کلمہ کے جس (کے کہنے) کی اُن سے فرمائش کی گئی تھی، اس پر ہم نے نازل کی ان ظالموں پر ایک سماوی آفت اس وجہ سے کہ وہ عدول حکمی کرتے تھے۔

فائدہ:- یہ آیت آیتِ سابقہ کا تتمہ ہے، وہ کلمۂ خلاف یہ تھا کہ حِطَّةٌ بمعنی توبہ کی جگہ ازراہِ تمسخر حَبَّةٌ فِيْ شَعِيْرَةٍ (یعنی غلہ درمیان جو کے) کہنا شروع کیا، وہ آفتِ سماوی طاعون تھا، جو حدیث کی رُو سے بے حکموں کے لئے عذاب اور حکمبرداروں کے لئے رحمت ہے، اس شرارت کی اُن کو یہ سزا ملی کہ ان میں طاعون پھوٹ پڑا اور بہت سے آدمی فنا ہوگئے، (بعضوں نے ہلاک شدگان کی تعداد ستر ہزار تک بتائی ہے)۔ (قرطبی)

معارف و مسائل

کلام میں لفظی تغیر و تبدل کا حکم شرعی

اس آیت سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اس شہر میں حِطَّةٌ یعنی توبہ توبہ کہتے ہوئے داخل ہوں، انھوں نے شرارت سے ان الفاظ کو بدل کر حِنْطَةٌ کہنا اختیار کیا، اس کی وجہ سے اُن پر آسمانی عذاب نازل ہوا، یہ الفاظ کی تبدیلی ایسی تھی کہ جس میں صرف الفاظ ہی نہیں بدلے، بلکہ معنی بھی بالکل اُلٹ گئے، حِطَّةٌ کے معنی توبہ یعنی گناہوں کو نظر انداز کرنے کے تھے، اور حِنْطَةٌ کے معنی گندم کے ہیں، جس کا کلمۂ مامور بہا سے کوئی تعلق نہیں، الفاظ کی ایسی تبدیلی خواہ قرآن میں ہو یا حدیث میں، یا اور کسی امرِ الٰہی میں بلاشبہ اور بالاتفاق حرام ہے، کیونکہ یہ ایک قسم کا استہزاء یا تحریف ہے، اسی پر یہ عذاب نازل ہوا۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ معنی اور مقصود کو محفوظ رکھتے ہوئے صرف الفاظ کی تبدیلی کا کیا حکم ہے؟ امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں اس کے متعلق فرمایا ہے کہ بعض کلمات اور اقوال میں معنی کی طرح الفاظ بھی مقصود اور ادا، عبارت کے لئے ضروری ہوتے ہیں، ایسے اقوال میں لفظی تبدیلی بھی جائز نہیں، جیسے اذان کے الفاظ مقررہ کے بجائے اسی معنی کے دوسرے الفاظ پڑھنا جائز نہیں، اسی طرح نماز میں جو دعائیں مثلاً سبحانک اللّٰہم، التحیات، دعائے قنوت، یا تسبیحات رکوع و سجود، جن الفاظ سے منقول ہیں انہی الفاظ میں ادا کرنا ضروری ہے، دوسرے الفاظ میں اگرچہ معنی وہی محفوظ بھی رہیں مگر تبدیلی جائز نہیں، اسی طرح تمام قرآن کریم کے الفاظ کا یہی حکم ہے، کہ تلاوتِ قرآن سے جو احکام

متعلق ہیں وہ صرف انہی الفاظ کے ساتھ ہیں، جو قرآن کریم کے نازل ہوئے ہیں، اگر کوئی ان الفاظ کا ترجمہ دوسرے لفظوں میں کرکے پڑھے جس میں معنی بالکل محفوظ رہیں اس کو اصطلاحِ شریعت میں تلاوتِ قرآن نہ کہا جائے گا، اور نہ اُس پر وہ ثواب حاصل ہوگا جو قرآن پڑھنے پر مقرر ہے کہ ایک حرف پر دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں، کیونکہ قرآن صرف معنی کا نام نہیں بلکہ معنی اور الفاظ نازل شدہ کے مجموعہ کو قرآن کہا جاتا ہے۔

آیت مذکورہ میں فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ کے الفاظ سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو توبہ کے لئے جو الفاظ حِطَّةٌ کے بتلائے گئے تھے یہ الفاظ بھی مامور بہ تھے، ان کا بدلنا خود بھی گناہ تھا، پھر تبدیلی ایسی کردی کہ معنی ہی اُلٹ گئے، اس لئے عذابِ آسمانی کے مستحق ہوگئے۔

لیکن جن اقوال اور کلمات میں اصل مقصود معنی ہی ہیں، الفاظ مقصود نہیں ان میں اگر لفظی تبدیلی ایسی کی جائے کہ معنی پر کوئی اثر نہ پڑے وہ پوری طرح محفوظ رہیں تو جمہور محدثین اور فقہاء کے نزدیک یہ تبدیلی جائز ہے، بعض حضرات محدثین حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسی لفظی تبدیلی کو بھی جائز نہیں کہتے، قرطبیؒ نے امام مالکؒ، شافعیؒ، امام اعظم ابوحنیفہؒ سے نقل کیا ہے کہ حدیث میں روایت بالمعنی بھی جائز ہے، مگر شرط یہ ہے کہ روایت کرنے والا عربی زبان کا ماہر اور مواقع خطاب اور جس ماحول میں حدیث وارد ہوئی ہے اس سے پوری طرح واقف ہو، تاکہ اس کی غلطی سے معنی میں فرق نہ آجائے۔

اور ائمہ حدیث کی ایک جماعت جس طرح الفاظِ حدیث سُنے ہیں اُسی طرح نقل کرنا ضروری سمجھتے ہیں، کوئی لفظی تغیر و تبدّل جائز نہیں رکھتے، محمد بن سیرینؒ، قاسم بن محمدؒ وغیرہ حضرات کا بھی یہی مسلک ہے، یہاں تک کہ ان میں سے بعض حضرات کا تعامل یہ ہے کہ اگر راوی حدیث نے کوئی لفظ نقل کرنے میں کوئی لغوی غلطی بھی کی ہے تو اس سے سننے والے کو اسی غلطی کے ساتھ روایت کرنا چاہئے، اپنی طرف سے تغیر نہ کرے، اس کے ساتھ یہ ظاہر کردے کہ میرے خیال میں صحیح لفظ اس طرح ہے، مگر مجھے روایت اس طرح پہنچی ہے، ان حضرات کا استدلال اس حدیث سے ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہ تلقین فرمائی تھی کہ جب سونے کے لئے بستر پر جائے تو یہ دعاء پڑھے: اٰمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِيْ اَنْزَلْتَ وَنَبِيِّكَ الَّذِيْ اَرْسَلْتَ، اس شخص نے نَبِيِّكَ کی جگہ رَسُوْلِكَ پڑھ دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر یہی ہدایت فرمائی کہ لفظ نَبِيِّكَ پڑھا کرے، جس سے معلوم ہوا کہ لفظی تبدیلی بھی جائز نہیں۔

اسی طرح ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

نَضَّرَ اللّٰہُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِیْ فَبَلَّغَھَا کَمَا سَمِعَھَا۔

یعنی اللہ تعالیٰ اُس شخص کو سرسبز و شاداب رکھے جس نے میرا کوئی کلام سُنا اور پھر اُمت کو اسی طرح پہنچا دیا جس طرح سنا تھا ۔"

اس سے بھی ظاہر ہے کہ جن الفاظ سے سنا تھا انہی لفظوں سے پہنچانا مراد ہے۔

مگر جمہور محدثین اور فقہاء کے نزدیک اگرچہ اَولیٰ اور افضل تو یہی ہے کہ جہاں تک ہوسکے حدیث کی روایت میں ٹھیک وہی الفاظ نقل کرے جو سُنے ہیں، اپنے قصد سے اُن میں تبدیلی نہ کرے، لیکن اگر وہ الفاظ پوری طرح یاد نہیں رہے تو ان کا مفہوم اپنے الفاظ میں نقل کر دینا بھی جائز ہے، اور حدیث بلغہا کما سمعہا کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ جو مضمون سُنا ہو وہی بعینہٖ نقل کر دے، اس کے مفہوم میں کوئی فرق نہ آوے، الفاظ کی تبدیلی اس کے منافی نہیں، امام قرطبیؒ نے اس کی تائید میں فرمایا کہ خود یہی حدیث اس کی دلیل ہے کہ الفاظ کی تبدیلی بضرورت جائز ہے، کیونکہ خود اس حدیث کی روایت ہی ہم تک مختلف الفاظ سے پہنچی ہے۔

اور پہلی حدیث میں جو لفظ رسولك کے بجائے نبیك ہی پڑھنے کا امر فرمایا، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ لفظ نبی میں صفتِ مدح بہ نسبت رسول کے زیادہ ہے، کیونکہ رسول کا لفظ تو قاصد کے معنی میں دوسروں کے لئے بھی بولا جاتا ہے، بخلاف لفظ نبی کے کہ وہ خاص اسی منصب کیلئے استعمال ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے مخصوص بندوں کو بذریعہ وحی خطاب کرنے کا عطا کیا جاتا ہے۔

اور دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے، کہ دعاؤں میں الفاظ منقولہ کا اتباع خواص و آثار کے اعتبار سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، دوسرے الفاظ میں وہ خاصیت نہیں رہتی (قرطبی) اسی لئے عامل حضرات جو تعویذ گنڈے کرتے ہیں وہ اس کی بڑی رعایت کرتے ہیں کہ جو الفاظ منقول ہیں ان میں تغیر و تبدل نہ کیا جائے، اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ادعیۂ ماثورہ بھی اسی قسم اوّل میں داخل ہیں، جن میں معنی کے ساتھ الفاظ مخصوصہ کی حفاظت بھی مقصود ہے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ

اور جب پانی مانگا موسیٰ نے اپنی قوم کے واسطے تو ہم نے کہا مار اپنے عصا کو پتھر پر

فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ

سو بہہ نکلے اس سے بارہ چشمے، پہچان لیا ہر قوم نے اپنا گھاٹ۔

كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٦٠﴾

کھاؤ اور پیو اللہ کی روزی اور نہ پھرو ملک میں فساد مچاتے ۔

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) نے پانی کی دعاء مانگی، اپنی قوم کے واسطے، اس پر ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کو) حکم دیا کہ اپنے اس عصا کو فلاں پتھر پر مارو (اس سے پانی نکل آوے گا)، بس (عصا پتھر پر مارنے کی دیر تھی) فوراً اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، (اور بنی اسرائیل کے بھی بارہ ہی خاندان تھے، چنانچہ) ہر ہر شخص نے اپنے پانی پینے کا موقع معلوم کرلیا (اور ہم نے یہ نصیحت کی کہ کھانے کو) کھاؤ اور (پینے کو) پیو، اللہ تعالیٰ کے رزق سے اور حد (اعتدال) سے مت نکلو، فساد (و فتنہ) کرتے ہوئے سرزمین میں۔

فائدہ:۔ یہ قصہ بھی وادیِ تیہ میں ہوا، وہاں پیاس لگی تو پانی مانگا، موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو ایک خاص پتھر کو صرف عصا مارنے سے قدرتِ خداوندی سے بارہ چشمے نکل پڑے، اور ان کے بارہ خاندان اس طرح تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ ۱۲ فرزند تھے، ہر ایک کی اولاد کا ایک ایک خاندان تھا، ان کو انتظامی معاملات میں الگ الگ ہی رکھا جاتا تھا، سب کے افسر بھی جُدا جُدا تھے، اس لئے چشمے بھی بارہ ہی نکلے۔

کھانے سے مراد مَن وسلویٰ اور پینے سے مراد یہی پانی تھا، اور نافرمانی اور ترکِ احکام کو فتنہ وفساد سے تعبیر فرمایا۔

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسے خوارق (اور معجزات) کا انکار بہت بڑی غلطی ہے، جب بعض پتھروں میں اللہ تعالیٰ نے بعید از قیاس اور خلافِ عقل یہ تاثیر رکھی ہے کہ لوہے کو جذب کرتا ہے تو اس پتھر میں اگر یہ تاثیر پیدا کردی ہو کہ اجزاءِ زمین سے پانی کو جذب کرلے اور اس سے پانی نکلنے لگے تو کیا محال ہے۔

ہمارے زمانے کے عقلاء کو اس بیان سے سبق حاصل کرنا اور فائدہ اٹھانا چاہئے، اور پھر یہ نظیر بھی محض سطحی نظر والوں کے لئے ہے، ورنہ خود اگر اس پتھر کے اجزاء ہی میں پانی پیدا ہوجائے تو بھی کونسا محال لازم آتا ہے، جو حضرات ایسے امور کو محال کہتے ہیں تو واللہ وہ اب تک محال کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھے۔

معارف ومسائل

آیت مذکورہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے استسقاء کی دعا فرمائی،

اللہ تعالیٰ نے پانی کا سامان کردیا، کہ پتھر پر لاٹھی مارنے سے چشمے اُبل پڑے، اس سے معلوم ہوا کہ استسقاء کی اصل دعاء ہی ہے، شریعت موسویہ میں بھی صرف دعاء پر اکتفاء کیا گیا، جیساکہ امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کا ارشاد ہو کہ استسقاء کی اصل پانی کے لئے دعاء کرنا ہے، یہ دعاء کبھی خاص نمازِ استسقاء کی صورت میں کی گئی ہے، جیساکہ حدیث صحیح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نمازِ استسقاء کے لئے عیدگاہ کے میدان میں تشریف لے جانا اور نماز اور خطبہ اور دعاء کرنا منقول ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ بغیر کسی خاص نماز کے صرف دعاء پر اکتفاء کیا گیا، جیساکہ صحیحین میں حضرت انسؓ کی روایت سے منقول ہے کہ خطبۂ جمعہ ہی میں آپؐ نے دعاء فرمائی، اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرمادی۔

اور یہ بات سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ استسقاء خواہ بصورت نماز کیا جائے، یا صرف دعاء کی صورت میں اس کے مؤثر ہونے کے لئے گناہوں سے توبہ اپنے فقر و مسکنت اور عبودیت کا اظہار ضروری ہے، گناہوں پر اصرار اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں پر قائم رہتے ہوئے تاثیر دعاء کے انتظار کا کسی کو حق نہیں، اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے یوں بھی قبول فرمالیں، ان کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ

اور جب کہا تم نے اے موسیٰ ہم ہرگز صبر نہ کریں گے ایک ہی طرح کے کھانے پر سو دعاء مانگ ہمارے واسطے

يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا

اپنے پروردگار سے کہ نکال دے ہمارے واسطے جو اُگتا ہے زمین سے ترکاری اور ککڑی اور گیہوں

وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۭ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ

اور مسور اور پیاز ، کہا موسیٰ نے کیا لینا چاہتے ہو وہ چیز جو ادنیٰ ہے اس کے بدلہ میں جو

هُوَ خَيْرٌ ۭ اِھْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ۭ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ

بہتر ہے، اُترو کسی شہر میں تو تم کو ملے جو مانگتے ہو اور ڈالی گئی اُن پر ذلت

الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۤ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ

اور محتاجی اور پھرے اللہ کا غصہ لے کر یہ اس لئے ہوا کہ

كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ

نہیں مانتے تھے احکامِ خداوندی کو اور خون کرتے تھے پیغمبروں کا ناحق ،

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٦١﴾ ع ۷

یہ اس لئے کہ نافرمان تھے، اور حد پر نہ رہتے تھے۔

خلاصہ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں نے (یوں) کہا کہ اے موسیٰ (روز کے روز) ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر کبھی نہ رہیں گے، (یعنی من وسلویٰ پر) آپ ہمارے واسطے اپنے پروردگار سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لئے ایسی چیزیں پیدا کریں جو زمین میں اُگا کرتی ہیں، ساگ (ہوا) ککڑی (ہوئی) گیہوں (ہوا) مسور (ہوئی) پیاز (ہوئی) آپ نے فرمایا کیا تم عوض میں لینا چاہتے ہو، ادنیٰ درجہ کی چیزوں کو ایسی چیز کے مقابلہ میں جو اعلیٰ درجہ کی ہے، (اچھا اگر نہیں مانتے تو) کسی شہر میں (جاکر) اترو (وہاں) البتہ تم کو وہ چیزیں ملیں گی جن کی تم درخواست کرتے ہو اور (ایسی ایسی گستاخیوں سے ایک زمانہ میں جاکر نقش کی طرح) جم گئی اُن پر ذلت (کہ دوسروں کی نگاہ میں قدر نہ رہی) اور پستی (کہ خود اُن کی طبائع میں اولوالعزمی نہ رہی) اور مستحق ہوگئے غضب الٰہی کے (اور) یہ (ذلت وغضب) اس وجہ سے (ہوا) کہ وہ لوگ منکر ہو جاتے تھے احکام الٰہیہ کے اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو (کہ وہ قتل خود ان کے نزدیک بھی) ناحق (ہوتا تھا) اور (نیز) یہ (ذلت وغضب) اس وجہ سے (ہوا) کہ ان لوگوں نے اطاعت نہ کی، اور دائرہ (اطاعت) سے نکل نکل جاتے تھے۔

فائدہ:۔ یہ قصہ بھی وادیٔ تیہ کا ہے، مَن وسلویٰ سے اُکتا کر ان ترکاریوں اور غلّوں کی درخواست کی، اس میدان کے داخلِ حدود میں کوئی شہر آباد تھا، وہاں جاکر رہنے کا حکم ہوا کہ بوؤ جوتو کھاؤ کماؤ۔

اور منجملہ ذلت ومسکنت کے یہ بھی ہے کہ یہودیوں سے سلطنت قربِ قیامت تک کیلئے چھین لی گئی. البتہ بالکل قیامت کے قریب محض لٹیروں کا سا بے ضابطہ تھوڑا زور شور دجّال یہودی کا کُل چالیس دن کے لئے ہو جائے گا، اور اس کو کوئی عاقل سلطنت نہیں کہہ سکتا، اور ان کو یہ بات موسیٰ علیہ السلام کی معرفت جتلا دی گئی تھی، کہ اگر بے حکمی کروگے تو ہمیشہ دوسری قوموں کے محکوم رہوگے، جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیت وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ط (۷: ۱۶۷) میں مذکور ہے، (موجودہ اسرائیلی حکومت کی حیثیت بھی امریکہ اور برطانیہ کے غلام سے زیادہ کچھ نہیں)۔

اور بہت سے پیغمبر مختلف اوقات میں یہودیوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، جس کو وہ لوگ بھی دل میں سمجھتے تھے کہ ہمارا یہ فعل ناحق ہے، لیکن عناد اور ضد نے اندھا بنا رکھا تھا۔

معارف و مسائل

یہودیوں پر ابدی ذلت کا مطلب اور اسرائیل کی موجودہ حکومت سے شبہ اور اس کا جواب

آیات مذکورہ میں یہود کی سزا دنیا میں دائمی ذلت و مسکنت اور دنیا و آخرت میں غضب الٰہی کو بیان کیا گیا ہے۔

ان کی دائمی ذلت و مسکنت کا مفہوم جو ائمۂ تفسیر صحابہؓ و تابعینؒ سے منقول ہے، اس کا خلاصہ ابن کثیرؒ کے الفاظ میں یہ ہے کہ لَا یَزَالُوْنَ مستذلین من وجدھم استذلھم وضرب علیھم الصغار، یعنی وہ کتنے ہی مالدار بھی ہو جائیں ہمیشہ تمام اقوام میں ذلیل و حقیر ہی سمجھے جائیں گے، جس کے ہاتھ لگیں گے ان کو ذلیل کرے گا، اور اُن پر غلامی کی علامتیں لگا دے گا۔

امام تفسیر ضحاکؒ ابن مزاحمؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ان کی ذلت و مسکنت کا یہ مفہوم نقل کیا ہے کہ ھم اھل القبالات یعنی الجزیۃ، مطلب یہ ہے کہ یہودی ہمیشہ دوسروں کی غلامی میں رہیں گے، ان کو ٹیکس وغیرہ ادا کرتے رہیں گے، خود اُن کو کوئی قوت و اقتدار حاصل نہ ہوگا۔

اس مضمون کی ایک آیت سورۂ آل عمران میں ایک زیادتی کے ساتھ اس طرح آئی ہے:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ ۔ (۳ : ۱۱۲)	"جمادی گئی اُن پر بے قدری جہاں کہیں جائینگے مگر ہاں ایک تو ایسے ذریعہ سے جو اللہ کی طرف سے ہو اور ایک ایسے ذریعہ سے جو آدمیوں کی طرف سے ہو"

اللہ تعالیٰ کے ذریعہ کا مطلب تو یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ہی اپنے قانون میں امن دیدیا ہو، جیسے نابالغ بچے، عورتیں، یا ایسے عبادت گذار جو مسلمانوں سے لڑتے نہیں پھرتے، وہ محفوظ و مامون رہیں گے، اور آدمیوں کے ذریعہ سے مراد معاہدۂ صلح ہے، جس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ مسلمانوں سے معاہدہ صلح کا یا جزیہ دے کر ان کے ملک میں رہنے کا ہو جائے، مگر الفاظ قرآنی میں مِنَ النَّاسِ فرمایا ہے مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ نہیں، اس لئے یہ صورت بھی محتمل ہے کہ دوسرے غیر مسلموں سے معاہدہ صلح کا کر کے اُن کی پشت پناہی میں آجائیں تو مامون رہ سکتے ہیں، پھر یہ استثناء حبل من اللہ اور حبل من الناس کا اگر بقول کشاف استثناء متصل قرار دیا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ یہود ہمیشہ ہر جگہ ذلیل و خوار رہیں گے، بجز اُن دو صورتوں کے کہ یا تو اللہ کے عہد کے ذریعہ ان کے بچے، عورتیں وغیرہ اس ذلت و خواری سے نکل جائیں، یا معاہدۂ صلح کے ذریعہ یہ اپنے آپ کو ذلت و خواری سے بچالیں، اور جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے معاہدۂ صلح کے ذریعہ ذلت و خواری سے نکلنے کی صورت مسلمانوں سے معاہدۂ صلح کر کے بھی ہو سکتی ہے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ دوسری قوموں سے معاہدہ صلح کا کر کے اُن کے

سہارے ذلت وخواری سے محفوظ رہیں۔

یہ سب تقریر استثناء متصل کی تقدیر پر ہے، اور بہت سے حضرات مفسرین نے اس کو استثناء منقطع قرار دیا ہے، تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ لوگ اپنی ذلت اور اپنی قومی حیثیت سے تو ذلیل وخوار ہی رہیں گے، گو قانونِ الٰہی کی وسعت میں آکر ان کے بعض افراد اس سے محفوظ ہو جائیں گے، یا دوسرے لوگوں کا سہارا لے کر ذلت وخواری پر پردہ ڈال دیں۔

اِس طرح سورۂ بقرہ کی آیت کی وضاحت سورۂ آلِ عمران کی آیت سے پوری ہوگئی، اور اسی سے وہ تمام شبہات بھی دور ہوگئے جو آجکل فلسطین میں یہودیوں کی حکومت قائم ہونے کی بناء پر بہت سے مسلمانوں کو پیش آتے ہیں، کہ قرآن کے قطعی ارشادات سے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہودیوں کی حکومت کبھی قائم نہ ہوگی، اور واقعہ یہ پایا جاتا ہے کہ فلسطین میں اُن کی حکومت قائم ہوگئی، جواب واضح ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کی موجودہ حکومت کی حقیقت سے جو لوگ باخبر ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ حکومت درحقیقت اسرائیل کی نہیں ہے بلکہ امریکہ اور برطانیہ کی ایک چھاؤنی سے زیادہ اس کی حیثیت نہیں، یہ اپنی ذاتی طاقت سے ایک مہینہ بھی زندہ نہیں رہ سکتے، یوروپین طاقتوں نے اسلامی بلاک کو کمزور کرنے کے لئے اُن کے بیچ میں اسرائیل کا نام دے کر ایک چھاؤنی بنائی ہوئی ہے، اور اسرائیلی اُن کی نظروں میں بھی اُن کے فرماں بردار غلام سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے، صرف قرآن کریم کے ارشاد بِحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ کے سہارے ان کا اپنا وجود قائم ہے، وہ بھی ذلّت کے ساتھ، اس لئے موجودہ اسرائیلی حکومت سے قرآن کریم کے کسی ارشاد پر ادنیٰ شبہ بھی نہیں ہوسکتا۔

اس کے علاوہ یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہو کہ یہود، نصاریٰ اور مسلمانوں میں سب سے پہلے یہود ہیں ان کی شریعت، اُن کی تہذیب سب سے پہلی ہو، اگر پوری دنیا میں فلسطین کے ایک چھوٹے سے قصبہ پر ان کا تسلط کسی طرح ہو بھی گیا، تو پوری دنیا کے نقشہ میں یہ حصہ ایک نقطہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے، اس کے بالمقابل نصاریٰ کی سلطنتیں اور مسلمانوں کے دورِ تنزل کے باوجود ان کی سلطنتیں، بت پرستوں کی سلطنتیں، لا مذہبوں کی حکومتیں جو جگہ جگہ مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی ہیں اُن کے مقابلہ میں فلسطین اور وہ بھی آدھا، اور اس پر بھی امریکہ، برطانیہ کے زیر سایہ کوئی تسلط یہودیوں کا ہوجائے تو کیا اس سے پوری قوم یہود پر خدا تعالیٰ کی طرف سے لگائی ہوئی دائمی ذلت کا کوئی جواب بن سکتا ہے؟

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ

بے شک جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئین

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ

جو ایمان لایا (ان میں سے) اللہ پر اور روزِ قیامت پر اور کام کئے نیک تو اُن کے لئے ہے ان کا ثواب

عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

ان کے رب کے پاس ، اور نہیں اُن پر کچھ خوف اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

خلاصۂ تفسیر

اس مقام پر یہودیوں کی شرارت کا حال معلوم کرکے سامعین کو یا خود یہود کو یہ خیال گذر سکتا ہے کہ ان حالات میں اگر عذر پیش کرکے ایمان لانا بھی چاہیں تو غالباً وہ اللہ کے نزدیک قبول نہ ہو، اس خیال کو دفع کرنے کے لئے اس آیت میں ایک قانون اور ضابطہ کا ذکر فرمایا کہ) یہ تحقیقی بات ہے کہ مسلمان، یہودی اور نصاریٰ اور فرقۂ صابئین (ان سب میں) جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ تعالیٰ (کی ذات وصفات) پر اور قیامت پر اور کارگذاری اچھی کرے (موافق قانونِ شریعت کے) ایسوں کے لئے ان کا حق الخدمت بھی ہے اُن کے پروردگار کے پاس (پہنچ کر) اور (وہاں جاکر) کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں ان پر، اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

فائدہ:۔ قانون کا حاصل ظاہر ہے کہ ہمارے دربار میں کسی کی تخصیص نہیں جو شخص پوری اطاعت اعتقاد اور اعمال میں اختیار کرے گا خواہ وہ پہلے سے کیسا ہی ہو ہمارے ہاں مقبول اور اس کی خدمت مشکور ہے، اور ظاہر ہے کہ نزولِ قرآن کے بعد پوری اطاعت اطاعتِ محمدیؐ یعنی مسلمان ہونے میں منحصر ہے، مطلب یہ ہوا کہ جو مسلمان ہو جائے گا مستحقِ نجاتِ اخروی ہوگا، اس میں اس خیال کا جواب ہوگیا، یعنی اِن شرارتوں کے بعد بھی اگر مسلمان ہو جائیں تو ہم سب معاف کردیں گے۔

اور صابئین ایک فرقہ تھا جس کے معتقدات اور طرزِ عمل کے بارے میں چونکہ کسی کو پورا پتہ نہ چلا اس لئے مختلف اقوال ہیں، واللہ اعلم۔

اور اس قانون میں بظاہر تو مسلمانوں کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ وہ تو مسلمان ہیں ہی، لیکن اس سے کلامِ پاک میں ایک خاص بلاغت اور مضمون میں ایک خاص وقعت پیدا ہوگئی، اسکی ایسی مثال ہے کہ کوئی حاکم یا بادشاہ کسی ایسے ہی موقع پر یوں کہے کہ ہمارا قانون عام ہے کوئی موافق ہو یا مخالف، جو شخص بھی اطاعت کرے گا موردِ عنایت ہوگا، اب ظاہر ہے کہ موافق تو اطاعت کر ہی رہا ہے سُنانا تو اصل میں مخالف کو ہے، لیکن اس میں نکتہ یہ ہوتا ہے کہ ہم کو جو موافقین پر عنایت ہے سو اس کی علت اُن سے کوئی ذاتی خصوصیت نہیں، بلکہ ان کی صفتِ موافقت پر مدار ہے ہماری عنایت کا، سو اگر مخالف بھی اختیار کرلے تو وہ بھی اس موافق کے برابر ہو جائے گا، اس لئے مخالف کے ساتھ موافق کو بھی ذکر کر دیا گیا۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا

اور جب لیا ہم نے تم سے اقرار اور بلند کیا تمہارے اوپر کوہ طور کو کہ پکڑو جو

مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾

کتاب ہم نے تم کو دی زور سے اور یاد رکھو جو کچھ اس میں ہے تاکہ تم ڈرو۔

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے تم سے قول وقرار لیا (کہ توراۃ پر عمل کریں گے) اور (اس قول وقرار لینے کے لئے) ہم نے طور پہاڑ کو اٹھا کر تمہارے اوپر (محاذات میں) معلق کر دیا، (اور اس وقت کہا) کہ (جلدی) قبول کرو جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے (یعنی توراۃ) مضبوطی کے ساتھ، اور یاد رکھو جو احکام اس (کتاب) میں ہیں جس سے توقع ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔

فائدہ: جب موسیٰ علیہ السلام کو طور پر توریت عطا ہوئی اور آپ نے واپس تشریف لاکر قوم کو وہ دکھائی اور سنائی تو اس میں احکام ذرا سخت تھے، مگر ان لوگوں کی حالت کے مطابق ایسے ہی احکام مناسب تھے، تو اوّل تو انھوں نے یہی کہا تھا کہ جب ہم سے اللہ تعالیٰ خود کہہ دیں گے، کہ یہ میری کتاب ہے، تب مانیں گے، (جس کا قصہ اوپر گذر چکا ہے) غرض وہ ستر آدمی جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر گئے تھے واپس آکر انھوں نے گواہی دی، مگر اس شہادت میں (اپنی طرف سے) اتنی آمیزش بھی کر دی کہ "اللہ تعالیٰ نے آخر میں یہ فرما دیا تھا کہ تم سے جس قدر عمل ہوسکے کرنا جو نہ ہوسکے معاف ہے"، تو کچھ تو جبلی شرارت، کچھ احکام کی مشقت اور کچھ اس آمیزش کا حیلہ ملا، غرض صاف کہہ دیا کہ ہم سے تو اس کتاب پر عمل نہیں ہوسکتا، حق تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ کوہ طور کا ایک بڑا ٹکڑا اٹھا کر اُن کے سروں پر معلق کر دو، کہ یا تو مانو ورنہ ابھی گرا، آخر چار ناچار ماننا پڑا۔

ایک شبہ کا ازالہ یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ دین میں تو اکراہ نہیں ہے، یہاں کیوں اکراہ کیا گیا؟ جواب یہ ہے کہ اکراہ ایمان لانے پر نہیں، بلکہ اوّل اپنی خوشی سے ایمان واسلام قبول کر لینے اور اس کے خلاف بغاوت کرنے کی وجہ سے ہے، باغیوں کی سزا تمام حکومتوں میں بھی عام مخالف اور دشمن قوموں سے الگ ہوتی ہے، اُن کے لئے ہر حکومت میں دو ہی راستے ہوتے ہیں، یا اطاعت قبول کریں، یا قتل کئے جائیں، اسی وجہ سے اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے، کفر کی سزا قتل نہیں۔

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ

پھر تم پھر گئے اس کے بعد سو اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اسکی مہربانی

لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٦٤﴾ ۱۰

تو ضرور تم تباہ ہوتے

خلاصۂ تفسیر پھر تم اس قول و قرار کے بعد بھی (اس سے) پھر گئے، سو اگر تم لوگوں پر خدا تعالیٰ کا فضل اور رحم نہ ہوتا (تو اس عہد شکنی کا مقتضا تو یہ تھا کہ) ضرور تم (فوراً) تباہ (اور ہلاک) ہو جاتے، (مگر ہماری عنایت و رحمت عامہ ہو کہ حیات مستعار کے ختم ہونے تک مہلت دے رکھی ہے، لیکن کب تک؟ آخر بعد از مرگ وبالِ اعمال میں مبتلا ہو گے)

فائدہ:- حق تعالیٰ کی رحمتِ عامہ دنیا میں مومن کافر سب پر ہے، جس کا اثر عافیت اور دنیوی راحت ہی، رحمت خاصہ کا ظہور آخرت میں ہوگا جس کا اثر نجات اور قربِ خداوندی ہے۔

بظاہر اس آیت کے جزو آخر کے مخاطب وہ یہودی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے، چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانا بھی عہد شکنی میں داخل ہے، اس لئے ان کو بھی عہد شکنوں میں شامل کر کے بطور مثال فرمایا گیا کہ اس پر بھی ہم نے تم پر دنیا میں کوئی عذاب ایسا نازل نہیں کیا جیسا پہلے بے ایمانوں اور عہد شکنوں پر ہوتا رہا، یہ محض خدا کی رحمت ہے۔

اور چونکہ اب از روئے احادیث ایسے عذابوں کا نہ آنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت ہی، اس لئے بعض مفسرین نے فضل و رحمت کی تفسیر بعثتِ محمدیہ سے کی ہے۔

اس مضمون کی تائید کے لئے گذشتہ بے ایمانوں کا ایک واقعہ اگلی آیت میں بیان ہو رہا ہے:

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ

اور تم خوب جان چکے ہو جنھوں نے کہ تم میں سے زیادتی کی تھی ہفتہ کے دن میں تو ہم نے کہا ان

كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ﴿٦٥﴾ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا

سے کہ ہو جاؤ بندر ذلیل، پھر کیا ہم نے اس واقعہ کو عبرت اُن لوگوں کیلئے جو وہاں

خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٦﴾

تھے اور جو پیچھے آنے والے تھے اور نصیحت ڈرنے والوں کیواسطے

خلاصۂ تفسیر اور تم جانتے ہی ہو اُن لوگوں کا حال جنھوں نے تم میں سے (حدِ شرع سے) تجاوز کیا تھا در بارہ (اس حکم کے جو) ہفتہ کے دن کے (متعلق تھا کہ اس روز

مچھلی کا شکار نہ کریں) سو ہم نے اُن کو (اپنے حکم قہری تکوینی سے مسخ کرنے کے لئے) کہہ دیا کہ تم بندر ذلیل بن جاؤ (چنانچہ وہ بندروں کے قالب میں مسخ ہو گئے) پھر ہم نے اس کو ایک (واقعہ) عبرت (انگیز) بنا دیا، ان لوگوں کے لئے بھی جو اس قوم کے معاصر تھے، اور ان لوگوں کے لئے بھی جو مابعد کے زمانے میں آتے رہے، اور (نیز اس واقعہ کو) موجب نصیحت (بنایا، خدا سے) ڈرنیوالوں کے لئے۔

فائدہ: - یہ واقعہ بھی بنی اسرائیل کا حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں ہوا، بنی اسرائیل کے لئے ہفتہ کا دن معظم اور عبادت کے لئے مقرر تھا، اور مچھلی کا شکار بھی اس روز ممنوع تھا یہ لوگ سمندر کے کنارے آباد تھے اور مچھلی کے شوقین تھے، اُس حکم کو نہ مانا، اور شکار کیا، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسخ صورت کا عذاب نازل ہوا، تین دن کے بعد وہ سب مر گئے۔

اس واقعہ کو دیکھنے اور سننے والے دو قسم کے لوگ تھے، فرمانبردار و نافرمان، تو نافرمانوں کے لئے تو یہ واقعہ نافرمانی سے توبہ کرانے والا تھا، اس لئے اس کو نکال فرمایا، اور فرمانبرداروں کو یہ واقعہ فرمانبرداری پر قائم رکھنے والا تھا اس کو مَوْعِظَةً فرمایا۔

معارف ومسائل

دینی معاملات میں کوئی ایسا حیلہ جس سے اصل حکم شرعی باطل ہو جائے حرام ہے

اس آیت میں یہودیوں کے جس اعتداء یعنی حدود سے تجاوز کا ذکر کرکے اس کو سببِ عذاب بتلایا گیا ہے، روایات سے ثابت ہے کہ وہ صاف طور پر حکم شرعی کی خلاف ورزی نہ تھی، بلکہ ایسے حیلے تھے جن سے حکم شرعی کا ابطال لازم آتا تھا، مثلاً ہفتہ کے دن مچھلی کی دُم میں ایک ڈور کا پھندا لگا کر دریا میں چھوڑ دیا، اور یہ ڈور زمین پر کسی چیز سے باندھ دی، پھر اتوار کے روز اس کو پکڑ کر کھا لیا، تو یہ ایک ایسا حیلہ ہے جس میں حکم شرعی کا ابطال بلکہ ایک قسم کا استہزاء ہے، اس لئے ایسا حیلہ کرنے والوں کو بڑا سرکش نافرمان قرار دے کر اُن پر عذاب آیا۔

مگر اس سے اُن فقہی حیلوں کی حرمت ثابت نہیں ہوتی جن میں سے بعض خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلائے ہیں مثلاً ایک سیر عمدہ کھجور کے بدلے میں دو سیر خراب کھجور خریدنا سود میں داخل ہے، مگر اس سے بچنے کا ایک حیلہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتلایا کہ جنس کا تبادلہ جنس سے نہ کرو، قیمت کے ذریعہ خرید و فروخت کرلو، مثلاً دو سیر خراب کھجوریں دو درہم میں فروخت کر دیں، پھر ان دو درہموں میں سے ایک سیر عمدہ کھجور خرید لی، تو یہاں حکم شرعی کی تعمیل مقصود ہے ابطال نہ مقصود ہے نہ واقع ہے، اسی طرح بعض دوسرے مسائل میں بھی فقہاء نے حرام سے بچنے کی بعض

ایسی ہی تدبیریں بتلائی ہیں، اُن کو یہودیوں کے حیلوں کی طرح کہنا اور سمجھنا غلط ہے۔

واقعہ مسخِ صورتِ یہود تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہود نے اوّل اوّل تو اس طرح کے حیلے کرکے مچھلیاں پکڑیں، پھر ہوتے ہوتے عام طور پر شکار کھیلنے لگے، تو ان میں دو جماعتیں ہوگئیں، ایک جماعت علماء و صلحاء کی تھی، جنھوں نے ان کو ایسا کرنے سے روکا، یہ باز نہ آئے تو اُن سے برادرانہ تعلقات قطع کرکے بالکل الگ ہوگئے، اور بستی کے دو حصے کرلئے، ایک میں یہ نافرمان لوگ رہ گئے، دوسرے میں علماء و صلحاء رہے، ایک روز اُن کو یہ محسوس ہوا کہ جس حصہ میں یہ نافرمان لوگ رہتے تھے ادھر بالکل سناٹا ہے تو وہاں جاکر دیکھا تو سب کے سب بندروں کی صورت میں مسخ ہوگئے تھے، اور حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ اُن کے جوان بندر بنا دیئے گئے تھے اور بوڑھے خنزیر کی شکل میں منتقل کردیئے گئے تھے، اور مسخ شدہ بندر اپنے رشتہ دار اور تعلق والے انسانوں کو پہچانتے تھے، اُن کے قریب آکر روتے تھے۔

ممسوخ قوم کی نسل نہیں چلتی اس معاملہ میں صحیح بات وہ ہے جو خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بروایت عبداللہ بن مسعودؓ صحیح مسلم میں منقول ہے، کہ بعض لوگوں نے اپنے زمانے کے بندروں اور خنزیروں کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا یہ وہی مسخ شدہ یہودی ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم میں مسخ صورت کا عذاب نازل کرتے ہیں تو اُن کی نسل نہیں چلتی، (بلکہ چند روز میں ہلاک ہوکر ختم ہوجاتے ہیں) اور پھر فرمایا کہ بندر اور خنزیر دنیا میں پہلے سے بھی موجود تھے (اور آج بھی ہیں، مگر مسخ شدہ بندروں اور خنزیروں سے اُن کا کوئی جوڑ نہیں)

اس موقع پر بعض مفسّرین نے صحیح بخاری کے حوالہ سے بندروں میں زنا کی سزا میں سنگساری کرنے کا ایک واقعہ نقل کیا ہے، مگر یہ واقعہ نہ بخاری کے صحیح نسخوں میں موجود ہے نہ روایۃً صحیح ہے، قرطبیؒ نے اس جگہ اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے اللہ فرماتا ہے تم کو، ذبح کرو ایک گائے

قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿٦٧﴾

وہ بولے کیا تو ہم سے ہنسی کرتا ہے کہا پناہ خدا کی کہ ہوں میں جاہلوں میں۔

خلاصۂ تفسیر اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا کہ حق تعالیٰ تم کو حکم دیتے ہیں کہ (اگر اس لاش کے قاتل کا پتہ لگانا چاہتے ہو

تو تم ایک بیل ذبح کرو، وہ کہنے لگے کہ آیا آپ ہم کو مسخرہ بناتے ہیں (کہاں قاتل کی تحقیق کہاں جانور کا ذبح کرنا) موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا نعوذ باللہ، جو میں ایسی جہالت والوں کا سا کام کروں، (کہ احکام خداوندی میں تمسخر کرنے لگوں)

فائدہ:- یہ قصہ اس طرح ہوا کہ بنی اسرائیل میں ایک خون ہو گیا تھا جس کی وجہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں یہ لکھی ہے کہ کسی شخص نے مقتول کی کسی لڑکی سے شادی کی درخواست کی تھی، مگر اس نے انکار کر دیا، اور اس شخص نے اس کو قتل کر دیا، قاتل لاپتہ تھا اس کا پتہ نہ لگتا تھا۔

اور معالم نے کلبیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس وقت تک توریت میں اس کے متعلق کوئی شرعی قانون بھی نازل نہیں ہوا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ نزولِ توریت سے قبل کا ہے۔

غرض بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ ہم چاہتے ہیں کہ قاتل کا پتہ چلے، آپ نے بحکم خداوندی ایک بیل ذبح کرنے کا حکم فرمایا، انھوں نے حسب عادت اور اپنی جبلّت کے مطابق اس میں حجتیں نکالنا شروع کیں۔

آیات آئندہ میں اسی کی تفصیل ہے۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا

بولے کہ دعا کر ہمارے واسطے اپنے رب سے کہ بتادے ہمکو کہ وہ گائے کیسی ہے، کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک

بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۖ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ ۖ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴿٦٨﴾

گائے ہے نہ بوڑھی اور نہ بن بیاہی درمیان میں ہے بڑھاپے اور جوانی کے اب کر ڈالو جو تمکو حکم ملا ہے،

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا

بولے کہ دعا کر ہمارے واسطے اپنے رب سے کہ بتادے ہمکو کیسا ہے اس کا رنگ، کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک

بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا

گائے ہے زرد خوب گہری ہے اس کی زردی، خوش آتی ہے دیکھنے والوں کو، بولے کہ دعا کر ہمارے واسطے

رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِنْ شَاءَ

اپنے رب سے کہ بتادے ہم کو کس قسم میں ہے وہ کیونکہ اس گائے میں شبہ پڑا ہے ہم کو اور ہم اگر اللہ نے چاہا

اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿٧٠﴾ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ

تو ضرور راہ پالیں گے، کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے محنت کرنیوالی نہیں کہ جوتتی ہو زمین کو یا

الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا ۗ قَالُوا الْـٰٔنَ

پانی دیتی ہو کھیتی کو ، بے عیب ہے کوئی داغ اس میں نہیں، بولے اب لایا تو

جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿٧١﴾ ع ۸ ۱۰ ۸

ٹھیک بات پھر اس کو ذبح کیا وہ لگتے نہ تھے کہ ایسا کر لیں گے۔

خلاصۂ تفسیر

وہ لوگ کہنے لگے کہ آپ درخواست کیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے ہم سے بیان کردیں کہ اس (بیل) کے کیا اوصاف ہیں، آپ نے فرمایا کہ وہ (میری درخواست کے جواب میں) یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایسا بیل ہو کہ نہ بوڑھا ہو نہ بہت بچہ ہو (بلکہ) پٹھا ہو، دونوں عمروں کے اوسط میں سو اب (زیادہ حجت مت کیجیو، بلکہ) کر ڈالو جو کچھ تم کو حکم ملا ہے، کہنے لگے کہ (اچھا یہ بھی) درخواست کر دیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے ہم سے یہ (بھی) بیان کردیں کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ آپ نے فرمایا کہ (اس کے متعلق) حق تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک زرد رنگ کا بیل ہو جس کا رنگ تیز زرد ہو کہ ناظرین کو فرحت بخش ہو، کہنے لگے کہ (اب کی بار اور) ہماری خاطر اپنے رب سے دریافت کر دیجئے کہ (اوّل بار کے سوال کا جواب ذرا اور واضح) ہم سے بیان کردیں کہ اس کے اوصاف کیا کیا ہوں، کیونکہ ہم کو اس بیل میں (قدرے) اشتباہ (یہ باقی) ہے (کہ وہ معمولی بیل ہوگا یا کوئی اور عجیب غریب جس میں تحقیق قاتل کا خاص اثر ہو) اور ہم ضرور انشاء اللہ تعالیٰ (اب کی بار) ٹھیک سمجھ جاویں گے، موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ وہ (کوئی عجیب وغریب جانور نہیں ہے، یہی معمولی بیل ہے، البتہ عمدہ ہونا چاہیے کہ اوصاف مذکورہ کے ساتھ) نہ تو ہل میں چلا ہوا ہو، جس سے زمین جوتی جاوے، اور نہ (کنوئیں میں جوڑا گیا ہو کہ) اس سے زراعت کی آبپاشی کی جاوے، (غرض ہر قسم کے عیب سے) سالم ہو اور اس میں (کسی طرح کا) کوئی داغ نہ ہو، (یہ سُنکر) کہنے لگے کہ (ہاں) اب آپ نے پوری (اوصاف) بات فرمائی، (القصہ جانور تلاش کر کے خریدا) پھر اس کو ذبح کردیا، حالانکہ بظاہر کرتے ہوئے معلوم نہ ہوتے تھے۔

فائدہ:۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر وہ یہ حجتیں نہ کرتے تو اتنی قیدیں اُن کے ذمہ نہ ہوتیں جو بھی بقرہ ذبح کر دیا جاتا کافی ہو جاتا۔

وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَّارَأْتُمْ فِيهَا ۖ وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ

اور جب مار ڈالا تھا تم نے ایک شخص کو پھر لگے ایک دوسرے پر دھرنے اور اللہ کو ظاہر کرنا تھا جو تم

تَكْتُمُونَ ﴿٧٢﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ۚ كَذَٰلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَىٰ

چھپاتے تھے ، پھر ہم نے کہا مارو اس مُردے پر اس گائے کا ایک ٹکڑا اسی طرح زندہ کریگا اللہ مُردوں کو

وَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

اور دکھاتا ہے تم کو اپنی قدرت کے نمونے تاکہ تم غور کرو

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں (میں سے کسی) نے ایک آدمی کا خون کر دیا، پھر (اپنی برائت کے لئے) ایک دوسرے پر ڈالنے لگے، اور اللہ تعالیٰ کو اس امر کا ظاہر کرنا منظور تھا جس کو تم (میں کے مجرم و مشتبہ لوگ) مخفی رکھنا چاہتے تھے، اس لئے (ذبح بقرہ کے بعد) ہم نے حکم دیا کہ اس (مقتول کی لاش) کو اس (بقرہ) کے کوئی سے ٹکڑے سے چھوا دو (چنانچہ چھوانے سے وہ زندہ ہو گیا) آگے اللہ تعالیٰ بمقابلۂ منکرین قیامت کے اس قصہ سے استدلال اور نظیر کے طور پر فرماتے ہیں کہ) اسی طرح حق تعالیٰ (قیامت میں) مُردوں کو زندہ کر دیں گے، اور (اللہ تعالیٰ اپنے نظائر (قدرت) تم کو دکھلاتے ہیں اس توقع پر کہ تم عقل سے کام لیا کرو (اور ایک نظیر سے دوسری نظیر کے انکار سے باز آؤ)۔

فائدہ:۔ جب اس مردہ کے ساتھ یہ معاملہ کیا گیا تو وہ زندہ ہو گیا، اس نے قاتل کا نام بتایا اور پھر فوراً ہی مر گیا۔

اس جگہ صرف مقتول کا بیان اس لئے کافی سمجھا گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ وحی معلوم ہو گیا تھا، کہ یہ مقتول سچ بولے گا، ورنہ صرف مقتول کے بیان سے بغیر شرعی شہادت کے کسی پر قتل کا ثبوت کافی نہیں ہوتا۔

یہاں یہ شبہ کرنا بھی درست نہیں کہ حق تعالیٰ کو تو مردہ زندہ کرنے کی ویسی ہی قدرت تھی، یا مقتول کو زندہ کئے بغیر قاتل کا نام بتایا جا سکتا تھا، پھر اس سامان کی کیا ضرورت تھی، تو بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا کوئی فعل ضرورت اور مجبوری کی وجہ سے تو ہوتا نہیں، بلکہ مصلحت اور حکمت کے لئے ہوتا ہے، اور ہر واقعہ کی حکمت اللہ تعالیٰ ہی کے احاطۂ علمی میں آ سکتی ہے، نہ ہم اس کے مکلف ہیں کہ ہر واقعہ کی مصلحت معلوم کریں اور نہ یہ ضروری ہے کہ ہر واقعہ کی حکمت ہماری سمجھ میں آ جائے، اس لئے اس کے پیچھے پڑ کر اپنی عمر عزیز ضائع کرنے کے بجائے بہتر طریقہ تسلیم و سکوت کا ہے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ

پھر تمہارے دل سخت ہو گئے اس سب کے بعد سو وہ ہو گئے جیسے پتھر یا ان سے بھی

قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ

سخت، اور پتھروں میں تو ایسے بھی ہیں جن سے جاری ہوتی ہیں نہریں اور ان میں

مِنۡهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخۡرُجُ مِنۡهُ الۡمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَهۡبِطُ مِنۡ

ایسے بھی ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور نکلتا ہے ان سے پانی اور ان میں ایسے بھی ہیں جو گر پڑتے ہیں

خَشۡيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۷۴﴾

اللہ کے ڈر سے اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے ۔

خلاصۂ تفسیر

(گذشتہ واقعات سے متاثر نہ ہونے پر شکایت کے طور پر ارشاد ہوتا ہے) ایسے ایسے واقعات کے بعد (چاہئے تھا کہ تم لوگوں کے دل بالکل نرم اور حق تعالیٰ کی عظمت سے پُر ہو جاتے، لیکن) تمہارے دل پھر بھی سخت ہی رہے تو (یوں کہنا چاہئے کہ) ان کی مثال پتھر کی سی ہے، یا (یوں کہئے کہ وہ) سختی میں اُن سے (بھی) زیادہ (ہیں) اور (زیادہ سخت اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ) بعضے پتھر تو ایسے ہیں جن سے (بڑی بڑی) نہریں پھوٹ کر چلتی ہیں، اور انہی پتھروں میں بعضے ایسے ہیں کہ جو شق ہو جاتے ہیں، پھر اُن سے (اگر زیادہ نہیں تو تھوڑا ہی) پانی نکل آتا ہے، اور ان ہی پتھروں میں بعضے ایسے ہیں جو خدا تعالیٰ کے خوف سے اوپر سے نیچے لڑھک آتے ہیں، (اور تمہارے قلوب میں کسی قسم کا اثر ہی نہیں ہوتا) اور (اس قساوت سے جو اعمالِ بد صادر ہوتے ہیں) حق تعالیٰ تمہارے (ان) اعمال سے بے خبر نہیں ہیں (بہت جلد تم کو سزا تک پہنچا دیں گے) ۔

فائدہ:۔ اس جگہ پتھر کے تین اثرات بیان کئے گئے ہیں، اول ان سے زیادہ پانی نکلنا، دوم کم پانی نکلنا، ان دو میں تو کسی کو شبہ نہیں پڑتا، تیسری صورت یعنی خدا کے خوف سے پتھر کا نیچے آگرنا، اس میں ممکن ہے کسی کو شبہ ہو، کیونکہ پتھر کو تو عقل اور حس نہیں ہے، سو یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ خوف کے لئے عقل کی تو ضرورت نہیں، کیونکہ حیوانات لا یعقل میں خوف کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، البتہ حس کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن جمادات میں اتنی حس بھی نہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں، کیوں کہ حس حیات پر موقوف ہے، اور بہت ممکن ہو کہ ان میں ایسی لطیف حیات ہو جس کا ہم کو ادراک نہ ہوتا ہو، جیسا جوہر دماغ کے احساس کا بہت سے عقلاء کو ادراک نہیں ہوتا، وہ محض دلائل سے اس کے قائل ہوتے ہیں، تو دلائلِ طبیہ سے ظاہر نصِ قرآن کی دلالت اور قوت کسی طرح بھی کم نہیں۔

پھر ہمارا یہ دعویٰ بھی نہیں کہ ہمیشہ پتھر گرنے کی علت خوف ہی ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ بعض پتھر اس وجہ سے گر جاتے ہیں، سو بہت ممکن ہے کہ گرنے کے اسباب مختلف ہوں، ان میں سے بعض طبعی ہوں اور ایک سبب خوفِ خدا بھی ہو۔

اس مقام پر تین قسم کے پتھروں کے ذکر میں ترتیب نہایت لطیف اور افادہ مقصود

نہایت بلیغ انداز میں کیا گیا ہے، یعنی بعض پتھروں میں تاثر اتنا قوی ہے جس سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں، جن سے مخلوق خدا فائدہ اٹھاتی ہے، اور ان (یہودیوں) کے دل ایسے بھی نہیں (کہ مخلوقِ خدا کی تکلیف و مصیبت میں پگھل جائیں) اور بعض پتھروں میں ان سے کم تاثر ہوتا ہے جس سے کم نفع پہنچتا ہے، تو یہ پتھر بہ نسبت اوّل کے کم نرم ہوئے، اور ان کے قلوب ان (درجہ دوم کے) پتھروں سے بھی سخت ہیں۔

اور بعض پتھروں میں گو اس درجہ کا اثر نہیں، مگر پھر بھی ایک اثر تو ہے (کہ خوفِ خدا سے نیچے گر آتے ہیں) گو درجے میں پہلی قسموں سے یہ ضعیف تر ہیں، مگر ان کے قلوب میں تو کم درجہ اور ضعیف ترین جذبۂ انفعال بھی نہیں۔

اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ وَقَدۡ کَانَ فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ

اب کیا تم اے مسلمانو! توقع رکھتے ہو کہ وہ مانیں تمہاری بات اور ان میں ایک فرقہ تھا

یَسۡمَعُوۡنَ کَلٰمَ اللّٰہِ ثُمَّ یُحَرِّفُوۡنَہٗ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡہُ وَہُمۡ

کہ سنتا تھا اللہ کا کلام پھر بدل ڈالتے تھے اس کو جان بُوجھ کر اور وہ

یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۵﴾

جانتے تھے۔

خلاصۂ تفسیر (مسلمان یہودیوں کو مومن بنانے کی جو کوشش کر رہے تھے اور اس میں کلفت اٹھاتے تھے تو یہود کے حالات و واقعات بتلا اور سنا کر مسلمانوں کی امید کا انقطاع کر کے ان کی کلفت اس آیت کے ذریعہ دفع فرماتے ہیں)

(اے مسلمانو!) کیا (یہ سارے قصے سُن کر) اب بھی تم توقع رکھتے ہو کہ یہ (یہودی) تمہارے کہنے سے ایمان لے آویں گے، حالانکہ (ان سب مذکورہ قصوں سے بڑھ کر ایک اور بات بھی اُن سے ہو چکی ہے کہ) ان میں کچھ لوگ ایسے گذرے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے تھے اور پھر اس کو کچھ کا کچھ کر ڈالتے تھے (اور) اس کو سمجھنے کے بعد (ایسا کرتے) اور (لطف یہ کہ یہ بھی) جانتے تھے (کہ ہم بُرا کر رہے ہیں، محض اغراضِ نفسانیہ اس کارروائی کا باعث ہوتیں)

فائدہ: مطلب یہ کہ جو لوگ ایسے بیباک اور اغراضِ نفسانی کے اسیر ہوں وہ کسی کے کہنے سننے سے کب باز آنے والے اور کسی کی کب سننے والے ہیں۔

اور کلام اللہ سے مراد یا تو توریت ہو، اور سماع سے مراد بواسطۂ انبیاء علیہم السلام کے ہے،

اور تحریف سے مراد اس کے بعض کلمات یا تفاسیر یا دونوں بدل ڈالنا ہیں، اور یا کلام سے مراد وہ کلام ہو جو اُن ستر آدمیوں نے بطور تصدیقِ موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر سُنا تھا، اور سماع سے مراد بلا واسطہ، اور تحریف سے مراد قوم سے یہ نقل کر دینا کہ آخیر میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرما دیا تھا کہ جو حکم تم سے ادا نہ ہو سکے وہ معاف ہے"

امور مذکورہ بالا میں سے کسی امر کا صدور گو ان یہودیوں سے نہ ہوا ہو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے، لیکن چونکہ یہ لوگ بھی اپنے اسلاف کے اُن اعمال پر انکار و نفرت نہ رکھتے تھے، اس لئے حکماً یہ بھی ویسے ہی ہوئے۔

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا ۚ وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ

اور جب ملتے ہیں مسلمانوں سے کہتے ہیں ہم مسلمان ہوئے اور جب تنہا ہوتے ہیں ایک دوسری کے

بَعْضٍ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُم

پاس تو کہتے ہیں تم کیوں کہدیتے ہو اُن سے جو ظاہر کیا اللہ نے تم پر تاکہ جھٹلائیں تم کو

بِهِ عِندَ رَبِّكُمْ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٧٦﴾

اس سے تمہارے رب کے آگے کیا تم نہیں سمجھتے۔

خلاصۂ تفسیر

اور جب ملتے ہیں (منافقین یہود) مسلمانوں سے تو (ان سے تو) کہتے ہیں کہ ہم (بھی) ایمان لے آئے ہیں اور جب تنہائی میں جاتے ہیں یہ بعضے (منافق یہودی) دوسرے بعضے (علانیہ) یہودیوں کے پاس (تو ان سے اُن کی معیت و ہم مشربی کے مدعی ہوتے ہیں اس وقت) وہ (دوسرے یہودی) اُن سے کہتے ہیں کہ تم (یہ) کیا (غضب کرتے ہو کہ مسلمانوں کو (خوشامد میں) وہ باتیں بتلا دیتے ہو جو (اُن کے مفید مذہب) اللہ تعالیٰ نے (توریت میں) تم پر منکشف کر دی ہیں (مگر ہم بمصلحت پوشیدہ رکھتے ہیں) نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ لوگ تم کو حجت میں مغلوب کر دیں گے کہ (دیکھو) یہ مضمون اللہ کے پاس (سے تمہاری کتاب میں آیا) ہے کیا تم (اتنی موٹی سی بات) نہیں سمجھتے۔

فائدہ: منافقین کبھی ایک آدھ بات خوشامد میں اپنے ایمان کی سچائی جتلانے کے لئے مسلمانوں سے کہہ دیتے تھے کہ توریت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بشارت آئی ہے، یا قرآن مجید کے متعلق خبر آئی ہے، وغیرہ وغیرہ، اس پر دوسرے لوگ اُن کو ملامت کرتے تھے۔

أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿۷۷﴾

کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ إِلَّآ أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا

اور بعض ان میں بے پڑھے ہیں کہ خبر نہیں رکھتے کتاب کی سوائے جھوٹی آرزوؤں کے اور اُن کے

يَظُنُّونَ ﴿۷۸﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتٰبَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ

پاس کچھ نہیں مگر خیالات، سو خرابی ہے اُن کو جو لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھ سے، پھر کہدیتے ہیں

يَقُولُونَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ

یہ خدا کی طرف سے ہے تاکہ لیویں اس پر تھوڑا سا مال، سو خرابی ہے اُن کو

لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُونَ ﴿۷۹﴾

اپنے ہاتھوں کے لکھے سے اور خرابی ہے ان کو اپنی اس کمائی سے۔

خلاصۂ تفسیر

کیا ان کو اس کا علم نہیں ہے کہ حق تعالیٰ کو سب خبر ہے اُن چیزوں کی بھی جن کو وہ مخفی رکھتے ہیں اور ان کی بھی جن کا وہ اظہار کرتے ہیں (تو اگر منافقین نے مؤمنین سے اپنا کفر چھپایا تو کیا اور ان ملامت گروں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت وغیرہ کے مضامین چھپائے تو کیا، اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں مضامین سے مسلمانوں کو جا بجا مطلع فرما دیا ہے)

اس آیت میں تو یہودیوں کے خواندہ لوگوں کا ذکر تھا، آگے اُن کے ناخواندہ لوگوں کا ذکر اس طرح فرماتے ہیں کہ:

اور ان (یہودیوں) میں بہت سے ناخواندہ (بھی) ہیں جو کتابی علم نہیں رکھتے، لیکن (بلا سند) دل خوش کن باتیں (بہت یاد ہیں) اور وہ لوگ کچھ اور نہیں، (ویسے ہی بے بنیاد) خیالات پکا لیتے ہیں (اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ تو ان کے علماء کی تعلیم ناقص اور مخلوط ہے، اور پھر اوپر سے اُن میں فہم کی کمی ہے، ایسی صورت میں بجز بے بنیاد خیالات کے حقائق واقعیہ کی تحقیق کہاں نصیب ہو سکتی ہے، بقول شخصے "کریلا اور نیم چڑھا" اس میں مٹھاس کہاں۔

اور چونکہ ان کی اس توہم پرستی میں ان کے علماء کی خیانت بڑا سبب ہے، اس لئے جرم میں بھی وہ اپنے عوام سے زیادہ ہوئے، اسی کا بیان اب یہاں کرتے ہیں۔

(جب عوام مذکورین قابل زجر و توبیخ ہیں اور ان کے جہل کا اصلی سبب اُن کے علماء ہی ہیں) تو بڑی خرابی اُن کی ہوگی جو لکھتے ہیں (بدل سدل کر) کتاب (توریت) کو اپنے ہاتھوں سے (اور) پھر (عوام) کہہ دیتے ہیں کہ یہ (حکم) خدا کی طرف سے (یوں ہی) آیا ہے (اور) غرض (صرف) یہ ہوتی ہے کہ اس ذریعہ سے کچھ نقد قدرے قلیل وصول کرلیں، سو بڑی خرابی (پیش) آدے گی ان کی اس (تحریف کتاب) کی بدولت (بھی) جس کو ان کے ہاتھوں نے لکھا تھا اور بڑی خرابی ہوگی ان کو اس (نقد) کی بدولت (بھی) جس کو وہ وصول کرلیا کرتے تھے۔

فائدہ:۔ عوام کی رضاجوئی کے لئے غلط سلط مسئلے بتلا دینے سے ان کو کچھ نقد وغیرہ بھی وصول ہو جاتا تھا، اور ان کی نظر میں وقعت اور وقار بھی رہتا تھا، اسی غرض سے توریت میں لفظی اور معنوی پھیر پھار بھی کرتے رہتے تھے، اس آیت میں اسی پر وعید سنائی گئی۔

وَقَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ

اور کہتے ہیں ہم کو ہرگز آگ نہ لگے گی مگر چند روز گنے چنے کہہ دو کیا تم لے چکے ہو

عِندَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ ۖ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ

اللہ کے یہاں سے قرار کہ اب ہرگز خلاف نہ کریگا اللہ اپنے قرار کے یا جوڑتے ہو اللہ پر

مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٨٠﴾

جو تم نہیں جانتے

خلاصۂ تفسیر

اور یہودیوں نے (یہ بھی) کہا کہ ہرگز ہم کو آتشِ (دوزخ) چھوئے گی (بھی تو) نہیں، (ہاں) مگر (بہت) تھوڑے روز جو (انگلیوں پر) شمار کرلئے جاسکیں (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (ان سے) یوں فرما دیجئے کیا تم لوگوں نے حق تعالیٰ سے (اس کے متعلق) کوئی معاہدہ لے لیا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ اپنے معاہدہ کے خلاف نہ کریں گے، یا (معاہدہ نہیں لیا، بلکہ ویسے ہی) اللہ تعالیٰ کے ذمہ ایسی بات لگاتے ہو جس کی کوئی علمی سند اپنے پاس نہیں رکھتے۔

فائدہ:۔ یہود کے اس قول کی مفسرین نے مختلف تقریریں کی ہیں منجملہ اس کے یہ ہے کہ یہ امر محقق ہے کہ مؤمن اگر عاصی ہو تو گو بقدر گناہ دوزخ کے عذاب میں داخل ہو، لیکن ایمان کی وجہ سے دائمی عذابِ جہنم نہ ہوگا، بعد چندے نجات ہو جائے گی۔

پس یہود کے دعوے کا حاصل یہ تھا کہ چونکہ ان کے بزعم دینِ موسوی منسوخ نہیں ہے، لہٰذا وہ

مؤمن ہیں، انکارِ نبوت حضرت عیسیٰ علیہ السلام و جناب حضور مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کافر نہیں ہوئے، پس اگر کسی عصیان کے سبب دوزخ میں چلے بھی گئے پھر نکال لئے جائیں گے، اور چونکہ یہ دعویٰ بناء الفاسد علی الفاسد ہے، کیونکہ دین موسوی کی ابدیت کا دعویٰ خود غلط ہے، لہٰذا انکار نبوت مسیحیہ و محمدیہ کے سبب وہ لوگ کافر ہوں گے، اور کفار کے لئے بعد چندے دوزخ سے نجات پا جانا کسی بھی آسمانی کتاب میں نہیں، جس کو اللہ تعالیٰ نے عہد سے تعبیر فرمایا، پس ثابت ہوا کہ دعویٰ بلا دلیل بلکہ خلافِ دلیل ہے۔

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ

کیوں نہیں جس نے کمایا گناہ اور گھیر لیا اس کو اس کے گناہ نے سو وہی ہیں دوزخ

النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

کے رہنے والے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے، اور جو ایمان لائے اور عمل کئے نیک

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع ۹ ۱۱ ۹

وہی ہیں جنت کے رہنے والے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

خلاصۂ تفسیر

خلود فی النار کا ضابطہ:۔ (بجز چند روز کے تم کو آتش دوزخ) کیوں نہیں (لگے گی، بلکہ ابدالآباد تک اس میں رہنا ضرور رہی، کیونکہ ہمارا ضابطہ یہ ہے کہ) جو شخص قصداً بری باتیں کرتا رہے اور اس کو اس کی خطا (و قصور اس طرح) احاطہ کرلے (کہ کہیں نیکی کا اثر تک نہ رہے) سو ایسے لوگ اہلِ دوزخ ہوتے ہیں (اور) وہ اس میں ہمیشہ (ہمیشہ) رہیں گے، اور جو لوگ (اللہ و رسول پر) ایمان لادیں اور نیک کام کریں ایسے لوگ اہلِ بہشت ہوتے ہیں (اور) وہ اس میں ہمیشہ (ہمیشہ) رہیں گے۔

فائدہ:۔ خطاؤں کے احاطہ کے جو معنی اوپر ذکر کئے گئے ہیں اس قسم کا احاطہ اس معنی کے ساتھ کفار کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ کفر کی وجہ سے کوئی بھی عمل صالح مقبول نہیں ہوتا، بلکہ کفر کے قبل اگر کچھ نیک اعمال کئے بھی ہوں تو وہ بھی ضائع اور ضبط ہو جاتے ہیں، اسی وجہ سے کفار میں سرتاپا بدی ہی بدی ہوگی، جس کی جزا ابدی جہنم ہوگی، بخلاف اہلِ ایمان کے کہ اوّل تو ان کا ایمان خود بہت بڑا عمل صالح ہے، دوسرے اعمالِ فرعیہ بھی ان کے نامۂ اعمال میں درج ہوتے ہیں، اس لئے وہ نیکی کے اثر سے خالی نہیں، پس احاطۂ مذکور اُن کی حالت پر صادق نہیں آتا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جب اس ضابطہ کی رُو سے کافر کا ابدی جہنمی ہونا ثابت ہوگیا، تو چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خاتم الانبیاء نہیں ہیں، آپ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نبی ہیں، تو یہود ان کا انکار کرکے کافروں میں شامل ہوگئے، اس لئے اس ضابطہ کی رُو سے وہ بھی خالد فی النار ہوں گے، تو ان کا دعویٰ مذکور دلیل قطعی سے باطل ٹھہرا۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ قف

اور جب ہم نے لیا قرار بنی اسرائیل سے کہ عبادت نہ کرنا مگر اللہ کی

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَ

اور ماں باپ سے سلوک نیک کرنا اور کنبہ والوں سے اور یتیموں اور محتاجوں سے اور

قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ط ثُمَّ

کہیو سب لوگوں سے نیک بات اور قائم رکھیو نماز اور دیتے رہیو زکوٰۃ پھر

تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾

تم پھر گئے مگر تھوڑے سے تم میں اور تم ہو ہی پھرنے والے۔

خلاصۂ تفسیر اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب لیا ہم نے (توریت میں) قول و قرار بنی اسرائیل سے کہ عبادت مت کرنا (کسی کی) بجز اللہ کے، اور ماں باپ کی اچھی طرح خدمت گذاری کرنا، اور اہلِ قرابت کی بھی، اور بے باپ کے بچوں کی بھی، اور غریب محتاجوں کی بھی، اور عام لوگوں سے (جب کوئی) بات (کہنا ہو تو) اچھی طرح (خوش خلقی سے) کہنا اور پابندی رکھنا نماز کی اور ادا کرتے رہنا زکوٰۃ، پھر تم (قول و قرار کرکے) اس سے پھر گئے بجز معدودے چند کے، اور تمھاری تو معمولی عادت ہے اقرار کرکے ہٹ جانا۔

فائدہ: یہ معدودے چند وہ لوگ ہیں جو توریت کے پورے پابند رہے، توریت کے منسوخ ہونے سے قبل شریعت موسویہ کے پابند رہے، جب توریت منسوخ ہوگئی تو شریعتِ محمدیہ کے متبع ہوگئے۔

مسئلہ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ احکام اسلام اور سابقہ شریعتوں میں مشترک ہیں، جن میں توحید، والدین اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں کی خدمت، اور تمام انسانوں کے ساتھ گفتگو میں نرمی و خوش خلقی کرنا اور نماز اور زکوٰۃ سب داخل ہیں۔

تعلیم تبلیغ میں سخت کلامی کافر سے بھی درست نہیں

قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا سے مراد قولاً ذا حسن ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ جب لوگوں سے خطاب کرو تو بات نرم کرے، خوشروئی اور کشادہ دلی سے کرے چاہے مخاطب نیک ہو یا بد سنّی ہو یا بدعتی، ہاں دین کے معاملہ میں مداہنت اور اس کی خاطر سے حق پوشی نہ کرے، وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جب موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو فرعون کی طرف بھیجا تو یہ ہدایت نامہ دیا کہ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (۲۰: ۴۴) تو آج جو کلام کرنے والا ہے وہ حضرت موسیٰؑ سے افضل نہیں، اور مخاطب کتنا ہی بُرا ہو فرعون سے زیادہ بُرا خبیث نہیں۔

طلحہ بن عمرؒ کہتے ہیں کہ میں نے امام تفسیر و حدیث عطاءؒ سے کہا کہ آپ کے پاس فاسد عقیدے والے لوگ بھی جمع رہتے ہیں، مگر میرے مزاج میں تیزی ہے، میرے پاس ایسے لوگ آتے ہیں تو میں ان کو سخت باتیں کہدیتا ہوں، حضرت عطاءؒ نے فرمایا کہ ایسا نہ کیا کرو، کیونکہ حق تعالیٰ کا حکم ہے کہ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا، اس میں تو یہودی و نصرانی بھی داخل ہیں، مسلمان خواہ کیسا ہی ہو وہ کیوں نہ داخل ہوگا (قرطبی)

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ

اور جب لیا ہم نے وعدہ تمہارا کہ نہ کروگے خون آپس میں اور نہ نکال دوگے

اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾

اپنوں کو اپنے وطن سے پھر تم نے اقرار کرلیا اور تم مانتے ہو۔

خلاصۂ تفسیر

اور پر جو عہدِ میثاق لیا گیا تھا اس آیت میں اس کا تتمہ بیان کیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:۔ اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے تم سے یہ قول و قرار (بھی) لیا کہ (خانہ جنگی کرکے) باہم خونریزی مت کرنا اور (ایک دوسرے کو ترکِ وطن مت کرانا، پھر (ہمارے اس اقرار لینے پر) تم نے اقرار بھی کرلیا اور اقرار بھی (ضمناً نہیں، بلکہ) ایسا جیسے تم (اس پر) شہادت (بھی) دیتے ہو۔

فائدہ:۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی کی تقریر سے کسی امر کا اقرار مترشح ہوتا ہے گو صاف اقرار نہیں ہوتا، مگر عرفاً اور عقلاً اس کو اقرار ہی سمجھا جاتا ہے، لیکن یہاں تو ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ سے اس شبہ کو بھی رفع کردیا، اور بتادیا کہ یہ اقرار اتنا صریح اور واضح تھا جیسے شہادت صاف اور واضح ہوا کرتی ہے۔

ترکِ وطن کرانے کی ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو آزار پہنچا کر اتنا تنگ مت کرنا کہ بیچارہ ترکِ وطن پر مجبور ہو جائے۔

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ

پھر تم وہ لوگ ہو کہ ویسے ہی خون کرتے ہو آپس میں اور نکال دیتے ہو اپنے ایک فرقہ

مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاِنْ

کو ان کے وطن سے چڑھائی کرتے ہو اُن پر گناہ اور ظلم سے اور اگر

يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ

وہی آویں تمہارے پاس کسی کے قیدی ہو کر تو ان کا بدلہ دیکر چھڑاتے ہو، حالانکہ حرام ہے تم پر ان کا نکال دینا

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ

بھی تو کیا مانتے ہو بعض کتاب کو اور نہیں مانتے بعض کو، سو کوئی سزا نہیں اس کی

يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْىٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ

جو تم میں یہ کام کرتا ہے مگر رُسوائی دنیا کی زندگی میں اور قیامت کے دن

يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾

پہنچائے جاویں سخت سے سخت عذاب میں، اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے

خلاصۂ تفسیر تتمہ میثاق میں جو حکم ان کو دیا گیا ہے اس کے متعلق عہد شکنی کا بیان اس آیت میں فرمایا ہے۔

پھر (اس اقرار صریح کے بعد) تم (جیسے ہو) یہ (آنکھوں کے سامنے) موجود (ہی) ہو کہ باہم قتل و قتال بھی کرتے ہو، اور (ایک دوسرے کو ترکِ وطن بھی کراتے ہو، (اس طور پر کہ) ان اپنوں کے مقابلہ میں (ان کی مخالف قوموں کی) امداد کرتے ہو گناہ اور ظلم کے ساتھ (سو ان دونوں حکموں کو تو یوں غارت کیا) اور (ایک تیسرا حکم جو سہل سا سمجھا اس پر عمل کرنے کو خوب تیار رہتے ہو کہ) اگر ان لوگوں میں سے کوئی گرفتار ہو کر تم تک پہنچ جاتا ہے تو ایسوں کو کچھ خرچ کرا کر رہا کرا دیتے ہو حالانکہ یہ بات (بھی معلوم) ہے کہ تم کو اُن کا ترکِ وطن کرا دینا (اور قتل تو اور بھی بدرجہ اولیٰ) نیز ممنوع ہے۔

معارف ومسائل

فائدہ: اس باب میں ان پر تین حکم لازم تھے، اوّل قتل نہ کرنا، دوم اخراج یعنی ترکِ وطن نہ کرانا، سوم اپنی قوم میں سے کسی کو قید و بند میں گرفتار دیکھیں تو روپیہ خرچ کر کے چھڑا دینا، تو ان لوگوں نے اوّل کے دو حکم کو تو چھوڑ دیا اور تیسرے حکم کا اہتمام کرنے لگے، اور صورت اس کی یہ ہوئی تھی کہ اہلِ مدینہ میں دو قومیں تھیں: اوس و خزرج، اور ان میں باہم عداوت رہتی تھی، اور کبھی کبھی قتال کی نوبت بھی آجاتی تھی، اور مدینہ کے گرد و نواح میں یہودیوں کی دو قومیں بنی قریظہ اور بنی نضیر آباد تھیں، اوس و بنی قریظہ کی باہم دوستی تھی، اور خزرج و بنی نضیر میں باہم یارانہ تھا، جب اوس و خزرج میں باہم لڑائی ہوتی تو دوستی کی بناء پر بنو قریظہ تو اوس کے مددگار ہوتے، اور بنو نضیر خزرج کی طرفداری کرتے، تو جہاں اوس و خزرج مارے جاتے اور خانماں آوارہ ہوتے ان کے دوستوں اور حامیوں کو بھی یہ مصیبت پیش آتی، اور ظاہر ہے کہ بنو قریظہ کے قتل و اخراج میں بنو نضیر کا بھی ہاتھ ہوتا، اور ایسا ہی بالعکس، البتہ یہود کی دونوں جماعتوں میں سے اگر کوئی جنگ میں قید ہو جاتا تو ہر جماعت اپنے دوستوں کو مال پر راضی کر کے اس قیدی کو رہائی دلا دیتے، اور کوئی پوچھتا کہ ایسا کیوں کرتے ہو تو اس کو جواب دیتے کہ اسیر کو رہا کرا دینا ہم پر واجب ہے، اور اگر کوئی قتل و قتال میں معین و مددگار بننے پر اعتراض کرتا تو کہتے کہ کیا کریں دوستوں کا ساتھ نہ دینے سے عار آتی ہے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس کی شکایت فرمائی ہے، اور ان کی حیلہ سازیوں کا پردہ چاک فرمایا ہے۔

اس آیت میں جن مخالف قوموں کی امداد کا ذکر ہے اس سے اوس و خزرج مراد ہیں، کہ اوس بنی قریظہ کی موافقت میں بنی نضیر کے مخالف تھے، اور خزرج بنی نضیر کی موافقت میں بنی قریظہ کے مخالف تھے۔

اثم و عدوان (ظلم و گناہ) دو لفظ لانے سے اس طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ اس میں دو حق ضائع ہوتے ہیں حکمِ الٰہی کی تعمیل نہ کر کے حق اللہ ضائع کیا، اور دوسرے کو آزار پہنچا کر حق العباد بھی ضائع کر دیا۔

آگے اس عہد شکنی پر ملامت و شکایت کے ساتھ ساتھ سزا کو بھی بالتصریح بیان فرمایا ہے ارشاد ہے۔

کیا تو (بس یوں کہو کہ) کتاب (توریت) کے بعض (احکام) پر تم ایمان رکھتے ہو اور بعض (احکام) پر ایمان نہیں رکھتے تو اور کیا سزا ہونا چاہئے) ایسے شخص کی جو تم لوگوں میں سے ایسی حرکت کرے بجز رسوائی کے دنیوی زندگانی میں اور روزِ قیامت کو بڑے سخت عذاب میں ڈال دیئے جاویں گے

اور اللہ تعالیٰ (کچھ) بے خبر نہیں ہیں تمھارے اعمال (زشت) سے۔

فائدہ: ہر چند کہ وہ یہودی جن کا قصہ میں ذکر ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کا انکار کرنے کی بناء پر کافر ہی تھے، مگر یہاں ان کا کفر مذکور نہیں، بلکہ بعض احکام پر عمل نہ کرنے کو کفر سے تعبیر فرمایا ہے، حالانکہ جب تک حرام کو حرام سمجھے آدمی کافر نہیں ہوتا، سو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ جو گناہ بہت شدید ہوتا ہے اس پر محاوراتِ شرعیہ میں اس کی شدت کے پیش نظر کفر کا اطلاق کر دیا جاتا ہے، ہم اپنے محاوراتِ عرفیہ میں اس کی مثالیں دن رات دیکھتے ہیں، جیسے کسی ذلیل حرکت کرنیوالے کو کہدیتے ہیں کہ تو تو بالکل چمار ہے، حالانکہ مخاطب چمار یقیناً نہیں ہے، اس سے مقصود شدتِ نفرت اور اُس کام کی قباحت ظاہر کرنا ہوتا ہے، اور یہی معنی ہیں اس حدیث مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ وغیرہ کے۔

اس مقام پر جن دو سزاؤں کا ذکر ہے ان میں سے پہلی سزا یعنی دنیا میں ذلّت و رسوائی تو اس کا وقوع اس طرح ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانے میں مسلمانوں کے ساتھ معاہدے کی خلاف ورزی کرنے کے سبب بنی قریظہ قتل و قید کئے گئے اور بنی نضیر ملکِ شام کی طرف بہزار ذلت و خواری نکال دیئے گئے۔

أُولٰٓئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ز فَلَا

یہ وہی ہیں جنھوں نے مول لی دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے سو نہ ہلکا

يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ﴿۸۶﴾ ع ۱۰

ہوگا اُن پر عذاب اور نہ اُن کو مدد پہنچے گی۔

خلاصۂ تفسیر

(اور وجہ سزا اُن کے لئے یہ ہے کہ) یہ وہ لوگ ہیں کہ انھوں نے (احکام کی مخالفت کرکے) دنیاوی زندگانی (کے مزوں) کو لے لیا ہے، بعوض (نجات) آخرت کے (جس کا ذریعہ اطاعت ہے) سو نہ تو (سزا دینے والے کی طرف سے) ان کی سزائیں (کچھ) تخفیف دی جاوے گی اور نہ کوئی (وکیل، مختار یا دوست رشتہ دار) اُن کی طرفداری (پیروی) کرنے پاوے گا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ز

اور بے شک دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور پے در پے بھیجے اس کے پیچھے رسول

وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ

اور دیئے ہم نے عیسٰی مریم کے بیٹے کو معجزے صریح اور قوت دی اس کو روح پاک سے

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ

پھر بھلا کیا جب تمہارے پاس لایا کوئی رسول وہ حکم جو نہ بھایا تمہارے جی کو تو تم تکبر کرنے لگے،

فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾

پھر ایک جماعت کو جھٹلایا اور ایک جماعت کو تم نے قتل کر دیا

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے (اے بنی اسرائیل تمہاری ہدایت کے لئے ہمیشہ سے بڑے بڑے سامان کئے، سب سے اول) موسیٰ علیہ السلام کو کتاب (توراۃ) دی اور (پھر) ان کے بعد (درمیان میں) یکے بعد دیگرے (برابر مختلف) پیغمبروں کو بھیجتے رہے، اور (پھر اس خاندان کے سلسلہ کے اخیر میں) ہم نے (حضرت) عیسٰی بن مریم کو (نبوت کے) واضح دلائل (انجیل اور معجزات) عطا فرمائے؛ اور ہم نے ان کو روح القدس (جبرئیل علیہ السلام) سے (جو) تائید دی (سو الگ جو بجائے خود ایک دلیل واضح تھی تو) کیا (تعجب کی بات نہیں کہ اس پر بھی تم سرکشی کرتے رہے اور) جب کبھی (بھی) کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسے احکام لائے جن کو تمہارا دل نہ چاہتا تھا، (جب ہی) تم نے (ان پیغمبروں کی اطاعت سے) تکبر کرنا شروع کر دیا، سو (ان پیغمبروں میں سے) بعضوں کو تو (نعوذ باللہ) تم نے جھوٹا بتلایا اور بعضوں کو (بیدھڑک) قتل ہی کر ڈالتے تھے۔

فائدہ: قرآن وحدیث میں جابجا حضرت جبرئیل علیہ السلام کو روح القدس کہا گیا ہے جیسے قرآن کی اس آیت میں، نیز قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ (۱۶: ۱۰۲) میں اور حدیث میں حضرت حسان بن ثابتؓ کا یہ شعر ہے

وجبریل رسول اللہ فینا ۔ و روح القدس لیس لہ کفاء

اور جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے عیسیٰ علیہ السلام کی کئی طریقوں سے تائید ہوئی، اوّل، تو ولادت کے وقت مسِ شیطان سے حفاظت کی گئی، پھر ان کے دم کرنے سے حمل عیسوی قرار پایا، پھر یہود چونکہ کثرت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مخالف تھے، اس لئے جبرئیل علیہ السلام حفاظت کے لئے ساتھ رہتے تھے، حتیٰ کہ آخر میں اُن کے ذریعہ سے آسمان پر اٹھوا لئے گئے، یہود نے بہت سے پیغمبروں کی تکذیب کی حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بھی تکذیب کی، اور حضرت زکریا وحضرت یحییٰ علیہما السلام کو قتل بھی کیا۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا

اور کہتے ہیں ہمارے دلوں پر غلاف ہے بلکہ لعنت کی ہے اللہ نے ان کے کفر کے سبب سو بہت

يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

کم ایمان لاتے ہیں

خلاصۂ تفسیر

اور وہ (یہودی طنزیہ طور پر) کہتے ہیں کہ ہمارے قلوب (ایسے) محفوظ ہیں (کہ اس میں مخالف مذہب کا جو اسلام ہے اثر ہی نہیں ہوتا، تو مذہب پر ہم خوب پختہ ہیں، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ محفوظی اور پختگی نہیں ہے) بلکہ اُن کے کفر کے سبب ان پر خدا کی مار ہے (کہ اسلام جو مذہب حق ہے اس سے نفور اور منسوخ مذہب پر مصر ہیں) سو بہت ہی تھوڑا سا ایمان رکھتے ہیں (اور تھوڑا ایمان مقبول نہیں، پس وہ کافر ہی ٹھہرے)

فائدہ:۔ یہ تھوڑا سا ایمان ان امور کی بابت ہے جو اُن کے مذہب اور اسلام میں مشترک ہیں مثلاً خدا کا قائل ہونا، قیامت کا قائل ہونا کہ ان امور کے وہ بھی قائل تھے، لیکن خود نبوتِ محمدیہ اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے کے منکر تھے، اس لئے پورا ایمان نہ تھا۔

اور اس تھوڑے ایمان کو باعتبار لغت ایمان کہا، جس کے معنی مطلق یقین کے ہیں، گو وہ بعض اشیاء کے ساتھ ہی متعلق ہو، شرعاً اس کو ایمان نہیں کہتے، شرعاً وہ ایمان معتبر ہے، جو کل امور وارد فی الشرع کے یقین کے ساتھ ہو۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ

اور جب پہونچی اُن کے پاس کتاب اللہ کی طرف سے جو سچا بتاتی ہے اس کتاب کو جو انکے پاس ہے

وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ښ فَلَمَّا جَآءَهُمْ

اور پہلے سے فتح مانگتے تھے کافروں پر ، پھر جب پہنچا ان کو جس

مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

کو پہچان رکھا تھا تو اس سے منکر ہوگئے، سو لعنت ہے اللہ کی منکروں پر

خلاصۂ تفسیر

اور جب اُن کو (ایک) ایسی کتاب پہنچی (یعنی قرآن مجید) جو منجانب اللہ ہے، (اور) اس (کتاب) کی (بھی) تصدیق کرنے والی ہے، جو (پہلے سے) ان کے

پاس ہو، (یعنی توراۃ) حالانکہ اس کے قبل (خود) بیان کرتے تھے (اور) کفار سے (یعنی مشرکین عرب سے) کہ ایک نبی آنے والے ہیں اور ایک کتاب لانے والے ہیں، (مگر) پھر جب وہ چیز آپہنچی جس کو وہ (خوب جانتے) پہچانتے ہیں تو اس کا (صاف) انکار کر بیٹھے سو (بس) خدا کی مار ہو ایسے منکروں پر (کہ جان بوجھ کر محض تعصب کے سبب انکار کریں)

فائدہ: قرآن کو جو مصدقِ توراۃ فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ توراۃ میں بعثتِ محمدیہ اور نزولِ قرآن کی جو پیشینگوئیاں تھیں ان سے ان کا صدق ظاہر ہو گیا، سو توراۃ کا ماننے والا تو قرآن اور صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کر ہی نہیں سکتا ورنہ توراۃ کی تکذیب لازم آئے گی۔

ایک شبہ اور اس کا جواب | اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب وہ حق کو حق جانتے تھے تو پھر ان کو مومن کہنا چاہئے کافر کیسے کہا گیا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایمان صرف جاننے کا نام نہیں، بلکہ ماننے کا نام ہے، ورنہ یوں تو شیطان سب سے زیادہ حق کو حق جانتا ہے، مگر جاننے کے باوجود انکار کرنے کی وجہ سے اور بھی کفر میں شدت بڑھ گئی، اسی لئے اگلی آیت میں اُن کے کفر کی وجہ اُن کا عناد بتلایا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

بُری چیز ہے وہ جس کے بدلے بیچا انھوں نے اپنے آپ کو کہ منکر ہوئے اس چیز کے جو اتاری اللہ

بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ

نے اس ضد پر کہ اتارے اللہ اپنے فضل سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے، سو کما لائے

بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾

غصہ پر غصہ اور کافروں کے واسطے عذاب ہے ذلت کا۔

خلاصۂ تفسیر | وہ حالت (بہت ہی) بری ہے جس کو اختیار کر کے (وہ بزعمِ خود) اپنی جانوں کو (عقوبتِ آخرت سے) چھڑانا چاہتے ہیں، (اور وہ حالت) یہ (ہے) کہ کفر (انکار) کرتے ہیں ایسی چیز کا جو حق تعالیٰ نے (ایک سچے پیغمبر پر) نازل فرمائی (یعنی قرآن اور وہ انکار بھی) محض (اس) ضد پر کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے جس بندہ پر اس کو منظور ہو، (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کیوں) نازل فرمادے سو (اس حسد بالائے کفر سے) وہ لوگ غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے، اور (آخرت میں) ان کفر کرنیوالوں کو ایسی سزا ہو گی جس میں (تکلیف کے علاوہ) ذلت (بھی) ہے،

فائدہ :۔ ایک غضب کفر پر دوسرا حسد پر، یوں غضب بالائے غضب فرمایا، عذاب کے ساتھ مہین کی قید سے بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ عذاب کفار کے ساتھ خاص ہے، کیونکہ گناہگار مؤمن کو عذاب اس کو پاک کرنے کے لئے ہوگا، ذلت کے لئے نہیں۔

آگے کی آیت میں جو اُن کا قول نقل کیا ہے اس سے ان کا کفر ثابت ہوتا ہے، اور حسد بھی مترشح ہوتا ہے :

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنْزِلَ

اور جب کہا جاتا ہے ان سے مانو اس کو جو اللہ نے بھیجا ہے تو کہتے ہیں ہم مانتے ہیں جو اُترا ہے

عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَهُمْ ۗ

ہم پر اور نہیں مانتے اس کو جو سوا اس کے ہے حالانکہ وہ کتاب سچی ہے جو تصدیق کرتی ہے اس کتاب کی جو

قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنْبِيَاءَ اللَّهِ مِنْ قَبْلُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٩١﴾

انکے پاس ہے کہہ دے پھر کیوں قتل کرتے رہے ہو اللہ کے پیغمبروں کو پہلے سے اگر تم ایمان رکھتے تھے۔

خلاصۂ تفسیر

اور جب ان (یہودیوں) سے کہا جاتا ہے کہ تم ایمان لاؤ اُن تمام کتابوں پر جو اللہ تعالیٰ نے (متعدد پیغمبروں پر) نازل فرمائی ہیں (اور ان تمام کتابوں میں قرآن بھی ہے) تو (جواب میں) کہتے ہیں کہ ہم (تو صرف) اس (ہی) کتاب پر ایمان لاویں گے جو ہم (لوگوں) پر (بواسطۂ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے) نازل کی گئی ہے (یعنی توراۃ) اور (باقی) جتنی (کتابیں) اس کے علاوہ ہیں (جیسے انجیل اور قرآن) ان (سب) کا وہ انکار کرتے ہیں، حالانکہ وہ (توراۃ کے ماسوا کتابیں) بھی (فی نفسہٖ) حق (اور واقعی) ہیں، اور (فی نفسہٖ حق ہونے کے علاوہ) تصدیق کرنیوالی بھی ہیں اس (کتاب) کی جو ان کے پاس ہے (یعنی توراۃ کی) آپ (یہ بھی) کہئے کہ (اچھا تو) پھر کیوں قتل کیا کرتے تھے اللہ کے پیغمبروں کو اس کے پہلے زمانہ میں اگر تم (توراۃ پر) ایمان رکھنے والے تھے۔

فائدہ :۔ یہود نے جو یہ کہا کہ "ہم صرف توراۃ پر ایمان لاویں گے دوسری کتب پر ایمان نہ لاویں گے" تو ان کا یہ قول صریح کفر ہے، اور اس کے ساتھ جو یہ کہا کہ (توراۃ) "جو ہم پر نازل کی گئی ہے" اس سے حسد مترشح ہوتا ہے، اس کا مفہوم صاف یہ ہے کہ اور کتابیں چونکہ ہم پر نازل نہیں کی گئیں، اس لئے اُن پر ایمان نہیں لائیں گے، اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس قول کو تین طرح رد فرمایا ہے :

اوّل یہ کہ جب اور کتابوں کی حقیت اور واقعیت بھی دلیل قطعی سے ثابت ہے تو پھر اس انکار کی کیا وجہ ہے؟ ہاں اگر اس دلیل میں کوئی کلام تھا تو اس کو پیش کر کے تشفی کر لیتے، انکار محض کی آخر کیا وجہ؟

دوسرے اور کتابیں مثلاً قرآن مجید جو توراۃ کا مصدق ہے تو اس کے انکار سے تو خود توراۃ کی تکذیب وانکار لازم آتا ہے۔

تیسرے یہ کہ انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنا تمام آسمانی کتابوں کی رُو سے کفر ہے، پھر تمہارے گروہ کے لوگوں نے جو کئی نبیوں کو قتل کیا، جن کی تعلیم بھی توراۃ ہی کے احکام کے ساتھ خاص تھی، اور تم ان قاتلین کو اپنا پیشوا اور مقتدا سمجھتے ہو، تو براہِ راست توراۃ کے ساتھ کفر کرتے ہو، اس سے تو تمہارا تورات پر ایمان کا دعویٰ بھی غلط ٹھہرتا ہے، غرض کسی بھی پہلو سے تمہارا قول و فعل صحیح اور درست نہیں۔

آگے بعض اور وجوہ و دلائل سے ان یہودیوں کا رَد فرمایا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ

اور آچکا تمہارے پاس موسیٰ صریح معجزے لے کر پھر بنا لیا تم نے بچھڑا اس کے

بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

گئے پیچھے، اور تم ظالم ہو۔

خلاصۂ تفسیر

اور (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) تم لوگوں کے پاس صاف صاف دلیلیں (توحید و رسالت کی) لائے (مگر) اس پر بھی تم لوگوں نے گوسالہ کو (معبود) بنا لیا، موسیٰ (علیہ السلام) کے (طور پر جانے کے) بعد اور تم (اس تجویز میں) ستم ڈھا رہے تھے۔

فائدہ: بیّنات سے وہ دلائل مراد ہیں جو اس قصہ سے پہلے جبکہ توراۃ نہ ملی تھی، موسیٰ علیہ السلام کے نبی برحق ہونے پر قائم ہو چکی تھیں، مثلاً عصاء اور ید بیضاء، دریا کا پھٹنا وغیرہ۔

رَد کی تقریر کا حاصل ظاہر ہے کہ تم دعویٰ تو ایمان کا کرتے ہو اور صریح شرک میں مبتلا ہو جس سے موسیٰ علیہ السلام بلکہ خدا تعالیٰ کی صریح تکذیب بھی لازم آتی ہے، گوسالہ کو معبود بنانے کا معاملہ اگرچہ ان یہودیوں کے ساتھ پیش نہیں آیا تھا، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نزولِ قرآن کے وقت موجود تھے، مگر چونکہ یہ لوگ اپنے اجداد کے حامی اور طرفدار رہتے تھے،

اس لئے فی الجملہ یہ بھی رَد میں شامل ہیں۔

اور اسی سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جن کے اسلاف نے موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کرکے کفر کیا وہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار کے مرتکب ہوں تو چنداں عجیب نہیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ

اور جب ہم نے لیا قرار تمہارا اور بلند کیا تمہارے اوپر کوہِ طور کو پکڑو جو ہم نے

اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ق وَاُشْرِبُوْا

تم کو دیا زور سے اور سنو بولے سُنا ہم نے اور نہ مانا اور پلائی گئی ان کے

فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ

دلوں میں محبت اسی بچھڑے کی بسبب اُن کے کفر کے کہہ دے کہ بُری باتیں سکھاتا ہے تم کو ایمان تمہارا

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

اگر تم ایمان والے ہو۔

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے تمہارا قول و قرار لیا تھا، اور (اس قول و قرار لینے کے لئے) طور کو تمہارے (سروں کے) اوپر لا کھڑا کیا تھا (اور اس وقت حکم دیا تھا کہ) لو جو کچھ (احکام) ہم تم کو دیتے ہیں ہمت (اور پختگی) کے ساتھ لیلو اور (ان احکام کو دل سے) سنو (اس وقت) انھوں نے (ڈر کے مارے زبان سے تو) کہہ دیا کہ ہم نے (قبول کرلیا اور) سُن لیا، اور (چونکہ واقع میں یہ بات دل سے نہ تھی، اس لئے گویا بزبانِ حال یوں بھی کہہ رہے تھے کہ) ہم سے عمل نہ ہوگا، اور (وجہ اُن کی اِس بد دلی کی یہ تھی کہ) ان کے قلوب (کے ریشہ ریشہ) میں وہی گوسالہ پیوست ہوگیا تھا، ان کے کفر (سابق) کی وجہ سے (جبکہ دریائے شور سے اُتر کر انھوں نے ایک بُت پرست قوم کو دیکھ کر درخواست کی تھی کہ ہمارے لئے کوئی ایسا ہی مجسّم معبود تجویز کردیا جائے) آپ فرما دیجئے کہ (دیکھ لیا تم نے اپنے ایمان مزعوم کے افعال کو سو) یہ افعال تو بہت بُرے ہیں، جن کی تعلیم تمہارا ایمان تم کو کر رہا ہے، اگر تم (بزعمِ خود اب بھی) اہلِ ایمان ہو (یعنی یہ ایمان نہیں ہے)۔

فائدہ:۔ اس آیت میں جو اسباب اور مسببات مذکور ہیں، اُن کی ترتیب کا حاصل یہ ہے کہ دریائے شور سے پار ہوکر ان سے ایک کلمۂ کفر کا صدور ہوا، ہرچند موسیٰ علیہ السلام کی ڈانٹ ڈپٹ

سے توبہ کرلی، لیکن توبہ کے مراتب بھی مختلف ہوتے ہیں، اعلیٰ درجہ کی توبہ نہ ہونے کے سبب اس کی ظلمت قلب میں کچھ باقی رہ گئی تھی، وہ ترقی پاکر گوسالہ پرستی کا سبب بن گئی، پھر اس کی توبہ میں بعضوں کو قتل ہونا پڑا، اور بعض کو غالباً بلا قتل معافی ہوگئی ہو، جیسا کہ بعض مفسرین نے ذکر بھی کیا ہے، اُن کی توبہ بھی کچھ ضعیف ہوئی ہوگی، اور جو گوسالہ پرستی سے محفوظ رہے تھے ان کو بھی گوسالہ پرستوں سے جس قدر نفرت واجب تھی اس میں کوتاہی ہونے سے ایک گونہ اثر اس معصیتِ شرکیہ کا ان کے قلب میں باقی تھا، بہرحال ضعفِ توبہ یا کفر سے نفرت نہ ہونے کے آثار باقی رہنے نے دلوں میں دین سے سستی پیدا کردی، جس سے اخذ میثاق میں کوہِ طور کو ان پر معلق کرنے کی نوبت آئی۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ

کہہ دے کہ اگر ہے تمہارے واسطے آخرت کا گھر اللہ کے ہاں تنہا سوا اور لوگوں

دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ

کے تو تم مرنے کی آرزو کرو اگر تم سچ کہتے ہو، اور ہرگز

يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾

آرزو نہ کریں گے موت کی کبھی بسبب اُن گناہوں کے کہ بھیج چکے ہیں انکے ہاتھ اور اللہ خوب جانتا ہے گنہگاروں کو

خلاصہ تفسیر

(بعض یہودی یہ دعویٰ کرتے تھے کہ آخرت کی نعمتیں خالص ہمارا ہی حق ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس دعوے کو باطل کرنے کے لئے فرمایا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (ان لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ اگر (بقول تمہارے) عالمِ آخرت محض تمہارے ہی لئے نافع ہی بلاشرکت غیرے تو تم (اس کی تصدیق کے لئے ذرا) موت کی تمنا کرکے دکھلا دو اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو، اور (ہم ساتھ ہی یہ بھی کہے دیتے ہیں کہ) یہ لوگ ہرگز کبھی اس (موت) کی تمنا نہ کریں گے، بوجہ (خوفِ سزا) ان اعمال (کفریہ) کے جو اپنے ہاتھوں سمیٹتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کو خوب اطلاع ہے ان ظالموں (کے حال) کی (جب مقدمہ کی تاریخ آئے گی فرد قرار داد جرم سنا کر سزا کا حکم کردیا جائیگا)

فائدہ:۔ قرآن کی بعض اور آیات سے بھی اُن کے اس دعویٰ کا مفہوم نکلتا ہے جیسا کہ:

قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ (۲: ۸۰) وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ (۲: ۱۱۱) وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ (۵: ۱۸) وغیرہا۔

ان سب دعووں کا حاصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم دینِ حق پر ہیں، لہٰذا آخرت میں ہم کو تو ضرور

نجات ملے گی، ہم میں سے جو تائب یا مرحوم ہیں اُن کو تو ابتداء ہی سے جنت میں داخلہ مل جائے گا، اور جو گنہگار ہیں وہ چند روزہ عذاب بھگت کر نجات پا جائیں گے، اور جو مطیع ہیں وہ بمثل ابناء و احبّاء محبوب و مقرب ہیں۔

بعض عنوانات کے قبح سے قطع نظر یہ دعوے دین حق پر قائم ہونے کی صورت میں فی نفسہٖ تو درست و صادق ہیں، لیکن چونکہ وہ لوگ اپنے دین کے منسوخ ہوجانے کی بناء پر حق پر نہ رہے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے جا بجا مختلف عنوانات اور طریقوں سے ان کی تکذیب فرمائی، یہاں ایک خاص طریقہ ذکر کیا گیا، کہ اگر عام عادت کے مطابق بحث اور دلائل سے فیصلہ نہیں کرتے تو آؤ مافوق العادۃ طریقہ یعنی معجزے کے ذریعے اس میں نہ زیادہ علم و فہم کی ضرورت ہو نہ غائر نظر درکار، صرف زبان ہلانے کی ضرورت ہے، مگر ہم پیشین گوئی کرتے ہیں کہ تم زبان سے یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ "ہم موت کی تمنا کرتے ہیں"۔

اس پیشین گوئی کے بعد ہم کہتے ہیں کہ اگر تم اپنے دعووں میں سچے ہو تو یہ کلمہ کہہ دو، نہ کہا تو پھر تمھارا جھوٹا ہونا ثابت ہوجائے گا۔

چونکہ ان کو اپنا باطل اور کفر پر ہونا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کا حق پر ہونا اُن پر خوب واضح و روشن تھا، اس لئے یا تو ایسی ہیبت چھائی کہ زبان ہی نہ اُٹھی، یا وہ ڈر گئے کہ تم نے یہ کلمہ مُنہ سے نکالا اور موت نے آ دبوچا، اور پھر سیدھے جہنم رسید ہوئے، ورنہ اُن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو عداوت و دشمنی تھی اس کے پیشِ نظر تو ان کو یہ سُنکر جوش آجانا چاہئے تھا، اور یہ کلمہ ضرور کہہ دینے چاہئے تھے۔

درحقیقت اسلام کی حقانیت کے ثبوت کے لئے یہ واقعہ بہت کافی ہے۔

یہاں دو باتیں اور قابلِ ذکر ہیں:

اوّل تو یہ کہ یہ استدلال ان یہودیوں کے ساتھ تھا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے، اور جنھوں نے آپ کو نبی پہچاننے کے بعد عناد و عداوت کی بناء پر آپ کا انکار کیا، ہر زمانے کے یہود سے یہ خطاب نہیں۔

دوسرے یہ شبہ بھی نہیں ہونا چاہئے کہ تمنا کرنا دل اور زبان دونوں سے ہوتا ہے، ممکن ہے انھوں نے دل سے تمنا کی ہو، اوّل تو یہ اس لئے صحیح نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اس کی صاف تردید کر رہا ہے، دوسرے اگر وہ دل سے تمنا کرتے تو زبان سے ضرور اس کا اظہار کرتے، کیونکہ اس میں تو اُن کی جیت تھی، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانے کا اچھا موقعہ تھا۔

اور یہ شبہ بھی نہ کرنا چاہئے کہ انھوں نے تمنا کی ہو، مگر اس کی شہرت نہ ہوئی ہو، یہ اس لئے

صحیح نہیں کہ اسلام کے ہمدرد و معاونین کی تعداد کے مقابلہ میں معاندین و مخالفین کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی اگر ایسی بات ہوئی ہوتی تو وہ خود اس کو خوب خوب اچھالتے کہ لو دیکھو تم نے جو معیارِ حق و صداقت مقرر کیا تھا اس پر بھی ہم پورے اُترے۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَىٰ حَيَاةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا ۚ

اور تو دیکھے گا اُن کو سب لوگوں سے زیادہ حریص زندگی پر اور زیادہ حریص مشرکوں سے بھی

يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهِ مِنَ

چاہتا ہے ایک ایک اُنمیں کا کہ عمر پاوے ہزار برس اور نہیں اس کو بچانیوالا عذاب سے

الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿٩٦﴾

اس قدر جینا ، اور اللہ دیکھتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ لوگ موت کی تمنا کیا خاک کرتے) آپؐ (تو) ان کو حیات (دنیویہ) کا حریص (اور عام) آدمیوں سے (بھی) بڑھ کر پائیں گے، اور (اوروں کا تو کیا ذکر حیرت تو یہ ہے کہ بعض) مشرکین سے بھی (بڑھ کر آپؐ ان کو حیات کا حریص دیکھیں گے، اور ان کی یہ کیفیت ہے کہ) ان میں کا ایک ایک (شخص) اس ہوس میں ہے کہ اس کی عمر ہزار برس کی ہو جاوے اور (بھلا بالفرض اگر اتنی عمر ہو بھی گئی تو کیا) یہ امر عذاب سے تو بچا نہیں سکتا، کہ (کسی کی بڑی) عمر ہو جاوے اور حق تعالیٰ کے سب پیش نظر ہیں ان کے اعمال (بدجس پر ان کو عذاب ہونے والا ہے)

فائدہ:۔ اس میں حیرت و استبعاد کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین عرب تو آخرت کے منکر تھے، انکی بہار اور عیش تو جو کچھ ہے دنیا ہی ہے، اس لئے وہ اگر طولِ عمر کی تمنا کریں تو چنداں عجیب نہیں، مگر یہود تو آخرت کے قائل اور بزعم خود آخرت کی نعمتوں کا اپنے آپ ہی کو مستحق کہتے تھے، پھر بھی وہ دنیا میں رہنے کی تمنا کریں، یہ ہے حیرت و تعجب کی بات۔

پس باوجود اعتقادِ آخرت کے طولِ عمر کی تمنا کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ نعمت اخروی کا اپنے آپ کو مستحق سمجھنے کا دعویٰ صرف دعویٰ ہی ہے، حقیقت جو ہے اس کو یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ وہاں پہنچ کر جہنم ہی ٹھکانا بنے گا، اس لئے جب تک بچے رہیں تب تک ہی سہی!

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ

تو کہہ دے جو کوئی ہووے دشمن جبریل کا، سو اس نے تو اتارا ہے یہ کلام تیرے دل پر، اللہ کے حکم سے

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ

کہ سچا بتانیوالا ہے اس کلام کو جو اس کے پہلے ہے اور راہ دکھاتا ہے اور خوشخبری سناتا ہے ایمان والوں کو، جو

عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ

کوئی ہووے دشمن اللہ کا اور اسکے فرشتوں کا اور اسکے پیغمبروں کا اور جبرئیل اور میکائیل کا تو اللہ

عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾

دشمن ہے ان کافروں کا۔

خلاصۂ تفسیر

(بعض یہود نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنکر کہ جبرئیل علیہ السلام وحی لاتے ہیں کہا کہ ان سے تو ہماری عداوت ہے، ہماری قوم پر واقعات ہائلہ اور احکاماتِ شاقہ انہی کے ذریعے آتے رہے ہیں، میکائیلؑ خوب ہیں کہ بارش اور رحمت ان کے متعلق ہے، اگر وہ وحی لایا کرتے تو ہم مان لیتے، اس پر حق تعالیٰ رد فرماتے ہیں کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (ان سے) یہ کہئے کہ جو شخص جبرئیلؑ سے عداوت رکھے (وہ جانے لیکن اس امر کو قرآن کے نہ ماننے میں کیا دخل؟ کیونکہ اس میں تو وہ سفیر محض ہیں) سو (سفارت کے طور پر) انھوں نے یہ قرآن پاک آپ کے قلب تک پہنچا دیا ہے خداوندی حکم سے (تو لانے والے کی خصوصیت کیوں دیکھی جاتی ہے؟ البتہ خود قرآن کو دیکھو کہ کیسا ہے سو) اس کی (خود) یہ حالت ہے کہ تصدیق کر رہا ہے اپنے سے قبل والی (آسمانی) کتابوں کی اور رہنمائی کر رہا ہے (مصالح ضروریہ کی) اور خوشخبری سُنا رہا ہے ایمان والوں کو (اور کتب سماویہ کی یہی شان ہوتی ہے، پس قرآن ہر حال میں کتابِ سماوی اور قابلِ اتباع ٹھہرا، پھر جبرئیل علیہ السلام کی عداوت سے اس کو نہ ماننا نری حماقت ہے، اب رہا خود مسئلہ عداوتِ جبرئیلؑ کا، سو اس کا فیصلہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے نزدیک خود اللہ تعالیٰ سے عداوت رکھنا یا اس کے دوسرے ملائکہ سے یا اس کے رسولوں سے، یا خود میکائیلؑ سے، جن کی دوستی کا دم بھرتے ہیں، ان سب سے عداوت رکھنا اور جبرئیلؑ سے عداوت رکھنا یہ سب ہم پلّہ شمار کئے جاتے ہیں، اور ان سب عداوتوں کا قانون یہ ہے کہ) جو (کوئی) شخص خدا تعالیٰ کا دشمن ہو (تو) اور فرشتوں کا ہو (تو) اور پیغمبروں کا ہو (تو) اور جبرئیل کا (ہو تو) اور میکائیل کا (ہو) تو (ان سب کا وبال یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ دشمن ہے ایسے کافروں کا۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾

اور ہم نے اُتاریں تیری طرف آیتیں روشن اور انکار نہ کریں گے اُن کا مگر وہی جو نافرمان ہیں

خلاصۂ تفسیر اور (بعض یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ آپ پر کوئی ایسی دلیل واضح نازل نہ ہوئی جس کو ہم بھی جانتے پہچانتے، اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ وہ تو ایک ہی واضح دلیل کو لئے پھرتے ہیں) ہم نے تو آپ کے پاس بہت سے دلائل واضحہ نازل کئے ہیں، (جن کو وہ بھی خوب جانتے پہچانتے ہیں، سو ان کا انکار نہ جاننے کی بنا پر نہیں، بلکہ یہ انکار عدول حکمی کی عادت کی وجہ سے ہے) اور (قاعدہ کلیہ ہو کہ) کوئی انکار نہیں کیا کرتا (ایسے دلائل کا) مگر صرف وہی لوگ جو عدول حکمی کے عادی ہیں۔

اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ

کیا جب کبھی باندھیں گے کوئی قرار تو پھینکدیگی اسکو ایک جماعت اُن میں سے بلکہ انمیں اکثر یقین

لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰۰

نہیں کرتے۔

خلاصۂ تفسیر (بعض یہود کو جو وہ عہد یاد دلایا گیا جو اُن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے باب میں توراۃ میں لیا گیا تھا، تو انھوں نے خود عہد لینے ہی سے صاف انکار کر دیا، اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہو کہ) کیا (اس عہد لینے سے اُن کو انکار ہے) اور (ان کی تو یہ حالت ہو کہ انھوں نے اپنے مسلّم عہدوں کو بھی کبھی پورا نہیں کیا، بلکہ) جب کبھی بھی ان لوگوں نے (دین کے متعلق) کوئی عہد کیا ہوگا (ضرور) اس کو ان میں سے کسی نہ کسی فریق نے نظر انداز کر دیا ہوگا، بلکہ ان (تعمیل عہد نہ کرنے والوں) میں زیادہ تو ایسے ہی نکلیں گے جو (سرے سے اس عہد کا) یقین ہی نہیں رکھتے (سو تعمیل نہ کرنا تو فسق تھا ہی، یہ یقین نہ کرنا اس سے بڑھ کر کفر ہے)

فائدہ:۔ اور ایک جماعت کی تخصیص اس لئے کی گئی کہ بعضے اُن میں کے ان عہود کو پورا بھی کرتے تھے، حتیٰ کہ اخیر میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لے آئے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ

اور جب پہنچا ان کے پاس رسول اللہ کی طرف سے تصدیق کرنیوالا اس کتاب کی جو اُن کے پاس ہو تو پھینک

فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ڎ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ

دیا ایک جماعت نے اہل کتاب سے کتاب اللہ کو اپنی پیٹھ کے پیچھے

كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٠١﴾

گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں۔

خلاصۂ تفسیر

(اس آیت میں ایک خاص عہد شکنی کا ذکر فرماتے ہیں، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانے میں کلام تھا، ارشاد ہوتا ہے) اور جب ان کے پاس ایک (عظیم الشان) پیغمبر آئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو (رسول ہونے کے ساتھ) تصدیق بھی کر رہے ہیں اس کتاب کی جو ان لوگوں کے پاس ہے (یعنی توراۃ کی، کیونکہ اس میں آپ کی نبوت کی خبر ہے، تو اس حالت میں آپ پر ایمان لانا عین توراۃ پر عمل تھا، جس کو وہ بھی کتاب اللہ جانتے ہیں مگر باوجود اس کے بھی) ان اہلِ کتاب میں کے ایک فریق نے خود اس کتاب اللہ ہی کو اس طرح پس پشت ڈال دیا جیسے ان کو (اس کے مضمون کا یا کتاب اللہ ہونے کا) گویا اصلاً علم ہی نہیں۔

وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ

اور پیچھے ہو لئے اُس علم کے جو پڑھتے تھے شیطان سلیمان کی بادشاہت کے وقت اور کفر نہیں کیا سلیمان

وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ

نے لیکن شیطانوں نے کفر کیا کہ سکھلاتے تھے لوگوں کو جادو، اور اس علم کے پیچھے ہو لئے

عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ

جو اُترا دو فرشتوں پر شہر بابل میں جن کا نام ہاروت اور ماروت ہے اور نہیں سکھاتے تھے وہ

حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا

دونوں فرشتے کسی کو جب تک یہ نہ کہدیتے کہ ہم تو آزمائش کیلئے ہیں سو تو کافر مت ہو پھر ان سے سیکھتے وہ جادو

يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا هُمْ بِضَاۗرِّيْنَ بِهٖ

جس سے جُدائی ڈالتے ہیں مرد میں اور اس کی عورت میں، اور وہ اس سے نقصان نہیں کر سکتے

مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّھُمْ وَلَا يَنْفَعُھُمْ ۭ

کسی کا بغیر حکم اللہ کے، اور سیکھتے ہیں وہ چیز جو نقصان کرے ان کا اور فائدہ نہ کرے

وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ڜ

اور خوب جان چکے ہیں کہ جس نے اختیار کیا جادو کو نہیں اس کے لئے آخرت میں کچھ حصہ،

وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۰۲ وَلَوْ اَنَّهُمْ

اور بہت ہی بُری چیز ہے جس کے بدلے بیچا انھوں نے اپنے آپ کو اگر ان کو سمجھ ہوتی، اور اگر وہ ایمان لاتے

اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۰۳ ع ۱۲

اور تقویٰ کرتے تو بدلہ پاتے اللہ کے ہاں سے بہتر، اگر ان کو سمجھ ہوتی -

خلاصۂ تفسیر

اور (یہودی ایسے بے عقل ہیں کہ) انھوں نے (کتاب اللہ کا تو اتباع نہ کیا اور) ایسی چیز کا (یعنی سحر وجادو کا) اتباع (اختیار) کیا جس کا چرچا کیا کرتے تھے شیاطین (یعنی خبیث جن) حضرت سلیمان علیہ السلام کے (عہد) سلطنت میں اور (بعضے بیوقوف جو حضرت سلیمان علیہ السلام پر گمانِ سحر رکھتے ہیں بالکل ہی لغو بات ہے، کیونکہ سحر تو اعتقاداً یا عملاً کفر ہے اور) حضرت سلیمان علیہ السلام نے (نعوذ باللہ کبھی) کفر نہیں کیا مگر (ہاں) شیاطین (یعنی خبیث جن بیشک) کفر (کی باتیں اور کام یعنی سحر) کیا کرتے تھے، اور حالت یہ تھی کہ (خود تو کرتے ہی اور) آدمیوں کو بھی (اس) سحر کی تعلیم کیا کرتے تھے (سو وہی سحر متوارث چلا آرہا ہے اس کا اتباع یہ یہودی کرتے ہیں) اور (اسی طرح) اس (سحر) کا بھی (یہ لوگ اتباع کرتے ہیں) جو کہ اُن دونوں فرشتوں پر (ایک خاص حکمت کیواسطے) نازل کیا گیا تھا (جو شہر) بابل میں (رہتے تھے) جن کا نام ہاروت وماروت تھا، اور وہ دونوں (وہ سحر) کسی کو نہ بتلاتے جب تک (احتیاطاً پہلے) یہ (نہ) کہدیتے کہ ہمارا وجود بھی (لوگوں کے لئے) ایک امتحان (خداوندی) ہے (کہ ہماری زبان سے سحر پر مطلع ہو کر کون پھنستا ہے اور کون بچتا ہی) سو تو (اس پر مطلع ہو کر) کہیں کافر مت بن جائیو (کہ اس میں پھنس جاؤ) سو (بعضے) لوگ ان دونوں (فرشتوں) سے اس قسم کا سحر سیکھ لیتے تھے جس کے ذریعہ سے (عمل کرکے) کسی مرد اور (اس کی بیوی میں تفریق پیدا کردیتے تھے اور (اس سے کوئی وہم اور خوف میں نہ پھنس جاوے کہ جادوگر جو چاہیں کرسکتا ہی کیونکہ یہ یقینی بات ہے کہ) یہ (ساحر) لوگ اس (سحر) کے ذریعے سے کسی کو (ذرّہ برابر) بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے مگر خدا ہی کے (تقدیری) حکم سے اور (ایسا سحر حاصل کرکے بس) ایسی چیزیں سیکھ لیتے ہیں جو (خود) ان کو (بوجہ گناہ کے) ضرر رساں ہیں اور (کسی معتدبہ درجہ میں) اُن کو نافع نہیں ہیں (تو یہودی بھی اتباعِ سحر سے بڑے ضرر میں ہوں گے) اور (یہ بات کچھ ہمارے ہی کہنے کی نہیں بلکہ) ضرور (یہ یہودی) بھی اتنا جانتے ہیں کہ جو شخص اس (سحر) کو (کتاب اللہ کے عوض) اختیار کرے ایسے شخص کا آخرت میں کوئی حصّہ (باقی) نہیں، اور بیشک بُری ہے وہ چیز (یعنی جادو دو کفر) جس میں وہ لوگ اپنی جان دے رہے ہیں کاش ان کو (اتنی) عقل ہوتی، اور اگر وہ لوگ (بجائے اس کفر و بدعملی کے) ایمان اور تقوےٰ (اختیار) کرتے تو خدا تعالیٰ کے یہاں کا معاوضہ (اس کفر و بدعملی سے ہزار درجے) بہتر تھا، کاش!

(ان کو عقل ہوتی)

معارف و مسائل

آیات مذکورہ کی تفسیر اور شانِ نزول میں نقل کی ہوئی اسرائیلی روایات سے بہت سے لوگوں کو مختلف قسم کے شبہات پیش آتے ہیں، ان شبہات کا حل سیّدی حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرّہٗ نے نہایت واضح اور سہل انداز میں فرمایا ہے، اس جگہ اس کو بعینہٖ نقل کردینا کافی ہے، وہ یہ ہے:

۱۔ یہ بیوقوف لوگ جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف جادو کی نسبت کرتے تھے، یہودی تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے درمیانِ آیت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی براءت بھی ظاہر فرمادی۔

۲۔ ان آیتوں سے یہودیوں کی برائی کرنا مقصود ہے، کیونکہ ان میں جادو کا چرچا تھا، ان آیتوں کے متعلق زہرہ کا ایک لمبا چوڑا قصہ بھی مشہور ہے، جو کسی معتبر روایت سے ثابت نہیں، جن علماء نے اس قصہ کو قواعد شرعیہ کے خلاف سمجھا ہے رَد کردیا ہے، اور جنھوں نے اس میں تاویل کو خلافِ شرع نہیں سمجھا رَد نہیں کیا، ہمیں یہاں فی الوقت اس کے صحیح یا غلط ہونے سے بحث نہیں، البتہ اتنا ضرور ہے کہ ان آیات کی تفسیر اس قصہ پر موقوف نہیں، جیسے کہ ناظرین کو معارف و مسائل کے اس زیرِ عنوان مضمون سے اندازہ ہو جائے گا۔

۳۔ اور یہودی سب باتوں کے جاننے کے باوجود چونکہ عمل علم کے خلاف کرتے تھے، اور تدبّر سے کام نہ لیتے تھے، اس لئے اوّل تو ان کے جاننے کی خبر دی، اور پھر آخر میں یہ کہہ کر اس کی نفی بھی کردی کہ "کاش ان کو علم و عقل ہوتی"، کیونکہ جس علم پر عمل اور تدبّر نہ ہو وہ جہل کی مانند ہے۔

۴۔ ایک زمانے میں جس کی پوری تعیین میں کوئی محققانہ رائے اس وقت سامنے نہیں، دنیا میں اور خصوصاً بابل میں جادو کا بہت چرچا تھا، اور اس کے عجیب اثرات کو دیکھ کر جاہلوں کو اس کی حقیقت اور انبیاء کرامؑ کے معجزات کی حقیقت میں خلط و اشتباہ ہونے لگا، اور بعض لوگ جادوگروں کو مقدس اور قابلِ اتباع سمجھنے لگے، اور بعض لوگ جادو کو نیک کام سمجھ کر اس کو سیکھنے اور اس پر عمل کرنے لگے، جیسا موجودہ دور میں مسمریزم کے ساتھ لوگوں کا معاملہ ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس اشتباہ اور غلطی کے رفع کرنے کے لئے بابل میں دو فرشتے ہاروت و ماروت نامی اس کام کے لئے بھیجے کہ لوگوں کو سحر کی حقیقت اور اس کے شعبوں سے مطلع کردیں تاکہ اشتباہ جاتا رہے، اور جادو پر عمل کرنے نیز جادوگروں کے اتباع کرنے سے اجتناب کرسکیں، اور جس طرح انبیاء علیہم السلام کی نبوت کو معجزات و دلائل سے ثابت کردیا جاتا ہے، اسی طرح ہاروت و ماروت

کے فرشتہ ہونے پر دلائل قائم کر دیئے گئے، تاکہ ان کے احکامات وارشادات کی تعمیل واطاعت ممکن ہو۔

اور یہ کام انبیاء کرامؑ سے اس لئے نہیں لیا گیا کہ اوّل تو انبیاءؑ اور جادوگروں میں امتیاز وفصل کرنا مقصود تھا، ایک حیثیت سے گویا انبیاء کرامؑ ایک فریق کا درجہ رکھتے تھے، اس لئے حکم فریقین کے علاوہ کوئی اور ثالث ہونا مناسب تھا۔

دوسرے اس کام کی تکمیل بغیر جادو کے الفاظ کی نقل وحکایت کے عادۃً ہو نہ سکتی تھی، اگرچہ نقلِ کفر کفر نباشد کے عقلی ونقلی مسلمہ قاعدہ کے مطابق ایسا ہو سکتا تھا، مگر چونکہ حضرات انبیاء کرامؑ مظہرِ ہدایت ہوتے تھے، اس لئے ان سے یہ کام لینا مناسب نہ سمجھا گیا، لہٰذا فرشتوں کو اس کام کے لئے تجویز کیا گیا، کیونکہ کارخانۂ تکوین میں جو خیر وشر سب پر مشتمل ہوتا ہے، ان فرشتوں سے ایسے کام بھی لئے جاتے ہیں جو مجموعۂ عالم کے اعتبار سے تو بوجہ مصالحِ عامہ خیر ہوں، لیکن لزومِ مفسدہ کے سبب فی ذاتہٖ شر ہوں، جیسے کسی ظالم وجابر یا موذی جانور وغیرہ کی نشوونما اور غور وپرداخت! کہ تکوینی اعتبار سے تو درست ومحمود ہے، اور تشریعی لحاظ سے نادرست ومذموم، بخلاف انبیاء کرام علیہم السّلام کے کہ ان سے خاص تشریعیات کا کام ہی لیا جاتا ہے جو خصوصًا وعمومًا خیر ہی خیر ہوتا ہے، اور گو کہ یہ نقل وحکایت مذکورہ غرض کے لحاظ سے ایک تشریعی کام ہی تھا، لیکن پھر بھی بوجہ احتمال قریب اس امر کے کہ کہیں یہ نقل وحکایت بھی جادو پر عمل کا سبب نہ بن جائے، جیسا کہ واقع میں ہوا، تو حضرات انبیاءؑ کو اس کا سبب بواسطہ نقل بننا بھی پسند نہیں کیا گیا۔

البتہ کلّیاتِ شرعیہ سے انبیاء علیہم السّلام کے ذریعہ بھی اس مقصود کی تکمیل کر دی گئی، ان کلّیات کے جزئیات کی تفصیلات بوجہ احتمال فتنہ انبیاء کرامؑ کے ذریعہ بیان نہیں کی گئیں، اس کی مثال ایسی ہے کہ مثلاً انبیاء کرامؑ نے یہ بتایا ہے کہ رشوت لینا حرام ہے، اور اس کی حقیقت بھی بتلادی، لیکن یہ جزئیات نہیں بتلائے، کہ ایک طریقہ رشوت کا یہ ہے کہ صاحبِ معاملہ سے یوں چال کر کے فلاں بات کہے، وغیرہ وغیرہ کیونکہ اس طرح کی تفصیلات بیان کرنے سے تو لوگ اور ترکیبیں سیکھ سکتے ہیں، یا مثلاً اقسامِ سحر ہی میں مثال فرض کیجئے کہ قواعدِ کلیہ سے یہ بتلا دیا گیا ہے کہ دستِ غیب کا عمل جس میں تکیہ کے نیچے یا جیب میں رکھے ہوئے روپے مل جائیں ناجائز ہے، لیکن یہ نہیں بتلایا کہ فلاں عمل پڑھنے سے اس طرح روپیہ ملنے لگتے ہیں۔

حاصلِ کلام یہ کہ فرشتوں نے بابل میں آکر اپنا کام شروع کر دیا، کہ سحر کے اصول وفروع ظاہر کر کے

لوگوں کو اس کے عملِ بد سے بچنے کی اور ساحرین سے نفرت و دوری رکھنے کی تنبیہ اور تائید کی، جیسے کوئی عالم دیکھے کہ جاہل لوگ اکثر نادانی سے کفریہ کلمات بک جاتے ہیں، اس لئے وہ تقریراً یا تحریراً ان کلمات کو جو اس وقت شائع ہیں جمع کر کے عوام کو مطلع کر دے کہ دیکھو یہ کلمات بچنے کے لائق ہیں ان سے احتیاط رکھنا۔

جب فرشتوں نے کام شروع کیا تو وقتاً فوقتاً مختلف لوگوں کی آمد و رفت ان کے پاس شروع ہوئی اور وہ درخواست کرنے لگے کہ ہم کو بھی ان اصول و فروع سے مطلع کر دیجئے تاکہ ناواقفی سے کسی اعتقادی یا عملی فساد میں مبتلا نہ ہو جائیں، اس وقت فرشتوں نے بطور احتیاط و تبلیغ اور بنظرِ اصلاح یہ التزام کیا کہ اصول و فروع بتانے سے قبل یہ کہہ دیا کرتے تھے کہ دیکھو ہمارے یہ بتانے کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کی آزمائش بھی مقصود ہے کہ دیکھیں ان چیزوں پر مطلع ہو کر کون شخص اپنے دین کی حفاظت و اصلاح کرتا ہے، کہ شر سے آگاہ ہو کر اس سے بچے، اور کون اپنا دین خراب کرتا ہے کہ اس شر پر مطلع ہو کر وہی شر خود اختیار کر لے، جس کا انجام کفر ہے، خواہ کفر عملی ہو یا اعتقادی دیکھو ہم تم کو نصیحت کئے دیتے ہیں کہ اچھی نیت سے اطلاع حاصل کرنا اور پھر اسی نیت پر ثابت قدم رہنا، ایسا نہ ہو کہ ہم سے تو یہ کہہ کر سیکھ لو کہ میں بچنے کے لئے پوچھ رہا ہوں، اور پھر اس کی خرابی میں خود ہی مبتلا ہو جاؤ، اور ایمان برباد کر لو۔

اب ظاہر ہے کہ وہ اس سے زیادہ خیر خواہی اور کیا کر سکتے تھے، غرض جو کوئی ان سے اس طرح عہد و پیمان کر لیتا وہ اس کے رد بر جادو کے سب اصول و فروع بیان کر دیتے تھے، کیونکہ ان کا کام ہی یہ تھا، اب اگر کوئی عہد شکنی کر کے اپنے ارادہ و اختیار سے کافر و فاجر بنے وہ جانے۔ چنانچہ بعضے اس عہد پر قائم نہ رہے، اور اس جادو کو مخلوق کی ایذا رسانی کا ذریعہ بنا لیا، جو فسق تو یقیناً ہے، اور بعضے طریقے اس کے استعمال کے کفر بھی ہیں، اس طرح سے فاجر کافر بن گئے۔

اس ارشاد اصلاحی اور پھر مخاطب کے خلاف کرنے کی مثال اس طرح ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص کسی جامع معقول و منقول، عالم باعمل کے پاس جائے کہ مجھ کو قدیم یا جدید فلسفہ پڑھا دیجئے، تاکہ خود بھی ان شبہات سے محفوظ رہوں جو فلسفہ میں اسلام کے خلاف بیان کئے جاتے ہیں، اور مخالفین کو بھی جواب دے سکوں، اور اس عالم کو یہ احتمال ہو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ کو دھوکہ دے کر پڑھ لے، اور پھر خود ہی خلافِ شرع عقائدِ باطلہ کو تقویت دینے میں اس کو استعمال کرنے لگے، اس احتمال کی وجہ سے اس کو نصیحت کرے کہ ایسا مت کرنا اور وہ وعدہ کر لے، اور اس لئے اس کو پڑھا دیا جاوے، لیکن وہ شخص فلسفہ کے خلافِ اسلام نظریات و عقائد ہی کو صحیح سمجھنے لگے تو ظاہر ہے کہ اس کی اس حرکت سے اس معلم پر کوئی ملامت یا برائی عائد نہیں ہو سکتی، اسی طرح اس اطلاعِ سحر سے ان فرشتوں پر بھی نہ کسی شبہ کی

گنجائش ہے نہ وسوسہ کی۔
اور اس فرض کی تکمیل کے بعد غالباً وہ فرشتے آسمان پر بلا لئے گئے ہوں گے، واللہ اعلم بحقیقۃ الحال (بیان القرآن)

سحر کی حقیقت سحر بالکسر لغت میں ہر ایسے اثر کو کہتے ہیں جس کا سبب ظاہر نہ ہو (قاموس) خواہ وہ سبب معنوی ہو جیسے خاص خاص کلمات کا اثر، یا غیر محسوس چیزوں کا ہو، جیسے جنات و شیاطین کا اثر، یا مسمریزم میں قوتِ خیالیہ کا اثر، یا محسوسات کا ہو مگر وہ محسوسات مخفی ہوں، جیسے مقناطیس کی کشش لوہے کے لئے جبکہ مقناطیس نظروں سے پوشیدہ ہو، یا دواؤں کا اثر جبکہ وہ دوائیں مخفی ہوں، یا نجوم و سیارات کا اثر۔

اسی لئے جادو کی اقسام بہت ہیں، مگر عرف عام میں عموماً جادو ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جن میں جنات و شیاطین کے عمل کا دخل ہو، یا قوتِ خیالیہ مسمریزم کا، یا کچھ الفاظ و کلمات کا، کیونکہ یہ بات عقلاً بھی ثابت ہے اور تجربہ و مشاہدہ سے بھی، اور قدیم و جدید فلاسفہ بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ حروف و کلمات میں بھی بالخاصہ کچھ تاثیرات ہوتی ہیں، کسی خاص حرف یا کلمہ کو کسی خاص تعداد میں پڑھنے یا لکھنے وغیرہ سے خاص خاص تاثرات کا مشاہدہ ہوتا ہے، یا ایسی تاثیرات جو کسی انسانی بال یا ناخنوں وغیرہ اعضاء، یا اس کے استعمالی کپڑوں کے ساتھ کچھ دوسری چیزیں شامل کر کے پیدا کی جاتی ہیں جن کو عرفِ عام میں ٹونہ ٹوٹکا کہا جاتا ہے، اور جادو میں شامل سمجھا جاتا ہے۔

اور اصطلاحِ قرآن و سنت میں سحر ہر ایسے امر عجیب کو کہا جاتا ہے جس میں شیاطین کو خوش کر کے ان کی مدد حاصل کی گئی ہو، پھر شیاطین کو راضی کرنے کی مختلف صورتیں ہیں، کبھی ایسے منتر اختیار کئے جاتے ہیں جن میں کفر و شرک کے کلمات ہوں اور شیاطین کی مدح کی گئی ہو، یا کواکب و نجوم کی عبادت اختیار کی گئی ہو جس سے شیطان خوش ہوتا ہے۔

کبھی ایسے اعمال اختیار کئے جاتے ہیں، جو شیطان کو پسند ہیں، مثلاً کسی کو ناحق قتل کر کے اس کا خون استعمال کرنا، یا جنابت و نجاست کی حالت میں رہنا، طہارت سے اجتناب کرنا، وغیرہ۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کے پاک فرشتوں کی مدد، ان اقوال و افعال سے حاصل کی جاتی ہے، جن کو فرشتے پسند کرتے ہیں مثلاً تقویٰ، طہارت، اور پاکیزگی، بدبو اور نجاست سے اجتناب، ذکر اللہ اور اعمالِ خیر۔

اسی طرح شیاطین کی امداد ایسے اقوال و افعال سے حاصل ہوتی ہے جو شیطان کو پسند ہیں، اسی لئے سحر صرف ایسے ہی لوگوں کا کامیاب ہوتا ہے جو گندے اور نجس رہیں، پاکی اور اللہ کے نام سے دور رہیں، خبیث کاموں کے عادی ہوں، عورتیں بھی ایامِ حیض میں یہ کام کرتی ہیں تو مؤثر ہوتا ہے، باقی

شعبدے اور ٹوٹکے یا ہاتھ چالاکی کے کام یا مسمریزم وغیرہ ان کو مجازاً سحر کہدیا جاتا ہے، (روح المعانی)

سحر کے اقسام امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں کہ سحر کی مختلف قسمیں ہیں،

ایک قسم تو محض نظر بندی اور تخییل ہوتی ہے، جس کی کوئی حقیقت واقعیہ نہیں، جیسے بعض شعبدہ باز اپنی ہاتھ چالاکی سے ایسے کام کر لیتے ہیں کہ عام لوگوں کی نظریں اس کو دیکھنے سے قاصر رہتی ہیں، یا قوتِ خیالیہ مسمریزم وغیرہ کے ذریعہ کسی کے دماغ پر ایسا اثر ڈالا جائے کہ وہ ایک چیز کو آنکھوں سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے، مگر اس کی کوئی حقیقتِ واقعیہ نہیں ہوتی، کبھی یہ کام شیاطین کے اثر سے بھی ہو سکتا ہے، کہ مسحور کی آنکھوں اور دماغ پر ایسا اثر ڈالا جائے جس سے وہ ایک غیر واقعی چیز کو حقیقت سمجھنے لگے، قرآن مجید میں فرعونی ساحروں کے جس سحر کا ذکر ہے وہ پہلی قسم کا سحر تھا، جیسا کہ ارشاد ہے:

سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ (۷: ۱۱۶)	"انھوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا"

اور ارشاد ہے:

يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ○ (۲۰: ۶۶)	"ان کے سحر سے موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں آنے لگا کہ یہ رسیوں کے سانپ دوڑ رہے ہیں"

اس میں یخیل کے لفظ سے یہ بتلا دیا گیا کہ یہ رسیاں اور لاٹھیاں جو ساحروں نے ڈالی تھیں نہ حقیقت در حقیقت سانپ بنی، اور نہ انھوں نے کوئی حرکت کی، بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوتِ متخیلہ متاثر ہو کر ان کو دوڑنے والے سانپ سمجھنے لگی۔

دوسری قسم اس طرح کی تخییل اور نظر بندی ہے جو بعض اوقات شیاطین کے اثر سے ہوتی ہے، جو قرآن کریم کے اس ارشاد سے معلوم ہوئی:

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ۝ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ (۲۶: ۲۲۱-۲۲۲)	"میں تمھیں بتلاتا ہوں کہ کن لوگوں پر شیطان اترتے ہیں، ہر بہتان باندھنے والے گناہگار پر اُترتے ہیں"

نیز دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ (۲: ۱۰۲)	"یعنی شیاطین نے کفر اختیار کیا، لوگوں کو جادو سکھانے لگے"

تیسری قسم یہ ہے کہ سحر کے ذریعے ایک شئے کی حقیقت ہی بدل جائے، جیسے کسی انسان یا جاندار کو پتھر یا کوئی جانور بنا دیں، امام راغبؒ اصفہانی، ابوبکر جصاصؒ وغیرہ حضرات نے اس سے انکار کیا ہے کہ سحر کے ذریعے کسی چیز کی حقیقت بدل جائے، بلکہ سحر کا اثر صرف تخییل اور نظر بندی

ہی تک ہوسکتا ہے، معتزلہ کا بھی یہی قول ہے، مگر جمہور علماء کی تحقیق یہ ہے کہ انقلابِ اعیان میں نہ کوئی عقلی امتناع ہے نہ شرعی، مثلاً کوئی جسم پتھر بن جائے، یا ایک نوع سے دوسری نوع کی طرف منقلب ہو جائے۔

اور فلاسفہ کا جو یہ قول مشہور ہے کہ انقلابِ حقائق ممکن نہیں، اُن کی مراد حقائق سے محال، ممکن، واجب کی حقیقتیں ہیں کہ ان میں انقلاب عقلاً ممکن نہیں، کہ کوئی محال ممکن بن جائے، یا کوئی ممکن محال بن جائے۔

اور قرآن عزیز میں فرعونی ساحروں کے سحر کو جو تخییل قرار دیا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر سحر تخییل ہی ہو اس سے زائد اور کچھ نہ ہو، اور بعض حضرات نے سحر کے ذریعہ انقلاب حقیقت کے جواز پر حضرت کعب احبارؓ کی اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جو موطاء امام مالکؒ میں بروایت قعقاع بن حکیم منقول ہے:

لولا کلمات اقولهن لجعلتنی الیهود حمارًا	اگر یہ چند کلمات نہ ہوتے جن کو میں پابندی سے پڑھتا ہوں تو یہودی مجھے گدھا بنا دیتے۔

گدھا بنا دینے کا لفظ مجازی طور پر بیوقوف بنانے کے معنی میں بھی ہوسکتا ہے، مگر بلا ضرورت حقیقت کو چھوڑ کر مجاز مراد لینا صحیح نہیں، اس لئے حقیقی اور ظاہری مفہوم اس کا یہی ہے کہ اگر میں یہ کلمات روزانہ پابندی سے نہ پڑھتا تو یہودی جادوگر مجھے گدھا بنا دیتے۔

اس سے دو باتیں ثابت ہوئیں، اوّل یہ کہ سحر کے ذریعے انسان کو گدھا بنا دینے کا امکان ہے، دوسرے یہ کہ جو کلمات وہ پڑھا کرتے تھے ان کی تاثیر یہ ہے کہ کوئی جادو اثر نہیں کرتا، حضرت کعب احبارؓ سے جب لوگوں نے پوچھا کہ وہ کلمات کیا تھے تو آپ نے یہ کلمات بتلائے:

اَعُوْذُ بِوَجْهِ اللّٰهِ الْعَظِیْمِ الَّذِیْ لَیْسَ شَیْءٌ اَعْظَمَ مِنْهُ وَبِکَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ الَّتِیْ لَا یُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَّلَا فَاجِرٌ وَبِاَسْمَاءِ اللّٰهِ الْحُسْنٰی کُلِّهَا مَا عَلِمْتُ مِنْهَا وَمَا لَمْ اَعْلَمْ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَبَرَاَ وَذَرَاَ اخرجه فی المؤطاء باب التعوذ عند النوم	"میں اللہ عظیم کی پناہ پکڑتا ہوں جس سے بڑا کوئی نہیں اور پناہ پکڑتا ہوں اللہ کے کلمات تامات کی جن سے کوئی نیک و بد انسان آگے نہیں نکل سکتا اور پناہ پکڑتا ہوں اللہ کے تمام اسماء حسنیٰ کی جن کو میں جانتا ہوں، اور جن کو نہیں جانتا، ہر اس چیز کے شر سے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا، اور وجود دیا اور پھیلایا ہے"

خلاصہ یہ ہے کہ سحر کی یہ تینوں قسمیں ممکن الوقوع ہیں۔

سحر اور معجزے میں فرق | جس طرح انبیاء علیہم السلام کے معجزات یا اولیاء کی کرامات سے ایسے واقعات مشاہدے میں آتے ہیں جو عادۃً نہیں ہو سکتے، اسی لئے ان کو خرقِ عادت کہا جاتا ہے، بظاہر سحر اور جادو سے بھی ایسے ہی آثار مشاہدے میں آتے ہیں، اس لئے بعض جاہلوں کو ان دونوں میں التباس بھی ہو جاتا ہے، اور اس کی وجہ سے وہ جادوگروں کی تعظیم و تکریم کرنے لگتے ہیں، اس لئے دونوں کا فرق بیان کرنا ضروری ہے۔

سو یہ فرق ایک تو اصل حقیقت کے اعتبار سے ہے اور ایک ظاہری آثار کے اعتبار سے، حقیقت کا فرق تو یہ ہے کہ سحر اور جادو سے جو چیزیں مشاہدے میں آتی ہیں یہ دائرۂ اسباب سے الگ کوئی چیز نہیں، فرق صرف اسباب کے ظہور و خفاء کا ہے جہاں اسباب ظاہر ہوتے ہیں، وہ آثار ان اسباب کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، اور کوئی تعجب کی چیز نہیں سمجھی جاتی، لیکن جہاں اسباب مخفی ہوں تو وہ تعجب کی چیز ہوتی ہے، اور عوام اسباب کے نہ جاننے کی وجہ سے اس کو خرقِ عادت سمجھنے لگتے ہیں، حالانکہ وہ درحقیقت تمام عادی امور کی طرح کسی جن شیطان کے اثر سے ہوتی ہے، ایک خط مشرق بعید سے آج کا لکھا ہوا اچانک سامنے آکر گر گیا، تو دیکھنے والے اس کو خرقِ عادت کہیں گے، حالانکہ جنّات و شیاطین کو ایسے اعمال و افعال کی قوت دی گئی ہے، ان کا ذریعہ معلوم ہو تو پھر کوئی خرقِ عادت نہیں رہتا، خلاصہ یہ ہے کہ سحر سے ظاہر ہونے والے تمام آثار اسبابِ طبعیہ کے ماتحت ہوتے ہیں، مگر اسباب کے مخفی ہونے کے سبب لوگوں کو مغالطہ خرقِ عادت کا ہو جاتا ہے۔

بخلاف معجزہ کے کہ وہ بلا واسطہ فعل حق تعالیٰ کا ہوتا ہے، اس میں اسبابِ طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے نمرود کی آگ کو حق تعالیٰ نے فرما دیا، کہ ابراہیم علیہ السلام کے لئے ٹھنڈی ہو جائے، مگر ٹھنڈک بھی اتنی نہ ہو جس سے تکلیف پہنچے، بلکہ جس سے سلامتی حاصل ہو، اس حکمِ الٰہی سے آگ ٹھنڈی ہو گئی۔

آج بھی بعض لوگ بدن پر کچھ دوائیں استعمال کر کے آگ کے اندر چلے جاتے ہیں، وہ معجزہ نہیں، بلکہ دواؤں کا اثر ہے، دوائیں مخفی ہونے سے لوگوں کو دھوکا خرقِ عادت کا ہو جاتا ہے۔

یہ بات کہ معجزہ براہِ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، خود قرآن عزیز کی تصریح سے ثابت ہے، ارشاد فرمایا:

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۸: ۱۷) | "کنکریوں کی مٹھی جو آپ نے پھینکی، درحقیقت آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی ہے"

مراد یہ ہے کہ ایک مٹھی خاک اور کنکر کی سارے مجمع کی آنکھوں تک پہنچ جانا اس میں آپ کے عمل کو کوئی دخل نہیں، یہ خالص حق تعالیٰ کا فعل ہے، یہ معجزہ غزوۂ بدر میں پیش آیا تھا کہ آپ نے ایک مٹھی خاک

اور سنگریزوں کی کفار کے لشکر پر پھینکی (جو سب کی آنکھوں میں پڑ گئی)۔

معجزہ اور سحر کی حقیقتوں کا یہ فرق کہ معجزہ بلا واسطہ اسباب طبعیہ کے براہ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، اور جادو اسباب طبعیہ مخفیہ کا اثر ہوتا ہے، حقیقت سمجھنے کے لئے تو کافی وافی ہے، مگر یہاں ایک سوال یہ رہ جاتا ہے کہ عوام الناس اس فرق کو کیسے پہچانیں، کیونکہ ظاہری صورت دونوں کی ایک سی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ عوام کے پہچاننے کے لئے بھی حق تعالیٰ نے کئی فرق ظاہر کر دیئے ہیں۔

اوّل یہ کہ معجزہ یا کرامت ایسے حضرات سے ظاہر ہوتی ہے، جن کا تقویٰ، طہارت، پاکیزگی اخلاق و اعمال کا سب مشاہدہ کرتے ہیں، اس کے برعکس جادو کا اثر صرف ایسے لوگوں سے ظہور پذیر ہوتا ہے جو گندے ناپاک، اللہ کے نام سے اور اس کی عبادت سے دُور رہتے ہیں، یہ چیز ہر انسان آنکھوں سے دیکھ کر معجزہ اور سحر میں فرق پہچان سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ عادة اللہ یہ بھی جاری ہے کہ جو شخص معجزے اور نبوّت کا دعویٰ کر کے کوئی جادو کرنا چاہے اس کا جادو نہیں چلتا، ہاں نبوّت کے دعوے کے بغیر کرے تو چل جاتا ہے۔

کیا انبیاءؑ پر بھی جادو کا اثر ہو سکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے، وجہ وہی ہے جو اوپر بتلائی گئی کہ سحر درحقیقت اسباب طبعیہ ہی کا اثر ہوتا ہے، اور انبیاء علیہم السلام اسباب طبعیہ کے اثرات سے متاثر ہوتے ہیں، یہ تأثر شانِ نبوّت کے خلاف نہیں، جیسے ان کا بھوک پیاس سے متأثر ہونا، بیماری میں مبتلا ہونا اور شفاء پانا ظاہری اسباب سے سب جانتے ہیں، اسی طرح جادو کے باطنی اسباب سے بھی انبیاء علیہم السلام متأثر ہو سکتے ہیں، اور یہ تأثر شانِ نبوّت کے منافی نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہودیوں کا سحر کرنا اور اس کی وجہ سے آپؐ پر بعض آثار کا ظاہر ہونا اور بذریعہ وحی اس جادو کا پتہ لگنا اور اس کا ازالہ کرنا احادیثِ صحیحہ میں ثابت ہے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سحر سے متاثر ہونا خود قرآن میں مذکور ہے، آیات يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى، اور فَاَوْجَسَ فِىْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى (۲۰: ۶۶-۶۷) موسیٰ علیہ السلام پر خوف طاری ہونا اسی جادو ہی کا تو اثر تھا۔

سحر کے احکامِ شرعیہ

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، قرآن و حدیث کی اصطلاح میں سحر صرف ایسے عمل کو کہا گیا ہے جس میں کفر و شرک اور فسق و فجور اختیار کر کے جنّات و شیاطین کو راضی کیا گیا ہو، اور ان سے

مدد لی گئی ہو، ان کی امداد سے کچھ عجیب واقعات ظاہر ہوگئے ہوں، سحر بابل جس کا قرآن میں ذکر ہے وہ یہی تھا، (جصاص) اور اسی سحر کو قرآن میں کفر قرار دیا ہے، ابومنصورؒ نے فرمایا کہ صحیح یہی ہے کہ مطلقاً سحر کی سب اقسام کفر نہیں، بلکہ صرف وہ سحر کفر ہے جس میں ایمان کیخلاف اقوال و اعمال اختیار کئے گئے ہوں۔ (روح المعانی)

اور یہ ظاہر ہو کہ شیاطین پر لعنت کرنے اور ان سے عداوت و مخالفت کرنے کے احکام قرآن و حدیث میں بار بار آتے ہیں، اس کے خلاف ان سے دوستی اور ان کو راضی کرنے کی فکر خود ہی ایک گناہ ہے، پھر وہ راضی جب ہی ہوتے ہیں جب انسان کفر و شرک میں مبتلا ہو جس سے ایمان ہی سلب ہو جائے، یا کم از کم فسق و فجور میں مبتلا ہو، اور اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی مرضیات کے خلاف گندہ اور نجس رہے، یہ مزید گناہ ہے، اور اگر جادو کے ذریعے کسی کو ناحق نقصان پہنچایا تو یہ اور گناہ ہے۔

غرض اصطلاحِ قرآن و سنت میں جس کو سحر کہا گیا ہے وہ کفر اعتقادی یا کم از کم کفر عملی سے خالی نہیں ہوتا، اگر شیاطین کو راضی کرنے کے لئے کچھ اقوال یا اعمال کفر و شرک کے اختیار کئے تو کفر حقیقی اعتقادی ہوگا، اور اگر کفر و شرک کے اقوال و افعال سے بچ بھی گیا مگر دوسرے گناہوں کا ارتکاب کیا، تو کفرِ عملی سے خالی نہ رہا، قرآن عزیز کی آیات مذکورہ میں جو سحر کو کفر کہا گیا ہے وہ اسی اعتبار سے ہے کہ یہ سحر کفر حقیقی اعتقادی یا کفر عملی سے خالی نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ ہو کہ جس سحر میں کوئی عمل کفر اختیار کیا گیا ہو جیسے شیاطین سے استغاثہ و استمداد یا کواکب کی تاثیر کو مستقل ماننا یا سحر کو معجزہ قرار دے کر اپنی نبوت کا دعویٰ کرنا وغیرہ تو یہ سحر باجماع کفر ہے، اور جس میں یہ افعالِ کفر نہ ہوں مگر معاصی کا ارتکاب ہو وہ گناہ کبیرہ ہے۔

مسئلہ: جب یہ معلوم ہوگیا کہ یہ سحر کفر اعتقادی یا عملی سے خالی نہیں تو اس کا سیکھنا اور سکھانا بھی حرام ہوا، اس پر عمل کرنا بھی حرام ہوا، البتہ اگر مسلمانوں سے دفعِ ضرر کیلئے بقدر ضرورت سیکھا جائے تو بعض فقہاء نے اجازت دی ہے (شامی، عالمگیری)

مسئلہ: تعویذ گنڈے وغیرہ جو عامل کرتے ہیں ان میں بھی اگر جنات و شیاطین سے استمداد ہو تو بحکم سحر ہیں، اور حرام ہیں، اور اگر الفاظ مشتبہ ہوں معنی معلوم نہ ہوں، اور شیاطین اور بتوں سے استمداد کا احتمال ہو تو بھی حرام ہے۔

مسئلہ: قرآن و سنت کے اصطلاحی سحرِ بابل کے علاوہ باقی قسمیں سحر کی ان میں بھی اگر کفر و شرک کا ارتکاب کیا جائے تو وہ بھی حرام ہیں۔

مسئلہ: اور خالی مباح اور جائز امور سے کام لیا جاتا ہو تو اس شرط کے ساتھ جائز ہو کہ

اس کو کسی ناجائز مقصد کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔
مسئلہ: اگر قرآن وحدیث کے کلمات ہی سے کام لیا جائے مگر ناجائز مقصد کے لئے استعمال کریں تو وہ بھی جائز نہیں، مثلاً کسی کو ناحق ضرر پہنچانے کے لئے کوئی تعویذ کیا جائے یا وظیفہ پڑھا جائے، اگرچہ وظیفہ اسماء الٰہیہ یا آیاتِ قرآنیہ ہی کا ہو وہ بھی حرام ہے (فتاویٰ قاضی خاں شامی)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ۭ

اے ایمان والو تم نہ کہو رَاعِنَا اور کہو اُنْظُرْنَا اور سنتے رہو،

وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱۰۴

اور کافروں کو عذاب ہے دردناک۔

خلاصۂ تفسیر

بعض یہودیوں نے ایک شرارت ایجاد کی، کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں آکر لفظ راعنا سے آپؐ کو خطاب کرتے، جس کے معنی ان کی عبرانی زبان میں ایک بد دعا کے ہیں، اور وہ اسی نیت سے کہتے تھے، مگر عربی زبان میں اسکے معنی "ہماری مصلحت کی رعایت فرمائیے" کے ہیں، اس لئے عربی داں اس شرارت کو نہ سمجھ سکتے تھے، اور اس اچھے معنی کے قصد سے بعضے مسلمان بھی حضورؐ کو اس کلمہ سے خطاب کرنے لگے، اس سے ان شریروں کو اور گنجائش ملی، آپس میں بیٹھ کر ہنستے تھے، کہ اب تک تو ہم ان کو خفیہ ہی برا کہتے تھے، اب علانیہ کہنے کی تدبیر ایسی ہاتھ آگئی کہ مسلمان بھی اس میں شریک ہوگئے، حق تعالیٰ نے اس گنجائش کے قطع کرنے کو مسلمانوں کو حکم دیا کہ) اے ایمان والو تم (لفظ) راعنا مت کہا کرو اور (اس کی جگہ لفظ) انظرنا کہہ دیا کرو (کیونکہ اس لفظ کے معنی اور راعنا کے معنی عربی زبان میں ایک ہی ہیں، راعنا کہنے میں یہودیوں کی شرارت چلتی ہے، اس لئے اس کو ترک کرکے دوسرا لفظ استعمال کرو،) اور (اس حکم کو اچھی طرح) سن لیجیو (اور یاد رکھیو) اور (ان) کافروں کو (تو) سزائے دردناک ہو (ہی) گی (جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایسی گستاخی اور وہ بھی چالاکی کے ساتھ کرتے ہیں)۔

مسئلہ: اس آیت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر اپنے کسی جائز فعل سے دوسروں کو ناجائز کاموں کی گنجائش ملتی معلوم ہو تو یہ جائز فعل بھی اس کے لئے جائز نہیں رہتا، جیسے اگر کسی عالم کے جائز فعل سے جاہلوں کو مغالطہ میں پڑنے اور ناجائز کاموں میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو تو اس عالم کے لئے یہ جائز فعل بھی ممنوع ہوجائے گا، بشرطیکہ یہ فعل شرعاً ضروری اور مقاصد شرعیہ میں سے نہ ہو، اس کی مثالیں قرآن وسنت میں بہت ہیں، اسی کی ایک دلیل وہ حدیث ہے جس میں ارشاد

ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "بیت اللہ کی تعمیر جو قریش نے زمانۂ جاہلیت میں کی تھی، اس میں کئی چیزیں بناء ابراہیمؑ کے خلاف کردی ہیں، میرا دل چاہتا ہے کہ اس کو منہدم کرکے ازسرنو بناء ابراہیمی کے مطابق بنادوں، لیکن اس سے ناواقف عوام کے فتنہ میں مبتلا ہوجانے کا خطرہ ہے اس لئے بالفعل ایسا نہیں کرتا"۔ ایسے احکام کو اصولِ فقہ کی اصطلاح میں سدّ ذرائع سے تعبیر کیا جاتا ہے جو سبھی فقہاء کے نزدیک معتبر ہے، خصوصاً حضرات حنابلہ اس کا زیادہ اہتمام کرتے ہیں (قرطبی)

مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ

دل نہیں چاہتا اُن لوگوں کا جو کافر ہیں اہل کتاب میں اور نہ مشرکوں میں اس بات کو

يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ رَبِّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ

کہ اُترے تم پر کوئی نیک بات تمہارے رب کی طرف سے اور اللہ خاص کرلیتا ہے اپنی رحمت

مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿١٠٥﴾

کے ساتھ جسکو چاہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہود کا جو برتاؤ تھا، وہ اوپر کی آیت میں بیان کیا گیا، اب اس آیت میں یہود کا برتاؤ مسلمانوں کے ساتھ بیان کیا جارہا ہے کہ (بعضے یہودی بعض مسلمانوں سے کہنے لگے کہ بخدا ہم دل سے تمہارے خیرخواہ ہیں، اور ہزار جان سے پسند کرتے ہیں کہ تم کو دینی احکام ہمارے دینی احکام سے بہتر عنایت ہوں تو ہم بھی ان کو قبول کریں، مگر کیا کیا جائے کہ تمہارا دین ہمارے دین سے اچھا ثابت نہیں ہوا، حق تعالیٰ اس دعوئ خیرخواہی کی تکذیب فرماتے ہیں کہ) ذرا بھی پسند نہیں کرتے کافر لوگ (خواہ) ان اہلِ کتاب میں سے (ہوں) اور (خواہ) مشرکین میں سے، اس امر کو کہ تم کو تمہارے پروردگار کی طرف سے کسی طرح کی بہتری (بھی) نصیب ہو اور ان کے حسد سے کچھ بھی نہیں ہوتا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ اپنی رحمت (وعنایت) کے ساتھ جسکو منظور ہوتا ہے مخصوص فرمالیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل (کرنے) والے ہیں۔

فائدہ:۔ ان یہودیوں کے دو دعوے تھے، اوّل یہودیت کا بہتر ہونا اسلام سے، دوسرے ان کا خیرخواہ ہونا، تو اوّل دعوے کو تو یہ ثابت نہیں کرسکے، نرے دعوے سے کیا ہوتا ہے اور پھر یہ دعوی ہے بھی فضول سی بات، کیونکہ جب ناسخ آتا ہے تو منسوخ ترک کردیا جاتا ہے، افضل غیر افضل کے فرق پر موقوف نہیں، لہٰذا بوجہ ظاہر اور کھلی ہوئی بات ہونے کے اس کا جواب

یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔

صرف دوسرے دعویٰ خیرخواہی ہی پر کلام کیا گیا ہے، اور اہل کتاب کے ساتھ مشرکین کا ذکر مضمون کو قوی اور مؤکد کرنے کے لئے کیا گیا، کہ جس طرح مشرکین یقیناً تمھارے خیرخواہ نہیں اسی طرح ان کو بھی سمجھو۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ

جو منسوخ کرتے ہیں ہم کوئی آیت یا بھلا دیتے ہیں تو بھیج دیتے ہیں اس سے بہتر یا اس کے برابر کیا تجھ کو

اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ

معلوم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے، کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمان

وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾

اور زمین کی اور نہیں تمھارے واسطے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ مددگار۔

خلاصۂ تفسیر

(تبدیلِ قبلہ کا واقعہ جب ہوا تو یہود نے اس پر طعن کیا، اور مشرکین بھی بعض احکام کی منسوخی پر زبانِ طعن دراز کرتے تھے، حق تعالیٰ اُن کے طعن اور اعتراض کا جواب دیتے ہیں کہ) ہم کسی آیت کا جو حکم موقوف کر دیتے ہیں (گو آیت قرآن میں یا ذہنوں میں باقی رہے) یا اس آیت (ہی) کو (ذہنوں سے) فراموش کر دیتے ہیں تو (یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں، کیونکہ اس میں بھی مصلحت ہوتی ہے، چنانچہ) ہم اس آیت سے بہتر یا اس آیت ہی کے مثل (بجائے اس کے دوسری چیز) لے آتے ہیں، (اے معترض) کیا تجھ کو یہ معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ ہر شے پر قدرت رکھتے ہیں، (پس ایسے قادر کو مصالح کی رعایت کیا مشکل ہے اور) کیا تجھ کو یہ معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ ایسے ہیں کہ خاص انہی کی سلطنت آسمانوں اور زمین پر ہے، (جب ان کی اس قدرت وسلطنت میں کوئی شریک وسہیم نہیں ہے تو ان مصلحتوں کی رعایت کر کے دوسرا حکم دیدینے میں کون مزاحمت کر سکتا ہے، غرض حکمِ ثانی کی تجویز سے بھی کوئی مانع نہیں، اور اس حکم کے جاری کر دینے میں بھی کوئی مانع نہیں،) اور (یہ بھی سمجھ رکھو کہ) تمھارا حق تعالیٰ کے سوا کوئی یار و مددگار بھی نہیں، (پس جب وہ یار ہیں تو احکام میں مصلحت کی ضرور رعایت کریں گے، اور جب مددگار ہیں تو ان احکام پر عمل کرنے کے وقت تمھارے مخالفین کی مزاحمت سے بھی ضرور محفوظ رکھیں گے البتہ اگر اس ضرر سے بڑھ کر کوئی نفع اخروی ملنے والا ہو تو ظاہراً مخالف کا مسلط ہو جانا اور بات ہے

معارف و مسائل

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا، اس آیت میں کسی آیتِ قرآن کے منسوخ ہونے کی جتنی صورتیں ہوسکتی ہیں سب کو جمع کردیا ہے، نسخ کے معنے لغت میں زائل کرنے اور لکھنے کے آتے ہیں، اس پر تمام مفسّرینِ امت کا اتفاق ہے، کہ اس آیت میں نسخ سے مراد کسی حکم کا زائل کرنا یعنی منسوخ کرنا ہے، اور اسی لئے اصطلاحِ کتاب و سنت میں نسخ ایک حکم کے بجائے کوئی دوسرا حکم جاری کرنے کو کہا جاتا ہے، خواہ وہ دوسرا حکم یہی ہو کہ سابق حکم بالکل ختم کردیا جائے، یا یہ ہو کہ اس کی جگہ دوسرا عمل تبلایا جائے۔

احکامِ الٰہیہ میں نسخ کی حقیقت دنیا کی حکومتوں اور اداروں میں کسی حکم کو منسوخ کرکے دوسرا حکم جاری کردینا مشہور و معروف ہے، لیکن انسانوں کے احکام میں نسخ کبھی اس لئے ہوتا ہے کہ پہلے کسی غلط فہمی سے ایک حکم جاری کردیا، بعد میں حقیقت معلوم ہوئی تو حکم بدل دیا، کبھی اس لئے ہوتا ہے کہ جس وقت یہ حکم جاری کیا گیا اس وقت کے حالات کے مناسب تھا، اور آگے آنے والے واقعات و حالات کا اندازہ نہ تھا، جب حالات بدلے تو حکم بھی بدلنا پڑا، یہ دونوں صورتیں احکامِ خداوندی میں نہیں ہوسکتیں۔

ایک تیسری صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ حکم دینے والے کو اوّل ہی سے یہ بھی معلوم تھا کہ حالات بدلیں گے اور اُس وقت یہ حکم مناسب نہیں ہوگا، دوسرا حکم دینا ہوگا، یہ جانتے ہوئے آج ایک حکم دیدیا اور جب اپنے علم کے مطابق حالات بدلے تو اپنی قرارداد سابق کے مطابق حکم بھی بدل دیا، اسکی مثال ایسی ہے، کہ مریض کے موجودہ حالات کو دیکھکر حکیم یا ڈاکٹر ایک دوا تجویز کرتا ہے، اور وہ جانتا ہے کہ دو روز اس دوا کے استعمال کرنے کے بعد مریض کا حال بدلے گا، اس وقت مجھے دوسری دوا تجویز کرنا ہوگی، یہ سب کچھ جانتے ہوئے وہ پہلے دن ایک دوا تجویز کرتا ہے جو اُس دن کے مناسب ہے، دو دن کے بعد حالات بدلنے پر دوسری دوا تجویز کرتا ہے۔

ماہر حکیم ڈاکٹر یہ بھی کرسکتا ہے کہ پہلے ہی دن پورے علاج کا نظام لکھ کر دیدے کہ دو روز تک یہ دوا استعمال کرو، پھر تین روز فلاں دوا، پھر ایک ہفتہ فلاں دوا، لیکن یہ مریض کی طبیعت پر بے وجہ کا ایک بار بھی ڈالنا ہے، اس میں غلط فہمی کی وجہ سے عملی خلل کا بھی خطرہ ہے، اس لئے وہ پہلے ہی سے سب تفصیلات نہیں بتلاتا۔

اللہ جل شانہٗ کے احکام میں اور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں میں صرف یہی آخری صورت نسخ کی ہوسکتی ہے، اور ہوتی رہی ہے، ہر آنے والی نبوّت اور ہر نازل ہونے والی کتاب نے پچھلی

نبوّت اور کتاب کے بہت سے احکام کو منسوخ کر کے نئے احکام جاری کئے، اور اسی طرح ایک ہی نبوّت و شریعت میں ایسا ہوتا رہا کہ کچھ عرصہ تک ایک حکم جاری رہا، پھر بتقاضائے حکمتِ خداوندی اس کو بدل کر دوسرا حکم نافذ کر دیا گیا، صحیح مسلم کی حدیث میں ہے:

لم تکن نبوۃ قط الا تناسخت۔ (مسلم)	"یعنی کبھی کوئی نبوّت نہیں آئی جس نے احکام میں نسخ اور ردّ و بدل نہ کیا ہو (قرطبی)

جاہلانہ شبہات البتہ کچھ جاہل یہودیوں نے اپنی جہالت سے احکامِ الٰہیہ کے نسخ کو دنیوی احکام کے نسخ کی پہلی دونوں صورتوں پر قیاس کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر زبانِ طعن دراز کی، اسی کے جواب میں یہ آیات نازل ہوئیں (ابن جریر، ابن کثیر وغیرہ)

مسلمانوں میں سے فرقہ معتزلہ کے بعض لوگوں نے شاید ان مخالفین کے طعن سے بچنے کی یہ راہ نکالی کہ احکامِ الٰہیہ میں نسخ ہونے کا امکان تو ہے، کوئی امر اس امکان کے لئے مانع نہیں، لیکن پورے قرآن میں نسخ کا وقوع کہیں نہیں ہوا، نہ کوئی آیت ناسخ ہے، نہ منسوخ۔ یہ قول ابو مسلم اصفہانی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، جس پر علماءِ اُمت نے ہمیشہ ردّ و نکیر فرمایا، تفسیر رُوح المعانی میں ہے:

واتفقت اھل الشرائع علیٰ جواز النسخ ووقوعه وخالفت الیھود غیر العیسویۃ فی جوازہ وقالوا یمتنع عقلاً وابو مسلم الاصفھانی فی وقوعه فقال انه و ان جاز عقلا لکنه لم یقع۔ (روح، ص ۳۵۲ ج ۱)	"تمام اہل شرائع کا نسخ کے جواز اور وقوع دونوں پر اتفاق ہے، صرف یہودیوں نے بجز عیسویہ کے امکان نسخ کا انکار کیا ہو اور ابو مسلم اصفہانی نے وقوع کا انکار کیا ہے، وہ کہتا ہو کہ نسخ احکام الٰہیہ میں ممکن تو ہے مگر کہیں واقع ہوا نہیں"۔

اور امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں فرمایا:

معرفۃ ھٰذا الباب اکیدۃ و فائدته عظیمۃ لا تستغنی عن معرفته العلماء ولا ینکرہ الا الجھلۃ الاغبیاء، (قرطبی ص ۵۵ ج ۲)	"باب نسخ کی معرفت بہت ضروری اور فائدہ اس کا بہت بڑا ہے، اس کی معرفت سے علماء مستغنی نہیں ہو سکتے، اور جاہلوں بیوقوفوں کے سوا اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا"۔

قرطبی نے اس جگہ ایک واقعہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا بھی نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ وہ مسجد میں تشریف لائے تو کوئی آدمی وعظ کہہ رہا تھا، آپ نے لوگوں سے پوچھا یہ کیا کرتا ہے؟ لوگوں

نے کہا کہ وعظ و نصیحت کر رہا ہے، آپ نے فرمایا نہیں، یہ کوئی وعظ و نصیحت نہیں کرتا، بلکہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں فلاں بن فلاں ہوں سو پہچانو، پھر اس شخص کو بلوا کر پوچھا کہ کیا تم قرآن و حدیث کے ناسخ منسوخ احکام کو جانتے ہو؟ اس نے کہا کہ نہیں میں نہیں جانتا، حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے فرمایا کہ ہماری مسجد سے نکل جاؤ، آئندہ کبھی یہاں وعظ نہ کہو۔

قرآن و سنت میں نسخ کے وجود و وقوع کے متعلق صحابہؓ و تابعینؒ کے اتنے آثار و اقوال موجود ہیں جنکو نقل کرنا مشکل ہے، تفسیر ابن جریر، ابن کثیر، درمنثور وغیرہ میں اسانید قویہ صحیحہ کے ساتھ بھی بہت سی روایات مذکور ہیں، اور روایاتِ ضعیفہ کا تو شمار نہیں۔

اسی لئے امت میں یہ مسئلہ ہمیشہ اجماعی رہا ہے، صرف ابومسلم اصفہانی اور چند معتزلہ نے وقوعِ نسخ کا انکار کیا ہے، جن پر امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں شرح و بسط کے ساتھ رد کیا ہے۔

نسخ کے مفہوم میں متقدمین و متاخرین کی اصطلاحوں میں فرق

چونکہ نسخ کے اصطلاحی معنی تبدیلِ حکم کے ہیں، اور یہ تبدیلی جس طرح ایک حکم کو بالکلیہ منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم لانے میں ہے جیسے بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کو قبلہ بنا دینا، اسی طرح کسی مطلق یا عام حکم میں کسی قید و شرط کو بڑھا دینا بھی ایک قسم کی تبدیلی ہے، اسلافِ امت نے نسخ کو اسی عام معنی میں استعمال فرمایا ہے، جس میں کسی حکم کی پوری تبدیلی بھی داخل ہے، اور جزوی تبدیلی قید و شرط یا استثناء وغیرہ کی بھی اس میں شامل ہے، اسی لئے متقدمین حضرات کے نزدیک قرآن میں آیات منسوخہ پانسو تک شمار کی گئی ہیں۔

حضرات متاخرین نے صرف اُس تبدیلی کا نام نسخ رکھا ہے، جس کی پہلے حکم کے ساتھ کسی طرح تطبیق نہ ہو سکے، ظاہر ہے کہ اس اصطلاح کے مطابق آیات منسوخہ کی تعداد بہت گھٹ جائے گی، اسی کا لازمی اثر یہ تھا کہ متقدمین نے تقریباً پانسو آیات قرآنی میں نسخ ثابت کیا تھا، جس میں معمولی سی تبدیلِ قید و شرط یا استثناء وغیرہ کو بھی شامل کیا تھا اور حضرات متاخرین میں علامہ سیوطیؒ نے صرف بیس آیتوں کو منسوخ قرار دیا، ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان میں بھی تطبیق کی صورت پیدا کر کے صرف پانچ آیتوں کو منسوخ فرمایا ہے، جن میں کوئی تطبیق بغیر تاویل بعید کے نہیں ہو سکتی، یہ امر اس لحاظ سے مستحسن ہو کہ احکام میں اصل بقاء حکم ہے، نسخ خلافِ اصل ہو، اس لئے جہاں آیت کے معمول بہا ہونے کی کوئی توجیہ ہو سکتی ہے، اس میں بلا ضرورت نسخ ماننا درست نہیں۔

لیکن اس تقلیل کا یہ منشاء ہرگز نہیں ہو سکتا کہ مسئلۂ نسخ اسلام یا قرآن پر کوئی عیب تھا جس کے ازالہ کی کوشش چودہ سو برس تک چلتی رہی، آخری انکشاف حضرت شاہ ولی اللہؒ کا ہوا،

جس میں گھٹتے گھٹتے پانچ رہ گئی، اور اب اس کا انتظار ہے کہ کوئی جدید محقق ان پانچ کا بھی خاتمہ کر کے بالکل صفر تک پہنچا دے۔

مسئلۂ نسخ کی تحقیق میں ایسا رخ اختیار کرنا نہ اسلام اور قرآن کی کوئی صحیح خدمت ہے اور نہ ایسا کرنے سے صحابہؓ و تابعینؒ اور پھر چودہ سو برس کے علما رمتقدمین ومتاخرین کے مقالات و تحقیقات کو دھویا جا سکتا ہے، اور نہ مخالفین کی زبانِ طعن اس سے بند ہو سکتی ہے، بلکہ اس زمانے کے ملحدین کے ہاتھ میں یہ ہتھیار دینا ہے کہ یہ بھی ہو سکتا ہے، کہ چودہ سو برس تک تمام علماء امت کچھ کہتے رہے ہوں اور آخر میں اس کا غلط ہونا ثابت ہو جائے، معاذ اللہ! اگر یہ دروازہ کھلے گا تو قرآن اور شریعت سے امن اُٹھ جائے گا، اس کی کیا ضمانت ہے کہ آج جو کسی نے تحقیق کی وہ کل کو غلط ثابت نہیں ہو جائیگی۔

عصرِ حاضر میں بعض علماء کی ایسی تحریریں نظر سے گذری ہیں، جنھوں نے آیت مذکورہ مَا نَنْسَخْ کو متضمن معنے شرط پر ہونیکی وجہ سے ایک قضیۂ فرضیہ مثل لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ اور لَوْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ قرار دے کر صرف امکانِ نسخ کی دلیل بنایا اور وقوع سے انکار کیا، حالانکہ تضمن معنی شرط اور قضیۂ شرطیہ مجرّد لَو میں بڑا فرق ہے، اور یہ وہی استدلال ہے جو ابو مسلم اصفہانی اور معتزلہ پیش کرتے ہیں۔

لیکن صحابہؓ و تابعینؒ کی تفسیریں اور پوری امت کے تراجم دیکھنے کے بعد اس کو مدلولِ قرآنی کہنا کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہو سکتا، صحابہ کرامؓ نے اسی آیت سے وقوعِ نسخ پر استدلال کیا ہے، اور متعدد واقعات شمار کرائے ہیں۔ (ابن کثیر، ابن جریر وغیرہ)

یہی وجہ ہے کہ امت کے متقدمین ومتاخرین میں کسی نے بھی وقوعِ نسخ کا مطلقاً انکار نہیں کیا، خود حضرت شاہ ولی اللہؒ نے تطبیق کر کے تعداد تو کم بتلائی مگر مطلقاً وقوعِ نسخ کا انکار نہیں فرمایا، ان کے بعد بھی اکابر علماءِ دیوبند بلا استثنا سبھی وقوعِ نسخ کے قائل چلے آئے ہیں، جن میں سے متعدد حضرات کی مستقل یا جزوی تفسیریں بھی موجود ہیں، کسی نے بھی نسخ کے وقوع کا مطلقاً انکار نہیں کیا، واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم۔

اَوْ نُنْسِهَا، یہ مشہور قراءت کے مطابق اِنْسَاء اور نسیان سے ماخوذ ہے، معنی یہ ہیں کہ کبھی نسخِ آیت کی یہ صورت بھی ہوتی ہے کہ وہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام صحابہؓ کے ذہنوں سے بالکل بھلا دی جائے، جیسا کہ اس کی تفسیر میں کئی واقعے اس طرح کے حضرات مفسرین نے ذکر کئے ہیں، اس بھلا دینے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ آئندہ اس پر عمل کرانا مقصود نہیں۔

نسخ کے متعلق بقیہ احکام کی تفصیلات کی یہاں گنجائش نہیں، اس کا اصل محل اصولِ فقہ کی کتابیں ہیں۔

أَمْ تُرِيدُونَ أَنْ تَسْئَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوسَىٰ مِنْ

کیا تم مسلمان بھی چاہتے ہو کہ سوال کرو اپنے رسول سے جیسے سوال ہو چکے ہیں موسیٰ سے اس سے

قَبْلُ ۗ وَمَنْ يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ﴿١٠٨﴾

پہلے اور جو کوئی کفر لیوے بدلے ایمان کے تو وہ بہکا سیدھی راہ سے ۔

خلاصۂ تفسیر بعض یہود نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عناداً عرض کیا کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام پر ایک ہی دفعہ توراۃ نازل ہوئی اسی طرح آپؐ قرآن مجموعی طور پر لائیے، اس پر ارشاد ہوتا ہے کہ) ہاں کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسولؐ (وقت) سے (بیجا بیجا) درخواستیں کرو جیسا کہ اس کے قبل (تمہارے بزرگوں کی طرف سے حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) سے بھی (ایسی ایسی) درخواستیں کی جا چکی ہیں، (مثلاً خدا تعالیٰ کو علانیہ دیکھنے کی درخواست کی تھی، اور ایسی درخواستیں جن سے صرف رسولؐ پر اعتراض کرنا اور مصالح الہیہ میں مزاحمت کرنا ہی مقصود ہو، اور ایمان لانے کا پھر بھی ارادہ نہ ہو نری کفر کی باتیں ہیں، اور) جو شخص ایمان لانے کی بجائے کفر (کی باتیں) کرے، بلاشک وہ شخص راہ راست سے دور جا پڑا،

فائدہ:۔ اس درخواست کو بیجا اس لئے فرمایا کہ ہر فعل میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں اور مصلحتیں جدا جدا ہوتی ہیں، بندے کو اس میں تعیین طریق کا کیا حق ہے کہ وہ کہے کہ یہ بات اس طرح ہو یہ اس طرح ہو، اس کا کام تو بس یہ ہونا چاہئے ۔

زباں تازہ کردن باقرار تو ‏‏‏‏‏ نینگیختن علّت از کار تو

ترجمہ شیخ الہندؒ میں یہ خطاب مسلمانوں سے قرار دیا ہے اس کا حاصل مسلمانوں کو اس پر تنبیہ کرنا ہوگا کہ رسولؐ سے بے جا سوال نہ کیا کریں ۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ

دل چاہتا ہے بہت سے اہلِ کتاب کا کہ کسی طرح تم کو پھیر کر مسلمان ہوئے پیچھے کافر بنا دیں

كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ

بسبب اپنے دلی حسد کے بعد اس کے کہ ظاہر ہو چکا اُن پر

الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ

حق سو تم درگذر کرو اور خیال میں نہ لاؤ جب تک بھیجے اللہ اپنا حکم بیشک اللہ

عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ وَمَا

ہر چیز پر قادر ہے ۔ اور قائم رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ اور جو کچھ

تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

آگے بھیجدو گے اپنے واسطے بھلائی پاؤ گے اس کو اللہ کے پاس ، بے شک اللہ

بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾

جو کچھ تم کرتے ہو سب دیکھتا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

(بعض یہود شب و روز مختلف تدبیروں سے دوستی اور خیر خواہی کے پیرایہ میں مسلمانوں کو اسلام سے پھیرنے کی کوشش کیا کرتے تھے، اور باوجود ناکامی کے اپنی دُھن سے باز نہ آتے تھے، حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس پر متنبہ فرمادیا کہ) ان اہلِ کتاب (یعنی یہود) میں سے بہتیرے دل سے یہ چاہتے ہیں کہ تم کو تمہارے ایمان لائے پیچھے پھیر کا فر کر ڈالیں، (اور یہ چاہنا کچھ خیر خواہی سے نہیں جیسا کہ وہ اظہار کرتے ہیں، بلکہ) محض حسد کی وجہ سے جو کہ (تمھاری جانب سے کسی امر کے سبب پیدا نہیں ہوا، بلکہ) خود ان کے دلوں ہی سے (جوش مارتا) ہے، (اور یہ بھی نہیں کہ ان کو حق واضح نہ ہوا ہو، بلکہ) حق واضح ہوئے پیچھے (یہ حالت ہے، اب اس پر مسلمانوں کو ان پر غصہ آنے کا محل تھا، اس لئے ارشاد ہوتا ہے کہ) خیر (اب تو) معاف کرو اور درگذر کرو جب تک حق تعالیٰ (اس معاملہ کے متعلق) اپنا حکم (قانون جدید) بھیجیں (اشارۃً بتلادیا کہ ان کی شرارتوں کا علاج قانونِ انتظامِ امن عام یعنی قتال وجزیہ سے ہم جلد کرنے والے ہیں، اس پر مسلمانوں کو اپنا ضعف اور ان کی قوت دیکھکر اس قانون کے اجراء کے متعلق تعجب ہوسکتا تھا، اس لئے ارشاد ہوتا ہے کہ تم تعجب کیوں کرتے ہو) اللہ تعالیٰ ہر چیز پر (خواہ وہ معمولی ہو خواہ عجیب ہو) قادر ہیں، اور (سرِدست صرف) نمازیں پابندی سے پڑھے جاؤ اور (جن پر زکوٰۃ فرض ہے) زکوٰۃ دیئے جاؤ، (اور جب وہ قانون آجائے گا ان اعمالِ صالحہ کے ساتھ اس کا بھی اضافہ کرلینا) اور (یہ نہ سمجھو کہ جب تک جہاد کا حکم نہ آوے صرف نماز روزہ سے کچھ ثواب میں کمی رہے گی، نہیں، بلکہ) جو نیک کام بھی اپنی بھلائی کے واسطے جمع کرتے رہو گے، حق تعالےٰ کے پاس (پہنچکر) اس کو (پورا پورا مع صلہ کے) پالو گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تمھارے سب کئے ہوئے کاموں کی دیکھ بھال کر رہے ہیں، (ان میں کا ایک ذرہ بھی ضائع نہ ہونے پائے گا)

فائدہ: اُس وقت کی حالت کا یہی مقتضا تھا، پھر حق تعالیٰ نے اس وعدے کو پورا فرمایا

اور جہاد کی آیات نازل ہوئیں، جس کے بعد یہود کے ساتھ بھی وہ قانون برتا گیا، اور ناشائستہ لوگوں کے ساتھ حسب حیثیت ان کے فساد کے بدلے قتل یا جلا وطنی یا جزیہ پر عملدرآمد کیا گیا۔

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ

اور کہتے ہیں کہ ہرگز نہ جاویں گے جنت میں مگر جو ہوں گے یہودی یا نصرانی،

تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿١١١﴾

یہ آرزوئیں باندھ لی ہیں انھوں نے، کہہ دے لے آؤ سند اپنی اگر تم سچے ہو،

بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ

کیوں نہیں جس نے تابع کردیا منہ اپنا اللہ کے اور وہ نیک کام کرنیوالا ہو تو اسی کیلئے ہے ثواب اسکا اپنے رب کے پاس

۱۳ ع ۹ ۱۳ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١١٢﴾ وَقَالَتِ الْيَهُودُ

اور نہ ڈر ہے اُن پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے، اور یہود تو کہتے ہیں کہ

لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ

نصاریٰ نہیں کسی راہ پر اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود نہیں کسی راہ

عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ ۗ كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ

پر باوجودیکہ سب پڑھتے ہیں کتاب اسی طرح کہا ان لوگوں نے جو جاہل ہیں

مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا

انہی کی سی بات اب اللہ حکم کرے گا ان میں قیامت کے دن جس بات میں

فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١١٣﴾

جھگڑتے تھے۔

خلاصۂ تفسیر

اور یہود نصاریٰ (یوں) کہتے ہیں کہ بہشت میں ہرگز کوئی نہ جانے پاویگا بجز ان لوگوں کے جو یہودی ہوں (یہ تو یہود کا قول ہے) یا ان لوگوں کے جو نصرانی ہوں (یہ نصاریٰ کا قول ہے، حق تعالیٰ اُن کی تردید فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ) یہ (خالی) دل بہلانے کی باتیں ہیں (اور حقیقت کچھ بھی نہیں) آپ (ان سے یہ تو) کہئے کہ (اچھا) اپنی دلیل لاؤ

اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو، (سو وہ تو کیا دلیل لاویں گے، کیونکہ کوئی دلیل ہے ہی نہیں، اب ہم اس کے خلاف پہلے تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ) ضرور دوسرے لوگ (بھی جنت میں) جاویں گے (پھر اس پر دلیل لاتے ہیں کہ ہمارا قانون جو باتفاق سماوی ملتوں کے ماننے والوں کے پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے یہ ہے کہ) جو کوئی شخص بھی اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے (یعنی اعمال و عقائد میں فرمانبرداری اختیار کرے) اور (اس کے ساتھ) وہ مخلص بھی ہو (کہ فرمانبرداری دلی طور پر اختیار کی ہو محض مصلحت سے ظاہرداری نہ ہو) تو ایسے شخص کو اس (کی فرمانبرداری) کا عوض ملتا ہے پروردگار کے پاس پہنچکر، اور ایسے لوگوں پر (قیامت میں) نہ کوئی اندیشہ (ناک واقعہ پڑنے والا) ہے، اور نہ ایسے لوگ (اس روز) مغموم ہونے والے ہیں، (کیونکہ فرشتے ان کو بشارتیں سُنا کر بے فکر کر دینگے)

حاصل استدلال کا یہ ہوا کہ جب یہ قانون مسلّم ہے تو اب صرف یہ دیکھ لو کہ یہ بات کس پر صادق آتی ہے؟ سو ظاہر ہے کہ کسی حکم سابق کے منسوخ ہو جانے کے بعد اس پر عمل کرنے والا کسی بھی طور پر فرمانبردار نہیں کہلا سکتا، لہٰذا یہود و نصاریٰ فرمانبردار نہ ہوئے، بلکہ حکم ثانی پر عمل کرنا فرمانبرداری سمجھی جائے گی، اور یہ شان مسلمانوں کی ہے، کہ نبوّت و شریعتِ محمدؐیہ کو قبول کر لیا، چنانچہ یہی جنت میں داخل ہونے والے شمار ہوئے۔

اور مخلصین کی قید سے منافقین نکل گئے (کیونکہ وہ بھی شرعاً کفار ہی میں داخل اور مستحق جہنم ہیں)

اور (ایک بار کچھ یہودی اور کچھ نصرانی جمع ہو کر مذہبی مباحثہ کرنے لگے، تو یہود تو اپنے عقیدہ کیموافق نصاریٰ کے دین کو باطل بتاتے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور انجیل کے کتاب اللہ ہونے کا انکار کرتے تھے، مگر نصاریٰ بھی ضد و تعصب میں آکر دینِ یہود کو بے اصل و باطل کہنے لگے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت اور توریت کے کتاب اللہ ہونے کا انکار کرنے لگے، اللہ تعالیٰ اس قصّہ کو نقل فرما کر بطور تردید فرماتے ہیں کہ) یہود کہنے لگے کہ نصاریٰ (کا مذہب) کسی بنیاد پر (قائم) نہیں (یعنی سرے سے غلط ہی) اور اسی طرح نصاریٰ کہنے لگے کہ یہود (کا مذہب) کسی بنیاد پر قائم نہیں، (یعنی سرے سے غلط ہی) حالانکہ یہ سب (فریقین کے لوگ آسمانی) کتابیں (بھی) پڑھتے (پڑھاتے) ہیں (یعنی یہودی توریت کو اور عیسائی انجیل کو پڑھتے اور دیکھتے ہیں اور دونوں کتابوں میں دونوں رسولوں اور دونوں کتابوں کی تصدیق موجود ہی، جو کہ دونوں مذہبوں کی اصل بنیاد ہی، گو منسوخ ہو جانے کی بنا پر قابل عمل نہ ہو یہ اور بات ہے)۔

اور اہلِ کتاب تو ایسے دعوے کرتے ہی تھے، ان کی دیکھا دیکھی مشرکین کو بھی جوش آیا اور اسی طرح سے یہ لوگ (بھی) جو کہ (محض) بے علم ہیں، ان (ہی اہلِ کتاب) کا سا قول دُھرانے لگے، (کہ ان یہود و نصاریٰ سب کا دین بے بنیاد ہے، حق پر بس ہم ہی ہیں) سو (یہاں سب اپنی اپنی ہانک لیں) اللہ تعالیٰ ان سب کے درمیان (عملی) فیصلہ کر دیں گے، قیامت کے دن ان تمام مقدمات میں جن میں

وہ باہم اختلاف کررہے تھے، (اور وہ عملی فیصلہ یہ ہوگا کہ اہلِ حق کو جنت میں اور اہلِ باطل کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا، عملی فیصلہ کی قید اس لئے لگائی کہ قولی اور برہانی فیصلہ تو عقلی او نقلی دلائل کے ذریعہ دنیا میں بھی ہوچکا ہے)۔

معارف و مسائل

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے باہمی اختلافات اور ایک دوسرے پر رَد کا ذکر فرما کر ان کی نادانی اور اس اختلاف کے مضر اثرات کا بیان، پھر اصل حقیقت کا اظہار فرمایا ہے، ان تمام واقعات میں مسلمانوں کے لئے بڑی اہم ہدایات ہیں جن کا بیان آگے آتا ہے۔

یہود و نصاریٰ دونوں نے دین کی اصل حقیقت کو فراموش کرکے مذہب کے نام پر ایک قومیت بنالی تھی، اور ان میں سے ہر ایک اپنی ہی قوم کے جنّتی اور مقبول ہونے، اور اپنے سوا تمام اقوامِ عالم کے دوزخی اور گمراہ ہونے کا معتقد تھا۔

اس نامعقول اختلاف کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرکین کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ عیسائیت بھی بے بنیاد اور یہودیت بھی بے اصل، حق و صحیح بس ہماری بُت پرستی ہے۔

حق تعالیٰ نے ان دونوں قوموں کی جہالت و گمراہی کے متعلق فرمایا کہ یہ دونوں قومیں جنّت میں جانے کے اصل سبب سے غافل ہیں، محض مذہب کے نام کی قومیت کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں حقیقت یہ ہو کہ مذہب یہود ہو یا نصاریٰ یا اسلام ان سب کی اصل رُوح دو چیزیں ہیں:

ایک یہ کہ بندہ دل و جان سے اپنے آپ کو خدا کے سپرد کردے، اس کی اطاعت و فرمانبرداری کو اپنا عقیدہ و مذہب سمجھے، چاہے یہ کسی مذہب میں حاصل ہو، حقیقتِ دین و مذہب کو فراموش کرکے یا پسِ پشت ڈال کر یہودی یا نصرانی قومیت کو اپنا مقصد بنالینا دین و مذہب سے ناواقفیت اور گمراہی ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ جنّت میں جانے کے لئے صرف یہ بھی کافی نہیں کہ کوئی آدمی اپنے دل سے خدا کی فرمانبرداری کا قصد تو درست کرلے، مگر اطاعت فرمانبرداری اور عبادت کے طریقے اپنے ذہن و خیال کے مطابق خود گھڑلے، بلکہ یہ ضروری ہے کہ عبادت و اطاعت اور امتثالِ امر کے طریقے بھی وہی اختیار کرے جو خدا تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کے ذریعے بتائے اور متعین کئے ہوں۔

پہلی بات بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ الخ کے ذریعے اور دوسری وَھُوَ مُحْسِنٌ الخ کے ذریعے واضح کی گئی ہو، جس سے معلوم ہوا کہ نجاتِ اخروی اور دخولِ جنّت کے لئے صرف قصدِ اطاعت کافی نہیں، بلکہ حُسنِ عمل بھی ضروری ہے، اور حُسنِ عمل کا مصداق وہی تعلیم و طریقہ ہے جو قرآن اور سنت رسول خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہو۔

نسلی مسلمان ہو یا یہودی و نصرانی، اللہ کے یہاں اسکی کوئی قیمت نہیں اصل چیز ایمان اور عمل صالح ہے	جو شخص ان بنیادی اصولوں میں سے کسی بھی اصول کو چھوڑ دے، خواہ وہ یہودی ہو یا نصرانی یا مسلمان

اور پھر محض نام کی قومیت کے زعم میں اپنے آپ کو جنّت کا ٹھیکہ دار سمجھ لے تو یہ صرف اس کی خود فریبی ہے، جس کا حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی بھی ان ناموں کا سہارا لے کر قریب نہیں ہو سکتا، نہ مقبول بن سکتا ہے، جب تک اس میں ایمان و عمل صالح کی روح موجود نہ ہو۔

پھر اصول ایمان تو ہر رسولؑ اور ہر شریعت کے زمانے میں مشترک و یکساں رہے ہیں، البتہ عمل صالح و مقبول کی شکلیں کچھ ادلتی بدلتی رہی ہیں، تورآت کے زمانے میں عمل صالح وہ سمجھا گیا، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور توریت کی تعلیم کے مُطابق تھا، انجیلؔ کے دور میں عمل صالح یقیناً وہی عمل تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کی تعلیم سے مطابقت رکھتا تھا، اور اب قرآن کے زمانے میں وہی عمل عمل صالح کہے جانے کا مستحق ہوگا جو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان اور ان کی لائی ہوئی اللہ کی کتاب" قرآن مجید" کی ہدایت کے مطابق ہوگا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ یہود و نصاریٰ کے اس اختلاف کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ دونوں قومیں جہالت کی باتیں کر رہی ہیں، دونوں میں سے کوئی بھی جنّت کا ٹھیکہ دار نہیں اور نہ ہی دونوں کے مذہب بے بنیاد اور بے اصل ہیں، بلکہ دونوں مذہبوں کی صحیح بنیاد موجود ہے، غلط فہمی کا سبب اصلی یہ ہے کہ انھوں نے مذہب و ملت کی اصل رُوح یعنی عقائد و اعمال اور نظریات کو چھوڑ کر نسلی یا وطنی بنیاد پر کسی قوم کو یہود ٹھہرا لیا اور کسی کو نصرانی سمجھ لیا۔

جو یہود کی نسل سے ہو، یا یہود کے شہر میں بستا ہو، یا مردم شماری میں اپنے آپ کو یہودی بتاتا ہو اس کو یہود سمجھ لیا گیا، اسی طرح نصرانیوں کی تشخیص و تعیین کی گئی، حالانکہ اصولِ ایمان کو توڑ کر اور اعمالِ صالحہ سے مُنہ موڑ کر نہ کوئی یہودیٔ یہودی رہتا ہے، نہ نصرانی، نصرانی۔

قرآن کریم میں اس اختلاف اور اس فیصلہ کا ذکر مسلمانوں کو سُنانے اور متنبہ کرنے کے لئے ہے کہ کہیں وہ بھی اس قسم کی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں، کہ ہم تو پشتی مسلمان ہیں، ہر دفتر و رجسٹر میں ہمارا نام مسلمان کے خانے میں درج ہے، اور ہم زبان سے بھی اپنے کو مسلمان ہی کہتے ہیں، اس لئے جنّت کے نیز ان تمام انعامی وعدوں کے ہم ہی مستحق ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے مسلمانوں سے کئے گئے۔

اس فیصلہ سے اُن پر واضح ہو جانا چاہئے کہ کوئی شخص نہ محض دعوے سے حقیقی مسلمان بنتا ہے، نہ کہیں مُسلمان نام درج کرانے یا مُسلمان کی صلب سے، یا ان کے شہر میں پیدائش ہونے کی وجہ سے: بلکہ مُسلمان ہونے کے لئے اوّل اسلام ضروری ہے، اور اسلام کے معنی ہی اپنے آپ کو سپرد کرنے

اور سونپ دینے کے ہیں، دوسرے احسانِ عمل یعنی سنت کے مطابق عمل کو درست کرنا۔
لیکن قرآن کریم کی اس تنبیہ کے باوجود بہت سے مسلمان، اسی یہودی اور نصرانی غلطی کا شکار ہوگئے، کہ خدا اور رسولؐ اور آخرت و قیامت سے بالکل غافل رہ کر اپنا نسلی مسلمان ہونا مسلمان ہونے کے لئے کافی سمجھنے لگے، اور قرآن و حدیث میں جو وعدے فلاح دنیا و آخرت کے مسلمانوں سے کئے گئے ہیں اپنے آپ کو ان کا مستحق سمجھ کر ان کے پورے ہونے کا انتظار کرنے لگے، اور جب وہ پورے ہوتے نظر نہیں آتے تو قرآن و حدیث کے وعدوں میں شک کرنے لگے، اس کو نہیں دیکھتے کہ قرآن نے محض نسلی مسلمانوں سے کوئی وعدہ نہیں کیا، جب تک وہ اپنے تمام ارادوں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع نہ کردیں، اور ان کے بتلائے ہوئے طریقوں پر عمل صالح کے پابند نہ ہوں، یہی خلاصہ ہے آیت مذکورہ بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ؀ کا۔
آجکل پوری دنیا کے مسلمان طرح طرح کے مصائب و آفات کا شکار ہیں اس کو دیکھ کر بہت سے ناواقف لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید ان تمام آفات و مصائب کا سبب ہمارا اسلام ہی ہو، لیکن مذکورہ تحریر سے واضح ہوگیا، کہ اس کا اصلی سبب ہمارا اسلام نہیں بلکہ ترکِ اسلام ہے، کہ ہم نے اسلام کا صرف نام باقی رکھا ہے، نہ اس کے عقائد ہمارے اندر ہیں، نہ اخلاق، نہ اعمال، گویا ؏

وضع میں ہم ہیں نصاریٰ تو تمدن میں ہنود

پھر ہمیں کیا حق ہے کہ اسلام اور مسلم کے لئے کئے ہوئے وعدوں اور انعاموں کا ہم انتظار کریں۔
البتہ یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ ہم کچھ بھی سہی نام تو اسلام کا لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا تو ہیں، اور جو کفار کھلے طور پر اللہ و رسولؐ کی مخالفت کرتے ہیں اسلام کا نام لینا بھی پسند نہیں کرتے، وہ تو آج دنیا میں ہر طرح کی ترقی کر رہے ہیں، بڑی بڑی حکومتوں کے مالک بنے ہوئے ہیں، دنیا کی صنعتوں اور تجارتوں کے ٹھیکہ دار بنے ہوئے ہیں، اگر ہماری بدعملی کی ہمیں یہ سزا مل رہی ہے کہ ہم ہر جگہ پامال و پریشان ہیں تو کفار و فجار کو اس سے زیادہ سزا ملنی چاہئے لیکن اگر ذرا غور سے کام لیا جائے تو یہ شبہ خود بخود رفع ہوجائے گا۔
اوّل تو اس لئے کہ دوست اور دشمن کے ساتھ معاملہ یکساں نہیں ہوا کرتا، دوست کو قدم قدم اور بات بات پر ٹوکا جاتا ہے، اولاد اور شاگرد کو ذرا ذرا سی بات پر سزا دی جاتی ہے لیکن دشمن کے ساتھ یہ سلوک نہیں ہوتا، اس کو ڈھیل دی جاتی ہے، اور وقت آنے پر دفعۃً پکڑ لیا جاتا ہے۔
مسلمان جب تک ایمان و اسلام کا نام لیتا ہے، اور اللہ کی عظمت و محبت کا دم بھرتا ہو،

وہ دوستوں کی فہرست میں داخل ہے، اُس کے بُرے اعمال کی سزا عموماً دنیا ہی میں دیدی جاتی ہے، تاکہ آخرت کا بار ہلکا ہو جائے، بخلاف کافر کے کہ اس پر باغیوں اور دشمنوں کا قانون جاری ہے، دنیا کی ہلکی ہلکی سزاؤں سے ان کا بارِ عذاب ہلکا نہیں کیا جاتا، اُن کو یک لخت عذاب میں پکڑا جائے گا، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی کا یہی مطلب ہو کہ "دُنیا مؤمن کے لئے قید خانہ اور کافر کے لئے جنت ہے"۔

دوسری اہم بات مسلمانوں کے تنزل اور پریشانی اور کفار کی ترقی و آرام کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر عمل کا جداگانہ خاصہ رکھا ہے، ایک عمل کرنے سے دوسرے عمل کے خواص حاصل نہیں ہو سکتے، مثلاً تجارت کا خاصہ ہر مال میں زیادتی، دوا کا خاصہ ہے بدن کی صحت، اب اگر کوئی شخص تجارت میں تو دن رات لگا رہے بیماری اور اس کے علاج کی طرف توجہ نہ دے تو محض تجارت کے سبب وہ بیماری سے نجات نہیں پا سکتا، اسی طرح دوا دارو کا استعمال کر کے تجارت کا خاصہ یعنی مال کی زیادتی حاصل نہیں کر سکتا، کفار کی دنیوی ترقی اور مال و دولت کی فراوانی ان کے کفر کا نتیجہ نہیں، جیسے مسلمان کا افلاس و پریشانی اسلام کا نتیجہ نہیں، بلکہ کفار نے جب آخرت کی فکر چھوڑ دی اور پوری طرح دنیا کے مال و دولت اور عیش و آرام کی فکر میں لگ گئے، تجارت، صنعت، زراعت اور حکومت و سیاست کے مفید راستوں کو اختیار کیا، مضر طریقوں سے بچے، تو دنیا میں ترقی حاصل کر لی، اگر وہ بھی ہماری طرح صرف اپنے مذہب کا نام لے کر بیٹھ جاتے اور دنیوی ترقی کے لئے اس کے اصول کے مطابق جدّ وجہد نہ کرتے تو ان کا کفر اُن کو مال و دولت یا حکومت کا مالک نہ بنا دیتا، پھر ہم یہ کیسے سمجھ لیں کہ ہمارا اسلام اور وہ بھی صرف نام کا، ہماری ساری فتوحات کے دروازے کھول دیگا؟ اسلام و ایمان اگر بالکل صحیح اصول پر بھی ہو تو اس کا اصلی خاصہ اور نتیجہ نجاتِ آخرت اور جنت کی دائمی راحت ہو، دنیا میں مال و دولت کی فراوانی یا عیش و آرام کی وسعت اس کے نتیجہ میں حاصل ہونا ضروری نہیں جبتک اس کے لئے اس کے مناسب جد وجہد نہ کی جائے۔

اور یہ بات تجربہ سے ثابت ہو کہ جہاں کہیں اور جب کوئی مسلمان تجارت و صنعت، حکومت و سیاست کے اصولِ صحیحہ کو سیکھ کر ان پر عمل پیرا ہو جاتا ہے تو وہ بھی ان دنیوی ثمرات و نتائج سے محروم نہیں رہتا جو کسی کافر کو حاصل ہو رہے ہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ دنیا میں ہمارا افلاس و احتیاج اور مصائب و آفات ہمارے اسلام کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک طرف اسلامی اخلاق و اعمال چھوڑنے کا اور دوسری طرف ان تمام کاموں سے مُنہ موڑنے کا نتیجہ ہے، جن کے عمل میں لانے سے مال و دولت میں زیادتی ہوا کرتی ہے۔

افسوس ہے کہ ہمیں جب یورپ والوں کے ساتھ اختلاط کا اتفاق پیش آیا تو ہم نے ان سے

صرف ان کا کفر اور آخرت سے غفلت اور بے حیائی و بداخلاقی تو سب سیکھ لی، لیکن ان کے وہ اعمال نہ سیکھے جن کی وجہ سے وہ دنیا میں کامیاب نظر آتے ہیں، جس مقصد کے لئے کھڑے ہوں اس کے پیچھے اَن تھک کوشش، معاملہ کی سچائی، بات کی سچائی اور دنیا میں اثر و رسوخ حاصل کرنے کے نئے نئے طریقے جو درحقیقت اسلام ہی کی اصلی تعلیمات ہیں ہم نے ان کو دیکھ کر بھی اس کی نقل اتارنے کی کوشش نہ کی تو یہ قصور ہمارے اسلام کا ہے یا ہمارا اپنا قصور ہے۔

الغرض قرآن کی ان آیات نے واضح کر دیا کہ محض نسلی طور پر اسلام کا نام رکھ لینا کسی نتیجہ پر نہیں پہنچا سکتا، جب تک ایمان اور عملِ صالح کو مکمل طور پر اختیار نہ کیا جائے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَ

اور اس سے بڑا ظالم کون جس نے منع کیا اللہ کی مسجدوں میں کہ لیا جاوے وہاں نام اس کا اور

سَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ۬ؕ

کوشش کی ان کے اجاڑنے میں، ایسوں کو لائق نہیں کہ داخل ہوں اُن میں مگر ڈرتے ہوئے

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَلِلّٰهِ

ان کے لئے دنیا میں ذلت ہے اور اُن کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے، اور اللہ ہی کا ہے

الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

مشرق اور مغرب سو جس طرف تم منہ کرو وہاں ہی متوجہ ہے اللہ بیشک اللہ

وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

بے انتہا بخشش کرنیوالا سب کچھ جاننے والا ہے

خلاصۂ تفسیر

یہود تو قبلہ کا حکم بدلنے کے وقت طرح طرح کے اعتراض کر کے کم سمجھ لوگوں کے دلوں میں شبہات پیدا کرتے تھے، اگر وہ شبہات عام طور پر قلوب میں اثر کرتے تو اُن کا لازمی نتیجہ انکارِ رسالت اور ترکِ نماز نکلتا، اور ترکِ نماز سے مسجد کی ویرانی لازم ہے، تو گویا یہ یہودی اس طور سے ترکِ نماز اور ویرانیٔ مساجد خصوصاً مسجدِ نبویؐ میں بھی کوشاں تھے، اور روم کے بعض سلاطین جو نصاریٰ کے اسلاف تھے، اور نصاریٰ ان کے افعال کا انکار بھی نہ کرتے تھے، گو وہ نصرانی نہ ہوں، کسی زمانے میں یہود شام پر چڑھ آئے تھے، قتل و قتال بھی ہوا، اور اس وقت بعض جہلاء کے ہاتھ سے مسجدِ بیت المقدس کی بے حرمتی بھی ہوئی، اور بدامنی کی وجہ سے اس میں

نماز وغیرہ کا اہتمام بھی نہ ہوا، اس طور پر نصاریٰ کے اسلاف ترکِ نماز اور ویرانیٔ مسجد کے بانی ہوئے، اور نصاریٰ پر بوجہ عدمِ انکار اس کا الزام دیا گیا، اس بادشاہ کا نام طیطس تھا، اور نصاریٰ کو یہ قصہ اس لئے ناگوار نہ تھا کہ اس میں یہودیوں کی تذلیل ہوئی تھی، اور یہ یہود سے عداوت رکھتے تھے۔ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ سے پہلے جب مکہ معظمہ میں داخل ہو کر مسجد الحرام کا طواف اور نماز ادا فرمانی چاہی تو مشرکینِ مکہ نے آپؐ کو نہ جانے دیا، یہاں تک کہ آپؐ اس سال واپس تشریف لے آئے، تو اس طرح یہ مشرکین بھی مسجدِ حرام کی ویرانی میں کوشاں ہوئے، اس لئے حق تعالیٰ نے صیغۂ عموم سے اس کی قباحت اور برائی ظاہر فرمائی، یعنی) اور اس شخص سے زیادہ اور کون ظالم ہوگا جو خدا تعالیٰ کی مسجدوں میں (جس میں مکہ کی مسجد حرام، مدینہ کی مسجد، بیت المقدس کی مسجد اور سب مسجدیں آگئیں) ان کا ذکر (اور عبادت) کئے جانے سے بندش کرے، اور ان (مساجد) کے ویران (اور معطل) ہونے (کے بارے) میں کوشش کرے، ان لوگوں کو تو کبھی بے ہیبت (اور بیباک) ہو کر ان (مساجد) میں قدم بھی نہ رکھنا چاہئے تھا، (بلکہ جب جاتے تو نہایت عظمت و حرمت و ادب سے جاتے جب بیباک ہو کر اندر جانے تک کا استحقاق نہیں تو اس کی ہتکِ حرمت کا حق کب حاصل ہے، اسی کو ظلم فرمایا گیا) ان لوگوں کو دنیا میں بھی رسوائی (نصیب) ہوگی، اور ان کو آخرت میں بھی سزائے عظیم ہوگی۔

(یہود نے تبدیلِ قبلہ کے حکم پر اعتراض کیا تھا کہ مسلمان اس جہت سے دوسری جہت کی طرف کیوں پھر گئے، اس کا جواب حق تعالیٰ دیتے ہوئے فرماتے ہیں، یعنی) اور اللہ ہی کی مملوک ہیں (سب جہتیں) مشرق بھی اور مغرب بھی (اور وہ اس کا مکان نہیں)

پس جب وہ مالک ہیں جس جہت کو چاہیں قبلہ مقرر کردیں، کیونکہ حکمت تعیینِ قبلہ میں مثلاً عابدین کا اتفاق ہیئت اور اجتماعِ خاطر ہے، اور یہ حکمت ہر جہت سے حاصل ہو سکتی ہے، جس کا حکم دیدیں وہی متعین ہو جائے گی، ہاں البتہ اگر معبود کی ذات نعوذ باللہ کسی جہت خاص کے ساتھ مقید ہوتی تو ضرورت کی وجہ سے اسی جہت میں قبلۂ عبادت بننے کا انحصار زیبا تھا، لیکن وہ ذات پاک کسی جہت کے ساتھ مقید و محدود نہیں جب یہ بات ہے) تو تم لوگ جس طرف بھی منہ کرو اُدھر (ہی) اللہ تعالیٰ (کی ذات پاک) کا رُخ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ (خود تمام جہات اور اشیاء کو) محیط ہیں (جس طرح کا احاطہ اُن کی شان کے لائق ہے، لیکن باوجود محیط و غیر محدود ہونے کے پھر بھی جہتِ عبادت کو متعین اس لئے فرمایا کہ وہ) کامل العلم ہیں، (کہ ہر شے کے مصالح کو خوب جانتے ہیں، چونکہ ان کے علم میں یہ تعیین بعض مصالح سے تھی، اس لئے اس کا حکم دیدیا)

فوائد از بیان القرآن | ۱۔ ویرانیٔ مساجد میں کوشاں گروہ کی دنیا میں تو یہ رسوائی ہوئی کہ یہ ساری قومیں اسلامی سلطنت کی رعایا اور باج گذار ہوئیں، اور عذابِ آخرت تو کافر ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے ہی، اور ویرانیٔ مساجد میں کوشش کے سبب یہ عذاب اور بھی سخت و شدید ہو جائے گا، اور اوپر کی آیت میں جو ان تینوں فرقوں کے حق پر ہونے کا دعویٰ مذکور ہوا تھا اس قصہ سے اسکی تردید کا ایک گونہ مفہوم بھی نکل آیا، کہ ایسے ایسے افعال کر کے صاحبِ حق ہونے کا دعویٰ بڑے شرم کی بات ہے۔

۲۔ تعیینِ قبلہ کی جو ایک حکمت بطورِ مثال اوپر بیان کی گئی، اس سے بعض مخالفینِ اسلام کا یہ اعتراض کہ "مسلمان کعبہ پرست ہیں" بالکل اُٹھ گیا۔

جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ عبادت و پرستش تو خدا تعالیٰ کی ہے، لیکن عبادت کے وقت یکسوئیٔ قلب کی ضرورت ہی، نیز عابدین کی ہیئت اجتماعیہ کو بھی اس یکسوئی میں دخل ہی، چنانچہ یہ دونوں باتیں تجربہ و مشاہدہ سے ثابت ہیں، اس لئے اس یکسوئی اور اجتماع ہیئت حاصل کرنے کے لئے تعیینِ جہت مشروع ہوئی، لہٰذا اس اعتراض و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

اور اگر اس پر کوئی اپنی برأت کے لئے یہ دعویٰ کرے کہ ہم بھی بتوں کو سامنے اسی قصد و غرض سے رکھتے ہیں، تو اوّل تو اپنی برأت کے دعوے سے مسلمانوں پر مذکورہ اعتراض نہیں ٹوٹتا، وہ بدستور مرتفع رہا، جو اس مقام پر مقصودِ اصلی ہے۔

ثانیاً، عام مسلمانوں اور عام کافروں کی حالت تفتیش کرنے سے عدمِ پرستش کے دعوے میں مسلمانوں کا راست گو ہونا اور دوسروں کا دروغ گو ہونا ہر وقت ہر شخص کو معلوم ہو سکتا ہے۔

تیسرے، علیٰ سبیل التنزّل کہا جاتا ہے کہ اگر اس دعوے کی سچائی مان بھی لی جائے پھر بھی اس تعیین اور تقیید کے لئے کسی غیر منسوخ شریعت کا حکم پیش کرنا لازم ہے، اور یہ بجز اہلِ اسلام کے دوسروں کے پاس مفقود ہے۔

اور ترجمہ و تفسیر کے ضمن میں بیانِ حکمت کے لئے جو لفظ مثلاً اضافہ کیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ احکامِ خداوندی کی حکمتیں اور مصلحتیں انحصار اور استیعاب کے ساتھ کسی کے ادراک میں نہیں آسکتیں، سو اس حکم میں بھی ہزاروں حکمتیں ہوں گی، ایک دو کے سمجھ جانے سے ان میں انحصار اور دوسروں کی نفی نہیں ہو سکتی۔

۳۔ اور یہ جو فرمایا ہے کہ "ادھر ہی اللہ کا رخ ہے" اور اسی طرح یہ جو فرمایا ہے کہ "وہ محیط ہے" اور ایسے ہی جو مضامین ہوں ان سب میں زیادہ کھود کرید نہ کرنی چاہئے، کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کا پورا ادراک کسی بندہ سے ممکن نہیں اسی طرح اس کی صفات کی حقیقت بھی فہم سے خارج ہے،

اجمالاً ان سب پر ایمان لے آوے، اس سے زیادہ کا انسان مکلف نہیں۔

عنقا شکار کس نشود دام باز چین
کا ینجا ہمیشہ باد بدست است دام را

معارف و مسائل

ان دو آیتوں میں دو اہم مسئلوں کا بیان ہے، پہلی آیت ایک خاص واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ زمانۂ اسلام سے پہلے جب یہودیوں نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو قتل کر ڈالا تو روم کے نصاریٰ نے ان سے انتقام لینے کی خاطر عراق کے ایک مجوسی بادشاہ کے ساتھ مل کر اپنے بادشاہ طیطوس کی سرکردگی میں شام کے بنی اسرائیل پر حملہ کر کے ان کو قتل و غارت کیا اور تورات کے نسخے جلا ڈالے، بیت المقدس میں نجاسات اور خنزیر ڈال دیئے، اس کی عمارت کو خراب و ویران کر دیا، بنی اسرائیل کی قوت و شوکت کو بالکل پامال اور ختم کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک تک بیت المقدس اسی طرح ویران و منہدم پڑا تھا۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد میں جب شام و عراق فتح ہوئے تو آپ کے حکم سے بیت المقدس کی دوبارہ تعمیر کرائی گئی، زمانۂ دراز تک پورا ملکِ شام و بیت المقدس مسلمانوں کے قبضہ میں رہا، پھر ایک عرصہ کے بعد بیت المقدس مسلمانوں کے قبضہ سے نکل گیا، اور تقریباً نوّے سال یورپ کے عیسائیوں کا اس پر قبضہ رہا، تا آنکہ چھٹی صدی ہجری میں سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے پھر اس کو فتح کیا۔

رومی نصاریٰ کی اس گستاخانہ حرکت پر کہ تورات کو جلایا اور بیت المقدس کو خراب و ویران کر کے اس کی بے حرمتی کی، یہ آیت نازل ہوئی۔

یہ قول مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا ہے، اور حضرت ابن زیدؓ وغیرہ دوسرے مفسرین نے آیت کا شانِ نزول یہ بتلایا ہے کہ جب مشرکینِ مکہ نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو واقعۂ حدیبیہ کے وقت مسجدِ حرام میں داخل ہونے اور طواف کرنے سے روک دیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

ابن جریرؒ نے پہلی روایت کو اور ابن کثیرؒ نے دوسری کو ترجیح دی ہے۔

لے بعض مفسرین نے اس مجوسی بادشاہ کا نام بخت نصر بتلایا اس سے معروف بخت نصر تو اس لئے مراد نہیں ہو سکتا کہ اس کا زمانہ حضرت یحییٰ علیہ السلام سے بہت پہلے ہے، یہ ممکن ہے کہ بعد میں کسی دوسرے بادشاہ کو بخت نصر ثانی کہنے لگے ہوں ۱۲
(محمد شفیع)

بہرحال آیت کا شانِ نزول تو مفسّرین کے نزدیک ان دونوں واقعوں میں سے کوئی خاص واقعہ ہے، مگر اس کا بیان عام لفظوں میں ایک مستقل ضابطہ اور قانون کے الفاظ میں فرمایا گیا ہے، تاکہ یہ حکم انہی نصاریٰ یا مشرکین وغیرہ کے لئے مخصوص نہ سمجھا جائے بلکہ تمام اقوامِ عالم کے لئے عام رہے، یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں خاص بیت المقدس کا نام لینے کے بجائے "مساجد اللہ" فرما کر تمام مساجد پر اس حکم کو عام کر دیا گیا، اور آیت کا مضمون یہ ہوگیا، کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی کسی مسجد میں لوگوں کو اللہ کا ذکر کرنے سے روکے، یا کوئی ایسا کام کرے جس سے مسجد ویران ہو جائے تو وہ بہت بڑا ظالم ہے۔

مَسَاجِدُ اللّٰہ کی عظمت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ان میں جو شخص داخل ہو ہیبت و عظمت اور خشوع و خضوع کے ساتھ داخل ہو، جیسے کسی شاہی دربار میں داخل ہوتے ہیں۔

اس آیت سے جو چند ضروری مسائل و احکام نکلے ان کی تفصیل یہ ہے:

اوّل یہ کہ دنیا کی تمام مساجد آدابِ مسجد کے لحاظ سے مساوی ہیں، جیسے بیت المقدس، مسجد حرام، یا مسجد نبوی کی بے حرمتی ظلمِ عظیم ہے، اسی طرح دوسری تمام مساجد کے متعلق بھی یہی حکم ہے، اگرچہ ان تینوں مساجد کی خاص بزرگی و عظمت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ مسجد حرام میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر اور مسجد نبوی و نیز بیت المقدس میں پچاس ہزار نمازوں کے برابر ملتا ہے، ان تینوں مساجد میں نماز پڑھنے کی خاطر دور دراز ملکوں سے سفر کر کے پہونچنا موجبِ ثوابِ عظیم اور باعثِ برکات ہے، بخلاف دوسری مساجد کے کہ ان تینوں کے علاوہ کسی دوسری مسجد میں نماز پڑھنے کو افضل جان کر اس کے لئے دور سے سفر کر کے آنے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ مسجد میں ذکر و نماز سے روکنے کی جتنی بھی صورتیں ہیں وہ سب ناجائز و حرام ہیں، ان میں سے ایک صورت تو یہ کھلی ہوئی ہے ہی کہ کسی کو مسجد میں جانے سے یا وہاں نماز و تلاوت سے صراحۃً روکا جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ مسجد میں شور و شغب کر کے یا اس کے قرب و جوار میں باجے گاجے بجا کر لوگوں کی نماز و ذکر وغیرہ میں خلل ڈالے، یہ بھی ذکر اللہ سے روکنے میں داخل ہے۔

اسی طرح اوقاتِ نماز میں جبکہ لوگ اپنی نوافل یا تسبیح و تلاوت وغیرہ میں مشغول ہوں، مسجد میں کوئی بلند آواز سے تلاوت یا ذکر بالجہر کرنے لگے، تو یہ بھی نمازیوں کی نماز و تسبیح میں خلل ڈالنے اور ایک حیثیت سے ذکر اللہ کو روکنے کی صورت ہے، اسی لئے حضرات فقہاء نے اس کو بھی ناجائز قرار دیا ہے، ہاں جب مسجد عام نمازیوں سے خالی ہو، اس وقت ذکر یا تلاوت جہر کا مضائقہ نہیں،

اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جس وقت لوگ نماز و تسبیح وغیرہ میں مشغول ہوں مسجد میں اپنے لئے سوال کرنا یا کسی دینی کام کے لئے چندہ کرنا بھی ایسے وقت ممنوع ہے۔

تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ مسجد کی ویرانی کی جتنی بھی صورتیں ہیں سب حرام ہیں، اس میں جس طرح کھلے طور پر مسجد کو منہدم اور ویران کرنا داخل ہے اسی طرح ایسے اسباب پیدا کرنا بھی اس میں داخل ہے جن کی وجہ سے مسجد ویران ہو جائے، اور مسجد کی ویرانی یہ ہے کہ وہاں نماز کے لئے لوگ نہ آئیں، یا کم ہو جائیں، کیونکہ مسجد کی تعمیر و آبادی دراصل در و دیوار یا ان کے نقش و نگار سے نہیں، بلکہ ان میں اللہ کا ذکر کرنے والوں سے ہے، اسی لئے قرآن شریف میں ایک جگہ ارشاد ہے:

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ (۹: ۱۸)	"یعنی اصل میں مسجد کی آبادی ان لوگوں سے ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائیں اور روز قیامت پر، اور نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈریں"

اسی لئے حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قربِ قیامت میں مسلمانوں کی مسجدیں بظاہر آباد اور مزین و خوب صورت ہوں گی، مگر حقیقتاً ویران ہوں گی کہ ان میں حاضر ہونے والے نمازی کم ہو جائیں گے۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ شرافت و انسانیت کے چھ کام ہیں، تین حضر کے اور تین سفر کے، حضر کے تین یہ ہیں: تلاوتِ قرآن کرنا، مسجدوں کو آباد کرنا، ایسے دوستوں کی جمعیت بنانا جو اللہ تعالیٰ اور دین کے کاموں میں امداد کریں، اور سفر کے تین کام یہ ہیں: اپنے توشہ سے غریب ساتھیوں پر خرچ کرنا، حسنِ خلق سے پیش آنا، اور رفقائے سفر کے ساتھ ہنسی خوشی، تفریح و خوش طبعی کا طرز عمل رکھنا، بشرطیکہ یہ خوش طبعی گناہ کی حد میں داخل نہ ہو جائے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد میں مسجدوں کے آباد کرنے کا مطلب یہی ہو کہ وہاں خشوع خضوع کے ساتھ حاضر بھی ہوں، اور وہاں حاضر ہو کر ذکر و تلاوت میں مشغول رہیں، اب اس کے مقابلہ میں مسجد کی ویرانی یہ ہو گی کہ وہاں نمازی نہ رہیں یا کم ہو جائیں، یا ایسے اسباب جمع ہوں جن سے خشوع و خضوع میں خلل آئے۔

اور اگر آیت کا شانِ نزول واقعۂ حدیبیہ اور مشرکینِ مکہ کا مسلمانوں کو مسجدِ حرام سے روکنا ہے تو اسی آیت سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ مساجد کی ویرانی صرف یہی نہیں کہ انھیں منہدم کر دیا جائے، بلکہ مساجد جس مقصد کے لئے بنائی گئی ہیں یعنی نماز اور ذکر اللہ، جب وہ نہ رہے یا کم ہو جائے تو مساجد ویران کہلائیں گی۔

تحویلِ قبلہ کی بحث دوسری آیت میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو تسلی دی گئی ہے کہ مشرکینِ مکہ نے اگرچہ آپؐ کو مکہ اور بیت اللہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا، اور مدینہ پہنچ کر ابتدائی زمانہ میں سولہ سترہ مہینہ تک آپؐ کو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا، لیکن اس میں آپؐ کا کوئی نقصان نہیں، نہ آپؐ کے لئے غمگین ہونے کی کوئی وجہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کسی خاص سمت میں نہیں وہ ہر جگہ ہے، اس کے لئے مشرق و مغرب یکساں ہیں، کعبہ کو قبلۂ نماز بنائیں، یا بیت المقدس کو، دونوں میں کوئی ذاتی خصوصیت نہیں، بلکہ امرِ الٰہی کی تعمیل ہی دونوں جگہ سببِ فضیلت ہے ؎

دادِ حق را قابلیّت شرط نیست
بلکہ شرطِ قابلیّت دادِ ہست

اس لئے جب کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم تھا اُس میں فضیلت تھی، اور جب بیت المقدس کا استقبال کرنے کا حکم ہو گیا تو اس میں فضیلت ہے، آپؐ دلگیر نہ ہوں، اللہ تعالیٰ کی توجہ دونوں حالتوں میں یکساں ہے، جبکہ بندہ اس کے حکم کی تعمیل کر رہا ہو۔

چند مہینوں کے لئے بیت المقدس کو قبلہ قرار دینے کا حکم دے کر عملاً اور آپؐ نے قولاً اس بات کو واضح کر دیا کہ کسی خاص مکان یا سمت کو قبلہ قرار دینا اس وجہ سے نہیں کہ معاذ اللہ خدا تعالیٰ اس مکان یا اس سمت میں ہے، دوسری جگہ میں نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ ہر سمت میں یکساں توجہ کے ساتھ موجود ہے، کسی خاص سمت کو قبلہ عالم قرار دینا، دوسری حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کی توجہ کسی خاص سمت یا جگہ کے ساتھ مقید نہیں تو اب عمل کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ ہر شخص کو اختیار دیدیا جائے کہ جس طرف چاہے رُخ کر کے نماز پڑھے، دوسرے یہ کہ سب کے لئے کوئی خاص سمت و جہت معیّن کر دی جائے، ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں ایک تشتت و افتراق کا منظر سامنے آئے گا، کہ دس آدمی نماز پڑھ رہے ہیں، اور ہر ایک کا رُخ الگ الگ، اور ہر ایک کا قبلہ جدا جدا ہے، اور دوسری صورت میں تنظیم و اتحاد کا عملی سبق ملتا ہے، ان حکمتوں کی بناء پر سارے عالم کا قبلہ ایک ہی چیز کو بنانا زیادہ مناسب ہے، اب وہ بیت المقدس ہو یا کعبہ، دونوں مقدس اور متبرک مقامات ہیں۔ ہر قوم اور ہر زمانہ کے مناسب اللہ تعالیٰ کی طرف سے احکام آتے ہیں، ایک زمانے تک بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کی دلی خواہش کے مطابق اس حکم کو منسوخ کر کے کعبہ کو قبلۂ عالم بنا دیا گیا، ارشاد ہوا:

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا ص

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ (۲: ۱۴۴)

ترجمہ:۔ "(یعنی کعبہ کو قبلہ بنا دینے کی دلی رغبت کی وجہ سے) بار بار آسمان کی طرف مُنہ اٹھا کر دیکھتے ہیں (کہ شاید فرشتہ حکم لے آئے) ہم یہ سب دیکھ رہے ہیں، اس لئے اب ہم آپؐ کو اسی قبلہ کی طرف متوجہ کر دیں گے جس کو آپؐ چاہتے ہیں، اس لئے اب آپؐ اپنا چہرہ نماز میں مسجد حرام کی طرف کیا کریں، اور یہ حکم کچھ آپؐ ہی کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ تمام امت کے لئے یہی حکم دیدیا گیا، کہ تم جہاں کہیں بھی موجود ہو، یہاں تک کہ خود بیت المقدس کے اندر بھی ہو، تو نماز میں اپنا رخ مسجد حرام کی طرف کیا کرو۔"

الغرض آیت مذکورہ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ نے استقبالِ قبلہ کی پوری حقیقت کو واضح کر دیا کہ اس کا منشاء بیت اللہ یا بیت المقدس کی معاذ اللہ پرستش نہیں، اور نہ اُن دونوں مکانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک مخصوص ہے، بلکہ اس کی ذات سارے عالم پر محیط اور ہر سمت میں اس کی توجہ یکساں ہے، پھر جو کسی خاص مکان یا سمت کو مخصوص کیا جاتا ہے اس میں دوسری حکمتیں ہیں۔

آیتِ مذکورہ کے اس مضمون کو واضح اور دل نشین کرنے ہی کے لئے شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کو ہجرت کے اوائل میں سولہ سترہ مہینہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم دے کر عملی طور پر بتلا دیا گیا کہ ہماری توجہ ہر طرف ہے، اور نوافل میں اس حکم کو ہمیشہ کے لئے جاری رکھا، کہ سفر میں کوئی شخص کسی سواری مثلاً اونٹ، گھوڑے وغیرہ پر سوار ہو تو اس کو اجازت ہے کہ سواری پر بیٹھے ہوئے اشارہ سے نفلی نماز پڑھ لے، اور اس کے لئے قبلہ کی طرف رُخ کرنا بھی ضروری نہیں، جس طرف اس کی سواری چل رہی ہے اسی طرف رُخ کر لینا کافی ہو

بعض مفسرینؒ نے آیت فَاَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ کو اسی نفلی نماز کا حکم قرار دیا ہو مگر یاد رہے کہ یہ حکم صرف اُن سواریوں کا ہے جن پر سوار ہو کر چلتے ہوئے قبلہ کی طرف رُخ کرنا دشوار ہو، اور جن سواریوں میں سوار کو قبلہ کی طرف رُخ کر لینا دشوار نہیں، جیسے ریل، پانی کا جہاز، ہوائی جہاز، ان کا وہی حکم ہے جو حالتِ حضر میں رُخِ قبلہ کا ہے، کہ اگر نفل نماز بھی ان میں پڑھی جائے تو قبلہ رخ ہو کر پڑھی جائے، (البتہ نماز کی حالت میں ریل کا یا جہاز کا رُخ مڑ جائے اور نمازی کے لئے گنجائش نہ ہو کہ وہ بھی قبلہ رُخ پھر جائے، تو اسی حالت میں نماز پوری کر لے)

اسی طرح جہاں نمازی کو سمتِ قبلہ معلوم نہ ہو، اور رات کی اندھیری وغیرہ کی وجہ سے سمتیں متعین کرنا بھی دشوار ہو اور کوئی بتلانے والا بھی نہ ہو تو وہاں بھی یہی حکم ہے کہ وہ اپنا اندازہ اور تخمینہ

لگا کر جس طرف کو بھی متعین کرے گا وہی سمت اس کا قبلہ قرار دی جائے گی، نماز ادا کرنے کے بعد اگر یہ بھی ثابت ہو جائے کہ اس نے غلط سمت میں نماز ادا کی ہے، تب بھی نماز صحیح ہے، اعادہ کی ضرورت نہیں۔

آیت کے اس بیان اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعامل اور جزئیات مذکورہ سے استقبالِ قبلہ کے حکمِ شرعی کی پوری حقیقت واضح ہوگئی۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ

اور کہتے ہیں کہ اللہ رکھتا ہے اولاد وہ تو سب باتوں سے پاک ہے، بلکہ اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمان اور

الْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا

زمین میں سب اسی کے تابعدار ہیں، نیا پیدا کرنے والا ہے آسمان اور زمین کا اور جب

قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

حکم کرتا ہے کسی کام کو تو یہی فرماتا ہے اسکو کہ ہو جا پس وہ ہو جاتا ہے

خلاصۂ تفسیر

(بعض یہودی حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو، اور مشرکین عرب ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں، جیسا مختلف آیات میں ان اقوال کی خبر دی گئی ہے، حق تعالیٰ اس قول کی قباحت اور بطلان کا بیان فرماتے ہیں، یعنی) اور یہ لوگ (مختلف عنوان سے) کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اولاد رکھتا ہے سبحان اللہ (کیا مہمل بات ہے) بلکہ (ان کے تو اولاد ہونا عقلاً ممکن نہیں، کیونکہ دو حال سے خالی نہیں، یا تو اولاد غیر جنس ہوگی اور یا ہمجنس ہوگی، اگر غیر جنس ہو تب تو ناجنس اولاد ہونا عیب ہے، اور حق تعالیٰ عیب سے پاک ہیں، عقلاً بھی جیسا مسلّم ہے، اور نقلاً بھی جیسا سبحانہٗ مذکور کا بھی مدلول ہے، اور اگر ہمجنس ہو تو اس لئے باطل ہے کہ حق تعالیٰ کا کوئی ہمجنس نہیں، کیونکہ جو صفات کمال لوازم ذات واجبہ سے ہیں وہ اللہ کے ساتھ مخصوص اور غیر اللہ میں معدوم ہیں، اور لازم کی نفی ملزوم کی نفی کی دلیل ہے، اس لئے غیر اللہ ذات واجب نہ ہوگا، اور وجوب خود عین حقیقت یا لازم حقیقت ہے پس کوئی غیر اللہ، اللہ کے ساتھ حقیقت میں شریک نہ ہوا، لہٰذا ہمجنس ہونا بھی باطل ہو گیا، اب صفاتِ کمال صرف حق تعالیٰ ہی کے ساتھ مختص ہونے کی دلیلیں مذکور ہوتی ہیں، اوّل یہ کہ) خاص اللہ تعالیٰ کے مملوک ہیں جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں (موجودات) ہیں (اور دوسرے یہ کہ مملوک ہونے کے ساتھ) سب ان کے محکوم (بھی) ہیں (باین معنی کہ انکے تصرفاتِ قدرت جیسے مارنا، جلانا وغیرہ کو کوئی نہیں ہٹا سکتا، گو احکام شرعیہ کو

کوئی ٹال دے اور تیسرے یہ کہ حق تعالیٰ) موجد (بھی) ہیں آسمانوں اور زمین کے اور (جو تھے یہ کہ ایجاد کی بھی قدرت ایسی عظیم و عجیب ہے کہ) جب کسی کام کا (مثلاً پیدا ہی کرنا ہے) پورا کرنا چاہتے ہیں تو بس (اتنی بات ہے کہ) اس کو (اتنا) فرما دیتے ہیں کہ ہو جا، بس وہ (اسی طرح) ہو جاتا ہے، (ان کو آلات واسباب اور صناعوں اور معینوں کی ضرورت نہیں پڑتی، اور یہ چاروں امر بجز حق تعالیٰ کے کسی میں نہیں پائے جاتے، اور یہ مدعیانِ اولاد کے بھی مسلمات سے تھا، پس دلیل سے مقدمۂ اختصاص بھی ثابت ہو کر حجت تمام ہو گئی)

فوائد ۱۔ خاص خاص کاموں پر خاص خاص ملائکہ کو مقرر کرنا، مثلاً بارش، رزق وغیرہ، اور اسی طرح اسباب اور مواد اور قُویٰ سے کام لینا، یہ سب کسی حکمتِ خداوندی پر مبنی ہوتا ہے، اس لئے نہیں کہ لوگ انھیں اسباب و قوّات کو حاجت روا مان کر استعانت و مدد کے طلبگار ہوں۔

۲۔ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ پہلی شرائع میں اللہ تعالیٰ کو سببِ اوّل ہونے کی وجہ سے باپ کہا کرتے تھے، جاہلوں نے ولادت کے معنے سمجھ لئے، اس لئے یہ عقیدہ رکھنا یا ایسا کہنا کفر قرار دیا گیا، دفعِ فساد کی مصلحت سے اب ایسی لفظ کے استعمال کی بالکل اجازت نہیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ

اور کہتے ہیں وہ لوگ جو کچھ نہیں جانتے کیوں نہیں بات کرتا ہم سے اللہ یا کیوں نہیں آتی ہمارے پاس کوئی آیت

كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ

اسی طرح کہہ چکے ہیں وہ لوگ جو اُن سے پہلے تھے انہی کی سی بات ایک سے ہیں دل

قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

ان کے بے شک ہم نے بیان کر دیں نشانیاں اُن لوگوں کے واسطے جو یقین لاتے ہیں

خلاصۂ تفسیر اور (بعضے) جاہل (یہود و نصاریٰ اور مشرکین، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں) یوں کہتے ہیں کہ (خود) اللہ تعالیٰ ہم سے کلام کیوں نہیں فرماتے (خواہ فرشتوں کے بغیر، جیسے خود فرشتوں سے کلام فرماتے ہیں، یا فرشتوں کے واسطے سے، جیسے پیغمبروں سے بطور وحی بات کرتے ہیں، اور اس کلام میں یا تو خود ہم کو احکام بتا دیں، کہ دوسرے رسول کی ہمکو ضرورت ہی نہ رہے، یا کم از کم اتنا ہی کہہ دیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے رسول ہیں، تو ہم ان کی ہی رسالت کے قائل ہو کر ان کی اطاعت کرنے لگیں) یا (کلام نہیں کرتے تو) ہمارے پاس کوئی اور

ہی دلیل (ثبوتِ رسالت کی) آجاوے (حق تعالیٰ اولاً اس بات کا جاہلانہ رسم ہونا بتلاتے ہیں کہ) اس طرح وہ (جاہل) لوگ بھی کہتے چلے آئے ہیں، جو اُن سے پہلے ہو گذرے ہیں، ان ہی کا سا (جاہلانہ) قول (سو معلوم ہوا کہ یہ قول کوئی باوقعت اور باریک بینی پر مبنی نہیں، یوں ہی ہانک دیا جاتا ہے، پھر ثانیاً اس قول کا منشاء اور سبب بیان فرماتے ہیں کہ) ان سب (اگلے پچھلے جاہلوں) کے قلوب (کج فہمی میں) باہم ایک دوسرے کے مشابہ ہیں (اس لئے سب کے بات بھی ایک ہی سی پیدا ہوئی، پھر ثالثاً اس قول کا جواب دیتے ہیں، اور چونکہ اس قول کا جزو اوّل حماقت محض تھا، کہ اپنے کو اس لیاقت پر ہم پلّہ ملائکہ اور انبیاء کا بنانا چاہتے تھے، جو بالکل ہی بدیہی البطلان ہے، اس لئے اس احمقانہ بات کو نظرانداز کرکے صرف دوسرے جز کا جواب ارشاد ہوتا ہے کہ تم تو ایک دلیل کو لئے پھرتے ہو) ہم نے تو بہت سی دلیلیں (رسالتِ محمدیہ کے ثبوت میں) صاف صاف بیان کردی ہیں (مگر وہ) ان لوگوں کے لئے (نافع و کافی ہو سکتی ہیں) جو یقین (اور اطمینان حاصل کرنا) چاہتے ہیں (اور چونکہ معترضین کو محض ضد اور کدہی مقصود ہے اس لئے حق طلبی کی نظر سے اُن کو تحقیق ہی منظور نہیں، سوایسوں کی تسلّی وتشفی کا کون ذمہ دار بنے)۔

فائدہ:- یہود و نصاریٰ تو اہلِ کتاب تھے، ان میں اہل علم بھی تھے، اس کے باوجود جو اُن کو اللہ تعالیٰ نے جاہل فرمایا تو اس لئے کہ باوجودیکہ قطعی اور قوی دلائل کثرت سے قائم کردیئے گئے تھے پھر بھی جو انکار کئے جارہے تھے تو جہالت نہیں تو اور کیا تھا، اور یہ جاہلوں ہی کی سی بات کہلائیگی لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بھی اُن کو جاہل فرمایا۔

إِنَّآ أَرۡسَلۡنَٰكَ بِٱلۡحَقِّ بَشِيرٗا وَنَذِيرٗاۖ وَلَا تُسۡـَٔلُ عَنۡ أَصۡحَٰبِ		
بیشک ہم نے تجھ کو بھیجا ہر سچا دین دے کر خوش خبری دینے والا اور ڈرانیوالا اور تجھ سے پوچھ نہیں دوزخ		
	ٱلۡجَحِيمِ ﴿١١٩﴾	
	میں رہنے والوں کی۔	

خلاصۂ تفسیر

(چونکہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رحمۃ للعالمین کا تقاضا یہ ہو سکتا تھا کہ آپؐ کو اس جہالت اور عناد کی بدولت دل تنگی پیش آتی، اور ان کے ایمان نہ لانے کی کوئی صورت سمجھ میں نہ آنے کے سبب آپؐ ملول و آزردہ خاطر ہو جاتے، اس لئے اللہ تعالیٰ آپؐ کی تسلّی کے لئے ارشاد فرماتے ہیں کہ اے رسولؐ) ہم نے آپؐ کو ایک سچا دین دے کر (خلق کی طرف) بھیجا ہے کہ (ماننے والوں کو) خوش خبری سُناتے رہیے اور (نہ ماننے والوں کو سزا سے)

ڈراتے رہتے، اور آپ سے دوزخ میں جانے والوں کی باز پرس نہ ہوگی، (کہ ان لوگوں نے کیوں نہیں قبول کیا، اور کیوں دوزخ میں گئے، آپ اپنا کام کرتے رہئے، آپ کو کسی کے ماننے یا نہ ماننے کی کوئی فکر نہیں کرنی چاہئے)

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ

اور ہرگز راضی نہ ہوں گے تجھ سے یہود اور نہ نصاریٰ جب تک تو تابع نہ ہو ان کے دین کا،

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ

تو کہہ دے جو راہ اللہ بتادے وہی راہ سیدھی ہے اور اگر بالفرض تو تابعداری کرے انکی خواہشوں کی بعد

الَّذِىْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾

اس علم کے جو تجھ کو پہنچا، تو تیرا کوئی نہیں اللہ کے ہاتھ سے حمایت کرنے والا اور نہ مددگار۔

خلاصۂ تفسیر

اور کبھی خوش نہ ہوں گے آپ سے یہ یہود اور نہ یہ نصاریٰ، جب تک کہ آپ (خدانخواستہ) ان کے مذہب کے (بالکل) پیرو نہ ہو جائیں (اور یہ محال ہے، پس ان کا راضی ہونا محال ہے، اور اگر کبھی اس قسم کی بات ان کی زبان یا حال سے مترشح ہو تو) آپ (صاف) کہہ دیجئے کہ (بھائی) حقیقت میں ہدایت کا تو وہی راستہ ہے جس کو خدا نے (ہدایت کا راستہ) بتلایا ہے، (اور دلائل سے ایسا راستہ صرف اسلام ہونا ثابت ہو چکا ہے، پس راہِ ہدایت وہی رہا) اور (یہ امر کہ آپ نعوذ باللہ ان کے مذہب کے پیرو ہو جائیں محال اس لئے ہے کہ اس سے ایک محال لازم آتا ہے، کیونکہ) اگر آپ ان کے غلط خیالات کا اتباع کرنے لگیں (جس کو وہ اپنا مذہب سمجھتے ہیں مگر کچھ تحریف سے اور کچھ منسوخ ہو جانے سے اب وہ محض چند غلط خیالات کا مجموعہ رہ گیا ہے، اور پھر اتباع بھی کیسی حالت میں کہ) علم (قطعی ثابت بالوحی) آچکنے کے بعد تو (ایسی حالت میں تو) آپ کا کوئی خدا سے بچانے والا نہ یار نکلے نہ مددگار (بلکہ توبہ توبہ پنجۂ قہر میں گرفتار ہو جانا لازم آوے، اور یہ لازم محال ہے، کیونکہ دلائلِ قطعیہ سے دوامِ رضائے حق تعالیٰ آپ سے ثابت ہے، پس غضب محال ہے، اور اتباعِ مذکور سے یہ لازم آیا تھا، اس لئے اتباعِ مذکور بھی محال، اور بدون اتباع کے ان کا راضی ہونا غیر ممکن، تو ایسے امر کی امید کرنے کی کوئی گنجائش نہیں، اس لئے اس سے دل کو خالی کر لینا چاہئے)؛

ع ۱۴ ۹ ۱۴

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ
وہ لوگ جن کو دی ہم نے کتاب وہ اس کو پڑھتے ہیں جو حق ہے اس کے پڑھنے کا وہی اس پر یقین لاتے ہیں

بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾
اور جو کوئی منکر ہوگا اس سے تو وہی لوگ نقصان پانے والے ہیں ۔

خلاصۂ تفسیر (اس آیت سے پہلے کی آیت میں معاندین اہلِ کتاب کا ذکر اور مخالفین کے ایمان سے کلی مایوسی کا بیان تھا، اس کے بعد حسب عادتِ قرآن انصاف پسند اہلِ کتاب کا بیان ہے، جنھوں نے حق واضح ہوجانے کے بعد جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی، اور آپؐ کا اتباع اختیار کرلیا، پس ارشاد ہے) جن لوگوں کو ہم نے کتاب (توراۃ و انجیل) دی بشرطیکہ وہ اس کی تلاوت (اس طرح) کرتے رہے جس طرح تلاوت کا حق ہے، (کہ قوتِ علمیہ کو فہم مضامین میں صرف کیا، اور قوتِ ارادیہ کو عزم اتباع حق میں استعمال کیا) ایسے لوگ (البتہ آپؐ کے) اس (دینِ حق اور علمِ وحی) پر ایمان لے آتے ہیں، اور جو شخص نہ مانے گا (کسی کا نقصان کرے گا) خود وہی ایسے لوگ خسارہ میں رہیں گے (کہ ایمان پر جو ثمرات عطا ہوتے ہیں ان سے محروم رہیں گے)۔

يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ
اے بنی اسرائیل! یاد کرو احسان ہمارے جو ہم نے تم پر کئے اور اس کو کہ ہم نے

اَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ
تم کو بڑائی دی اہلِ عالم پر ، اور ڈرو اس دن سے کہ نہ کام آوے کوئی شخص کسی

عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّ
کی طرف سے ذرا بھی اور نہ قبول کیا جاوے گا اس کی طرف سے بدلہ اور نہ کام آوے اس کو سفارش اور

لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾
نہ اُن کو مدد پہنچے ؛ ؛ ؛

خلاصۂ تفسیر اوپر کی آیت تک بنی اسرائیل کے متعلق جن خاص مضامین کا بیان کرنا مقصود تھا وہ تو ختم ہوئے، اب ان مضامین کی ابتدائی تمہید جس کے اجمال کے یہ سارے

مضامین تفصیل تھے، اس کو دوبارہ پھر بیان کرتے ہیں، جس کا مقصد یہ ہے کہ تمہید کا مضمونِ خاص یعنی ترغیب کے لئے انعام عام و خاص کا یاد دلانا، اور ترہیب کیلئے قیامت کو پیشِ نظر کر دینا بوجہ تکرار خوب ذہن نشین ہو جائے، کیونکہ مقصودِ اعظم کلیات ہوتے ہیں، جن کا خود استحضار ان کے اختصار کی وجہ سے سہل اور آسان ہوتا ہے، اور بوجہ جامعیت اور انطباق کے ان کے ذریعے ان کے جزئیات کا محفوظ رکھنا آسان ہوتا ہے، اور محاورات میں یہ طرز بلیغ بھی اعلیٰ درجہ کا سمجھا جاتا ہے، کہ مفصل اور مطوّل بات کرنے سے پہلے ایک مجمل عنوان سے اس کی تقریر کر دی جائے جس کا قدرِ مشترک تمام تفاصیل کے سمجھنے میں معین و مددگار ہو، اور آخر میں بطور خلاصہ اور نتیجۂ تفصیل اسی مجمل عنوان کا پھر اعادہ کر دیا جائے، مثلاً یہ کہا جائے کہ تکبر بڑی مضر خصلت ہے، اس میں ایک ضرر یہ، دوسرا یہ، تیسرا یہ، دس بیس مضرتیں گنوا کر پھر آخر میں کہہ دیا جائے کہ غرض تکبر بڑی مضر خصلت ہے، اسی طور پر اس آیت یٰبَنِیٓ اِسْرَآءِیْلَ کا اعادہ فرمایا گیا ہے۔

اے اولادِ یعقوب (علیہ السلام) میری ان نعمتوں کو یاد کرو جن کا میں نے تم پر (وقتاً فوقتاً) انعام کیا، اور اس کو (بھی یاد کرو) کہ میں نے تم کو بہت لوگوں پر (بہت سی باتوں میں) فوقیت دی اور تم ڈرو ایسے دن سے (یعنی روزِ قیامت سے) جس میں کوئی شخص کسی کی طرف سے نہ کوئی مطالبہ (اور حق واجب) ادا کرنے پاوے گا، اور نہ کسی کی طرف سے کوئی معاوضہ (بجائے حق واجب کے) قبول کیا جاوے گا اور نہ کسی کی کوئی سفارش (جبکہ ایمان نہ ہو) مفید ہوگی اور نہ ان لوگوں کو کوئی (بزور) بچا سکے گا۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ

اور جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے کئی باتوں میں پھر اس نے وہ پوری کیں، تب فرمایا میں تجھ کو کردوں گا

لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى

سب لوگوں کا پیشوا، بولا اور میری اولاد میں سے بھی فرمایا نہیں پہنچے گا میرا قرار

الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

ظالموں کو۔

خلاصۂ تفسیر

اور جس وقت امتحان کیا حضرت ابراہیم کا اُن کے پروردگار نے چند باتوں میں (اپنے احکام میں سے) اور وہ ان کو پورے طور سے بجا لائے، (اس وقت)

حق تعالیٰ نے (ان سے) فرمایا کہ میں تم کو (اس کے صلہ میں نبوت دے کر یا امت بڑھا کر) لوگوں کا مقتدا بناؤں گا، انھوں نے عرض کیا اور میری اولاد میں سے بھی کسی کسی کو (نبوت دیجئے)، ارشاد ہوا کہ (آپ کی درخواست منظور ہے، مگر اس کا ضابطہ سُن لیجئے کہ) میرا (یہ) عہدہ (نبوت) خلاف ورزی (قانون) کرنے والوں کو نہ ملے گا، (سو ایسے لوگوں کو تو صاف جواب ہے، البتہ اطاعت کرنے والوں میں سے بعض کو نبوت دی جائے گی)

معارف و مسائل

اس آیت میں حق تعالیٰ کے خاص پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مختلف امتحانات اور ان میں ان کی کامیابی پھر اس کے انعام وصلہ کا بیان ہے، اور پھر جب حضرت خلیل اللہؑ نے از راہِ شفقت اپنی اولاد کے لئے بھی اسی انعام کی درخواست کی، تو انعام پانے کا ایک ضابطہ ارشاد فرما دیا گیا، جس میں حضرت خلیل اللہؑ کی درخواست کی منظوری مشروط صورت میں دی گئی، کہ یہ انعام آپ کی ذریت کو بھی ملے گا، مگر جو لوگ ذریت میں سے نافرمان اور ظالم ہوں گے وہ یہ انعام نہ پاسکیں گے۔

حضرت خلیل اللہؑ کے عظیم امتحانات اور مضامینِ امتحان

یہاں چند باتیں غور طلب ہیں:

اوّل یہ کہ امتحان کسی شخص کی قابلیت معلوم کرنے کے لئے لیا جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہیں، کسی بھی شخص کا کوئی حال یا کمال اُن پر مخفی نہیں، پھر اس امتحان کا مقصد کیا تھا؟

دوسرے یہ کہ امتحان کس کس عنوان سے لیا گیا۔

تیسرے یہ کہ کامیابی کس صورت اور کس نوعیت کی رہی۔

چوتھے یہ کہ انعام کیا دیا گیا اور اس کی حیثیت کیا ہے۔

پانچویں یہ کہ اس انعام کے لئے جو ضابطہ مقرر کیا گیا ہے اس کی کچھ توضیح و تفصیل۔

ان پانچوں سوالات کے جوابات بالتفصیل ملاحظہ فرمایئے:

پہلی بات کہ امتحان کا مقصد کیا تھا؟ قرآن کے ایک لفظ رَبُّہٗ نے اس کو حل کر دیا ہے جس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اس امتحان کے ممتحن خود اللہ جل شانہٗ ہیں، اور ان کے اسماء حُسنیٰ میں سے اس جگہ لفظ رب لاکر شانِ ربوبیت کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے، جس کے معنی ہیں کسی چیز کو آہستہ آہستہ درجۂ کمال تک پہنچانا۔

مطلب یہ ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کا یہ ابتلاء و امتحان کسی جرم کی پاداش میں یا نامعلوم قابلیت کا علم حاصل کرنے کے لئے نہیں، بلکہ شانِ تربیت و ربوبیت اس کا منشاء ہے، ان

آزمائشوں کے ذریعے اپنے خلیلؑ کی تربیت کرکے ان کے درجات و مقامات تک پہنچانا مقصود ہے، پھر اس جملہ میں مفعول کو مقدم اور فاعل کو مؤخر کرکے یوں ارشاد ہوا وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ اس میں ابراہیم علیہ السلام کی جلالتِ شان کو اور نمایاں فرمایا گیا۔

دوسرا سوال کہ امتحان کس عنوان سے لیا گیا؟ اس کے متعلق قرآن شریف میں تو صرف کلمات کا لفظ آیا ہے، اور اس لفظ کی تفسیر و تشریح میں حضرات صحابہؓ و تابعینؒ کے مختلف اقوال ہیں، کسی نے احکام الٰہیہ میں سے دس چیزیں شمار کیں، کسی نے تیس بتلائی ہیں، اور کسی نے اور کچھ کم و بیش دوسری چیزیں بتائیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں کچھ اختلاف نہیں، وہ چیزیں سب کی سب ہی حضرت خلیل اللہؑ کے مضامینِ امتحان تھے، ائمۂ تفسیر ابن جریرؒ اور ابن کثیرؒ کی یہی رائے ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک علمی موشگافیوں سے زیادہ قابلِ قدر اخلاق و کردار کی عملی ثابت قدمی ہے

یہی مضامینِ امتحان جن کی تفصیل آگے بیان ہوگی مدارس کے امتحانات کی طرح فنّی مسائل اور اُن کی تحقیقات نہیں، بلکہ اخلاقی قدروں اور عملی ثابت قدمی کی جانچ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ بارگاہِ عزّ و جلال میں جس چیز کی قیمت ہے وہ علمی موشگافیاں نہیں، بلکہ عملی اور اخلاقی برتری ہے۔

اب ان مضامینِ امتحان میں سے چند اہم چیزیں سنئے:

حق تعالیٰ کو منظور تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی خُلّت کا خلعتِ خاص عطا فرمایا جائے، اس لئے ان کو سخت امتحانات سے گذارا گیا، پوری قوم کی قوم حتیٰ کہ اپنا خاندان سب کے سب بُت پرستی میں مبتلا تھے سب کے عقائد و رسوم سے مختلف ایک دین حنیف ان کو عطا کیا گیا، اور اس کی تبلیغ اور قوم کو اس کی طرف دعوت دینے کا بارگراں آپ پر ڈالا گیا، آپ نے پیغمبرانہ جرأت و ہمت کے ساتھ بے خوف و خطر قوم کو خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کی طرف بلایا، بت پرستی کی شرمناک رسم کی خرابیاں مختلف عنوانات سے بیان کیں، عملی طور پر بتوں کے خلاف جہاد کیا، پوری قوم کی قوم آمادۂ جنگ و جدال ہوگئی، بادشاہِ وقت نمرود اور اس کی قوم نے آپ کو آگ میں ڈال کر زندہ جلا دینے کا فیصلہ کرلیا، اللہ کے خلیلؑ نے اپنے مولا کی رضامندی کے لئے ان سب بلاؤں پر راضی ہوکر اپنے آپ کو آگ میں ڈال دینے کے لئے پیش کردیا، اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیلؑ کو امتحان میں کامیاب پایا تو آگ کو حکم دیا:

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓي اِبْرٰهِيْمَ ۝ (۲۱: ۶۹)

"ہم نے حکم دیدیا کہ اے آگ تو ابراہیمؑ پر ٹھنڈی اور ذریعۂ سلامتی بن جا"۔

جس وقت یہ حکمِ خداوندی آتشِ نمرود کے متعلق آیا تو حکم کے الفاظ عام تھے، کسی خاص آگ

کی تعیین کر کے حکم نہیں دیا گیا تھا، اس لئے پوری دنیا میں جہاں کہیں آگ موجود تھی اس حکم خداوندی کے آتے ہی اپنی اپنی جگہ ہر آگ ٹھنڈی ہوگئی، اور نار نمرود بھی اس زمرہ کا فرد بن کر ٹھنڈی پڑگئی،

قرآن میں لفظ بَرْدًا کے ساتھ سَلٰمًا کا اضافہ اس لئے فرمایا گیا کہ کسی چیز کی ٹھنڈک حدِ اعتدال سے بڑھ جائے تو وہ بھی برف کی طرح تکلیف دہ بلکہ مہلک ہو جاتی ہے، اگر لفظ سلاماً ارشاد نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ آگ برف کی طرح ایسی ٹھنڈی ہو جاتی جو بجائے خود ایک عذاب بنجاتی جیسے جہنم میں ایک عذاب زمہریر کا بھی ہے۔

اس امتحان سے فارغ ہو کر دوسرا امتحان یہ لیا گیا کہ اپنے اصلی وطن کو چھوڑ کر شام کی طرف ہجرت کر جائیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رضائے خداوندی کی تڑپ میں قوم و وطن کو بھی خیر باد کہہ دیا، اور مع اہل و عیال ہجرت کر کے شام میں چلے آئے!

آنکس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند
فرزند و عیال و خانماں راچہ کند

اب قوم و وطن کو چھوڑ کر ملکِ شام میں قیام کیا ہی تھا کہ یہ حکم ملا کہ بی بی ہاجرہ رضی اللہ عنہا اور اُن کے شیر خوار بچے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ساتھ لے کر یہاں سے بھی کوچ کریں (ابن کثیر) جبرئیل امین آئے اور دونوں کو ساتھ لے کر چلے، راستہ میں جہاں کوئی سرسبز جگہ آتی تو حضرت خلیلؑ فرماتے کہ یہاں ٹھہرا دیا جائے، جبرئیلؑ فرماتے کہ یہاں کا حکم نہیں، منزل آگے ہے، جب وہ خشک پہاڑ اور گرم ریگستان آجاتا ہے جہاں آگے کسی وقت بیت اللہ کی تعمیر اور شہر مکہ کی بستی بسانا مقدر تھا، اس ریگستان میں آپ کو اتار دیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے خلیلؑ اپنے پروردگار کی محبت میں مسرور و مگن اسی چٹیل میدان اور بے آب و گیاہ جنگل میں بی بی کو لے کر ٹھہر جاتے ہیں، لیکن یہ امتحان اسی پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ملتا ہے کہ بی بی اور بچے کو یہیں چھوڑ دیں، اور خود ملکِ شام کو واپس ہو جائیں، اللہ کا خلیلؑ حکم پاتے ہی اس کی تعمیل میں اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، اور شام کی طرف روانہ ہو جاتا ہے، تعمیلِ حکم میں اتنی تاخیر بھی گوارا نہیں کہ بیوی کو یہ اطلاع ہی دیدے کہ مجھے چونکہ خدا کا یہ حکم ملا ہے اس لئے میں جا رہا ہوں، حضرت ہاجرہ علیہا السلام جب آپ کو جاتے ہوئے دیکھتی ہیں تو پکارتی ہیں، مگر آپ جواب نہیں دیتے، پھر پکارتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اس لق و دق میدان میں ہمیں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو! اس کا بھی جواب نہیں دیتے، مگر وہ بی بی بھی خلیل اللہؑ کی بی بی تھیں سمجھ گئیں کہ ماجرا کیا ہے، اور کہنے لگیں کہ کیا آپ کو اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم ملا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں، حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو بھی جب حکمِ خداوندی کا علم ہوگیا، تو نہایت اطمینان کے ساتھ فرمایا کہ جائیے جس

مالک نے آپ کو چلے جانے کا حکم فرمایا ہے وہ ہمیں بھی ضائع نہیں کرے گا۔

اب حضرت ہاجرہؑ اپنے شیرخوار بچہ کے ساتھ اس لق و دق جنگل میں وقت گذارنے لگتی ہیں، پیاس کی شدت پانی کی تلاش پر مجبور کرتی ہے، بچے کو کھلے میدان میں چھوڑ کر، صفا و مروہ کی پہاڑیوں پر بار بار چڑھتی اترتی ہیں کہ کہیں پانی کے آثار نظر آئیں، یا کوئی انسان نظر آجائے، جس سے کچھ معلومات حاصل کریں، سات مرتبہ کی دوڑ دھوپ کے بعد مایوس ہو کر بچے کے پاس لوٹ آتی ہیں، صفا و مروہ کے درمیان سات مرتبہ دوڑنا اسی کی یادگار کے طور پر قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے احکامِ حج میں ضروری قرار دیا گیا ہے، حضرت ہاجرہ علیہا السلام اپنی دوڑ دھوپ ختم کرنے اور مایوس ہونے کے بعد جب بچے کے پاس آتی ہیں تو رحمتِ خداوندی نازل ہوتی ہے، جبرئیل امین آتے ہیں، اور اس خشک ریگستان کی زمین سے پانی کا ایک چشمہ نکال دیتے ہیں، جس کا نام آج زمزم ہے، پانی کو دیکھ کر اوّل جانور آجاتے ہیں، پھر جانوروں کو دیکھ کر انسان پہنچتے ہیں، اور مکہ کی آبادی کا سامان ہو جاتا ہے، ضروریاتِ زندگی کی کچھ آسانیاں مہیا ہو جاتی ہیں۔

نومولود بچہ جن کو آج حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کہا جاتا ہے نشو ونما پاتے ہیں اور کام کاج کے قابل ہو جاتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام باشاراتِ ربّانی گاہ گاہ تشریف لاتے ہیں، اور بی بی بچہ کو دیکھ جاتے ہیں، اس وقت پھر اللہ تعالیٰ اپنے خلیلؑ کا تیسرا امتحان لیتے ہیں، یہ بچہ اس بیکسی اور بے سروسامانی میں پروان چڑھا، اور بظاہر اسباب باپ کی تربیت اور شفقت سے بھی محروم رہا، اب والد ماجد کو بظاہر یہ حکم ملتا ہے اس بچے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کردو، ارشاد قرآنی ہے:

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (۳۷ : ۱۰۲)

"جب بچہ اس قابل ہو گیا کہ باپ کے ساتھ کام کاج میں کچھ مدد دے سکے تو ابراہیم علیہ السلام نے اس سے کہا کہ اے بیٹے میں خواب میں یہ دیکھتا ہوں کہ تجھ کو ذبح کر رہا ہوں، تو بتلا کہ تیرا کیا خیال ہے؟ فرزند سعید نے عرض کیا کہ ابا جان آپ کو جو حکم ملا ہے اس کی تعمیل کیجئے آپ مجھے بھی اس کی تعمیل میں ان شاء اللہ ثابت قدم پائیں گے۔"

اس کے بعد کا واقعہ ہر مسلمان جانتا ہے کہ حضرت خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام صاحبزادے کو ذبح کرنے کے لئے منیٰ کے جنگل میں لے گئے، اور اپنی طرف سے حکمِ حق جل و علا شانہٗ کی پوری تعمیل کردی، مگر وہاں مقصود بچے کو ذبح کرانا نہیں بلکہ شفیق باپ کا امتحان کرنا تھا، واقعہ خواب کے الفاظ میں غور کیا جائے کہ اس میں یہ نہیں دیکھا تھا کہ ذبح کردیا، بلکہ ذبح کا عمل کرتے دیکھا،

جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کر دکھایا اور اس عمل کو بذریعہ وحی منام دکھلانے میں بھی شاید یہی مصلحت ہو کہ بذریعہ کلام حکم ذبح دینا منظور نہ تھا، اسی وجہ سے ارشاد یہ ہوا کہ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا، کہ خواب میں جو کچھ دیکھا تھا آپ نے اس کو پورا کر دیا، جب اسمیں وہ پورے اُترے، تو اللہ تعالیٰ نے جنت سے اس کا فدیہ نازل فرما کر اس کی قربانی کا حکم دیدیا، اور یہ سنتِ ابراہیمی آنے والی دنیا کے لئے دائمی سنت بن گئی۔

یہ کڑے اور سخت امتحانات تھے جن میں حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو گذارا گیا، اس کے ساتھ ہی دوسرے بہت سے اعمال و احکام کی پابندیاں آپ پر عائد کی گئیں، جن میں سے دس خصائلِ فطرت کے نام سے موسوم ہیں، جن کا تعلق بدن کی صفائی، ستھرائی اور پاکی سے ہے، اور یہ خصائلِ فطرت آنے والی تمام امتوں کے لئے بھی مستقل احکام بن گئے، حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو ان تمام امور کے لئے تاکیدی احکام دیئے۔

اور ابن کثیرؒ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں یہ بھی نقل کیا ہے کہ پورا اسلام تیس حصوں میں دائر ہے، جس میں سے دس سورۂ برأت میں مذکور ہیں اور دس سورۂ احزاب میں اور دس سورۂ مومنون میں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان تمام چیزوں کا پورا حق ادا کیا، اور ان سب امتحانات میں پورے اُترے، اور کامیاب رہے۔

سورۂ برأت میں مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے مسلمان کی دس مخصوص علامات و صفات کا اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۹: ۱۱۲)	"وہ ایسے ہیں جو توبہ کرنیوالے، عبادت کرنیوالے حمد کرنیوالے، روزہ رکھنے والے، رکوع سجدہ کرنیوالے، نیک باتوں کی تعلیم کرنیوالے، اور بُری باتوں سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کا خیال رکھنے والے، اور ایسے مومنین کو آپ خوشخبری سُنا دیجئے"

اور سورۂ مومنون کی دس صفات یہ ہیں:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ	"یقیناً ان مسلمانوں نے فلاح پائی جو اپنی نماز میں خشوع و خضوع کرنے والے ہیں، اور جو

هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ط هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (۲۳: ۱-۱۱)

لغو باتوں سے برکنار رہنے والے ہیں اور جو اپنے آپ کو پاک کرنیوالے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنیوالے ہیں، لیکن اپنی بیویوں سے یا اپنی لونڈیوں سے کیونکہ ان پر کوئی الزام نہیں، ہاں جو اس کے علاوہ طلبگار ہوں ایسے لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں، اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا خیال رکھنے والے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں ایسے ہی لوگ وارث ہونے والے ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

اور سورۃ احزاب میں مذکورہ دس صفات یہ ہیں:

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ لا اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (۳۳: ۳۵)

"بیشک اسلام کے کام کرنیوالے مرد اور اسلام کے کام کرنیوالی عورتیں اور ایمان لانیوالے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں اور فرمانبرداری کرنیوالے مرد اور فرمانبرداری کرنیوالی عورتیں اور راستباز مرد اور راستباز عورتیں اور صبر کرنیوالے مرد اور صبر کرنیوالی عورتیں، اور خشوع کرنیوالے مرد اور خشوع کرنیوالی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنے والی عورتیں اور بکثرت اللہ کو یاد کرنے والے مرد اور بکثرت اللہ کو یاد کرنے والی عورتیں، ان سب کیلئے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔"

مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ مسلمان کے لئے جتنی علمی، عملی، اخلاقی صفات مطلوب ہیں وہ ان تینوں سورتوں کی چند آیات میں جمع کردی گئی ہیں، اور یہی صفات وہ کلمات ہیں جن میں حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کا امتحان لیا گیا، اور آیت وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ میں انہی صفات کی طرف اشارہ ہے۔

ان آیات کے متعلق قابلِ غور سوالات میں سے دو سوالوں کا جواب یہاں تک ہوگیا۔

تیسرا سوال یہ تھا کہ اس امتحان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کامیابی کا درجہ اور مقام کیا رہا۔ تو وہ خود قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز میں ان کو سندِ کامیابی عطا فرمائی، ارشاد ہوا:

وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى (۵۳: ۳۷) (وہ ابراہیم جس نے پورا کر دکھایا)

اس کا حاصل یہ ہے کہ ہر امتحان کی مکمل اور سو فی صدی کامیابی کا اعلان فرما دیا۔

چوتھا سوال کہ اس امتحان پر انعام کیا ملا، اس کا ذکر خود اسی آیت میں آچکا ہے، یعنی:

قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ (۲: ۱۲۴)	"(امتحان کے بعد) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں آپ کو لوگوں کا امام اور پیشوا بنانے والا ہوں"

اس سے ایک طرف تو یہ معلوم ہوا کہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو اس کامیابی کے صلہ میں امامتِ خلق اور پیشوائی کا انعام دیا گیا، دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوا کہ خلقِ خدا کے امام و مقتدا اور پیشوا بننے کے لئے جو امتحان درکار ہے وہ دنیا کے مدارس اور یونیورسٹیوں جیسا امتحان نہیں جس میں چند مسائل کی فنی تحقیق اور علمی موشگافی کو کامیابی کا اعلیٰ درجہ سمجھا جاتا ہے، اس عہدے کے حاصل کرنے کے لئے ان تیس اخلاقی اور عملی صفات میں کامل اور مکمل ہونا شرط ہے، جن کا ذکر ابھی بحوالۂ آیات آچکا ہے، قرآن کریم نے ایک دوسری جگہ بھی یہی مضمون اس طرح بیان فرمایا ہے:

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ڲ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ○ (۳۲: ۲۴)	"یعنی ہم نے اُن میں سے امام اور پیشوا بنائے کہ وہ ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کریں جب انھوں نے اپنے نفس کو خلافِ شرع سے روکا اور ہماری آیتوں پر یقین کیا"

اس آیت میں امامت و پیشوائی کے لئے ان تیس صفات کا خلاصہ دو لفظوں میں کردیا گیا ہے، یعنی صبر و یقین، یقین علمی اور اعتقادی کمال اور صبر عملی اور اخلاقی کمال ہے، اور وہ تیس صفات جن کا ذکر ابھی اوپر گذر چکا ہے سب کی سب انہی دو وصفوں میں سموئی ہوئی ہیں۔

پانچواں سوال یہ تھا کہ آئندہ آنے والی نسلوں کو منصبِ امامت و پیشوائی دینے کے لئے جو یہ ضابطہ ارشاد ہوا ہے کہ فاسق اور ظالم لوگوں کو یہ منصب نہ ملے گا، اس کا کیا مطلب ہے؟

اس کی توضیح یہ ہے کہ امامت و پیشوائی ایک حیثیت سے اللہ جل شانہ کی خلافت ہے، یہ کسی ایسے شخص کو نہیں دی جاسکتی جو اس کا باغی اور نافرمان ہو، اسی لئے مسلمانوں پر لازم ہے کہ اپنے اختیار سے اپنا نمائندہ یا امیر کسی ایسے شخص کو مقرر نہ کریں جو اللہ تعالیٰ کا باغی یا نافرمان ہو۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ

اور جب مقرر کیا ہم نے خانہ کعبہ کو اجتماع کی جگہ لوگوں کیواسطے اور جگہ امن کی، اور بناؤ ابراہیم کے کھڑے ہونے

اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا

کی جگہ کو نماز کی جگہ اور حکم کیا ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل کو کہ پاک رکھو میرے

بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

گھر کو واسطے طواف کرنیوالوں کے اور اعتکاف کرنیوالوں کے اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے۔

حلِّ لغات مَثَابَةً یہ لفظ ثَابَ یَثُوْبُ ثَوْبًا وَمَثَابًا سے ماخوذ ہے، جس کے معنی لوٹنے کے ہیں اس لئے مثابہ کے معنی مرجع کے ہوگئے جہاں آدمی بار بار لوٹ کر جائے۔

خلاصۂ تفسیر (اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے کہ) جس وقت ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کا معبد اور (مقام) امن (ہمیشہ سے مقرر رکھا اور (آخر میں امتِ محمدیہ کو حکم دیا کہ برکت حاصل کرنے کے لئے) مقام ابراہیم کو (کبھی کبھی) نماز پڑھنے کی جگہ بنالیا کرو، اور ہم نے (بنائے کعبہ کے وقت حضرت) ابراہیم و (حضرت) اسمٰعیل (علیہما السلام) کی طرف حکم بھیجا کہ میرے (اس) گھر کو خوب پاک (صاف) رکھا کرو، بیرونی اور مقامی لوگوں (کی عبادت) کے واسطے اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے واسطے۔

معارف و مسائل

حضرت خلیل اللہؑ کی ہجرتِ مکہ اور بناء بیت اللہ کا تفصیلی واقعہ اس آیت میں بیت اللہ کعبہ کی تاریخ کی طرف اشارہ ہے اور حضرت خلیل اللہ اور اسمٰعیل علیہما السلام کے ہاتھوں اسکی تعمیر جدید، نیز بیت اللہ اور مکہ مکرمہ کی چند خصوصیات کا ذکر اور بیت اللہ کے احترام سے متعلقہ احکام مذکور ہیں، یہ مضمون قرآن کی بہت سی آیات میں مختلف سورتوں میں پھیلا ہوا ہے، اس جگہ مختصر طور پر اس کو بیان کیا جاتا ہے، جس سے مذکورہ آیات کا پورا مضمون واضح ہو جائے گا، یہ مضمون سورۂ حج کی آیت نمبر ۲۶ میں اس طرح مذکور ہے:

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝

"یعنی وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہو جبکہ ہم نے ابراہیم کو خانہ کعبہ کی جگہ بتلادی کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرنا، اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے واسطے، پاک رکھنا اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو لوگ تمھارے پاس چلے آئیں گے، پیادہ بھی اور دُبلی اونٹنیوں پر بھی جو دور دراز کے راستوں سے پہونچی ہوں گی"۔

تفسیر ابن کثیر میں ائمہ تفسیر حضرت مجاہدؒ وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام ملکِ شام میں مقیم تھے، اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام شیر خوار بچے تھے، جس وقت حق تعالیٰ کا ان کو یہ حکم ملا کہ ہم خانہ کعبہ کی جگہ آپ کو بتلاتے ہیں، آپ اس کو پاک صاف کر کے طواف و نماز سے آباد رکھیں، اس حکم کی تعمیل کے لئے جبرئیل امین براق لے کر حاضر ہوئے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اور اسمٰعیل علیہ السلام کو مع ان کی والدہ حضرت ہاجرہؑ کے ساتھ لیکر سفر کیا، راستے میں جب کسی بستی پر نظر پڑتی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام جبرئیل امین سے دریافت کرتے کہ کیا ہمیں یہاں اُترنے کا حکم ملا ہے، تو حضرت جبرئیل علیہ السلام فرماتے کہ نہیں آپ کی منزل آگے ہے، یہاں تک کہ مکہ مکرمہ کی جگہ سامنے آئی، جس میں کانٹے دار جھاڑیاں اور ببول کے درختوں کے سوا کچھ نہ تھا، اس خطۂ زمین کے آس پاس کچھ لوگ بستے تھے جن کو عمالیق کہا جاتا تھا، بیت اللہ اس وقت ایک ٹیلہ کی شکل میں تھا، حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے اس جگہ پہونچ کر جبرئیل امین سے دریافت کیا کہ کیا ہماری منزل یہ ہے، تو فرمایا کہ ہاں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام مع اپنے صاجزادے اور حضرت ہاجرہ کے یہاں اُتر گئے، اور بیت اللہ کے پاس ایک معمولی چھپّر ڈال کر حضرت اسمٰعیل اور ہاجرہ علیہما السلام کو یہاں ٹھہرا دیا، ان کے پاس ایک توشہ دان میں کچھ کھجوریں اور ایک مشکیزہ میں پانی رکھ دیا، اور ابراہیم علیہ السلام کو اس وقت یہاں ٹھہرنے کا حکم نہ تھا وہ اس شیر خوار بچہ اور ان کی والدہ کو حوالہ بخدا کر کے واپس ہونے لگے، جانے کی تیاری دیکھ کر حضرت ہاجرہ نے عرض کیا کہ ہمیں اس لق و دق میدان میں چھوڑ کر آپ کہاں جاتے ہیں، جس میں نہ کوئی مونس و مددگار ہے نہ زندگی کی ضروریات۔

حضرت خلیل اللہ صلوات اللہ علیہ وسلامہٗ نے کوئی جواب نہ دیا، اور چلنے لگے، حضرت ہاجرہؑ ساتھ اٹھیں، پھر بار بار یہی سوال دُہرایا، حضرت خلیل اللہؑ کی طرف سے کوئی جواب نہ تھا، یہاں تک کہ خود

ان کے دل میں بات پڑی، اور عرض کیا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہاں چھوڑ کر چلے جانے کا حکم دیا ہے؟ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ملا ہے۔

اس کو سنکر حضرت ہاجرہؑ نے فرمایا کہ پھر آپ شوق سے جائیں، جس نے آپ کو یہ حکم دیا ہے وہ ہمیں بھی ضائع نہ کرے گا، ابراہیم علیہ السلام حکمِ خداوندی کی تعمیل میں یہاں سے چل کھڑے ہوئے مگر شیر خوار بچہ اور اس کی والدہ کا خیال لگا ہوا تھا، جب راستہ کے موڑ پر پہنچے جہاں سے حضرت ہاجرہؑ نہ دیکھ سکیں تو ٹھہر گئے اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعاء فرمائی جو سورۂ ابراہیم کی آیت نمبر ۳۵ و ۳۷ میں اس طرح مذکور ہے:

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝ (سورۂ ابراہیم ۱۴: ۳۵)

"اے میرے پروردگار اس شہر کو امن والا بنا دیجئے اور مجھ کو اور میرے خاص فرزندوں کو بتوں کی عبادت سے بچائے رکھئے"

پھر دعاء میں عرض کیا:

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۝ (۱۴: ۳۷)

"یعنی اے ہمارے رب میں اپنی اولاد کو آپکے محترم گھر کے قریب ایک میدان میں جو زراعت کے قابل نہیں آباد کرتا ہوں، اے ہمارے رب تاکہ وہ نماز کا اہتمام رکھیں، تو آپ کچھ لوگوں کے قلوب ان کی طرف مائل کر دیجئے، اور ان کو پھل کھانے کو دیجئے تاکہ یہ لوگ شکر کریں"

سابقہ حکم جس کی بناء پر شام سے ہجرت کرا کر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کو یہاں لایا گیا تھا اس میں یہ ارشاد ہوا تھا کہ میرے گھر کو پاک رکھنا، حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام جانتے تھے کہ پاک رکھنے سے مراد یہ ہے کہ اس کو ظاہری نجاسات اور گندگی سے بھی پاک رکھا جائے، اور باطنی نجاست کفر و شرک سے پاکی بھی فرمانِ الٰہی میں مقصود ہے، اس لئے یہاں ٹھہر کر جو دعائیں فرمائیں ان میں اوّل تو اس بستی کے محفوظ و مامون رہنے اور جائے امن ہونے کی دعاء فرمائی، پھر یہ دعاء کی کہ مجھے اور میری اولاد کو شرک و بت پرستی سے بچائیے، کیونکہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو معرفتِ حق تعالیٰ کا وہ مقام حاصل تھا جس میں انسان کو اپنا وجود ہی نابود نظر آتا ہے، اپنے تمام افعال و اعمال اور ارادوں کو یہ محسوس کرتا ہے کہ سب کچھ حق تعالیٰ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہیں اسی کی مشیت و ارادہ سے سب کام ہوتے ہیں، اس لئے کفر و شرک سے بیت اللہ کو پاک رکھنے کا

جو حکم ملا تھا، اس میں حق تعالیٰ ہی سے امداد طلب کی، اس دعاء کے اندر کفر و شرک سے محفوظ رہنے کی التجا میں ایک خاص راز یہ بھی ہو سکتا ہی کہ جب بیت اللہ کی تعظیم و تکریم کا حکم ہوا تو یہ احتمال بھی تھا کہ آئندہ چل کر کوئی ناواقف اس بیت اللہ ہی کو معبود نہ بنالے، اور اس طرح شرک میں مبتلا ہو جائے، اس لئے یہ دعاء فرمائی کہ مجھ کو اور میری اولاد کو شرک سے محفوظ رکھا جائے۔

اس کے بعد شیر خوار بچہ اور اس کی والدہ پر شفقت کے پیش نظر یہ دعاء فرمائی کہ میں نے ان کو آپ کے حکم کے مطابق آپ کے محترم گھر کے پاس ٹھہرا تو دیا ہے لیکن یہ جگہ زراعت کے قابل بھی نہیں، جہاں کوئی اپنی محنت سے ضروریاتِ زندگی حاصل کر سکے، اس لئے آپ ہی اپنے فضل سے ان کو پھلوں کا رزق عطا فرمادیں۔

یہ دعاء کر کے حضرت خلیل اللہ علیہ السلام تو اپنے وطن شام کی طرف روانہ ہو گئے، ادھر حضرت ہاجرہؑ کا کچھ وقت تو اس توشۂ کھجور اور پانی کے ساتھ کٹ گیا جو حضرت خلیل اللہؑ چھوڑ گئے تھے، پانی ختم ہونے کے بعد خود بھی پیاس سے بے چین اور شیر خوار بچہ بھی، اس وقت پانی کی تلاش میں ان کا نکلنا اور کبھی کوہِ صفا پر کبھی کوہِ مروہ پر چڑھنا اور ان دونوں کے درمیان دوڑ دوڑ کر راستہ طے کرنا، تاکہ حضرت اسمٰعیلؑ آنکھوں کے سامنے آجائیں، عام مسلمانوں میں معروف ہے اور حج میں صفا مروہ کے درمیان سعی کرنا آجتک اسی کی یادگار ہی۔

اس قصہ کے آخر میں حضرت جبریل امین کا بحکمِ خداوندی وہاں پہونچنا اور چشمۂ زمزم کا جاری کرنا اور پھر قبیلۂ جرہم کے کچھ لوگوں کا یہاں آکر مقیم ہو جانا اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے جوان ہونے کے بعد قبیلۂ جرہم کی ایک بی بی سے شادی ہو جانا، یہ سب صحیح بخاری کی روایت میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے، روایاتِ حدیث کے مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء سورۂ حج کی آیت میں جو بیت اللہ کو آباد کرنے اور پاک صاف رکھنے کا حکم حضرت خلیل اللہؑ کو ملا تھا اس وقت اتنا ہی عمل مقصود تھا کہ اس جگہ کو حضرت اسمٰعیل اور ہاجرہ علیہما السلام کے ذریعہ آباد کر دیا جائے، اس کے مخاطب صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے، کیونکہ اسمٰعیل علیہ السلام ابھی شیر خواری کے عالم میں تھے، اس وقت بیت اللہ کی تعمیر جدید کا حکم نہ ملا تھا، سورۂ بقرہ کی یہ آیت جو اس وقت زیر نظر ہے وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ اس میں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو بھی شریک کر لیا گیا ہے، یہ حکم اس وقت کا ہے جب کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جوان اور متاہل ہو چکے تھے، اُس وقت دونوں کو بناءِ بیت اللہ کا حکم دیا گیا۔

صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ ایک روز حضرت ابراہیم علیہ السلام حسبِ عادت حضرت ہاجرہؑ

اور اسمٰعیلؑ کی ملاقات کے لئے مکہ مکرمہ پہنچے، تو دیکھا کہ اسمٰعیل علیہ السلام ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تیر بنارہے ہیں، والد ماجد کو دیکھ کر کھڑے ہوگئے، ملاقات کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک کام کا حکم دیا ہے، کیا تم اس میں میری مدد کرو گے؟ لائق فرزند نے عرض کیا کہ بسر وچشم کروں گا، اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُس ٹیلہ کی طرف اشارہ کیا، جہاں بیت اللہ تھا، کہ مجھے اس کی تعمیر کا حکم ہوا ہے، بیت اللہ کے حدود اربعہ حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو بتلا دیئے تھے، دونوں بزرگوار اس کام میں لگے تو بیت اللہ کی قدیم بنیادیں نکل آئیں، انہی پر دونوں نے تعمیر شروع کردی، اگلی آیت میں اسی کا بیان ہے: وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ بانی بیت اللہ اصل میں حضرت خلیل علیہ السلام ہیں اور اسمٰعیل علیہ السلام مددگار کی حیثیت سے شریک ہیں۔

ان تمام آیات پر غور کرنے سے وہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے جو بعض روایاتِ حدیث اور تاریخ میں مذکور ہے کہ بیت اللہ پہلے سے دنیا میں موجود تھا، کیونکہ تمام آیات میں کہیں بیت اللہ کی جگہ بتلا دینے کا ذکر ہے، کہیں اس کو پاک صاف رکھنے کا ذکر ہے، یہ کہیں مذکور نہیں کہ آج کوئی نیا گھر تعمیر کرانا ہے اس کی تعمیر کریں، اس سے معلوم ہوا کہ بیت اللہ کا وجود اس واقعہ سے پہلے موجود تھا، پھر طوفانِ نوحؑ کے وقت منہدم ہوگیا یا اٹھا لیا گیا تھا، صرف بنیادیں موجود تھیں، حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام کعبہ کے پہلے بانی نہیں، بلکہ بناءِ سابق کی بنیادوں پر جدید تعمیر ان کے ہاتھوں ہوئی ہے۔

اب رہا یہ معاملہ کہ پہلی تعمیر کس نے اور کس وقت کی؟ اس میں کوئی صحیح اور قوی روایت حدیث کی منقول نہیں، اہلِ کتاب کی روایات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اس کی تعمیر آدم علیہ السلام کے اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی فرشتوں نے کی تھی، پھر آدم علیہ السلام نے اس کی تجدید فرمائی، یہ تعمیر طوفانِ نوح تک باقی رہی، طوفانِ نوحؑ میں منہدم ہوجانے کے بعد سے ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ تک یہ ایک ٹیلہ کی صورت میں باقی رہی، حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے از سرِ نو تعمیر فرمائی، اس کے بعد اس تعمیر میں شکست و ریخت تو ہمیشہ ہوتی رہی مگر منہدم نہیں ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل قریش مکہ نے اس کو منہدم کرکے از سرِ نو تعمیر کیا جس کی تعمیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی خاص شرکت فرمائی۔

احکام و مسائل متعلقہ حرم محترم

۱۔ لفظ مَثَابَۃً سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو یہ خاص فضیلت بخشی ہے کہ وہ ہمیشہ

مرجعِ خلائق بنا رہے گا، اور لوگ بار بار اس کی طرف جانے اور لوٹنے کے آرزو مند رہیں گے، امام تفسیر حضرت مجاہدؒ نے فرمایا لا یقضی احد منہا وطرًا (قرطبی) یعنی کوئی آدمی اس کی زیارت سے کبھی سیر نہیں ہوتا، بلکہ ہر مرتبہ پہلے سے زیادہ زیارت وطواف کا شوق لیکر لوٹتا ہے، اور بعض علماء نے فرمایا کہ قبولِ حج کی علامات میں سے ہے کہ وہاں سے لوٹنے کے بعد پھر وہاں جانے کا شوق دل میں پائے، چنانچہ عام طور پر اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ پہلی مرتبہ جتنا شوقِ زیارت بیت اللہ کا ہوتا ہے دوسری مرتبہ کے لئے اس شوق میں اضافہ ہو جاتا ہے، اور جوں جوں بار بار زیارت کرتا رہتا ہے یہ شوق اور بڑھتا جاتا ہے۔

یہ معجزہ بیت اللہ ہی کی خصوصیت ہو سکتی ہے، ورنہ دنیا کے بہتر سے بہتر مناظر کو انسان ایک دو مرتبہ دیکھ لینے کے بعد سیر ہو جاتا ہے، اور پانچ سات مرتبہ دیکھنے کے بعد تو دیکھنے کا دھیان بھی نہیں آتا، اور یہاں تو نہ کوئی خوش منظر سبزی ہے، نہ وہاں پہنچنا کچھ آسان ہے، نہ وہاں دنیا کے کاروبار ہی کی کوئی اہمیت ہے، اس کے باوجود لوگوں کے دل میں اس کی تڑپ ہمیشہ موجزن رہتی ہے۔ ہزاروں روپیہ خرچ کر کے سینکڑوں مشقتیں جھیل کر وہاں پہنچنے کے مشتاق رہتے ہیں۔

۲۔ لفظ اٰمنًا اس جگہ مَاْمَن یعنی جائے امن کے معنی میں ہے، اور لفظ بیت سے مراد صرف بیت اللہ یعنی خانہ کعبہ نہیں بلکہ پورا حرم مراد ہے، قرآن کریم میں بیت اللہ اور کعبہ کا لفظ بول کر پورا حرم مراد لینے کے اور بھی شواہد موجود ہیں جیسے ارشاد ہے، هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ (۵: ۹۵)، اس میں لفظ کعبہ بول کر پورا حرم مراد لیا گیا ہے، کیونکہ اس میں ذکر قربانی کا ہے اور بیتِ کعبہ کے اندر تو قربانی نہیں ہوتی، اور نہ وہاں قربانی کرنا جائز ہے، اس لئے معنی آیت کے یہ ہوئے کہ ہم نے حرمِ مکہ کو جائے امن بنا دیا ہے، اور جائے امن بنا دینے سے مراد لوگوں کو یہ حکم دینا ہے کہ حرم محترم کو عام قتل و قتال اور انتقام سے بالاتر رکھیں۔ (ابن عربی)

چنانچہ زمانۂ جاہلیت میں بھی عربوں کے ہاتھ میں ملتِ ابراہیمی کے جو کچھ آثار باقی رہ گئے تھے، ان میں یہ بھی تھا کہ حرم میں اپنے باپ اور بھائی کا قاتل بھی کسی کو ملتا تو انتقام نہیں لیتے تھے، اور عام جنگ و قتال کو بھی حرم میں حرام سمجھتے تھے، شریعتِ اسلام میں بھی یہ حکم اسی طرح باقی رکھا گیا، فتح مکہ کے وقت صرف چند گھنٹوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے ارضِ حرم میں قتال کو جائز کیا گیا تھا، مگر اسی وقت پھر ہمیشہ کے لئے حرام کر دیا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے خطبہ میں اس کا اعلان فرما دیا (صحیح بخاری)

اب رہا یہ مسئلہ کہ کوئی شخص حرم کے اندر ہی کوئی ایسا جرم کرے جس پر حد و قصاص اسلامی شریعت کی رُو سے عائد ہوتا ہے تو حرم اس کو امن نہیں دے گا، بلکہ اس پر باجماعِ امت

حدود و قصاص جاری کئے جائیں گے (احکام القرآن جصاص و قرطبی) کیونکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے :

فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ "یعنی اگر تم سے لوگ حرم میں قتال کرنے لگیں تو تم بھی وہیں اُن کو قتل کر دو" (۲: ۱۹۱)

البتہ یہاں ایک مسئلہ ائمۂ مجتہدین میں مختلف فیہ ہے، وہ یہ کہ کوئی شخص باہر سے جرم کرکے حرم میں پناہ لیلے تو اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا، اس میں بعض ائمہ اس پر بھی حرم میں حدود و قصاص کی سزائیں جاری کرنے کا حکم دیتے ہیں، اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کو سزا سے چھوڑنا تو نہیں، کیونکہ اگر ایسا کیا گیا تو جرائم کرکے سزا سے بچنے کا راستہ کھل جائے گا، اور عالم میں فساد برپا ہو جائے گا، اور حرم مجرموں کا ٹھکانا بن جائے گا، لیکن احترام حرم کے سبب حرم کے اندر سزا نہ دی جائیگی، بلکہ اس کو مجبور کیا جائیگا کہ وہ حرم سے باہر نکلے، وہاں سے نکلنے کے بعد سزا جاری کی جائے گی۔

۳۔ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى، اس میں مقامِ ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قدم مبارک کا بطور معجزہ نشان پڑ گیا تھا، اور جس کو تعمیر بیت اللہ کے وقت آپ نے استعمال کیا تھا (صحیح بخاری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے اس پتھر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم مبارک کا نقش دیکھا ہے، مگر لوگوں کے بکثرت چھونے اور ہاتھ لگانے سے اب وہ نشان ہلکا پڑ گیا ہے (قرطبی) ___ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مقامِ ابراہیم کی تفسیر میں یہ بھی منقول ہے کہ پورا حرم مقامِ ابراہیم ہے، ممکن ہو کہ اس سے مراد یہ ہو کہ طواف کے بعد کی دو رکعتیں جن کو مقامِ ابراہیم پر پڑھنے کا حکم اس آیت میں ہے، اس حکم کی تعمیل پورے حرم میں کسی جگہ بھی یہ رکعتیں پڑھنے سے ہو جائے گی، اس پر اکثر فقہاء امت متفق ہیں۔

۴۔ آیتِ مذکورہ میں مقامِ ابراہیم کو مصلّٰی بنانے کا حکم ہے اس کی وضاحت خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں اپنے قول و عمل سے اس طرح فرما دی کہ آپؐ طواف کے بعد مقامِ ابراہیم کے پاس پہنچے جو بیت اللہ کے سامنے تھوڑے فاصلہ سے رکھا ہوا ہے وہاں پہونچ کر یہ آیت تلاوت فرمائی: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى اور پھر مقامِ ابراہیم کے پیچھے اس طرح دو رکعت نماز پڑھی کہ مقامِ ابراہیم کو درمیان میں رکھتے ہوئے بیت اللہ کا استقبال ہو جائے، (صحیح مسلم) اسی لئے فقہاء امت نے فرمایا ہے کہ جس شخص کو مقامِ ابراہیم کے پیچھے متصلاً جگہ نہ ملے، وہ کتنے ہی فاصلہ پر بھی جب اس طرح کھڑا ہو کہ مقامِ ابراہیم بھی اس کے سامنے رہے، اور بیت اللہ بھی تو اس حکم کی پوری تعمیل ہو جائے گی۔

۵۔ اس آیت سے ثابت ہوا کہ طواف کے بعد کی دو رکعتیں واجب ہیں (جصاص ومناسک ملا علی قاری)

البتہ ان دو رکعتوں کا خاص مقام ابراہیم کے پیچھے ادا کرنا سنّت ہے اور حرم میں کسی دوسری جگہ بھی ادا کرے تو کافی ہوگا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان رکعتوں کا بیت اللہ کے دروازے سے متصل پڑھنا بھی ثابت ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی اس جگہ پڑھنا منقول ہے (جصاص) اور ملا علی قاریؒ نے کتاب مناسک میں فرمایا ہے کہ یہ دو رکعت طواف تو واجب ہیں، اور سنت یہ ہے کہ مقامِ ابراہیم کے پیچھے ادا کی جائیں، لیکن اگر کسی وجہ سے وہاں ادا نہ کرسکا تو پھر حرم میں یا حرم سے باہر جہاں کہیں ممکن ہو ادا کرنے سے واجب ادا ہوجائے گا، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حجۃ الوداع میں حضرت ام سلمہؓ کو ایسا ہی اتفاق ہوا کہ ان کو واجب طواف نماز پڑھنے کا وہاں موقع نہ ملا تو مسجد حرام بلکہ مکۂ مکرمہ سے نکلنے کے بعد ادا کی، اور بضرورت حرم سے باہر ادا کرنے پر جمہور علماء کے نزدیک کوئی دم بھی واجب نہیں ہوتا، صرف امام مالکؒ وجوب دم کے قائل ہیں (مناسک ملا علی قاری)

۶۔ طَهِّرَا بَيْتِيَ، اس میں بیت اللہ کو پاک کرنے کا حکم ہے جس میں ظاہری نجاسات اور گندگی سے طہارت بھی داخل ہے، اور باطنی نجاسات کفر وشرک اور اخلاقِ رذیلہ بغض وحسد، حرص وہوا تکبر وغرور، ریاء ونام ونمود سے پاکی بھی شامل ہے، اور اس حکمِ طہارت کیلئے لفظ بَيْتِيَ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ حکم تمام مساجد کے لئے عام ہے، کیونکہ ساری مساجد بیوت اللہ ہیں، جیساکہ ارشاد ہے، فِي بُيُوتٍ أَذِنَ اللَّهُ أَن تُرْفَعَ (۲۴: ۳۶)

حضرت فاروق اعظمؓ نے مسجد میں ایک شخص کی آواز سنی، تو فرمایا، تمھیں خبر نہیں کہ تم کہاں کھڑے ہو (قرطبی) یعنی مسجد کا ادب واحترام چاہئے، اس میں غیر مشروع آواز بلند نہیں کرنا چاہئے، حاصل یہ ہے کہ اس آیت سے جس طرح بیت اللہ کا تمام ظاہری اور باطنی نجاسات سے پاک رکھنا ضروری ہے، اسی طرح تمام مساجد کو بھی پاک رکھنا واجب ہے، یعنی مساجد میں داخل ہونے والوں پر لازم ہے کہ اپنے بدن اور کپڑوں کو بھی تمام نجاسات اور بدبُو کی چیزوں سے پاک صاف رکھیں، اور اپنے دلوں کو شرک ونفاق اور تمام اخلاقِ رذیلہ، تکبر، حسد، بغض، حرص وریاء وغیرہ کی نجاسات سے پاک کرکے داخل ہوں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ کوئی شخص پیاز، لہسن وغیرہ بدبودار چیز کھاکر مسجد میں نہ جائے، اور چھوٹے بچوں اور دیوانوں کو مسجدوں میں داخل ہونے سے منع فرمایا ہے، کہ ان سے نجاست کا خطرہ رہتا ہے۔

۷۔ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ آیت کے ان کلمات سے چند احکام وفوائد حاصل ہوئے، اوّل یہ کہ بناءِ بیت اللہ کا مقصد طواف، اعتکاف اور نماز ہے، دوسرے یہ کہ طواف

نماز سے مقدم ہے (کما روی عن ابن عباس) تیسرے یہ کہ اطرافِ عالم سے جانے والے حجاج کے لئے طواف بہ نسبت نماز کے افضل ہے، چوتھے یہ کہ بیت اللہ کے اندر نماز علی الاطلاق جائز ہے فرض ہو یا نفل (جصاص)

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ

اور جب کہا ابراہیم نے اے میرے رب بنا اس کو شہر امن کا اور روزی دے اس کے رہنے

مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ

والوں کو میوے جو کوئی ان میں سے ایمان لاوے اللہ پر اور قیامت کے دن پر فرمایا اور جو

كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ

کفر کرے اس کو بھی نفع پہنچاؤں گا تھوڑے دنوں پھر اس کو جبراً بلاؤں گا دوزخ کے عذاب میں اور وہ

الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ

بُری جگہ ہے رہنے کی، اور یاد کرو جب اٹھاتے تھے ابراہیم بنیادیں خانۂ کعبہ کی اور

اِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا

اسمٰعیلؑ دعاء کرتے تھے اے پروردگار ہمارے قبول کر ہم سے بیشک تو ہی ہے سننے والا جاننے والا اے پروردگار

وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠

ہمارے اور کر ہم کو حکم بردار اپنا اور ہماری اولاد میں بھی کر ایک جماعت فرمانبردار اپنی

وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾

اور بتلا ہم کو قاعدے حج کرنے کے اور ہم کو معاف کر بیشک تو ہی ہے توبہ قبول کرنیوالا مہربان۔

خلاصۂ تفسیر اور (وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جس وقت ابراہیم (علیہ السلام) نے (دعاء میں) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار اس (موقع) کو ایک (آباد) شہر بنا دیجئے (اور شہر بھی کیسا) امن (و امان) والا اور اس کے بسنے والوں کو پھلوں (کی قسم) سے بھی عنایت کیجئے (اور میں سب بسنے والوں کو نہیں کہتا بلکہ خاص) اُن کو (کہتا ہوں) جو اُن میں اللہ تعالیٰ

پر اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہوں (باقیوں کو آپ جانیں) حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا (کہ چونکہ رزق ہمارا خاص نہیں ہے، اس لئے ثمرات سب کو دوں گا مؤمن کو بھی) اور اس شخص کو بھی جو کافر رہے (البتہ نجاتِ آخرت چونکہ اہلِ ایمان کے ساتھ خاص ہی سو (اس واسطے) ایسے شخص کو (جوکہ کافر رہی) تھوڑے روز (یعنی دنیا میں) تو خوب آرام برتاؤں گا لیکن) پھر (بعد مرگ) اس کو کشاں کشاں عذابِ دوزخ میں پہنچادوں گا اور ایسی پہنچنے کی جگہ تو بہت بُری ہے (اللہ بچاوے، اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہی) جبکہ اٹھا رہے تھے ابراہیم علیہ السلام دیواریں خانہ کعبہ کی اور (ان کے ساتھ) اسمٰعیل علیہ السلام بھی (اور یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ) اے ہمارے پروردگار (یہ خدمت) ہم سے قبول فرمائیے، بلاشبہ آپ خوب سننے والے، جاننے والے ہیں (ہماری دعاء کو سنتے ہیں ہماری نیتوں کو جانتے ہیں) اے ہمارے پروردگار اور (ہم دونوں یہ بھی دعاء کرتے ہیں کہ) ہم کو اپنا اور زیادہ مطیع بنالیجئے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک ایسی جماعت پیدا کیجئے جو آپ کی مطیع ہو اور (نیز) ہم کو ہمارے حج (وغیرہ) کے احکام بھی بتلا دیجئے اور ہمارے حال پر (مہربانی کے ساتھ) توجہ رکھئے اور فی الحقیقت آپ ہی ہیں توجہ فرمانے والے، مہربانی کرنے والے۔

معارف و مسائل

حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ کی راہ میں قربانیاں دیں، مال و منال، اہل و عیال اور خود اپنے نفس کی خواہشات کو نظر انداز کر کے تعمیلِ احکامِ ربانی میں مسارعت کے جو کارنامے پیش کئے وہ عجائبِ روزگار میں سے ہیں۔

اس کے ساتھ اہل و عیال پر شفقت و محبت ایک طبعی اور فطری امر ہونے کے ساتھ حکم ربانی بھی ہے، مذکور الصدر آیات اس کا مظہر ہیں، انھوں نے اپنے اہل و عیال کیلئے دین و دنیا کی آسائش و راحت کے لئے دعائیں مانگی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعائیں دعاء کو شروع لفظ ربّ سے کیا ہے، جس کے معنی ہیں "اے میرے پالنے والے" ان الفاظ میں دعاء مانگنے کا سلیقہ سکھایا ہے، کہ خود یہ الفاظ حق تعالیٰ کی رحمت اور لطف و کرم کو متوجہ کرنے پر مؤثر دواعی ہیں، پھر سب سے پہلی دعاء یہ فرمائی کہ اس چٹیل میدان کو جس میں آپ کے حکم کے مطابق میں نے اپنے اہل و عیال کو لا ڈالا ہے آپ ایک شہر بنادیں، تاکہ یہاں کی سکونت میں اُن کو وحشت نہ ہو، اور ضروریاتِ زندگی بآسانی میسر آجائیں، یہی دعاء سورۂ ابراہیم میں ھٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا کے الفاظ سے آئی ہے، جس میں البلد کو الف لام کے ساتھ ذکر کیا ہے، جو عربی زبان کی اصطلاح میں معرفہ کہلاتا ہے، فرق کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پہلی دعاء جو آیت

سورۃ بقرہ میں بَلَدًا کے لفظ سے آئی ہے یہ اس وقت کی گئی ہے جب یہ جگہ جنگل تھی، شہر بنا نہیں تھا اسوقت بلد کو بغیر الف لام کے نکرہ استعمال کیا اور دوسری دعا بظاہر اسوقت کی ہے جب مکہ کی بستی بس گئی اور وہ شہر معروف بن گیا، اس کا قرینہ یہ ہے کہ سورۃ ابراہیم کی آخری آیات میں ہے: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡ وَهَبَ لِیۡ عَلَی الۡکِبَرِ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ ط (۱۴ : ۳۹) جس سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ یہ دعا حضرت اسحٰق ؑ کی پیدائش کے بعد کی ہے، اور حضرت اسحٰق حضرت اسمٰعیل ؑ سے تیرہ ۱۳ سال بعد میں پیدا ہوئے (ابن کثیر)

دوسری دعا اس میں یہ ہے کہ اس شہر کو امن والا شہر بنا دیجئے، یعنی جو قتل و غارت گری سے کفار کے تسلط سے اور آفات سے مامون و محفوظ رہے۔

حضرت خلیل اللہ ؑ کی یہ دعا قبول ہوئی، اور مکہ مکرمہ ایک ایسا آباد شہر ہو گیا، کہ اس کی اپنی آبادی کے علاوہ ساری دنیا کا مرجع بن گیا، اطرافِ عالم سے مسلمان وہاں پہنچنے کو اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھتے ہیں، اور مامون و محفوظ بھی ہو گیا، کہ بیت اللہ کے مخالف کسی قوم اور کسی بادشاہ کا اس پر تسلط نہیں ہو سکا، اصحابِ فیل کا واقعہ خود قرآن میں مذکور ہے، کہ انھوں نے بیت اللہ پر حملے کا قصد کیا تو پورے لشکر کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔

یہ شہر قتل و غارت گری سے بھی برابر محفوظ چلا آیا ہے، اسلام سے پہلے بھی زمانۂ جاہلیت والے کتنی ہی خرابیوں اور کفر و شرک کی رسموں میں مبتلا ہونے کے باوجود بیت اللہ اور اس کے ماحول حرم کی تعظیم و تکریم کو ایسا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے کہ کیسا ہی دشمن وہاں کسی کو مل جائے حرم میں اس سے قصاص یا انتقام نہ لیتے تھے، بلکہ سکانِ حرم کی تعظیم و تکریم بھی پورے عرب میں عام تھی، اسی لئے مکہ والے ملکِ شام اور یمن سے تجارتی درآمد و برآمد کا سلسلہ رکھتے تھے اور کوئی ان کی راہ میں حائل نہ ہوتا تھا۔

حدودِ حرم میں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو بھی امن دیا ہے، اس میں شکار جائز نہیں ایسا ہی جانوروں میں بھی یہ قدرتی احساس پیدا فرما دیا ہے، کہ حدودِ حرم میں آکر جانور اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے، کسی شکاری آدمی سے نہیں گھبراتا۔

حرم محترم کے مامون ہونے کے یہ احکام جو دعاءِ ابراہیمی کا نتیجہ ہیں زمانۂ جاہلیت سے قائم چلے آتے تھے، اسلام اور قرآن نے ان کو اور زیادہ نکھارا، اور تقویت پہنچائی، حجاج ابن یوسف اور پھر قرامطہ کے ظلم و ستم اور بدکاریوں سے جو قتل و قتال حرم میں ہوا اوّل تو وہ خود اسلام کا نام لینے والوں کے ہاتھوں ہوا، کوئی کافر قوم حملہ آور نہ تھی، اور کوئی شخص خود اپنے گھر کو آگ لگائے تو وہ امن کے منافی نہیں، اس کے علاوہ یہ واقعات شاذہ ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر آج تک ہزاروں سال کی مدت میں گنے چنے ہیں، اور قتل و قتال کے بعد ایسا کرنے والوں کا انجام

بھی سب کے سامنے آگیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ دعاءِ ابراہیمی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو ایک مامون شہر اور تمام دنیا کے لئے امن کی جگہ قدرتی طور پر بھی بنادی ہے، یہاں تک کہ دجّال کو بھی حرم میں داخل ہونے کی قدرت نہ ہوگی، اور شرعی طور پر بھی یہ احکام جاری فرما دیئے کہ حرم میں باہمی قتل و قتال تو کیا جانوروں کا شکار بھی حرام کر دیا گیا۔

تیسری دعاء یہ فرمائی کہ اس شہر کے باشندوں کو پھلوں کا رزق عطا فرمائیے، مکہ مکرّمہ اور اس کے آس پاس کی زمین نہ کسی باغ و چمن کی متحمل تھی، نہ وہاں دُور دُور تک پانی کا نام و نشان تھا، مگر حق تعالیٰ نے دعاءِ ابراہیمی کو قبول فرمایا، اور مکہ کے قریب ہی طائف کا ایک ایسا خطّہ بنادیا جس میں ہر طرح کے بہترین پھل بکثرت پیدا ہوتے اور مکہ مکرمہ آکر فروخت ہوتے ہیں، بعض اسرائیلی روایات میں ہے کہ طائف دراصل ملکِ شام کا خطہ تھا، جس کو بحکمِ خداوندی جبرئیل امین نے یہاں منتقل کر دیا۔

حکمتِ ابراہیمی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعاء میں یہ نہیں فرمایا کہ مکہ اور اس کے ماحول کو گلزار اور پھلوں کی زمین یا قابلِ کاشت بنا دیجئے، بلکہ دعاء یہ فرمائی کہ یہ چیزیں پیدا کہیں اور ہوں مگر مکہ میں پہنچا کریں، اس میں شاید یہ راز ہو کہ حضرت خلیلؑ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی اولاد کاشتکاری یا باغبانی کے کاموں میں مشغول ہو جائے، کیونکہ ان کو اس جگہ آباد کرنے کا منشاء تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود یہ فرما دیا رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت خلیل علیہ السلام اپنی اولاد کا اصل مشغلہ بیت اللہ کی حفاظت اور نماز کو رکھنا چاہتے تھے، ورنہ کیا مشکل تھا کہ خود مکہ مکرمہ کو ایسا گلزار بنا دیا جاتا کہ دمشق و بیروت اس پر رشک کرتے۔

رزق ثمرات تمام ضروریاتِ زندگی کو شامل ہے لفظ ثمرات جو ثمرہ کی جمع ہے اس کے معنی پھل کے ہیں، اور ظاہر اس سے مراد درختوں کے پھل ہیں، لیکن سورہ قصص آیت نمبر ۵۷ میں اس دعاء کی قبولیت کا اظہار ان الفاظ میں فرمادیا ہے، يُجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ ان الفاظ میں ایک تو اس کی تصریح ہے کہ خود مکہ میں یہ پھل پیدا کرنے کا وعدہ نہیں، بلکہ دوسرے مقامات سے یہاں لائے جایا کریں گے، کیونکہ لفظ یجبیٰ کا یہی مفہوم ہے، دوسرے ثمرات کل شجر نہیں فرمایا، بلکہ ثمرات کل شیءٍ فرمایا، اس تغیر لفظی سے ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہاں ثمرات کو عام کرنا مقصود ہے، کیونکہ ثمرہ عرف میں ہر چیز سے حاصل ہونے والی پیداوار کو کہا جاتا ہے، درختوں سے پیدا ہونے والے پھل جس طرح اس میں داخل ہیں اسی طرح مشینوں سے حاصل ہونے والا کل سامان بھی مشینوں کے ثمرات ہیں، اسی طرح مختلف دستکاریوں سے بننے والا سامان اُن دستکاریوں کے

ثمرات ہیں، اس طرح ثمرات کل شیء میں تمام ضروریات زندگی داخل ہوجاتی ہیں، اور حالات و واقعات کا مشاہدہ بھی یہ ثابت کرتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اگرچہ ارض حرم کو نہ کاشت کی زمین بنایا، نہ صنعتکاری کی، لیکن دنیا بھر میں پیدا ہونے والی اور بننے والی چیزیں یہاں عام طور پر ملجاتی ہیں، اور یہ بات شاید آج بھی کسی بڑے سے بڑے تجارتی یا صنعتی شہر کو حاصل نہ ہو کہ دنیا بھر کی مصنوعات بکثرت وبآسانی وہاں مل جاتی ہیں۔

حضرت خلیل اللہؑ کی احتیاط اس آیت میں جبکہ اہل مکہ کے لئے امن اور فراخئ عیش کی دعاء کی گئی، تو ان میں مومن کافر سب داخل تھے، اور اس سے پہلے حضرت خلیل اللہ نے جب ایک دعاء میں اپنی پوری ذریت کو بغیر امتیاز مومن و کافر جمع کیا تھا، تو حق تعالیٰ کی طرف سے یہ ارشاد آیا تھا کہ یہ دعاء مؤمنوں کے حق میں قبول ہے، ظالم مشرکوں کے حق میں قابل قبول نہیں، وہ دعاء تھی امامت و اقتدار کی، حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو جو مقامِ خلت پر فائز اور خشیۃ اللہ سے لبریز تھے اس جگہ بھی وہ بات یاد آئی تو اپنی دعاء میں یہ قید لگادی کہ یہ معاشی خوش حالی اور امن وامان کی دعاء صرف مؤمنین کے لئے کرتا ہوں، حق تعالیٰ کی طرف سے اس خشیت واحتیاط کی قدر کی گئی اور فرمایا وَمَنْ كَفَرَ یعنی یہ دنیوی خوش حالی اور اقتصادی فراخی ہم سبھی اہل مکہ کو عطا کریں گے، اگرچہ وہ ظالم مشرک و کافر ہی ہوں، البتہ مؤمنین کو یہ خوش حالی جس طرح دنیا میں دی جائے گی اسی طرح آخرت میں بھی عطا ہوگی، اور کافروں کو آخرت میں عذاب کے سوا کچھ نہیں۔

اپنے نیک عمل پر بھروسہ اور قناعت نہ کرنے کی تعلیم رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا، حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حکم ربانی کی تعمیل میں ملکِ شام کے ہرے بھرے خوش منظر خطہ کو چھوڑ کر مکہ مکرمہ کے خشک پہاڑوں کے درمیان اپنے اہل وعیال کو لاڈالا، اور بیت اللہ کی تعمیر میں اپنی پوری توانائی خرچ کی، یہ موقع ایسا تھا کہ ایسے مجاہدے کرنے والے کے دل میں عُجب پیدا ہوتا تو وہ اپنے عمل کو بہت کچھ قابلِ قدر سمجھتا، لیکن یہاں حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں، رب العزت کی بارگاہِ عزت وجلال کو پہچاننے والے ہیں کہ کسی انسان سے اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان عبادت واطاعت ممکن نہیں، ہر شخص اپنی قوت وہمت کی مقدار سے کام کرتا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ کوئی بھی بڑے سے بڑا عمل کرے تو اس پر ناز نہ کرے، بلکہ الحاح وزاری کے ساتھ دعاء کرے کہ میرا یہ عمل قبول ہوجائے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بناءِ بیت اللہ کے عمل کے متعلق یہ دعاء فرمائی کہ "اے ہمارے پروردگار آپ ہمارے اس عمل کو قبول فرمالیں، کیونکہ آپ تو سننے والے اور جاننے والے ہیں، ہماری دعاء کو سنتے ہیں اور ہماری نیتوں کو جانتے ہیں"

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ، یہ دعاء بھی اسی معرفت وخشیت کا نتیجہ ہے، جو حضرت خلیلؑ

کو حاصل تھی، کہ اطاعت و فرمانبرداری کے بے مثال کارنامے بجالانے کے بعد بھی یہ دعا کرتے ہیں کہ "ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنا لیجئے" وجہ یہ ہے کہ جتنی کسی کو حق تعالیٰ کی معرفت بڑھتی جاتی ہے، اتنا ہی اس کا یہ احساس بڑھتا جاتا ہے، کہ ہم حقِ وفاداری اور حقِ فرمانبرداری پورا ادا نہیں کر رہے۔

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ، اس دعا میں بھی اپنی اولاد کو شریک فرمایا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ والے جو اللہ کی راہ میں اپنی جان اور اولاد کی قربانی پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے ان کو اپنی اولاد سے کس قدر محبت ہوتی ہے، مگر اس محبت کے صحیح تقاضوں کو پورا کرتے ہیں جہاں تک عوام کی رسائی نہیں، عوام تو اولاد کی صرف جسمانی صحت و راحت کو جانتے ہیں، اُن کی ساری شفقت و راحت اُسی کے گرد گھومتی ہے، مگر اللہ کے مقبول بندے جسمانی سے زیادہ رُوحانی اور دُنیوی سے زیادہ اُخروی راحت کی فکر کرتے ہیں، اس لئے دعا فرمائی کہ میری اولاد میں سے ایک جماعت کو پورا فرمانبردار بنا دیجئے، اپنی ذرّیّت کے لئے دعا میں ایک حکمت اور بھی ہے کہ تجربہ شاہد ہے کہ جو لوگ قوم میں بڑے مانے جاتے ہیں ان کی اولاد اگر ان کے راستہ پر قائم رہی تو عوام میں اُن کی مقبولیت فطری ہوتی ہے انکی صلاحیت صلاحِ عوام کا ذریعہ بنتی ہے (بحر محیط)

حضرت خلیل اللہؑ کی یہ دعا بھی قبول ہوئی کہ آپ کی ذرّیّت میں ہمیشہ ایسے لوگ موجود رہے ہیں جو دینِ حق پر قائم اور اللہ کے فرماں بردار بندے تھے، جاہلیّتِ عرب میں جبکہ پوری دنیا کو خصوصاً عرب کو شرک وبت پرستی نے گھیر لیا تھا اس وقت اولادِ ابراہیم میں ہمیشہ کچھ لوگ عقیدۂ توحید آخرت کے سچے معتقد اور اطاعت شعار رہے ہیں، جیسے اہلِ جاہلیت میں زید بن عمرو بن نُفَیل اور قُسّ بن ساعدہ تھے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جدّامجد عبدالمطلب بن ہاشم کے متعلق بھی یہی روایت ہے کہ وہ شرک و بُت پرستی سے بیزار تھے (بحر محیط)

اَرِنَا مَنَاسِكَنَا، مناسک منسک کی جمع ہے، اعمالِ حج کو بھی مناسک کہا جاتا ہے، اور مقاماتِ حج، عرفات منیٰ، مزدلفہ کو بھی، یہاں دونوں مراد ہو سکتے ہیں، اور دعا کا حاصل یہ ہے کہ ہمیں اعمالِ حج اور مقاماتِ حج پوری طرح سمجھا دیجئے، اسی لئے لفظ اَرِنَا استعمال فرمایا، جس کے معنی ہیں "ہمیں دکھلا دیجئے" وہ دیکھنا آنکھوں سے بھی ہو سکتا ہے اور قلب سے بھی، چنانچہ مقاماتِ حج کو بذریعہ جبرئیل امینؑ دکھلا کر متعین کر دیا گیا اور احکامِ حج کی واضح تلقین و تعلیم فرما دی گئی۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ

اے پروردگار ہمارے اور بھیج ان میں ایک رسول انہی میں کا کہ پڑھے اُن پر تیری آیتیں اور سکھلائے ان کو

۱۵ ع ۸ ۱۵ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۱۲۹﴾

کتاب اور تہ کی باتیں اور پاک کرے ان کو بیشک تو ہی ہے بہت زبردست بڑی حکمت والا۔

خلاصۂ تفسیر اے ہمارے پروردگار اور یہ بھی دعاء ہے کہ) اس جماعت کے اندر (جس کے پیدا ہونے کی دعاء اپنی اولاد میں سے کر رہے ہیں) انہی میں کا ایک ایسا پیغمبر بھی مقرر کیجئے جو اُن لوگوں کو آپ کی آیات پڑھ کر سنایا کریں اور ان کو (آسمانی) کتاب (کے مضامین) کی اور (اس میں) خوش فہمی (کا سلیقہ حاصل کرنے کی) کی تعلیم دیا کریں اور ان کو (اس تعلیم و تلاوت کے ذریعہ جہالت کے خیالات اور اعمال سے) پاک کریں، بلاشبہ آپ ہی ہیں غالب القدرت کامل الانتظام

تشریحِ لغات

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ ، مصدر تلاوۃ سے مشتق ہے، تلاوت کے اصلی معنی اتباع اور پیروی کے ہیں، اصطلاحِ قرآن و حدیث میں یہ لفظ قرآن کریم اور دوسری آسمانی کتابوں اور کلامِ الٰہی کے پڑھنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، کیونکہ اس کلام کے پڑھنے والے کو اس کا پورا اتباع کرنا لازم ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ٹھیک اسی طرح پڑھنا ضروری ہے، اپنی طرف سے کسی لفظ یا اس کی حرکات میں کمی بیشی یا تبدیلی کی اجازت نہیں، امام راغب اصفہانیؒ نے "مفردات القرآن" میں فرمایا ہے کہ کلامِ الٰہی کے سوا کسی دوسری کتاب یا کلام کے پڑھنے کو عرفاً تلاوت نہیں کہا جاسکتا ۔

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ، اس میں کتاب سے مراد کتابُ اللہ ہے، اور الحکمۃ کا لفظ عربی لغت میں کئی معنے کے لئے آتا ہے، حق بات پر پہونچنا، عدل و انصاف، علم و حلم وغیرہ (قاموس) امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں کہ یہ لفظ جب اللہ تعالیٰ کے لئے بولا جاتا ہے تو اس کے معنی تمام اشیاء کی پوری معرفت اور مستحکم ایجاد کے ہوتے ہیں، اور جب غیر اللہ کے لئے بولا جائے تو موجودات کی صحیح معرفت اور نیک اعمال کے لئے جاتے ہیں، ترجمہ شیخ الہندؒ میں اس کا ترجمہ "تہہ کی باتیں" اسی مفہوم کو ادا کرتا ہے، اور لفظ حکمت عربی زبان میں کئی معنی کے لئے بولا جاتا ہے، علم صحیح، نیک عمل، عدل و انصاف، قول صادق وغیرہ۔ (قاموس و راغب)

اس لئے دیکھنا ہے کہ اس آیت میں لفظ حکمت سے کیا مراد ہے، مفسرین صحابہؓ و تابعینؒ جو معانیٔ قرآن کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھ کر کرتے ہیں، اس جگہ لفظ حکمت کے معنی بیان کرنے میں اگرچہ ان کے الفاظ مختلف ہیں، لیکن خلاصہ سب کا ایک ہی ہے، یعنی سنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، امام تفسیر ابن کثیرؒ و ابن جریرؒ نے حضرت قتادہؒ سے یہی تفسیر نقل کی ہے کسی نے تفسیر قرآن اور کسی نے تفقہ فی الدین فرمایا ہے اور کسی نے علم احکام شرعیہ کہا اور کسی نے کہا کہ ایسے احکام الٰہیہ کا علم جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی بیان سے معلوم ہو سکتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان سب کا حاصل وہی

حدیث وسنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

لفظ یُزَکِّیۡہِمۡ۔ زکوٰۃ سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں طہارت اور پاکی، اور یہ لفظ ظاہری اور باطنی ہر طرح کی پاکی کے لئے بولا جاتا ہے۔

معارف و مسائل

تشریح مذکورسے آیت کا مفہوم واضح ہوگیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی آئندہ نسل کی فلاح دنیا وآخرت کے واسطے حق تعالیٰ سے یہ دعاء کی کہ میری اولاد میں ایک رسول بھیج دیجئے جوان کو آپکی آیات تلاوت کر کے سنائے اور قرآن وسنت کی تعلیم دے، اوران کو ظاہری و باطنی گندگیوں سے پاک کرے، اس میں حضرت خلیل اللہؑ نے اس رسول کے لئے اپنی اولاد میں ہونے کی اس لئے دعاء فرمائی کہ اول تو یہ اپنی اولاد کے لئے سعادت وشرف ہے، دوسرے ان لوگوں کے لئے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ رسول جب انہی کی قوم اور برادری کے اندر ہوگا، تو اس کے چال، چلن سیرت وحالات سے یہ لوگ بخوبی واقف ہوں گے، کسی دھوکہ فریب میں مبتلا نہ ہوں گے، حدیث میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس دعاء کا جواب حق تعالیٰ کی طرف سے یہ ملا کہ آپ کی دعاء قبول کرلی گئی، اور یہ رسول آخری زمانہ میں بھیجے جائیں گے۔ (ابن جریر وابن کثیر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خصوصیات

مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اللہ کے نزدیک خاتم النبیین اسوقت تھا جبکہ آدم علیہ السلام پیدا بھی نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کا خمیر ہی تیار ہو رہا تھا، اور میں آپ لوگوں کو اپنے معاملہ کی ابتداء بتلاتا ہوں کہ میں اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت اور اپنی والدہ ماجدہ کے خواب کا مظہر ہوں، عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت سے مراد ان کا یہ قول ہے: مُبَشِّرًۢا بِرَسُوۡلٍ يَّاۡتِىۡ مِنۡۢ بَعۡدِى اسۡمُهٗۤ اَحۡمَدُ ؕ (۶۱: ۶)، اور والدہ ماجدہ نے حالتِ حمل میں یہ خواب دیکھا تھا کہ میرے بطن سے ایک نور نکلا جس سے ملکِ شام کے محلات جگمگا اُٹھے، پھر قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا تذکرہ کرتے ہوئے دو جگہ سورۃ آل عمران (آیت نمبر ۱۶۴) اور سورۃ جمعہ آیت نمبر ۲ میں انہی الفاظ کا اعادہ کیا گیا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء میں یہاں مذکور ہیں، جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس رسولؐ کے بھیجنے کی دعاء فرمائی تھی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، آیت کے الفاظ کی تشریح اور اس کا مفہوم واضح ہوجانے کے بعد اس پر غور کیجئے۔

بعثتِ رسولؐ کے تین مقاصد

سورۃ بقرہ کی اس آیت میں اور سورۃ آل عمران اور سورۃ جمعہ کی آیات میں آنحضرتؐ

صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایک ہی مضمون ایک ہی طرح کے الفاظ میں آیا ہے، جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا میں تشریف لانے کے مقاصد یا آپ کے عہدۂ نبوّت و رسالت کے فرائضِ منصبی تین بیان کئے گئے ہیں، ایک تلاوتِ آیات، دوسرے تعلیم کتاب و حکمت، تیسرے لوگوں کا تزکیۂ اخلاق وغیرہ۔

پہلا مقصد تلاوتِ آیات — یہاں پہلی بات قابلِ غور ہے کہ تلاوت کا تعلق الفاظ سے ہے اور تعلیم کا معانی سے، یہاں تلاوت و تعلیم کو الگ الگ بیان کرنے سے یہ حاصل ہوا کہ قرآن کریم میں جس طرح معانی مقصود ہیں، اس کے الفاظ بھی مستقل مقصود ہیں، ان کی تلاوت حفاظت فرض اور اہم عبادت ہے، یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بلا واسطہ شاگرد اور مخاطب خاص وہ حضرات تھے جو عربی زبان کے نہ صرف جاننے والے بلکہ اس کے فصیح و بلیغ خطیب اور شاعر بھی تھے، ان کے سامنے قرآن عربی کا پڑھ دینا بھی بظاہر انکی تعلیم کیلئے کافی تھا انکو الگ سے ترجمۂ تفسیر کی ضرورت نہ تھی تو پھر تلاوتِ آیات کو ایک علیحٰدہ مقصد اور تعلیم کتاب کو جداگانہ دوسرا مقصد رسالت قرار دینے کی کیا ضرورت تھی، جبکہ عمل کے اعتبار سے یہ دونوں مقصد ایک ہی ہو جاتے ہیں، اس میں غور کیا جائے تو دو اہم نتیجے آپ کے سامنے آئیں گے، اوّل یہ کہ قرآن کریم دوسری کتابوں کی طرح ایک کتاب نہیں جس میں صرف معانی مقصود ہوتے ہیں الفاظ ایک ثانوی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں اگر معمولی تغیر و تبدل بھی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا، ان کے الفاظ بغیر معنے سمجھے ہوئے پڑھتے رہنا بالکل لغو و فضول ہے، بلکہ قرآن کریم جس طرح معانی مقصود ہیں اسی طرح الفاظ بھی مقصود ہیں، اور الفاظِ قرآن کے ساتھ خاص خاص احکام شرعیہ بھی متعلق ہیں، یہی وجہ ہے کہ اصولِ فقہ میں قرآن کریم کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ ھو النظم والمعنی جمیعا یعنی قرآن نام ہے الفاظ اور معنی دونوں کا جس سے معلوم ہوا کہ اگر معانی قرآن کو الفاظ قرآن کے علاوہ دوسرے الفاظ یا دوسری زبان میں لکھا جائے تو وہ قرآن کہلانے کا مستحق نہیں، اگرچہ مضامین بالکل صحیح درست ہی ہوں، ان مضامینِ قرآنیہ کو بدلے ہوئے الفاظ میں اگر کوئی شخص نماز میں پڑھ لے، تو نماز ادا نہ ہوگی، اسی طرح وہ تمام احکام جو قرآن سے متعلق ہیں اس پر عائد نہیں ہوں گے، قرآن کریم کی تلاوت کا جو ثواب احادیث صحیحہ میں وارد ہے، وہ بدلی ہوئی زبان یا بدلے ہوئے الفاظ پر مرتب نہیں ہوگا، اور اسی لئے فقہائے امّت نے قرآن کریم کا صرف ترجمہ بلا متن قرآن کے لکھنے اور چھاپنے کو ممنوع فرمایا ہے، جس کو عرف میں اردو کا قرآن یا انگریزی کا قرآن کہدیا جاتا ہے، کیونکہ درحقیقت جو قرآن اردو یا انگریزی میں نقل کیا گیا وہ قرآن کہلانے کا مستحق نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں تعلیم کتاب

سے علیحدہ تلاوتِ آیات کو جداگانہ فرض قرار دے کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ قرآن کریم میں جس طرح اس کے معانی مقصود ہیں، اسی طرح اس کے الفاظ بھی مقصود ہیں، کیونکہ تلاوت الفاظ کی ہوتی ہے، معانی کی نہیں، اسی لئے جس طرح رسول کے فرائض میں معانی کی تعلیم داخل ہے، اسی طرح الفاظ کی تلاوت اور حفاظت بھی ایک مستقل فرض ہے، اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم کے نزول کا اصل مقصد اس کے بتائے ہوئے نظامِ زندگی پر عمل کرنا اور اس کی تعلیمات کو سمجھنا اور سمجھانا ہے، محض اس کے الفاظ رٹ لینے پر قناعت کر کے بیٹھ جانا قرآن کریم کی حقیقت سے بے خبری اور اس کی بے قدری ہے۔

قرآن کریم کے الفاظ اگر بے سمجھے بھی پڑھے جائیں تو بیکار نہیں، بلکہ موجبِ ثوابِ عظیم ہیں

لیکن اس کے ساتھ یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں کہ جب تک قرآن کریم کے الفاظ کے معانی نہ سمجھے طوطے کی طرح اس کے الفاظ پڑھنا فضول ہے، یہ میں اس لئے واضح کر رہا ہوں کہ آجکل بہت سے حضرات قرآن کریم کو دوسری کتابوں پر قیاس کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک کسی کتاب کے معنی نہ سمجھیں تو اس کے الفاظ کا پڑھنا پڑھانا وقت ضائع کرنا ہے، مگر قرآن کریم میں ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے، کیونکہ قرآن الفاظ اور معنی دونوں کا نام ہے، جس طرح ان کے معانی کا سمجھنا اور اس کے دیئے ہوئے احکام پر عمل کرنا فرض اور اعلیٰ عبادت ہے اسی طرح اس کے الفاظ کی تلاوت بھی ایک مستقل عبادت اور ثوابِ عظیم ہے۔

دوسرا مقصد تعلیم کتاب

یہی وجہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضؓ جو معانیِ قرآن کو سب سے زیادہ جاننے والے اور سمجھنے والے تھے، انھوں نے محض معنی سمجھ لینے اور عمل کر لینے کو کافی نہ سمجھا، سمجھنے اور عمل کرنے کے لئے تو ایک مرتبہ پڑھ لینا کافی ہوتا، انھوں نے ساری عمر تلاوتِ قرآن کو حرزِ جان بنائے رکھا، بعض صحابہؓ روزانہ ایک قرآن مجید ختم کرتے تھے، بعض دو دن میں اور اکثر حضرات تین دن میں ختمِ قرآن کے عادی تھے، اور ہر ہفتہ میں قرآن ختم کرنے کا تو پوری امت کا معمول رہا ہے، قرآن کریم کی سات منزلیں اسی ہفتہ واری معمول کی علامت ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کا یہ عمل بتلا رہا ہے کہ جس طرح قرآن کے معانی کا سمجھنا اور عمل کرنا اصلی عبادت ہے، اسی طرح اس کے الفاظ کی تلاوت بھی بجائے خود ایک اعلیٰ عبادت اور موجبِ انوار و برکات اور سرمایۂ سعادت و نجات ہے، اس لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں تلاوتِ آیات کو ایک مستقل حیثیت دی گئی، مقصد یہ ہے کہ جو مسلمان فی الحال معانیِ قرآن کو نہیں سمجھتے وہ اس بدنصیبی میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ الفاظ کو فضول سمجھ کر اس سے بھی محروم ہو جائیں، کوشش کرتے رہنا ضروری ہے کہ وہ

قرآن کے معانی کو سمجھیں تاکہ قرآن کریم کے حقیقی انوار و برکات کا مشاہدہ کریں، اور نزولِ قرآن کا اصلی مقصد پورا ہو، قرآن کو معاذ اللہ جنتر منتر کی طرح صرف جھاڑ پھونک میں استعمال کی چیز نہ بنائیں، اور بقول اقبال مرحوم سورۃ یٰسٓ کو صرف اس کام کے لئے نہ سمجھیں کہ اس کے پڑھنے سے مرنے والے کی جان سہولت سے نکل جاتی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہو کہ اس آیت میں فرائضِ رسولؐ بیان کرتے ہوئے تلاوتِ آیات کو مستقل فرض کی حیثیت دے کر اس پر تنبیہ کر دی گئی ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ کی تلاوت اور ان کی حفاظت اور ان کو ٹھیک اس لب و لہجہ میں پڑھنا جس پر وہ نازل ہوئے ہیں، ایک مستقل فرض ہے، اسی طرح تلاوتِ آیات کے فرض کے ساتھ تعلیم کتاب کو جداگانہ فرض قرار دینے سے ایک دوسرا اہم نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن فہمی کے لئے صرف عربی زبان کا جان لینا کافی نہیں بلکہ تعلیمِ رسولؐ کی ضرورت ہے جیسے کہ تمام علوم و فنون میں یہ بات معلوم و مشاہد ہے کہ کسی فن کی کتاب کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے محض اس کتاب کی زبان جاننا بلکہ زبان کا ماہر ہونا بھی کافی نہیں، جب تک کہ اس فن کو کسی ماہر اُستاذ سے حاصل نہ کیا جائے، مثلاً آجکل ڈاکٹری، ہومیوپیتھک اور ایلوپیتھک کی کتابیں عموماً انگریزی زبان میں ہیں، لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ محض انگریزی زبان میں مہارت پیدا کر لینے اور ڈاکٹری کی کتابوں کا مطالعہ کر لینے سے کوئی شخص ڈاکٹر نہیں بن سکتا، انجینئرنگ کی کتابیں پڑھنے سے کوئی انجینئر نہیں بن سکتا، بڑے فنون تو اپنی جگہ پر ہیں، معمولی روزمرہ کے کام محض کتاب کے مطالعہ بغیر استاد سے سیکھے ہوئے حاصل نہیں ہو سکتے، آج تو ہر صنعت و حرفت پر سینکڑوں کتابیں لکھی ہوئی ہیں، فوٹو دیکر کام سکھانے کے طریقے بتائے ہیں، لیکن ان کتابوں کو دیکھ کر نہ کوئی درزی بنتا ہے نہ باورچی یا لوہار، اگر محض زبان جان لینا کسی فن کے حاصل کرنے اور اس کی کتاب سمجھنے کے لئے کافی ہوتا تو دنیا کے سب فنون اس شخص کو حاصل ہو جاتے جو ان کتابوں کی زبان جانتا ہے، اب ہر شخص غور کر سکتا ہے کہ معمولی فنون اور اُن کے سمجھنے کے لئے جب محض زبان دانی کافی نہیں، تعلیم استاد کی ضرورت ہے تو مضامینِ قرآن جو علومِ الٰہیہ سے لے کر طبعیات و فلسفہ تک تمام گہرے دقیق علوم پر مشتمل ہو وہ محض عربی زبان جان لینے سے کیسے حاصل ہو سکتے ہیں، اور اگر یہی ہوتا تو جو شخص عربی زبان سیکھ لے وہ معارفِ قرآن کا ماہر سمجھا جائے تو آج بھی ہزاروں یہودی اور نصرانی عرب ممالک میں عربی زبان کے بڑے ماہر ادیب ہیں وہ سب سے بڑے مفسرِ قرآن مانے جاتے، اور عہدِ رسالتؐ میں ابوجہل ابولہب قرآن کے ماہر سمجھے جاتے۔

غرض یہ ہے کہ قرآن کریم نے ایک طرف تو رسولؐ کے فرائض میں تلاوتِ آیات کو ایک

مستقل فرض قرار دیا، دوسری طرف تعلیمِ کتاب کو جداگانہ فرض قرار دے کر بتلادیا کہ محض تلاوتِ آیات کا سُن لینا فہم قرآن کے لئے عربی زبان جاننے والوں کے واسطے بھی کافی نہیں، بلکہ تعلیم رسول ہی کے ذریعہ قرآنی تعلیم کا صحیح علم حاصل ہوسکتا ہے، قرآن کو تعلیماتِ رسول سے جدا کرکے خود سمجھنے کی فکر خود فریبی کے سوا کچھ نہیں، اگر مضامینِ قرآنی کو بتلانے سکھانے کی ضرورت نہ ہوتی تو رسول کو بھیجنے ہی کی کوئی حاجت نہ تھی، اللہ کی کتاب کسی دوسری طرح بھی انسانوں تک پہونچائی جاسکتی تھی، مگر اللہ تعالیٰ علیم وحکیم ہیں، وہ جانتے ہیں کہ مضامینِ قرآنی کی تعلیم وتفہیم کے لئے دنیا کے دوسرے علوم وفنون سے زیادہ تعلیمِ استاد کی ضرورت ہے، اور یہاں پر عام استاد بھی کافی نہیں، بلکہ ان مضامین کا استاد صرف وہ شخص ہوسکتا ہے جس کو حق تعالیٰ سے بذریعہ وحی شرفِ ہمکلامی حاصل ہو، جس کو اسلام کی اصطلاح میں نبی ورسول کہا جاتا ہے، اسی لئے قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں بھیجنے کا مقصد یہ قرار دیا کہ وہ قرآن کریم کے معانی واحکام کی شرح کرکے بیان فرمائیں، ارشاد ہے لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (۱۶: ۴۴) "یعنی ہم نے آپ کو اس لئے بھیجا ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے اللہ کی نازل کردہ آیات کے مطالب بیان فرمائیں"

تعلیمِ کتاب کے ساتھ آپ کے فرائض میں دوسری چیز تعلیم حکمت بھی رکھی گئی ہے، اور میں نے اوپر بتلایا ہے کہ حکمت کے عربی زبان کے اعتبار سے اگرچہ کئی معنی ہوسکتے ہیں، لیکن اس آیت میں اور اس کے ہم معنی دوسری آیات میں صحابہؓ وتابعینؒ نے حکمت کی تفسیر سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی ہے، جس سے واضح ہوا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ جس طرح معانی قرآن کا سمجھانا اور بتلانا فرض ہے، اسی طرح پیغمبرانہ تربیت کے اصول وآداب جن کا نام سنت ہے، ان کی تعلیم بھی آپ کے فرائضِ منصبی میں داخل ہے اور اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا "میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں" اور یہ ظاہر ہے کہ جب آپ کا مقصد وجود معلم ہونا ہے، تو آپ کی امت کا مقصدِ وجود متعلم اور طالب علم ہونا لازم ہوگیا، اس لئے ہر مسلمان مرد وعورت بحیثیت مسلمان ہونے کے ایک طالب علم ہونا چاہئے جس کو تعلیماتِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لگن ہو، اگر علومِ قرآن وسنت کی مکمل تحصیل اور اس میں مہارت کے لئے ہمت وفرصت نہیں ہے تو کم ازکم بقدرِ ضرورت علم حاصل کرنے کی فکر چاہئے۔

تیسرا مقصد تزکیہ تیسرا فرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں تزکیہ ہے، جس کے معنی ہیں، ظاہری وباطنی نجاسات سے پاک کرنا، ظاہری نجاسات سے تو عام مسلمان واقف ہیں، باطنی نجاسات کفر اور شرک، غیر اللہ پر اعتماد کلّی اور اعتقاد فاسد، نیز تکبر وحسد وبغض، حبّ دنیا وغیرہ ہیں، اگرچہ علمی طور پر قرآن وسنت کی تعلیم میں ان سب چیزوں کا بیان آگیا ہے، لیکن تزکیہ کو آپ کا

جداگانہ فرض قرار دے کر اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا، کہ جس طرح محض الفاظ کے سمجھنے سے کوئی فن حاصل نہیں ہوتا، اسی طرح نظری و علمی طور پر فن حاصل ہو جانے سے اس کا استعمال اور کمال حاصل نہیں ہوتا جب تک کسی مربی کے زیر نظر اس کی مشق کر کے عادت نہ ڈالے، سلوک و تصوف میں کسی شیخ کامل کی تربیت کا یہی مقام ہے کہ قرآن و سنت میں جن احکام کو علمی طور پر بتلایا گیا ہے اُنکی عملی طور پر عادت ڈالی جائے۔

ہدایت و اصلاح کے دو سلسلے، کتاب اللہ اور رجال اللہ اب اس سلسلے کی دو باتیں اور قابلِ نظر ہیں: اوّل یہ کہ اللہ جل شانہٗ نے ابتداءِ آفرینش سے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے ہمیشہ ہر زمانے میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک دو سلسلے جاری رکھے ہیں، ایک آسمانی کتابوں کا دوسرے اس کی تعلیم دینے والے رسولوں کا، جس طرح محض کتاب نازل فرما دینے کو کافی نہیں سمجھا، اسی طرح محض رسولوں کے بھیجنے پر بھی اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ دونوں سلسلے برابر جاری رکھے، اللہ جل شانہٗ کی اس عادت اور قرآن کریم کی شہادت نے قوموں کی اصلاح و فلاح کے لئے ان دونوں سلسلوں کو یکساں طور پر جاری فرما کر ایک بڑے علم کا دروازہ کھول دیا کہ انسان کی صحیح تعلیم و تربیت کے لئے نہ صرف کتاب کافی ہے، نہ کوئی مربی انسان، بلکہ ایک طرف آسمانی ہدایات اور الٰہی قانون کی ضرورت ہے جس کا نام کتاب یا قرآن ہے، دوسری طرف ایک معلّم اور مربی انسان کی ضرورت ہے جو اپنی تعلیم و تربیت سے عام انسان کو آسمانی ہدایات سے روشناس کر کے ان کا خوگر بنائے، کیونکہ انسان کا اصلی معلّم انسان ہی ہو سکتا ہے، کتاب معلّم یا مربی نہیں ہو سکتی، ہاں تعلیم و تربیت میں معین و مددگار ضرور ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جس طرح اسلام کی ابتداء ایک کتاب اور ایک رسول سے ہوئی، اور ان دونوں کے امتزاج نے ایک صحیح اور اعلیٰ مثالی معاشرہ دنیا میں پیدا کر دیا، اسی طرح آگے آنیوالی نسلوں کے لئے بھی ایک طرف شریعت مطہرہ اور دوسری طرف رجال اللہ کا سلسلہ رہا، قرآن کریم نے جگہ جگہ اس کی ہدایتیں دی ہیں، ایک جگہ ارشاد ہوا:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (۹: ۱۱۹)	"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور صادقین کے ساتھ رہو"

دوسری جگہ صادقین کی تعریف اور اوصاف بیان کر کے فرمایا:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (۲: ۱۷۷)	"اور یہی لوگ سچے ہیں، اور یہی ہیں پرہیزگار"

پورے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ ہے، اور سورۂ فاتحہ کا خلاصہ صراطِ مستقیم کی ہدایت ہے

۲۱
یہاں بھی صراطِ مستقیم کا پتہ دینے کے لئے بجائے اس کے کہ صراط القرآن یا صراط الرسول یا صراط السنۃ فرمایا جاتا، کچھ اللہ والے لوگوں کا پتہ دیا گیا کہ اُن سے صراطِ مستقیم حاصل کی جاتے، ارشاد ہوا:

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝	"یعنی صراطِ مستقیم اُن لوگوں کا راستہ ہے جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا ہے نہ کہ اُن لوگوں کا جو گمراہ ہوگئے"

دوسری جگہ ان کی مزید تعیین اور توضیح قرآن میں وارد ہوئی جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ (۴: ۶۹)
اسی طرح رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد کے لئے کچھ حضرات کے نام متعین کرکے دینی معاملات میں آپ کا اتباع کرنے کی ہدایت فرمائی، ترمذی کی صحیح حدیث میں ہے:

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ اَمْرَيْنِ مَا اِنْ اَخَذْتُمْ بِهٖ لَنْ تَضِلُّوْا كِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِيْ اَهْلَ بَيْتِيْ (ترمذی)	"اے لوگو! میں تمہارے لئے اپنے بعد میں دو چیزیں چھوڑتا ہوں اُن دونوں کو مضبوطی سے تھامے رہنا تو تم گمراہ نہ ہوگے، ایک کتاب اللہ دوسری میری اولاد اور اہلِ بیت"

اور صحیح بخاری کی حدیث میں ہے:

اِقْتَدُوْا بِالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِيْ اَبِيْ بَكْرٍ وَعُمَرَ	"یعنی میرے بعد ابوبکرؓ اور عمرؓ کا اتباع کرو"

اور ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:-

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ	"میرے طریقہ کو اختیار کرو، اور خلفائے راشدین کے طریقہ کو"

خلاصۂ کلام یہ ہو کہ قرآن کریم کی ان ہدایات اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ قوموں کی اصلاح و تربیت کے لئے ہر قرن ہر زمانے میں دو چیزیں ضروری ہیں، قرآنی ہدایات اور ان کے سمجھنے اور اُن پر عمل کرنے کا سلیقہ حاصل کرنے کے لئے ماہرینِ شریعت اور اللہ والوں کی تعلیم و تربیت، اور اگر مختلف علوم و فنون اور اُن کے سیکھنے سکھانے کے طریقوں پر ناقدانہ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اصولِ تعلیم و تربیت کچھ دین اور دینیات ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تمام علوم و فنون کی صحیح تحصیل اسی پر دائر ہے کہ ایک طرف ہر فن کی بہترین کتابیں ہوں تو دوسری طرف ماہرین کی تعلیم و تربیت، ہر علم و فن کی ترقی و تکمیل کے یہی دو بازو ہیں، لیکن دین اور دینیات میں ان دونوں بازوؤں سے فائدہ اٹھانے

میں بہت سے لوگ افراط و تفریط کی غلط روش میں پڑ جاتے ہیں، جس کا نتیجہ بجائے فائدہ اٹھانے کے نقصان اور بجائے اصلاح کے فساد ہوتا ہے۔

بعض لوگ کتاب اللہ کو نظر انداز کر کے صرف علماء و مشائخ ہی کو قبلۂ مقصود بنا لیتے ہیں اور ان کے متبع شریعت ہونے کی تحقیق نہیں کرتے، اور یہ اصلی مرض یہود و نصاریٰ کا ہے کہ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳۱:۹) "یعنی ان لوگوں نے اپنے علماء و مشائخ کو اللہ کے سوا اپنا معبود اور قبلۂ مقصود بنا لیا" ظاہر ہے کہ یہ راستہ شرک و کفر کا ہے، اور لاکھوں انسان اس راستہ میں برباد ہوئے، اور ہو رہے ہیں، اس کے مقابلہ میں بعض وہ لوگ بھی ہیں جو علومِ قرآن و حدیث کے حاصل کرنے میں کسی معلّم و مربّی کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں صرف اللہ کی کتاب کافی ہے، نہ ماہر علماء کی ضرورت، نہ تربیت یافتہ مشائخ کی حاجت، یہ دوسری گمراہی ہے، جس کا نتیجہ دین و ملّت سے نکل کر نفسانی اغراض کا شکار ہونا ہے، کیوں کہ ماہرین کی امداد و اعانت کے بغیر کسی فن کا صحیح حاصل ہو جانا انسانی فطرت کے خلاف ہے، ایسا کرنے والا یقیناً غلط فہمیوں کا شکار ہوتا ہے، اور یہ غلط فہمی بعض اوقات اس کو دین و ملّت سے بالکل نکال دیتی ہے۔

اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ ان دو چیزوں کو اپنے اپنے مقامات اور حدود میں رکھکر ان سے فائدہ اٹھایا جائے، یہ سمجھا جائے کہ حکم اصلی صرف ایک وحدہٗ لاشریک لہٗ کا ہے، اور اطاعت اصل میں اسی کی ہے، رسولؐ بھی اس پر عمل کرنے اور کرانے کا ایک ذریعہ ہیں، رسولؐ کی اطاعت بھی محض اسی نظر سے کی جاتی ہے، کہ وہ بعینہٖ اللہ جل شانہٗ کی اطاعت ہے، ہاں اس کے ساتھ قرآن و حدیث کے سمجھنے میں اور ان کے احکام پر عمل کرنے میں جو علمی یا عملی مشکلات سامنے آئیں اس کے لئے ماہرین کے قول و فعل سے امداد لینے کو سرمایۂ سعادت و نجات سمجھنا ضروری ہے، آیت مذکورہ میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں تعلیمِ کتاب کو داخل فرمانے سے ایک دوسرا فائدہ یہ بھی حاصل ہوا ہے کہ جب قرآن فہمی کے لئے تعلیمِ رسولؐ ضروری ہوا اور اس کے بغیر قرآن پر صحیح عمل ناممکن ہوا تو جس طرح قرآن قیامت تک محفوظ ہے اس کا ایک ایک زیر و زبر محفوظ ہے، ضروری ہے کہ تعلیماتِ رسولؐ بھی مجموعی حیثیت سے قیامت تک باقی اور محفوظ رہیں، ورنہ محض الفاظ قرآن کے محفوظ رہنے سے نزولِ قرآن کا اصلی مقصد پورا نہ ہوگا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ تعلیماتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم وہی ہیں جن کو سنت یا حدیثِ رسولؐ کہا جاتا ہے، اس کی حفاظت کا وعدہ اللہ جل شانہٗ کی طرف سے اگرچہ اس درجہ میں نہیں ہے جس درجہ کی حفاظت قرآن کے لئے موعود ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝	ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں ؛

جس کا یہ نتیجہ ہے کہ اس کے الفاظ اور زیر زبر تک بالکل محفوظ چلے آئے ہیں، اور قیامت تک اسی طرح محفوظ رہیں گے، سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ اگرچہ اس طرح محفوظ نہیں لیکن مجموعی حیثیت سے آپؐ کی تعلیمات کا محفوظ رہنا آیتِ مذکورہ کی رُو سے لازمی ہے، اور بحمد اللہ آج تک وہ محفوظ چلی آتی ہیں، جب کسی طرف سے اس میں رخنہ اندازی یا غلط روایات کی آمیزش کی گئی ماہرینِ سنت نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ نکھار کر رکھ دیا، اور قیامت تک یہ سلسلہ بھی اسی طرح رہے گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمت میں قیامت تک ایسی جماعت اہلِ حق اور اہلِ علم قائم رہے گی، جو قرآن و حدیث کو صحیح طور پر محفوظ رکھے گی، اور اُن میں ڈالے گئے ہر رخنہ کی اصلاح کرتی رہے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب قرآن پر عمل کرنے کے لئے تعلیمِ رسولؐ ضروری ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآن پر عمل قیامت تک فرض ہے تو لازم ہے کہ قیامت تک تعلیماتِ رسولؐ بھی باقی اور محفوظ رہیں، اس لئے آیت میں تعلیماتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قیامت تک باقی اور محفوظ رہنے کی بھی پیشنگوئی موجود ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے صحابۂ کرامؓ سے لے کر آج تک علمِ حدیث کے ماہر علماء اور مستند کتابوں کے ذریعہ محفوظ رکھا ہے، اس سے اس دجل والحاد کی حقیقت کھل جاتی ہے جو آجکل بعض لوگوں نے احکامِ اسلام سے جان بچانے کے لئے یہ بہانہ تراشا ہے کہ موجودہ ذخیرۂ حدیث محفوظ اور قابلِ اطمینان نہیں ہے، ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ ذخیرۂ حدیث سے اعتماد اُٹھ جائے تو قرآن پر بھی اعتماد کا کوئی راستہ نہیں رہتا۔

آیتِ مذکورہ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تیسرا فرضِ منصبی تزکیہ قرار دیا ہے، تزکیہ کے معنی باطنی نجاسات اور گندگیوں سے پاک کرنا ہے، یعنی شرک و کفر اور عقائدِ فاسدہ سے نیز بُرے اخلاق تکبر، حرص و طمع، بغض و حسد، حُبِّ مال و جاہ وغیرہ سے پاک کرنا۔

اصلاحِ انسان کیلئے صرف تعلیم صحیح بھی کافی نہیں اخلاقی تربیت بھی ضروری ہے

تزکیہ کو تعلیم سے جدا کر کے مستقل مقصدِ رسالت اور رسولؐ کا فرضِ منصبی قرار دینے میں اس طرف اشارہ ہے کہ تعلیم کتنی ہی صحیح ہو محض تعلیم سے عادۃً اصلاحِ اخلاق نہیں ہوتی جب تک کسی تربیت یافتہ مربی کے زیر نظر عملی تربیت حاصل نہ کرے، کیونکہ تعلیم کا کام درحقیقت سیدھا اور صحیح راستہ دکھلا دینا ہے، مگر ظاہر ہے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے محض راستہ جان لینا تو کافی نہیں جب تک ہمت کر کے قدم نہ اٹھائے اور راستہ نہ چلے، اور ہمت کا نسخہ بجز اہلِ ہمت کی صحبت

اور اطاعت کے اور کچھ نہیں، ورنہ سب کچھ جاننے سمجھنے کے بعد بھی حالت یہ ہوتی ہے کہ ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت وزہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

عمل کی ہمت و توفیق کسی کتاب کے پڑھنے یا سمجھنے سے پیدا نہیں ہوتی، اس کی صرف ایک ہی تدبیر ہے کہ اللہ والوں کی صحبت اور ان سے ہمت کی تربیت حاصل کرنا، اسی کا نام تزکیہ ہے، قرآن کریم نے تزکیہ کو مقاصدِ رسالت میں ایک مستقل مقصد قرار دے کر تعلیماتِ اسلام کی نمایاں خصوصیت کو بتلایا ہے، کیونکہ محض تعلیم اور ظاہری تہذیب تو ہر قوم اور ہر ملت میں کسی نہ کسی صورت سے کامل یا ناقص طریق پر ضروری سمجھی جاتی ہے، ہر مذہب و ملت اور ہر سوسائٹی میں اس کو انسانی ضروریات میں داخل سمجھا جاتا ہے، اس میں اسلام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے صحیح اور مکمل تعلیم پیش کی جو انسان کی انفرادی زندگی سے لیکر عائلی پھر قبائلی زندگی اور اس سے آگے بڑھ کر سیاسی و ملکی زندگی پر حاوی اور بہترین نظام کی حامل ہے، جس کی نظیر دوسری اقوام و ملل میں نہیں پائی جاتی، اس کے ساتھ تزکیۂ اخلاق اور باطنی طہارت ایک ایسا کام ہے جس کو عام اقوام اور سوسائیٹیوں نے سرے سے نظر انداز کر رکھا ہے، انسانی لیاقت و استعداد کا معیار اس کی تعلیمی ڈگریاں سمجھی جاتی ہیں، انہی ڈگریوں کے وزن کے ساتھ انسانوں کا وزن گھٹتا بڑھتا ہے، اسلام نے تعلیم کے ساتھ تزکیہ کا ضمیمہ لگا کر تعلیم کے اصل مقصد کو پورا کر دکھایا۔

جو خوش نصیب حضرات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے زیرِ تعلیم رہے، تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کا باطنی تزکیہ بھی ہوتا گیا، اور جو جماعت صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین آپ کی زیرِ تربیت تیار ہوئی، ایک طرف اُن کی عقل و دانش اور علم و حکمت کی گہرائی کا یہ عالم تھا کہ ساری دنیا کے فلسفے اس کے سامنے گرد ہوگئے، تو دوسری طرف ان کے تزکیۂ باطنی اور تعلق مع اللہ اور اعتماد علی اللہ کا یہ درجہ تھا جو خود قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:

وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا (۴۸: ۲۹)

"اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں رحمدل ہیں، تم انہیں رکوع سجدہ کرتے ہوئے دیکھوگے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی تلاش کرتے ہیں"

یہی وجہ تھی کہ وہ جس طرف چلتے تھے فتح و نصرت اُن کے قدم لیتی تھی، تائید ربانی ان کے ساتھ ہوتی تھی، اُن کے محیر العقول کارنامے جو آج بھی ہر قوم و ملت کے ذہنوں کو مرعوب کئے ہوئے

ہیں وہ اسی تعلیم و تزکیہ کے اعلیٰ نتائج ہیں، آج دنیا میں تعلیم کو بہتر بنانے کے لئے نصابوں کی تبدیلی و ترمیم پر توسب لوگ غور کرتے ہیں، لیکن تعلیم کی رُوح کو درست کرنے کی طرف عام طور پر توجہ نہیں دی جاتی، کہ مدرّس اور معلّم کی اخلاقی حالت اور مصلحانہ تربیت کو دیکھا جائے اس پر زور دیا جائے، اس کا نتیجہ ہے کہ ہزار کوششوں کے بعد بھی ایسے مکمل انسان پیدا نہیں ہوتے جن کے عمدہ اخلاق دوسروں پر اثر انداز ہوں، اور دوسروں کی تربیت کرسکیں۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اساتذہ جس علم و عمل اور اخلاق و کردار کے مالک ہونگے ان سے پڑھنے والے طلبہ زیادہ سے زیادہ انہی جیسے پیدا ہو سکیں گے، اس لئے تعلیم کو مفید اور بہتر بنانے کے لئے نصابوں کی تدوین و ترمیم سے زیادہ اس نصاب کے پڑھانے والوں کی علمی و عملی و اخلاقی حالات پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

یہاں تک رسالت و نبوت کے تین مقاصد کا بیان تھا، آخر میں مختصر طور پر یہ بھی سن لیجئے کہ سردار دو عالم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تین فرائض منصبی سپرد کئے گئے تھے، ان کو آپ نے کس حد تک پورا فرمایا، آپ کو ان کے پورا کرنے میں کہاں تک کامیابی ہوئی، اس کے لئے اتنا جان لینا کافی ہے، کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے تشریف لے جانے سے پہلے پہلے تلاوتِ آیات کا یہ درجہ ہوگیا تھا، کہ تقریباً پورے جزیرۃ العرب میں قرآن پڑھا جارہا تھا ہزاروں اس کے حافظ تھے، سینکڑوں ایسے حضرات تھے جو روزانہ یا تیسرے روز پورا قرآن ختم کرتے تھے، تعلیمِ کتاب و حکمت کا یہ مقام تھا ؎

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست
کتب خانہ چند ملت بشست

دنیا کے سارے فلسفے قرآن کے سامنے ماند ہو چکے تھے، توریت و انجیل کے تحریف شدہ صحائف افسانہ بن چکے تھے، قرآنی اصول کو عزت و شرف کا معیار مانا جاتا تھا، تزکیہ کا یہ عالم تھا کہ ساری بد اخلاقیوں کے مرتکب افراد تہذیبِ اخلاق کے معلّم بن گئے، بداخلاقیوں کے مریض نہ صرف صحتیاب بلکہ کامیاب معالج اور مسیحا بن گئے، جو رہزن تھے رہبر بن گئے، غرض بت پرست لوگ ایثار و ہمدردی کے مجسّمے بن گئے، تندخوئی اور جنگ جوئی کی جگہ نرمی اور صلح جوئی نظر آنے لگی، چور اور ڈاکو، لوگوں کے اموال کے محافظ بن گئے۔

الغرض حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جن مقاصد کے لئے دعاء فرمائی، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا تھا وہ تینوں مقصد آپ کے عہد مبارک ہی میں نمایاں طور پر کامیاب ہوئے، پھر آپ کے بعد آپ کے صحابۂ کرامؓ نے تو ان کو مشرق سے مغرب

اور جنوب سے شمال تک ساری دنیا میں عام کردیا، فصلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین وسلم تسلیماً کثیراً لعدد من صلّٰی وصام وقعد وقام۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ

اور کون ہے جو پھرے ابراہیم کے مذہب سے مگر وہی جس نے احمق بنایا اپنے آپ کو اور بیشک

اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾

ہم نے ان کو منتخب کیا دنیا میں اور وہ آخرت میں نیکوں میں ہیں،

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَوَصّٰى

یاد کرو جب اس کو کہا اس کے رب نے کہ حکمبرداری کر تو بولا کہ میں حکمبردار ہوں تمام عالم کے پروردگار کا، اور یہی وصیت

بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ

کر گیا ابراہیم اپنے بیٹوں کو اور یعقوب بھی کہ اے بیٹو بیشک اللہ نے چن کر دیا ہے تم کو

الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

دین سو تم ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان۔

حلِ لغات

سَفِهَ نَفْسَهٗ ۔ سفہ بمعنی جہل، وانتصاب نفسہ علیٰ انہ تمییز علیٰ قول الفراء اوشبّہ بالمفعول علیٰ قول بعض الکوفیین او مفعول بہ اما لکون سفہ متعدیاً بنفسہ کسفّہ المضعف اولکونہ ضمن معنی ما یتعدی ای جہل وھو قول الزجاج، ترجمہ شیخ الہندؒ اسی پر مبنی ہے اسلئے سَفِهَ نَفْسَهٗ کے معنی پہلی توجیہ کے اعتبار سے وہ ہیں جو خلاصۂ تفسیر میں لئے گئے کہ اپنی ذات ہی سے احمق ہو اور دوسری توجیہ پر معنی یہ ہوں گے کہ ملتِ ابراہیمی سے رُوگردانی وہی کریگا جو اپنے نفس سے بھی جاہل ہو، یعنی اس کو خود اپنی ذات کی بھی خبر نہ ہو کہ میں کیا ہوں۔

خلاصۂ تفسیر

اور ملتِ ابراہیمی سے تو وہی روگردانی کرے گا جو اپنی ذات ہی سے احمق ہو، اور (ایسی ملت کے تارک کو کیونکر احمق نہ کہا جائے جس کی یہ شان ہو کہ اسی کی بدولت) ہم نے ان (ابراہیم علیہ السلام) کو (عہدۂ رسالت کے لئے) دنیا میں منتخب کیا اور (اسی کی بدولت) وہ آخرت میں بڑے لائق لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں (جن کے لئے سب ہی کچھ ہے اور یہ انتخاب عہدۂ رسالت کے لئے اس وقت ہوا تھا) جب کہ ان سے ان کے پروردگار نے (بطور الہام کے) فرمایا کہ تم (حق تعالیٰ کی) اطاعت اختیار کرو، انھوں نے عرض کیا کہ میں نے

اطاعت اختیار کی رب العالمین کی (پس اسی اطاعت کے اختیار کرنے پر ہم نے اُن کو شرفِ نبوت دیدیا، خواہ اسی وقت ہو یا بعد چندے) اور اسی (ملتِ موصوفہ پر قائم رہنے) کا حکم کر گئے ہیں ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹوں کو اور (اسی طرح) یعقوب علیہ السلام بھی (اپنے بیٹوں کو جس کا یہ مضمون تھا کہ) میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے اس دین (اسلام و اطاعتِ حق) کو تمہارے لئے منتخب فرمایا ہے، سو تم (دم مرگ تک اسی کو مت چھوڑنا اور) بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں ملتِ ابراہیمی کے بنیادی اصول اور ان کے اتباع کی تاکید اور ان سے انحراف کی خرابی کا بیان ہے، جس میں یہود و نصاریٰ کے اتباعِ ملتِ ابراہیمی کے متعلق دعووں کی تردید اور صرف ملتِ اسلام کا ملتِ ابراہیمی کے مطابق ہونا اور دینِ اسلام کی حقیقت اور یہ کہ وہ تمام انبیاء کا مشترکہ دین ہے، ذکر کیا گیا ہے۔

مذکورہ آیات میں انبیاء علیہم السلام کا اپنی اولاد کی دینی اور روحانی تربیت کی طرف خاص توجہ اور اہتمام مذکور ہے، پہلی آیت میں ملتِ ابراہیمی کی فضیلت اور اسی کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دنیا و آخرت میں شرف اور بزرگی بتلا کر ان کی ملت سے انحراف کرنے کو احمقانہ کام بتلایا گیا ہے، ارشاد ہے: وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ یعنی "ملتِ ابراہیمی سے رُوگردانی صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس میں ذرا عقل نہ ہو" کیونکہ یہ ملت عین دینِ فطرت ہے، کوئی سلیم الفطرۃ انسان اس سے انکار نہیں کر سکتا، آگے اس کی وجہ بیان فرمائی کہ اس ملت کا شرف اور فضیلت اس سے ظاہر ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے اسی ملت کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دنیا میں عزت و بزرگی عطا فرمائی، اور آخرت میں بھی، دنیا کی عزت و بزرگی کا مشاہدہ تو ساری دنیا نے کر لیا، کہ نمرود جیسا صاحبِ اقتدار بادشاہ اور اس کی قوم اس اکیلے بزرگ کے خلاف کھڑی ہوئی، اور اپنے اقتدار کے سارے عوامل ان کے خلاف استعمال کر لئے، آخر میں آگ کے ایک بڑے انبار میں اُن کو ڈال دیا گیا، مگر دنیا کے سارے عناصر اور انکی طاقتیں جس قدرت والے کے تابع فرمان ہیں اس نے سارے نمرودی منصوبوں کو خاک میں ملا دیا، آگ ہی کو اپنے خلیلؑ کے لئے گلزار بنا دیا، اور دنیا کی ساری قومیں ان کا لوہا ماننے پر مجبور ہوگئیں، دنیا کے سارے مومن اور کافر یہاں تک کہ بُت پرست بھی اس بُت شکن کی عزت کرتے چلے آئے، مشرکینِ عرب بہر حال اولادِ ابراہیمؑ تھے، بُت پرستی کے باوجود حضرت ابراہیم

علیہ السلام کی عزت وعظمت پر جان دیتے تھے، اور انہی کی ملت کے اتباع کا دعویٰ کرتے تھے، اور ملتِ ابراہیمی کے مٹے مٹے کچھ آثار ان کے عمل میں بھی موجود تھے، حج وعمرہ وقربانی، مہمان نوازی انہی کے باقیات صالحات تھے، اگرچہ جہالت نے اُن کو بھی مسخ کر دیا تھا، اور یہ نتیجہ اس خداوندی انعام کا ہے جس کی رُو سے خلیل اللہؑ کو امام الناس کا خطاب دیا گیا تھا، اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔

ابراہیم اور ملتِ ابراہیم علیہ السلام کے اس قہری غلبہ کے علاوہ اس کی مقبولیت اور فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہونا بھی دنیا کے سامنے آچکا تھا، اور جس میں کچھ بھی عقل وفہم تھی وہ اس ملت کے سامنے جُھک گیا تھا۔

یہ تو ابراہیم علیہ السلام کے دنیاوی شرف وبزرگی کا ذکر تھا، آخرت کا معاملہ جو ابھی سامنے نہیں، اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام قرآن کی اس آیت نے واضح کر دیا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں عزت وفضیلت عطا فرمائی اسی طرح آخرت میں بھی ان کے درجاتِ عالیہ مقرر ہیں۔

ملتِ ابراہیمی کا بنیادی اصول اسلام، یعنی اطاعتِ حق ہے وہ صرف اسلام میں منحصر ہے

اس کے بعد دوسری آیت میں ملتِ ابراہیمی کے بنیادی اصول بتلائے گئے، ارشاد ہوا:۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، "یعنی جب فرمایا ابراہیمؑ سے اُن کے رب نے کہ اطاعت اختیار کرو تو انھوں نے عرض کیا کہ میں نے اطاعت اختیار کی رب العالمین کی"، اس طرزِ بیان میں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ اللہ جل شانہٗ کے خطاب اَسْلِمْ کا جواب بظاہر خطاب ہی کے انداز میں یہ ہونا چاہئے کہ اَسْلَمْتُ لَكَ، یعنی میں نے آپکی اطاعت اختیار کرلی، مگر حضرت خلیل علیہ السلام نے اس طرزِ خطاب کو چھوڑ کر یوں عرض کیا کہ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، یعنی میں نے پروردگارِ عالم کی اطاعت اختیار کرلی، ایک تو اس میں رعایتِ ادب کے ساتھ اور حق جل وعلا شانہ کی حمد وثناء شامل ہوگئی جس کا مقام تھا، دوسرے اس کا اظہار ہوگیا کہ میں نے جو طاعت اختیار کی وہ کسی پر احسان نہیں کیا، بلکہ میرے لئے اس کا کرنا ہی ناگزیر تھا، کیونکہ وہ رب العالمین یعنی سارے جہان کا پروردگار ہے، سارے جہان اور جہان والوں کو اس کی اطاعت کے سوا کوئی چارہ کار نہیں، جس نے اطاعت اختیار کی اس نے اپنا فرض ادا کرکے اپنا نفع حاصل کیا، اس میں یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ملتِ ابراہیمی کا بنیادی اصول اور پوری حقیقت ایک لفظ اسلام میں مضمر ہے، جس کے معنی ہیں اطاعتِ حق، اور یہی خلاصہ ہے ابراہیم علیہ السلام کے مذہب و مسلک کا، اور یہی حاصل ہے ان امتحانات کا جن سے گزر کر اللہ تعالیٰ کا یہ

خلیل اپنے مقامِ عالی تک پہنچا ہے، اور اسلام یعنی اطاعتِ حق ہی وہ چیز ہے جس کے لئے یہ سارا جہاں بنایا گیا، اور جس کے لئے انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے، آسمانی کتابیں نازل کی گئیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اسلام ہی تمام انبیاء علیہم السلام کا مشترک دین اور نقطۂ وحدت ہے، حضرت آدمؑ سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر آنے والے رسول اور نبی نے اسی کی طرف دعوت دی، اسی پر اپنی اپنی امت کو چلایا، قرآن کریم نے واضح الفاظ میں فرمایا:

۱- اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (۳: ۱۹)	"دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے"
۲- وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ - (۳: ۸۵)	"اور جو شخص اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین ومذہب اختیار کرے وہ مقبول نہیں"

اور ظاہر ہے کہ جتنے دین ومذہب مختلف انبیاء علیہم السلام لائے ہیں وہ سب اپنے اپنے وقت میں اللہ کے نزدیک مقبول تھے، اس لئے ضروری ہے کہ وہ سب دین دینِ اسلام ہی ہوں، اگرچہ نام ان کا کچھ بھی رکھ دیا جائے، دینِ موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کہا جائے یا یہودیت و نصرانیت وغیرہ، مگر حقیقت سب کی اسلام ہے، جس کا حاصل اطاعتِ حق ہے، البتہ اس میں ایک خصوصیت ملّتِ ابراہیمی کو حاصل ہے، کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ملت کا نام بھی اسلام تجویز کیا اور اپنی امت کو بھی اُمّتِ مسلمہ کا نام دیا، دعاء میں عرض کیا:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ (۲: ۱۲۸)	"اے ہمارے پروردگار بنا دیجئے ہم دونوں (ابراہیم واسمٰعیل) کو مسلم (یعنی اپنا فرمانبردار) اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک جماعت کو اپنا فرمانبردار بنا"

اولاد کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۲: ۱۳۲)	"تم بجز مسلم ہونے کے کسی مذہب پر جان نہ دینا"

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد یہ خصوصی امتیاز حضرت ابراہیمؑ ہی کی تجویز کے مطابق امتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کو حاصل ہوا، کہ اس کا نام امتِ مسلمہ رکھا گیا، اور اس کی ملت بھی ملّتِ اسلامیہ کے نام سے معروف ہوئی، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

مِلَّۃَ اَبِیْکُمْ اِبْرٰھِیْمَ ھُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ ۵ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ ھٰذَا (۲۲: ۷۸)	"تم اپنے باپ ابراہیم کے دین پر قائم رہو اس نے تمھارا لقب مسلمان رکھا ہے، پہلے بھی اور اس میں بھی (یعنی قرآن میں)"

کہنے کو تو یہود بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم ملتِ ابراہیمؑ پر ہیں، نصاریٰ بھی اور مشرکینِ عرب بھی

لیکن یہ سب غلط فہمی یا جھوٹے دعوے تھے، حقیقت میں ملتِ محمدیہ ہی آخری دور میں ملتِ ابراہیمی اور دینِ فطرت کے مطابق تھی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے جتنے انبیاء علیہم السلام تشریف لائے اور جتنی کتابیں اور شرائع نازل ہوئے ان سب کی رُوح اسلام یعنی اطاعتِ حق ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ نفسانی خواہشات کے مقابلہ میں فرمانِ حق کی اطاعت اور اتباعِ ہوٰی کو چھوڑ کر اتباعِ ہدٰی کی پابندی۔

افسوس ہے کہ آج اسلام کا نام لینے والے لاکھوں مسلمان بھی اس حقیقت سے بیگانہ ہوگئے اور دین و مذہب کے نام پر بھی اپنی خواہشات کا اتباع کرنا چاہتے ہیں، انھیں قرآن و حدیث کی صرف وہ تفسیر و تعبیر بھلی معلوم ہوتی ہے جو اُن کی خواہش کے مطابق ہو، ورنہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ جامۂ شریعت کو کھینچ تان کر بلکہ چیر پھاڑ کر اپنی اغراض اور اہواء نفسانی کے بتوں کا لباس بنادیں کہ دیکھنے میں دین و مذہب کا اتباع نظر آئے، اگرچہ وہ حقیقت میں خالص اتباعِ ہوٰی اور خواہشات کی پیروی ہے ؎

سودہ شد از سجدۂ راہِ بُتاں پیشانیم
چند بر خود تہمتِ دینِ مسلمانی نہم

غافل انسان یہ نہیں جانتا کہ یہ حیلے اور تاویلیں مخلوق کے سامنے تو چل سکتی ہیں، مگر خالق کے سامنے جس کا علم ذرہ ذرہ کو محیط ہے، جو دلوں کے چھپے ہوئے ارادوں بھیدوں کو دیکھتا اور جانتا ہے اس کے آگے بجز خالص اطاعت کے کوئی چیز کارگر نہیں ؎

کارہا باخلق آری جملہ راست
باخدا تزویر و حیلہ کے رواست

حقیقی اسلام یہ ہے کہ اپنی اغراض اور خواہشات سے بالکل خالی الذہن ہو کر انسان کو اس کی تلاش ہو کہ حضرت حق جل شانہٗ کی رضا کس کام میں ہے، اور اس کا فرمان میرے لئے کیا ہے، وہ ایک فرمانبردار غلام کی طرح گوش برآواز رہے، کہ کس طرف جانے کا اور کس کام کا حکم ہوتا ہے، اور اس کام کو کس انداز سے کیا جائے، جس سے وہ مقبول ہو اور میرا مالک راضی ہو، اسی کا نام عبادت و بندگی ہے ؎

در راہِ عشق وسوسۂ اھرمن بسے ست
ہشدار و گوش را بہ پیامِ سروش دار

اسی جذبۂ اطاعت و محبت کا کمال انسان کی ترقی کا آخری مقام ہے، جس کو مقامِ عبدیت

کہا جاتا ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں پہونچ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ کا خطاب پاتے ہیں، اور سید الرسل خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو عَبۡدُنَا کا خطاب ملتا ہے، اسی عبدیت اور اطاعت کے ذیلی درجات پر امت کے اولیاء، اقطاب و ابدال کے درجات دائر ہوتے ہیں، اور یہی حقیقی توحید ہے جس کے حاصل ہونے پر انسان کے خوف و امید صرف ایک اللہ جل شانہ کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں ؎

امید و ہراسش نباشد زکس
ہمین ست بنیادِ توحید و بس

غرض اسلام کے معنی اور حقیقت اطاعتِ حق ہے، اور اس کا راستہ صرف اتباعِ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں منحصر ہے، جس کو قرآن کریم نے واضح الفاظ میں اس طرح ارشاد فرمایا

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ؕ (۴: ۶۵)

"تیرے رب کی قسم وہ کبھی مومن نہ ہوں گے جبتک وہ آپ کو اپنے تمام اختلافی معاملات میں حَکَم تسلیم نہ کرلیں اور پھر آپ کے فیصلے کوئی دل تنگی محسوس نہ کریں، اور فیصلہ کو ٹھنڈے دل سے تسلیم نہ کریں"

مسئلہ: آیت مذکورہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو وصیت فرمائی، اور ان سے عہد لیا، وہ یہ تھا کہ اسلام کے سوا اور کسی حالت اور کسی ملت پر نہ مرنا، مراد اس کی یہ ہے کہ اپنی زندگی میں اسلام اور اسلامی تعلیمات پر پختگی سے عمل کرتے رہو تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارا خاتمہ بھی اسلام ہی پر فرمادے، جیساکہ بعض روایات میں ہے کہ تم اپنی زندگی میں جس حالت کے پابند رہو گے، اُسی حالت پر تمہاری موت بھی ہوگی، اور اسی حالت میں محشر میں قائم ہوگے، اللہ جل شانہٗ کی عادت یہی ہے کہ جو بندہ نیکی کا قصد کرتا ہے، اور اس کے لئے اپنے مقدور کے مطابق کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو نیکی کی توفیق دیدیتے ہیں، اور یہ کام اس کے لئے آسان کردیتے ہیں۔

اس معاملہ میں اُس حدیث سے شبہ نہ کیا جائے جس میں یہ ارشاد ہے کہ بعض آدمی جنت کے کام اور اہلِ جنت کے عمل ہمیشہ کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس شخص اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فیصلہ رہ جاتا ہے، مگر پھر اس کی تقدیر غالب آجاتی ہے، اور اہلِ دوزخ کے سے کام کرنے لگتا ہے، اور انجام کار دوزخ میں جاتا ہے، اسی طرح بعض آدمی دوزخ کے کام میں مشغول رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر تقدیر غالب آتی ہے اور آخر عمر میں اہلِ جنت کے کام کرنے لگتا ہے، اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ اس حدیث کے بعض الفاظ میں یہ قید بھی لگی ہوئی ہے کہ فیما یبدو للنّاس یعنی جس نے عمر بھر جنت کے کام کئے اور آخر میں دوزخ کے کام میں لگا درحقیقت اس کے پہلے کام بھی دوزخ ہی کے عمل تھے، مگر لوگوں کے ظاہر میں اور دیکھنے میں وہ اہل جنت کے عمل معلوم ہوتے تھے، اسی طرح جو دوزخ کے اعمال میں مشغول رہا آخر میں جنت کے کام کرنے لگا، درحقیقت وہ اوّل ہی سے جنت کے کام میں تھا، مگر ظاہر نظر میں لوگ اس کو گناہگار سمجھتے تھے (ابن کثیر)

خلاصہ یہ ہے کہ جو آدمی نیک کام میں مشغول رہے اس کو اللہ تعالیٰ کے وعدہ اور عادت کی بناء پر یہی امید رکھنا چاہئے کہ اس کا خاتمہ بھی نیکی پر ہوگا۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ

کیا تم موجود تھے جس وقت قریب آئی یعقوب کے موت جب کہا اپنے بیٹوں کو تم

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ۭ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَاۗىِٕكَ

کس کی عبادت کروگے میرے بعد بولے ہم بندگی کریں گے تیرے رب کی اور تیرے باپ دادوں

اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰــهًا وَّاحِدًا ښ وَّنَحْنُ لَهٗ

کے رب کی جو کہ ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق ہیں، وہی ایک معبود ہے اور ہم سب اسی کے

مُسْلِمُوْنَ ۝۱۳۳ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ

فرمانبردار ہیں، وہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی اُن کے واسطے ہے جو انھوں نے کیا اور تمہارے

مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔــلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۳۴

واسطے ہے جو تم نے کیا اور تم سے پوچھ نہیں اُن کے کاموں کی۔

خلاصۂ تفسیر

کیا (تم لوگ کسی معتبر صحیح نقل سے دعویٰ مذکورہ کرتے ہو یا) تم خود (اس وقت) موجود تھے جس وقت یعقوب علیہ السلام کا آخری وقت آیا (اور) جس وقت انھوں نے اپنے بیٹوں سے (تجدید معاہدہ کے لئے) پوچھا کہ تم لوگ میرے (مرنے کے) بعد کس چیز کی پرستش کروگے، انھوں نے (بالاتفاق) جواب دیا کہ ہم اس (ذات پاک) کی پرستش کریں گے جس کی آپ اور آپ کے بزرگ، (حضرات) ابراہیم و اسمٰعیل و اسحٰق (علیہم السلام) پرستش کرتے آئے ہیں، یعنی وہی معبود جو وحدہٗ لاشریک ہے، اور ہم (احکام میں) اسی کی اطاعت پر (قائم) رہیں گے، یہ (ان بزرگوں کی) ایک جماعت تھی جو (اپنے زمانہ میں) گذر

چکی، ان کے کام ان کا کیا ہوا آئے گا اور تمھارے کام تمھارا کیا ہوا آئے گا، اور تم سے ان کے کئے ہوئے کی پوچھ بھی تو نہ ہوگی (اور خالی تذکرہ بھی تو نہ ہوگا، رہا اس سے تم کو نفع پہنچنا یہ تو بڑی دور ہے)

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں ملّتِ ابراہیمؑ اور اسلام کی حقیقت کا بیان تھا، اب آیات مذکورہ میں ایک اور اصولی بات قابلِ نظر ہے کہ ملّتِ ابراہیمؑ کہئے یا اسلام یہ پوری قوم بلکہ ساری دنیا کے لئے ہدایت نامہ ہے، پھر اس میں اولاد ابراہیم و یعقوب علیہم السلام کی کیا خصوصیت ہے، کہ آیات مذکورہ میں ان کو خاص خطاب فرمایا گیا، اور اللہ تعالیٰ کے ان دونوں برگزیدہ پیغمبروں نے اپنی اولاد کو بطور وصیت خاص اس کی ہدایت فرمائی۔

اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ اولاد کی محبت اور ان کی بھلائی کی فکر مقامِ رسالت و نبوت بلکہ مقامِ خلّت کے بھی منافی نہیں، اللہ تعالیٰ کا وہ خلیل جو ایک وقت اپنے رب کا اشارہ پاکر اپنے چہیتے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے کمربستہ نظر آتا ہے، وہی دوسرے وقت اپنی اولاد کی دینی اور دنیوی آسائش اور بھلائی کے لئے اپنے رب سے دعائیں بھی کرتا ہے، دنیا سے رخصت ہونے کے وقت اپنی اولاد کو وہ چیز دے کر جانا چاہتا ہے جو اس کی نظر میں سب سے بڑی نعمت ہے، یعنی اسلام آیت مذکورہ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ کا یہی مطلب ہے، اور آیت اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ، کا یہی حاصل ہے، فرق اتنا ہے کہ عام انسانوں کی نظروں میں نعمت و دولت دنیا کی فانی اور ذلیل چیزیں ہیں، ان کی نظر اور حوصلہ بلند ہے، ان کے نزدیک اصلی دولت ایمان اور عمل صالح یا اسلام ہے۔

جس طرح عام انسان اپنی موت کے وقت یہ چاہتے ہیں کہ جو بڑی سے بڑی دولت ان کے پاس ہے وہ اولاد کو دے جائیں، ایک سرمایہ دار تاجر کی آجکل یہ خواہش ہوتی ہے کہ میری اولاد ملوں اور فیکٹریوں کی مالک ہو، ان کو امپورٹ اور ایکسپورٹ کے بڑے بڑے لائسنس ملیں، لاکھوں اور کروڑوں کا بینک بیلنس ہو، یا ایک سروس والا انسان یہ چاہتا ہے کہ میری اولاد کو اونچے عہدے اور بڑی تنخواہیں ملیں، یا ایک صنعت پیشہ آدمی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد اسکی صنعت میں کمال حاصل کرے، اس کو اس کے اپنی عمر بھر کے گُر بتلادے۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین اولیاء کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ جس چیز کو وہ اصلی اور دائمی لازوال دولت سمجھتے ہیں وہ ان کی اولاد کو پوری پوری مل جائے، اس کے لئے دعائیں کرتے ہیں، اور کوششیں بھی، آخر وقت میں وصیت اسی کی کرتے ہیں جیسا کہ

آیاتِ مذکورہ سے واضح ہے۔

اولاد کے لئے کوئی دولت دین و اخلاق سکھانے کے برابر نہیں

انبیاء علیہم السلام کے اس طرزِ خاص میں عام انسانوں کے لئے بھی یہ ہدایت ہے کہ وہ جس طرح ان کی دنیوی پرورش اور ان کے دنیوی آرام و راحت کا انتظام کرتے ہیں اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ ان پر لازم ہے کہ اولاد کی نظری، عملی اور اخلاقی تربیت کریں، بُری راستوں اور بُرے اعمال و اخلاق سے ان کو بچانے میں سعی بلیغ کریں، کہ اولاد کی سچی محبت اور اصلی خیرخواہی یہی ہے، یہ کوئی عقل کی بات نہیں کہ ایک انسان اپنے بچہ کو دھوپ کی گرمی سے بچانے کے لئے تو ساری توانائی خرچ کرے اور دائمی آگ سے اور عذاب سے بچانے کے لئے کوئی دھیان نہ دے، اس کے بدن سے پھانس نکالنے میں تو سارے ذرائع اور وسائل استعمال کرے، اور بندوق کی گولی کا نشانہ بننے سے اس کو نہ بچائے۔

انبیاء علیہم السلام کے اس طرزِ عمل سے ایک اصولی بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ والدین کا فرض اور اولاد کا حق ہے کہ سب سے پہلے ان کی صلاح و فلاح کی فکر کی جائے ان کے بعد دوسروں کی طرف توجہ کی جائے، جس میں دو حکمتیں ہیں:

اوّل یہ کہ طبعی اور جسمی تعلق کی بناء پر وہ نصیحت کا اثر زیادہ جلد اور آسانی سے قبول کرسکیں گے، اور پھر وہ ان کی تحریک اور اصلاحی کوشش میں اُن کے دست و بازو بن کر اشاعتِ حق میں اُن کے معین ہوں گے۔

دوسرے اشاعتِ حق کا اس سے زیادہ سہل اور مفید راستہ کوئی نہیں کہ ہر گھر کا ذمہ دار آدمی اپنے اہل و عیال کو حق بات سکھانے اور اس پر عمل کرانے کی سعی میں دل و جان سے لگ جائے کہ اس طرح تبلیغ و تعلیم اور اصلاح و تربیت کا دائرہ عمل سمٹ کر صرف گھروں کے ذمہ داروں تک آجاتا ہے، ان کو سکھلانا پوری قوم کو سکھانے کے ہم معنی ہوجاتا ہے، قرآن کریم نے اسی تنظیمی اصول کے پیش نظر ارشاد فرمایا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا (۶۶: ۶)

"اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو بڑی آگ سے"

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ساری دنیا کے رسول ہیں، اور جن کی ہدایت قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے عام ہے آپ کو بھی سب سے پہلے اس کا حکم دیا گیا کہ:

وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ (۲۶: ۲۱۴)

"اپنے قریبی رشتہ داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیے"

اور ارشاد ہوا:-

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ (۲۰: ۱۳۲)	"یعنی اپنے اہل و عیال کو نماز کا حکم کیجئے اور خود بھی اس کے پابند رہئے"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اس کی تعمیل فرمائی۔

ایک تیسری حکمت یہ بھی ہے کہ جب تک کسی شخص کے اہل و عیال اور قریبی خاندان اس کے نظریات اور عملی پروگرام میں اس کا ساتھی اور ہم رنگ نہیں ہوتا تو اس کی تعلیم و تبلیغ دوسروں پر اتنی مؤثر نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کے جواب میں ابتداءِ اسلام کے وقت عام لوگوں کا یہ جواب ہوتا تھا کہ پہلے اپنے خاندان قریش کو تو آپ درست کرلیں، پھر ہماری خبرلیں، اور جب خاندان میں اسلام پھیل گیا اور فتح مکہ کے وقت اس کی تکمیل ہوئی تو اس کا نتیجہ قرآن کے الفاظ میں یہ ظاہر ہوا کہ:

يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ (۱۱۰: ۲)	"یعنی لوگ اللہ کے دین میں فوج درفوج ہوکر داخل ہوں گے"

آجکل مسلمانوں میں بے علمی اور بے دینی پھیلنے کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ والدین اگر خود دین سے واقف اور دیندار بھی ہیں تو اس کی فکر نہیں کرتے کہ ہماری اولاد بھی دیندار ہوکر دائمی راحت کی مستحق ہو، عام طور پر ہماری نظریں صرف اولاد کی دنیوی اور چند روزہ راحت پر رہتی ہیں اسی کے لئے انتظامات کرتے رہتے ہیں، دولتِ لازوال کی طرف توجہ نہیں دیتے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمادیں، کہ آخرت کی فکر میں لگ جائیں، اور اپنے لئے اور اپنی اولاد کیلئے سب سے بڑا سرمایہ ایمان اور عملِ صالح کو سمجھ کر اس کی کوشش کریں۔

بعض مسائل متعلقہ مسئلہ توریث الجد

اس آیت میں حضرت یعقوبؑ کی اولاد کی طرف سے جو جواب نقل کیا گیا ہے اس میں اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ فرماکر اس طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ دادا بھی باپ ہی کہلاتا ہے، اور باپ ہی کے حکم میں ہے، اس لئے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اس آیت سے استدلال کرکے فرمایا کہ میراث میں، دادا کا بھی وہی حکم ہے جو باپ کا ہے۔

آباء و اجداد کے اعمال کی جزا سزا اولاد پر نہیں ہوگی

لَهَا مَا كَسَبَتْ الآیۃ اس آیت سے معلوم ہوا کہ باپ دادا کے نیک اعمال اولاد کے لئے کافی نہیں ہوں گے، جب تک وہ خود اپنے اعمال کو درست نہ کریں، اسی طرح باپ دادا کے بُرے اعمال کا عذاب بھی اولاد پر نہ پڑے گا جب کہ یہ اعمالِ صالحہ کے پابند ہوں، اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مشرکین کی اولاد جو بلوغ سے پہلے مرجائے اُن کو اپنے ماں باپ کے کفر و شرک کی وجہ سے عذاب نہیں ہوگا، اور اس سے یہود کے اس عقیدے کی بھی تردید ہوگئی کہ ہم

جو چاہیں عمل کرتے رہیں ہماری مغفرت تو ہمارے آباء و اجداد کے اعمال سے ہو جائے گی، اسی طرح آجکل کے بعض سید خاندان کے لوگ اس خیال میں رہتے ہیں کہ ہم اولادِ رسول ہیں ہم جو چاہیں گناہ کرتے رہیں ہماری مغفرت ہی ہوگی۔

قرآن کریم نے اس مضمون کو بار بار مختلف عنوانات سے بیان فرمایا ہے؛ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا اور وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۶: ۱۶۴) وغیرہ، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اے بنی ہاشم: ایسا نہ ہو کہ قیامت کے روز اور لوگ تو اپنے اپنے اعمالِ صالحہ لیکر آئیں اور تم اعمالِ صالحہ سے غفلت برتو اور صرف میرے نسب کا بھروسہ لیکر آؤ اور میں اس روز تم سے یہ کہوں کہ میں تمھیں اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتا۔"

اور دوسری حدیث میں ارشاد ہے:

مَن بَطَّأَ بِهٖ عَمَلُهٗ لَمْ يُسْرِعْ بِهٖ نَسَبُهٗ۔

"یعنی جس شخص کو اس کے عمل نے پیچھے ڈالا اس کو اس کا نسب آگے نہیں بڑھا سکتا۔"

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ

اور کہتے ہیں کہ ہو جاؤ یہودی یا نصرانی تو تم پالوگے راہِ راست کہہ دے کہ ہرگز نہیں بلکہ ہم نے اختیار

حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا

کی راہ ابراہیم کی جو ایک ہی طرف کا تھا اور نہ تھا شرک کرنے والوں میں، تم کہہ دو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو اترا ہم پر

وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ

اور جو اترا ابراہیم پر اور اسمٰعیل پر اور اسحٰق پر اور یعقوب پر اور اس کی اولاد پر اور جو ملا

اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ

موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور جو ملا دوسرے پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے ہم فرق نہیں کرتے

اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

اُن سب میں سے ایک میں بھی اور ہم اسی پروردگار کے فرمانبردار ہیں

؁ ہر ایک نفس جو عمل کرتا ہے اس کی ذمہ داری اسی پر ہے ۱۲

؁ کسی کا بوجھ قیامت کے روز کوئی دوسرا نہیں اٹھا سکے گا ۱۲

خلاصۂ تفسیر

اور یہ (یہودی و نصرانی) لوگ (مسلمانوں سے) کہتے ہیں کہ تم لوگ یہودی ہو جاؤ (یہ تو یہود نے کہا تھا) یا نصرانی ہو جاؤ (یہ نصاریٰ نے کہا تھا) تم بھی راہ (حق) پر پڑ جاؤ گے، (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (جواب میں) کہہ دیجئے کہ ہم تو (یہودی یا نصرانی کبھی نہ ہوں گے، بلکہ) ملتِ ابراہیم (یعنی اسلام) پر رہیں گے، جس میں کجی کا نام نہیں، (بخلاف یہودیت و نصرانیت کے، جس میں علاوہ محرّف ہونے کے اس کے منسوخ ہو چکنے کے سبب اب اس میں کجی آ گئی) اور ابراہیم علیہ السلام مشرک بھی نہ تھے، (مسلمانو! یہود و نصاریٰ کے جواب میں جو تم نے اجمالاً کہا ہے کہ ہم ملتِ ابراہیمی پر رہیں گے، اس ملّت کی تفصیل بیان کرنے کے لئے) کہہ دو کہ (اس ملت پر رہنے کا حاصل یہ ہے کہ) ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس (حکم) پر بھی جو ہمارے پاس (بواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے) بھیجا گیا اور اس (حکم) پر بھی جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب (علیہم السلام) اور اولادِ یعقوب (میں جو نبی گذرے ہیں ان) کی طرف (بواسطہ وحی کے) بھیجا گیا، اور اس (حکم اور معجزہ) پر بھی جو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو دیا گیا، اور اس پر بھی جو کچھ اور انبیاء (علیہم السلام) کو دیا گیا، ان کے پروردگار کی طرف سے (سو ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں، اور ایمان بھی) اس کیفیت سے کہ ہم ان (حضرات) میں سے کسی ایک میں بھی (دوسرے سے ایمان لانے میں) تفریق نہیں کرتے (کہ کسی پر ایمان رکھیں کسی پر نہ رکھیں) اور ہم تو اللہ تعالیٰ کے مطیع ہیں (انھوں نے ہم کو یہ دین بتلایا) ہم نے اختیار کر لیا (پس یہ حاصل ہے اس ملّت کا جس پر ہم قائم ہیں، جس میں کسی کو اصلاً انکار و سرتابی کی گنجائش نہیں)۔

معارف و مسائل

اولادِ یعقوب علیہ السلام کو قرآن کریم نے لفظ اسباط سے تعبیر فرمایا ہے، یہ جمع ہے سبط کی جس کے معنی قبیلہ اور جماعت کے ہیں، ان کو سبط کہنے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ یعقوب علیہ السلام کے صلبی لڑکے بارہ تھے، پھر ہر لڑکے کی اولاد ایک مستقل قبیلہ بن گئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی نسل میں یہ برکت دی کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس مصر گئے تو بارہ بھائی تھے، اور جب فرعون کے مقابلہ کے بعد موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کی اولاد بنی اسرائیل نکلے تو ہر بھائی کی اولاد ہزاروں افراد پر مشتمل قبیلے تھے، اور دوسری برکت اولادِ یعقوب علیہ السلام میں اللہ تعالیٰ نے یہ عطا فرمائی کہ دس انبیاء کے علاوہ باقی سب انبیاء و رسل ان کی اولاد میں پیدا ہوئے، بنی اسرائیل کے علاوہ باقی انبیاءؑ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد نوحؑ، شیثؑ، ہودؑ، صالحؑ، لوطؑ، ابراہیمؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ، اسمٰعیلؑ اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا

سو اگر وہ بھی ایمان لاویں جس طرح پر تم ایمان لائے تو ہدایت پائی انھوں نے بھی اور اگر پھر جاویں تو پھر

هُمْ فِیْ شِقَاقٍ ۚ فَسَیَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۳۷﴾

وہی ہیں ضد پر، سو اب کافی ہے تیری طرف سے ان کو اللہ اور وہی ہے سننے والا جاننے والا

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

ہم نے قبول کرلیا رنگ اللہ کا اور کس کا رنگ بہتر ہے اللہ کے رنگ سے اور ہم اسی کی بندگی کرتے ہیں۔

اللغات والبلاغۃ اَلشِّقَاقُ قال البیضاوی ہو المناواۃ والمخالفۃ فانّ کل واحد من المخالفین فی شق غیر شق الآخر، اَلصِّبْغَۃُ بالکسر فعلۃ من صبغ وہی الحالۃ اللتی یقع علیہا الصبغ۔

خلاصۂ تفسیر (یعنی جب اوپر طریقِ اسلام میں دینِ حق کا منحصر ہونا ثابت ہو چکا) سو اگر وہ (یہود و نصاریٰ) بھی اسی طریق سے ایمان لے آویں جس طریق سے تم (اہلِ اسلام) ایمان لائے ہو تب تو وہ بھی راہِ (حق) پر لگ جاویں گے، اور اگر وہ (اس سے) روگردانی کریں تو (تم ان کی روگردانی سے کچھ تعجب کرو کیونکہ) وہ لوگ تو (ہمیشہ سے) برسرِ مخالفت ہیں ہی (اور اگر انکی مخالفت سے کچھ اندیشہ ہو) تو (سمجھ لیجئے کہ) آپ کی طرف سے عنقریب ہی نمٹ لیں گے ان سے اللہ تعالیٰ، اور اللہ تعالیٰ (تمھاری اور ان کی باتیں) سنتے ہیں (اور تمھارے اور ان کے برتاوے) جانتے ہیں، (تمھارے فکر و غم کی کوئی ضرورت نہیں)

(اے مسلمانو! کہہ دو کہ ہم نے جو اوپر تم لوگوں کے جواب میں کہا ہے کہ ہم ملّتِ ابراہیم پر رہیں گے اس کلام کی حقیقت یہ ہے کہ) ہم (دین کی) اس حالت پر رہیں گے جس میں (ہم کو) اللہ تعالیٰ نے رنگ دیا ہے (اور رنگ کی طرح ہمارے رگ و ریشہ میں بھر دیا ہے) اور (دوسرا) کون ہے جس کے رنگ دینے کی حالت اللہ تعالیٰ (کے رنگ دینے کی حالت) سے خوب تر ہو (جب اور کوئی دوسرا ایسا نہیں تو ہم نے اور کسی کا دین بھی اختیار نہیں کیا) اور (اس لئے) ہم اس کی غلامی اختیار کئے ہوئے ہیں۔

معارف و مسائل

ایمان کی مختصر اور جامع تفسیر فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ، شروع سورۂ بقرہ سے یہاں تک ایمان کی حقیقت کہیں مجمل کہیں مفصل بیان کی گئی ہے، اس آیت میں ایک ایسا اجمال ہے جو تمام تفصیلات اور تشریحات

پر حاوی ہے، کیونکہ "اٰمَنْتُمْ" کے مخاطب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ ہیں، اس آیت میں ان کے ایمان کو ایک مثالی نمونہ قرار دے کر حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول و معتبر صرف اس طرح کا ایمان ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ نے اختیار فرمایا، جو اعتقاد اس سے سرِ مو مختلف ہو اللہ کے نزدیک مقبول نہیں۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ جتنی چیزوں پر یہ حضرات ایمان لائے ان میں کوئی کمی زیادتی نہ ہو، اور جس طرح اخلاص کے ساتھ ایمان لائے اس میں کوئی فرق نہ آئے کہ وہ نفاق میں داخل ہی، اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، فرشتے، اور انبیاء و رسل، آسمانی کتابیں اور ان کی تعلیمات کے متعلق جو ایمان واعتقاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا وہی اللہ کے نزدیک مقبول ہے، اس کے خلاف اس میں کوئی تاویل کرنا یا کوئی دوسرے معنی مراد لینا اللہ کے نزدیک مردود ہے، فرشتوں اور انبیاء و رسل کے لئے جو مقام آپؐ کے قول وعمل سے واضح ہوا اس سے ان کو گھٹانا یا بڑھانا ایمان کے منافی ہے۔

اس توضیح سے ان تمام باطل فرقوں کے ایمان کا خلل واضح ہوگیا جو ایمان کے دعویدار ہیں مگر حقیقتِ ایمان سے بے بہرہ ہیں، کیونکہ زبانی دعویٰ ایمان کا تو بت پرست مشرکین بھی کرتے تھے، اور یہود ونصاریٰ بھی، اور ہر زمانے میں زندیق وملحد بھی، مگر چونکہ ان کا ایمان اللہ پر اور رسولوں پر اور فرشتوں پر اور یوم قیامت وغیرہ پر اس طرح کا نہیں تھا، جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، اس لئے وہ اللہ کے نزدیک مردود و نامقبول ہوا۔

فرشتہ اور رسول کی عظمت و محبت میں اعتدال مطلوب ہے، غلو گمراہی ہے

مشرکین میں سے بعض نے تو فرشتوں کے وجود ہی کا انکار کیا، بعض نے ان کو خدا کی بیٹیاں بنا دیا، دونوں کی تردید بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ سے ہوگئی، یہود ونصاریٰ کے بعض گروہوں نے اپنے پیغمبروں کی مخالفت اور نافرمانی کی، یہانتک کہ بعض کو قتل بھی کر دیا، اور بعض گروہوں نے ان کی عزت وعظمت کو اتنا بڑھایا کہ خدا، یا خدا کا بیٹا یا خدا کا مثل بنا دیا، یہ دونوں قسم کی افراط و تفریط ضلالت وگمراہی قرار دی گئی۔

شریعتِ اسلام میں رسول کی عظمت ومحبت فرض ہے، اس کے بغیر ایمان ہی نہیں ہوتا مگر رسول کو کسی صفت علم یا قدرت وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کے برابر کر دینا گمراہی اور شرک ہے، قرآن کریم نے شرک کی حقیقت یہی بیان فرمائی ہے، کہ غیر اللہ کو کسی صفت میں اللہ کے برابر کریں، اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۲۶: ۹۸) کا یہی مفہوم ہے، آج بھی جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب اور خدا کی طرح ہر جگہ موجود، حاضر و ناظر کہتے ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ومحبت کا حق ادا کر رہے ہیں، حالانکہ وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی اور عمر بھر کی

کوششوں کی صریح مخالفت کر رہے ہیں، اس آیت میں اُن کے لئے بھی سبق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ومحبت اللہ کے نزدیک ایسی ہی مطلوب ہے جیسی صحابہ کرامؓ کے دل میں آپؐ کی تھی، اس سے کمی بھی جرم ہے اور اس میں زیادتی بھی غلو اور گمراہی ہے۔

نبی و رسول کی اختراعی قسمیں، ظلّی، بروزی، لغوی سب گمراہی ہیں

اسی طرح جن فرقوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختمِ نبوت کا انکار کر کے نئے نبی کے لئے دروازہ کھولنا چاہا، اور قرآن کریم کی واضح تصریح خاتم النبیین کو اپنے مقصد میں حائل پایا تو انھوں نے رسول و نبی کی بہت سی قسمیں اپنی طرف سے اختراع کرلیں، جن کا نام نبی ظلّی، نبی بروزی وغیرہ رکھ دیا، اور ان کے لئے گنجائش نکالنے کی کوشش کی، مذکور الصدر آیت نے ان کے دجل و گمراہی کو بھی واضح کر دیا، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے ایمان بالرسل میں کسی ظلّی و بروزی کا کہیں نام و نشان نہیں، یہ کھلا ہوا زندقہ اور الحاد ہے۔

ایمان بالآخرۃ کی تاویلاتِ باطلہ مردود ہیں

اسی طرح وہ لوگ جن کے قلب و دماغ صرف مادّے اور مادّیات میں کھوئے ہوئے ہیں، عالمِ غیب اور عالمِ آخرت کی چیزیں جب انھیں مستبعد نظر آتی ہیں تو طرح طرح کی تاویلوں میں پڑ جاتے ہیں، اور اپنے نزدیک اس کو دین کی خدمت سمجھتے ہیں کہ ہم نے اس کو اقرب الی الفہم کر دیا، مگر چونکہ وہ تاویلیں بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ کے خلاف ہیں، اس لئے سب مردود و باطل ہیں، آخرت کے تمام حالات و واقعات جس طرح قرآن و سنت میں وارد ہوئے ہیں اُن پر بغیر کسی جھجک اور تاویل کے ایمان لانا ہی درحقیقت ایمان ہے، حشرِ اجساد کے بجائے حشرِ روحانی اور عذاب و ثواب جسمانی روحانی، اسی طرح وزنِ اعمال میں تاویلیں کرنا سب اللہ کے نزدیک مردود، باطل اور گمراہی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے لے لی

فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ، میں واضح فرما دیا، کہ آپؐ اپنے مخالفوں کی زیادہ فکر نہ فرماویں، ہم خود ان سے نمٹ لیں گے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسا دوسری ایک آیت وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (۵: ۶۷) میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ فرما دیا، کہ آپؐ مخالفین کی فکر نہ کریں، اللہ تعالیٰ ان سے آپؐ کی حفاظت خود کریں گے۔

دین و ایمان ایک گہرا رنگ ہے، جو انسان کے چہرہ بشرہ سے نظر آنا چاہئے

صِبْغَةَ اللّٰهِ، اس سے پہلی آیت میں دینِ اسلام کو حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب کیا گیا تھا، مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا، اس جگہ اس کو براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے بتلا دیا کہ دین درحقیقت اللہ تعالیٰ کا ہے، کسی پیغمبر کی طرف اس کی نسبت مجازی کر دی جاتی ہے، اور اس جگہ ملّت کو صِبْغَۃ کے لفظ سے تعبیر کر کے دو باتوں کی طرف اشارہ ہو گیا، اوّل تو نصاریٰ کی ایک رسم کی تردید ہو گئی، ان کی عادت یہ

تھی کہ جو بچہ پیدا ہو اس کو ساتویں روز ایک رنگین پانی میں نہلاتے تھے، اور بجائے ختنہ کے اسی نہلانے کو بچہ کی طہارت اور دینِ نصرانیت کا پختہ رنگ سمجھتے تھے، اس آیت نے بتلایا کہ یہ پانی کا رنگ تو دُھل کر ختم ہو جاتا ہے، اس کا بعد میں کوئی اثر نہیں رہتا، نیز ختنہ نہ کرنے کی وجہ سے جو گندگی اور ناپاکی جسم میں رہتی ہے اس سے بھی یہ رنگ نجات نہیں دیتا، اصل رنگ دین و ایمان کا رنگ ہے جو ظاہری اور باطنی پاکی کی ضمانت بھی ہے اور باقی رہنے والا بھی۔

دوسرے دین و ایمان کو رنگ فرما کر اس کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ جس طرح رنگ آنکھوں سے محسوس ہوتا ہے مومن کے ایمان کی علامات اس کے چہرہ بشرہ اور تمام حرکات و سکنات، معاملات و عادات میں ظاہر ہونا چاہئیں واللہ اعلم۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ

کہہ دے کیا تم جھگڑا کرتے ہو ہم سے اللہ کی نسبت حالانکہ وہی ہے رب ہمارا اور رب تمہارا اور ہمارے لئے ہیں عمل ہمارے

اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ

اور تمہارے لئے ہیں عمل تمہارے اور ہم تو خالص اُسی کے ہیں، کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم اور

وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۭ

اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور اس کی اولاد تو یہودی تھے یا نصرانی،

قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ

کہہ دے کہ تم کو زیادہ خبر ہے یا اللہ کو، اور اس سے بڑا ظالم کون جس نے چھپائی وہ گواہی جو ثابت ہو چکی

مِنَ اللّٰهِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ

اس کو اللہ کی طرف سے اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے، وہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی،

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔــلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا

ان کیواسطے ہے جو انھوں نے کیا اور تمہارے واسطے ہے جو تم نے کیا، اور تم سے کچھ پوچھ نہیں اُن کے

يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾ ع

کاموں کی۔

ع ۱۶ ۱۲ ۱۶

خلاصۂ تفسیر

آپ (ان یہود و نصاریٰ سے) فرما دیجئے کہ کیا تم لوگ (اب بھی) ہم سے حجت کئے جاتے ہو حق تعالیٰ کے معاملہ میں (کہ وہ ہم کو قیامت میں نہ بخشیں گے) حالانکہ وہ ہمارا اور تمہارا (سب کا) رب (اور مالک) ہے، (سو ربوبیت میں تو تمہارے ساتھ کوئی خصوصیت نہیں، جیسا تمہارے بعض دعووں سے اختصاص مفہوم ہوتا ہے، مثل نحن ابناء اللہ) اور ہم کو ہمارا کیا ہوا ملے گا اور تم کو تمہارا کیا ہوا ملے گا (یہاں تک تو تمہارے نزدیک بھی مسلّم ہے) اور (اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ) ہم نے صرف حق تعالیٰ (کی خوشنودی) کے لئے اپنے (دین) کو (شرک وغیرہ سے) خالص کر رکھا ہے (بخلاف تمہارے طریقۂ موجودہ کے کہ علاوہ منسوخ ہونے کے خود شرک سے بھی مخلوط ہے جیسا ان کے اقوال عزیر ابن اللہ اور مسیح ابن اللہ سے ظاہر ہے، اور اس میں ہم کو اللہ تعالیٰ نے ترجیح دی ہے پھر ہم کو نجات نہ ہونے کے کیا معنی) یا (اب بھی اپنے حق پر ہونے کے ثابت کرنے کو یہی) کہے جاتے ہو کہ ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولادِ یعقوب (میں جو انبیاء گذرے ہیں یہ سب حضرات) یہود یا نصاریٰ تھے، (اور اس سے بواسطۂ موافقت طریق اپنا حق پر ہونا ثابت کرتے ہو، سو اس کے جواب میں) اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم (ایک، اتنی مختصر سی بات ان سے) کہدیجئے کہ (اچھا یہ بتلاؤ کہ) تم زیادہ واقف ہو یا حق تعالیٰ (اور ظاہر ہے کہ خدا ہی زیادہ واقف ہے، اور وہ ان انبیاء کا ملتِ اسلام پر ہونا ثابت کرچکے ہیں، جیسا ابھی اوپر گذر چکا ہے) اور (جانتے ہیں یہ کافر بھی مگر چھپاتے ہیں سو) ایسے شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو ایسی شہادت کا اخفا کرے جو اس کے پاس منجانب اللہ پہنچی ہو اور (اے اہل کتاب) اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے سے بےخبر نہیں ہیں، (پس جب یہ حضرات یہود و نصاریٰ نہ تھے، سو تم طریق دین میں ان کے موافق کب ہوئے پھر تمہارا حق پر ہونا ثابت نہ ہوا) یہ (ان بزرگوں کی) ایک جماعت تھی جو (اپنے زمانے میں) گذر گئی، ان کے کام ان کا کیا ہوا آوے گا اور تمہارے کام تمہارا کیا ہوا آوے گا، اور (تم سے ان کے کئے ہوئے کی پوچھ بھی تو نہ ہوگی (اور جب خالی تذکرہ بھی نہ ہوگا تو اس سے تم کو کچھ نفع پہنچنا تو در کنار)

معارف و مسائل

اخلاص کی حقیقت | وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ، اس میں امتِ مسلمہ کی ایک خصوصیت یہ بتلائی ہے کہ وہ اللہ کے لئے مخلص ہے، اخلاص کے معنی حضرت سعید بن جبیرؒ نے یہ بتلائے ہیں کہ انسان اپنے دین میں مخلص ہو، کہ اللہ کے سوا کسی کو شریک نہ ٹھہرائے، اور اپنے عمل کو خالص اللہ کے لئے کرے، لوگوں کے دکھلانے یا ان کی مدح و شکر کی طرف نظر نہ ہو۔

بعض بزرگوں نے فرمایا کہ اخلاص ایک ایسا عمل ہے جس کو نہ تو فرشتے پہچان سکتے ہیں اور نہ شیطان، وہ صرف بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک راز ہے ؛

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ

اب کہیں گے بیوقوف لوگ کہ کس چیز نے پھیر دیا مسلمانوں کو

عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۚ قُل لِّلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ

ان کے قبلہ سے جس پر وہ تھے تو کہہ اللہ ہی کا ہے مشرق اور مغرب ،

يَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿١٤٢﴾

چلائے جس کو چاہے سیدھی راہ ۔

خلاصۂ تفسیر

(جب کعبہ قبلۂ نماز مقرر ہو کر یہود کا قبلہ متروک ہوگیا تو بوجہ ناگواری کے) اب تو (یہ) بیوقوف لوگ ضرور ہی کہیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے (سابق سمت قبلہ سے (کہ بیت المقدس تھا) جس طرف پہلے متوجہ ہوا کرتے تھے کس بات نے (دوسری سمت کی طرف) بدل دیا آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ سب (سمتیں خواہ) مشرق (ہو) اور (خواہ) مغرب (ہو) اللہ ہی کے ملک ہیں (خدا تعالیٰ کو مالکانہ اختیار ہے جس سمت کو چاہیں مقرر فرما دیں، کسی کو منصب علّت دریافت کرنے کا نہیں ہے، اور سیدھا طریق احکامِ شرعیہ کے باب میں یہی اعتقاد ہے، لیکن بعضوں کو اس راہ کے اختیار کرنے کی توفیق نہیں ہوتی، خواہ مخواہ علتیں ڈھونڈتے پھرا کرتے ہیں البتہ) جس کو خدا ہی (اپنے فضل سے) چاہیں (یہ) سیدھا طریق بتلا دیتے ہیں۔

معارف و مسائل

اس آیت میں مخالفین کا اعتراض دربارۂ تحویلِ قبلہ نقل کرکے اس کا جواب دیا گیا ہے، اس اعتراض اور جواب سے پہلے قبلہ کی حقیقت اور اس کی مختصر تاریخ سُن لیجئے، جس سے سوال وجواب کا سمجھنا آسان ہوجائے۔

قبلہ کے لفظی معنی ہیں سمتِ توجہ، یعنی جس طرف رُخ کیا جائے، یہ ظاہر ہے کہ مؤمن کا رُخ ہر عبادت میں صرف ایک اللہ وحدہ لاشریک لہٗ کی طرف ہوتا ہے، اور اس کی ذات پاک مشرق ومغرب اور شمال وجنوب کی قیدوں اور سمتوں سے بالاتر ہے، وہ کسی خاص سمت میں نہیں، اس کا اثر طبعی خاص طور پر یہ ہونا تھا کہ کوئی عبادت کرنے والا کسی خاص رُخ کا پابند نہ ہوتا، جس کا جس طرف جی چاہتا نماز میں اپنا رخ اس طرف کرلیتا، اور ایک ہی آدمی کسی وقت ایک طرف اور کسی وقت کسی

طرف رخ کرتا تو وہ بھی بے جا نہ ہوتا۔

لیکن ایک دوسری حکمتِ الٰہیہ اس کی مقتضی ہوئی کہ تمام عبادت گذاروں کا رُخ ایک ہی طرف ہونا چاہئے، اور وہ یہ ہے کہ عبادت کی مختلف قسمیں ہیں، بعض انفرادی ہیں، بعض اجتماعی، ذکر اللہ اور روزہ وغیرہ انفرادی عبادات ہیں جن کو خلوت میں اور اخفاء کے ساتھ ادا کیا جا سکتا ہے، اور نماز اور حج اجتماعی عبادات ہیں جن کو جماعت واجتماع و اعلان کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے، ان میں عبادت کے ساتھ مسلمانوں کو اجتماعی زندگی کے آداب کا بتلانا اور سکھانا بھی پیش نظر ہے، اور یہ بھی بالکل ظاہر ہے کہ اجتماعی نظام کا سب سے بڑا بنیادی اصول افراد کثیرہ کی وحدت اور یک جہتی ہے، یہ وحدت جتنی زیادہ قوی سے قوی ہوگی اتنا ہی اجتماعی نظام مستحکم اور مضبوط ہوگا، انفرادیت اور تشتت اجتماعی نظام کے لئے سمّ قاتل ہے، پھر نقطۂ وحدت متعین کرنے میں ہر قرن ہر زمانہ کے لوگوں کی مختلف راہیں رہی ہیں، کسی قوم نے نسل اور نسب کو نقطۂ وحدت قرار دیا، کسی نے وطن اور جغرافیائی خصوصیات کو، کسی نے رنگ اور زبان کو۔

لیکن دینِ الٰہی اور شرائع انبیاء علیہم السلام نے ان غیر اختیاری چیزوں کو نقطۂ وحدت بنانے کے قابل نہیں سمجھا، اور نہ درحقیقت یہ چیزیں ایسی ہیں جو پورے افرادِ انسانی کو کسی ایک مرکز پر جمع کر سکیں، بلکہ جتنا غور کیا جائے یہ وحدتیں درحقیقت افرادِ انسانی کو بہت سی کثرتوں میں تقسیم کر ڈالنے اور آپس میں ٹکراؤ اور اختلافات کے اسباب ہیں۔

دینِ اسلام نے جو درحقیقت تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ہے وحدت کا اصل نقطہ فکر و خیال اور عقیدہ کی وحدت کو قرار دیا، اور کروڑوں خداؤں کی پرستش میں بٹی ہوئی دنیا کو ایک ذاتِ حق وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت اور اطاعت کی دعوت دی جس پر مشرق و مغرب اور ماضی و مستقبل کے تمام افرادِ انسانی جمع ہو سکتے ہیں، پھر اس حقیقی فکری اور نظری وحدت کو عملی صورت اور قوت دینے کے لئے کچھ ظاہری وحدتیں بھی ساتھ لگائی گئیں، مگر ان ظاہری وحدتوں میں بھی اصول یہ رکھا گیا کہ وہ عملی اور اختیاری ہوں، تاکہ تمام افرادِ انسانی ان کو اختیار کرکے ایک رشتۂ اخوت میں منسلک ہو سکیں، نسب، وطن، زبان، رنگ وغیرہ اختیاری چیزیں نہیں ہیں جو شخص ایک خاندان کے اندر پیدا ہو چکا ہے وہ کسی طرح دوسرے خاندان میں پیدا نہیں ہو سکتا، جو پاکستان میں پیدا ہو چکا وہ انگلستان یا افریقہ میں پیدا نہیں ہو سکتا، جو کالا ہے وہ اپنے اختیار سے گورا، اور جو گورا ہے وہ اپنے اختیار سے کالا نہیں ہو سکتا۔

اب اگر ان چیزوں کو مرکزِ وحدت بنایا جائے تو انسانیت کا سیکڑوں بلکہ ہزاروں ٹکڑوں اور گروہوں میں تقسیم ہو جانا ناگزیر ہوگا، اس لئے دینِ اسلام نے ان چیزوں سے جن سے تمدّنی

مفاد وابستہ ہیں ان کا پورا احترام رکھتے ہوئے ان کو وحدتِ انسانی کا مرکز نہیں بننے دیا، کہ یہ وحدتیں افرادِ انسانی کو مختلف کثرتوں میں بانٹنے والی ہیں، ہاں اختیاری امور میں اس کی پوری رعایت رکھی کہ فکری وحدت کے ساتھ عملی اور صوری وحدت بھی قائم ہوجائے، مگر اس میں بھی اس کا پورا لحاظ رکھا گیا کہ مرکزِ وحدت ایسی چیزیں بنائی جائیں جن کا اختیار کرنا ہر مرد و عورت لکھے پڑھے اور ان پڑھ شہری اور دیہاتی امیر و غریب کو یکساں طور پر آسان ہو، یہی وجہ ہے کہ شریعتِ اسلام نے تمام دنیا کے لوگوں کو لباس اور مسکن، کھانے اور پینے کے کسی ایک طریقہ کا پابند نہیں کیا، کہ ہر جگہ کے موسم اور طبائع مختلف اور ان کی ضروریات مختلفہ ہیں، سب کو ایک ہی طرح کے لباس یا شعار (یونیفارم) کا پابند کردیا جائے تو بہت سی مشکلات پیش آئیں گی، پھر اگر یہ یونیفارم کم سے کم تجویز کردیا جائے، تو یہ اعتدالِ انسانی پر ظلم ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے عمدہ لباس اور عمدہ کپڑوں کی بےحرمتی ہوگی، اور اگر اس سے زائد کسی لباس کا پابند کیا جائے تو غریب مفلس لوگوں کو مشکلات پیش آئیں گی۔

اس لئے شریعتِ اسلام نے مسلمانوں کا کوئی ایک شعار (یونیفارم) مقرر نہیں کیا، بلکہ مختلف قوموں میں جو طریقے اور اوضاع لباس کی رائج تھیں ان سب پر نظر کرکے ان میں سے جو صورتیں اسرافِ بیجا یا فخر وغیرہ یا کسی غیر مسلم قوم کی نقالی پر مبنی تھیں، صرف ان کو ممنوع قرار دے کر باقی چیزوں میں ہر فرد اور ہر قوم کو آزاد اور خود مختار رکھا، مرکزِ وحدت ایسی چیزوں کو بنایا گیا جو اختیاری بھی ہوں اور آسان اور سستی بھی، ان چیزوں میں جیسے جماعتِ نماز کی صف بندی، ایک امام کی نقل و حرکت کی مکمل پابندی، حج میں لباس اور مسکن کا اشتراک وغیرہ ہیں۔

اسی طرح ایک اہم چیز سمتِ قبلہ کی وحدت بھی ہے، کہ اگرچہ اللہ جل شانہٗ کی ذات پاک ہر سمت و جہت سے بالاتر ہے، اس کے لئے شش جہت یکساں ہیں، لیکن نماز میں اجتماعی صورت اور وحدت پیدا کرنے کے لئے تمام دنیا کے انسانوں کا رُخ کسی ایک ہی جہت و سمت کی طرف ہونا ایک بہترین اور آسان اور بےقیمت وحدت کا ذریعہ ہے، جس پر سارے مشرق و مغرب اور جنوب و شمال کے انسان آسانی سے جمع ہوسکتے ہیں، اب وہ ایک سمت و جہت کونسی ہو جس کی طرف ساری دنیا کا رُخ پھیرا جائے، اس کا فیصلہ اگر انسانوں پر چھوڑا جائے تو یہی ایک سب سے بڑی بناء اختلاف و نزاع بن جاتی ہے، اس لئے ضرور تھا کہ اس کا تعین خود حضرت حق جل وعلا شانہٗ کی طرف سے ہوتا، حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں اتارا گیا، تو فرشتوں کے ذریعہ بیت اللہ کعبہ کی بنیاد پہلے ہی رکھ دی گئی تھی، حضرت آدم اور اولادِ آدم علیہ السلام کا سب سے پہلا قبلہ یہی بیت اللہ اور خانہ کعبہ بنایا گیا

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ○ (۳: ۹۶)	"سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ گھر ہے جو مکہ میں ہے برکت والا، ہدایت والا جہان والوں کیلئے"

نوح علیہ السلام تک سب کا قبلہ یہی بیت اللہ تھا، طوفانِ نوح علیہ السلام کے وقت پوری دنیا غرق ہو کر تباہ ہوگئی، بیت اللہ کی عمارت بھی منہدم ہوگئی اور ان کے بعد حضرت خلیل اللہ اور اسمٰعیل علیہما السلام نے دوبارہ بحکمِ خداوندی بیت اللہ کی تعمیر کی، اور یہی ان کا اور ان کی امت کا قبلہ رہا، اس کے بعد انبیاء بنی اسرائیلؑ کے لئے بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا گیا اور بقول ابوالعالیہ انبیاء سابقینؑ جو بیت المقدس میں نماز پڑھتے تھے وہ بھی عمل ایسا کرتے تھے کہ صخرۂ بیت المقدس بھی سامنے رہے اور بیت اللہ بھی۔ (ذکرہ القرطبی)

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر جب نماز فرض کی گئی تو بقول بعض علماء ابتداءً آپؐ کا قبلہ آپؐ کے جدِ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ یعنی خانہ کعبہ ہی قرار دیا گیا، مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے اور مدینہ طیبہ میں قیام کرنے کے بعد اور بعض روایات کے اعتبار سے ہجرتِ مدینہ سے کچھ پہلے آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہوا کہ آپؐ بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنائیے، صحیح بخاری کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سولہ سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف نماز ادا فرمائی مسجد نبویؐ میں آج تک اس کی علامات موجود ہیں، جہاں کھڑے ہو کر آپؐ نے بیت المقدس کی طرف نمازیں ادا فرمائی تھیں۔ (قرطبی)

حکمِ خداوندی کی تعمیل کے لئے تو سید الرسلؐ سراپا اطاعت تھے، اور حکمِ خداوندی کے مطابق نمازیں بیت المقدس کی طرف ادا فرما رہے تھے، لیکن آپؐ کی طبعی رغبت اور دلی خواہش یہی تھی کہ آپؐ کا قبلہ پھر وہی آدم علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ قرار دیدیا جائے، اور چونکہ عادۃ اللہ یہی ہے کہ وہ اپنے مقبول بندوں کی مراد اور خواہش و رغبت کو پورا فرماتے ہیں ؎

تو چناں خواہی خدا خواہد چنیں
می دہد یزداں مرادِ متقیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ امید تھی کہ آپؐ کی تمنا پوری کی جائے گی، اور اس لئے انتظارِ وحی میں آپؐ بار بار آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھتے تھے، اسی کا بیان قرآن کی اس آیت میں ہے:

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ (۲: ۱۴۴)	"ہم دیکھ رہے ہیں آپؐ کا بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھانا، سو ہم آپؐ کا قبلہ وہی بدل دیں گے جو آپؐ کو پسند ہے اس لئے آئندہ آپؐ نمازمیں اپنا رخ مسجد حرام کی طرف کیا کریں"

اس آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا کا اظہار فرما کر اس کو پورا کرنے کا حکم دیدیا گیا ہے، کہ آئندہ آپؐ مسجد حرام کی طرف رُخ کیا کریں۔

نماز میں خاص بیت اللہ کا استقبال ضروری نہیں اس کی سمت کا استقبال بھی بیرونی دنیا کیلئے کافی ہے

یہاں ایک فقہی نکتہ یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس آیت میں کعبہ یا بیت اللہ کے بجائے لفظ مسجد حرام کا استعمال فرمایا گیا ہے، جس میں اشارہ ہے کہ بلادِ بعیدہ کے رہنے والوں کے لئے یہ ضروری نہیں کہ عین بیت اللہ کی محاذات پائی جائے، بلکہ سمتِ بیت اللہ کی طرف رُخ کرلینا کافی ہے، ہاں جو شخص مسجدِ حرام میں موجود ہے، یا کسی قریبی پہاڑ پر بیت اللہ کو دیکھ رہا ہے، اس کے لئے خاص بیت اللہ ہی کی طرف رخ کرنا ضروری ہے، اگر بیت اللہ کی کوئی چیز بھی اُس کے چہرے کے محاذات میں نہ آئی تو اس کی نماز نہیں ہوتی، بخلاف ان لوگوں کے جن کے سامنے بیت اللہ نہیں کہ ان کے واسطے سمتِ بیت اللہ یا سمتِ مسجدِ حرام کی طرف رُخ کرلینا کافی ہے۔

بہرحال ہجرتِ مدینہ سے سولہ سترہ مہینے بعد پھر آپؐ کا اور مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ کو بنایا گیا اس پر یہود اور بعض مشرکین و منافقین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ پر یہ اعتراض کرنے لگے کہ ان کے دین کا بھی کوئی ٹھکانا نہیں، ان کا قبلہ بھی روز روز بدلتا رہتا ہے۔

قرآن کریم نے ان کا یہ اعتراض آیت مذکورہ میں نقل فرمایا، مگر ساتھ ہی عنوان یہ رہا کہ بیوقوف لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں، اور ان کی بیوقوفی اس جواب سے واضح ہوگئی جو اس کے بعد ذکر فرمایا گیا ہے، ارشاد ہے: قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۭ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ؁

"یعنی آپ فرما دیجئے کہ اللہ ہی کے ہیں مشرق اور مغرب وہ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ چلاتا ہے"

اس میں استقبالِ قبلہ کی حقیقت کو واضح فرما دیا کہ کعبہ اور بیت المقدس کی کوئی خصوصیت بجز اس کے نہیں کہ حکمِ ربانی نے ان کو کوئی امتیاز دے کر قبلہ بنا دیا، وہ اگر چاہیں تو ان دونوں کے علاوہ کسی تیسری چوتھی چیز کو بھی قبلہ بنا سکتے ہیں، پھر جس کو قبلہ بنا دیا گیا اس کی طرف رُخ کرنے میں جو کچھ فضیلت اور ثواب ہے اس کی روح حکمِ حق جل شانہٗ کی اطاعت کے سوا کچھ نہیں، جو بانیِ کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کا بنیادی اصول ہے، اور اسی لئے دوسری آیت میں اور زیادہ واضح فرمایا کہ:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ (بقرہ: ۱۷۷)

"اس میں ذاتی کوئی نیکی اور ثواب نہیں کہ تم مشرق کی طرف رُخ کرو یا مغرب کی طرف لیکن نیکی اللہ پر ایمان لانے اور اس کی اطاعت کرنے میں ہے"

اور ایک آیت میں فرمایا:

فَاَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡہُ اللّٰہِ ؕ (۲: ۱۱۵)	یعنی تم اللہ کے فرمان کے مطابق جس طرف بھی رخ کرو اللہ تعالیٰ کی توجہ اسی طرف پاؤ گے"

ان آیات نے قبلہ اور استقبالِ قبلہ کی حقیقت کو بھی واضح فرمادیا، کہ اس میں ان مقامات کی کوئی ذاتی خصوصیت نہیں، بلکہ ان میں فضیلت پیدا ہونے کا سبب ہی یہ ہے کہ ان کو حق تعالیٰ نے قبلہ بنانے کے لئے اختیار فرمالیا، اور اس کی طرف رُخ کرنے میں ثواب کی وجہ بھی صرف یہی ہے، کہ حکمِ ربانی کی اطاعت ہے، اور شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قبلہ میں تغیر و تبدل فرمانے کی یہ بھی حکمت ہو کہ عملی طور سے لوگوں پر یہ واضح ہوجائے کہ قبلہ کوئی بُت نہیں، جس کی پرستش کی جائے، بلکہ اصل چیز حکمِ خداوندی ہے وہ بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا آگیا تو اس کی تعمیل کی، پھر جب کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم مل گیا تو اسی کی طرف رُخ کرنا عبادت ہوگیا، اس کے بعد والی آیت میں خود قرآن کریم نے بھی اس حکمت کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں فرمایا ہے:

وَمَا جَعَلۡنَا الۡقِبۡلَۃَ الَّتِیۡ کُنۡتَ عَلَیۡہَاۤ اِلَّا لِنَعۡلَمَ مَنۡ یَّتَّبِعُ الرَّسُوۡلَ مِمَّنۡ یَّنۡقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیۡہِ (۲: ۱۴۳)	"یعنی جس قبلہ پر آپ پہلے رہ چکے ہیں اس کو قبلہ بنانا تو محض اس بات کو ظاہر کرنے کے لئے تھا کہ کون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرتا ہے اور کون پیچھے ہٹ جاتا ہے"

اس حقیقتِ قبلہ کے بیان سے ان بیوقوف مخالفین کا بھی پورا جواب ہوگیا جو قبلہ کے بارے میں تغیر و تحویل کو اصولِ اسلام کے منافی سمجھتے اور مسلمانوں کو طعنے دیتے تھے، آخر میں ارشاد فرمایا: یَھۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ اس میں بتلادیا ہے کہ سیدھی راہ یہی ہے کہ انسان حکمِ حق جل شانہٗ کے لئے کمربستہ منتظر رہے، جو حکم مل جائے اس پر بے چون وچرا عمل کرے اور یہ سیدھی راہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مسلمانوں کو حاصل ہوئی۔

مسند احمد کی ایک حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہلِ کتاب کو مسلمانوں کے ساتھ سب سے بڑا حسد تین چیزوں پر ہے، ایک یہ کہ ہفتہ میں ایک دن عبادت کے لئے مخصوص کرنے کا حکم ساری امتوں کو ملا تھا، یہود نے **سنیچر کا دن** مقرر کرلیا، اور نصاریٰ نے اتوار کا، اور حقیقت میں عنداللہ وہ جمعہ کا روز تھا، جو مسلمانوں کے انتخاب میں آیا، دوسرے وہ قبلہ جو تحویل کے بعد مسلمانوں کے لئے مقرر کیا گیا، اور کسی امت کو اس کی توفیق نہیں ہوئی، تیسرے امام کے پیچھے آمین کہنا کہ یہ تینوں خصلتیں صرف مسلمانوں

کو میسّر ہوئیں اہل کتاب ان سے محروم ہیں۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ

اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو امتِ معتدل تاکہ ہو تم گواہ لوگوں پر اور ہو رسولؐ

الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ

تم پر گواہی دینے والا۔

خلاصۂ تفسیر

اور (اے متبعانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اسی طرح ہم نے تم کو ایسی ہی ایک جماعت بنادی ہے، جو (ہر پہلو سے) نہایت اعتدال پر ہے، تاکہ (دنیا میں شرف وامتیاز حاصل ہونے کے علاوہ آخرت میں بھی تمہارا بڑا شرف ظاہر ہو کہ) تم (ایک بڑے مقدمہ میں جس میں ایک فریق حضرات انبیاء علیہم السلام ہوں گے، اور فریق ثانی ان کی مخالف قومیں ہوں گی ان مخالف) لوگوں کے مقابلہ میں گواہ (تجویز) ہو اور (شرف بالائے شرف یہ ہو کہ) تمہارے (قابل شہادت اور معتبر ہونے کے) لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گواہ ہوں، (اور اس شہادت سے تمہاری شہادت معتبر ہونے کی تصدیق ہو، پھر تمہاری شہادت سے اس مقدمہ کا حضرات انبیاء علیہم السلام کے حق میں فیصلہ ہو اور مخالفین مجرم قرار پاکر سزایاب ہوں، اور اس امر کا اعلیٰ درجہ کی عزت ہونا ظاہر ہے)

معارف و مسائل

امتِ محمدیہ کا خاص اعتدال لفظ وَسَط بفتح السین بمعنی اوسط ہے، اور خیر الامور اور افضل اشیاء کو وَسَط کہا جاتا ہے،

ترمذی میں بروایت ابو سعید خدریؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لفظ وسط کی تفسیر عدل سے کی گئی ہے، جو بہترین کے معنی میں آیا ہے (قرطبی) اس آیت میں امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی ایک امتیازی فضیلت وخصوصیت کا ذکر ہے، کہ وہ ایک معتدل امت بنائی گئی، اس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ جس طرح ہم نے مسلمانوں کو وہ قبلہ عطا کیا، جو سب سے اشرف وافضل ہے، اسی طرح ہم نے امتِ اسلامیہ کو ایک خاص امتیازی فضیلت یہ عطا کی ہے کہ اس کو ایک معتدل امت بنایا ہے، جس کے نتیجہ میں ان کو میدانِ حشر میں یہ امتیاز حاصل ہوگا کہ سارے انبیاء علیہم السلام کی اُمتیں جب اپنے انبیاءؑ کی ہدایت وتبلیغ سے مُکر جائیں گی، اور ان کو جھٹلا کر یہ کہیں گی کہ ہمارے پاس نہ کوئی کتاب آئی، نہ کسی نبی نے ہمیں کوئی ہدایت کی، اُس وقت اُمتِ محمدیہ انبیاء علیہم السلام کی طرف سے گواہی میں پیش

ہوگی اور یہ شہادت دے گی کہ انبیاء علیہم السلام نے ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائی ہوئی ہدایت ان کو پہنچائیں، اور ان کو صحیح راستہ پر لانے کی مقدور بھر پوری کوشش کی، مدعیٰ علیہم امتیں امت محمدیہ کی گواہی پر یہ جرح کریں گی کہ اس امتِ محمدیہ کا تو ہمارے زمانے میں وجود بھی نہ تھا، اس کو ہمارے معاملات کی کیا خبر، اس کی گواہی ہمارے مقابلہ میں کیسے قبول کی جاسکتی ہے۔

امتِ محمدیہ اس جرح کا یہ جواب دے گی کہ بے شک ہم اس وقت موجود نہ تھے، مگر ان کے واقعات و حالات کی خبر ہمیں ایک صادق مصدوق رسولؐ نے اور اللہ کی کتاب نے دی ہے، جس پر ہم ایمان لائے اور ان کی خبر کو اپنے معائنہ سے زیادہ وقیع اور سچا جانتے ہیں، اس لئے ہم اپنی شہادت میں حق بجانب اور سچے ہیں، اس وقت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیش ہوں گے، اور ان گواہوں کا تزکیہ و توثیق کریں گے کہ بیشک انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ صحیح ہے، اللہ تعالیٰ کی کتاب اور میری تعلیم کے ذریعہ ان کو یہ صحیح حالات معلوم ہوئے۔

محشر کے اس واقعہ کی تفصیل صحیح بخاری، ترمذی، نسائی، اور مسند احمد کی متعدد احادیث میں مجملاً اور مفصلاً مذکور ہے۔

الغرض آیت مذکورہ میں امتِ محمدیہ کی اعلیٰ فضیلت و شرف کا راز یہ بتلایا گیا ہے کہ یہ امتِ معتدل امت بنائی گئی ہے، اس لئے یہاں چند باتیں قابلِ غور ہیں۔

اعتدالِ امت کی حقیقت، اہمیت اور اس کی کچھ تفصیل

(۱) اعتدال کے معنی اور حقیقت کیا ہیں، (۲) وصفِ اعتدال کی یہ اہمیت کیوں ہے کہ اس پر مدار فضیلت رکھا گیا (۳) اس امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے معتدل ہونے کا واقعات کی رُو سے کیا ثبوت ہے، ترتیب وار ان تینوں سوالوں کا جواب یہ ہے:۔

۱۔ اعتدال کے لفظی معنی ہیں برابر ہونا، یہ لفظ عدل سے مشتق ہے، اس کے معنی بھی برابر کرنے کے ہیں۔

۲۔ وصفِ اعتدال کی یہ اہمیت کہ اس کو انسانی شرف و فضیلت کا معیار قرار دیا گیا، ذرا تفصیل طلب ہے، اس کو پہلے ایک محسوس مثال سے دیکھئے، دنیا کے جتنے نئے اور پُرانے طریقے جسمانی صحت و علاج کے لئے جاری ہیں، طبِ یونانی، ویدک، ایلوپیتھک، ہومیوپیتھک وغیرہ سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ بدنِ انسانی کی صحت اعتدالِ مزاج سے ہے، اور جہاں یہ اعتدال کسی جانب سے خلل پذیر ہو وہی بدنِ انسانی کا مرض ہے، خصوصاً طبِ یونانی کا تو بنیادی اصول ہی مزاج کی پہچان پر موقوف ہے، انسان کا بدن چار خلط خون، بلغم، سوداء، صفراء سے مرکب، اور انہی چاروں اخلاط سے پیدا شدہ چار کیفیات انسان کے بدن میں ضروری ہیں، گرمی، ٹھنڈک، خشکی اور تری، جس وقت تک یہ چاروں کیفیات مزاجِ انسانی کے مناسب حدود کے اندر معتدل رہتی ہیں وہ بدنِ انسانی کی صحت و تندرستی

کہلاتی ہے، اور جہاں اُن میں سے کوئی کیفیت مزاجِ انسانی کی حد سے زیادہ ہوجائے یا گھٹ جائے وہی مرض ہے، اور اگر اس کی اصلاح و علاج نہ کیا جائے، تو ایک حد میں پہنچ کر وہی موت کا پیام ہوجاتا ہے

اس محسوس مثال کے بعد اب رُوحانیت اور اخلاقیات کی طرف آیئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں بھی اعتدال اور بے اعتدالی کا یہی طریقہ جاری ہے، اس کے اعتدال کا نام روحانی صحت اور بے اعتدالی کا نام روحانی اور اخلاقی مرض ہے، اور اس مرض کا اگر علاج کرکے اعتدال پر نہ لایا جائے تو اس کا نتیجہ رُوحانی موت ہے، اور یہ بھی کسی صاحبِ بصیرت انسان پر مخفی نہیں کہ جوہرِ انسانیت جس کی وجہ سے انسان ساری مخلوقات کا حاکم اور مخدوم قرار دیا گیا ہے، وہ اس کا بدن یا بدن کے اجزاء و اخلاط یا ان کی کیفیات حرارت و برودت نہیں، کیونکہ ان اجزاء و کیفیات میں تو دنیا کے سارے جانور بھی انسانیت کے ساتھ شریک بلکہ انسانیت سے زیادہ حصہ رکھنے والے ہیں۔

جوہرِ انسانیت جس کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات اور آقائے کائنات مانا گیا ہے، وہ اس کے گوشت پوست اور حرارت و برودت وغیرہ سے بالاتر کوئی چیز ہے، جو انسان میں کامل اور اکمل طور پر موجود ہے، دوسری مخلوقات کو اس کا وہ درجہ حاصل نہیں، اور اس کا معین کرلینا بھی کوئی باریک اور مشکل کام نہیں، کہ وہ انسان کا رُوحانی اور اخلاقی کمال ہے، جس نے اس کو مخدومِ کائنات بنایا ہے، مولانا رومیؒ نے خوب فرمایا ہے ؎

آدمیت لحم و شحم و پوست نیست
آدمیت جز رضائے دوست نیست

اور اسی وجہ سے وہ انسان جو اپنے جوہرِ شرافت و فضیلت کی بے قدری کرکے اس کو ضائع کرتے ہیں ان کے بارے میں فرمایا ؎

اینکہ می بینی خلافِ آدم اند
نیستند آدم غلافِ آدم اند

اور جب یہ معلوم ہوگیا کہ انسان کا جوہرِ شرافت اور مدارِ فضیلت اس کے روحانی اور اخلاقی کمالات ہیں، اور یہ پہلے معلوم ہوچکا ہے کہ بدنِ انسانی کی طرح روحِ انسانی بھی اعتدال و بے اعتدالی کا شکار ہوتی ہے، اور جس طرح بدنِ انسانی کی صحت، اس کے مزاج اور اخلاط کا اعتدال ہے، اسی طرح رُوح کی صحت روح اور اس کے اخلاق کا اعتدال ہے، اس لئے انسان کامل کہلانے کا مستحق صرف وہی شخص ہوسکتا ہے جو جسمانی اعتدال کے ساتھ روحانی اور اخلاقی اعتدال بھی رکھتا ہو، یہ کمال تمام انبیاء علیہم السلام کو خصوصیت کے ساتھ عطا ہوتا ہے، اور ہمارے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء علیہم السلام میں بھی سب سے زیادہ یہ کمال حاصل تھا، اس لئے انسان کامل کے اوّلین مصداق

آپ ہی ہیں، اور جس طرح جسمانی علاج معالجہ کے لئے ہر زمانہ اور ہر جگہ ہر بستی میں طبیب اور ڈاکٹر اور دواؤں اور آلات کا ایک محکم نظام حق تعالیٰ نے قائم فرمایا ہے، اسی طرح روحانی علاج اور قوموں میں اخلاقی اعتدال پیدا کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے، ان کے ساتھ آسمانی ہدایات بھیجی گئیں اور بقدر ضرورت مادّی طاقتیں بھی عطا کی گئیں، جن کے ذریعہ وہ یہ قانونِ اعتدال دنیا میں نافذ کرسکیں، اسی مضمون کو قرآن کریم نے سورۂ حدید میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۵۷: ۲۵)

"یعنی ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اتاری اُن کے ساتھ کتاب اور ترازو تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہوجائیں اور ہم نے اتارا لوہا اس میں سخت لڑائی ہے اور لوگوں کے کام چلتے ہیں"

اس میں انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے اور ان پر کتابیں نازل کرنے کی حکمت یہی بتلائی ہے کہ وہ ان کے ذریعہ لوگوں میں اخلاقی اور عملی اعتدال پیدا کریں، کتاب، اخلاق، اور روحانی اعتدال پیدا کرنے کے لئے نازل کی گئی، اور ترازو معاملات لین دین میں عملی اعتدال پیدا کرنے کے لئے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ترازو سے مراد ہر پیغمبر کی شریعت ہو، جس کے ذریعہ اعتدالِ حقیقی معلوم ہوتا ہے، اور عدل و انصاف قائم کیا جاسکتا ہے۔

اس تفصیل سے آپ نے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے اور اُن پر کتابیں نازل کرنے کی اصلی غرض و حکمت یہی ہے کہ قوموں کو اخلاقی اور عملی اعتدال پر قائم کیا جائے، اور یہی قوموں کی صحت مندی اور تندرستی ہے۔

امتِ محمدیہ میں ہر قسم کا اعتدال اس بیان سے آپ نے یہ بھی معلوم کرلیا ہوگا کہ امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی جو فضیلت آیت مذکورہ میں بتلائی گئی، وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا "یعنی ہم نے تمھیں ایک معتدل امت بنایا ہے"، یہ بولنے اور لکھنے میں تو ایک لفظ ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے کسی قوم یا شخص میں جتنے کمالات اس دنیا میں ہوسکتے ہیں ان سب کے لئے حاوی اور جامع ہے۔

اس میں امتِ محمدیہ کو امت وسط یعنی معتدل امت فرماکر یہ بتلادیا کہ انسان کا جوہر شرافت و فضیلت ان میں بدرجۂ کمال موجود ہے، اور جس غرض کیلئے یہ آسمان و زمین کا سارا نظام ہوا، اور جس کے لئے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں بھیجی گئی ہیں، یہ امت اس میں ساری امتوں سے ممتاز اور افضل ہے۔

قرآن کریم نے اس امت کے متعلق اس خاص وصف فضیلت کا بیان مختلف آیات میں مختلف عنوانات سے کیا ہے، سورۂ اعراف کے آخر میں امتِ محمدیہ کے لئے ارشاد ہوا:۔

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ یَعْدِلُوْنَ ○ (۷: ۱۸۱)	"یعنی اُن لوگوں میں جن کو ہم نے پیدا کیا ہے، ایک ایسی امت ہے جو سچی راہ بتلاتے ہیں اور اس کے موافق انصاف کرتے ہیں"

اس میں امتِ محمدیہ کے اعتدالِ روحانی و اخلاقی کو واضح فرمایا ہے، کہ وہ اپنے ذاتی مفادات اور خواہشات کو چھوڑ کر آسمانی ہدایت کے مطابق خود بھی چلتے ہیں، اور دوسروں کو بھی چلانے کی کوشش کرتے ہیں، اور کسی معاملہ میں نزاع و اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ بھی اسی بے لاگ آسمانی قانون کے ذریعہ کرتے ہیں، جس میں کسی قوم یا شخص کے ناجائز مفاد کا کوئی خطرہ نہیں۔

اور سورۂ آلِ عمران میں امتِ محمدیہ کے اسی اعتدالِ مزاج اور اعتدالِ روحانی کے آثار کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ (۳: ۱۱۰)	"یعنی تم سب امتوں میں بہتر ہو جو عالم میں بھیجی گئی ہو، حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو بُرے کاموں سے اور اللہ پر ایمان لاتے ہو"

یعنی جس طرح ان کو رسولؐ سب رسولوں میں افضل نصیب ہوئے، کتاب سب کتابوں میں جامع اور اکمل نصیب ہوئی، اسی طرح ان کو قوموں کا صحتمندانہ مزاج اور اعتدال بھی اس اعلیٰ پیمانے پر نصیب ہوا، کہ وہ سب امتوں میں بہتر امّت قرار پائی، اس پر علوم و معارف کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں، ایمان و عمل و تقویٰ کی تمام شاخیں ان کی قربانیوں سے سرسبز و شاداب ہوں گی، وہ کسی مخصوص ملک و اقلیم میں محصور نہ ہوگی، بلکہ اس کا دائرۂ عمل سارے عالم اور انسانی زندگی کے سارے شعبوں کو محیط ہوگا، گویا اس کا وجود ہی اس لئے ہوگا کہ دوسروں کی خیرخواہی کرے، اور جس طرح ممکن ہو انھیں جنّت کے دروازوں پر لاکھڑا کر دے، اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ میں اس کی طرف اشارہ ہے، کہ یہ امّت دوسروں کی خیرخواہی اور فائدہ کے لئے بنائی گئی ہے، اس کا فرض منصبی اور قومی نشان یہ ہے کہ لوگوں کو نیک کاموں کی ہدایت کرے، بُرے کاموں سے روکے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَةُ کا یہی مطلب ہے کہ دین اس کا نام ہے، کہ سب مسلمانوں کی خیرخواہی کرے، پھر بُرے کاموں میں کفر، شرک،

بدعات، رسوم قبیحہ، فسق و فجور اور ہر قسم کی بداخلاقی اور نامعقول باتیں شامل ہیں، اُن سے روکنا بھی کسی طرح ہوگا، کبھی زبان سے کبھی ہاتھ سے، کبھی قلم سے، کبھی تلوار سے، غرض ہر قسم کا جہاد اس میں داخل ہوگیا۔ یہ صفت جس قدر عموم و اہتمام سے امتِ محمدیہ میں پائی گئی پہلی امتوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

۳۔ اب تیسری بات غور طلب یہ رہ گئی کہ اس امت کے توسط و اعتدال کا واقعات سے ثبوت کیا ہے، اس کی تفصیل طویل اور تمام امتوں کے اعتقادات، اعمال و اخلاق اور کارناموں کا موازنہ کرکے بتلانے پر موقوف ہے، اس میں سے چند چیزیں بطور مثال ذکر کی جاتی ہیں۔

اعتقادی اعتدال: سب سے پہلے اعتقادی اور نظری اعتدال کو لے لیجئے، تو پچھلی امتوں میں ایک طرف تو یہ نظر آئے گا کہ اللہ کے رسولوں کو اس کا بیٹا بنا لیا، اور ان کی عبادت اور پرستش کرنے لگے: وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ (۹: ۳۰)، اور دوسری طرف انہی قوموں کے دوسرے افراد کا یہ عالم بھی مشاہدہ میں آئے گا کہ رسولؑ کے مسلسل معجزات دیکھنے اور برتنے کے باوجود جب اُن کا رسولؑ ان کو کسی جنگ و جہاد کی دعوت دیتا ہے تو وہ کہدیتے ہیں فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (۵: ۲۴) (یعنی جائیے آپ اور آپ کا پروردگار وہی مخالفین سے قتال کریں ہم تو یہاں بیٹھے ہیں) کہیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ اپنے انبیاء کو خود ان کے ماننے والے طرح طرح کی ایذائیں پہنچاتے ہیں۔

بخلاف امتِ محمدیہ کے کہ وہ ہر قرن ہر زمانے میں ایک طرف تو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ عشق و محبت رکھتے ہیں کہ اس کے آگے اپنی جان و مال اور اولاد و آبرو سب کو قربان کردیتے ہیں ؎

سلام اُسؐ پر کہ جس کے نام لیوا ہر زمانے میں
بڑھا دیتے ہیں ٹکڑا سرفروشی کے فسانے میں

اور دوسری طرف یہ اعتدال کہ رسول کو رسول اور خدا کو خدا سمجھتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو باایں ہمہ کمالات و فضائل عَبْدُاللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ مانتے اور کہتے ہیں، وہ آپؐ کے مدائح و مناقب میں بھی یہ پیمانہ رکھتے ہیں، جو قصیدۂ بردہ میں فرمایا ؎

دَعْ مَا ادَّعَتْهُ النَّصَارٰى فِيْ نَبِيِّهِمِ وَاحْكُمْ بِمَا شِئْتَ مَدْحًا فِيْهِ وَاحْتَكِمِ

"یعنی اس کلمۂ کفر کو تو چھوڑ دو جو نصاریٰ نے اپنے نبی کے بارے میں کہہ دیا، (کہ وہ معاذ اللہ خود خدا یا خدا کے بیٹے ہیں) اس کے سوا آپؐ کی مدح و ثنا میں جو کچھ کہو وہ سب حق و صحیح ہے"

جس کا خلاصہ کسی نے ایک مصرع میں اس طرح بیان کردیا ع

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

عمل اور عبادت میں اعتدال: اعتقاد کے بعد عمل اور عبادت کا نمبر ہے، اس میں ملاحظہ فرمایئے پچھلی امتوں میں ایک طرف تو یہ نظر آئے گا کہ اپنی شریعت کے احکام کو چند ٹکوں کے بدلے فروخت کیا جاتا ہے، رشوتیں لیکر آسمانی کتاب میں ترمیم کی جاتی ہے، یا غلط فتوے دیتے جاتے ہیں، اور طرح طرح کے حیلے بہانے کرکے شرعی احکام کو بدلا جاتا ہے، عبادت سے پیچھا چھڑایا جاتا ہے، اور دوسری طرف عبادت خانوں میں آپ کو ایسے لوگ بھی نظر آئیں گے جنھوں نے ترکِ دنیا کرکے رہبانیت اختیار کرلی، وہ خدا کی دی ہوئی حلال نعمتوں سے بھی اپنے آپ کو محروم رکھتے اور سختیاں جھیلنے ہی کو عبادت و ثواب سمجھتے ہیں۔

امتِ محمدیہ نے اس کے خلاف ایک طرف رہبانیت کو انسانیت پر ظلم قرار دیا، اور دوسری طرف احکامِ خدا و رسول پر مر مٹنے کا جذبہ پیدا کیا، اور قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج کے مالک بن کر دنیا کو یہ دکھلا دیا کہ دیانت و سیاست میں یا دین و دنیا میں بیر نہیں، مذہب صرف مسجدوں یا خانقاہوں کے گوشوں کے لئے نہیں آیا بلکہ اس کی حکمرانی بازاروں اور دفتروں پر بھی ہے، اور وزارتوں اور امارتوں پر بھی، اس نے بادشاہی میں فقیری اور فقیری میں بادشاہی سکھلائی ؎

چو فقر اندر لباسِ شاہی آمد
ز تدبیرِ عبید اللّٰہی آمد

معاشرتی اور تمدنی اعتدال: اس کے بعد معاشرت اور تمدن کو دیکھئے، تو پچھلی امتوں میں آپ ایک طرف یہ بے اعتدالی دیکھیں گے کہ انسانی حقوق کی کوئی پرواہ نہیں، حق ناحق کی کوئی بحث نہیں، اپنی اغراض کے خلاف جس کو دیکھا اس کو کچل ڈالنا، قتل کردینا، لوٹ لینا سب سے بڑا کمال ہے، ایک رئیس کی چراگاہ میں کسی دوسرے کا اونٹ گھس گیا، اور وہاں کچھ نقصان کردیا تو عرب کی مشہور جنگ حرب بسوس مسلسل سو برس جاری رہی، ہزاروں انسانوں کا خون ہوا، عورتوں کو انسانی حقوق دینا تو کجا زندہ رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی، کہیں بچپن ہی میں ان کو زندہ درگور کردینے کی رسم تھی، کہیں مُردہ شوہروں کے ساتھ ستی کرکے جلا ڈالنے کا رواج تھا، اس کے بالمقابل دوسری طرف یہ سفیہانہ رحم دلی کہ کیڑے مکوڑوں کی ہتھیا کو حرام سمجھیں، جانوروں کے ذبیحہ کو حرام قرار دیں، خدا کے حلال کئے ہوئے جانوروں کے گوشت و پوست سے نفع اٹھانے کو ظلم سمجھیں، امتِ محمدیہ اور اس کی شریعت نے ان سب بے اعتدالیوں کا خاتمہ کیا، ایک طرف انسان کو انسان کے حقوق بتلائے، اور نہ صرف صلح و دوستی کے وقت بلکہ عین میدانِ جنگ میں مخالفین کے حقوق کی حفاظت سکھلائی، عورتوں کو مردوں کی طرح حقوق عطا فرمائے، اور دوسری طرف ہر چیز کی حد مقرر فرمائی، جس سے آگے بڑھنے اور پیچھے رہنے کو جرم قرار دیا، اور اپنے حقوق کے

معاملہ میں درگذر اور عفو وچشم پوشی کا سبق سکھلایا، دوسروں کے حقوق کا پورا اہتمام کرنے کے آداب سکھلائے۔

اقتصادی اور مالی اعتدال: اس کے بعد دنیا کی ہر قوم و ملت میں سب سے اہم مسئلہ معاشیات اور اقتصادیات کا ہے، اس میں بھی دوسری قوموں اور امتوں میں طرح طرح کی بے اعتدالیاں نظر آئیں گی، ایک طرف نظامِ سرمایہ داری ہے جس میں حلال وحرام کی قیود سے اور دوسرے لوگوں کی خوش حالی یا بدحالی سے آنکھیں بند کرکے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرلینا سب سے بڑی انسانی فضیلت سمجھی جاتی ہے، تو دوسری طرف شخصی اور انفرادی ملکیت ہی کو سرے سے جرم قرار دیا جاتا ہے، اور غور کرنے سے دونوں اقتصادی نظاموں کا حاصل مال و دولت کی پرستش اور اس کو مقصدِ زندگی سمجھنا اور اس کے لئے دوڑ دھوپ ہے۔

امتِ محمدیہ اور اس کی شریعت نے اس میں بھی اعتدال کی عجیب وغریب صورت پیدا کی، کہ ایک طرف تو دولت کو مقصدِ زندگی بنانے سے منع فرمایا، اور انسانی عزت وشرافت یا کسی منصب وعہدہ کا مدار اس پر نہیں رکھا، اور دوسری طرف تقسیمِ دولت کے ایسے پاکیزہ اصول مقرر کیے جن سے کوئی انسان ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے، اور کوئی فرد ساری دولت کو نہ سمیٹ لے، قابلِ اشتراک چیزوں کو مشترک اور وقفِ عام رکھا، مخصوص چیزوں میں انفرادی ملکیت کا مکمل احترام کیا، حلال مال کی فضیلت، اس کے رکھنے اور استعمال کرنے کے صحیح طریقے بتلائے، اس کی تفصیل اس قدر طویل ہے کہ ایک مستقل بیان کو چاہتی ہے، اس وقت بطورِ مثال چند نمونے اعتدال اور بے اعتدالی کے پیش کرنے تھے، اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے جس سے آیتِ مذکورہ کا مضمون واضح ہوگیا، کہ امتِ محمدیہ کو ایک معتدل اور بہترین امت بنایا گیا ہے۔

شہادت کے لئے عدل و ثقہ ہونا شرط ہے

لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ، یعنی امتِ محمدیہ کو وَسط اور عدل و ثقہ اس لئے بنایا گیا کہ یہ شہادت دینے کے قابل ہوجائیں، اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص عدل نہیں وہ قابلِ شہادت نہیں، عدل کا ترجمہ ثقہ یعنی قابلِ اعتماد کیا جاتا ہے، اسکی پوری شرائط کتبِ فقہ میں مذکور ہیں۔

اجماع کا حجت ہونا

قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ آیت اجماعِ امت کے حجت ہونے پر ایک دلیل ہے کیونکہ جب اس امت کو اللہ تعالیٰ نے شہداء قرار دے کر دوسری امتوں کے بالمقابل انکی بات کو حجت بنادیا، تو ثابت ہوا کہ اس امت کا اجماع حجت ہے، اور عمل اس پر واجب ہے، اس طرح کہ صحابہؓ کا اجماع تابعینؒ پر اور تابعینؒ کا اجماع تبع تابعینؒ پر حجت ہے۔

اور تفسیر مظہری میں ہے کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ اس اُمت کے جو افعال و اعمال متفق علیہ ہیں وہ سب محمود و مقبول ہیں، کیونکہ اگر سب کا اتفاق کسی خطا پر تسلیم کیا جائے تو پھر یہ کہنے کے کوئی معنی نہیں رہتے کہ یہ امت وَسط اور عدل ہے۔

اور امام جصاصؒ نے فرمایا کہ اس آیت میں اس کی دلیل ہے کہ ہر زمانے کے مسلمانوں کا اجماع معتبر ہے، اجماع کا حجت ہونا صرف قرن اوّل یا کسی خاص زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں، کیونکہ آیت میں پوری امت کو خطاب ہے، اور امّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف وہ نہ تھے جو اس زمانے میں موجود تھے، بلکہ قیامت تک آنے والی نسلیں جو مسلمان ہیں وہ سب آپؐ کی اُمّت ہیں تو ہر زمانے کے مسلمان شہداء اللہ ہوگئے، جن کا قول حجت ہے، وہ سب کسی خطاء اور غلط پر متفق نہیں ہو سکتے۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ

اور نہیں مقرر کیا تھا ہم نے وہ قبلہ کہ جس پر تو پہلے تھا مگر اس واسطے کہ معلوم کریں کہ کون تابع

الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى

رہے گا رسول کا اور کون پھر جائے گا اُلٹے پاؤں اور بے شک یہ بات بھاری ہوئی مگر اُن پر

الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۗ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ

جن کو راہ دکھائی اللہ نے اور اللہ ایسا نہیں کہ ضائع کرے تمہارا ایمان بیشک اللہ

بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿۱۴۳﴾

لوگوں پر بہت شفیق نہایت مہربان ہے

خلاصۂ تفسیر

(اور اصل میں تو شریعت محمدیہ کے لئے ہم نے کعبہ ہی قبلہ تجویز کر رکھا تھا) اور جس سمتِ قبلہ پر آپ (چندروز قائم) رہ چکے ہیں (یعنی بیت المقدس) وہ تو محض اس (مصلحت کے) لئے تھا کہ ہم کو (ظاہری طور پر بھی) معلوم ہو جاوے کہ (اس کے مقرر ہونے سے یا بدلنے سے یہود اور غیر یہود میں سے) کون تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اختیار کرتا ہے اور کون پیچھے کو ہٹتا جاتا ہے (اور نفرت اور مخالفت کرتا ہے اس امتحان کے لئے اس عارضی قبلہ کو مقرر کیا تھا، پھر اصلی قبلہ سے اس کو منسوخ کر دیا،) اور یہ قبلہ کا بدلنا (منحرف لوگوں پر)

ہوا بڑا ثقیل رہا، مگر جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے رسیدھے طریق کی) ہدایت فرمائی ہے (جس کا بیان اوپر آچکا ہے کہ احکام الٰہیہ کو بے چون وچرا قبول کرلینا اُن کو کچھ بھی گراں نہیں ہوا، جیسا پہلے اس کو خدا کا حکم سمجھتے تھے اب اس کو سمجھنے لگے) اور (ہم نے جو کہا ہے کہ بیت المقدس قبلہ غیر اصلی تھا، اس سے کوئی شخص یہ وسوسہ نہ لاوے بس تو جتنی نمازیں ادھر پڑھی ہیں ان میں ثواب بھی کم ملا ہوگا، کیونکہ اصلی قبلہ کی طرف نہ تھیں، سو اس وسوسہ کو دل میں نہ لانا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ ایسے نہیں کہ تمہارے ایمان (کے متعلق اعمال مثلاً نماز کے ثواب) کو ضائع (اور ناقص) کردیں (اور) واقعی اللہ تعالیٰ تو (ایسے) لوگوں پر بہت ہی شفیق (اور) مہربان ہیں (تو ایسے شفیق مہربان پر یہ گمان کب ہوسکتا ہے، کیونکہ کسی قبلہ کا اصلی یا غیر اصلی ہونا تو ہم ہی جانتے ہیں، تم نے تو دونوں کو ہمارا حکم سمجھ کر قبول کیا، اس لئے ثواب بھی کسی کا کم نہ ہوگا)

معارف ومسائل

کعبہ کے قبلۂ نماز ہونے کی ابتداء کب ہوئی

اس میں صحابہؓ وتابعینؒ کا اختلاف ہے، کہ ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں جب نماز فرض ہوئی اس وقت قبلہ بیت اللہ تھا، یا بیت المقدس، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول یہ ہے کہ اوّل ہی سے قبلہ بیت المقدس تھا، جو ہجرت کے بعد بھی سولہ سترہ مہینہ تک باقی رہا، اس کے بعد بیت اللہ کو قبلہ بنانے کے احکام نازل ہوگئے، البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مکہ مکرمہ میں یہ رہا، کہ آپؐ حجرِ اسود اور رکن یمانی کے درمیان نماز پڑھتے تھے، تاکہ بیت اللہ بھی سامنے رہے اور بیت المقدس کا بھی استقبال ہوجائے، مدینہ منورہ پہونچنے کے بعد یہ ممکن نہ رہا، اس لئے تحویلِ قبلہ کا اشتیاق پیدا ہوا (ابن کثیر)

اور دوسرے حضرات نے فرمایا کہ جب نماز فرض ہوئی مکہ مکرمہ میں تو مسلمانوں کا ابتدائی قبلہ بیت اللہ ہی تھا، کیونکہ حضرت ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام کا قبلہ بھی بیت اللہ ہی رہا تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہے، بیت اللہ ہی کی طرف نماز پڑھتے رہے، پھر ہجرت کے بعد آپؐ کا قبلہ بیت المقدس قرار دیدیا گیا، اور مدینہ منورہ میں سولہ سترہ مہینے آپ نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی، اس کے بعد پھر آپؐ کا جو پہلا قبلہ تھا یعنی بیت اللہ اسی کی طرف نمازمیں توجہ کرنے کا حکم آگیا، تفسیر قرطبی میں بحوالۂ ابو عمر واسی کو اصح القولین قرار دیا ہے، اور حکمت اس کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ مدینہ منورہ میں تشریف لانے کے بعد چونکہ قبائلِ یہود سے سابقہ پڑا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مانوس کرنے کے لئے انہی کا قبلہ باذنِ خداوندی اختیار کرلیا، مگر پھر تجربہ سے ثابت ہوا کہ یہ لوگ اپنی ہٹ دھرمی

سے باز آنے والے نہیں تو پھر آپ کو اپنے اصلی قبلہ یعنی بیت اللہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم مل گیا، جو آپ کو اپنے آبار ابراہیم و اسمٰعیل کا قبلہ ہونے کی وجہ سے طبعاً محبوب تھا۔

اور قرطبیؒ نے ابوالعالیہ ریاحی سے نقل کیا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی مسجد کا قبلہ بھی بیت اللہ کی طرف تھا، اور پھر ابوالعالیہ نے نقل کیا ہے کہ ان کا ایک یہودی سے مناظرہ ہوگیا، یہودی نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام کا قبلہ صخرۂ بیت المقدس تھا، ابوالعالیہؒ نے کہا کہ نہیں، موسیٰ علیہ السلام صخرۂ بیت المقدس کے پاس نماز پڑھتے تھے مگر آپ کا رخ بیت اللہ ہی کی طرف ہوتا تھا، یہودی نے انکار کیا تو ابوالعالیہ نے کہا کہ اچھا میرے تمہارے جھگڑے کا فیصلہ حضرت صالح علیہ السلام کی مسجد کردے گی، جو بیت المقدس کے نیچے ایک پہاڑ پر ہے، دیکھا گیا تو اس کا قبلہ بیت اللہ کی طرف تھا۔

اور جن حضرات نے پہلا قول اختیار کیا ہے ان کے نزدیک حکمت یہ تھی کہ مکہ مکرمہ میں تو مشرکین سے امتیاز اور اُن سے مخالفت کا اظہار کرنا تھا، اس لئے ان کا قبلہ چھوڑ کر بیت المقدس کو قبلہ بنا دیا گیا، پھر ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں یہود و نصاریٰ سے امتیاز اور ان کی مخالفت کا اظہار مقصود ہوا تو اُن کا قبلہ بدل کر بیت اللہ کو قبلہ بنا دیا گیا، اسی اختلافِ اقوال کی بناء پر آیت مذکورہ کی تفسیر میں بھی اختلاف ہوگیا، کہ اَلْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَاۤ سے کیا مراد ہے، قول اوّل کی بناء پر اس سے مراد بیت المقدس ہے، جو آپ کا قبلۂ اولیٰ تھا، اور قول ثانی کی بناء پر اس سے مراد کعبہ بھی ہوسکتا ہے کیونکہ وہی آپ کا پہلا قبلہ تھا۔

اور مفہوم آیت کا دونوں صورتوں میں یہ ہے کہ ہم نے تحویلِ قبلہ کو آپ کا اتباع کرنے والے مسلمانوں کے لئے ایک امتحان قرار دیا ہے، تاکہ ظاہر طور پر بھی معلوم ہوجائے کہ کون آپ کا صحیح فرمانبردار ہے اور کون اپنی رائے کے پیچھے چلتا ہے، چنانچہ تحویلِ قبلہ کا حکم نازل ہونے کے بعد بعض ضعیف الایمان یا وہ جن کے دلوں میں کچھ نفاق تھا اسلام سے پھر گئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام لگایا کہ یہ تو اپنی قوم کے دین کی طرف پھر گئے۔

بعض احکام متعلّقہ

کبھی سنت کو قرآن کے ذریعہ بھی منسوخ کیا جاتا ہے

جصاصؒ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ قرآن کریم میں کہیں اس کی تصریح نہیں ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبل از ہجرت یا بعد ہجرت بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، بلکہ اس کا ثبوت صرف احادیث اور سنتِ نبویہؐ ہی سے ہے، تو جو چیز سنت کے ذریعہ ثابت ہوئی تھی اس آیتِ قرآن نے اس کو منسوخ کرکے

آپؐ کا قبلہ بیت اللہ کو بنا دیا۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ حدیثِ رسولؐ بھی ایک حیثیت سے قرآن ہی ہے، اور یہ کہ کچھ احکام وہ بھی ہیں جو قرآن میں مذکور نہیں، صرف حدیث سے ثابت ہیں، اور قرآن ان کی شرعی حیثیت کو تسلیم کرتا ہے، کیونکہ اسی آیت کے اخیر میں یہ بھی مذکور ہے کہ جو نمازیں بامرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف پڑھی گئیں وہ بھی معتبر اور مقبول عند اللہ ہیں۔

خبر واحد جبکہ قرائن قویہ اس کے ثبوت پر موجود ہوں اس سے قرآنی حکم منسوخ سمجھا جا سکتا ہے

بخاری و مسلم اور تمام معتبر کتبِ حدیث میں متعدد صحابہ کرامؓ کی روایت سے منقول ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تحویلِ قبلہ کا حکم نازل ہوا، اور آپؐ نے عصر کی نماز جانب بیت اللہ پڑھی، (اور بعض روایات میں اس جگہ عصر کے بجائے ظہر مذکور ہے) (ابن کثیر) تو بعض صحابہ کرامؓ یہاں سے نماز پڑھ کر باہر گئے، اور دیکھا کہ قبیلہ بنی سلمہ کے لوگ اپنی مسجد میں حسبِ سابق بیت المقدس کی طرف نماز پڑھ رہے ہیں تو انھوں نے آواز دے کر کہا کہ اب قبلہ بیت اللہ کی طرف ہوگیا ہے۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بجانب بیت اللہ نماز پڑھ کر آئے ہیں، ان لوگوں نے درمیانِ نماز ہی اپنا رخ بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف پھیر لیا، نویلہ بنت مسلم کی روایت میں ہے کہ اس وقت عورتیں جو پچھلی صفوں میں تھیں آگے آگئیں اور مرد جو اگلی صفوں میں تھے پیچھے آگئے، اور جب رُخ بیت اللہ کی طرف بدلا گیا تو مَردوں کی صفیں آگے اور عورتوں کی پیچھے ہوگئیں (ابن کثیر)

بنو سلمہ کے لوگوں نے تو ظہر یا عصر ہی سے تحویلِ قبلہ کے حکم پر عمل کر لیا، مگر قُبا میں یہ خبر اگلے دن صبح کی نماز میں پہونچی، جیسا کہ بخاری و مسلم میں بروایت ابن عمرؓ مذکور ہے، اہلِ قُبا نے بھی نماز ہی کے اندر اپنا رخ بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف پھیر لیا (ابن کثیر و جصاص)

امام جصاصؒ نے یہ متعدد روایات حدیث نقل کر کے فرمایا:

ھٰذا خبر صحیح مستفیض فی ایدی اھل العلم قد تلقوہ بالقبول فصار فی حیز التواتر الموجب للعلم	یعنی یہ حدیث اگرچہ اصل سے خبر واحد ہے، مگر قرائن قویہ کی وجہ سے اس نے درجہ تواتر کا حاصل کر لیا ہے، جو علم یقین کا موجب ہوتا ہے"

مگر حنفیہ اور ان کے متفق فقہاء جن کا ضابطہ یہ ہے کہ خبر واحد سے کوئی قطعی حکم منسوخ نہیں ہو سکتا اُن پر یہ سوال اب بھی باقی رہتا ہے کہ اس حدیث کی شہرت اور تلقی بالقبول تو بعد میں ہوئی، بنو سلمہ اور اہلِ قُبا کو تو اچانک ایک ہی آدمی نے خبر دی تھی، اس وقت اس حدیث کو درجۂ شہرت و تواتر حاصل نہیں تھا، انھوں نے اس پر کیسے عمل کر لیا، جصاصؒ نے فرمایا کہ اصل بات یہ ہے کہ ان حضرات اور سب صحابہ کو پہلے سے یہ معلوم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رغبت یہ ہے کہ آپؐ کا قبلہ بیت اللہ کر دیا جائے

اور آپؐ اس کے لئے دعا بھی کر رہے ہیں، اس رغبت و دعاء کی وجہ سے ان حضراتؓ کی نظر میں استقبالِ بیت المقدس کا حکم آئندہ باقی نہ رہنے کا احتمال ضرور پیدا ہو گیا تھا، اس احتمال کی وجہ سے بقاءِ قبلہ بیت المقدس ظنی ہو گیا تھا، اس کے منسوخ کرنے کے لئے یہ خبر واحد کافی ہو گئی، ورنہ محض خبر واحد سے کوئی قرآنی قطعی فیصلہ منسوخ ہو جانا معقول نہیں۔

آلہ مکبر الصوت کی آواز پر نماز میں نقل و حرکت کے مفسد نماز نہ ہونے پر استدلال

صحیح بخاری باب ما جاء فی القبلۃ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں جو قباء میں تحویلِ قبلہ کا حکم پہنچنے اور ان لوگوں کے بحالتِ نماز بیت اللہ کی طرف پھر جانے کا واقعہ ذکر کیا، اس پر علامہ عینی حنفی نے تحریر فرمایا ہے:-

فیہ جواز تعلیم من لیس فی الصلوٰۃ من ھو فیھا (عمدۃ القاری، ص ۱۴۸ ج ۴)	"یعنی اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جو شخص نماز میں شریک نہیں وہ کسی نماز پڑھنے والے کو تعلیم و تلقین کر سکتا ہے۔"

نیز علامہ عینی نے دوسری جگہ اس حدیث کے ذیل میں یہ الفاظ لکھے ہیں، وفیہ استماع المُصلّی لکلام من لیس فی الصلوٰۃ فلا یضر صلوٰتہ (الی) ھکذا استنبطہ الطحاوی (عمدۃ القاری، ص ۲۴۲ ج ۱)

اور عام فقہاء حنفیہ نے جو خارجِ صلوٰۃ کسی شخص کی اقتداء اور اتباع کو مفسدِ نماز کہا ہے جو عام متون و شروح حنفیہ میں منقول ہے، اس کا منشاء یہ ہے کہ نماز میں غیر اللہ کے امر کا اتباع موجبِ فسادِ نماز ہے، لیکن اگر کوئی شخص اتباع امرِ الٰہی کا کرے مگر اس اتباع میں کوئی دوسرا شخص واسطہ بن جائے وہ موجب فساد نہیں۔

فقہاءؒ نے جہاں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ کوئی شخص جماعت میں شریک ہونے کے لئے ایسے وقت پہنچے کہ اگلی صف پوری ہو چکی ہے، اب پچھلی صف میں تنہا رہ جاتا ہے تو اس کو چاہئے کہ اگلی صف میں سے کسی آدمی کو پیچھے کھینچ کر اپنے ساتھ ملالے، اس میں بھی یہی سوال آتا ہے کہ اس کے کہنے سے جو پیچھے آجائے گا وہ نماز میں اتباع امرِ غیر اللہ کا کرے گا، اس لئے اس کی نماز فاسد ہو جانی چاہئے، لیکن درمختار باب الامامۃ میں اس مسئلہ کے متعلق تحریر فرمایا ثم نقل تصحیح عدم الفساد فی مسئلۃ من جذب من الصف فتأخر فھل ثمّ فرق فلیحرر، اس پر علامہ طحطاویؒ نے تحریر فرمایا: لِاَنَّہٗ اِمْتَثَلَ اَمْرَ اللّٰہِ، یعنی اس صورت میں نماز فاسد نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت اس شخص نے آنیوالے کے حکم کا اتباع نہیں کیا، بلکہ امرِ الٰہی کا اتباع کیا ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس کو پہنچا ہے، کہ جب ایسی صورت پیش آئے تو اگلی صف والے کو پیچھے آجانا چاہئے۔

اسی طرح شرنبلالیؒ نے شرح وہبانیہ میں اس مسئلہ کا ذکر کر کے پہلے فسادِ نماز کا قول نقل کیا

پھر اس کی تردید کی، اس کے الفاظ یہ ہیں:۔ اِذَا قِیْلَ لِمُصَلٍّ تَقَدَّمْ فتقدم (الی) فسدت صلوٰتہ لانہ امتثل امر غیر اللہ فی الصلوٰۃ۔ لان امتثالہ انما ھو لامر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلا یضر اھ

ان تمام روایات سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی نمازی ایسے شخص کی آواز پر عمل کرے جو اس کے ساتھ نماز میں شریک نہیں تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ خود اس شخص کی دلداری اور اتباع مقصود ہو یہ تو مفسدِ نماز ہے، لیکن اگر اس نے کوئی حکم شرعی بتلایا اور اس کا اتباع نمازی نے کر لیا تو وہ درحقیقت امر الٰہی کا اتباع ہے، اس لئے مفسدِ نماز نہیں ہوگا، اسی لئے طحطاوی نے فیصلہ یہی کیا ہے کہ اقول لو قیل بالتفصیل بین کونہ امتثل امر الشارع فلا تفسد وبین کونہ امتثل امر الداخل مراعاۃ لخاطرہ من غیر نظر لامر الشارع فتفسد لکان حسنًا (طحطاوی علی الدر، ص ۲۴۶ ج ۱)

اب مسئلہ زیر بحث یعنی آلۂ مکبر الصوت کا فیصلہ کر لینا آسان ہوگیا، کیونکہ وہاں اس آلے کے اتباع کا دُور دور بھی وہم نہیں ہوسکتا، ظاہر ہے کہ اتباع رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کا ہوتا ہے کہ جب امام رکوع کرے تو رکوع کرو، جب سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو، اس آلہ سے صرف یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ اب امام رکوع میں گیا، یا سجدہ میں جا رہا ہے، اس علم کے بعد اتباع امام کا کرتا ہے نہ کہ اس آلے کے حکم کا، اور اتباعِ امام ایک حکمِ الٰہی ہے، اور یہ کلام اس بنیاد پر ہے کہ آلہ مکبر الصوت کی آواز کو عین امام کی آواز نہ مانی جائے بلکہ اس کی نقل وحکایت قرار دیا جائے، اور اہلِ فن اس کی آواز کو عین آوازِ امام کہتے ہیں، ان کی تحقیق پر تو کوئی اشکال جوازِ صلوٰۃ میں نہیں ہے، اس مسئلہ کی تحقیق پر احقر کا ایک مستقل مفصّل رسالہ بھی شائع شدہ ہے اس کو دیکھ لیا جائے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ، یہاں اگر ایمان سے مراد اس کے معروف معنی لئے جائیں تو مطلب آیت کا یہ ہے کہ تحویلِ قبلہ پر جو بعض بیوقوف لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ دین سے منحرف ہوگئے اور ان کا ایمان ہی ضائع ہوگیا، اس کا جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والے نہیں، بے وقوف لوگوں کے کہنے پر کان نہ دھریں۔

اور بعض روایاتِ حدیث اور اقوالِ سلف میں اس جگہ ایمان کی تفسیر نماز سے کی گئی ہے، اور معنی یہ ہیں کہ جو نمازیں سابق قبلہ بیت المقدس کی طرف پڑھی گئی ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ضائع کرنے والا نہیں، وہ تو صحیح ومقبول ہوچکیں، تحویلِ قبلہ کے حکم کا پچھلی نمازوں پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔

صحیح بخاری میں بروایت ابن عازبؓ، اور ترمذی میں بروایت ابن عباسؓ منقول ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ بیت اللہ کو بنا دیا گیا تو لوگوں نے سوال کیا کہ جو مسلمان اس عرصہ میں انتقال کر گئے جب کہ نماز بیت المقدس کی طرف ہوا کرتی تھی، اور بیت اللہ کی طرف نماز پڑھنا

ان کو نصیب نہیں ہوا اُن کا کیا حال ہوگا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں نماز کو ایمان کے لفظ سے تعبیر کر کے واضح کردیا کہ ان کی نمازیں سب صحیح و مقبول ہو چکی ہیں، ان کے معاملہ میں تحویلِ قبلہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠

بیشک ہم دیکھتے ہیں بار بار اُٹھنا تیرے مُنہ کا آسمان کی طرف ، سو البتہ پھیریں گے ہم تجھ کو جس قبلہ کی طرف تو راضی ہے

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا

اب پھیر مُنہ اپنا طرف مسجدالحرام کے اور جس جگہ تم ہوا کرو پھیرو مُنہ اسی کی

وُجُوْھَكُمْ شَطْرَهٗ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ

طرف ، اور جن کو ملی ہے کتاب البتہ جانتے ہیں کہ یہی

الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۴۴

ٹھیک ہے ان کے رب کی طرف سے اور اللہ بے خبر نہیں اُن کاموں سے جو وہ کرتے ہیں ۔

خلاصۂ تفسیر

آپ جو دل سے کعبہ کے قبلہ ہونے کی خواہش رکھتے ہیں، اور امیدِ وحی میں بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھتے ہیں کہ شاید فرشتہ حکم لے آوے، سو) آپ کے منھ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں (اور چونکہ ہمیں آپ کی خوشی پورا کرنا منظور ہے اس لئے (ہم وعدہ کرتے ہیں کہ) آپ کو اسی قبلہ کی طرف متوجہ کردیں گے، جو آپ کو پسند ہے (لو پھر ہم حکم ہی دیئے دیتے ہیں، کہ) اب اپنا چہرہ نماز میں مسجدِ حرام کی طرف کیا کیجئے اور (یہ حکم صرف آپ کے لئے مخصوص نہیں بلکہ سب لوگ پیغمبر بھی اور امتی بھی) جہاں کہیں موجود ہو (خواہ مدینہ منورہ میں یا اور جگہ، یہاں تک کہ خود بیت المقدس میں بھی) اپنے چہروں کو اسی (مسجدِ حرام) کی طرف کیا کرو (اور اس قبلہ کے مقرر ہونے کے متعلق) یہ اہلِ کتاب بھی بالعموم اپنی کتابوں کی پیشینگوئی کی وجہ سے کہ نبی آخر الزماں کا قبلہ اس طرح ہوگا) یقیناً جانتے ہیں کہ یہ حکم بالکل ٹھیک ہے (اور) ان کے پروردگار ہی کی طرف سے ہے (مگر عناداً مانتے نہیں) اور اللہ تعالیٰ ان کی کارروائیوں سے کچھ بے خبر نہیں ہے۔

معارف و مسائل

اس آیت کے پہلے جملہ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اشتیاقِ کعبہ کا ذکر ہے، اس اشتیاق کی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں اور سب میں کوئی تعارض نہیں وہ سب وجوہ ہوسکتی ہیں مثلاً یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نزولِ وحی اور عطاءِ نبوت سے پہلے اپنی طبیعت و فطرت سے ملتِ ابراہیمی کے تابع کام کرتے تھے، اور نزولِ وحی کے بعد قرآن نے بھی آپؐ کی شریعت کو ملتِ ابراہیمؑ کے مطابق قرار دیا، اور حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کا قبلہ بیت اللہ تھا، اس لئے آپؐ کی دلی خواہش یہی تھی کہ آپؐ کا اور مسلمانوں کا قبلہ بھی وہی کعبہ بیت اللہ قرار دیدیا جائے۔

یہ وجہ بھی تھی کہ قبائلِ عرب بھی چونکہ ملتِ ابراہیمی کو کم از کم زبان سے مانتے تھے اور اس کی پیروی کے مدعی تھے، کعبہ کے قبلۂ مسلمین ہوجانے سے ان کے اسلام کی طرف مائل ہوجانے کی توقع تھی، اور سابق قبلہ بیت المقدس میں جو موافقت اہلِ کتاب کی توقع کی جاسکتی تھی وہ سولہ سترہ مہینے کے عمل کے بعد منقطع ہوچکی تھی، کیونکہ یہودِ مدینہ منوّرہ کو اس کی وجہ سے کوئی اسلام سے قرب ہونے کے بجائے بُعد ہی بڑھا تھا۔

بہرحال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خواہش یہ تھی کہ مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ یعنی کعبہ کو قرار دیدیا جائے، اور چونکہ مقربانِ بارگاہِ الٰہی انبیاء علیہم السلام اپنی کوئی خواہش اور کوئی درخواست حق تعالیٰ کی بارگاہ میں اُس وقت تک پیش نہیں کرتے جب تک اُن کو یہ درخواست پیش کرنے کی اجازت کا علم نہ ہوجائے، اس سے سمجھا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعاء کرنے کی اجازت پہلے مل چکی تھی، اور آپؐ اس کی دعاء کر رہے تھے اور اس کی قبولیت کے امیدوار تھے، اس لئے بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھاتے تھے، کہ شاید کوئی فرشتہ حکم لے کر آجائے، آیتِ مذکورہ میں اس کیفیت کا بیان فرماکر پہلے تو قبولیتِ دعاء کا وعدہ فرمایا، فَلَنُوَلِّيَنَّكَ یعنی ہم آپؐ کا رُخ اُسی کی طرف پھیر دیں گے جو سمت آپؐ کو پسند ہے، اس کے فوراً بعد ہی یہ رُخ پھیرنے کا حکم بھی نازل فرمادیا، فَوَلِّ وَجْهَكَ، اس طرزِ عمل میں ایک خاص لطف تھا، کہ پہلے وعدہ کی خوشی حاصل ہو، پھر ایفاءِ وعدہ کی خوشی قند مکرر ہوجائے (یہ سب مضمون قرطبی، جصاص، مظہری سے لیا گیا ہے)

مسئلہ استقبالِ قبلہ یہ تحقیق پہلے آچکی ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے اعتبار سے تو ساری سمتیں اور ساری جہات برابر ہیں، قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ، لیکن مصالح امت کے لئے بتقاضائے حکمت کسی ایک جہت کو تمام دنیا میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کے لئے قبلہ بنا کر سب میں ایک دینی وحدت

کا عملی مظاہرہ مقصود تھا، وہ جہت بیت المقدس بھی ہو سکتی تھی، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا کے مطابق کعبہ کو قبلہ بنانا تجویز کرلیا گیا، اور اسی کا حکم اس آیت میں دیا گیا، اس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ اس جگہ فَوَلِّ وَجْهَكَ اِلَى الْكَعْبَةِ اَوْ اِلٰى بَيْتِ اللّٰهِ فرمایا جاتا، مگر قرآن حکیم نے یہ عنوان بدل کر شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کے الفاظ اختیار فرمائے، اس سے کئی اہم مسائل استقبالِ قبلہ کے بارہ میں واضح ہوگئے۔

اوّل یہ کہ اگرچہ اصل قبلہ بیت اللہ ہے جس کو کعبہ کہا جاتا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اصل بیت اللہ کا استقبال اسی جگہ تک ہو سکتا ہے جہاں تک بیت اللہ نظر آتا ہے، جو لوگ وہاں سے دور ہیں، اور بیت اللہ اُن کی نظروں سے غائب ہے اگر ان پر یہ پابندی عائد کی جائے کہ عین بیت اللہ کی طرف رُخ کرو تو اس کی تعمیل بہت دشوار ہو جائے، خاص آلات وحسابات کے ذریعہ بھی صحیح سمت کا تخرج دُور کے شہروں میں مشکل اور غیر یقینی ہو جائے، اور شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا مدار سہولت وآسانی پر رکھا گیا ہے، اس لئے بجائے بیت اللہ یا کعبہ کے مسجد حرام کا لفظ رکھا گیا جو بہ نسبت بیت اللہ کے بہت زیادہ وسیع رقبہ پر مشتمل ہے، اس کی طرف رُخ پھیر لینا دور دور تک لوگوں کے لئے آسان ہے۔

پھر ایک دوسری سہولت لفظ شطر اختیار کر کے دیدی گئی، ورنہ اس سے مختصر لفظ اِلَى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ تھا، اس کو چھوڑ کر شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فرمایا گیا، شطر دو معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک نصفِ شے، دوسرے سمتِ شے، باتفاق مفسرین اس جگہ شطر سے مراد سمت ہے، تو اس لفظ نے یہ بتلا دیا کہ بلادِ بعیدہ میں یہ بھی ضروری نہیں کہ خاص مسجد حرام ہی کی طرف ہر ایک کا رُخ ہو جائے تو نماز درست ہو بلکہ سمتِ مسجد حرام کافی ہے (بحر محیط)

مثلاً مشرقی ممالک ہندوستان و پاکستان وغیرہ کے لئے جانبِ مغرب مسجد حرام کی سمت ہے تو مغرب کی جانب رُخ کر لینے سے استقبال قبلہ کا فرض ادا ہو جائے گا، اور چونکہ گرمی، سردی کے موسموں میں سمتِ مغرب میں بھی اختلاف ہوتا رہتا ہے، اس لئے فقہاء رحمہم اللہ نے اس سمت کو سمتِ مغرب وقبلہ قرار دیا ہے، جو موسم گرما و سرما کی دونوں مغربوں کے درمیان ہے، اور قواعدِ ریاضی کے حساب سے یہ صورت ہوگی کہ مغربِ صیف اور مغربِ شتا کے درمیان ۴۸ ڈگری تک سمت قبلہ قرار دی جائے گی، یعنی ۲۴ ڈگری تک بھی اگر دائیں یا بائیں مائل ہو جائے تو سمتِ قبلہ فوت نہیں ہوگی، نماز درست ہو جائے گی، ریاضی کی قدیم اور مشہور کتاب شرح چغمنی باب رابع صفحہ ۶۶ میں دونوں مغربین کا فاصلہ یہی ۴۸ ڈگری قرار دیا ہے۔[1]

---

[1] حضرت والد صاحبؒ نے جواہر الفقہ میں فقہاء کا دوسرا قول ذکر کیا ہے کہ ۴۵ درجے دائیں یا بائیں مائل ہونے سے سمتِ قبلہ فوت نہیں ہوگی۔ محمد تقی

سمتِ قبلہ معلوم کرنے کے لئے شرعاً آلات رصدیہ اور حسابات ریاضیہ پر مدار نہیں

اس سے اُن لوگوں کی جہالت بھی واضح ہوگئی جنھوں نے ہندوستان و پاکستان کی بہت سی مسجدوں کی سمتِ قبلہ میں معمولی سا فرق دو چار ڈگری کا دیکھ کر یہ فیصلہ کر دیا کہ ان میں نماز نہیں ہوتی یہ سراسر جہالت ہے، اور بلاوجہ مسلمانوں میں تفریق و انتشار پیدا کرنا ہے۔

شریعتِ اسلامیہ چونکہ قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے اور پوری دنیا کے ممالک کے لئے ہے، اس لئے احکامِ شرعیہ کو ہر شعبہ میں اتنا آسان رکھا گیا ہے کہ ہر گاؤں، جنگل، پہاڑ، جزیرہ میں بسنے والے مسلمان اس پر اپنے مشاہدہ سے عمل کرسکیں، کسی مرحلے میں حسابات، ریاضی، یا اصطرلاب وغیرہ آلات کی ضرورت نہ پڑے، ۴۸ ڈگری تک کی وسیع سمت مغرب اہلِ مشرق کا قبلہ ہے، اس میں پانچ دس ڈگری کا فرق ہو بھی جائے تو اس سے نمازوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے اس کی اور وضاحت ہوجاتی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: مابین المشرق و المغرب قبلۃ (رواہ الترمذی عن ابی ھریرۃؓ) یعنی مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے، آپؐ کا یہ ارشاد مدینہ طیبہ والوں کے لئے تھا، کیونکہ ان کا قبلہ مشرق و مغرب کے درمیان جانبِ جنوب واقع تھا، اس حدیث نے گویا شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کے لفظ کی تشریح کردی کہ مسجدِ حرام کی سمت کافی ہے، البتہ بناءِ مسجد کے وقت اس کی کوشش بہتر ہے کہ ٹھیک بیت اللہ کے رُخ سے جتنا قریب ہوسکے وہ کرلیا جائے، صحابہؓ و تابعینؒ اور سلف صالحینؒ کا طریقہ تو اس دریافت کے لئے سیدھا سادہ یہ تھا کہ جس جگہ صحابہ کرامؓ کی بنائی ہوئی کوئی مسجد ہوئی اس سے اس کے قرب و جوار کی مسجدوں کا رُخ سیدھا کرلیا، پھر اُن کے قرب و جوار کا ان کے ذریعہ، اسی طرح تمام عالم میں مساجد کا رُخ تجویز کیا گیا ہے، اس لئے بلادِ بعیدہ میں سمتِ قبلہ معلوم کرنے کا صحیح طریقہ جو سلف سے چلا آتا ہے یہ ہے کہ جن بلاد میں مساجد قدیمہ موجود ہیں ان کا اتباع کیا جائے، کیونکہ اکثر بلاد میں تو حضرات صحابہؓ و تابعینؒ نے مساجد کی بنیادیں ڈالی ہیں، اور سمتِ قبلہ متعین فرمائی ہے، اور پھر انھیں دیکھ کر دوسری بستیوں میں مسلمانوں نے اپنی اپنی مساجد بنائی ہیں۔

اس لئے یہ سب مساجدِ مسلمین سمت قبلہ معلوم کرنے کے لئے کافی و وافی ہیں، ان میں بلاوجہ شبہات فلسفیہ نکالنا شرعاً محمود نہیں، بلکہ مذموم اور موجبِ تشویش ہے، بلکہ بسا اوقات ان تشویشات میں پڑنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ حضرات صحابہؓ و تابعینؒ اور عامۃ المسلمین پر بدگمانی ہوجاتی ہے، کہ ان کی نمازیں اور قبلہ درست نہیں، حالانکہ یہ باطل محض اور سخت جسارت ہے، آٹھویں صدی ہجری کے مشہور و معروف عالم ابن رجب حنبلیؒ اسی بنا پر سمتِ قبلہ میں آلات رصدیہ اور تدقیقات ریاضیہ میں پڑنے کو منع فرماتے ہیں، و لفظہ:

واما علم التسيير فاذا تعلم منه ما يحتاج اليه للاستهداء ومعرفة القبلة والطرق كان جائزا عند الجمهور وما زاد عليه فلا حاجة اليه وهو يشغل عما هو اهم منه وربما ادّى التدقيق فيه الى اساءة الظن بمحاريب المسلمين في امصارهم كما وقع في ذلك كثير من اهل هذا العلم قديما وحديثا وذلك يفضي الى اعتقاد خطاء الصّحابة والتابعين في صلواتهم في كثير من الامصار وهو باطل وقد انكر الامام احمد الاستدلال بالجدي وقال انما ورد مابين المشرق والمغرب قبلة	"لیکن علم تسییر سو اس کو اس قدر حاصل کرنا جمہور کے نزدیک جائز ہے جس سے راہ یابی اور قبلہ اور راستوں کی شناخت ہو سکے، اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں کہ وہ (یعنی زیادہ سیکھنا) امور ضروریہ سے غافل کر دے گا، اور بعض مرتبہ تدقیقات فلکیہ میں پڑنا عامۂ بلاد اسلامیہ میں جو مسلمانوں کی مسجدیں ہیں ان کے متعلق بدگمانی پیدا کر دیتا ہے، اس فن میں مشغول ہونیوالوں کو ہمیشہ اس قسم کے شبہات پیش آتے ہیں، اس سے یہ بھی اعتقاد پیدا ہو گا کہ بہت سے شہروں میں صحابہؓ و تابعینؒ کی نمازیں غلط طریقہ پر تھیں، اور یہ بالکل لغو و باطل ہے، امام احمدؒ نے (ستارہ) جدی (جس کو ہمارے بلاد میں قطب کہتے ہیں) سمتِ قبلہ میں اس سے استدلال کرنے کو منع کیا، اور

فرمایا کہ حدیث شریف میں (صرف) ما بین المشرق والمغرب قبلہ آیا ہے، یعنی مشرق و مغرب کے درمیان پوری جہت قبلہ ہے"۔

اور جن جنگلات یا نو آبادیات وغیرہ میں مساجد قدیمہ موجود نہ ہوں وہاں شرعی طریقہ جو سنت صحابہؓ و تابعینؒ سے ثابت ہے یہ ہے کہ شمس و قمر اور قطب وغیرہ کے مشہور و معروف ذرائع سے اندازہ قائم کر کے سمتِ قبلہ متعین کر لی جاوے، اگر اس میں معمولی انحراف و میلان بھی رہے تو اس کو نظر انداز کیا جاوے کیونکہ حسب تصریح صاحب بدائع ان بلادِ بعیدہ میں تحری اور اندازہ سے قائم کردہ جہت ہی قائم مقام کعبہ کے ہے، اور اسی پر احکام دائر ہیں، جیسے شریعت نے نیند کو قائم مقام خروج ریح کا قرار دے کر اسی پر نقضِ وضو کا حکم کر دیا، یا سفر کو قائم مقام مشقت کا قرار دے کر مطلقاً سفر پر رخصتیں مرتب کر دیں، حقیقۃً مشقت ہو یا نہ ہو، اسی طرح بلاد بعیدہ میں مشہور و معروف نشانات و علامات کے ذریعہ جو سمتِ قبلہ تحری و اندازہ سے قائم کی جائے گی وہی شرعاً قائم مقام کعبہ کے ہوگی، علامہ بحر العلوم نے رسائل الارکان میں اسی مضمون کو بالفاظِ ذیل بیان کیا ہے:

والشرط وقوع المسامتة على حسب	"اور استقبالِ قبلہ میں شرط و ضروری صرف یہ

مایری المصلّی ونحن غیر مأمورین بالمسامتة علی ما یحکم به الاٰلاٰت الرصدیة ولهذا افتوا ان الانحراف المفسد ان یتجاوز المشارق و المغارب (رسائل الارکان ص ۵۳)

ہر کہ نمازی کی رائے اور اندازہ کے موافق کعبہ کے ساتھ مسامتت (محاذات) واقع ہو جاوے اور ہم اس کے مکلف نہیں کہ وہ درجۂ مسامتت و محاذات کا پیدا کریں جو آلات رصدیہ کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے، اس لئے عام علماء کا فتویٰ ہے کہ انحراف مفسد (صلوٰۃ) وہ ہے جس میں مشرق و مغرب کا تفاوت ہو جاوے۔"

اس مسئلہ کی مکمل تشریح اور حسابات کے ذریعہ استخراج قبلہ کے مختلف طریقے اور ان کی شرعی حیثیت پر مفصل کلام میرے رسالے "سمتِ قبلہ" میں دیکھا جا سکتا ہے۔

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ

اور اگر تو لائے اہلِ کتاب کے پاس ساری نشانیاں تو بھی نہ مانیں گے تیرے قبلہ کو

وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ

اور نہ تو مانے اُن کا قبلہ اور نہ اُن میں ایک مانتا ہے دوسرے کا قبلہ اور اگر تو چلا

اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ

ان کی خواہشوں پر بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا تو بیشک تو بھی ہوا ان

الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

بے انصافوں میں۔

وقف لازم

خلاصۂ تفسیر

اور (باوجود ان لوگوں کے سب کچھ سمجھنے کے ان کی ضد کی یہ حالت تھی کہ) اگر آپ (ان) اہلِ کتاب کے سامنے تمام (دنیا بھر کی) دلیلیں (جمع کرکے) پیش کردیں جب بھی یہ (کبھی) آپ کے قبلہ کو قبول نہ کریں اور (ان کی موافقت کی امید اس لئے نہ رکھنی چاہئے کہ آپ کا قبلہ بھی منسوخ ہونے والا نہیں، اس لئے) آپ بھی ان کے قبلہ کو قبول نہیں کرسکتے، (پس کوئی صورت موافقت کی باقی نہیں رہی) اور (جیسا ان اہلِ کتاب کو آپ سے ضد ہے ان میں باہم بھی موافقت نہیں کیونکہ) ان کا کوئی (فریق) بھی دوسرے (فریق) کے قبلہ کو قبول نہیں کرتا، (مثلاً یہود نے بیت المقدس لے رکھا تھا اور نصاریٰ نے مشرق کی سمت کو قبلہ بنا رکھا تھا) اور

(خدانخواستہ آپ تو کسی طرح اُن کے قبلۂ منسوخہ غیر مشروعہ کو لے ہی نہیں سکتے، کیونکہ) اگر آپ ان کے (ان) نفسانی خیالات کو (گو وہ اصل میں حکم آسمانی رہے ہوں لیکن اب بوجہ منسوخ ہونے کے ان پر عمل کرنا محض نفسانی تعصب ہی، سو اگر آپ ایسے خیالات کو) اختیار کرلیں (اور وہ بھی) آپ کے پاس علم (قطعی یعنی وحی) آئے پیچھے، تو یقیناً آپ (نعوذ باللہ) ظالموں میں شمار ہونے لگیں (جو کہ تارکین حکم ہیں، اور آپ کا ظالم ہونا بوجہ معصوم ہونے کے محال ہے، اس لئے یہ بھی محال ہے کہ آپ ان کے خیالات کو جن میں سے ان کا قبلہ بھی ہے قبول کرلیں)۔

معارف و مسائل

وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب قیامت تک کے لئے آپ کا قبلہ بیت اللہ ہی رہے گا، اس سے یہود و نصاریٰ کے ان خیالات کا قطع کرنا مقصود تھا کہ مسلمانوں کے قبلہ کو تو کوئی قرار نہیں، پہلے بیت اللہ تھا، پھر بیت المقدس ہو گیا، پھر بیت اللہ ہو گیا، اب بھی ممکن ہے کہ پھر دوبارہ بیت المقدس ہی کو قبلہ بنا لیں۔ (بحر محیط)

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ، یہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور فرضِ محال کے ہے جس کے وقوع کا کوئی احتمال نہیں، اور دراصل سُنانا امتِ محمدیہ کو ہے، کہ اس کی خلاف ورزی ایسی چیز ہے کہ خود رسولؐ بھی بفرضِ محال ایسا کریں تو وہ بھی ظالم قرار پائیں۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ط

جن کو ہم نے دی ہے کتاب پہچانتے ہیں اس کو جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو

وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ اَلْحَقُّ

اور بیشک ایک فرقہ اُن میں سے چھپاتے ہیں حق کو جان کر ، حق وہی ہے

۱۷ ع ۱۶ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

جو تیرا رب کہے پھر تو نہ ہو شک لانے والا۔

خلاصۂ تفسیر اس سے پہلی آیت میں اہلِ کتاب کا قبلۂ مسلمین کو دل میں حق جاننے اور زبان سے نہ ماننے کا ذکر تھا، اس آیت میں انہی اہلِ کتاب کا صاحبِ قبلہ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح دل میں حق جاننے اور زبان سے نہ ماننے کا بیان ہے

جن لوگوں کو ہم نے کتاب (توراۃ و انجیل) دی ہے، وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو (تورات و انجیل میں آئی ہوئی بشارت کی بناء پر بحیثیت رسالت) ایسا (بے شک وشبہ) پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو (ان کی صورت سے) پہچانتے ہیں، (کہ بیٹے کی صورت دیکھ کر کبھی شبہ نہیں ہوتا کہ یہ کون شخص ہے، مگر پہچان کر بھی سب مسلمان نہیں ہوتے، بلکہ بعض تو ایمان لے آئے) اور بعضے ان میں سے (ایسے ہیں کہ اس) امر واقعی کو باوجود یکہ خوب جانتے ہیں (مگر) اخفاء کرتے ہیں (حالانکہ) یہ امر واقعی من جانب اللہ (ثابت ہو چکا) ہے سو (ایسے امر واقعی ثابت من اللہ میں ہر ہر فرد کو کہا جا سکتا ہے کہ) ہرگز شک وشبہ لانے والوں میں شمار نہ ہونا۔

معارف و مسائل

اس آیت میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت رسول پہچاننے کی تشبیہ اپنے بیٹوں کو پہچاننے کے ساتھ دی گئی ہے، کہ یہ لوگ جس طرح اپنے بیٹوں کو پوری طرح پہچانتے ہیں، ان میں کبھی شبہ و اشتباہ نہیں ہوتا، اسی طرح تورات و انجیل میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت اور آپ کی واضح علامات ونشانات کا ذکر آیا ہے اس کے ذریعہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یقینی طور سے جانتے پہچانتے ہیں، ان کا انکار محض عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ پوری طرح پہچاننے کے لئے بیٹوں کی مثال دی گئی ہے، ماں باپ کی مثال نہیں دی حالانکہ آدمی اپنے ماں باپ کو بھی عادۃً خوب پہچانتا ہے، وجہ یہ ہے کہ بیٹوں کی پہچان ماں باپ کی پہچان کی نسبت بہت زیادہ ہے، کیونکہ انسان اپنے بیٹوں کو ابتداءِ پیدائش سے اپنے ہاتھوں میں پالتا ہے، اس کے بدن کا کوئی حصّہ ایسا نہیں ہوتا جو ماں باپ کی نظر سے اوجھل رہا ہو، بخلاف ماں باپ کے کہ ان کے اعضاء مستورہ پر اولاد کی کبھی نظر نہیں ہوتی۔

اس بیان سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ یہاں بیٹوں کو بیٹا ہونے کی حیثیت سے پہچاننا مراد نہیں، کیونکہ اسکی نسبت تو انسان پر مشتبہ ہو سکتی ہے کہ ممکن ہے کہ بیوی نے خیانت کی ہو اور یہ بیٹا اپنا نہ ہو، بلکہ مراد ان کی شکل وصورت وغیرہ کا پہچاننا ہے کہ بیٹا فی الواقع اپنا ہو یا نہ ہو، مگر جس کو بحیثیت بیٹے کے انسان پالتا ہے اس کی شکل وصورت کے پہچاننے میں کبھی اشتباہ نہیں ہوتا۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا

اور ہر کسی کے واسطے ایک جانب ہے یعنی قبلہ کہ وہ منہ کرتا ہے اس طرف سو تم سبقت کرو نیکیوں میں جہاں کہیں تم

يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾ وَمِنْ

ہو گے کر لائے گا تم کو اکٹھا، بیشک اللہ ہر چیز کر سکتا ہے، اور جس جگہ سے

حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَاِنَّهٗ

تو نکلے سو مُنہ کر اپنا مسجدِ حرام کی طرف اور بے شک یہی حق ہے

لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَمِنْ حَيْثُ

تیرے رب کی طرف سے اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے، اور جہاں سے تو

خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ

نکلے مُنہ کر اپنا مسجد حرام کی طرف، اور جس جگہ تم ہوا کرو مُنہ کرو

فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۤ ۙ اِلَّا

اسی کی طرف تاکہ نہ رہے لوگوں کو تم سے جھگڑنے کا موقع مگر جو

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۤ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۤ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ

اُن میں بے انصاف ہیں، سو اُن سے (یعنی انکے اعتراضوں سے) نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور اس واسطے کہ کامل

عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾

کروں تم پر فضل اپنا اور تاکہ تم پاؤ راہ سیدھی۔

خلاصہ تفسیر اور (دوسری حکمت تحویلِ قبلہ میں یہ ہے کہ عادۃ اللہ جاری ہے کہ) ہر (مذہب والے) شخص کے واسطے ایک ایک قبلہ رہا ہے، جس کی طرف وہ (عبادت میں) مُنہ کرتا رہا ہے (چونکہ شریعت محمدیؐ یہ بھی ایک مستقل دین ہے، اس کا قبلہ بھی ایک خاص ہوگیا، جب حکمت سب پر ظاہر ہو چکی) سو (مسلمانو) تم (اب اس بحث کو چھوڑ کر اپنے دین کے) نیک کاموں میں آگے بڑھنے کی کوشش کرو (کیونکہ ایک روز اپنے مالک سے سابقہ پڑنا ہے، چنانچہ) تم خواہ کہیں ہوگے (لیکن) اللہ تعالیٰ تم سب کو (اپنے اجلاس میں) حاضر کردیں گے (اس وقت نیکیوں پر جزا اور اعمالِ بد پر سزا ہوگی اور) بالیقین اللہ تعالیٰ ہر امر پر پوری قدرت رکھتے ہیں، اور (اس حکمت کا مقتضا بھی یہی ہے کہ جس طرح حضر میں کعبہ کی طرف رُخ ہوتا ہے اسی طرح اگر مدینہ سے یا اور کہیں سے) جس جگہ سے بھی (کہیں سفر میں) آپ باہر جاویں تو (بھی) اپنا چہرہ (نماز میں) مسجد حرام کی طرف رکھا کیجئے، (غرض حضر و سفر سب حالتوں کا یہی قبلہ ہے) اور یہ (حکم عام قبلہ کا) بالکل حق (اور صحیح) ہے (اور) منجانب اللہ (ہے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں سے ذرا بیخبر نہیں۔

تحویلِ قبلہ کی تیسری حکمت اور (مکرر پھر کہا جاتا ہے کہ) آپ جس جگہ سے بھی (سفر میں) باہر جاویں (اور

حضر میں بدرجہ اولیٰ) اپنا چہرہ (نماز میں) مسجدِ حرام کی طرف رکھئے، اور (اسی طرح سب مسلمان بھی سُن لیں کہ) تم لوگ جہاں کہیں (موجود) ہو اپنا چہرہ (نماز میں) اُسی (مسجد حرام) کی طرف رکھا کرو (اور یہ حکم اس لئے مقرر کیا جاتا ہے) تاکہ (ان مخالف) لوگوں کو تمہارے مقابلہ میں (اس) گفتگو (کی مجال) نہ رہے، (کہ اگر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم وہی نبی موعود آخر الزماں ہوتے تو ان کی علامات میں تو یہ بھی ہے کہ ان کا اصلی قبلہ کعبہ ہوگا، اور یہ تو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے ہیں، یہ تیسری حکمت ہے تحویل قبلہ کی، ہاں) مگر ان میں جو (بالکل ہی) بے انصاف ہیں (وہ اب بھی کٹھ حجتی نکالیں گے، کہ یہ کیسے نبی ہیں جو اتنے نبیوں کے خلاف کعبہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں. لیکن جب ایسے مہمل اعتراضوں سے دین حق کو کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا) تو ایسے لوگوں سے (ذرا) اندیشہ نہ کرو (اور ان کے اعتراضوں کے جواب کی فکر میں مت پڑو) اور مجھ سے ڈرتے رہو (کہ میرے احکام کی مخالفت نہ ہونے پائے کہ یہی مخالفت البتہ تم کو مضر ہے) اور (ہم نے ان سب احکام مذکورہ پر عمل کرنے کی توفیق بھی دی) تاکہ تم پر جو (کچھ) میرا انعام (و اکرام متوجہ) ہے (تم کو آخرت میں داخلِ بہشت کرکے) اس کی تکمیل کردوں اور تاکہ (دنیا میں) تم راہ (حق) پر (یعنی اسلام پر قائم رہنے والوں میں) رہو (جس پر وہ تکمیلِ نعمت مرتب ہوتی ہے)

معارف و مسائل

تحویلِ قبلہ کی حکمتیں مذکورہ آیات میں تحویل قبلہ کیلئے الفاظ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ تین مرتبہ آئے ہیں اور حَيْثُمَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ دو مرتبہ اس تکرار کی ایک عام وجہ تو یہ ہے کہ تحویلِ قبلہ کا حکم مخالفین کے لئے تو شور و شغب کا ذریعہ تھا ہی خود مسلمانوں کے لئے بھی عبادات کا ایک عظیم انقلاب تھا، اگر یہ حکم تاکیدات کے ساتھ بتکرار نہ لایا جاتا تو قلوب کا اطمینان و سکون آسان نہ ہوتا، اس لئے اس حکم کو بار بار دہرایا گیا جس میں اس کی طرف بھی اشارہ کیا گیا کہ یہ تحویل آخری اور قطعی ہے، اب اس کی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں۔

بیان القرآن کے خلاصہ تفسیر میں جو تطبیق کی صورت لکھی گئی ہے قرطبی نے بھی اسکی ایک ایسی تقریر نقل کی ہے جس سے تکرار محض نہ رہی مثلاً فرمایا کہ پہلی مرتبہ جو حکم آیا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُمَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ یہ حکم حالتِ حضر کا ہے، کہ جب آپ اپنی جگہ مقیم ہیں تو آپ مسجد حرام کی طرف رُخ کیا کریں، اور پھر پوری امت کو اسی کا حکم دیا گیا، اور حَيْثُمَا كُنْتُمْ کا مفہوم اس تقریر پر یہ ہوگا کہ اپنے وطن اور شہر میں جس جگہ بھی ہوں استقبال بیت اللہ ہی کا کرنا ہے، یہ حکم صرف مسجد نبوی کے ساتھ مخصوص نہیں۔

پھر دوسری مرتبہ جو انہی الفاظ کے ساتھ حکم آیا اس سے پہلے مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ کے الفاظ نے یہ واضح کر دیا کہ یہ حکم وطن سے نکلنے اور سفر کی حالت کے لئے ہے، اور چونکہ سفر کے حالات بھی مختلف ہوتے ہیں، کبھی چند روز کے لئے کسی بستی میں قیام کیا جاتا ہے، کبھی سفر قطع کرنے کا سلسلہ ہوتا ہے، ان دونوں حالتوں کو عام کرنے کے لئے تیسری مرتبہ پھر ان الفاظ کے ساتھ وَحَيْثُمَا كُنْتُمْ کا اضافہ کر کے تبلا دیا کہ سفر کی کوئی بھی حالت ہو ہر حال میں استقبال مسجدِ حرام ہی کا کرنا ہے اس تیسری مرتبہ کے اعادہ کے ساتھ تحویلِ قبلہ کی ایک حکمت کا بھی جوڑ لگا دیا گیا، کہ مخالفین کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ نبی آخر الزمانؐ کا قبلہ تو تورات و انجیل کی تصریحات کے مطابق کعبہ ہونا چاہئے، اور یہ رسولؐ کعبہ کے بجائے بیت المقدس کا استقبال کرتے ہیں۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا ۔ وِجْهَةٌ بکسر الواؤ کے معنی لغوی، جس چیز کی طرف رُخ کیا جائے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد قبلہ ہے، اور حضرت ابی بن کعبؓ کی قراءت میں اس جگہ وِجْهَةٌ کی بجائے قِبْلَةٌ بھی منقول ہے، مراد آیت کی جمہور مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ ہر قوم کا قبلہ جس کی طرف وہ عبادت میں رُخ کرتے ہیں مختلف ہے، خواہ منجانب اللہ ان کو ایسا ہی حکم ملا ہے یا انھوں نے خود کوئی جانب مقرر کرلی ہے، بہرحال یہ امر واقعہ ہے کہ مختلف قوموں کے قبلے مختلف ہوتے چلے آئے ہیں، تو اسی حالت میں اگر نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کوئی خاص قبلہ مقرر کر دیا گیا تو انکار و تعجب کی کیا بات ہے۔

مذہبی مسائل میں فضول بحثوں سے اجتناب کی ہدایت

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۔ اس سے پہلے جملہ میں یہ فرمایا تھا کہ مختلف قوموں کے مختلف قبلے ہیں، کوئی ایک دوسرے کے قبلہ کو تسلیم نہیں کرتا، اس لئے اپنے قبلہ کے حق ہونے پر ان لوگوں سے بحث فضول ہے، اس جملے کا حاصل یہ ہے کہ جب یہ معلوم ہے کہ اس بحث سے ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہونچے گا، تو پھر اس فضول بحث کو چھوڑ کر اپنے اصلی کام میں لگ جانا چاہئے، اور وہ کام ہے نیک کاموں میں دوڑ دھوپ اور آگے بڑھنے کی کوشش اور چونکہ فضول بحثوں میں وقت ضائع کرنا اور مسابقت الی الخیرات میں سستی کرنا، عموماً آخرت سے غفلت کے سبب ہوتے ہیں، جس کو اپنی آخرت اور انجام کی فکر درپیش ہو وہ کبھی فضول بحثوں میں نہیں الجھتا، اپنی منزل طے کرنے کی فکر میں رہتا ہے، اس لئے اگلے جملے میں آخرت کی یاد دلانے کے لئے ارشاد فرمایا، اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا، جس کا مطلب یہ ہے کہ بحثوں میں ہار جیت اور لوگوں کے اعتراضات سے بچنے کی فکر سب چند روزہ دنیا کے لئے ہے، اور عنقریب وہ دن آنے والا ہے جس میں اللہ تعالیٰ تمام اقوامِ عالم کو ایک جگہ جمع کر کے حساب لیں گے، عقلمند کا کام یہ ہے کہ اپنے اوقات اس کی فکر میں صرف کرے۔

عبادات اور نیک اعمال میں بلا وجہ تاخیر کرنا مناسب نہیں مسارعت کرنا چاہئے

لفظ فَاسْتَبِقُوْا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان کو چاہئے کہ کسی نیک عمل کا جب موقع مل جائے تو اس کے کرنے میں دیر نہ کرے، کیونکہ بعض اوقات اس کے ٹلانے اور تاخیر کرنے سے توفیق سلب ہو جاتی ہے، پھر آدمی کام کر ہی نہیں سکتا، خواہ وہ نماز روزہ ہو یا حج وصدقہ وغیرہ، قرآن کریم میں یہی مضمون سورۃ انفال کی آیت میں زیادہ وضاحت سے آیا ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ (۸: ۲۴)

"یعنی اے ایمان والو! تم اللہ و رسول کے کہنے کو بجالایا کرو جبکہ رسول تم کو تمہاری زندگی بخش چیز کی طرف بلاتے ہوں اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ آڑ بن جایا کرتا ہے آدمی کے اور اس کے قلب کے درمیان میں"۔

کیا ہر نماز کا اوّل وقت میں پڑھنا افضل ہے

اس مسابقت فی الخیرات سے بعض فقہاء نے اس پر استدلال کیا ہے کہ ہر نماز کو اوّل وقت میں پڑھنا افضل ہے، اور وہ روایات حدیث اس کی تائید میں پیش کی ہیں جن میں اوّل وقت نماز ادا کرنے کی فضیلت آئی ہے، امام شافعیؒ کا یہی مذہب ہے، مگر امام اعظم ابوحنیفہ و مالک رحمہما اللہ نے دوسری روایاتِ حدیث کی بناء پر اس معاملے میں تفصیل کی ہے کہ جن نمازوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاخیر کرکے پڑھنے کی تعلیم اپنے قول و عمل سے دی ہے، ان کا اوّل اور افضل وقت وہی ہے جو اُن احادیث میں بیان ہوا ہے، باقی اپنی اصل پر اوّل وقت میں پڑھی جائیں، مثلاً صحیح بخاری میں بروایت انسؓ عشاء کی نماز کو مؤخر کرکے پڑھنے کی فضیلت مذکور ہے اور حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عشاء کی تاخیر پسند تھی (قرطبی)

اسی طرح صحیح بخاری و ترمذی میں بروایت ابوذرؓ منقول ہے کہ ایک سفر میں حضرت بلالؓ نے ظہر کی اذان اوّل وقت میں دینا چاہی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے روکا، اور فرمایا کہ جب وقت ذرا ٹھنڈا ہو جائے اس وقت اذان کہی جائے کیونکہ گرمی کی شدّت جہنم کی آگ سے ہے، مطلب یہ ہے کہ گرمی کے زمانے میں نماز ظہر کو تاخیر سے پڑھنا پسند فرمایا۔

ان روایات کی بناء پر امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ نے فرمایا کہ ان نمازوں میں اوّل وقت پر عمل کرنے کی صورت یہی ہے کہ جب وقت مستحب ہو جائے تو پھر تاخیر نہ کریں، اور جہاں کوئی تاخیر کا حکم نہیں آیا وہاں بالکل ابتداء وقت ہی میں نماز پڑھنا افضل ہے جیسے نماز مغرب۔

بہرحال آیتِ مذکورہ سے یہ بات باتفاق ثابت ہوگئی کہ جب نماز کا وقت آجائے تو بغیر ضرورت شرعیہ یا طبعیہ کے تاخیر کرنا اچھا نہیں، ضرورتِ شرعیہ تو وہی ہے جو اوپر لکھی گئی، کہ بعض نمازوں کی تاخیر کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے اور ضرورت طبعیہ اپنے ذاتی عوارض بیماری و محتاجی کے سبب تاخیر کرنا، واللہ اعلم۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ

جیساکہ بھیجا ہم نے تم میں رسول تم ہی میں کا پڑھتا ہے تمہارے آگے آیتیں ہماری اور پاک کرتا ہے تم کو

وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٥١﴾

اور سکھلاتا ہے تم کو کتاب اور اس کے اسرار اور سکھاتا ہے تم کو جو تم نہ جانتے تھے،

۱۸ ع ۵ ۲ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿١٥٢﴾ ع

سو تم یاد رکھو مجھ کو میں یاد رکھوں تم کو اور احسان مانو میرا اور ناشکری مت کرو

خلاصۂ تفسیر

(یعنی ہم نے کعبہ کو قبلہ مقرر کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک دعاء جو درباب مقبولیت بناءِ کعبہ تھی اس طرح قبول کی) جس طرح (ان کی دوسری دعاء جو درباب بعثتِ محمدؐ یہ کے تھی قبول کی کہ) تم لوگوں میں ہم نے ایک (عظیم الشان) رسول کو بھیجا (جو کہ) تم ہی میں سے (ہیں اور وہ) ہماری آیات (واحکام) پڑھ پڑھ کر تم کو سناتے ہیں اور (خیالات ورسوم جہالت سے) تمہاری صفائی کرتے رہتے ہیں، اور تم کو کتاب (الٰہی) اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور تم کو ایسی (مفید) باتیں تعلیم کرتے ہیں جن کی تم کو خبر بھی نہ تھی، (اور نہ کتب سابقہ یا عقل ان کے لئے کافی تھی، اور اس شان کے رسول کے مبعوث ہونے کی ابراہیم علیہ السلام کی دعاء تھی، سو اس کا ظہور ہوگیا) ان (مذکورہ) نعمتوں پر مجھ کو (منعم ہونے کی حیثیت سے) یاد کرو میں تم کو (عنایت سے) یاد رکھوں گا، اور میری (نعمت کی) شکر گذاری کرو اور (انکارِ نعمت یا ترک اطاعت سے) میری ناسپاسی مت کرو۔

معارف و مسائل

یہاں تک قبلہ کی بحث چلی آرہی تھی، اب اس بحث کو ایسے مضمون پر ختم فرمایا گیا ہے، جو اس بحث کی تمہید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام بانیِ کعبہ کی دعاء میں ضمناً آیا تھا، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اولادِ ابراہیمؑ میں ایک خاص شان کے ساتھ مبعوث ہونا، اس میں اس طرف بھی اشارہ ہوگیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت میں بانیِ کعبہ کی دعاء کو بھی دخل ہے، اس لئے اگر ان کا قبلہ کعبہ کو بنا دیا گیا تو اس میں کوئی تعجب یا انکار کی بات نہیں ہے۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا میں حرف کاف جو تشبیہ کے لئے آتا ہے اس کی ایک توجیہ تو وہ ہے جو خلاصۂ تفسیر سے معلوم ہو چکی ہے، دوسری ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے جس کو قرطبی نے اختیار کیا ہے، کہ اس حرف کاف کا تعلق بعد کی آیت فَاذْكُرُوْنِيْٓ سے ہے، اور معنی یہ ہیں کہ جیسا ہم نے تم پر

ایک نعمت قبلہ کی پھر دوسری نعمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی مبذول فرمائی ہو ایسی ہی نعمت ذکراللہ بھی ہے، ان سب نعمتوں کا شکر ادا کرو، تاکہ یہ نعمتیں اور زیادہ ہوجائیں قرطبیؒ نے فرمایا کہ کَمَآ اَرْسَلْنَا کا کاف یہاں ایسا ہی ہے جیسے سورۂ انفال میں کَمَآ اَخْرَجَكَ اور سورۂ حجر کے آخر میں کَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ آیا ہے۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ، ذکر کے اصلی معنی یاد کرنے کے ہیں جس کا تعلق قلب سے ہے، زبان سے ذکر کرنے کو بھی ذکر اس لئے کہا جاتا ہے کہ زبان ترجمانِ قلب ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ذکر زبانی وہی معتبر ہے جس کے ساتھ دل میں بھی اللہ کی یاد ہو، مولانا رومیؒ نے اسی کے متعلق فرمایا ہے ؎

بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر
ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اگر کوئی شخص زبان سے ذکر و تسبیح میں مشغول ہو مگر اس کا دل حاضر نہ ہو اور ذکر میں نہ لگے تو وہ بھی فائدہ سے خالی نہیں، حضرت ابوعثمانؒ سے کسی نے ایسی ہی حالت کی شکایت کی کہ ہم زبان سے ذکر کرتے ہیں، مگر قلوب میں اس کی کوئی حلاوت محسوس نہیں کرتے، آپؒ نے فرمایا اس پر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر کرو، کہ اس نے تمہارے ایک عضو یعنی زبان کو تو اپنی طاعت میں لگالیا (قرطبی)

ذکراللہ کے فضائل بے شمار ہیں، اور یہی ایک فضیلت کچھ کم نہیں ہے، کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد فرماتے ہیں، ابوعثمان نہدیؒ نے کہا کہ میں اس وقت کو جانتا ہوں جس وقت اللہ تعالیٰ ہمیں یاد فرماتے ہیں، لوگوں نے کہا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوسکتا ہے، فرمایا اس لئے کہ قرآن کریم کے وعدے کے مطابق جب کوئی بندۂ مومن اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اُسے یاد کرتے ہیں، اس لئے سب کو یہ سمجھ لینا آسان ہے کہ جس وقت ہم اللہ کی یاد میں مشغول ہوں گے تو اللہ تعالیٰ بھی یاد فرمائیں گے۔

اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم مجھے اطاعتِ احکام کے ساتھ یاد کرو تو میں تمھیں ثواب اور مغفرت کے ساتھ یاد کروں گا، حضرت سعید بن جبیرؒ نے ذکر اللہ کی تفسیر ہی طاعت و فرمانبرداری سے کی ہے وہ فرماتے ہیں:

فمن لم یطعہ لم یذکرہ وان کثر صلٰوتہ وتسبیحہ	"یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی نہ کی اس نے اللہ کو یاد نہیں کیا، اگرچہ ظاہر میں اس کی نماز اور تسبیح کتنی بھی ہو"

ذکراللہ کی اصل حقیقت قرطبی نے بحوالہ احکام القرآن ابن خویز منداذ ایک حدیث بھی اس مضمون کی نقل کی ہے

جس کا ترجمہ یہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی، یعنی اس کے احکام حلال و حرام کا اتباع کیا اس نے اللہ کو یاد کیا، اگرچہ اس کی (نفل) نماز روزہ وغیرہ کم ہوں، اور جس نے احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی کی اس نے اللہ کو بھلا دیا، اگرچہ (بظاہر) اس کی نماز، روزہ، تسبیحات وغیرہ زیادہ ہوں۔

حضرت ذوالنون مصریؒ نے فرمایا کہ جو شخص حقیقی طور پر اللہ کو یاد کرتا ہے وہ اس کے مقابلے میں ساری چیزوں کو بھول جاتا ہے، اور اس کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ خود اس کے لئے ساری چیزوں کی حفاظت کرتے ہیں، اور تمام چیزوں کا عوض اس کو عطا کر دیتے ہیں۔

اور حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ انسان کا کوئی عمل اس کو خدا تعالیٰ کے عذاب سے نجات دلانے میں ذکر اللہ کے برابر نہیں، اور ایک حدیث قدسی بروایت ابو ہریرہؓ میں ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب تک وہ مجھے یاد کرتا ہے، اور میرے ذکر میں اس کے ہونٹ ہلتے رہیں، ذکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں، ان کا مختصر خلاصہ احقر نے اپنے رسالہ ذکر اللہ میں جمع کر دیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ		
اے مسلمانو! مدد لو صبر اور نماز سے ، بیشک اللہ صبر		
	الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾	
	کرنے والوں کے ساتھ ہے	

ربط :۔ تحویلِ قبلہ پر جو مخالفین کی طرف سے اعتراض تھا، اس کے دو اثر تھے، ایک مذہب اسلام پر کہ اعتراض سے مذہب کی حقانیت میں شبہ پیدا کیا جایا کرتا ہے، اوپر کی آیتوں میں اس اعتراض کا جواب دے کر اس اثر کا دفع کرنا مقصود تھا، دوسرا اثر طبائع اہل اسلام پر کہ اعتراض سے بالخصوص جواب دینے کے بعد بھی اس پر بے جا اصرار کرنے سے قلب میں رنج اور صدمہ پیدا ہوتا ہے، آیتِ آئندہ میں تخفیفِ حزن کا طریقہ کہ صبر و صلوٰۃ ہے، بتلا کر اس دوسرے اثر کو زائل فرماتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو! (طبیعتوں میں غم ہلکا کرنے کے بارے میں) صبر اور نماز سے سہارا (اور مدد) حاصل کرو، بلاشبہ حق تعالیٰ (ہر طرح سے) صبر کرنے والوں کے ساتھ رہتے ہیں، (اور نماز پڑھنے والوں کے ساتھ تو بدرجۂ اولیٰ، وجہ یہ کہ نماز سب سے بڑی عبادت ہی، جب صبر میں یہ وعدہ ہے تو نماز جو اس سے بڑھ کر ہے اس میں تو بدرجۂ اولیٰ یہ بشارت ہوگی)۔

مَعارف و مسَائل

صبر اور نماز ہر مشکل کا حل اور ہر تکلیف کا علاج ہیں

اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ، اس آیت میں یہ ہدایت ہے کہ انسان کی تمام حوائج و ضروریات کے پورا کرنے اور تمام آفات و مصائب اور تکالیف کو دور کرنے کا نسخہ اکسیر دو جزء سے مرکب ہے، ایک صبر، دوسرے نماز، اور اس نسخہ کے تمام حوائج اور تمام مصائب کے لئے عام ہونے کی طرف قرآن عظیم نے اس طرح سے اشارہ کر دیا ہے کہ اِسْتَعِيْنُوْا کو عام چھوڑا ہے، کوئی خاص چیز ذکر نہیں فرمائی، کہ فلاں کام میں ان دونوں چیزوں سے مدد حاصل کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ ان سے انسان کی ہر ضرورت میں مدد حاصل کی جاسکتی ہے، تفسیر مظہری میں اس عموم کو واضح کر دیا ہے، اب اس دو جزئی نسخے کے دونوں اجزاء کو سمجھ لیجئے۔

صبر کی اصل حقیقت

صبر کے اصلی معنی اپنے نفس کو روکنے اور اس پر قابو پانے کے ہیں، قرآن و سنت کی اصطلاح میں صبر کے تین شعبے ہیں، ایک اپنے نفس کو حرام و ناجائز چیزوں سے روکنا، دوسرے طاعات و عبادات کی پابندی پر مجبور کرنا، تیسرے مصائب و آفات پر صبر کرنا، یعنی جو مصیبت آگئی اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھنا، اور اس کے ثواب کا امیدوار ہونا، اس کے ساتھ اگر تکلیف و پریشانی کے اظہار کا کوئی کلمہ بھی مُنہ سے نکل جائے تو وہ صبر کے منافی نہیں۔ (ذکرہ ابن کثیر عن سعید بن جبیرؓ)

یہ تینوں شعبے صبر کے فرائض میں داخل ہیں، ہر مسلمان پر یہ پابندی عائد ہے کہ تینوں طرح کے صبر کا پابند ہو، عوام کے نزدیک صرف تیسرے شعبے کو تو صبر کہا جاتا ہے، دو شعبے جو صبر کی اصل اور بنیاد ہیں عام طور پر اُن کو صبر میں داخل ہی نہیں سمجھا جاتا۔

قرآن و حدیث کی اصطلاح میں صابرین انھیں لوگوں کا لقب ہے جو تینوں طرح کے صبر میں ثابت قدم ہوں، بعض روایات میں ہے کہ محشر میں نداء کی جائے گی کہ صابرین کہاں ہیں؟ تو وہ لوگ جو تینوں طرح کے صبر پر قائم رہ کر زندگی سے گذرے ہیں وہ کھڑے ہو جائیں گے، اور ان کو بلا حساب جنت میں داخلہ کی اجازت دیدی جائے گی، ابن کثیرؒ نے اس روایت کو نقل کر کے فرمایا کہ آیت قرآن اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۳۹: ۱۰) سے بھی اس طرف اشارہ ہوتا ہے۔

نماز، دوسرا جزء اس نسخہ کا جو تمام انسانی ضروریات کو پورا کرنے اور تمام پریشانیوں اور آفتوں سے نجات دلانے میں اکسیر ہے نماز ہے، صبر کی جو تفسیر ابھی لکھی گئی ہے اس سے معلوم ہو گیا ہے کہ درحقیقت نماز اور تمام عبادات صبر ہی کے جزئیات ہیں، مگر نماز کو جداگانہ بیان اس لئے کر دیا کہ تمام عبادات میں سے نماز ایک ایسی عبادت ہے جو صبر کا مکمل نمونہ ہے، کیونکہ نماز کی حالت میں نفس کو عبادت و طاعت پر محبوس بھی کیا جاتا ہے، اور تمام معاصی و مکروہات سے

بلکہ بہت سے مباحات سے بھی نفس کو بحالتِ نماز روکا جاتا ہے، اس لئے صبر جس کے معنی نفس کو اپنے قابو میں رکھ کر تمام طاعات کا پیرو اور تمام معاصی سے مجتنب و بیزار بنانا ہے، نماز اس کی ایک عملی تمثیل ہے۔

اس کے علاوہ نماز کو انسان کی تمام حاجات کے پورا کرنے اور تمام آفتوں مصیبتوں سے نجات دلانے میں ایک خاص تاثیر بھی ہے، گو اس کی وجہ اور سبب معلوم نہ ہو، جیسے دواؤں میں بہت سی ادویات کو مؤثر بالخاصۃ تسلیم کیا جاتا ہے، یعنی کیفیات حرارت و برودت کے حساب سے جیسے کسی خاص مرض کے ازالہ کے لئے بعض دوائیں بالخاصۃ مؤثر ہوتی ہیں، جیسے دردِ گردہ کے لئے فرنگی دانہ کو ہاتھ یا مُنہ میں رکھنا، اور بہت سے امراض کے لئے عود صلیب وغیرہ کو گلے میں ڈالنا مؤثر بالخاصۃ ہے، سبب نامعلوم ہے، لوہے کو کھینچنے میں مقناطیس مؤثر بالخاصہ ہے، وجہ معلوم نہیں، اسی طرح نماز تمام انسانی ضروریات کی کفالت اور تمام مصائب سے نجات دلانے میں مؤثر بالخاصہ ہے بشرطیکہ نماز کو نماز کی طرح آداب اور خشوع خضوع کے ساتھ پڑھا جائے، ہماری جو نمازیں غیر مؤثر نظر آتی ہیں، اس کا سبب ہمارا قصور ہے کہ نماز کے آداب اور خشوع و خضوع میں کوتاہی ہوتی ہے، ورنہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ جب کوئی مہم پیش آتی تو نماز کی طرف رجوع فرماتے تھے، اور اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس مہم کو پورا فرما دیتے تھے، حدیث میں ہے:

اذا حزبہ امر فزع الی الصلوٰۃ	یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی ضرورت پیش آتی تو نماز کی طرف رجوع فرمایا کرتے تھے۔

صبر اور نماز تمام مشکلات و مصائب سے نجات کا سبب اس لئے ہے کہ صبر سے اللہ تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ، اس کلمہ میں اس کا راز بتلا دیا گیا ہے کہ صبر حلِ مشکلات اور دفعِ مصائب کا سبب کیسے بنتا ہے، ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ صبر کے نتیجہ میں انسان کو حق تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ جس شخص کے ساتھ رب العزت کی طاقت ہو اس کا کونسا کام رُک سکتا ہے اور کونسی مصیبت اس کو عاجز کر سکتی ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ

اور نہ کہو اُن کو جو مارے گئے خدا کی راہ میں کہ مُردے ہیں بلکہ وہ زندے ہیں لیکن

لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝۱۵۴ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ

تم کو خبر نہیں، اور البتہ ہم آزمائیں گے تم کو تھوڑے سے ڈر سے اور بھوک سے اور نقصانوں سے

مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ

مالوں کے اور جانوں کے اور میووں کے اور خوش خبری دے صبر کرنے والوں کو کہ جب

اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ

پہنچے اُن کو مصیبت تو کہیں ہم تو اللہ ہی کا مال ہیں اور ہم اُسی کی طرف لوٹ کر جانیوالے ہیں ، ایسے ہی

عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

لوگوں پر عنایتیں ہیں اپنے رب کی اور مہربانی اور وہی ہیں سیدھی راہ پر۔

رَبط اوپر ایک خاص ناگوار واقعہ میں صبر کی تعلیم اور صابرین کی نضیلت بیان فرمائی تھی، آیاتِ آئندہ میں اور بھی بعض واقعات خلافِ طبع کی تفصیل اور اس میں صبر کی ترغیب اور فضیلت بیان فرماتے ہیں، جن میں قتل و قتال مع الکفار کا مضمون مقدم فرماتے ہیں، دو وجہ سے، اوّل بوجہ اعظم ہونے کے، کہ اعظم پر صبر کرنے والا اصغر پر بدرجۂ اولیٰ صبر کرے گا، دوسرے خاص طور پر مناسب مقام ہونے کی وجہ سے، کیونکہ معترضین مذکورین کے ساتھ یہ معاملہ پیش آتا تھا،

خلاصۂ تفسیر اور جو لوگ اللہ کی راہ میں (یعنی دین کے واسطے) قتل کئے جاتے ہیں ان (کی ایسی فضیلت ہے کہ ان) کی نسبت یوں بھی مت کہو کہ وہ (معمولی مُردوں کی طرح) مُردے ہیں، بلکہ وہ لوگ (ایک ممتاز حیات کے ساتھ) زندہ ہیں، لیکن تم (اپنے موجودہ) حواس سے (اس حیات کا) ادراک نہیں کر سکتے، اور (دیکھو) ہم (صفتِ رضا و تسلیم میں جو کہ مقتضا ایمان کا ہے) تمہارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف سے (جو کہ ہجوم مخالفین یا نزولِ حوادث و شدائد سے پیش آوے) اور (کسی قدر فقر و) فاقہ سے اور (کسی قدر) مال اور جان اور پھلوں کی کمی سے (مثلاً مواشی مر گئے یا کوئی آدمی مر گیا، یا بیمار ہو گیا یا پھل اور کھیتی کی پیداوار تلف ہو گئی، پس تم صبر کرنا) اور (جو لوگ ان امتحانوں میں پورے اتر آویں اور مستقل رہیں تو) آپ ایسے صابرین کو بشارت سُنا دیجئے (جن کی یہ عادت ہے) کہ ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ (دل سے سمجھ کر یوں) کہتے ہیں کہ ہم تو (مع مال و اولاد حقیقۃً) اللہ تعالیٰ ہی کی مِلک ہیں (اور مالکِ حقیقی کو اپنی مِلک میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار حاصل ہے، اس سے مملوک کا تنگ ہونا کیا معنی) اور ہم سب (دنیا سے) اللہ تعالیٰ ہی کے پاس جانے والے ہیں (سو یہاں کے نقصانوں کا بدلہ وہاں جا کر مل رہے گا، اور جو مضمون بشارت کا ان کو سُنایا جائے گا وہ یہ ہے کہ) ان لوگوں پر (جدا جدا) خاص خاص رحمتیں بھی ان کے پروردگار کی طرف سے (مبذول) ہوں گی اور (سب پر بالاشتراک) عام رحمت بھی ہوگی، اور یہی لوگ ہیں جن کی (حقیقتِ حال تک) رسائی ہو گئی (کہ حق تعالیٰ کو ہر چیز کا مالک اور نقصان کا تدارک کر دینے والا سمجھ گئے)۔

معارف و مسائل

شہداءؒ اور انبیاءؑ کی حیات برزخی اور اس کے درجات میں تفاضل

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اسلامی روایات کی رُو سے ہر مرنے والے کو برزخ میں ایک خاص قِسم کی حیات ملتی ہے جس سے وہ قبر کے عذاب یا ثواب کو محسوس کرتا ہے، اس میں مومن وکافر یا صالح وفاسق میں کوئی تفریق نہیں، لیکن اس حیات برزخی کے مختلف درجات ہیں ایک درجہ تو سب کو عام اور شامل ہے، کچھ مخصوص درجے انبیاءؑ وصالحینؒ کے لئے مخصوص ہیں، اور ان میں بھی باہمی تفاضل ہے، اس مسئلہ کی تحقیق پر علماء کے مقالات وتحقیقات بے شمار ہیں، لیکن ان میں سے جو بات اقرب الی الکتاب والسنّت ہو اور شبہات سے پاک ہو، اس کو سیدی حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے بیان القرآن میں واضح فرمایا ہے، اس جگہ اسی کو نقل کرنا کافی معلوم ہوا۔

ف: ایسے مقتول کو جو اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے شہید کہتے ہیں، اور اس کی نسبت گو یہ کہنا کہ وہ مرگیا صحیح اور جائز ہے، لیکن اس کی موت کو دوسرے مُردوں کی سی موت سمجھنے کی ممانعت کی گئی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ بعد مرنے کے گو برزخی حیات ہر شخص کی روح کو حاصل ہے، اور اسی سے جزاء وسزا کا ادراک ہوتا ہے، لیکن شہید کو اس حیات میں اور مُردوں سے ایک گونہ امتیاز ہے اور وہ امتیاز یہ ہے کہ اس کی یہ حیات آثار میں اوروں سے قوی ہے، جیسے انگلیوں کے اگلے پورے اور ایڑی، اگرچہ دونوں میں حیات ہے، اور حیات کے آثار بھی دونوں میں موجود ہیں، لیکن انگلیوں کے پوروں میں حیات کے آثار احساس وغیرہ بہ نسبت ایڑی کے زیادہ ہیں، اسی طرح شہداء میں آثارِ حیات عام مُردوں سے بہت زیادہ ہیں، حتیٰ کہ شہید کی اس حیات کی قوت کا ایک اثر برخلاف معمولی مُردوں کے اس کے جسد ظاہری تک بھی پہنچا ہے، کہ اس کا جسم باوجود مجموعۂ گوشت وپوست ہونے کے خاک سے متاثر نہیں ہوتا، اور مثلِ جسم زندہ کے صحیح سالم رہتا ہے، جیسا کہ احادیث اور مشاہدات شاہد ہیں، پس اس امتیاز کی وجہ سے شہداء کو احیاء کہا گیا، اور انکو دوسرے اموات کے برابر اموات کہنے کی ممانعت کی گئی، مگر احکامِ ظاہرہ میں وہ عام مُردوں کی طرح ہیں، اُن کی میراث تقسیم ہوتی ہے، اور ان کی بیویاں دوسروں سے نکاح کرسکتی ہیں، اور یہی حیات ہے جس میں حضرات انبیاء علیہم السلام شہداء سے بھی زیادہ امتیاز اور قوت رکھتے ہیں، یہاں تک کہ سلامتِ جسم کے علاوہ اس حیاتِ برزخی کے کچھ آثار ظاہری احکام پر بھی پڑتے ہیں، مثلاً ان کی میراث تقسیم نہیں ہوتی، اُن کی ازواج دوسروں کے نکاح میں نہیں آسکتیں۔

پس اس حیات میں سب سے قوی تر انبیاء علیہم السلام ہیں، پھر شہداء، پھر اور معمولی مُردے،

البتہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اولیاءؒ و صالحینؒ بھی اس فضیلت میں شہداء کے شریک ہیں، سو مجاہدۂ نفس میں مرنے کو بھی معنیً شہادت میں داخل سمجھیں گے، اس طور پر وہ بھی شہداء ہوگئے، یا یوں کہا جاوے کہ آیت میں شہداء کی تخصیص عام قرون کے اعتبار سے ہے، شہداء کے ہم رتبہ دوسرے لوگ صالحین و صدیقین کے اعتبار سے نہیں۔

اور اگر کسی شخص نے کسی شہید کی لاش کو خاک خوردہ پایا ہو تو سمجھ لے کہ ممکن ہے اس کی نیت خالص نہ ہو، جس پر مدار ہے قتل کے شہادت ہونے کا، اور صرف قتل شہادت نہیں ہے، اور اگر فرضاً ایسا شہید خاک خوردہ پایا جاوے جس کا قتل فی سبیل اللہ اور اس کا جامع شرائطِ شہادت ہونا دلیل قطعی تواتر وغیرہ سے ثابت ہو (جس کا شبہ صاحبِ رُوح المعانی کو ہوگیا ہے) تو اس کی وجہ میں کہا جاوے گا کہ حدیث میں جس چیز کی تصریح ہے وہ یہ کہ انبیاءؑ و شہداءؒ کے جسم کو زمین نہیں کھاتی، یعنی مٹی ان کے جسم کو خراب نہیں کرسکتی، اجزاء ارضیہ مٹی وغیرہ کے علاوہ کسی دوسری چیز سے ان کے جسم کا متاثر ہو کر فنا ہوجانا پھر بھی ممکن ہے، کیونکہ زمین میں اور بھی بہت سی اقسام و انواع کی دھاتیں اور ان کے اجزاء اللہ تعالیٰ نے رکھ دیئے ہیں، اگر ان کی وجہ سے کسی شہید کا جسم متاثر ہوجائے تو اس آیت کے منافی نہیں۔

چنانچہ دوسرے اجسامِ مرکبہ مثل اسلحہ و ادویہ و اغذیہ و اخلاط و اجسامِ بسیطہ مثل آب و آتش و باد کی تاثیر انبیاء علیہم السلام کے اجساد میں بھی ثابت ہے، اور شہداء کی حیات بعد الممات انبیاءؑ کی حیات قبل الممات سے اقویٰ نہیں، اور بعض حصۂ ارض میں بعض اجزاءِ غیر ارضیہ بھی شامل ہوجاتے ہیں، جس طرح دوسرے عناصر میں بھی مختلف عناصر شامل ہوجاتے ہیں، سو اگر ان اجزائے غیر ارضیہ سے ان کے اجساد متاثر ہوجاویں تو اس سے ان احادیث پر اشکال نہیں ہوتا، جن میں حرمت اجساد علی الارض وارد ہے۔

اور ایک جواب یہ ہے کہ امتیازِ اجسادِ شہداء کے لئے یہ کافی ہے کہ دوسری اموات سے زیادہ مدّت تک ان کے اجساد خاک سے متاثر نہ ہوں، گو کسی وقت میں ہوجاویں، اور احادیث سے یہی امر مقصود کہا جاوے کہ ان کی محفوظیت اجساد کی خارقِ عادت ہے، اور خرقِ عادت کی دونوں صورتیں ہیں، حفظ مؤبّد اور حفظ طویل، اور چونکہ عالمِ برزخ حواس یعنی آنکھ، کان، ناک، ہاتھ وغیرہ سے مدرک نہیں ہوتا اس لئے لَّا تَشْعُرُوْنَ فرمایا گیا کہ تم اُن کی حیات کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔

مصائب پر صبر کے آسان کرنے کی خاص تدبیر

ف: اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بندوں کا امتحان ہوتا ہے، اس کی حقیقت آیت وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰھٖمَ رَبُّهٗ کی تفسیر میں گذر چکی ہے، اور حوادث کے واقع ہونے سے پہلے ان کی خبر دیدینے میں یہ فائدہ ہوا کہ صبر آسان ہوجاتا ہے، ورنہ دفعۃً کوئی صدمہ

پڑنے سے زیادہ پریشانی ہوتی ہے، اور یہ خطاب ساری امّت کو ہے تو سب کو سمجھ لینا چاہئے کہ دنیا دار المحن ہے (یعنی محنتوں اور تکلیفوں کی جگہ ہے) اس لئے یہاں کے حوادث کو عجیب اور بعید نہ سمجھا جاوے تو بے صبری نہ ہوگی، اور چونکہ یہ لوگ نفسِ عمل صبر میں سب مشترک ہیں، اس لئے اس کا صلہٗ مشترکہ تو عام رحمت ہے، جو نفسِ صبر پر موعود ہے، اور چونکہ مقدار اور شان اور خصوصیت ہر صابر کے صبر کی جدا ہے، اس لئے ان خصوصیات کا صلہ جدا جدا خاص عنایتوں سے ہوگا، جو ان خاص خصوصیات پر موعود ہیں، جیسے دنیا میں مواقع انعام پر دعوتِ طعام تو عام ہوتی ہے، پھر روپے اور جوڑے ہر ایک کو علی قدر الحیثیت والخدمت دیتے جاتے ہیں۔

مصیبت میں انا للہ کو سمجھ کر پڑھا جائے تو تسکینِ قلب کا بہترین علاج ہے

صابرین کی طرف نسبت کرکے جو یہ فرمایا ہے کہ وہ مصیبت کے وقت اناللہ وانا الیہ راجعون کہا کرتے ہیں، حقیقت میں مقصود اس کی تعلیم سے یہ ہے کہ مصیبت والوں کو ایسا کہنا چاہئے، کیونکہ ایسا کہنے میں ثواب بھی بڑا ہے، اور اگر دل سے سمجھ کر یہ الفاظ کہے جائیں تو غم و رنج کے دور کرنے اور قلب کو تسلّی دینے کے معاملہ میں بھی اکسیر کا حکم رکھتے ہیں۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ

بے شک صفا اور مروہ نشانیوں میں سے ہیں اللہ کی سو جو کوئی حج کرے بیت اللہ کا یا عمرہ

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۭ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ

تو کچھ گناہ نہیں اس کو کہ طواف کرے ان دونوں میں اور جو کوئی اپنی خوشی سے کرے کچھ نیکی تو اللہ

شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾

قدر دان ہے سب کچھ جاننے والا

ربط آیاتِ متقدمہ میں وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ سے دور تک خانۂ کعبہ کا مفصّل ذکر ہوا ہے جس کے اوّل میں خانۂ کعبہ کے جائے عبادت ہونے کا بیان تھا، اور اس کے آگے دعائے ابراہیمی کی حکایت تھی کہ انھوں نے یہ درخواست کی تھی کہ ہمیں احکامِ مناسک سکھلا دیئے جاویں، اور مناسک میں حج و عمرہ بھی داخل ہیں، پس بیت اللہ کا مَعْبَدْ ہونا جیسے اس کے قبلۂ نماز بنانے سے ظاہر کیا گیا اسی طرح حج و عمرہ میں بیت اللہ کو مقصد بنا کر اس کی اہمیت کو واضح کیا گیا۔

اب آیت آئندہ میں اس کے مقصدِ حج و عمرہ بننے کے متعلق ایک مضمون کا بیان ہے، وہ یہ کہ

صفا و مروہ دو پہاڑیاں مکہ میں ہیں، حج و عمرہ میں کعبہ کا طواف کرکے ان کے درمیان میں دوڑتے چلتے ہیں، جس کو سعی کہتے ہیں، چونکہ زمانۂ جاہلیت میں بھی یہ سعی ہوتی تھی، اور اس وقت صفا و مروہ پر کچھ مورتیاں رکھی تھیں، اس لئے بعض مسلمانوں کو شبہ پڑ گیا کہ شاید یہ رسومِ جاہلیت سے ہو، اور موجبِ گناہ ہو اور بعض جاہلیت میں بھی اس کو گناہ سمجھتے تھے، ان کو یہ شبہ ہوا کہ شاید اسلام میں بھی گناہ ہو، اللہ تعالیٰ کو یہ شبہ دفع فرمانا مقصود ہے، پس مضمون سابق میں کعبہ کے قبلۂ نماز ہونے پر اعتراض کفار کا دفع کرنا مقصود تھا، اور مضمون لاحق میں کعبہ کے مقصدِ حج و عمرہ ہونے کے متعلق ایک امر یعنی صفا و مروہ کی سعی پر خود مسلمانوں کے شبہ کا ازالہ فرمانا مقصود ہے، یہ وجہ دونوں مضمونوں میں ربط کی ہے۔

خلاصۂ تفسیر

(صفا و مروہ کی سعی میں کوئی شبہ نہ کرو، کیونکہ) تحقیقاً صفا اور مروہ (اور ان کے درمیان میں سعی کرنا) منجملہ یادگار (دین) خداوندی ہیں، سو جو شخص حج کرے بیت اللہ کا یا (اس کا) عمرہ کرے اس پر ذرا بھی گناہ نہیں (جیسا تم کو شبہ ہو گیا) ان دونوں کے درمیان (سعی کے معروف طریقہ کے مطابق) آمد و رفت کرنے میں (جس کا نام سعی ہے اور گناہ کیا بلکہ ثواب ہوتا ہے کیونکہ یہ سعی تو شرعاً امرِ خیر ہے) اور (ہمارے یہاں کا ضابطہ ہے کہ) جو شخص خوشی سے کوئی امرِ خیر کرے تو حق تعالیٰ (اس کی بڑی) قدردانی کرتے ہیں (اور اس خیر کرنے والے کی نیت و خلوص) خوب جانتے ہیں، (پس اس ضابطہ کی رُو سے سعی کرنے والے کو بمقدار اخلاص ثواب عنایت ہوگا)۔

معارف و مسائل

بعض لغات کی تحقیق

شَعَآئِرِ اللّٰهِ، شعائر جمع ہے شعیرہ کی، جس کے معنی علامت کے ہیں، شعائر اللہ سے مراد وہ اعمال ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دین کی علامتیں قرار دیا ہے، حج کے لفظی معنی قصد کرنے کے ہیں، اور اصطلاحِ قرآن و سنت میں خاص خانۂ کعبہ کا قصد کرنے اور وہاں افعالِ مخصوصہ کے ادا کرنے کو حج کہا جاتا ہے، عمرہ کے لفظی معنی زیارت کے ہیں اور اصطلاحِ شرع میں مسجد حرام کی حاضری اور طواف و سعی کو کہا جاتا ہے۔

صفا و مروہ کے درمیان سعی واجب ہے

حج اور عمرہ اور سعی کا طریقہ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے، اور یہ سعی امام احمدؒ کے نزدیک سنت مستحبہ ہے، اور مالکؒ اور شافعیؒ کے نزدیک فرض ہے، اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک واجب ہے، کہ ترک سے ایک بکری ذبح کرنا پڑتی ہے۔

آیتِ مذکورہ کے الفاظ سے یہ شبہ نہ کرنا چاہئے کہ اس آیت میں تو صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے کے متعلق صرف اتنا فرمایا گیا ہے کہ وہ گناہ نہیں، اس سے تو زیادہ سے زیادہ یہ ثابت

۲

ہوا کہ سعی مباحات میں سے ایک مباح ہے، وجہ یہ ہے کہ اس جگہ عنوان لَاجُنَاحَ کا سوال کی مناسبت سے رکھا گیا ہے، سوال اسی کا تھا کہ صفا و مروہ پر بتوں کی مورتیں رکھی تھیں اور اہلِ جاہلیت انہی کی پوجا پاٹ کے لئے صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے تھے، اس لئے یہ عمل حرام ہونا چاہئے، اس کے جواب میں فرمایا کہ اس میں کوئی گناہ نہیں، چونکہ یہ دراصل سنتِ ابراہیمیؑ ہے کسی کے جاہلانہ عمل سے کوئی گناہ نہیں ہو جاتا، یہ فرمانا اس کے واجب ہونے کے منافی نہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن

بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ ہم نے اُتارے صاف حکم اور ہدایت کی باتیں بعد اس کے

بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ

کہ ہم ان کو کھول چکے لوگوں کے واسطے کتاب میں اُن پر لعنت کرتا ہے اللہ اور لعنت کرتے ہیں

اللَّاعِنُونَ ﴿١٥٩﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ

اُن پر لعنت کرنیوالے، مگر جنھوں نے توبہ کی اور درست کیا اپنے کلام کو اور بیان کر دیا حق بات کو تو اُن کو معاف

عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١٦٠﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا

کرتا ہوں اور میں ہوں بڑا معاف کرنیوالا نہایت مہربان، بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور مر گئے

وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ

کافر ہی انہی پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں اور لوگوں کی

أَجْمَعِينَ ﴿١٦١﴾ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ

سب کی، ہمیشہ رہیں گے اسی لعنت میں نہ ہلکا ہوگا اُن پر سے عذاب اور

لَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿١٦٢﴾

نہ اُن کو مہلت ملے گی۔

ربط اوپر بحثِ قبلہ کے ضمن میں صاحبِ قبلہ کی نبوّت کے متعلق اہلِ کتاب کی حق پوشی کا مضمون مذکور تھا، اس آیت میں اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ الیٰ قولہ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ آگے اس مضمون کی تکمیل کے واسطے حق کو چھپانے والوں کی اور کتمانِ حق پر اصرار کرنے والوں کی وعید اور توبہ کرنے پر معافی کا وعدہ ارشاد فرماتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر جو لوگ اخفاء کرتے ہیں ان مضامین کا جن کو ہم نے نازل کیا ہے جو کہ (اپنی ذات میں) واضح ہیں اور (دوسروں کے لئے) ہادی ہیں (اور اخفاء بھی) اس (حالت) کے بعد کہ ہم ان (مضامین) کو کتاب (الٰہی توراۃ و انجیل) میں (نازل فرما کر) عام لوگوں پر ظاہر کر چکے ہوں ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت فرماتے ہیں (کہ اپنی رحمتِ خاصہ سے اُن کو بعید کر دیتے ہیں) اور (دوسرے بہتیرے) لعنت کرنے والے بھی (جن کو اس فعل سے نفرت ہی) اُن پر لعنت بھیجتے ہیں (کہ ان پر بد دعاء کرتے ہیں ہاں) مگر جو لوگ (ان اخفاء کرنے والوں میں اپنی اس حرکت سے) توبہ (یعنی حق تعالیٰ کے روبرو گذشتہ سے معذرت) کرلیں اور (جو کچھ ان کے اس فعل سے خرابی ہوگئی تھی، آئندہ کے لئے اس کی) اصلاح کر دیں (اور اس اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ ان اخفاء کئے ہوئے مضامین کو عام طور پر) ظاہر کر دیں (تاکہ سب کو اطلاع ہو جاوے اور ان پر لوگوں کو گمراہ کرنے کا بار نہ رہے اور اظہار معتبر عندالشرع یہ ہے کہ اسلام کو قبول کرلیں، کیونکہ اسلام نہ لانے میں نبوتِ محمدیہ کے متعلق عوام پر بھی حق مخفی رہے گا، وہ یہی سمجھیں گے کہ اگر نبوت حق ہوتی تو یہ کتاب جاننے والے لوگ کیوں نہ ایمان لاتے، خلاصہ یہ کہ یہ لوگ مسلمان ہو جاویں) تو ایسے لوگوں (کے حال) پر میں (عنایت سے) متوجہ ہو جاتا ہوں (اور ان کی خطا معاف کر دیتا ہوں) اور میری تو بکثرت عادت ہے توبہ قبول کرلینا، اور مہربانی فرمانا (کوئی توبہ کرنے والا ہونا چاہئے) البتہ جو لوگ (ان میں سے) اسلام نہ لاویں، اور اسی حالتِ غیر اسلام پر مر جاویں ایسے لوگوں پر (وہ) لعنت (مذکورہ) اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں اور آدمیوں کی بھی سب کی (ایسے طور پر برسا کرے گی کہ) وہ ہمیشہ ہمیشہ کو اسی (لعنت) میں رہیں گے (حاصل یہ کہ وہ جہنم میں ہمیشہ کے لئے داخل ہوں گے، اور ہمیشہ کا جہنم میں رہنے والا ہمیشہ ہی خدا کی خاص رحمت سے دُور بھی رہے گا اور ہمیشہ ملعون رہنا یہی ہی، اور ہمیشگی لعنت کے ساتھ یہ بھی ہے کہ داخل ہونے کے بعد کسی وقت) ان (پر) سے (جہنم کا) عذاب ہلکا (بھی) نہ ہونے پاوے گا اور نہ (داخل ہونے کے قبل) ان کو (کسی میعاد تک) مہلت دی جاوے گی (کیونکہ میعاد اس وقت دی جاتی ہے، جب کہ مقدمہ میں گنجائش ہو اور گنجائش نہ ہونے پر اوّل ہی پیشی میں حکم سزا ہو جاتا ہے)۔

معارف و مسائل

علم دین کا اظہار اور پھیلانا واجب اور اس کا چھپانا سخت حرام ہے

آیتِ مذکورہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایات بینات نازل کی گئی ہیں ان کا لوگوں سے چھپانا اتنا

بڑا جرم عظیم ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت کرتے ہیں اور تمام مخلوق لعنت بھیجتی ہے، اس سے چند احکام حاصل ہوئے:۔

اوّل یہ کہ جس علم کے اظہار اور پھیلانے کی ضرورت ہے اس کا چھپانا حرام ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ يَعْلَمُهٗ فَكَتَمَهٗ اَلْجَمَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِّنَ النَّارِ، (رواہ ابوھریرۃ وعمرو بن العاصؓ اخرجہ ابن ماجۃ۔ از قرطبی)

"یعنی جو شخص دین کے کسی حکم کا علم رکھتا ہو اور اس سے وہ حکم دریافت کیا جائے اگر وہ اس کو چھپائے گا تو قیامت کے روز اس کے منہ میں اللہ تعالیٰ آگ کا لگام ڈالیں گے۔"

حضرات فقہاء نے فرمایا کہ یہ وعید اس صورت میں ہے جب کہ اس کے سوا کوئی دوسرا آدمی مسئلہ کا بیان کرنے والا وہاں موجود نہ ہو، اور اگر دوسرے علماء بھی موجود ہوں تو گنجائش ہے کہ یہ کہدے کہ دوسرے علماء سے دریافت کرلو (قرطبی، جصاص)

دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوئی کہ جس کو خود صحیح علم حاصل نہیں اس کو مسائل و احکام بتانے کی جرأت نہیں کرنا چاہئے۔

تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ علم کو چھپانے کی یہ سخت وعید انھیں علوم و مسائل کے متعلق ہے، جو قرآن و سنت میں واضح بیان کئے گئے ہیں اور جن کے ظاہر کرنے اور پھیلانے کی ضرورت ہو وہ باریک اور دقیق مسائل جو عوام نہ سمجھ سکیں بلکہ خطرہ ہو کہ وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوجائیں گے تو ایسے مسائل و احکام کا عوام کے سامنے بیان نہ کرنا ہی بہتر ہے، اور وہ کتمانِ علم کے حکم میں نہیں ہو آیتِ مذکورہ میں لفظ مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى سے اسی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، ایسے ہی مسائل کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ تم اگر عوام کو ایسی حدیثیں سناؤ گے جن کو وہ پوری طرح نہ سمجھ سکیں تو ان کو فتنہ میں مبتلا کردو گے (قرطبی)

اسی طرح صحیح بخاری میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہو انھوں نے فرمایا کہ عام لوگوں کے سامنے صرف اتنے ہی علم کا اظہار کرو جس کو ان کی عقل و فہم برداشت کرسکے، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کی تکذیب کریں، کیونکہ جو بات ان کی سمجھ سے باہر ہوگی، ان کے دلوں میں اس سے شبہات و خدشات پیدا ہوں گے، اور ممکن ہے کہ اس سے انکار کر بیٹھیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ عالم کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ مخاطب کے حالات کا اندازہ لگا کر کلام کرے، جس شخص کے غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو اُس کے سامنے ایسے مسائل بیان نہ کرے اسی لئے حضرات فقہاء بہت سے مسائل کے بیان کے بعد لکھ دیتے ہیں ھٰذَا مِمَّا يُعْرَفُ وَلَا يُعَرَّفُ

یعنی یہ مسئلہ ایسا ہی کہ اہلِ علم کو خود تو سمجھ لینا چاہئے مگر عوام میں پھیلانا نہیں چاہئے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَمْنَعُوا الْحِكْمَةَ أَهْلَهَا فَتَظْلِمُوْهُمْ وَلَا تَضَعُوْهَا فِيْ غَيْرِ أَهْلِهَا فَتَظْلِمُوْهَا

"یعنی حکمت کی بات کو ایسے لوگوں سے نہ روکو جو اس بات کے اہل ہوں اگر تم نے ایسا کیا تو ان لوگوں پر ظلم ہوگا، اور جو اہل نہیں ہیں ان کے سامنے حکمت کی باتیں نہ رکھو، کیونکہ اس صورت میں اس حکمت پر ظلم ہوگا"۔

امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ کسی کافر کو جو مسلمانوں کے مقابلہ میں مناظرے کرتا ہو، یا کوئی مبتدع گمراہ جو لوگوں کو اپنے غلط خیالات کی طرف دعوت دیتا ہو اس کو علمِ دین سکھانا اُس وقت تک جائز نہیں جب تک یہ ظن غالب نہ ہو جائے کہ علم سکھانے سے اس کے خیالات درست ہو جائیں گے۔

اسی طرح کسی بادشاہ یا حاکمِ وقت کو ایسے مسائل بتلانا جن کے ذریعہ وہ رعیت پر ظلم کرنے کا راستہ نکال لیں جائز نہیں، اسی طرح عوام کے سامنے احکامِ دین میں رُخصتیں اور حیلوں کی صورتیں بلاضرورت بیان نہ کرنا چاہئے، جس کی وجہ سے وہ احکام دین پر عمل کرنے میں حیلہ جوئی کے عادی بن جائیں (قرطبی)

حدیثِ رسولؐ بھی قرآن کے حکم میں ہے: صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا اگر قرآن کی یہ آیت نہ ہوتی تو میں تم سے کوئی حدیث بیان نہ کرتا، آیت سے مراد یہی آیت ہے جس میں کتمانِ علم پر لعنت کی وعید شدید مذکور ہے، ایسے ہی بعض دوسرے صحابہؓ نے بھی بعض روایاتِ حدیث کے ذکر کرنے کے ساتھ ایسے ہی الفاظ فرمائے کہ اگر قرآن کریم کی یہ آیت کتمانِ علم کے بارے میں نہ ہوتی تو میں یہ حدیث بیان نہ کرتا۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ کے نزدیک حدیثِ رسول صلے اللہ علیہ وسلم قرآن ہی کے حکم میں ہے، کیونکہ آیت میں تو کتمان کی وعید اُن لوگوں کے لئے آئی ہے جو قرآن میں نازل شدہ ہدایات و بینات کو چھپائیں، اس میں حدیث کا صراحۃً ذکر نہیں، لیکن صحابہ کرامؓ نے حدیثِ رسولؐ کو بھی قرآن ہی کے حکم میں سمجھ کر اس کے اخفاء کرنے کو اس وعید کا سبب سمجھا۔

بعض گناہوں کا وبال ایسا ہوتا ہے کہ اس پر ساری مخلوق لعنت کرتی ہے: وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ میں قرآن کریم نے لعنت کرنے والوں کو متعین نہیں کیا کہ کون لوگ لعنت کرتے ہیں، امامِ تفسیر مجاہدؒ اور عکرمہؒ نے فرمایا کہ اس عدمِ تعیین سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ دنیا کی ہر چیز اور ہر مخلوق ان پر لعنت کرتی ہے، یہاں تک کہ تمام جانور اور حشرات الارض بھی اُن پر لعنت

کرتے ہیں، کیونکہ ان کی بداعمالی سے ان سب مخلوقات کو نقصان پہونچتا ہے، حضرت براء بن عازبؓ کی حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللّٰعِنُوْنَ سے مراد تمام زمین پر چلنے والے جانور ہیں (قرطبی بحوالہ ابن ماجہ باسناد حسن)

کسی معین شخص پر لعنت اس وقت تک جائز نہیں جب تک اس کے کفر پر مرنے کا یقین ہو

وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ کے لفظ سے جصاص اور قرطبی وغیرہ نے یہ استنباط کیا ہے کہ جس کافر کے کفر کی حالت میں مرنے کا یقین نہ ہو اس پر لعنت کرنا جائز نہیں اور چونکہ ہمیں کسی شخص کے خاتمہ کا یقینی علم ہونے کا اب کوئی ذریعہ نہیں، اس لئے کسی کافر کا نام لے کر اس پر لعنت کرنا جائز نہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کافروں پر نام لے کر لعنت کی ہے آپؐ کو ان کی موت علی الکفر کا منجانب اللہ علم ہوگیا تھا، البتہ عام کافروں، ظالموں پر بغیر تعیین کے لعنت کرنا درست ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ جب لعنت کا معاملہ اتنا شدید ہے کہ کسی کافر پر بھی اُس وقت تک جائز نہیں جب تک اس کا یقین نہ ہوجائے کہ اس کی موت کفر ہی پر ہوگی، تو کسی مسلمان پر یا کسی جانور پر لعنت کیسے جائز ہوسکتی ہے، اور عوام اس سے بالکل غفلت میں ہیں خصوصاً عورتیں کہ بات بات پر لعنت کے الفاظ اپنے متعلقین کے متعلق استعمال کرتی رہتی ہیں، اور لعنت صرف لفظ لعنت ہی کے کہنے سے نہیں ہوتی، بلکہ اس کے ہم معنی جو الفاظ ہیں وہ بھی لعنت ہی کے حکم میں ہیں، لعنت کے اصلی معنی خدا تعالیٰ کی رحمت سے دور کرنے کے ہیں، اس لئے کسی کو مردود، راندۂ درگاہ، اللہ مارا وغیرہ کے الفاظ کہنا بھی لعنت ہی کے حکم میں ہے۔

ع ۱۹/۱۱/۳

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾

اور معبود تم سب کا ایک ہی معبود ہے کوئی معبود نہیں اس کے سوا بڑا مہربان ہے نہایت رحم والا

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ

بے شک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے بدلتے رہنے میں

وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ

اور کشتیوں میں جو کہ لے کر چلتی ہیں دریا میں لوگوں کے کام کی چیزیں اور پانی میں جس کو کہ اُتارا

اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ

اللہ نے آسمان سے پھر جلایا اس سے زمین کو اس کے مر گئے پیچھے اور

بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ

پھیلائے اس میں سب قسم کے جانور اور ہواؤں کے بدلنے میں اور بادل میں جو کہ تابعدار ہے

بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

اس کے حکم کا درمیان آسمان و زمین کے بیشک اُن سب چیزوں میں نشانیاں ہیں عقلمندوں کیلئے

ربط مشرکین عرب نے جو آیت وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ اپنے عقیدہ کے خلاف سُنی تو تعجب سے کہنے لگے کہ کہیں سارے جہان کا ایک معبود بھی ہو سکتا ہے، اور اگر یہ دعویٰ صحیح ہے تو کوئی دلیل پیش کرنا چاہئے، حق تعالیٰ آگے دلیل بیان فرماتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر اور (ایسا معبود) جو تم سب کے معبود بننے کا مستحق وہ تو ایک ہی معبود (حقیقی) ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی رحمٰن ہے، رحیم ہے، (اور کوئی ان صفات میں کامل نہیں، اور بدون کمالِ صفات معبودیت کا استحقاق باطل ہے پس بجز معبود حقیقی کے کوئی اور مستحق عبادت نہ ہوا) بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے میں اور جہازوں (کے چلنے) میں جو کہ سمندر میں چلتے ہیں آدمیوں کے نفع کی چیزیں (اور اسباب) لے کر، اور (بارش کے) پانی میں جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے برسایا، پھر اس (پانی) سے زمین کو تر و تازہ کیا، اس کے خشک ہوئے پیچھے (یعنی اس میں نباتات پیدا کئے) اور (ان نباتات سے) ہر قسم کے حیوانات اس (زمین) میں پھیلادیئے (کیونکہ حیوانات کی زندگی اور توالد و تناسل اسی غذائے نباتی کی بدولت ہے) اور ہواؤں کی (سمتیں اور کیفیتیں) بدلنے میں (کہ کبھی پروا ہے کبھی پچھوا کبھی گرم ہے کبھی سرد) اور ابر (کے وجود) میں جو زمین و آسمان کے درمیان مقید (اور معلق) رہتا ہے (ان تمام چیزوں میں) دلائل (توحید کے موجود ہیں) ان لوگوں کے (استدلال کے) لئے جو عقل (سلیم) رکھتے ہیں۔

معارف و مسائل

توحید کا وسیع مفہوم وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ۔ اللہ تعالیٰ کی توحید متعدد اور مختلف حیثیتوں سے ثابت ہے۔ مثلاً وہ ایک ہے، یعنی کائنات میں کوئی اس کی نظیر و شبیہ نہیں، نہ کوئی اس کا ہمسر و برابر ہے، اس لئے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو واحد کہا جائے۔

دوسرے یہ کہ وہ ایک ہے استحقاقِ عبادت میں یعنی اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔

تیسرے یہ کہ وہ ایک ہے یعنی ذی اجزاء نہیں، وہ اجزاء و اعضاء سے پاک ہے، نہ اس کا

تجزیہ اور تقسیم ہو سکتی ہے۔

چوتھے یہ کہ وہ ایک ہی، یعنی اپنے وجود ازلی ابدی میں ایک ہی، وہ اس وقت بھی موجود تھا، جب کوئی چیز موجود نہ تھی، اور اُس وقت بھی موجود رہیگا جب کوئی چیز موجود نہ رہے گی، اس لئے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو واحد کہا جائے، لفظ واحد میں یہ تمام حیثیتیں توحید کی ملحوظ ہیں (جصاص)

اس کے بعد حق تعالیٰ کے واحد حقیقی ہونے پر تکوینی علامات و دلائل بتلائے گئے ہیں جنکو ہر عالم و جاہل سمجھ سکتا ہے، کہ آسمان و زمین کی تخلیق اور رات دن کے دائمی انقلاب اس کی قدرتِ کاملہ اور توحید کے واضح دلائل ہیں، کہ ان چیزوں کی پیدائش اور بقاء میں کسی دوسری ہستی کا کوئی دخل نہیں۔

اسی طرح پانی پر کشتیوں کا چلنا ایک بڑی آیتِ قدرت ہے، کہ پانی کو حق تعالیٰ نے ایسا جوہر سیّال بنادیا کہ رقیق اور سیّال ہونیکے باوجود اسکی پیٹھ پر لاکھوں من وزن کے جہاز بڑے بڑے وزن کولے کر مشرق سے مغرب تک منتقل کر دیتے ہیں، اور ان کو حرکت میں لانے کے لئے ہواؤں کا چلانا اور پھر اپنی حکمت کے ساتھ ان کے رُخ بدلتے رہنا یہ سب اس کا پتہ دیتے ہیں کہ ان چیزوں کا پیدا کرنیوالا اور چلانے والا کوئی بڑا علیم و خبیر اور حکیم ہے، اگر پانی کا مادہ سیّال نہ ہو تو یہ کام نہیں ہو سکتا، اور مادہ سیّال بھی ہو تو جب تک ہوائیں نہ چلیں جو ان جہازوں کو حرکت میں لاتی ہیں، جہازوں کا لمبی لمبی مسافتیں طے کرنا ممکن نہیں، قرآن کریم نے اسی مضمون کو فرمایا:

اِنۡ يَّشَاۡ يُسۡكِنِ الرِّيۡحَ فَيَظۡلَلۡنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهۡرِهٖ ۚ (۴۲: ۳۳)	"اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو ہواؤں کو ساکن کر دیں اور یہ جہاز سمندر کی پشت پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں"

بِمَا يَنۡفَعُ النَّاسَ کے لفظ میں اشارہ کر دیا گیا کہ بحری جہازوں کے ذریعہ ایک ملک کا سامان دوسرے ملک میں درآمد و برآمد کرنے کے ذریعہ عام انسانوں کے بے شمار فائدے ہیں جن کو شمار بھی نہیں کیا جا سکتا، اور یہ فائدے ہر زمانے ہر ملک میں نئی نئی صورتیں پیدا کر دیتے ہیں۔

اسی طرح آسمان سے پانی کو قطرہ قطرہ کرکے اس طرح نازل کرنا کہ اس سے کسی چیز کو نقصان نہ پہونچے، اگر سیلاب کی طرح آتا تو کوئی آدمی، جانور، سامان کچھ نہ رہتا، پھر پانی برسنے کے بعد اس کا زمین پر محفوظ رکھنا، انسان کے بس کا نہیں، اگر کہہ دیا جاتا کہ چھ مہینہ کے پانی کا کوٹہ اپنا اپنا ہر شخص رکھ لے، تو ہر شخص اس کے رکھنے کا کیا انتظام کرتا، اور کسی طرح رکھ بھی لیتا تو اس کو سڑنے اور خراب ہو جانے سے کیسے بچاتا، قدرت نے یہ سب انتظامات خود فرمائے

ارشاد فرمایا:

فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۚ (۲۳ : ۱۸)

"یعنی ہم نے ہی پانی کو زمین کے اندر ٹھہرا دیا، اگرچہ ہمیں اس کی بھی قدرت تھی کہ بارش کا پانی برسنے کے بعد بہہ کر ختم ہو جاتا"۔

مگر قدرت نے پانی کو اہلِ زمین انسان اور جانوروں کے لئے کہیں کھلے طور پر تالابوں اور حوضوں میں جمع کر دیا، کہیں پہاڑوں کی زمین میں پھیلی ہوئی رگوں کے ذریعہ زمین کے اندر اتار دیا اور پھر ایک غیر محسوس پائپ لائن ساری زمین میں بچھا دی، ہر شخص جہاں چاہے کھود کر پانی نکال لیتا ہے اور اسی پانی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ بحرِ منجمد بنا کر برف کی صورت میں پہاڑوں کے اوپر لاد دیا، جو سڑنے اور خراب ہونے سے بھی محفوظ ہے، اور آہستہ آہستہ پگھل کر زمین کے اندر قدرتی پائپ لائن کے ذریعہ پورے عالم میں پہونچتا ہے، غرض آیتِ مذکورہ میں قدرتِ کاملہ کے چند مظاہر کا بیان کر کے توحید کو ثابت کیا گیا، علماء مفسرین نے ان تمام چیزوں پر تفصیلی بحث کی ہے، دیکھئے جصاص، قرطبی وغیرہ۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ

اور بعضے لوگ وہ ہیں جو بناتے ہیں اللہ کے برابر اوروں کو ان کی محبت ایسے رکھتے ہیں جیسے

كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ

محبت اللہ کی اور ایمان والوں کو ان سے زیادہ تر ہے محبت اللہ کی، اور اگر دیکھ لیں یہ

ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ

ظالم اس وقت کو جبکہ دیکھیں گے عذاب کہ قوت ساری اللہ ہی کے لئے ہے اور یہ کہ اللہ

شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿١٦٥﴾

کا عذاب سخت ہے۔

ربط اوپر کی آیات میں توحید کا اثبات تھا، آگے مشرکین کی غلطی اور وعید کا بیان فرماتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر اور ایک آدمی وہ (بھی) ہیں جو علاوہ خدا تعالیٰ کے اوروں کو بھی شریک

(خدائی) قرار دیتے ہیں (اور ان کو اپنا کارساز سمجھتے ہیں اور) ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے (رکھنا) ضروری ہے، (یہ حالت تو مشرکین کی ہے) اور (جو مومن ہیں ان کو (صرف) اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے، (کیونکہ اگر کسی مشرک کو یہ ثابت ہو جاوے کہ میرے معبود سے مجھ پر کوئی ضرر پڑے گا تو فوراً محبت منقطع ہو جاوے، اور مومن باوجود اس کے کہ نافع وضار حق تعالیٰ ہی کو اعتقاد کرتا ہے، لیکن پھر بھی محبت و رضا اس کی باقی رہتی ہے، و نیز اکثر مشرکین مصیبت شدیدہ کے وقت اپنے شرکاء کو چھوڑ دیتے ہیں، اور مومنین من حیث الایمان مصیبت میں بھی خدا کو نہ چھوڑتے تھے، اور محاورات میں ایسے قضایا باعتبار حالتِ غالبہ کے بھی صادق ہوتے ہیں) اور کیا خوب ہوتا اگر یہ ظالم (مشرکین) جب (دنیا میں) کسی مصیبت کو دیکھتے تو (اس کے وقوع میں غور کرکے) یہ سمجھ لیا کرتے کہ سب قوت حق تعالیٰ ہی کو ہی (اور دوسرے سب اس کے سامنے عاجز ہیں، چنانچہ اس مصیبت کو نہ کوئی روک سکا نہ ٹال سکا اور نہ ایسے وقت میں اور کوئی یاد رہا) اور (اس مصیبت کی شدت میں غور کرکے) یہ (سمجھ لیا کرتے) کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب (آخرت میں کہ دار الجزاء ہے اور بھی) سخت ہوگا، (تو اس طرح غور کرنے سے تراشیدہ معبودوں کا عجز اور حق تعالیٰ کی قدرت و عظمت منکشف ہو کر توحید و ایمان اختیار کر لیتے)

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ

جب کہ بیزار ہو جاویں گے وہ کہ جن کی پیروی کی تھی اُن سے جو کہ اُن کے پیرو ہوئے تھے اور دیکھیں گے عذاب

وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا

اور منقطع ہو جاویں گے ان کے سب علاقے، اور کہیں گے پیرو کیا اچھا ہوتا جو ہم کو دنیا کی طرف

كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ

لوٹ جانا مل جاتا تو پھر ہم بھی بیزار ہو جاتے ان سے جیسے یہ ہم سے بیزار ہو گئے، اسی طرح پر دکھلائے گا اللہ

ع ۲۰ ۴

اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾ ع

ان کو ان کے کام حسرت دلانے کو اور وہ ہرگز نکلنے والے نہیں نار سے۔

ربط اوپر عذاب آخرت کو سخت فرمایا ہے آگے اس سختی کی کیفیت کا بیان فرماتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر (وہ سختی عذاب کی اس وقت معلوم ہوگی) جب کہ (ان مشرکین میں سے) وہ (ذی اثر) لوگ جن کے کہنے پر دوسرے (عوام) چلتے تھے، ان (عام) لوگوں سے صاف الگ ہوجاویں گے جو ان کے کہنے پر چلتے تھے اور سب (خواص وعوام) عذاب کا مشاہدہ کرلیں گے اور باہم ان میں جو تعلقات تھے (کہ ایک تابع تھا دوسرا متبوع تھا وغیرہ وغیرہ) اس وقت سب قطع ہوجاویں گے (جیسے دنیا میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ جرم میں سب شریک و متفق ہوتے ہیں، اور تنقیح مقدمہ کے وقت سب الگ الگ بچنا چاہتے ہیں، حتی کہ باہم گر شناخت تک کے منکر ہوجاتے ہیں) اور (جب) یہ تابع لوگ (متبوعین کی یہ طوطا چشمی دیکھیں گے تو بڑے جھنجلا دیں گے، اور تو کچھ نہ ہوسکے گا مگر جھلا کر) یوں کہنے لگیں گے کسی طرح ہم سب کو (دنیا میں) بس ذرا ایک دفعہ جانا مل جاوے تو ہم بھی ان سے (اتنا بدلہ تو لیلیں کہ اگر یہ پھر ہم کو اپنے تابع ہونے کی ترغیب دیں تو ہم بھی ان سے) صاف (ٹکا سا جواب دے کر) الگ ہوجاویں جیسا یہ ہم سے (اس وقت) صاف الگ ہو بیٹھے (اور کہدیں کہ جناب آپ وہی ہیں کہ عین موقع پر بے رخی کی تھی اب ہم سے کیا غرض، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان تجویزوں اور سوچ بچاروں سے کیا ہاتھ آوے گا فقط) اللہ تعالیٰ یوں ہی اُنکی بداعمالیوں کو خالی ارمان (کے پیرائے میں) کرکے ان کو دکھلادیں گے اور ان (تابعین و متبوعین سب) کو دوزخ سے نکلنا کبھی نصیب نہ ہوگا (کیونکہ شرک کی سزا خلود فی النار رہی)

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ

اے لوگو! کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے حلال پاکیزہ اور پیروی نہ کرو شیطان

الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿١٦٨﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْۗءِ وَالْفَحْشَاۗءِ

کی بیشک وہ تمہارا دشمن ہے صریح، وہ تو یہی حکم کرے گا تم کو کہ بُرے کام اور بےحیائی کرو

وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٦٩﴾

اور جھوٹ لگاؤ اللہ پر وہ باتیں جن کو تم نہیں جانتے۔

خلاصۂ تفسیر (بعض مشرکین بتوں کے نام جانور چھوڑتے تھے، اور ان سے منتفع ہونے کو باعتقاد ان کی تعظیم کے حرام سمجھتے تھے اور اپنے اس فعل کو حکم الٰہی اور موجب رضائے حق و وسیلۂ تقرب الی اللہ بواسطۂ شفاعت ان بتوں کے سمجھتے تھے، حق تعالیٰ اس باب میں خطاب فرماتے ہیں کہ) اے لوگو! جو چیزیں زمین میں موجود ہیں ان میں سے (شرعی) حلال

پاک چیزوں (کی نسبت اجازت ہے کہ اُن) کو کھاؤ (برتو) اور (ان میں سے کسی حلال چیز سے یہ سمجھ کر پرہیز کرنا کہ اس سے اللہ راضی ہوگا یہ سب شیطانی خیالات ہیں تم) شیطان کے قدم بقدم مت چلو، فی الواقع وہ (شیطان) تمہارا صریح دشمن ہے (کہ ایسے ایسے خیالات وجہالات سے تم کو خسرانِ ابدی میں گرفتار کر رکھا ہے اور دشمن ہونے کی وجہ سے) وہ تم کو انہی باتوں کی تعلیم کرے گا جو کہ (شرعاً) بُری اور گندی ہیں، اور یہ (بھی تعلیم کرے گا) کہ اللہ کے ذمہ وہ باتیں لگاؤ جن کی تم سند بھی نہیں رکھتے (مثلاً یہی کہ ہم کو خدا تعالیٰ کا اس طرح حکم ہے)۔

معارف ومسائل

حلّ اللغات

حَلٰلًا طَیِّبًا، لفظ حَلّ کے اصلی معنی گرہ کھولنے کے ہیں، جو چیز انسان کے لئے حلال کر دی گئی گویا ایک گرہ کھول دی گئی اور پابندی ہٹا دی گئی، حضرت سہل بن عبد اللہؒ فرماتے ہیں کہ نجات تین چیزوں میں منحصر ہے، حلال کھانا، فرائض ادا کرنا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع کرنا، اور لفظ طیّب کے معنی ہیں پاکیزہ جس میں شرعی حلال ہونا بھی داخل ہے اور طبعی مرغوب ہونا بھی۔

خُطُوٰتِ، خطوہ کی جمع ہے، اتنی مقدار کو خطوہ کہتے ہیں جو دونوں قدموں کے درمیان کا فاصلہ ہے، خطواتِ شیطان سے مراد شیطانی اعمال وافعال ہیں۔

اَلسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَاۗءِ، سوء وہ چیز جس کو دیکھ کر عقلمند شریف آدمی کو دکھ ہو، فحشاء، بے حیائی کا کام، بعض حضرات نے فرمایا کہ اس جگہ سوء سے مراد مطلق معصیت اور فحشاء سے مراد کبیرہ گناہ ہے، اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ شیطان کے امر اور حکم کرنے سے مراد دل میں وسوسہ ڈالنا ہے، جیسا حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدم کے بیٹے کے قلب میں ایک شیطانی الہام واثر ہوتا ہے اور دوسرا فرشتہ کی طرف سے، شیطانی وسوسہ کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بُرے کام کرنے کے فوائد اور مصالح سامنے آتی ہیں، اور حق کو جھٹلانے کی راہیں کھلتی ہیں، اور الہامِ فرشتہ کا اثر خیر اور نیکی پر انعام وفلاح کا وعدہ اور حق کی تصدیق پر قلب کا مطمئن ہونا ہوتا ہے۔

مسئلہ: سانڈ وغیرہ جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں، یا اور کوئی جانور مرغا، بکرا وغیرہ کسی بزرگ یا اور کسی غیر اللہ کے نامزد کر دیا جاتا ہے، اس کا حرام ہونا ابھی چار آیتوں کے بعد وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے تحت آنے والا ہے، اس آیت يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ میں ایسے جانور کے حرام ہونے کی نفی کرنا منظور نہیں، جیسا کہ بعضوں کو شبہ ہوگیا بلکہ مقصد اس فعل کی حرمت وممانعت ہے کہ

غیر اللہ کے تقرب کے لئے جانوروں کو چھوڑ دینا اور اس عمل کو موجب برکت و تقرب سمجھنا، اور ان جانوروں کو اپنے اوپر حرام کر لینے کا معاہدہ کر لینا اس کو دائمی سمجھنا یہ سب افعال ناجائز اور ان کا کرنا گناہ ہے۔

تو حاصل مطلب آیت کا یہ ہو کہ جن جانوروں کو اللہ تعالیٰ نے حلال بنایا ہے ان کو بتوں کے نام کر کے حرام نہ بناؤ، بلکہ اپنی حالت پر چھوڑ کر کھاؤ پیو، اور اگر ایسی حرکت جہالت سے ہو جائے تو اصلاحِ نیت کے ساتھ تجدیدِ ایمان اور توبہ کر کے اس حرمت کو ختم کرو، اس طرح ان جانوروں کو تعظیماً حرام قرار دینا تو گناہ ہوا، مگر غیر اللہ کے نام پر کر دینے سے یہ مردار اور نجس کے حکم میں ہو گیا، نجاست کی وجہ سے حرمت ثابت ہو گئی۔

مسئلہ: اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص نے جہالت یا غفلت سے کسی جانور کو کسی غیر اللہ کے ساتھ نامزد کر کے چھوڑ دیا تو اس کی توبہ یہی ہے کہ اپنے اس خیالِ حرمت سے رجوع کرے اور اس فعل سے توبہ کرے، تو پھر اس کا گوشت حلال ہو جائے گا، واللہ اعلم۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا

اور جب کوئی ان سے کہے کہ تابعداری کرو اس حکم کی جو کہ نازل فرمایا اللہ نے تو کہتے ہیں ہرگز نہیں ہم تو تابعداری

عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُھُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَـيْــــًٔـا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۝۱۷۰

کریں گے اسکی جس پر دیکھا ہم نے اپنے باپ دادوں کو بھلا اگرچہ اُن کے باپ دادے نہ سمجھتے ہوں کچھ بھی اور نہ جانتے ہوں سیدھی راہ،

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِىْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَاۗءً

اور مثال اُن کافروں کی ایسی ہو جیسے پکارے کوئی شخص ایسی چیز کو جو کچھ نہ سُنے سوائے پکار نے

وَّنِدَاۗءً ۭ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۱۷۱

اور چلانے کے بہرے گونگے اندھے ہیں سو وہ کچھ نہیں سمجھتے۔

خلاصۂ تفسیر

اور جب کوئی ان (مشرک) لوگوں سے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم (اپنے پیغمبر کے پاس) بھیجا ہے اس پر چلو تو (جواب میں) کہتے ہیں (کہ نہیں) بلکہ ہم تو اسی (طریقہ) پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے (کیونکہ وہ لوگ اس طریقہ کے اختیار کرنے میں مامور من اللہ تھے، حق تعالیٰ ان پر رد فرماتے ہیں) کیا (ہر حالت میں یہ لوگ اپنے باپ دادا ہی کے طریقہ پر چلیں گے)

اگرچہ اُن کے باپ دادا (دین کی) نہ کچھ سمجھ رکھتے ہوں اور نہ (کسی آسمانی کتاب کی) ہدایت رکھتے ہوں،
وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ (الی قولہ) فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ، اور ان کافروں کی
کیفیت (نافہمی میں) اس (جانور) کی کیفیت کے مثل ہے (جس کا ذکر اس مثال میں کیا جاتا ہے) کہ
ایک شخص ہے وہ ایسے (جانور) کے پیچھے چلّا رہا ہے، جو بجز بلانے اور پکارنے کے کوئی (پُر مضمون)
بات نہیں سنتا (اسی طرح) یہ کفار (بھی ظاہری بات چیت تو سنتے ہیں، لیکن کام کی بات سے بالکل)
بہرے ہیں (گویا سُنا ہی نہیں) گونگے ہیں (کہ کبھی ایسی بات زبان ہی پر نہیں آتی) اندھے ہیں (کیونکہ
نفع نقصان نظر ہی نہیں آتا) سو (جب سارے ہی حواس مختل ہیں تو) سمجھتے (سمجھاتے) کچھ نہیں۔

معارف و مسائل

اس آیت سے جس طرح باپ دادوں کی اندھی تقلید و اتباع کی مذمت ثابت ہوئی اسی طرح جائز تقلید و اتباع کے شرائط اور ایک ضابطہ بھی معلوم ہوگیا، جس کی طرف دو لفظوں میں اشارہ فرمایا ہے لَا يَعْقِلُوْنَ اور لَا يَهْتَدُوْنَ، کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ ان آباء و اجداد کی تقلید و اتباع کو اس لئے منع کیا گیا ہے کہ انھیں نہ عقل تھی نہ ہدایت، ہدایت سے مراد وہ احکام ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صریح طور پر نازل کئے گئے، اور عقل سے مراد وہ جو بذریعہ اجتہاد نصوصِ شرعیہ سے استنباط کئے گئے۔

تو وجہ ان کے اتباع و تقلید کے عدمِ جواز کی یہ ہے کہ نہ اُن کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کئے ہوئے احکام ہیں اور نہ اس کی صلاحیت کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان سے احکام نکال سکیں، اس میں اشارہ پایا گیا کہ جس عالم کے متعلق یہ اطمینان ہو جائے کہ اس کے پاس قرآن و سنت کا علم ہے، اور اس کو درجۂ اجتہاد بھی حاصل ہے کہ جو احکام صراحۃً قرآن و سنت میں نہ ہوں ان کو نصوصِ قرآن و سنت سے بذریعہ قیاس نکال سکتا ہے، تو ایسے عالم مجتہد کی تقلید و اتباع جائز ہے، نہ اس لئے کہ اس کا حکم ماننا اور اس کا اتباع کرنا ہے، بلکہ اس لئے کہ حکم اللہ کا ماننا اور اسی کا اتباع کرنا ہے، مگر چونکہ ہم براہِ راست اللہ کے حکم سے واقف نہیں ہو سکتے، اس لئے کسی عالم مجتہد کا اتباع کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل ہو سکے۔

جاہلانہ تقلید اور ائمہ مجتہدین کی تقلید میں فرق

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ مطلق تقلید ائمۂ مجتہدین کے خلاف اس طرح کی آیات پڑھ دیتے ہیں وہ خود ان آیات کے صحیح مدلول سے واقف نہیں۔

امام قرطبیؒ نے اسی آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اس آیت میں تقلیدِ آبائی کے ممنوع ہونے

کا جو ذکر ہے اس سے مراد باطل عقائد و اعمال میں آباء و اجداد کی تقلید کرنا ہے، عقائد صحیحہ و اعمالِ صالحہ میں تقلید اس میں داخل نہیں، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے کلام میں ان دونوں چیزوں کی وضاحت سورۂ یوسف میں اس طرح آئی ہے :

اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ط (۱۲ : ۳۷-۳۸)	"میں نے ان لوگوں کی ملت و مذہب کو چھوڑ دیا جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، اور جو آخرت کے منکر ہیں، اور میں نے اتباع کیا اپنے آباء ابراہیمؑ اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کا"

اس میں پوری وضاحت سے ثابت ہوگیا کہ آباء کی تقلید باطل میں حرام ہے، حق میں جائز بلکہ مستحسن ہے۔

امام قرطبیؒ نے اسی آیت کے ذیل میں ائمہ مجتہدین کی تقلید کے متعلق بھی مسائل و احکام بیان کئے ہیں اور فرمایا ہے :

تعلق قوم بھذہ الاٰیۃ فی ذم التقلید (الیٰ) وھذا فی الباطل صحیح اما التقلید فی الحق فاصل من اصول الدین وعصمۃ من عصم المسلمین یلجاء الیھا الجاھل المقصر عن درك النظر (قرطبی، ص ۱۹۴ ج ۲)	"کچھ لوگوں نے اس آیت کو تقلید کی مذمت میں پیش کیا ہے، اور یہ باطل کے معاملہ میں تو صحیح ہے، لیکن حق کے معاملہ میں تقلید سے اس کا کوئی تعلق نہیں، حق میں تقلید کرنا تو دین کے اصول میں سے ایک مستقل بنیاد ہے، اور مسلمانوں کے دین کی حفاظت کا بہت بڑا ذریعہ ہے کہ جو شخص اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتا وہ دین کے معاملہ سے تقلید ہی پر اعتماد کرتا ہے۔"

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا

اے ایمان والو کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو روزی دی ہم نے تم کو اور شکر کرو اللہ کا

لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةَ وَ

اگر تم اسی کے بندے ہو ، اس نے تم پر یہی حرام کیا ہے مُردہ جانور اور

الدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِیْرِ وَمَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ

لہو اور گوشت سور کا اور جس جانور پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا پھر جو کوئی بے اختیار ہو جائے

بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۷۳)

نہ تو نافرمانی کرے اور نہ زیادتی تو اس پر کچھ گناہ نہیں بیشک اللہ ہے بڑا بخشنے والا نہایت مہربان

خلاصۂ تفسیر

اوپر اکلِ طیبات کے معاملہ میں مشرکین کی غلطی بتلاکر ان کی اصلاح مقصود تھی، آگے اہل ایمان کو اس بات سے متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ اس غلطی میں مشرکین کی موافقت نہ کرنے لگیں، اسی کے ضمن میں اہل ایمان کو اپنے انعامات کا ذکر اور اس پر ادائے شکر کی تعلیم بھی ہے۔

اے ایمان والو! (ہماری طرف سے تم کو اجازت ہے کہ) جو (شرع کی رو سے) پاک چیزیں ہم نے تم کو مرحمت فرمائی ہیں ان میں سے (جو چاہو) کھاؤ (برتو) اور (اس اجازت کے ساتھ یہ حکم ہے کہ) حق تعالیٰ کی شکر گذاری کرو، (زبان سے بھی ہاتھ پاؤں سے خدمت وطاعت بجالاکر بھی اور دل سے ان نعمتوں کو منجانب اللہ سمجھ کر بھی) اگر تم خاص ان کے ساتھ غلامی کا تعلق رکھتے ہو (اور یہ تعلق ہونا مسلّم اور ظاہر ہے، پس وجوبِ شکر بھی ثابت ہے)۔

ربط اوپر تو اس کا بیان تھا کہ حلال کو حرام مت کرو، آگے یہ مذکور ہوتا ہے کہ حرام کو حلال مت سمجھو، جیسا کہ مشرکین اس میں مبتلا تھے، مثلاً مردار جانور اور ایسے جانور جن کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، مشرکین ان کو کھایا کرتے تھے، اس سے منع کیا گیا، اسی کے ضمن میں یہ بھی بتلادیا کہ اللہ کے نزدیک فلاں فلاں جانور حرام ہیں، ان کے سوا دوسرے جانوروں کو اپنی طرف سے حرام قرار دینا غلطی ہے، اس سے پچھلے مضمون کی تائید ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ نے تم پر صرف (ان چیزوں کو) حرام کیا ہے (اور ان چیزوں کو حرام نہیں کیا جن کو تم اپنی طرف سے حرام کر رہے ہو، جیسا کہ گذرا یعنی) مردار (جانور) کو (جو باوجود واجب الذبح ہونے کے بلا ذبح شرعی مرجاوے) اور خون کو (جو بہتا ہو) اور خنزیر کے گوشت کو (اسی طرح اس کے سب اجزاء کو بھی) اور ایسے جانور کو جو (بقصد تقرب) غیر اللہ کے نامزد کردیا گیا ہو (ان سب کو بیشک حرام کیا ہے) پھر بھی (اس میں اتنی آسانی رکھی ہے کہ) جو شخص (بھوک سے بہت ہی) بیتاب ہوجاوے، بشرطیکہ نہ تو (کھانے میں) طالبِ لذت ہو، اور نہ (قدرِ ضرورت وحاجت سے) تجاوز کرنے والا ہو تو (اس حالت میں ان چیزوں سے کھانے میں بھی) اس شخص پر کچھ گناہ نہیں ہوتا، واقعی اللہ تعالیٰ ہیں بڑے غفور رحیم (کہ ایسے وقت میں یہ رحمت فرمائی کہ گناہ کی چیز میں بھی گناہ اٹھادیا)

معارف و مسائل

حلال کھانے کی برکت اور حرام کھانے کی نحوست

آیاتِ مذکورہ میں جیسے حرام کھانے کی ممانعت کی گئی ہے اسی طرح حلال طیّب چیزوں کے کھانے اور اس پر شکر گذار ہونے کی ترغیب بھی ہے، کیونکہ جس طرح حرام کھانے سے اخلاقِ رذیلہ پیدا ہوتے ہیں، عبادت کا ذوق جاتا رہتا ہے، دعاء قبول نہیں ہوتی، اسی طرح حلال کھانے سے ایک نور پیدا ہوتا ہے، اخلاقِ رذیلہ سے نفرت، اخلاقِ فاضلہ کی رغبت پیدا ہوتی ہے، عبادت میں دل لگتا ہے، گناہ سے دل گھبراتا ہے، دعاء قبول ہوتی ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے سب رسولوں کو یہ ہدایت فرمائی ہے،

يَآ أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا (۲۳: ۵۱) | "اے (ہمارے) رسولو! تم پاکیزہ چیزیں کھاؤ، اور نیک عمل کرو"

اس میں اشارہ ہے کہ نیک عمل کرنے میں رزقِ حلال کو بڑا دخل ہے، اسی طرح قبولِ دعا میں حلال کھانا معین اور حرام مانعِ قبول ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہت سے لوگ طویل السفر پریشان حال اللہ کے سامنے دعاء کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں، اور یارب یارب پکارتے ہیں، مگر کھانا ان کا حرام، پینا ان کا حرام، لباس ان کا حرام، غذا ان کی حرام، ان حالات میں ان کی دعاء کہاں قبول ہوسکتی ہے (صحیح مسلم، ترمذی، از ابن کثیر)

إِنَّمَا حَرَّمَ، کلمہ اِنَّمَا حصر کے لئے آتا ہے، اس لئے آیت کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف وہ چیزیں حرام کی ہیں، جن کا آگے ذکر کیا جاتا ہے، اس کے سوا کچھ حرام نہیں، اس آیت میں تو لفظ اِنَّمَا سے اس کی طرف اشارہ ہوا، اور دوسری آیت میں اس سے زیادہ صراحت کے ساتھ یہ بھی آیا ہے، قُلْ لَّآ أَجِدُ فِيْ مَآ أُوْحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ الآیۃ (۶: ۱۴۵) اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ اعلان کردیں کہ میری وحی میں بجز ان چند چیزوں کے جن کا ذکر آگے کیا گیا ہے، اور کوئی چیز حرام نہیں۔

مگر اس پر اشکال یہ ہے کہ دوسری آیات قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ سے ان چند چیزوں کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزوں کی حرمت ثابت ہے، تو یہ حصر اور حرمت ماسوٰی کی نفی کیسے درست ہوگی؟

جواب یہ ہے کہ یہاں مطلق حلال و حرام کا بیان نہیں، بلکہ ان مخصوص جانوروں کی حلت و حرمت کا بیان ہے جن کے بارے میں مشرکینِ مکہ اپنے مشرکانہ عقائد کی غلطیاں کیا کرتے تھے، پچھلی آیت میں اس کی وضاحت آچکی ہے کہ بہت سے حلال جانوروں کو مشرکین حرام سمجھ لیتے

۲۰

تھے، یا اپنے اوپر حرام کر لیتے تھے، اس کی مخالفت کی گئی تھی، اس کے بالمقابل یہاں یہ بتلایا گیا کہ اللہ کے نزدیک فلاں فلاں جانور حرام ہیں جن سے تم اجتناب نہیں کرتے، اور جو اللہ کے نزدیک حلال ہیں ان سے پرہیز کرتے ہو، اس لئے اس جگہ حصر مطلق نہیں، بلکہ اضافی ہے مشرکانہ عقائد کے بالمقابل۔

آگے اس آیت میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے، وہ چار چیزیں یہ ہیں:

میتۃ (مردار)، خون، لحم خنزیر، وہ جانور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، پھر چاروں چیزوں کی مزید تشریحات خود قرآن کریم کی دوسری آیات اور احادیث صحیحہ میں آئی ہیں جن کو ملانے کے بعد ان چاروں چیزوں کے احکام حسب ذیل ہیں، ان کو کسی قدر تفصیل سے لکھا جاتا ہے۔

میتہ جس کو اردو میں مردار کہتے ہیں، اس سے مراد وہ جانور ہے جس کے حلال ہونے کے لئے از روئے شرع ذبح کرنا ضروری ہے، مگر وہ بغیر ذبح کے خود بخود مر جائے، یا گلا گھونٹ کر یا کسی دوسری طرح چوٹ مار کر مار دیا جائے تو وہ مردار اور حرام ہی، لیکن خود قرآن کریم کی دوسری آیت اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ (۵: ۹۶) سے معلوم ہوا کہ دریائی جانور کے لئے ذبح کرنا شرط نہیں، وہ بلا ذبح بھی جائز ہے، اس بناء پر احادیث صحیحہ میں مچھلی اور ٹڈی کو میتہ سے مستثنیٰ قرار دے کر حلال کیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہمارے لئے دو مردار حلال کر دیئے گئے، ایک مچھلی دوسرے ٹڈی، اور دو خون حلال کر دیئے گئے، جگر اور طحال (ابن کثیر، از احمد، ابن ماجہ، دارقطنی)

معلوم ہوا کہ جانوروں میں سے مچھلی اور ٹڈی بغیر ذبح کے حلال ہیں، خواہ وہ خود مر جائیں یا کسی کے مارنے سے مر جائیں، البتہ جو مچھلی سڑ جانے کی وجہ سے خود پانی کے اوپر آجائے وہ حرام ہے (جصاص)

اسی طرح وہ شکاری جانور جو قابو میں نہیں کہ ذبح کر لیا جائے اور اس کو بھی بسم اللہ پڑھ کر تیر وغیرہ دھار دار چیز سے زخم لگا دیں تو بغیر ذبح کے حلال ہو جاتا ہے، مطلقاً زخمی ہو جانا کافی نہیں، کسی آلۂ جارحہ تیز دھار سے زخمی ہونا شرط ہے۔

بندوق کی گولی سے شکار **مسئلہ:** بندوق کی گولی سے کوئی جانور زخمی ہو کر قبل ذبح مر جائے تو وہ ایسا ہے جیسے پتھر یا لاٹھی مارنے سے مر جائے، جس کو قرآن کریم کی دوسری آیت میں مَوْقُوذَةٌ کہا گیا ہے، اور حرام قرار دیا ہے، ہاں مرنے سے پہلے اسکو ذبح کر لیا جائے تو حلال ہو جائیگا۔

مسئلہ: آجکل بندوق کی ایک گولی نوکدار بنائی گئی ہے، اس کے متعلق بعض علماء کا خیال ہے کہ تیر کے حکم میں ہے، مگر جمہور علماء کے نزدیک یہ بھی تیر کی طرح آلۂ جارحہ نہیں،

بلکہ خارق ہی جس سے بارود کی طاقت کے ذریعہ گوشت پھٹ جاتا ہے، ورنہ خود اس میں کوئی دھار نہیں جس سے جانور زخمی ہو جائے اس لئے ایسی گولی کا شکار بھی بغیر ذبح کے جائز نہیں۔

مسئلہ: آیت مذکورہ میں مطلقاً میتہ کو حرام قرار دیا ہے، اس لئے جس طرح اس کا گوشت کھانا حرام ہے اس کی خرید و فروخت بھی حرام ہے، یہی حکم تمام نجاسات کا ہے، کہ جیسے ان کا استعمال حرام ہے اُن کی خرید و فروخت اور ان سے نفع اٹھانا بھی حرام ہے، یہاں تک کہ مردار جانور یا ناپاک کوئی چیز باختیار خود جانور کو کھلانا بھی جائز نہیں، ہاں ایسی جگہ رکھ دے جہاں سے کوئی کتا بلّی خود کھالے، یہ جائز ہے، مگر خود اٹھا کر ان کو کھلانا جائز نہیں۔ (جصاص، قرطبی وغیرہ)

مسئلہ: اس آیت میں میتہ کے حرام ہونے کا حکم عام معلوم ہوتا ہے، جس میں میتہ کے تمام اجزاء شامل ہیں، لیکن دوسری آیت میں اس کی تشریح عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗ کے الفاظ سے کردی گئی ہے جس سے معلوم ہوا کہ مردار جانور کے وہ اجزاء حرام ہیں، جو کھانے کے قابل ہیں، اس لئے مردار جانور کی ہڈی، بال جو کھانے کی چیز نہیں وہ پاک ہیں، اور ان کا استعمال جائز ہے، آیت قرآن کریم وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِیْنٍ (۱۶: ۸۰) میں اُن جانوروں کے بالوں کو مطلقاً جائز الانتفاع قرار دیا ہے ذبیحہ کی شرط نہیں (جصاص)۔ کھال پر چونکہ خون وغیرہ کی نجاست لگی ہوتی ہے اس لئے وہ دباغت سے پہلے حرام ہے، مگر دباغت دینے کے بعد حلال اور جائز ہے، احادیث صحیحہ میں اس کی مزید تصریح موجود ہے (جصاص)

مسئلہ: مردار جانور کی چربی اور اس سے بنائی ہوئی چیزیں بھی حرام ہیں، ان کا استعمال کسی طرح سے جائز نہیں، اور خرید و فروخت بھی حرام ہے۔

مسئلہ: یورپ وغیرہ سے آئی ہوئی چیزیں صابون وغیرہ جن میں چربی استعمال ہوتی ہے، ان سے پرہیز کرنا احتیاط ہے، مگر مردار کی چربی ہونے کا علم یقینی نہ ہونے کی وجہ سے گنجائش ہے، نیز اس وجہ سے بھی کہ بعض صحابہ کرامؓ ابن عمرؓ، ابو سعید خدریؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ نے مردار کی چربی کا صرف کھانے میں استعمال حرام قرار دیا ہے، خارجی استعمال کی اجازت دی ہے، اس لئے اس کی خرید و فروخت کو بھی جائز رکھا ہے۔ (جصاص)

مسئلہ: دودھ کا پنیر بنانے میں ایک چیز استعمال کی جاتی ہے، جس کو عربی زبان میں اِنفحَہ کہا جاتا ہے، یہ جانور کے پیٹ سے نکالی جاتی ہے، اس کو دودھ میں شامل کرنے سے دودھ جم جاتا ہے، اب اگر یہ جانور اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا ہو تو اس کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں، مذبوح جانور کا گوشت چربی وغیرہ سب حلال ہیں، لیکن غیر مذبوح جانور کے پیٹ سے لیا جائے تو اس

میں فقہاء کا اختلاف ہے، امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ اس کو پاک قرار دیتے ہیں، لیکن صاحبین امام ابویوسفؒ و محمدؒ اور ثوریؒ وغیرہ اس کو ناپاک کہتے ہیں۔ (جصاص، قرطبی)

یورپ اور دوسرے غیر اسلامی ملکوں سے جو پنیر بنا ہوا آتا ہے اس میں غیر مذبوح جانوروں کا انفحہ استعمال ہونے کا احتمال غالب ہے، اس لئے جمہور فقہاء کے قول پر اس سے پرہیز کرنا چاہئے امام اعظمؒ اور امام مالکؒ کے قول پر گنجائش ہے، ہاں یورپ سے آئے ہوئے بعض پنیر ایسے بھی ہیں جن میں خنزیر کی چربی استعمال ہوتی ہے، اور ڈبہ پر لکھا ہوا ہوتا ہے، وہ قطعاً حرام اور نجس ہیں۔

خون کے مسائل

دوسری چیز جو آیتِ مذکورہ میں حرام قرار دی گئی ہے وہ خون ہے لفظ دَم بمعنی خون اس آیت میں اگرچہ مطلق ہے، مگر سورۂ انعام کی آیت میں اس کے ساتھ مَسْفُوْحٌ یعنی بہنے والا ہونے کی شرط ہے، اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا (۶: ۱۴۵) اس لئے باتفاق فقہاء خون منجمد جیسے گردہ تلی وغیرہ وہ حلال اور پاک ہیں۔

مسئلہ: جب کہ حرام صرف بہنے والا خون ہے تو جو خون ذبح کے بعد گوشت میں لگا رہ جاتا ہے وہ پاک ہے، فقہاء و صحابہؓ و تابعینؒ اور امت کا اس پر اتفاق ہے، اسی طرح مچھر، مکھی، کھٹمل وغیرہ کا خون بھی ناپاک نہیں، لیکن زیادہ ہو جائے تو اس کو بھی دھونا چاہئے (جصاص)

مسئلہ: جس طرح خون کا کھانا پینا حرام ہے، اسی طرح اس کا خارجی استعمال بھی حرام ہے، اور جس طرح تمام نجاسات کی خرید و فروخت بھی اور اس سے نفع اٹھانا حرام ہے، اسی طرح خون کی خرید و فروخت بھی حرام ہے، اس سے حاصل کی ہوئی آمدنی بھی حرام ہے، کیونکہ الفاظ قرآنی میں مطلقاً دَم کو حرام فرمایا ہے، جس میں اس کے استعمال کی تمام صورتیں شامل ہیں۔

مریض کو دوسرے کا خون دینے کا مسئلہ

تحقیق اس مسئلہ کی یہ ہے کہ انسانی خون انسان کا جزء ہے، اور جب بدن سے نکال لیا جائے تو وہ نجس بھی ہے، اس کا اصل تقاضا تو یہی ہے کہ ایک انسان کا خون دوسرے کے بدن میں داخل کرنا دو وجہ سے حرام ہو، اوّل اس لئے کہ اعضاء انسانی کا احترام واجب ہے، اور یہ اُس احترام کے منافی ہے، دوسرے اس لئے کہ خون نجاست غلیظہ ہے اور نجس چیزوں کا استعمال ناجائز ہے۔

لیکن اضطراری حالات اور عام معالجات میں شریعتِ اسلام کی دی ہوئی سہولتوں میں غور کرنے سے امور ذیل ثابت ہوتے ہیں:۔

اوّل یہ کہ خون اگرچہ جزء انسانی ہے، مگر اس کو کسی دوسرے انسان کے بدن میں منتقل

کرنے کے لئے اعضاء انسانی میں کاٹ چھانٹ اور آپریشن کی ضرورت پیش نہیں آتی، انجکشن کے ذریعہ خون نکالا اور دوسرے کے بدن میں ڈالا جاتا ہے، اس لئے اس کی مثال دودھ کی سی ہوگئی جو بدنِ انسانی سے بغیر کسی کاٹ چھانٹ کے نکلتا اور دوسرا انسان کا جزء بنتا ہے اور شریعتِ اسلام نے بچہ کی ضرورت کے پیشِ نظر انسانی دودھ ہی کو اس کی غذا قرار دیا ہے، اور ماں پر اپنے بچوں کو دودھ پلانا واجب کیا، جب تک وہ بچوں کے باپ کے نکاح میں رہے طلاق کے بعد ماں کو دودھ پلانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، بچوں کا رزق مہیا کرنا باپ کی ذمہ داری ہے، وہ کسی دوسری عورت سے دودھ پلوائے، یا ان کی ماں ہی کو معاوضہ دیکر اس سے دودھ پلوائے، قرآن کریم میں اس کی واضح تصریح موجود ہے:

فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ج (۶۵: ۶)	"اگر تمہاری مطلقہ بیوی تمہارے بچوں کو دودھ پلائے تو اس کو اجرت دمعاوضہ دیدو۔"

خلاصہ یہ ہے کہ دودھ جزءِ انسانی ہونے کے باوجود بوجہ ضرورت اس کے استعمال کی اجازت بچوں کے لئے دی گئی ہے، اور علاج کے طور پر بڑوں کے لئے بھی، جیسا کہ عالمگیری میں ہے:

وَلَا بَأْسَ بِاَنْ يُّسْعَطَ الرَّجُلُ بِلَبَنِ الْمَرْأَةِ وَيَشْرَبَه لِلدَّوَاءِ (عالمگیری، ص ۴)	"اس میں مضائقہ نہیں کہ دواء کے لئے کسی شخص کی ناک میں عورت کا دودھ ڈالا جائے یا پینے میں استعمال کیا جائے۔"

اور مغنی ابن قدامہ میں اس مسئلہ کی مزید تفصیل مذکور ہے (مغنی کتاب الصید ص ۶۰۲/۸ ج)

اگر خون کو دودھ پر قیاس کیا جائے تو کچھ بعید از قیاس نہیں، کیونکہ دودھ بھی خون کی بدلی ہوئی صورت ہے، اور جزءِ انسان ہونے میں مشترک ہے، فرق صرف یہ ہے کہ دودھ پاک ہے اور خون ناپاک، تو حرمت کی پہلی وجہ یعنی جزءِ انسانی ہونا تو یہاں وجہِ ممانعت نہ رہی، صرف نجاست کا معاملہ رہ گیا، علاج ددواء کے معاملہ میں بعض فقہاء نے خون کے استعمال کی بھی اجازت دی ہے۔

اس لئے انسان کا خون دوسرے کے بدن میں منتقل کرنے کا شرعی حکم یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام حالات میں تو جائز نہیں، مگر علاج ددواء کے طور پر اس کا استعمال اضطراری حالت میں بلاشبہ جائز ہے، اضطراری حالت سے مراد یہ ہے کہ مریض کی جان کا خطرہ ہو اور کوئی دوسری دوا اس کی جان بچانے کے لئے مؤثر یا موجود نہ ہو، اور خون دینے سے اس کی جان بچنے کا ظن غالب ہو، ان شرطوں کے ساتھ خون دینا تو اس نصِ قرآنی کی رُو سے جائز ہے، جس میں مضطر

کے لئے مردار جانور کھا کر جان بچانے کی اجازت صراحۃً مذکور ہے، اور اگر اضطراری حالت نہ ہو یا دوسری دوائیں بھی کام کر سکتی ہوں تو ایسی حالت میں مسئلہ مختلف فیہا ہے، بعض فقہاء کے نزدیک جائز ہے، بعض ناجائز کہتے ہیں، جس کی تفصیل کتب فقہ بحث تداوی بالمحرم میں مذکور ہے، واللہ سبحانہ' تعالیٰ اعلم، احقر کا ایک مستقل رسالہ بھی اس موضوع پر شائع ہوگیا ہے، جس کا نام ہے "اعضائے انسانی کی پیوندکاری"، اس کو ملاحظہ فرمایا جائے۔

تحریم خنزیر

تیسری چیز جو اس آیت میں حرام کی گئی ہے وہ لحم خنزیر ہے، آیت میں حرمتِ خنزیر کے ساتھ لحم کی قید مذکور ہے، امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ اس سے مقصود لحم یعنی گوشت کی تخصیص نہیں، بلکہ اس کے تمام اجزاء ہڈی، کھال، بال، پٹھے سب ہی باجماعِ امت حرام ہیں، لیکن لفظ لحم بڑھا کر اشارہ اس طرف ہے کہ خنزیر دوسرے حرام جانوروں کی طرح نہیں ہے، کہ وہ ذبح کرنے سے پاک ہوسکتے ہیں، اگرچہ کھانا حرام ہی رہے، کیونکہ خنزیر کا گوشت ذبح کرنے سے بھی پاک نہیں ہوتا، کہ وہ نجس العین بھی ہے حرام بھی، صرف چمڑا سینے کے لئے اس کے بال کا استعمال حدیث میں جائز قرار دیا ہے (جصاص، قرطبی)

مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کی تین صورتیں

چوتھی چیز جس کو آیت میں حرام قرار دیا گیا ہے وہ جانور ہے جو غیر اللہ کے لئے نامزد کردیا گیا ہو، جس کی تین صورتیں متعارف ہیں۔

اوّل یہ کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرب کے لئے ذبح کیا جائے، اور بوقت ذبح اسی غیر اللہ کا نام لیا جائے، یہ صورت باتفاق و باجماعِ امت حرام ہے، اور یہ جانور میتہ ہے، اس کے کسی جزء سے انتفاع جائز نہیں، کیونکہ یہ صورت آیت مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کا مدلول صریح ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی جانور کو تقرب الی غیر اللہ کے لئے ذبح کیا جائے، یعنی اس کا خون بہانے سے تقرب الی غیر اللہ مقصود ہو، لیکن بوقت ذبح اس پر نام اللہ ہی کا لیا جائے جیسے بہت سے ناواقف مسلمان بزرگوں، پیروں کے نام پر اُن کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بکرے، مرغے وغیرہ ذبح کرتے ہیں، لیکن ذبح کے وقت اس پر نام اللہ ہی کا پکارتے ہیں، یہ صورت بھی باتفاقِ فقہاء حرام اور مذبوحہ مردار ہے۔

مگر تخریج دلیل میں کچھ اختلاف ہے، بعض حضرات مفسرین و فقہاء نے اس کو بھی مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کا مدلول صریح قرار دیا ہے، جیسا کہ حواشی بیضاوی میں ہے:

فَكُلُّ مَا نُوْدِيَ عَلَيْهِ بِغَيْرِ اسْمِ اللّٰهِ فَهُوَ حَرَامٌ وَاِنْ ذُبِحَ	"ہر وہ جانور جس کو غیر اللہ کے نام کردیا گیا وہ حرام ہے، اگرچہ بوقت ذبح اللہ ہی کا

بِاسْمِ اللّٰهِ تَعَالٰى حَيْثُ أَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ لَوْ أَنَّ مُسْلِمًا ذَبَحَ ذَبِيْحَةً وَقَصَدَ بِذَبْحِهِ التَّقَرُّبَ إِلٰى غَيْرِ اللّٰهِ صَارَ مُرْتَدًّا وَذَبِيْحَتُهُ ذَبِيْحَةُ مُرْتَدٍّ

نام لیا ہو اس لئے کہ علماء فقہاء کا اتفاق ہے کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرب کے لئے اگر کوئی مسلمان ذبح کرے تو وہ مرتد ہو جاوے گا، اور اس کا ذبیحہ مرتد کا ذبیحہ کہلائے گا"

نیز درمختار کتاب الذبائح میں ہے:

ذُبِحَ لِقُدُوْمِ الْأَمِيْرِ وَنَحْوِهٖ كَوَاحِدٍ مِّنَ الْعُظَمَاءِ يَحْرُمُ لِأَنَّهٗ أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ وَلَوْ ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ وَأَقَرَّهُ الشَّامِيُّ (ص ۲۲۹ ج ۵)

"کسی امیر یا بڑے کے آنے پر جانور ذبح کیا تو وہ حرام ہوگا، کیونکہ وہ ما اہلّ بہ لغیر اللہ میں داخل ہے، اگرچہ بوقت ذبح اللہ ہی کا نام لیا ہو، اور شامی نے اس کو برقرار رکھا ہے"عہ

اور بعض حضرات نے اس صورت کو مَآ أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کا مدلول صریح تو نہیں بنایا کیونکہ وہ بحیثیت عربیت تکلف سے خالی نہیں، مگر بوجہ اشتراکِ علت یعنی تقرب الیٰ غیر اللہ کی نیت کے اس کو بھی مَآ أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے ساتھ ملحق کر کے حرام قرار دیا ہے، احقر کے نزدیک یہی وجہ احوط اور اسلم ہے۔

نیز اس صورت کی حرمت کے لئے ایک مستقل آیت بھی دلیل ہے، یعنی وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ، نُصُب ان تمام چیزوں کو کہا جاتا ہے، جن کی باطل طور پر پرستش کی جاتی ہو، معنے یہ ہیں کہ وہ جانور جس کو معبوداتِ باطلہ کے لئے ذبح کیا گیا ہے، اس سے پہلے وَمَآ أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مَآ أُهِلَّ کا مدلول صریح تو وہی جانور ہے جس پر بوقتِ ذبح غیر اللہ کا نام لیا گیا، اور ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ (۵: ۳) اسکے بالمقابل آیا ہے، جس میں غیر اللہ کے نام لینے کا ذکر نہیں، صرف بتوں وغیرہ کی خوشنودی کی نیت سے ذبح کرنا مراد ہے، اس میں وہ جانور بھی داخل ہیں جن کو ذبح تو کیا گیا ہے غیر اللہ کے تقرب کے لئے مگر بوقت ذبح

عہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر محض ذبح کے عمل سے کسی بڑے کی تعظیم مقصود ہو تو یہ حرام ہے، لیکن اگر مقصد مہمانی کرنا ہو اور اس مہمانی کیلئے جانور ذبح کیا جائے، یعنی اس کا گوشت مہمان کو کھلانا مقصود ہو، محض ذبح کے عمل سے تعظیم مقصود نہ ہو تو یہ سنتِ ضیافت ہے اور جائز ہے، اور دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ دوسری صورت میں میزبانی کیلئے گوشت کا حصول مقصود ہوتا ہے، اور پہلی صورت میں تعظیم کی علامت کے طور پر جانور کو ذبح کرنا مقصود ہوتا ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کا گوشت کھایا جائے گا یا نہیں؛ چنانچہ درمختار میں آگے یہی وضاحت کی گئی ہے: ولو ذبح للضيف لا يحرم لانه سنة الخليل واكرام الضيف اكرام الله تعالىٰ۔ والفارق أنه إن قدمها ليأكل منها كان الذبح لله والمنفعة للضيف أو للوليمة أو للربح، وإن لم يقدمها ليأكل منها بل يدفعها لغيره كان لتعظيم غير الله فتحرم۔ علامہ شامیؒ نے اس کی شرح میں مزید تشریح فرمادی ہے (رد المحتار ص ۳۰۹ و ۳۱۰ ج ۶) محمد تقی عثمانی ۲۷ ذیقعدہ ۱۴۱۲ھ

اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے۔ (افادہ شیخ حکیم الامت ؒ)

امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے، اُن کی عبارت یہ ہے:

وَجَرَتْ عَادَةُ الْعَرَبِ بِالصِّيَاحِ بِاسْمِ الْمَقْصُوْدِ بِالذَّبِيْحَةِ وَغَلَبَ ذٰلِكَ فِيْ اِسْتِعْمَالِهِمْ حَتّٰى عَبَّرَ بِهٖ عَنِ النِّيَّةِ الَّتِيْ هِيَ عِلَّةُ التَّحْرِيْمِ (تفسیر قرطبی ص ۲۰۷ ج ۲)

"عرب کی عادت تھی کہ جس کیلئے ذبح کرنا مقصود ہوتا ذبح کرنیکے وقت اس کا نام بلند آواز سے پکارتے اور یہ رواج ان میں عام تھا یہاں تک کہ اس آیت میں تقرب الی غیر اللہ کو جو کہ اصل علت تحریم ہے اہلال کے لفظ سے تعبیر کر دیا"

امام قرطبیؒ نے اپنی اس تحقیق کی بنیاد صحابہ کرامؓ میں سے دو حضرات حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے فتاویٰ پر رکھی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے زمانہ میں فرزدق شاعر کے باپ غالب نے ایک اونٹ ذبح کیا تھا جس پر کسی غیر اللہ کا نام لینے کا کوئی ذکر نہیں، مگر حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے اس کو بھی مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ میں داخل قرار دے کر حرام فرمایا، اور سب صحابہ کرامؓ نے اس کو قبول کیا، اسی طرح امام مسلمؒ کے شیخ یحییٰ بن یحییٰ کی سند سے صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک طویل حدیث نقل کی جس کے آخر میں ہے کہ ایک عورت نے حضرت صدیقہؓ سے سوال کیا کہ اُمّ المؤمنین! ہمارے کچھ رضاعی رشتہ دار عجمی لوگوں میں سے ہیں، اور ان کے یہاں تو روز روز کوئی نہ کوئی تہوار ہوتا رہتا ہے، یہ اپنے تہواروں کے دن کچھ ہدیہ تحفہ ہمارے پاس بھی بھیج دیتے ہیں، ہم اس کو کھائیں یا نہیں؟ اس پر صدیقہ عائشہؓ نے فرمایا:

اَمَّا مَا ذُبِحَ لِذٰلِكَ الْيَوْمِ فَلَا تَاْكُلُوْا وَلٰكِنْ كُلُوْا مِنْ اَشْجَارِهِمْ (تفسیر قرطبی ص ۲۰۷ ج ۲)

"جو جانور اس عید کے دن کے لئے ذبح کیا گیا ہو وہ نہ کھاؤ، لیکن اُن کے درختوں کے پھل وغیرہ کھا سکتے ہو"

الغرض یہ صورت ثانیہ جس میں نیت تو تقرب الی غیر اللہ کی ہو مگر ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا جائے، اوّل تو اشتراکِ علت یعنی نیت تقرب الی غیر اللہ کی وجہ سے مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے حکم میں ہے، دوسرے آیت وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ کا بھی مدلول ہے اس لئے یہ بھی حرام ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کسی جانور کو کان کاٹ کر یا کوئی دوسری علامت لگا کر تقرب الی غیر اللہ اور تعظیم غیر اللہ کے لئے چھوڑ دیا جائے، نہ اس سے کام لیں اور نہ اس کے ذبح کرنے کا قصد ہو، بلکہ اس کے ذبح کرنے کو حرام جانیں، یہ جانور مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ اور مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ دونوں میں داخل نہیں، بلکہ اس قسم کے جانور کو بحیرہ یا سائبہ وغیرہ کہا جاتا ہے، اور حکم ان کا یہ ہے کہ یہ فعل تو بنص قرآن حرام ہے، جیسا کہ آیت مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ

وَّلَاسَآئِبَۃٍ (۵: ۱۰۳) میں انشاء اللہ تعالیٰ آئے گا۔

مگر ان کے اس حرام عمل سے اور اس جانور کو حرام سمجھنے کے عقیدہ سے یہ جانور حرام نہیں ہوجاتا بلکہ اس کو حرام سمجھنے میں تو ان کے عقیدۂ باطلہ کی تائید و تقویت ہوتی ہے، اس لئے یہ جانور عام جانوروں کی طرح حلال ہے۔

مگر شرعی اصول کے مطابق یہ جانور اپنے مالک کی مِلک سے خارج نہیں ہوا، اسی کا مملوک ہے، اگرچہ وہ اپنے غلط عقیدہ سے یہ سمجھتا ہے کہ میری مِلک سے نکل کر غیر اللہ کے لئے وقف ہوگیا، مگر شرعاً اس کا یہ عقیدہ باطل ہے، وہ جانور بدستور اس کی ملک میں ہے۔

اب اگر وہ شخص خود اس جانور کو کسی کے ہاتھ فروخت کردے یا ہبہ کردے تو اس کے لئے یہ جانور حلال ہے، جیسا بکثرت ہندو اپنے دیوتاؤں کے نام بکری یا گائے وغیرہ کو اپنے نزدیک وقف کرکے چھوڑ دیتے ہیں، اور مندروں کے پجاریوں کو اختیار دیتے ہیں وہ جو چاہیں کریں، یہ مندروں کے پجاری اُن کو مسلمانوں کے ہاتھ بھی فروخت کردیتے ہیں۔

یا اسی طرح بعض جاہل مسلمان بھی بعض مزارات پر ایسا ہی عمل کرتے ہیں، کہ بکرا، یا مرغا چھوڑ دیتے ہیں، اور مزارات کے مجاورین کو اختیار دیتے ہیں وہ ان کو فروخت کردیتے ہیں، تو جو لوگ اِن جانوروں کو اُن لوگوں سے خریدلیں جن کو اصل مالک نے اختیار دیا ہے ان کے لئے ان کا خریدنا اور ذبح کرکے کھانا اور فروخت کرنا سب حلال ہے۔

نذر لغیر اللہ کا مسئلہ یہاں ایک چوتھی صورت اور ہے جس کا تعلق حیوانات کے علاوہ دوسری چیزوں سے ہے، مثلاً مٹھائی کھانا وغیرہ جن کو غیر اللہ کے نام پر نذر (مَنّت) کے طور سے، ہندو لوگ بتوں پر اور جاہل مسلمان بزرگوں کے مزارات پر چڑھاتے ہیں، حضرات فقہاء نے اس کو بھی اشتراک علت یعنی تقرب الی غیر اللہ کی وجہ سے مَآ اُھِلَّ بِہٖ لِغَيْرِ اللّٰہِ کے حکم میں قرار دے کر حرام کہا ہے، اور اس کے کھانے پینے، دوسروں کو کھلانے اور بیچنے خریدنے سب کو حرام کہا ہے، کتب فقہ بحر الرائق وغیرہ میں اس کی تفصیلات مذکور ہیں، یہ مسئلہ قیاسی ہے جس کو نص قرآنی متعلقہ حیوانات پر قیاس کیا گیا ہے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

اضطرار و مجبوری کے احکام آیتِ مذکورہ میں چار چیزوں کو حرام قرار دینے کے بعد ایک حکم استثنائی مذکور ہے فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْہِ ۭ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ اس حکم میں اتنی آسانی کردی گئی ہے کہ جو شخص بھوک سے بہت ہی بیتاب ہوجائے، بشرطیکہ نہ تو کھانے میں طالبِ لذت ہو اور نہ قدرِ ضرورت سے تجاوز کرنے والا ہو تو اس حالت میں اُن حرام چیزوں کو کھالینے سے بھی

اس شخص کو کوئی گناہ نہیں ہوتا، بے شک اللہ تعالیٰ ہیں بڑے غفور رحیم۔

اس میں مضطر کے لئے جان بچانے کے واسطے دو شرطوں کے ساتھ ان حرام چیزوں کے کھالینے سے بھی گناہ اٹھا دیا گیا ہے۔

مضطر، شرعی اصطلاح میں اس شخص کو کہا جاتا ہے، جس کی جان خطرہ میں ہو، معمولی تکلیف یا ضرورت سے مضطر نہیں کہا جا سکتا، تو جو شخص بھوک سے ایسی حالت پر پہنچ گیا کہ اگر کچھ نہ کھائے تو جان جاتی رہے گی، اس کے لئے دو شرطوں کے ساتھ یہ حرام چیزیں کھالینے کی گنجائش دی گئی ہے، ایک شرط یہ ہے کہ مقصود جان بچانا ہو کھانے کی لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو، دوسری شرط یہ ہے کہ صرف اتنی مقدار کھائے جو جان بچانے کے لئے کافی ہو، پیٹ بھر کر کھانا یا قدر ضرورت سے زائد کھانا اس وقت بھی حرام ہے۔

اہم فائدہ یہاں قرآن عزیز نے اضطرار کی حالت میں بھی حرام چیزوں کے کھانے کو حلال نہیں فرمایا، بلکہ لَآ اِثْمَ عَلَيْهِ فرمایا، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں تو اب بھی اپنی جگہ حرام ہی ہیں، مگر اس کھانے والے سے بوجہ اضطرار کے استعمالِ حرام کا گناہ معاف کر دیا گیا، حلال ہو جانے اور گناہ معاف کر دینے میں بڑا فرق ہے، اگر اضطراری حالت میں ان چیزوں کو حلال کر دینا مقصود ہوتا تو حرمت سے صرف استثناء کر دینا کافی ہوتا، مگر یہاں صرف استثناء پر اکتفاء کر دینے کے بجائے لَآ اِثْمَ عَلَيْهِ کا اضافہ فرما کر اس نکتہ کی طرف اشارہ کر دیا کہ حرام تو اپنی جگہ حرام ہی ہے، اور اس کا استعمال گناہ ہی ہے، مگر مضطر سے یہ گناہ معاف کر دیا گیا۔

حالتِ اضطرار میں دوا کے طور پر حرام چیزوں کا استعمال آیتِ مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جس شخص کی جان خطرہ میں ہو وہ جان بچانے کے لئے بطور دواء کے حرام چیز کو استعمال کر سکتا ہے، مگر آیتِ مذکورہ ہی کے اشارہ سے اس میں چند شرطیں معلوم ہوتی ہیں:

اوّل یہ کہ حالت اضطرار کی ہو، خطرہ جان جانے کا ہو، معمولی تکلیف و بیماری کا یہ حکم نہیں ہے، دوسرے یہ کہ بجز حرام چیز کے اور کوئی چیز علاج و دواء کے لئے مؤثر نہ ہو یا موجود نہ ہو، جیسے شدید بھوک کی حالت میں استثناء اُسی وقت ہے جب کہ کوئی دوسری حلال غذا موجود و مقدور نہ ہو، تیسرے یہ کہ اس حرام کے استعمال کرنے سے جان بچ جانا یقینی ہو جیسے بھوک سے مضطر کے لئے ایک دو لقمہ حرام گوشت کا کھالینا عادۃً اس کی جان بچانے کا یقینی سامان ہے، اگر کوئی دواء ایسی ہے کہ اس کا استعمال مفید تو معلوم ہوتا ہے مگر اس سے شفاء یقینی نہیں تو اس دواء حرام کا استعمال آیتِ مذکورہ کے استثنائی حکم میں داخل ہو کر جائز نہیں ہوگا، اس کے ساتھ مزید دو شرطیں آیتِ قرآنی میں منصوص ہیں، کہ اس کے

استعمال سے لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو اور قدرِ ضرورت سے زائد استعمال نہ کرے۔

آیتِ مذکورہ کی تصریح اور اشارات سے جو قیود و شرائط حاصل ہوئے ان شرائط کے ساتھ ہر حرام و ناپاک دوا کا استعمال خواہ کھانے پینے میں ہو یا خارجی استعمال میں باتفاق فقہاء امت جائز ہے، اُن شرائط کا خلاصہ پانچ چیزیں ہیں۔

(۱) حالت اضطرار کی ہو یعنی جان کا خطرہ ہو (۲) دوسری کوئی حلال دوا کارگر نہ ہو یا موجود نہ ہو (۳) اس دوا سے مرض کا ازالہ عادۃً یقینی ہو (۴) اس کے استعمال سے لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو (۵) قدرِ ضرورت سے زائد اس کو استعمال نہ کیا جائے۔

غیر اضطراری حالت میں عام علاج و دواء کے لئے حرام چیز کا استعمال

اضطراری حالت کا مسئلہ تو شرائطِ مذکورہ کے ساتھ نصِ قرآن سے ثابت اور اجماعی حکم ہے، لیکن عام بیماریوں میں بھی کسی ناپاک یا حرام دواء کا استعمال جائز ہے یا نہیں، اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے، اکثر فقہاء نے فرمایا کہ بغیر اضطرار اور ان تمام شرائط کے جو اوپر مذکور ہوئیں حرام دواء کا استعمال جائز نہیں، کیونکہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: "اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے لئے حرام میں شفاء نہیں رکھی (بخاری شریف)

بعض دوسرے فقہاء نے ایک خاص واقعہ حدیث سے استدلال کر کے جائز قرار دیا، وہ واقعہ عُرَنِیِّین کا ہے، جو تمام کتبِ حدیث میں مذکور ہے، کہ کچھ گاؤں والے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اونٹ کا دودھ اور پیشاب استعمال کرنے کی اجازت دی جس سے ان کو شفاء ہوگئی۔

مگر اس واقعہ میں متعدد احتمالات ہیں جن سے حرام چیز کا استعمال مشکوک ہو جاتا ہے، اس لئے اصل حکم تو یہی ہے کہ عام بیماریوں میں جبتک شرائطِ اضطرار مذکورہ موجود نہ ہوں حرام دواء کا استعمال جائز نہیں۔

لیکن فقہاء متاخرین نے موجودہ زمانے میں حرام و ناپاک دواؤں کی کثرت اور ابتلاء عام اور عوام کے ضعف پر نظر کر کے اس شرط کے ساتھ اجازت دی ہے کہ کوئی دوسری حلال اور پاک دواء اس مرض کے لئے کارگر نہ ہو یا موجود نہ ہو۔

کما فی الدر المختار قبیل فصل البیر اختلف فی التداوی بالمحرم و ظاهر المذهب المنع کما فی	"درمختار میں فصل بیر سے پہلے مذکور ہے حرام چیزوں کو بطور دواء استعمال کرنے میں اختلاف ہے، اور ظاہر مذہب میں اس

رضاع البحر ولكن نقل المصنف ثَمَّ وههنا عن الحاوی قیل یرخص اذا اُعلِمَ فيه الشفاء ولم يُعلَمْ دواء آخر كما رخص فی الخمر للعطشان وعليه الفتوٰی، ومثله فی العالمگیریۃ ص ۳۵۵ ج ۵

کی ممانعت آئی ہے، جیساکہ بحرالرائق کتاب الرضاع میں مذکور ہے، لیکن مصنف تنویر نے اس جگہ رضاع میں بھی اور یہاں بھی حاوی قدسی سے نقل کیا ہے کہ بعض علماء نے فرمایا دواء وعلاج کے لئے حرام چیزوں کا استعمال اس شرط سے جائز ہے کہ اس دواء کے استعمال سے شفاء ہوجانا عادۃً یقینی ہو، اور کوئی حلال دواء اس کا بدل نہ ہوسکے، جیساکہ پیاسے کے لئے شراب کا گھونٹ پینے کی اجازت دی گئی ہے "۔

مسئلہ: تفصیل مذکورسے اُن تمام انگریزی دواؤں کا حکم معلوم ہوگیا جو یورپ وغیرہ سے آتی ہیں، جن میں شراب وغیرہ نجس اشیاء کا ہونا معلوم ویقینی ہو، اور جن دواؤں میں حرام ونجس اجزاء کا وجود مشکوک ہو ان کے استعمال میں اور زیادہ گنجائش ہے، اور احتیاط بہرحال احتیاط ہے، خصوصاً جبکہ کوئی شدید ضرورت بھی نہ ہو، واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ

بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ نازل کی اللہ نے کتاب اور لیتے ہیں اس پر

بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا

تھوڑا سا مول وہ نہیں بھرتے اپنے پیٹ میں مگر آگ اور نہ بات

يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ

کرے گا ان سے اللہ قیامت کے دن اور نہ پاک کرے گا اُن کو اور اُن کے لئے ہے

اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ

عذاب دردناک، یہی ہیں جنھوں نے خریدا گمراہی کو بدلے ہدایت کے اور عذاب

بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ

بدلے بخشش کے، سو کس قدر صبر کرنیوالے ہیں دوزخ پر، یہ اس واسطے کہ اللہ نے نازل فرمائی

الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍۢ

کتاب سچی ، اور جنھوں نے اختلاف ڈالا کتاب میں وہ بے شک ضد میں

بَعِيْدٍ ۝۱۷۶ ع

دُور جا پڑے

۲۱ ع ۵

خلاصۂ تفسیر و ربط آیات اس سے پہلی آیات میں اُن حرام چیزوں کا ذکر تھا جو محسوسات میں سے ہیں، اگلی آیات میں ایسے حرام کاموں کا ذکر جو محسوس نہیں بلکہ وہ باطنی اور ظاہری اعمالِ شر ہیں، مثلاً علمائے یہود میں یہ مرض تھا کہ عوام سے رشوت لیکر اُن کے مطلب کے موافق غلط فتوے دیدیتے تھے، اور توریت کی آیات میں تحریف کرکے اُن کے مطلب کے موافق بناتے تھے، اس میں امتِ محمدیہ کے علماء کو بھی تنبیہ ہے، کہ وہ ایسے افعال سے اجتناب کریں، کسی نفسانی غرض سے احکامِ حق کے اظہار میں کوتاہی نہ کریں۔

دین فروشی کی سزا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتاب (کے مضامین) کا اخفاء کرتے ہیں اور اس (خیانت) کے معاوضہ میں (دنیا کی) متاعِ قلیل وصول کرتے ہیں ایسے لوگ اور کچھ نہیں اپنے پیٹ میں آگ (کے انگارے) بھر رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان سے نہ تو قیامت میں (لطف کے ساتھ) کلام کریں گے اور نہ (گناہ معاف کرکے) ان کی صفائی کریں گے، اور ان کو سزائے دردناک ہوگی، یہ ایسے لوگ ہیں جنھوں نے (دنیا میں تو) ہدایت چھوڑ کر ضلالت اختیار کی اور (آخرت میں) مغفرت چھوڑ کر عذاب (سر پر لیا) سو (شاباش ہے اُن کی ہمت کو) دوزخ (میں جانے) کے لئے کیسے باہمت ہیں (اور) یہ (ساری مذکورہ) سزائیں (ان کو) اس وجہ سے ہیں کہ حق تعالیٰ نے (اس) کتاب کو ٹھیک ٹھیک بھیجا تھا، اور جو لوگ (ایسی ٹھیک ٹھیک بھیجی ہوئی) کتاب میں بے راہی (اختیار) کریں، وہ ظاہر ہے کہ بڑی دور (و دراز) کی خلاف (ورزی) میں (مبتلا) ہوں گے (اور ایسی خلاف ورزی پر ضرور ایسی ہی سخت سزاؤں کا استحقاق ہوگا)۔

معارف و مسائل

مسئلہ: آیات مذکورہ سے معلوم ہوا کہ جو شخص مال کے لالچ سے حکمِ شرعی کو بدل دے، وہ جو یہ مالِ حرام کھاتا ہے گویا اپنے پیٹ میں جہنم کے انگارے بھر رہا ہے، کیونکہ اس عمل کا انجام یہی ہے، اور بعض محقق علماء نے فرمایا کہ مالِ حرام درحقیقت جہنم کی آگ ہی ہے،

اگرچہ اس کا آگ ہونا دنیا میں محسوس نہیں ہوتا، مگر مرنے کے بعد اس کا یہ عمل آگ کی شکل میں سامنے آجائے گا۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ

نیکی کچھ یہی نہیں کہ مُنہ کرو اپنا مشرق کی طرف یا مغرب کی،

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ

لیکن بڑی نیکی تو یہ ہے کہ جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور

وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَ

سب کتابوں پر اور پیغمبروں پر اور دے مال اس کی محبت پر رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور

الْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ

محتاجوں کو اور مسافروں کو اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں اور قائم رکھے

الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ

نماز اور دیا کرے زکوٰۃ، اور پورا کرنے والے اپنے اقرار کو جب عہد کریں،

وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ

اور صبر کرنے والے سختی میں اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت یہی لوگ

الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

ہیں سچے اور یہی ہیں پرہیزگار ؛ ؛ ؛

ربط از بیان القرآن

شروع سورت سے یہاں تک تقریباً نصف سورۂ بقرہ ہی، زیادہ روئے سخن منکرین کی طرف تھا، کیونکہ سب سے اول قرآن کی حقانیت کا اثبات کیا، اس ضمن میں اس کے ماننے والے اور نہ ماننے والے فرقوں کا ذکر کیا، پھر توحید و رسالت کو ثابت کیا، پھر اولاد ابراہیم علیہ السلام پر انعامات و احسانات کو اِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ تک بیان فرمایا، وہاں سے قبلہ کی بحث چلی، اور اس کو بیان کر کے صفا و مروہ کی بحث پر ختم کیا۔

پھر توحید کے اثبات کے بعد شرک کے اصول و فروع کا ابطال کیا، اور یہاں تک یہی

بیان ہوا، اور ان سب مضامین میں ظاہر ہے کہ منکرین کو زیادہ تنبیہ ہی، اور ضمناً کوئی خطاب مسلمانوں کو ہو جانا اور بات ہے۔

اب آیات آئندہ میں کہ بقیہ تقریباً سورۃ بقرہ کا نصف ہے، زیادہ تر مقصود مسلمانوں کو بعض اصول و فروع کی تعلیم کرنا ہے، گو ضمناً غیر مسلمین کو بھی کوئی خطاب ہو جاوے، اور یہ مضمون ختم سورۃ تک چلا گیا ہے، جس کو شروع کیا گیا ہے ایک مجمل عنوان بِرّ سے، لفظ بِرّ بکسر الباء عربی زبان میں مطلق خیر کے معنی میں ہے، جو تمام ظاہری اور باطنی طاعات و خیرات کو جامع ہے، اور اوّل آیات میں الفاظ جامعہ سے کلی اور اصولی تعلیم دی گئی ہے، مثلاً ایمان بالکتاب و ایتاءِ مال و وفاءِ عہد و صبر حین البأس وغیرہ، جس میں قرآنی تمام احکام کے بنیادی اصول آگئے، کیونکہ شریعت کے کُل احکام کا حاصل تین چیزیں ہیں، عقائد، اعمال، اخلاق، باقی تمام جزئیات انھیں کلیات کے تحت میں داخل ہیں، اور اس آیت میں ان تینوں قسم کے بڑے بڑے شعبے آگئے۔

آگے اس بِرّ کی تفصیل چلی ہے، جس میں سے بہت سے احکام باقتضائے وقت و مقام مثل قصاص و وصیت و روزہ و جہاد و حج و انفاق و حیض و ایلاء و یمین و طلاق و نکاح و عدت و مہر و تکرار ذکر جہاد، و انفاق فی سبیل اللہ، و بعض معاملات بیع و شراء، و شہادت بقدر ضرورت بیان فرما کر بشارت و وعدۂ رحمت و مغفرت پر ختم فرما دیا، سبحان اللہ، کیا بلیغ ترتیب ہے، پس چونکہ ان مضامین کا حاصل بِرّ کا بیان ہے اجمالاً و تفصیلاً، اس لئے اگر اس مجموعہ کا لقب ابواب البِرّ رکھا جاوے تو نہایت زیبا ہے، واللہ الموفق۔

خلاصۂ تفسیر

ابوابُ البِر

کچھ سارا کمال اسی میں نہیں (آگیا) کہ تم اپنا منہ مشرق کو کرلو، یا مغرب کو (کرلو) لیکن (اصلی) کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ (کی ذات و صفات پر) یقین رکھے، اور (اسی طرح) قیامت کے دن (آنے) پر (بھی) اور فرشتوں پر (بھی کہ وہ اللہ کے فرمانبردار بندے ہیں، نور سے بنے ہیں، گناہ سے معصوم ہیں، کھانے پینے اور انسانی شہوات سے پاک ہیں) اور (سب) کتب (سماویہ) پر (بھی) اور (سب) پیغمبروں پر (بھی) اور (وہ شخص) مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں (اپنے حاجتمند) رشتہ داروں کو اور (نادار) یتیموں کو (یعنی جن بچوں کو ان کا باپ نابالغ چھوڑ کر مر گیا ہو) اور (دوسرے غریب) محتاجوں کو (بھی) اور (بے خرچ) مسافروں کو اور (لاچاری میں) سوال کرنے والوں کو اور (قیدی اور غلاموں کی) گردن چھڑانے میں (بھی مال خرچ کرتا ہو) اور (وہ شخص) نماز کی پابندی

(بھی) رکھتا ہو اور (مقررہ) زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو اور جو اشخاص (کہ ان عقائد و اعمال کے ساتھ یہ اخلاق بھی رکھتے ہوں کہ) اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب (کسی امر جائز کا) عہد کرلیں اور (اس صفت کو خصوصیت کے ساتھ کہوں گا کہ) وہ لوگ (ان مواقع میں) مستقل (مزاج) رہنے والے ہوں (ایک تو) تنگدستی میں اور (دوسرے) بیماری میں اور (تیسرے معرکۂ) قتال (کفار) میں (یعنی پریشان اور کم ہمت نہ ہوں بس) یہ لوگ ہیں جو سچے (کمال کے ساتھ موصوف) ہیں، اور یہی لوگ ہیں جو (سچے) متقی (کہے جا سکتے) ہیں (غرض اصلی مقاصد اور کمالات دین کے یہ ہیں نماز میں کسی سمت کو منہ کرنا انہی کمالات مذکورہ میں سے ایک کمال خاص یعنی اقامتِ صلوٰۃ کے توابع اور شرائط میں سے ہے، اور اس کے حسن سے اس میں بھی حسن آگیا، ورنہ اگر نماز نہ ہوتی تو کسی خاص سمت کو منہ کرنا بھی عبادت نہ ہوتا)

معارف و مسائل

جب مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کردیا گیا تو یہود و نصاریٰ اور مشرکین جو اسلام اور مسلمانوں میں عیب جوئی کی فکر میں رہتے تھے ان میں بڑا شور و شغب ہوا اور طرح طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام پر اعتراضات کا سلسلہ جاری کردیا، جس کے جوابات پچھلی آیات میں بڑی توضیح و تفصیل کے ساتھ ذکر کئے گئے ہیں۔

ان آیات میں ایک خاص انداز سے اس بحث کو ختم کردیا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ تم نے سارا دین صرف اس بات میں منحصر کردیا ہے کہ نماز میں انسان کا رخ مغرب کی طرف ہو یا مشرق کی مراد اس سے مطلق جہات اور سمتیں ہیں، یعنی تم نے صرف سمت وجہت کو دین کا مقصد بنالیا، اور ساری بحثیں اسی میں دائر ہوگئیں، گویا شریعت کا کوئی اور حکم ہی نہیں ہے۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس آیت کا خطاب یہود و نصاریٰ اور مسلمان سب کیلئے ہو، اور مراد یہ ہو کہ اصل برّ اور ثواب اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ہے وہ جس طرف رُخ کرنے کا حکم دیں، وہی ثواب و صواب ہوجاتا ہے، اپنی ذات کے اعتبار سے مشرق و مغرب یا کوئی جانب وجہت نہ کوئی اہمیت رکھتی ہے، نہ ثواب، بلکہ ثواب دراصل اطاعتِ حکم کا ہے، جس جانب کا بھی حکم ہوجائے، جب تک بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا حکم تھا وہ ثواب تھا، اور جب بیت اللہ کی طرف رُخ کرنے کا ارشاد ہوا تو اب وہی ثواب ہے۔

جیسا کہ بسلسلۂ ربطِ آیات بیان ہوچکا ہے، کہ اس آیت سے سورۂ بقرہ کا ایک نیا باب شروع ہو رہا ہے جس میں مسلمانوں کے لئے تعلیمات و ہدایات اصل ہیں، مخالفین

کے جوابات ضمنی، اسی لئے اس آیت کو احکامِ اسلامیہ کی ایک نہایت جامع آیت کہا گیا ہے۔
اس کے بعد بقرہ کے ختم تک تقریباً اسی آیت کی مزید تشریحات ہیں، اس آیت میں اصولی طور سے تمام احکام شرعیہ، اعتقادات، عبادات، معاملات، اخلاق کا اجمالی ذکر آگیا ہے۔

پہلی چیز اعتقادات ہیں، اس کا ذکر مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ میں مفصل آگیا، دوسری چیز اعمال یعنی عبادات اور معاملات ہیں، ان میں سے عبادات کا ذکر وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ تک آگیا، پھر معاملات کا ذکر وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ سے کیا گیا، پھر اخلاق کا ذکر وَالصّٰبِرِیْنَ سے کیا گیا، آخر میں بتلادیا کہ سچے مومن وہی لوگ ہیں جو ان تمام احکام کی پیروی مکمل کریں اور انہی کو تقوٰی شعار کہا جا سکتا ہے۔

ان احکام کے بیان کرنے میں بہت سے بلیغ اشارات ہیں، مثلاً مال کو خرچ کرنے میں عَلٰی حُبِّہٖ کی قید لگادی، جس میں تین احتمال ہیں، ایک یہ کہ حُبِّہٖ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ مال خرچ کرنے میں کوئی نفسانی غرض نام و نمود کی شامل نہ ہو، بلکہ اخلاص کامل کے ساتھ صرف اللہ جل شانہ کے ساتھ محبت اس خرچ کرنے کا داعیہ ہو۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ ضمیر مال کی طرف راجع ہو تو مراد یہ ہوگی کہ اللہ کی راہ میں وہ مال خرچ کرنا موجب ثواب ہے، جو انسان کو محبوب ہو، بیکار چیزیں جو پھینکنے کی تھیں ان کو دے کر صدقہ کا نام کرنا کوئی صدقہ نہیں، اگرچہ پھینکنے کی نسبت سے بہتر یہی ہے کہ کسی کے کام آسکے، تو اس کو دیدے۔

تیسرا احتمال یہ ہے کہ لفظ اٰتٰی میں جو اس کا مصدر ایتاء مفہوم ہوتا ہے اس کی طرف ضمیر راجع ہو، اور معنی یہ ہوں کہ وہ اپنے خرچ کرنے پر دل سے راضی ہو، یہ نہ ہو کہ خرچ تو کر رہا ہے مگر اندر سے دل دُکھ رہا ہے۔

امام جصاص ؒ نے فرمایا کہ ممکن ہے کہ تینوں ہی چیزیں مراد میں داخل ہوں، پھر اس جگہ مال کے خرچ کرنے کی دو صورتیں مقدم بیان کردیں، جو زکوٰۃ کے علاوہ ہیں، زکوٰۃ کا ذکر اس کے بعد کیا، شاید تقدیم کی وجہ یہ ہو کہ عام طور سے ان حقوق میں غفلت اور کوتاہی برتی جاتی ہے، صرف زکوٰۃ ادا کردینے کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔

مسئلہ: اسی سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ مالی فرض صرف زکوٰۃ سے پورا نہیں ہوتا ہے، زکوٰۃ کے علاوہ بھی بہت جگہ پر مال خرچ کرنا فرض و واجب ہوتا ہے (جصاص، قرطبی)

جیسے رشتہ داروں پر خرچ کرنا کہ جب وہ کمانے سے معذور ہوں تو نفقہ ادا کرنا واجب ہوتا ہے، کوئی مسکین غریب مر رہا ہے اور آپ اپنی زکوٰۃ ادا کرچکے ہیں، مگر اس وقت مال خرچ کر کے اس کی جان بچانا فرض ہے۔

اسی طرح ضرورت کی جگہ مسجد بنانا یا دینی تعلیم کے لئے مدارس و مکاتب بنانا یہ سب فرائض مالی میں داخل ہیں، فرق اتنا ہو کہ زکوٰۃ کا ایک خاص قانون ہے اس کے مطابق ہر حال میں زکوٰۃ کا ادا کرنا ضروری ہے، اور یہ دوسرے مصارف ضرورت و حاجت پر موقوف ہیں، جہاں ضرورت ہو خرچ کرنا فرض ہو جائے گا جہاں نہ ہو فرض نہیں ہوگا۔

فائدہ جن لوگوں پر مال خرچ کرنا ہے، مثلاً ذوی القربیٰ، مساکین، مسافر، سوال کرنیوالے فقیر، ان سب کو تو ایک انداز سے بیان فرمایا، پھر وَفِی الرِّقَابِ میں، حرف فی بڑھا کر اشارہ کر دیا کہ مملوک غلاموں کو مال کا مالک بنانا مقصود نہیں، بلکہ ان کے مالک سے خرید کر ان کے آزاد کرنے پر خرچ کیا جائے، اس کے بعد اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ کا ذکر بھی اسی طریق پر آیا، جیسے دوسری چیزوں کا ذکر ہے، آگے معاملات کا باب بیان کرنا تھا اس میں اسلوب (طریق) بدل کر بجائے صیغہ ماضی استعمال کرنے کے وَالْمُوْفُوْنَ صیغہ اسم فاعل استعمال کیا، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہو کہ اس میں ایفاءِ عہد کی عادت دائمی ہونا چاہئے، اتفاقی طور پر کوئی معاہدہ پورا کر دے تو یہ ہر کافر فاجر بھی کبھی نہ کبھی کرتا ہے، اس کا اعتبار نہیں۔

اسی طرح معاملات کے باب میں صرف ایفائے عہد کا ذکر کیا گیا، کیونکہ اگر غور کیا جائے تو تمام معاملات بیع و شراء، اجارہ، شرکت سب ہی کی روح ایفاءِ معاہدہ ہے۔

اسی طرح آگے اخلاق یعنی اعمالِ باطنہ کا ذکر کرنا تھا، ان میں سے صرف صبر کو بیان کیا گیا، کیونکہ صبر کے معنے ہیں نفس کو قابو میں رکھنے اور برائیوں سے بچانے کے، اگر غور کیا جائے تو تمام اعمالِ باطنہ کی اصل روح صبر ہی ہے، اسی کے ذریعہ اخلاق فاضلہ حاصل کئے جاسکتے ہیں، اور اسی کے ذریعہ اخلاق رذیلہ سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

ایک اور تغیّر اسلوبِ بیان میں یہاں یہ کیا گیا کہ پہلے وَالْمُوْفُوْنَ ذکر کیا تھا یہاں وَالصَّابِرُوْنَ نہیں بلکہ وَالصّٰبِرِیْنَ فرمایا، حضرات مفسّرین نے فرمایا کہ یہ نصب علی المدح ہے، جس کی مراد یہ ہے کہ اس جگہ لفظ مدح مقدر ہو اور صابرین اس کا مفعول ہو، یعنی ان سب نیکوکار لوگوں میں خصوصیت سے قابلِ مدح صابرین ہیں، کیونکہ صبر ہی ایک ایسا ملکہ اور ایسی قوت ہے جس سے تمام اعمالِ مذکورہ میں مدد لی جاسکتی ہے، اس طرح آیتِ مذکورہ میں دین کے تمام شعبوں کے اہم اصول بھی آگئے ہیں، اور بلیغ اشارات سے ہر ایک کی اہمیت کا درجہ بھی معلوم ہوگیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ۭ اَلْحُرُّ

اے ایمان والو فرض ہوا تم پر (قصاص) برابری کرنا مقتولوں میں ، آزاد کے بدلے

بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ۭ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ

آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت پھر جسکو معاف کیا جاوے اس کے بھائی کی طرف سے

فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاۗءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ۭ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ

کچھ بھی تو تابعداری کرنی چاہیئے موافق دستور کے اور ادا کرنا چاہیئے اس کو خوبی کے ساتھ یہ آسانی ہوئی

مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۭ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ

تمہارے رب کی طرف سے اور مہربانی پھر جو زیادتی کرے اس فیصلہ کے بعد تو اس کے لئے ہے عذاب

اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ

دردناک ، اور تمہارے واسطے قصاص میں بڑی زندگی ہے اے عقلمندو ! تاکہ تم

تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

بچتے رہو۔

ربطِ آیات اور خلاصۂ تفسیر

اس سے پہلی آیات کی تفسیر میں آپ معلوم کر چکے ہیں کہ ان آیات میں اجمالی طور پر نیکی اور خوبی کے اصول بتلادیئے گئے ہیں، آگے اُن کی جزئی تفصیلات آئیں گی جن کو ابواب البر کہا جا سکتا ہے، آگے انہی ابواب البر کے کچھ احکام جزئیہ کا بیان ہوتا ہے، جو ضرورت اور حالات و واقعات کے تابع بیان ہوئے ہیں۔

حکمِ اوّل قصاص اے ایمان والو تم پر (قانون) قصاص فرض کیا جاتا ہے، مقتولین (بقتلِ عمد) کے بارے میں (یعنی ہر) آزاد آدمی (قتل کیا جاوے ہر دوسرے) آزاد آدمی کے عوض میں اور (اسی طرح ہر) غلام (دوسرے ہر) غلام کے عوض میں اور (اسی طرح ہر) عورت (دوسری ہر) عورت کے عوض میں (گو یہ قاتلین بڑے درجہ کے اور مقتولین چھوٹے درجہ کے ہوں، جب بھی سب برابر قصاص لیا جاوے گا، یعنی قاتل کو سزا میں قتل کیا جاوے گا) ہاں جس (قاتل) کو اس کے فریق (مقدمہ) کی طرف سے کچھ معافی

ہو جاوے (مگر پوری معاف نہ ہو) تو (اس سے سزائے قتل سے تو بَری ہو گیا، لیکن دیت یعنی خونبہا کے طور پر ایک معین مقدار سے مال بذمہ قاتل واجب ہو جاوے گا، تو اس وقت فریقین کے ذمہ ان دو امر کی رعایت ضروری ہے، مدعی یعنی وارثِ مقتول کے ذمہ تو) معقول طور پر (اس مال کا) مطالبہ کرنا (کہ اس کو زیادہ تنگ نہ کرے) اور (مدعا علیہ یعنی قاتل کے ذمہ) خوبی کے ساتھ (اس مال کا) اس (مدعی) کے پاس پہنچا دینا (کہ مقدار میں کمی نہ کرے، اور خواہ مخواہ ٹالے نہیں) یہ (قانونِ دیت و عفو) تمہارے پروردگار کی طرف سے (سزا میں) تخفیف ہے اور (شاہانہ) ترحم ہے (ورنہ بجز سزائے قتل کے کوئی گنجائش ہی نہ ہوتی) پھر جو شخص اس (قانون) کے (مقرر ہوئے) بعد تعدی کا مرتکب ہو (مثلاً کسی پر جھوٹا یا اشتباہ میں دعویٰ قتل کا کر دے یا معاف کر کے پھر قتل کی پیروی کرے) تو اس شخص کو (آخرت میں) بڑا دردناک عذاب ہو گا، اور فہیم لوگو (اس قانون) قصاص میں تمہاری جانوں کا بڑا بچاؤ ہے (کیونکہ اس قانون کے خوف سے ارتکابِ قتل سے ڈریں گے، تو کئی جانیں بچیں گی) ہم امید کرتے ہیں کہ تم لوگ (ایسے قانونِ امن کی خلاف ورزی سے) پرہیز رکھو گے۔

معارف و مسائل

قصاص کے لفظی معنی مماثلت کے ہیں، مراد یہ ہے کہ جتنا ظلم کسی نے کسی پر کیا اتنا ہی بدلہ لینا دوسرے کے لئے جائز ہے، اس سے زیادتی کرنا جائز نہیں، قرآن مجید کی آیت میں عنقریب اسی سورت میں اس کی زیادہ وضاحت اس طرح آئی ہے: فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (۲: ۱۹۴) اور سورۂ نحل کی آخری آیات میں وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ (۱۶: ۱۲۶) اسی مضمون کے لئے آیا ہے۔

اسی لئے اصطلاح شرع میں قصاص کہا جاتا ہے قتل کرنے اور زخم لگانے کی اس سزا کو جس میں مساوات اور مماثلت کی رعایت کی گئی ہو۔

مسئلہ: قتلِ عمد کہ ارادہ کر کے کسی کو آہنی ہتھیار سے یا ایسی چیز سے جس سے گوشت پوست کٹ کر خون بہہ سکے قتل کیا جاوے، قصاص یعنی جان کے بدلے جان لینا، ایسے ہی قتل کے جرم کے ساتھ مخصوص ہے۔

مسئلہ: ایسے قتل میں جیسے آزاد آدمی آزاد کے عوض میں قتل کیا جاتا ہے ایسے ہی غلام کے عوض میں بھی غلام، اور جس طرح عورت کے عوض میں عورت ماری جاتی ہے، اسی طرح مرد بھی عورت کے مقابلہ میں قتل کیا جاتا ہے۔

آیت میں آزاد کے مقابل آزاد اور عورت کے مقابل عورت کا جو ذکر آیا ہے یہ اُس خاص واقعہ کی بناء پر ہے جس میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

ابن کثیرؒ نے باسناد ابن ابی حاتمؒ نقل کیا ہے کہ زمانۂ اسلام سے کچھ پہلے دو عرب قبیلوں میں جنگ ہوگئی، طرفین کے بہت سے آدمی آزاد اور غلام مرد اور عورتیں قتل ہوگئے، ابھی ان کے معاملہ کا تصفیہ ہونے نہیں پایا تھا کہ زمانۂ اسلام شروع ہوگیا، اور یہ دونوں قبیلے اسلام میں داخل ہوگئے، اسلام لانے کے بعد اپنے اپنے مقتولوں کا قصاص لینے کی گفتگو شروع ہوئی، تو ایک قبیلہ جو قوت و شوکت والا تھا، اس نے کہا کہ ہم اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک ہمارے غلام کے بدلے میں تمہارا آزاد آدمی اور عورت کے بدلے میں مرد قتل نہ کیا جائے۔

قصاص کے متعلق اسلام کا عادلانہ قانون اور قصاص کے مسائل

ان کے جاہلانہ اور ظالمانہ مطالبہ کی تردید کرنے کیلئے یہ آیت نازل ہوئی اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی، جس کا حاصل ان کے مطالبہ کو رَدّ کرنا تھا کہ غلام کے بدلے آزاد کو اور عورت کے بدلے مرد کو قتل کیا جائے اگرچہ وہ قاتل نہ ہو، اسلام نے اپنا عادلانہ قانون یہ نافذ کردیا کہ جس نے قتل کیا ہے وہی قصاص میں قتل کیا جائے، اگر عورت قاتل ہے تو کسی بے گناہ مرد کو اس کے بدلے میں قتل کرنا اسی طرح قاتل اگر غلام ہے تو اس کے بدلے میں کسی بے گناہ آزاد کو قتل کرنا ظلمِ عظیم ہے، جو اسلام میں قطعاً برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آیت کا حاصل اس کے سوا نہیں کہ جس نے قتل کیا ہے وہی قصاص میں قتل کیا جائے گا، عورت ہو یا غلام، قاتل عورت اور غلام کے بجائے بے گناہ مرد یا آزاد کو قتل کرنا جائز نہیں۔

آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عورت کسی مرد کو قتل کردے یا غلام کسی آزاد کو قتل کردے تو اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا، قرآن مجید کی اسی آیت کے شروع میں اَلْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی اس عموم کی واضح دلیل ہے، اور دوسری آیات میں اس سے بھی زیادہ وضاحت ہے، مثلاً اَلنَّفْسُ بِالنَّفْسِ وغیرہ۔

مسئلہ: اگر قتلِ عمد میں قاتل کو پوری معافی دیدی جاوے، مثلاً مقتول کے وارث صرف اس کے دو بیٹے تھے، اور ان دونوں نے اپنا حق معاف کردیا، تو قاتل پر کوئی مطالبہ نہیں رہا، اور اگر پوری معافی نہ ہو مثلاً صورتِ مذکورہ میں دو بیٹوں میں سے ایک نے معاف کیا دوسرے نے معاف نہیں کیا، تو سزائے قصاص سے تو قاتل بری ہوگیا، لیکن معاف

نہ کرنے والے کو نصف دیت (خونبہا) دلایا جاوے گا، اور دیت یعنی خوں بہا شریعت میں سو اونٹ یا ہزار دینار یا دس ہزار درہم ہوتے ہیں، اور درہم آجکل کے مروّجہ وزن کے اعتبار سے تقریباً ساڑھے تین ماشہ چاندی کا ہوتا ہے، تو پوری دیت دو ہزار نو سو سولہ تولے ۸ ماشے چاندی ہوگی، یعنی ۳۶ سیر ۶ ۳ تولے ۸ ماشے۔

مسئلہ: جس طرح ناتمام معافی سے مال واجب ہو جاتا ہے اسی طرح اگر باہم کسی قدر مال پر مصالحت ہو جائے تب بھی قصاص ساقط ہو کر مال واجب ہو جاتا ہے، لیکن اس میں کچھ شرائط ہیں جو کتبِ فقہ میں مذکور ہیں۔

مسئلہ: مقتول کے جتنے شرعی وارث ہیں وہی قصاص اور دیت کے مالک بقدر اپنے حصۂ میراث کے ہوں گے، اگر دیت یعنی خوں بہا لیا گیا تو مال ان وارثوں میں بحسبِ وراثت تقسیم ہوگا، اور قصاص کا فیصلہ ہوا تو قصاص کا حق بھی سب میں مشترک ہوگا، مگر چونکہ قصاص ناقابلِ تقسیم ہے، اس لئے کوئی ادنیٰ درجہ کا حق رکھنے والا بھی اپنا حق قصاص معاف کردیگا تو دوسرے وارثوں کا حقِ قصاص بھی معاف ہو جائے گا، ہاں انکو دیت (خونبہا) کی رقم حسبِ حصّہ ملے گی۔

مسئلہ: قصاص لینے کا حق اگرچہ اولیاءِ مقتول کا ہے، مگر باجماعِ امت ان کو اپنا یہ حق خود وصول کرنے کا اختیار نہیں، کہ خود ہی قاتل کو مار ڈالیں بلکہ اس حق کے حاصل کرنے کے لئے حکمِ سلطانِ مسلم یا اس کے کسی نائب کا ضروری ہے، کیونکہ قصاص کس صورت میں واجب ہوتا ہے کس میں نہیں اس کی جزئیات بھی دقیق ہیں جن کو ہر شخص معلوم نہیں کرسکتا، اس کے علاوہ اولیاءِ مقتول اپنے غصّہ میں مغلوب ہو کر کوئی زیادتی بھی کرسکتے ہیں، اس لئے باتفاقِ علماءِ امت حقِ قصاص حاصل کرنے کے لئے اسلامی حکومت کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے (قرطبی)

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖۚ الْوَصِيَّةُ

فرض کیا گیا تم پر جب حاضر ہو کسی کو تم میں موت بشرطیکہ چھوڑے کچھ مال

الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى

وصیت کرنا ماں باپ کے واسطے اور رشتہ داروں کے لئے انصاف کے ساتھ یہ حکم لازم ہے

الْمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى

پرہیزگاروں پر، پھر جو کوئی بدل ڈالے وصیت کو بعد اس کے کہ جو سن چکا تو اس کا گناہ انہی پر

الَّذِیْنَ یُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۱۸۱﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ

ہے جنھوں نے اس کو بدلا بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے ، پھر جو کوئی خوف کرے وصیت کرنے

جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَیْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

والے سے طرفداری کا یا گناہ کا پھر ان میں باہم صلح کرادے تو اس پر کچھ گناہ نہیں بیشک اللہ

غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۸۲﴾ ع ۲۲ ۶

بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہے

ربطِ آیات و خلاصۂ تفسیر

حکم دوم از ابوابُ البرّ "وصیت"

وصیت ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کے کرنے کا حکم دیا جائے خواہ زندگی میں یا بعد الموت، لیکن عرف میں اس کام کو کہا جاتا ہے جس کے کرنے کا حکم بعد الموت ہو۔

خیر، لفظ خیر کے بہت سے معانی میں سے ایک معنی مال کے بھی آتے ہیں، جیسے قرآن میں ہے، وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ (۱۰۰: ۸)، اس جگہ باتفاقِ مفسرین خیر سے مراد مال ہے۔

شروع اسلام میں جب تک میراث کے حصے شرع سے مقرر نہ ہوئے تھے، یہ حکم تھا کہ ترکہ کے ایک ثلث میں مرنے والا اپنے والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے لئے جتنا جتنا مناسب سمجھے وصیت کر دے، اتنا تو ان لوگوں کو حق تھا، باقی جو کچھ رہتا وہ سب اولاد کا حق ہوتا تھا، اس آیت میں یہ حکم مذکور ہے یعنی :-

تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب کسی کو (آثار سے) موت نزدیک معلوم ہونے لگے بشرطیکہ کچھ مال بھی ترکہ میں چھوڑا ہو تو (اپنے) والدین اور (دیگر) اقارب کے لئے معقول طور پر (کہ مجموعہ ایک ثلث سے زیادہ نہ ہو) کچھ کچھ بتلا جاوے (اس کا نام وصیت ہے) جن کو خدا کا خوف ہے ان کے ذمہ یہ ضروری (کیا جاتا ہے، پھر (جن لوگوں نے اس وصیت کو سنا ہے ان میں سے) جو شخص (بھی) سن لینے کے بعد اس (کے مضمون) کو تبدیل کرے گا (اور باہمی تقسیم و فیصلہ کے وقت غلط اظہار دے گا، اور اس کے موافق فیصلہ ہونے سے کسی کا حق تلف ہو جاویگا) تو اس (حق تلفی) کا گناہ انہی لوگوں کو ہوگا جو اس (مضمون) کو تبدیل کریں گے (حاکم عدالت یا ثالث کو یا مرنے والے کو گناہ نہ ہوگا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ تو یقیناً سنتے جانتے ہیں (تو تبدیل کرنے والے کے اظہار بھی سنتے ہیں اور حاکم کا بے خبر اور معذور ہونا بھی جانتے ہیں) ہاں (ایک طرح کی

تبدیل کی اجازت بھی ہے وہ یہ کہ) جس شخص کو وصیت کرنے والے کی جانب سے (وصیت کے بارے میں) کسی غلطی کی یا (قصداً قانون وصیت کے کسی دفعہ کی خلاف ورزی کے) کسی جرم کے ارتکاب کی تحقیق ہوئی ہو (اور اس بے ضابطہ وصیت کی وجہ سے اس میت کے پسماندہ مستحقان ترکہ و مستحقانِ مالِ وصیت میں نزاع کا خطرہ یا وقوع معلوم ہو) پھر یہ شخص ان میں باہم مصالحت کرا دے (گو وہ مصالحت اس مضمون وصیت کے خلاف ہو جو ظاہراً تبدیلِ وصیت ہی) تو اس شخص پر کوئی (بار) گناہ نہیں ہے (اور) واقعی اللہ تعالیٰ تو (خود گناہوں کے) معاف فرمانے والے ہیں اور (گنہگاروں پر) رحم کرنے والے ہیں (اور اس شخص نے تو کوئی گناہ نہیں کیا کیونکہ وصیت میں تبدیلی اصلاح کے لئے کی ہے، تو اس پر کیوں نہ رحمت ہوگی)

معارف و مسائل

اس آیت میں جو وصیت کرنا اس مرنے والے پر فرض کیا ہے جو کچھ مال چھوڑ کر مر رہا ہو اس حکم کے تین جزء ہیں، ایک یہ کہ مرنے والے کے ترکہ میں اولاد کے سوا کسی دوسرے وارث کے حصے مقرر نہیں ہیں، اُن کے حصوں کا تعین مرنے والے کی وصیت کی بنیاد پر ہوگا۔

دوسرے یہ کہ ایسے اقارب کے لئے وصیت کرنا مرنے والے پر فرض ہے۔

تیسرے یہ کہ ایک تہائی مال سے زیادہ کی وصیت جائز نہیں۔

ان تین احکام میں سے پہلا حکم تو اکثر صحابہؓ و تابعینؒ کے نزدیک آیتِ میراث سے منسوخ ہوگیا، ابن کثیر نے بتصحیح حاکم وغیرہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ اس حکم کو آیتِ میراث نے منسوخ کر دیا، یعنی: لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا (۴: ۷)

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ایک دوسری روایت میں اس کی یہ تفصیل ہے کہ آیت میراث نے ان لوگوں کی وصیت کو منسوخ کر دیا جن کا میراث میں حصہ مقرر ہے، دوسرے رشتہ دار جن کا میراث میں حصہ نہیں، اُن کے لئے حکمِ وصیت اب بھی باقی ہے (جصاص، قرطبی)

لیکن باجماعِ امت یہ ظاہر ہے کہ جن رشتہ داروں کا میراث میں کوئی حصہ مقرر نہیں، اُن کے لئے میت پر وصیت کرنا کوئی فرض و لازم نہیں، اس لئے فرضیتِ وصیت اُن کے حق میں بھی منسوخ ہی ہوگی (جصاص، قرطبی) یعنی بشرطِ ضرورت صرف مستحب رہ جائے گی۔

دوسرا حکم وصیت کا فرض ہونا یہ بھی باجماعِ امت منسوخ ہے، اور ناسخ اس کا وہ حدیث متواتر ہے جس کا اعلان رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع

کے خطبہ میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہؓ کے سامنے فرمایا:-

اِنَّ اللّٰہَ اَعْطٰی لِکُلِّ ذِی حَقٍّ حَقَّہٗ فَلَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ، اخرجہ الترمذی وقال ھذا حدیث حسن صحیح	"اللہ تعالیٰ نے ہر ایک حق والے کو اس کا حق خود دیدیا ہے، اس لئے اب کسی وارث کے لئے وصیت جائز نہیں"

اسی حدیث میں بروایت ابن عباسؓ یہ الفاظ بھی منقول ہیں:

لَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ اِلَّا اَنْ تُجِیْزَہُ الْوَرَثَۃُ (جصاص)	"کسی وارث کے لئے وصیت اس وقت تک جائز نہیں جب تک باقی سب وارث اجازت نہ دیدیں"

اس لئے حاصل اس حدیث کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وارثوں کے حصّے خود مقرر فرما دیئے ہیں، اس لئے اسے وصیت کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ وارث کے حق میں وصیت کرنے کی اجازت بھی نہیں، ہاں اگر دوسرے ورثہ اس وصیت کی اجازت دیدیں تو جائز ہے۔

امام جصاص نے فرمایا کہ یہ حدیث ایک جماعت صحابہؓ سے منقول ہے، اور فقہاء امت نے باتفاق اس کو قبول کیا ہے، اس لئے بحکم متواتر ہے، جس سے آیتِ قرآن کا نسخ جائز ہے۔

اور امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ بات علماء امت میں متفق علیہ ہے کہ جب کوئی حکم رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی یقینی طور پر معلوم ہوجائے جیسے خبر متواتر، مشہور وغیرہ میں ہوتا ہے، تو وہ بالکل بحکم قرآن ہے، اور وہ بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کا فرمان ہے، اس لئے ایسی حدیث سے کسی آیتِ قرآن کا منسوخ ہوجانا کوئی محلِ شبہ نہیں، پھر فرمایا کہ اگرچہ یہ حدیث ہم تک خبر واحد ہی کے طریق پر پہونچی ہو، مگر اس کے ساتھ حجۃ الوداع کے سب سے بڑے اجتماع میں ایک لاکھ سے زائد صحابہؓ کے سامنے اس کا اعلان فرمانا اور اس پر اجماعِ صحابہؓ اور اجماعِ امت نے یہ واضح کردیا کہ یہ حدیث اُن حضرات کے نزدیک قطعی الثبوت ہے، ورنہ شک و شبہ کی گنجائش ہوتے ہوئے اس کی وجہ سے آیتِ قرآن کے حکم کو چھوڑ کر اس پر اجماع نہ کرتے۔

تیسرا حکم، وصیت ایک تہائی مال سے زیادہ کی جائز نہیں	یہ باتفاقِ امت اب بھی باقی ہے، ہاں وارثوں کی اجازت سے ایک تہائی سے زائد کی بلکہ پورے مال کی بھی وصیت جائز اور قابلِ قبول ہے۔

مسئلہ: تفصیل مذکور سے یہ واضح ہو چکا کہ اب جن رشتہ داروں کے حصے قرآن کریم نے خود مقرر کر دیئے ہیں اُن کے لئے اب وصیت واجب نہیں، بلکہ بدون اجازت دوسرے وارثوں کے جائز بھی نہیں، البتہ جو رشتہ دار شرعی وارث نہیں ان کے لئے وصیت کرنے کی اجازت ایک تہائی مال تک ہے۔

مسئلہ: اس آیت میں ذکر ایک خاص وصیت کا تھا، جو مرنے والا اپنے متروکہ مال کے متعلق کرتا تھا، جو منسوخ ہو گیا، لیکن جس شخص کے ذمّے دوسرے لوگوں کے حقوق واجب ہوں یا اس کے پاس کسی کی امانت رکھی ہو اُس پر اُن تمام چیزوں کی ادائیگی کے لئے وصیت واجب ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ جس شخص کے ذمہ کچھ لوگوں کے حقوق ہوں اس پر تین راتیں ایسی نہ گذرنی چاہئیں کہ اس کی وصیت لکھی ہوئی اس کے پاس موجود نہ ہو۔

مسئلہ: آدمی کو جو ایک تہائی مال میں وصیت کرنے کا حق دیا گیا ہے اپنی زندگی میں اس کو یہ بھی حق رہتا ہے کہ اس وصیت میں کچھ تبدیلی کر دے یا بالکل ختم کر دے (جصاص)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى

اے ایمان والو فرض کیا گیا تم پر روزہ جیسے فرض کیا گیا تھا تم سے

الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۸۳﴾ أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ

اگلوں پر تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ، چند روز ہیں گنتی کے

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ

پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا مسافر تو اُن پر ان کی گنتی ہے اور دنوں سے

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ

اور جن کو طاقت ہے روزہ کی اُن کے ذمہ بدلہ ہے ایک فقیر کا کھانا، پھر جو کوئی خوشی سے کرے

خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ

نیکی تو اچھا ہے اس کے واسطے اور روزہ رکھو تو بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم

تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۴﴾

سمجھ رکھتے ہو۔

خلاصۂ تفسیر

حکمِ سوم صوم اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے (امتوں کے) لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، اس توقع پر کہ تم (روزہ کی بدولت رفتہ رفتہ) متقی بن جاؤ (کیونکہ روزہ رکھنے سے عادت پڑے گی نفس کو اس کے متعدد تقاضوں سے روکنے کی اور اسی عادت کی پختگی بنیاد ہے تقوٰی کی سو) تھوڑے دنوں روزہ رکھ لیا کرو (ان تھوڑے دنوں سے مراد رمضان ہے، جیسا اگلی آیت میں آتا ہے) پھر (اس میں بھی اتنی آسانی ہے کہ) جو شخص تم میں (ایسا) بیمار ہو (جس کو روزہ رکھنا مشکل یا مضر ہو) یا (شرعی) سفر میں ہو تو (اس کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے، اور بجائے رمضان کے) دوسرے ایام کا (اتناہی) شمار (کر کے ان میں روزہ) رکھنا (اس پر واجب) ہے، اور (دوسری آسانی جو بعد میں منسوخ ہوگئی یہ کہ) جو لوگ روزے کی طاقت رکھتے ہوں (اور پھر روزہ رکھنے کو دل نہ چاہے تو) اُن کے ذمہ (صرف روزے کا) فدیہ (یعنی بدلہ) ہے کہ وہ ایک غریب کا کھانا (کھلادینا یا دیدینا) ہے، اور جو شخص خوشی سے (زیادہ) خیر (خیرات) کرے (کہ زیادہ فدیہ دیدے) تو یہ اس شخص کے لئے اور بہتر ہے، اور (گو ہم نے آسانی کے لئے ان حالتوں میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت دیدی ہے لیکن) تمہارا روزہ رکھنا (اس حالت میں بھی) زیادہ بہتر ہے اگر تم (کچھ روزے کی فضیلت کی) خبر رکھتے ہو۔

معارف و مسائل

صوم کے لفظی معنی امساک یعنی رُکنے اور بچنے کے ہیں، اور اصطلاحِ شرع میں کھانے پینے اور عورت سے مباشرت کرنے سے رُکنے اور باز رہنے کا نام صوم ہے، بشرطیکہ وہ طلوعِ صبح صادق سے لے کر غروبِ آفتاب تک مسلسل رُکا رہے، اور نیت روزہ کی بھی ہو، اس لئے اگر غروبِ آفتاب سے ایک منٹ پہلے بھی کچھ کھا پی لیا تو روزہ نہیں ہوا، اسی طرح اگر ان تمام چیزوں سے پرہیز تو پورے دن پوری احتیاط سے کیا، مگر نیت روزہ کی نہیں کی تو بھی روزہ نہیں ہوا۔

صوم یعنی روزہ اُن عبادات میں سے ہے جن کو اسلام کے عمود اور شعائر قرار دیا گیا ہے، اس کے فضائل بے شمار ہیں، جن کے تفصیلی بیان کا یہ موقع نہیں۔

پچھلی اُمتوں میں روزہ کا حکم روزے کی فرضیت کا حکم مسلمانوں کو ایک خاص مثال سے دیا گیا ہے، حکم کے ساتھ یہ بھی ذکر فرمایا کہ یہ روزے کی

فرضیت کچھ تمہارے ساتھ خاص نہیں، پچھلی امتوں پر بھی روزے فرض کئے گئے تھے، اس سے روزے کی خاص اہمیت بھی معلوم ہوئی، اور مسلمانوں کی دلجوئی کا بھی انتظام کیا گیا کہ روزہ اگرچہ مشقت کی چیز ہے، مگر یہ مشقت تم سے پہلے بھی سب لوگ اٹھاتے آئے ہیں، طبعی بات ہے کہ مشقت میں بہت سے لوگ مبتلا ہوں تو وہ ہلکی معلوم ہونے لگتی ہے (روح المعانی)

قرآن کریم کے الفاظ اَلَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ عام ہیں، حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک کی تمام شریعتوں اور امتوں کو شامل ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح نماز کی عبادت سے کوئی شریعت اور کوئی امت خالی نہیں رہی اسی طرح روزہ بھی ہر شریعت میں فرض رہا ہے۔

جن حضرات نے فرمایا ہے کہ مِنْ قَبْلِکُمْ سے اس جگہ نصاریٰ مراد ہیں وہ بطور ایک مثال کے ہے، اس سے دوسری امتوں کی نفی نہیں ہوتی (روح)

آیت میں صرف اتنا بتلایا گیا ہے کہ روزے جس طرح مسلمانوں پر فرض کئے گئے پچھلی امتوں میں بھی فرض کئے گئے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پچھلی امتوں کے روزے تمام حالات و صفات میں مسلمانوں ہی کے روزوں کے برابر ہوں، مثلاً روزوں کی تعداد، روزوں کے اوقات کی تحدید، اور یہ کہ کن ایام میں رکھے جائیں، ان امور میں اختلاف ہو سکتا ہے، چنانچہ واقعہ بھی ایسا ہی ہوا، کہ تعداد میں بھی کمی بیشی ہوتی رہی، اور روزے کے ایام اور اوقات میں فرق ہوتا رہا ہے (روح)

لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ میں اشارہ ہے کہ تقویٰ کی قوت حاصل کرنے میں روزہ کو بڑا دخل ہے، کیونکہ روزہ سے اپنی خواہشات کو قابو میں رکھنے کا ایک ملکہ پیدا ہوتا ہے، وہی تقوے کی بنیاد ہے۔

مریض کا روزہ فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَّرِیْضًا، مریض سے مراد وہ مریض ہے جس کو روزہ رکھنے سے ناقابل برداشت تکلیف پہنچے، یا مرض بڑھ جانے کا قوی اندیشہ ہو، بعد کی آیت وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ میں اس طرف اشارہ موجود ہے، جمہور فقہاء امت کا یہی مسلک ہے۔

مسافر کا روزہ اَوْ عَلٰی سَفَرٍ یہاں لفظ مسافر کے بجائے عَلٰی سَفَرٍ کا لفظ اختیار فرما کر کئی اہم مسائل کی طرف اشارہ فرما دیا:

اوّل یہ کہ مطلقاً لغوی سفر یعنی اپنے گھر اور وطن سے باہر نکل جانا روزہ میں رخصتِ سفر کے لئے کافی نہیں، بلکہ سفر کچھ طویل ہونا چاہئے، کیونکہ لفظ عَلٰی سَفَرٍ کا مفہوم یہ ہے کہ

وہ سفر پر سوار ہو، جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ گھر سے دس پانچ میل چلے جانا مراد نہیں، مگر یہ تحدید کہ سفر کتنا طویل ہو قرآن کے الفاظ میں مذکور نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور صحابہؓ کے تعامل سے امام اعظم ابوحنیفہؒ اور بہت سے فقہاء نے اس کی مقدار تین منزل یعنی وہ مسافت جس کو پیادہ سفر کرنے والا بآسانی تین روز میں طے کر سکے، قرار دی ہے، اور بعد کے فقہاء نے میلوں کے حساب سے اڑتالیس میل لکھے ہیں۔

دوسرا مسئلہ اسی لفظ عَلٰی سَفَرٍ سے یہ نکلا کہ وطن سے نکل جانے والا مسافر اسی وقت تک رخصتِ سفر کا مستحق ہے جب تک اس کے سفر کا سلسلہ جاری رہے، اور یہ ظاہر ہے کہ آرام کرنے یا کچھ کام کرنے کے لئے کسی جگہ ٹھہر جانا مطلقاً اس کے سلسلۂ سفر کو ختم نہیں کر دیتا، جب تک کوئی معتدبہ مقدارِ قیام نہ ہو، اور اسی معتدبہ قیام کی مدت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے ثابت ہوئی کہ پندرہ دن ہیں، جو شخص کسی ایک مقام پر پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کرے تو وہ عَلٰی سَفَرٍ نہیں کہلاتا، اس لئے وہ رخصتِ سفر کا بھی مستحق نہیں۔

مسئلہ: اسی سے یہ بھی نکل آیا کہ کوئی شخص پندرہ دن کے قیام کی نیت ایک جگہ نہیں بلکہ متفرق مقامات شہروں اور بستیوں میں کرے تو وہ بدستور مسافر کے حکم میں رہ کر رخصتِ سفر کا مستحق رہے گا، کیونکہ وہ عَلٰی سَفَرٍ کی حالت میں ہے۔

روزہ کی قضا

فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ، یعنی مریض و مسافر کو اپنے فوت شدہ روزوں کی گنتی کے مطابق دوسرے دنوں میں روزے رکھنا واجب ہے، اس میں بتلانا تو یہ منظور تھا کہ مرض یا سفر کی مجبوری سے جو روزے چھوڑے گئے ہیں ان کی قضا ان لوگوں پر واجب ہے جس کے لئے فَعَلَيْهِ الْقَضَاءُ کا مختصر جملہ بھی کافی تھا، مگر اس کے بجائے فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ فرما کر اشارہ کر دیا گیا کہ مریض و مسافر پر فوت شدہ روزوں کی قضا صرف اس صورت میں واجب ہو گی، جب کہ مریض صحت کے بعد اور مسافر مقیم ہونے کے بعد اتنے دنوں کی مہلت پائے، جنھیں قضا کر سکے، تو اگر کوئی شخص اتنے دن سے پہلے ہی مر گیا تو اس پر قضا، یا وصیتِ فدیہ لازم نہیں ہو گی۔

مسئلہ: عِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ، میں چونکہ اس کی کوئی قید نہیں کہ ترتیب وار رکھے، یا غیر مسلسل رکھے، بلکہ عام اختیار ہے، اس لئے اگر کوئی شخص جس کے رمضان کے ابتدائی دس روزے قضا ہو گئے ہوں وہ دسویں یا نویں روزے کی قضا پہلے کرے اور ابتدائی روزوں کی قضا بعد میں تو اس میں بھی مضائقہ نہیں، اسی طرح متفرق کر کے قضا روزے رکھے، تو یہ بھی جائز ہے کیونکہ عِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ، میں اس کی گنجائش ہے۔

روزہ کا فدیہ

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ ، اس آیت کے بے تکلف معنی وہی ہیں جو خلاصۂ تفسیر میں بتلائے گئے ہیں، کہ جو لوگ مریض یا مسافر کی طرح روزہ رکھنے سے مجبور نہیں بلکہ روزے کی طاقت تو رکھتے ہیں، مگر کسی وجہ سے دل نہیں چاہتا تو ان کے لئے بھی یہ گنجائش ہے کہ وہ روزے کے بجائے روزے کا فدیہ بصورت صدقہ ادا کر دیں، اسکے ساتھ اتنا فرما دیا وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ، یعنی تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ روزہ ہی رکھو۔

یہ حکم شروع اسلام میں تھا جب لوگوں کو روزے کا خوگر کرنا مقصود تھا، اس کے بعد جو آیت آنے والی ہے یعنی مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ، اس سے یہ حکم عام لوگوں کے حق میں منسوخ کر دیا گیا، صرف ایسے لوگوں کے حق میں اب بھی باجماعِ امت باقی رہ گیا جو بہت بوڑھے ہوں (جصاص) یا ایسے بیمار ہوں کہ اب صحت کی امید ہی نہیں رہی، جمہور صحابہؓ وتابعینؒ کا یہی قول ہے (جصاص، مظہری)

صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد، نسائی، ترمذی، طبرانی وغیرہ تمام ائمہ حدیثؒ نے حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ نازل ہوئی تو ہمیں اختیار دیدیا گیا تھا کہ جس کا جی چاہے روزے رکھے جس کا جی چاہے ہر روزے کا فدیہ دیدے، پھر جب دوسری آیت مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ نازل ہوئی تو یہ اختیار ختم ہو کر طاقت والوں پر صرف روزہ ہی رکھنا لازم ہو گیا۔

مسند احمد میں حضرت معاذ بن جبلؓ کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ نماز کے معاملات میں بھی ابتدائے اسلام میں تین تغیرات ہوئے اور روزے کے معاملہ میں بھی تین تبدیلیاں ہوئیں، روزے کی تین تبدیلیاں یہ ہیں کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینۂ طیبہ میں تشریف لائے تو ہر مہینہ میں تین روزے اور ایک روزہ یومِ عاشورا (یعنی دسویں محرم) کا رکھتے تھے، پھر رمضان کی فرضیت نازل ہوگئی، كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ تو حکم یہ تھا کہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ روزہ رکھ لے یا فدیہ دیدے: اور روزہ رکھنا بہتر اور افضل ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ نازل فرمادی، اس آیت نے تندرست قوی کے لئے یہ اختیار ختم کر کے صرف روزہ رکھنا لازم کر دیا، مگر بہت بوڑھے آدمی کے لئے یہ حکم باقی رہا کہ وہ چاہے تو فدیہ ادا کر دے۔

یہ تو دو تبدیلیاں ہوئیں، تیسری تبدیلی یہ ہوئی کہ شروع میں افطار کے بعد کھانے پینے اور اپنی خواہش پورا کرنے کی اجازت صرف اس وقت تک تھی جب تک آدمی سوئے نہیں، جب سو گیا تو دوسرا روزہ شروع ہو گیا، کھانا پینا وغیرہ ممنوع ہو گیا، پھر اللہ تعالیٰ نے آیت

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ الآیۃ نازل فرما کر یہ آسانی عطا فرمادی کہ اگلے دن کی صبح صادق تک کھانا پینا وغیرہ سب جائز ہیں، سو کر اُٹھنے کے بعد سحری کھانے کو سنت قرار دیدیا گیا، صحیح بخاری، مسلم، ابوداؤد میں بھی اس مضمون کی احادیث آئی ہیں (ابن کثیر)

فدیہ کی مقدار اور متعلقہ مسائل

ایک روزہ کا فدیہ نصف صاع گندم یا اس کی قیمت ہے، نصف صاع ہمارے مروّجہ سیر اسّی تولہ کے حساب سے تقریباً پونے دو سیر ہوتے ہیں، اس کی بازاری قیمت معلوم کرکے کسی غریب مسکین کو مالکانہ طور پر دیدینا ایک روزہ کا فدیہ ہے، بشرطیکہ کسی مسجد مدرسہ کی خدمت کے معاوضہ میں نہ ہو۔

مسئلہ: ایک روزہ کے فدیہ کو دو آدمیوں میں تقسیم کرنا یا چند روزوں کے فدیہ کو ایک ہی شخص کو ایک تاریخ میں دینا درست نہیں، جیساکہ شامی نے بحوالہ بحر از قنیہ نقل کیا ہے اور بیان القرآن میں اسی کو نقل کیا گیا ہے، مگر حضرتؒ نے امداد الفتاویٰ میں فتویٰ اس پر نقل کیا ہے کہ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں، شامی نے بھی فتویٰ اس پر نقل کیا ہے، البتہ امداد الفتاویٰ میں ہے کہ احتیاط اس میں ہے کہ کئی روزوں کا فدیہ ایک تاریخ میں ایک کو نہ دے، لیکن دیدینے میں گنجائش بھی ہے، یہ فتویٰ مورخہ ۱۶ جمادی الاخریٰ ۱۳۵۳ھ امداد الفتاویٰ جلد دوم صفحہ ۱۵۰ میں منقول ہے

مسئلہ: اگر کسی کو فدیہ ادا کرنے کی بھی وسعت نہ ہو تو وہ فقط استغفار کرے اور دل میں نیت رکھے کہ جب ہو سکے گا ادا کردوں گا (بیان القرآن)

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَ

مہینہ رمضان کا ہے جس میں نازل ہوا قرآن ہدایت ہے واسطے لوگوں کے

بَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ

اور دلیلیں روشن راہ پانے کی اور حق کو باطل سے جُدا کرنے کی، سو جو کوئی پائے تم میں سے اس مہینہ کو

فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ

تو ضرور روزے رکھے اس کے اور جو کوئی ہو بیمار یا مسافر تو اس کی گنتی پوری کرنی چاہئے اور دنوں سے

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ

اللہ چاہتا ہے تم پر آسانی اور نہیں چاہتا تم پر دشواری اور اس واسطے کہ تم پوری کرو گنتی

وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿١٨٥﴾

اور تاکہ بڑائی کرو اللہ کی اس بات پر کہ تم کو ہدایت کی اور تاکہ تم احسان مانو۔

خلاصۂ تفسیر اور ربطِ آیات

تعیینِ ایامِ صیام اوپر ارشاد ہوا تھا کہ تھوڑے روزہ رکھ لیا کرو، آگے ان تھوڑے دنوں کا بیان ہے:

(وہ تھوڑے ایام جن میں روزے کا حکم ہوا ہے) ماہ رمضان ہے جس میں (ایسی برکت ہے کہ اس کے ایک خاص حصہ یعنی شب قدر میں) قرآن مجید (لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر) بھیجا گیا ہے، جس کا (ایک) وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے (ذریعۂ) ہدایت ہے، اور (دوسرا وصف یہ ہے کہ ہدایت کے طریقے بتلانے میں اس کا جزو جزو) واضح الدلالۃ ہے، (اور ان دونوں وصفوں میں منجملہ ان کتب (سماویہ) کے (ہے) جو کہ (انہی دو وصفوں سے موصوف ہیں یعنی ذریعۂ) ہدایت (بھی) ہیں اور (وضوحِ دلالت کی وجہ سے حق و باطل کے درمیان) فیصلہ کرنے والی (بھی) ہیں، سو جو شخص اس ماہ میں موجود ہو اس کو ضرور اس میں روزہ رکھنا چاہئے (اور وہ فدیہ کی اجازت جو اوپر مذکور تھی منسوخ و موقوف ہوئی) اور (مریض اور مسافر کے لئے جو اوپر قانون تھا وہ البتہ اب بھی اسی طرح باقی ہے کہ) جو شخص (ایسا) بیمار ہو (جس میں روزہ رکھنا مشکل یا مضر ہو) یا (شرعی) سفر میں ہو تو (اس کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے اور بجائے ایامِ رمضان کے) دوسرے ایام کا (اتنا ہی) شمار (کرکے ان میں روزہ) رکھنا (اس پر واجب ہے) اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ (احکام میں) آسانی (کی رعایت) کرنا منظور ہے (اس لئے ایسے احکام مقرر کئے جن کو تم آسانی سے بجا لاسکو، چنانچہ سفر اور مرض میں کیسا آسان قانون مقرر کر دیا) اور تمہارے ساتھ (احکام و قوانین مقرر کرنے میں) دشواری منظور نہیں (کہ سخت احکام تجویز کر دیتے) اور (یہ احکام مذکورہ ہم نے خاص خاص مصلحتوں سے مقرر کئے، چنانچہ اولاً روزہ ادا رکھنے کا اور کسی شرعی عذر سے رہ جاوے تو دوسرے ایام میں قضا کرنے کا حکم تو اسی لئے کیا) تاکہ تم لوگ (ایامِ ادا یا قضا کی) شمار کی تکمیل کر لیا کرو، (تاکہ ثواب میں کمی نہ رہے) اور (خود قضا رکھنے کا حکم اس لئے کیا) تاکہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی بزرگی (اور ثنا) بیان کیا کرو اس پر کہ تم کو (ایک ایسا) طریقہ بتلا دیا (جس سے تم برکات و ثمرات صیام سے محروم نہ رہو، ورنہ اگر قضا واجب نہ ہوتی تو کون اتنے روزے رکھ کر ثواب حاصل کرتا) اور (عذر سے خاص رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت اس لئے دیدی) تاکہ تم لوگ (اس نعمتِ آسانی پر اللہ تعالیٰ کا) شکر ادا کیا کرو (ورنہ اگر یہ اجازت نہ ہوتی تو سخت مشقت ہو جاتی)

معارف و مسائل

اس آیت میں پچھلی مجمل آیت کا بیان بھی ہے اور ماہ رمضان کی اعلیٰ فضیلت کا ذکر بھی، بیان اس لئے کہ پچھلی آیات میں اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ کا لفظ مجمل ہے، جس کی شرح اس آیت نے کردی کہ وہ پورے ماہِ رمضان کے ایام ہیں، اور فضیلت یہ بیان کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس مہینہ کو اپنی وحی اور آسمانی کتابیں نازل کرنے کے لئے منتخب کر رکھا ہے، چنانچہ قرآن بھی اسی ماہ میں نازل ہوا، مسند احمد میں حضرت واثلہ بن اسقعؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے رمضان کی پہلی تاریخ میں نازل ہوئے، اور تورات چھ رمضان میں، انجیل تیرہ رمضان اور قرآن چوبیس رمضان میں نازل ہوا، اور حضرت جابرؓ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ زبور بارہ رمضان میں، انجیل اٹھارہ رمضان میں نازل ہوئی (ابن کثیر)

حدیثِ مذکور میں پچھلی کتابوں کا نزول جس تاریخ میں ذکر کیا گیا ہے اسی تاریخ میں وہ کتابیں پوری کی پوری انبیاء پر نازل کردی گئی ہیں، قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ رمضان کی ایک رات میں پورا کا پورا لوحِ محفوظ سے سماءِ دنیا پر نازل کردیا گیا، مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کا نزول تیئیس سال میں رفتہ رفتہ ہوا۔

رمضان کی وہ رات جس میں قرآن نازل ہوا قرآن ہی کی تصریح کے مطابق شبِ قدر تھی اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ، مذکورالصدر حدیث میں اس کو ۲۴ رمضان کی شب بتلایا ہے، اور حضرت حسنؒ کے نزدیک چوبیسویں شب شبِ قدر ہوتی ہے، اس طرح یہ حدیث آیتِ قرآن کے مطابق ہوجاتی ہے، اور اگر یہ مطابقت نہ تسلیم کی جائے تو بہرحال قرآن کریم کی تصریح سب پر مقدم ہے جو رات بھی شب قدر ہو وہی اس کی مراد ہوگی۔

مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ۔ اس ایک جملہ میں روزے کے متعلق بہت سے احکام و مسائل کی طرف اشارات ہیں، لفظ شَهِدَ شہود سے بنا ہے، جس کے معنی حضور یعنی حاضر و موجود ہونے کے ہیں، اور الشہر، عربی لغت میں مہینہ کے معنی میں آتا ہے، مراد اس سے مہینہ رمضان کا ہے، جس کا ذکر اوپر آیا ہے، اس لئے معنی اس جملے کے یہ ہوگئے کہ تم میں سے جو شخص ماہ رمضان میں حاضر یعنی موجود ہو اس پر لازم ہے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے،

روزہ کے بجائے فدیہ دینے کا عام اختیار جو اس سے پہلی آیت میں مذکور ہے اس جملے نے منسوخ کر کے روزہ ہی رکھنا لازم کر دیا ہے۔

ماہ رمضان میں حاضر و موجود ہونے کا مفہوم یہی ہے کہ وہ ماہ رمضان کو ایسی حالت میں پائے کہ اس میں روزہ رکھنے کی صلاحیت موجود ہو، یعنی مسلمان، عاقل، بالغ، مقیم، حیض و نفاس سے پاک ہو۔

اسی لئے جس شخص کا پورا رمضان ایسی حالت میں گذر گیا کہ اس میں روزہ رکھنے کی مطلق صلاحیت ہی نہیں جیسے کافر، نابالغ، مجنون، تو یہ لوگ اس حکم کے مخاطب ہی نہیں، اس لئے ان پر گذشتہ رمضان کے روزے فرض ہی نہیں ہوئے، اور جن میں صلاحیت ذاتی طور پر موجود ہو مگر کسی وقت عذر کی وجہ سے مجبور رہو گئے، جیسے حیض و نفاس والی عورت یا مریض اور مسافر، تو انھوں نے ایک حیثیت سے ماہ رمضان بحالتِ صلاحیت پالیا، اس لئے حکم آیت کا اُن کے حق میں ثابت ہوگیا، مگر وقتی عذر کے سبب اُس وقت روزہ معاف ہے، البتہ بعد میں قضاء لازم ہے، جیسا کہ اس کے بعد تفصیل آئے گی۔

مسئلہ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ رمضان کے روزے فرض ہونے کے لئے ماہ رمضان کا بحالتِ صلاحیت پالینا شرط ہے، اس لئے جس نے پورا رمضان پالیا اس پر پورے رمضان کے روزے فرض ہوگئے، جس نے کچھ کم پایا اُس پر اتنے ہی دن کے روزے فرض ہوئے جتنے دن رمضان کے پائے، اس لئے وسط رمضان میں جو کافر مسلمان ہوا یا نابالغ بالغ ہوا اس پر صرف آئندہ کے روزے لازم ہوں گے، گذشتہ ایام رمضان کی قضاء لازم نہ ہوگی، البتہ مجنون مسلمان اور بالغ ہونے کے اعتبار سے ذاتی صلاحیت رکھتا ہے، وہ اگر رمضان کے کسی حصہ میں ہوش میں آجائے تو گذشتہ ایامِ رمضان کی قضاء بھی اس پر لازم ہو جائے گی، اسی طرح حیض و نفاس والی عورت، وسطِ رمضان میں پاک ہو جائے یا مریض تندرست ہو جائے یا مسافر مقیم ہو جائے تو گذشتہ ایام کی قضاء لازم ہوگی۔

مسئلہ: ماہ رمضان کا پالینا شرعًا تین طریقوں سے ثابت ہوتا ہے، ایک یہ کہ خود رمضان کا چاند دیکھ لے، دوسرے یہ کہ کسی معتبر شہادت سے چاند دیکھنا ثابت ہو جائے، اور جب یہ دونوں صورتیں نہ پائی جائیں تو شعبان کے تیس روز پورے کرنے کے بعد ماہِ رمضان شروع ہو جائے گا۔

مسئلہ: شعبان کی انتیسویں تاریخ کی شام کو اگر ابر وغیرہ کے سبب چاند نظر نہ آئے اور کوئی شرعی شہادت بھی چاند دیکھنے کی نہ پہونچے تو اگلا روز یوم الشک کہلاتا ہے، کیونکہ

اُس میں یہ بھی احتمال ہے، کہ حقیقۃً چاند ہوگیا ہو، مگر مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے نظر نہ آیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ آج چاند ہی مطلع پر نہ آیا ہو، اُس روز میں چونکہ شہود شہر یعنی رمضان کا پالینا صادق نہیں آتا، اس لئے اُس دن کا روزہ رکھنا واجب نہیں بلکہ مکروہ ہے، حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے تاکہ فرض اور نفل میں اختلاط اور التباس نہ پیدا ہوجائے (جصاص)

مسئلہ: جن ملکوں میں رات دن کئی کئی مہینوں کے طویل ہوتے ہیں وہاں شہود شہر یعنی رمضان کا پالینا بظاہر صادق نہیں آتا، اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اُن پر روزے فرض ہی نہ ہوں فقہائے حنفیہ میں سے حلوانی اور بقالی وغیرہ نے نماز کے متعلق تو اسی پر فتویٰ دیا ہے کہ ان لوگوں پر اپنے ہی دن رات کے اعتبار سے نماز کا حکم عائد ہوگا، مثلاً جس ملک میں مغرب کے فوراً بعد صبح صادق ہوجاتی ہے وہاں نمازِ عشاء فرض ہی نہیں (شامی) اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ جہاں چھ مہینے کا دن ہو وہاں چھ مہینے میں صرف پانچ نمازیں ہوں گی اور رمضان وہاں آئے گا ہی نہیں، اس لئے روزے بھی فرض نہ ہوں گے، حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے امداد الفتاوٰی میں روزے کے متعلق اسی قول کو اختیار فرمایا ہے۔

مَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ، اس میں مریض اور مسافر کو رخصت دی گئی ہے کہ وہ اُس وقت روزہ نہ رکھیں، تندرستی ہونے پر اور سفر کے ختم ہونے پر اتنے دنوں کی قضاء کرلیں، یہ حکم اگرچہ پچھلی آیت میں بھی آچکا تھا، مگر جب اس آیت میں روزہ کے بجائے فدیہ دینے کا اختیار منسوخ کیا گیا ہے تو یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ شاید مریض اور مسافر کی رخصت بھی منسوخ ہوگئی ہو اس لئے دوبارہ اس کا اعادہ کردیا گیا۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ

اور جب تجھ سے پوچھیں میرے بندے مجھ کو سو میں تو قریب ہوں قبول کرتا ہوں دعاء مانگنے والے کی دعا کو

اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿١٨٦﴾

جب مجھ سے دعاء مانگے تو چاہئے کہ وہ حکم مانیں میرا اور یقین لائیں مجھ پر تاکہ نیک راہ پر آئیں۔

خلاصۂ تفسیر مع ربط آیات

پچھلی تین آیتوں میں روزہ اور رمضان کے احکام اور فضائل کا ذکر تھا، اور اس کے

بعد بھی ایک طویل آیت میں روزہ اور اعتکاف کے احکام کی تفصیل ہی، درمیان کی اس مختصر آیت میں بندوں کے حال پر حق تعالیٰ کی خاص عنایت، ان کی دعائیں سننے اور قبول کرنے کا ذکر فرماکر اطاعتِ احکام کی ترغیب دی گئی ہے، کیونکہ روزہ کی عبادت میں رخصتوں اور سہولتوں کے باوجود کسی قدر مشقت ہے، اس کو سہل کرنے کے لئے اپنی مخصوص عنایت کا ذکر فرمایا، کہ میں اپنے بندوں سے قریب ہی ہوں جب بھی وہ دعاء مانگتے ہیں میں اُن کی دعائیں قبول کرتا ہوں اور ان کی حاجات کو پورا کر دیتا ہوں۔

ان حالات میں بندوں کو بھی چاہئے کہ میرے احکام کی تعمیل میں کچھ مشقت بھی ہو تو برداشت کریں، ——— اور امام ابن کثیرؒ نے اس درمیانی جملہ ترغیب دعاء کی یہ حکمت بتلائی ہے کہ اس آیت نے اشارہ کر دیا کہ روزہ کے بعد دعاء قبول ہوتی ہے، اس لئے دعاء کا خاص اہتمام کرنا چاہئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لِلصَّائِمِ عِنْدَ فِطْرِہٖ دَعْوَۃٌ مُّسْتَجَابَۃٌ، (ابوداؤد طیالسی بروایۃ عبداللہ بن عمرؓ)	"یعنی روزہ افطار کرنے کے وقت روزہ دار کی دعاء مقبول ہے"

اسی لئے حضرت عبداللہ بن عمرؓ افطار کے وقت سب گھر والوں کو جمع کر کے دعاء کیا کرتے تھے، تفسیر آیت کی یہ ہے:

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) جب آپؐ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں (کہ میں ان سے قریب ہوں یا دور) تو (میری طرف سے اُن سے فرما دیجئے کہ) میں قریب ہی ہوں (اور باستثناء نامناسب درخواست کے) منظور کر لیتا ہوں (ہر) عرضی درخواست کرنے والے کی جب کہ وہ میرے حضور میں درخواست دے، سو (جس طرح میں اُن کی عرض معروض کو منظور کر لیتا ہوں) ان کو چاہئے کہ میرے احکام کو (بجا آوری کے ساتھ) قبول کیا کریں (اور چونکہ ان احکام میں کوئی حکم نامناسب نہیں اس لئے اس میں استثناء ممکن نہیں) اور مجھ پر یقین رکھیں (یعنی میری ہستی پر بھی میرے حاکم ہونے پر بھی میرے حکیم ہونے پر اور رعایت و مصالح پر بھی اس طرح) امید ہو کہ وہ لوگ رشد (وفلاح) حاصل کر سکیں گے۔

مسئلہ: اس آیت میں اِنِّیْ قَرِیْبٌ فرماکر اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ دعاء آہستہ اور خفیہ کرنا چاہئے، دعاء میں آواز بلند کرنا پسند نہیں، ابن کثیرؒ نے آیت کا شانِ نزول یہی ذکر کیا ہے کہ کسی گاؤں والے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ہمارا رب اگر ہم سے قریب ہی تو ہم دعاء آہستہ آواز سے مانگا کریں، اور دور ہو تو بلند آواز سے پکارا کریں' اس پر یہ آیت نازل ہوئی:-

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَآئِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ
حلال ہوا تم کو روزہ کی رات میں بے حجاب ہونا اپنی عورتوں سے وہ پوشاک ہیں تمہاری
وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ
اور تم پوشاک ہو ان کی اللہ کو معلوم ہے کہ تم خیانت کرتے تھے اپنی جانوں سے
فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ فَالْـَٔانَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ
سو معاف کیا تم کو اور درگذر کی تم سے پھر ملو اپنی عورتوں سے اور طلب کرو اس کو جو لکھ دیا ہے
اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ
اللہ نے تمہارے لئے اور کھاؤ اور پیو جب تک کہ صاف نظر آئے تم کو دھاری صبح کی جدا دھاری
مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى الَّيْلِ ۚ
سیاہ سے، پھر پورا کرو روزہ کو رات تک،
وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَٰكِفُونَ فِي الْمَسَٰجِدِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ
اور نہ ملو عورتوں سے جب تک کہ تم اعتکاف کرو مسجدوں میں یہ حدیں باندھی ہوئی ہیں اللہ کی،
فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ ءَايَٰتِهِۦ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿۱۸۷﴾
سو ان کے نزدیک نہ جاؤ اسی طرح بیان فرماتا ہے اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے واسطے تاکہ وہ بچتے رہیں۔

خُلاصۂ تفسیر

حکم چہارم، رمضان کی راتوں میں جماع اس آیت میں روزہ کے بقیہ احکام کی کچھ تفسیر مذکور ہے، تم لوگوں کے واسطے روزہ کی شب میں اپنی بیبیوں سے مشغول ہونا حلال کر دیا گیا (اور پہلے جو اس سے ممانعت تھی وہ موقوف کی گئی) کیونکہ (بوجہ قرب و اتصال کے) وہ تمہارے (بجائے) اوڑھنے بچھونے (کے) ہیں اور تم ان کے (بجائے) اوڑھنے بچھونے (کے) ہو، خدا تعالیٰ کو اس کی خبر تھی کہ تم (اس حکم الٰہی میں) خیانت (کر) کے گناہ میں اپنے کو مبتلا کر رہے تھے (مگر) خیر (جب تم معذرت سے پیش آئے تو) اللہ تعالیٰ نے تم پر عنایت فرمائی اور تم سے گناہ کو دھو دیا، سو

(جب اجازت ہوگئی تو) اب ان سے ملو ملاؤ اور جو (قانونِ اجازت) تمہارے لئے تجویز کر دیا ہے، (بے تکلف) اس کا سامان کرو اور (جس طرح شب صیام میں بی بی سے ہمبستری کی اجازت ہے، اسی طرح یہ بھی اجازت ہے کہ تمام رات میں جب چاہو) کھاؤ (بھی) اور پیو (بھی) اس وقت تک کہ تم کو سفید خط صبح (صادق کی روشنی) کا متمیز ہو جاوے سیاہ خط سے (یعنی رات کی تاریکی سے) تو پھر (صبح صادق سے) رات (آنے) تک روزہ کو پورا کیا کرو۔

صبح کی سفیدی کا سفید خط رات کی تاریکی کے سیاہ خط سے متمیز ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ صبح صادق یقینی طور سے ثابت ہو جائے۔

حکم پنجم ۵ اعتکاف اور ان بیبیوں (کے بدن) سے اپنا بدن بھی (شہوت کے ساتھ) مت ملنے دو جس زمانے میں کہ تم لوگ اعتکاف والے ہو، (جو کہ) مسجدوں میں (ہوا کرتا ہے) یہ (سب احکام مذکورہ) خداوندی ضابطے ہیں، سو ان (ضابطوں) سے (نکلنا تو کیسا) نکلنے کے نزدیک بھی مت ہونا (اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ احکام بیان کئے ہیں) اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے (اور) احکام (بھی) لوگوں (کی اصلاح) کے واسطے بیان فرمایا کرتے ہیں، اس امید پر کہ وہ لوگ (احکام پر مطلع ہو کر ان احکام کے خلاف کرنے سے) پرہیز رکھیں۔

معارف و مسائل

اُحِلَّ لَكُمْ کے لفظ سے معلوم ہوا کہ جو چیز اس آیت کے ذریعہ حلال کی گئی ہے وہ اس سے پہلے حرام تھی، صحیح بخاری وغیرہ میں بروایت براء بن عازبؓ مذکور ہے کہ ابتداء میں جب رمضان کے روزے فرض کئے گئے تو افطار کے بعد کھانے پینے اور بیبیوں کے ساتھ اختلاط کی صرف اُس وقت تک اجازت تھی جب تک سو نہ جائے، سو جانے کے بعد یہ سب چیزیں حرام ہو جاتی تھیں، بعض صحابہ کرامؓ کو اس میں مشکلات پیش آئیں، قیس بن صرمہ انصاریؓ دن بھر مزدوری کر کے افطار کے وقت گھر پہونچے تو گھر میں کھانے کے لئے کچھ نہ تھا، بیوی نے کہا کہ میں کہیں سے کچھ انتظام کر کے لاتی ہوں جب وہ واپس آئی تو دن بھر کے تکان کی وجہ سے ان کی آنکھ لگ گئی، اب بیدار ہوئے تو کھانا حرام ہو چکا تھا، اگلے دن اسی طرح روزہ رکھا، دوپہر کو ضعف سے بیہوش ہو گئے، (ابن کثیر) اسی طرح بعض صحابہؓ سونے کے بعد اپنی بیبیوں کے ساتھ اختلاط میں مبتلا ہو کر پریشان ہوئے، ان واقعات کے بعد یہ آیت نازل ہوئی جس میں پہلا حکم منسوخ کر کے غروب آفتاب کے بعد سے طلوع صبح صادق تک پوری رات میں کھانے پینے اور مباشرت کی اجازت دیدی گئی، اگرچہ سو کر اٹھنے کے بعد ہو، بلکہ سو کر اٹھنے

کے بعد آخر شب میں سحری کھانا سنت قرار دیا گیا، جس کا ذکر روایاتِ حدیث میں واضح ہے، اس آیت میں اسی حکم کا بیان کیا گیا ہے۔

رَفَثُ کے لفظی معنی اگرچہ عام ہیں، ایک مرد بی بی سے اپنی خواہش پورا کرنے کے لئے جو کچھ کرتا یا کہتا ہے وہ سب اس میں شامل ہے لیکن باتفاقِ امت اس جگہ اس سے مراد جماع کرنا ہے۔

ثبوتِ احکامِ شرعیہ کے لئے قولِ رسول کریمؐ بھی بحکم قرآن ہے اس آیت نے جس حکم کو منسوخ کیا ہے، یعنی سو جانے کے بعد کھانے، پینے وغیرہ کی حرمت کو، یہ حکم قرآن میں کہیں مذکور نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے صحابۂ کرامؓ اس حکم پر عمل کرتے تھے (کما رواہ احمد فی مسندہٖ) اسکو اس آیت نے حکم الٰہی قرار دیکر منسوخ کیا ہے

اس آیت میں پہلے حکم کو حکمِ آلٰہی قرار دیا گیا، اور پھر آسانی کے لئے اس کو منسوخ کیا گیا، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سنت سے ثابت شدہ بعض احکام کو قرآن کے ذریعہ بھی منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ (جصاص وغیرہ)

سحری کھانے کا آخری وقت

حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ، اس آیت میں رات کی تاریکی کو سیاہ خط اور صبح کی روشنی کو سفید خط کی مثال سے بتلا کر روزہ شروع ہونے اور کھانا پینا حرام ہو جانے کا صحیح وقت متعین فرما دیا، اور اس میں افراط و تفریط کے احتمالات کو ختم کرنے کے لئے حَتّٰى يَتَبَيَّنَ کا لفظ بڑھا دیا جس میں یہ بتلایا گیا ہے، کہ نہ تو وہمی مزاج لوگوں کی طرح صبح صادق سے کچھ پہلے ہی کھانے پینے وغیرہ کو حرام سمجھو، اور نہ ایسی بے فکری اختیار کرو کہ صبح کی روشنی کا یقین ہو جانے کے باوجود کھاتے پیتے رہو، بلکہ کھانے پینے اور روزہ کے درمیان حد فاصل صبح صادق کا تیقن ہے، اس تیقن سے پہلے کھانے پینے کو حرام سمجھنا درست نہیں، اور تیقن کے بعد کھانے پینے میں مشغول رہنا بھی حرام اور روزے کے لئے مفسد ہے، اگرچہ ایک ہی منٹ کے لئے ہو، سحری کھانے میں وسعت اور گنجائش صرف اسی وقت تک ہے جب تک صبح صادق کا یقین نہ ہو، بعض صحابۂ کرامؓ کے ایسے واقعات کو بعض کہنے والوں نے اسطرح بیان کیا کہ سحری کھاتے ہوئے صبح ہو گئی اور وہ بے پروائی سے کھاتے رہے، یہ اسی پر مبنی تھا کہ صبح کا یقین نہیں ہوا تھا اس لئے کہنے والوں کی جلد بازی سے متاثر نہیں ہوئے۔

ایک حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت بلالؓ کی اذان تمھیں سحری کھانے سے مانع نہ ہونی چاہئے، کیونکہ وہ رات سے اذان دیدیتے ہیں، اس لئے تم بلال کی اذان سُنکر بھی اُس وقت تک کھاتے پیتے رہو جب تک ابن اُمّ مکتومؓ کی اذان نہ سنو، کیونکہ وہ ٹھیک طلوعِ صبح صادق پر اذان دیتے ہیں (بخاری و مسلم)

اس حدیث کے ناتمام نقل کرنے سے بعض معاصرین کو یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ اذان فجر کے بعد بھی کچھ دیر کھایا پیا جائے تو مضائقہ نہیں، اور جس شخص کی آنکھ دیر میں کھلی کہ صبح کی اذان ہو رہی تھی اس کے لئے جائز کر دیا کہ وہ جلدی جلدی کچھ کھالے، حالانکہ اسی حدیث میں واضح طور پر بتلا دیا گیا ہے کہ اذان ابن ام مکتومؓ جو ٹھیک طلوعِ فجر کے ساتھ ہوتی تھی اس پر کھانے سے رُک جانا ضروری ہے، اس کے علاوہ قرآن کریم نے خود جو حدبندی فرمادی ہے وہ طلوعِ صبح کا تیقن ہے اس کے بعد ایک منٹ کے لئے بھی کھانے پینے کی اجازت دینا نصِ قرآن کی خلاف ورزی ہے، صحابہ کرامؓ اور اسلافِ امت سے جو افطار و سحر میں مساہلت کی روایات منقول ہیں ان سب کا محمل نص قرآن کے مطابق یہی ہو سکتا ہے کہ تیقن صبحِ صادق سے پہلے پہلے زیادہ احتیاطی تنگی اختیار نہ کی جائے، امام ابن کثیرؒ نے بھی ان روایات کو اسی بات پر محمول فرمایا ہے، ورنہ نصِ قرآنی کی صریح مخالفت کو کون مسلمان برداشت کرسکتا ہے، اور صحابہ کرامؓ سے تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا خصوصاً جبکہ قرآن کریم نے اسی آیت کے اخیر میں تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ کے ساتھ فَلَا تَقْرَبُوْهَا فرما کر خاص احتیاط کی تاکید بھی فرمادی ہے۔

مسئلہ: یہ سب کلام ان لوگوں کے بارے میں ہے جو ایسے مقام پر ہیں جہاں سے صبح صادق کو بچشمِ خود دیکھ کر یقین حاصل کر سکتے ہیں، اور مطلع بھی صاف ہے، اور وہ صبح صادق کی ابتدائی روشنی کی پہچان بھی رکھتے ہیں، تو ان کو لازم ہے کہ براہِ راست افق کو دیکھ کر عمل کریں، اور جہاں یہ صورت نہ ہو مثلاً کھلا ہوا افق سامنے نہیں یا مطلع صاف نہیں، یا اس کو صبح صادق کی پہچان نہیں، اس لئے وہ دوسرے آثار و علامات یا ریاضی حسابات کے ذریعہ وقت کا تعین کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کے لئے کچھ وقت ایسا آئے گا کہ صبح صادق کا ہو جانا مشکوک ہو یقینی نہ ہو، ایسے لوگوں کو مشکوک حالت میں کیا کرنا چاہئے، اس کے متعلق امام جصاصؒ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس حالت میں اصل تو یہی ہے کہ کھانے پینے پر اقدام نہ کرے، لیکن مشکوک حالت میں صبح صادق کا یقین ہونے سے پہلے پہلے کسی نے کچھ کھا پی لیا تو گناہگار نہیں ہوگا، لیکن اگر بعد میں تحقیق سے یہ ثابت ہوگیا کہ اُس وقت صبح ہو چکی تھی تو قضاء اس کے ذمہ لازم ہے، جیسے شروع رمضان میں چاند نظر نہ آیا اور لوگوں نے روزہ نہیں رکھا، مگر بعد میں شہادت سے ۲۹ ر کا چاند ثابت ہوگیا، تو جن لوگوں نے اس دن کو شعبان کی تیسویں تاریخ سمجھ کر روزہ نہیں رکھا تھا، وہ گنہگار تو نہیں ہوئے، مگر اس روزے کی قضاء اُن پر باتفاق لازم ہے، اسی طرح بادل کے دن میں غروب کے گمان پر روزہ افطار کر لیا، بعد میں آفتاب نکل آیا، تو یہ شخص گناہگار تو نہیں مگر قضاء اس پر واجب ہے۔

امام جصاصؒ کے اس بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جس شخص کی آنکھ دیر میں کھلی اور عام طور پر صبح کی اذان ہوئی تھی جس سے صبح ہونے کا یقین لازمی ہے، وہ جان بوجھ کر اس وقت کچھ کھائیگا تو وہ گناہگار بھی ہوگا اور قضاء بھی اس پر لازم ہوگی، اور مشکوک حالت میں کھائے گا تو گناہ ساقط ہوجائے گا، مگر قضاء ساقط نہ ہوگی، اور کسی نہ کسی درجہ میں کراہت بھی ہوگی۔

اعتکاف اور اس کے مسائل اعتکاف کے لغوی معنی کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں، اور اصطلاحِ قرآن وسنت میں خاص شرائط کے ساتھ مسجد میں ٹھہرنے اور قیام کرنے کا نام اعتکاف ہے، لفظ فِي الْمَسَاجِدِ کے عموم سے ثابت ہوا کہ اعتکاف ہر مسجد میں ہوسکتا ہے، حضراتِ فقہاء نے جو یہ شرط بیان کی ہے کہ اعتکاف صرف اُس مسجد میں ہوسکتا ہے جس میں جماعت ہوتی ہو غیر آباد مسجد جہاں جماعت نہ ہوتی ہو اس میں اعتکاف درست نہیں، یہ شرط درحقیقت مسجد کے مفہوم ہی سے مستفاد ہے، کیونکہ مساجد کے بنانے کا اصل مقصد جماعت کی نماز ہے، ورنہ تنہا نماز تو ہر جگہ دُوکان مکان وغیرہ میں ہوسکتی ہے۔

مسئلہ: روزے کی رات میں کھانا، پینا، بی بی سے مباشرت سب کا حلال ہونا اوپر بیان ہوا ہے، حالتِ اعتکاف میں کھانے پینے کا تو وہی حکم ہے جو سب کے لئے ہے، مگر مباشرتِ نساء کے معاملہ میں الگ ہے، کہ وہ رات میں بھی جائز نہیں، اس لئے اس آیت میں اسی کا حکم بتایا گیا ہے۔

مسئلہ: اعتکاف کے دوسرے مسائل کہ اس کے ساتھ روزہ شرط ہے، اور یہ کہ اعتکاف میں مسجد سے نکلنا بغیر حاجت طبعی یا شرعی کے جائز نہیں، کچھ اسی لفظ اعتکاف سے مستفاد ہیں کچھ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل سے۔

روزے کے معاملے میں احتیاط کا حکم آخر آیت میں تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا، فرما کر اشارہ کر دیا کہ روزے میں کھانے پینے اور مباشرت کی جو ممانعت ہے یہ اللہ کے حدود ہیں، ان کے قریب بھی مت جاؤ، کیونکہ قریب جانے سے حد شکنی کا احتمال ہے، اسی لئے روزہ کی حالت میں کلّی کرنے میں مبالغہ کرنا مکروہ ہے، جس سے پانی اندر جانے کا خطرہ ہو، مُنھ کے اندر کوئی دوا استعمال کرنا مکروہ ہے، بی بی سے بوس وکنار مکروہ ہے، اسی طرح سحری کھانے میں احتیاطاً وقت ختم ہونے سے دو چار منٹ پہلے ختم کرنا اور افطار میں دو تین منٹ مؤخر کرنا بہتر ہے، اس میں بے پروائی اور سہل انگاری اس ارشادِ خداوندی کے خلاف ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ

اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں ناحق اور نہ پہنچاؤ اُن کو حاکموں تک کہ

لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ ع ۷ ۲۳

کھا جاؤ کوئی حصہ لوگوں کے مال میں سے ظلم کر کے (ناحق) اور تم کو معلوم ہے۔

ربط آیات و خلاصۂ تفسیر

پچھلی آیتوں میں روزے کے احکام مذکور تھے، جس میں حلال چیزوں کے استعمال کو ایک معیّن زمانے میں اور معیّن وقت میں حرام کر دیا گیا ہے، اس کے بعد مالِ حرام حاصل کرنے اور اس کے استعمال کرنے کی ممانعت اسی مناسبت سے ذکر کی گئی کہ عبادتِ صوم کا اصل منشاء یہی ہے کہ انسان کچھ عرصے حلال چیزوں سے بھی صبر کا خوگر ہو جائے گا، تو حرام چیزوں سے بچنا آسان ہو جائے گا، نیز یہ مناسبت بھی ہر کہ جب روزہ ختم ہو افطار کے لئے مالِ حلال مہیّا کرنا چاہئے، جس نے دن بھر روزہ رکھا شام کو مالِ حرام سے افطار کیا اس کا روزہ اللہ کے نزدیک قبول نہیں۔

حکم ششم، مالِ حرام سے بچنا: اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق مت کھاؤ اور ان (کے جھوٹے مقدمہ) کو حکام کے یہاں اس غرض سے رجوع مت کرو کہ (اس کے ذریعہ سے) لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریق گناہ (یعنی ظلم) کے کھا جاؤ، جبکہ تم کو (اپنے جھوٹ اور ظلم کا) علم بھی ہو۔

معارف و مسائل

اس آیت میں حرام طریقوں سے مال حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی ممانعت ہے، جس طرح اس سے پہلے اسی سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۶۸ میں حلال طریقہ پر حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی اجازت کا بیان گذر چکا ہے، جس میں ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ

"یعنی اے لوگو کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے جو چیزیں حلال اور ستھری ہیں اور شیطان کے قدم پر نہ چلو، کیونکہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے"

اور سورۂ نحل آیت ۱۱۴ میں ارشاد فرمایا:-

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ○

"یعنی کھاؤ جو روزی دی تم کو اللہ تعالیٰ نے حلال اور پاک اور شکر کرو اللہ کے احسان کا اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو"

کسبِ مال کے اچھے بُرے ذرائع اور اچھائی بُرائی کا معیار

جس طرح مال کی ضرورت اور مدارِ زندگی ہونے پر ساری دنیا اور اس کی ہر قوم و ملت کا اتفاق ہے، اسی طرح اس پر بھی اتفاق ہے کہ اس کی تحصیل کے کچھ ذرائع پسندیدہ اور جائز ہیں، کچھ ناپسند اور ممنوع ہیں، چوری، ڈاکہ، دھوکہ، فریب کو ساری ہی دنیا بُرا سمجھتی ہے، لیکن ان ذرائع کے جائز یا ناجائز ہونے کا کوئی صحیح معیار عام طور پر لوگوں کے ہاتھ میں نہیں، اور ہو بھی نہیں سکتا، کیونکہ اس کا تعلق پوری دنیا کے انسانوں کی صلاح و فلاح سے ہے اور پورا عالمِ انسانیت اس سے متاثر ہوتا ہے، اس کا صحیح اور معقول معیار صرف وہی ہو سکتا ہے جو رب العالمین کی طرف سے بذریعہ وحی بھیجا گیا ہو، ورنہ اگر خود انسان اس کا معیار بنانے کا مختار ہو تو جو لوگ اس کا قانون بنائیں گے وہ اپنی قوم یا اپنے وطن یا اپنی ملت کے بارے میں جو کچھ سوچیں گے وہ عام عادت کے مطابق اس سے مختلف ہوگا جو دوسری قومیں اور وطنوں کے متعلق سوچا جائے گا۔ اور بین الاقوامی کانفرنسوں کی صورت میں پوری دنیا کی نمائندگی کی جائے تو تجربہ شاہد ہے کہ وہ بھی ساری مخلوق کو مطمئن کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتی، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ قانونی ناانصافی انجام کار جنگ و جدل اور فساد کی صورت اختیار کرے گی۔

اسلامی نظامِ معاش ہی دنیا میں امنِ عام قائم کر سکتا ہے

شریعتِ اسلام نے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا جو قانون بنایا ہے وہ صراحۃً وحی الٰہی سے ہے یا اس سے مستفاد، اور وہی ایک ایسا معقول، فطری اور جامع قانون ہے جو ہر قوم و ملت اور ہر ملک و وطن میں چل سکتا ہے، اور امنِ عامہ کا ضامن ہو سکتا ہے، کیونکہ اس قانونِ الٰہی میں قابلِ اشتراک چیزوں کو مشترک اور وقفِ عام رکھا گیا ہے، جس میں تمام انسان مساوی حق رکھتے ہیں جیسے ہوا، پانی، خودرو گھاس، آگ کی حرارت اور غیر مملوک جنگلات اور غیر آباد پہاڑی جنگلات کی پیداوار وغیرہ کہ ان میں سب انسانوں کا مشترک حق ہے، کسی کو اُن پر مالکانہ قبضہ جائز نہیں، اور جن چیزوں کے اشتراک میں انسانی معاشرت میں خلل پیدا ہوتا ہے، یا نزاع و جدال کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں ان میں انفرادی ملکیت کا قانون جاری فرمایا گیا، کسی زمین یا اس کی پیداوار پر ابتدائی ملکیت کا قانون جُدا ہے، اور پھر انتقالِ ملکیت کا جُدا، اس قانون کی ہر دفعہ میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ کوئی انسان ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے، بشرطیکہ وہ اپنی جد و جہد ان کی تحصیل میں خرچ کرے،

ور کوئی انسان دوسروں کے حقوق غصب کرکے یا دوسروں کو نقصان پہنچا کر سرمایہ کو محدود افراد میں مقید نہ کردے، انتقالِ ملکیت خواہ بعد الموت وراثت کے قانونِ الٰہی کے مطابق ہو، یا پھر بیع و شراء وغیرہ کے ذریعہ فریقین کی رضامندی سے ہو، مزدوری ہو یا کسی مال کا معاوضہ دونوں میں اس کو ضروری قرار دیا گیا کہ معاملہ میں کوئی دھوکہ، فریب، یا تلبیس نہ ہو، اور کوئی ایسا ابہام اور اجمال نہ رہے جس کی وجہ سے باہمی منازعت کی نوبت آئے۔

نیز اس کی بھی رعایت رکھی گئی ہے کہ فریقین جو رضامندی دے رہے ہیں وہ حقیقی رضامندی ہو، کسی انسان پر دباؤ ڈال کر کوئی رضامندی نہ لی گئی ہو، شریعتِ اسلام میں جتنے معاملات باطل یا فاسد اور گناہ کہلاتے ہیں اُن سب کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ اُن میں وجوہِ مذکور میں کسی وجہ سے خلل ہوتا ہے، کہیں دھوکہ فریب ہوتا ہے، کہیں نامعلوم چیز یا نامعلوم عمل کا معاوضہ ہوتا ہے، کہیں کسی کا حق غصب ہوتا ہے، کہیں کسی کو نقصان پہونچا کر اپنا نفع کیا جاتا ہے، کہیں حقوقِ عامّہ میں ناجائز تصرف ہوتا ہے، سود، قمار وغیرہ کو حرام قرار دینے کی اہم وجہ یہ ہے کہ وہ حقوقِ عامہ کے لئے مضر ہیں، ان کے نتیجہ میں چند افراد پلتے بڑھتے ہیں، اور پوری ملّت مفلس ہوتی ہے، ایسے معاملات فریقین کی رضامندی سے بھی اس لئے حلال نہیں کہ وہ پوری ملت کے خلاف ایک جرم ہے، آیت مذکورہ ان تمام ناجائز صورتوں پر حاوی ہے، ارشاد ہے، وَلَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ، یعنی نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق پر" اس میں ایک بات تو یہ قابلِ غور ہو کہ قرآن کریم کے الفاظ میں اَمْوَالَكُمْ آیا ہے، جس کے اصلی معنی ہیں اپنے اموال جس میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا کہ تم جو کسی دوسرے کے مال میں ناجائز تصرّف کرتے ہو تو یہ غور کرو کہ دوسرے شخص کو بھی اپنے مال سے ایسی ہی محبت اور تعلق ہوگا جیسا تمھیں اپنے مال سے ہے، اگر وہ تمھارے مال میں ایسا ناجائز تصرف کرتا تو تمھیں جو دُکھ پہنچتا اُس کا اس وقت بھی ایسا ہی احساس کرو، کہ گویا وہ تمھارا مال ہو۔

اس کے علاوہ اشارہ اس طرف بھی ہوسکتا ہے کہ جب ایک شخص دوسرے کے مال میں کوئی ناجائز تصرّف کرتا ہے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ اگر یہ رسم چل پڑی تو دوسرے اس کے مال میں ایسا ہی تصرّف کریں گے، اس حیثیت سے کسی شخص کے مال میں ناجائز تصرّف درحقیقت اپنے مال میں ناجائز تصرف کے لئے راستہ ہموار کرنا ہے، غور کیجئے اشیاءِ ضرورت میں ملاوٹ کی رسم چل جائے، کوئی گھی میں تیل یا چربی ملا کر زائد پیسے حاصل کرے، تو اس کو جب دودھ خریدنے کی ضرورت پڑے گی دودھ والا اس میں پانی ملا کر دے گا، مسالہ کی ضرورت ہوگی اس میں ملاوٹ ہوگی، دوا کی ضرورت ہوگی اس میں بھی یہی منظر سامنے آئے گا، تو جتنے پیسے ایک شخص نے ملاوٹ

کرکے زائد حاصل کرلے، دوسرا آدمی دہ پیسے اس کی جیب سے نکال لیتا ہے، اسی طرح دوسرے کے پیسے تیسرا نکال لیتا ہے، یہ بیوقوف اپنی جگہ پیسوں کی زیادتی شمار کرکے خوش ہوتا ہے، مگر انجام نہیں دیکھتا کہ اس کے پاس کیا رہا، تو جو کوئی دوسرے کے مال کو غلط طریقے سے حاصل کرتا ہے درحقیقت وہ اپنے مال کے ناجائز تصرف کا دروازہ کھولتا ہے۔

دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ اس ارشادِ خداوندی کے الفاظ عام ہیں کہ باطل اور ناجائز طریق سے کسی کا مال نہ کھاؤ، اس میں کسی کا مال غصب کرلینا بھی داخل ہے، چوری اور ڈاکہ بھی، جن میں دوسرے پر ظلم کرکے جبراً مال چھین لیا جاتا ہے، اور سود، قمار، رشوت اور تمام بیوع فاسدہ اور معاملات فاسدہ بھی جو از روئے شرع جائز نہیں، اگرچہ فریقین کی رضامندی بھی متحقق ہو، جھوٹ بول کر یا جھوٹی قسم کھا کر کوئی مال حاصل کرلینا یا ایسی کمائی جس کو شریعتِ اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے، اگرچہ اپنی جان کی محنت ہی سے حاصل کی گئی ہو وہ سب حرام اور باطل ہیں، اور قرآن کے الفاظ میں اگرچہ صراحۃً کھانے کی ممانعت مذکور ہے، لیکن مراد اس جگہ صرف کھانا ہی نہیں بلکہ مطلقاً استعمال کرنا ہے، خواہ کھا پی کر، یا پہن کر یا دوسرے طریقہ کے استعمال سے، مگر محاورات میں ان سب قسم کے استعمالوں کو کھا لینا ہی بولا جاتا ہے، کہ فلاں آدمی فلاں کا مال کھا گیا، اگرچہ وہ مال کھانے پینے کے لائق نہ ہو۔

شانِ نزول یہ آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہے، واقعہ یہ ہے کہ حضراتِ صحابہ کرامؓ میں سے دو صاحبوں کا آپس میں ایک زمین پر جھگڑا ہوا، مقدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں پیش ہوا، مدعی کے پاس گواہ نہ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شرعی ضابطہ کے مطابق مدعا علیہ کو حلف کرنے کا حکم دیا، وہ حلف پر آمادہ ہوگیا، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور نصیحت اُن کو یہ آیت سنائی: اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا (۳: ۷۷) جس میں قسم کھا کر کوئی مال حاصل کرنے پر وعید مذکور ہے، صحابیؓ نے جب یہ آیت سُنی تو قسم کھانے کو ترک کردیا اور زمین مدعی کے حوالہ کردی۔ (روح المعانی)

اس واقعہ میں یہ آیت نازل ہوئی جس میں ناجائز طریق پر کسی کا مال کھانے یا حاصل کرنے کو حرام قرار دیا ہے، اور اس کے آخر میں خاص طور پر جھوٹا مقدمہ بنانے اور جھوٹی قسم کھانے اور جھوٹی شہادت دینے اور دلوانے کی سخت ممانعت اور اس پر وعید آئی ہے، ارشاد ہے: وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِیْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ یعنی نہ لے جاؤ اموال کے مقدمات حکام تک، تاکہ ان کے ذریعہ تم لوگوں کے اموال کا کوئی حصہ کھا جاؤ بطریق گناہ جب کہ تم جانتے بھی ہو کہ اس میں تمہارا کوئی حق نہیں، تم جھوٹا مقدمہ بنا رہے ہو، وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی مغالطہ کی بنا پر اس چیز کو اپنا حق سمجھتا ہے، وہ اگر عدالت میں

دعویٰ دائر کر کے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے تو وہ اس وعید میں داخل نہیں، اسی جیسے ایک واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا،

اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ وَّ اَنْتُمْ تَخْتَصِمُوْنَ اِلَیَّ وَلَعَلَّ بَعْضَکُمْ اَنْ یَّکُوْنَ اَلْحَنَ بِحُجَّتِہٖ مِنْ بَعْضٍ فَاَقْضِیْ لَہٗ عَلٰی نَحْوِ مَآ اَسْمَعُ مِنْہُ فَمَنْ قَضَیْتُ لَہٗ بِشَیْءٍ مِّنْ حَقِّ اَخِیْہِ فَلَا یَاْخُذَنَّہٗ فَاِنَّمَآ اَقْطَعُ لَہٗ قِطْعَۃً مِّنَ النَّارِ (رواہ البخاری ومسلم عن ام سلمۃؓ)

"یعنی میں ایک انسان ہوں اور تم میرے پاس اپنے مقدمات لاتے ہو، اس میں یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے معاملہ کو زیادہ رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کرے، اور میں اسی سے مطمئن ہو کر اس کے حق میں فیصلہ کر دوں تو یاد رکھو کہ حقیقتِ حال تو صاحب معاملہ کو خود معلوم ہوتی ہے) اگر فی الواقع وہ اس کا حق نہیں ہر تو اس کو لینا نہیں چاہئے، کیونکہ اس صورت میں جو کچھ میں اس کو دوں گا وہ جہنم کا ایک قطعہ ہوگا"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں واضح فرمادیا کہ اگر امام یا قاضی یا امام المسلمین کسی مغالطہ کی وجہ سے کوئی فیصلہ کر دے جس میں ایک کا حق دوسرے کو ناجائز طور پر مل رہا ہو، تو اس عدالتی فیصلہ کی وجہ سے وہ اس کے لئے حلال نہیں ہو جاتا، اور جس کے لئے حلال ہو اس کے لئے حرام نہیں ہو جاتا، الغرض عدالت کا فیصلہ کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال نہیں بناتا، اگر کوئی شخص دھوکہ فریب یا جھوٹی شہادت یا جھوٹی قسم کے ذریعہ کسی کا مال بذریعہ عدالت لے لے، تو اس کا وبال اس کی گردن پر رہے گا اس کو چاہئے کہ آخرت کے حساب کتاب اور علیم وخبیر کی عدالت میں پیشی کا خیال کر کے اس کو چھوڑ دے۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جن معاملات میں کوئی عقد یا فسخ ہوتا ہو اور جن میں قاضی یا جج کو بھی شرعاً اختیارات حاصل ہوتے ہیں، ایسے معاملات میں اگر جھوٹی قسم یا جھوٹی شہادت کی بناء پر بھی کوئی فیصلہ قاضی نے صادر کر دیا تو شرعاً وہ عقد یا فسخ صحیح ہو جائے گا، اور حلال وحرام کے احکام اس پر عائد ہو جائیں گے، اگرچہ جھوٹ بولنے اور جھوٹی شہادت دلوانے کا وبال اس کی گردن پر رہے گا۔

مالِ حلال کی برکات اور حرام کی نحوست

حرام سے بچنے اور حلال کے حاصل کرنے کے لئے قرآن کریم نے مختلف مقامات میں مختلف عنوانات سے تاکیدیں فرمائی ہیں، ایک آیت میں اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ انسان کے اعمال واخلاق میں بہت بڑا دخل حلال کھانے کو ہے، اگر اس کا کھانا پینا حلال نہیں تو اس سے اخلاقِ حمیدہ اور

اعمالِ صالحہ کا صدور مشکل ہو، ارشاد ہے:

يَاأَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ (۲۳: ۵۱)

"یعنی اے گروہِ انبیاءؑ حلال اور پاک چیزیں کھاؤ، اور نیک عمل کرو، میں تمہارے اعمال کی حقیقت سے واقف ہوں"

اس آیت میں حلال کھانے کے ساتھ عملِ صالح کا حکم فرما کر اشارہ کر دیا ہے کہ اعمالِ صالحہ کا صدور جب ہی ہو سکتا ہے جبکہ انسان کا کھانا پینا حلال ہو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں یہ بھی واضح فرما دیا کہ اس آیت میں اگرچہ خطاب انبیاء علیہم السلام کو ہے، مگر یہ حکم کچھ انھیں کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ سب مسلمان اس کے مامور ہیں، اس حدیث کے آخر میں آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ حرام مال کھانے والے کی دعاء قبول نہیں ہوتی، بہت سے آدمی عبادت وغیرہ میں مشقت اٹھاتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ دعاء کے لئے پھیلاتے ہیں، اور یارب یارب پکارتے ہیں، مگر کھانا ان کا حرام، پینا ان کا حرام، لباس اُن کا حرام ہے تو اُن کی یہ دعاء کہاں قبول ہو سکتی ہے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا ایک بہت بڑا حصّہ اسی کام کے لئے وقف رہا ہے کہ امّت کو حرام سے بچانے اور حلال کے استعمال کرنے کی ہدایتیں دیں۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے حلال کھایا اور سنت کے مطابق عمل کیا اور لوگ اس کی ایذاؤں سے محفوظ رہے وہ جنّت میں جائے گا، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ آجکل تو یہ حالات آپؐ کی امت میں عام ہیں، بیشتر مسلمان ان کے پابند ہیں، آپؐ نے فرمایا ہاں! آئندہ بھی ہر زمانہ میں ایسے لوگ رہیں گے جو اِن احکام کے پابند ہوں گے (یہ حدیث ترمذی نے روایت کی ہے، اور اس کو صحیح فرمایا ہے)

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے فرمایا کہ چار خصلتیں ایسی ہیں جب وہ تمہارے اندر موجود ہوں تو پھر دنیا میں کچھ بھی حاصل نہ ہو تو تمہارے لئے کافی ہیں، وہ چار خصلتیں یہ ہیں کہ ایک امانت کی حفاظت، دوسرے سچ بولنا، تیسرے حُسنِ خلق، چوتھے کھانے میں حلال کا اہتمام۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ میرے لئے یہ دعاء فرما دیجئے کہ میں مستجاب الدعاء ہو جاؤں، جو دعاء کیا کروں قبول ہوا کرے، آپؐ نے فرمایا اے سعد اپنا کھانا حلال اور پاک بنا لو مستجاب الدعوات ہو جاؤ گے، اور قسم ہو اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے بندہ جب اپنے پیٹ میں حرام لقمہ ڈالتا ہے تو

چالیس روز تک اس کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، اور جس شخص کا گوشت حرام مال سے بنا ہو اس گوشت کے لئے تو جہنم کی آگ ہی لائق ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ کوئی بندہ اُسوقت تک مسلمان نہیں ہوتا جب تک اس کا قلب اور زبان مسلم نہ ہو جائے، اور جب تک اس کے پڑوسی اس کی ایذاؤں سے محفوظ نہ ہو جائیں، اور جب کوئی بندہ مالِ حرام کماتا ہے پھر اس کو صدقہ کرتا ہے تو وہ قبول نہیں ہوتا، اور اگر اس میں سے خرچ کرتا ہے تو برکت نہیں ہوتی، اور اگر اس کو اپنے وارثوں کے لئے چھوڑ جاتا ہے تو وہ جہنم کی طرف جانے کے لئے اس کا توشہ ہوتا ہے، بیشک اللہ تعالیٰ بُری چیز سے بُرے عمل کو نہیں دھوتے، ہاں اچھے عمل سے بُرے عمل کو دھو دیتے ہیں۔

محشر میں ہر انسان سے پانچ اہم سوالات اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

مَا تَزَالُ قَدَمَا عَبْدٍ یَوْمَ الْقِیَامَةِ حَتّٰی یُسْأَلَ عَنْ اَرْبَعٍ عَنْ عُمُرِہٖ فِیْمَا اَفْنَاہُ وَعَنْ شَبَابِہٖ فِیْمَا اَبْلَاہُ وَعَنْ مَّالِہٖ مِنْ اَیْنَ اکْتَسَبَہٗ وَفِیْمَا اَنْفَقَہٗ وَعَنْ عِلْمِہٖ مَاذَا عَمِلَ فِیْہِ (البیہقی، ترغیب)

"قیامت کے روز محشر میں کوئی بندہ اپنی جگہ سے سرک نہ سکے گا، جب تک اس سے چار[ع] سوالوں کا جواب نہ لیا جائے، ایک یہ کہ اس نے اپنی عمر کس کام میں فنا کی، دوسرے یہ کہ اپنی جوانی کس شغل میں برباد کی، تیسرے یہ کہ اپنا مال کہاں سے کمایا، اور کہاں خرچ کیا، اور چوتھ یہ کہ اپنے علم پر کہاں تک عمل کیا"۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ خطبہ دیا، جس میں فرمایا کہ اے جماعتِ مہاجرین! پانچ خصلتیں ہیں جن کے متعلق مَیں اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ تمھارے اندر پیدا ہو جائیں، ایک یہ کہ جب کسی قوم میں بے حیائی پھیلتی ہے تو ان پر طاعون اور وبائیں اور ایسے نئے نئے امراض مسلّط کر دیئے جاتے ہیں جو ان کے آباء و اجداد نے سُنے بھی نہ تھے، اور دوسرے یہ کہ جب کسی قوم میں ناپ تول کے اندر کمی کرنے کا مرض پیدا ہو جائے تو ان پر قحط اور گرانی اور مشقت و محنت اور حکام کے مظالم مسلّط کر دیئے جاتے ہیں، اور تیسرے یہ کہ جب کوئی قوم زکوٰۃ ادا نہ کرے تو بارش بند کر دی جاتی ہے، اور چوتھے یہ کہ جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے عہد کو توڑ ڈالے تو اللہ تعالیٰ اُن پر اجنبی دشمن مسلّط فرما دیتے ہیں، جو اُن کے مال بغیر کسی حق کے چھین لیتا ہے، اور پانچویں یہ کہ جب کسی قوم کے اربابِ اقتدار کتاب اللہ کے قانون پر فیصلہ نہ کریں، اور اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام اُن کے دل کو نہ لگیں تو

ع بعض روایات میں پانچ کا عدد ہے اس میں مال کے دو سوالوں کو الگ الگ شمار کیا۔

اللہ تعالیٰ اُن کے آپس میں منافرت اور لڑائی جھگڑے ڈال دیتے ہیں۔ (یہ روایت ابن ماجہ اور بیہقی وغیرہ نے نقل کی ہے، اور حاکم نے اس کو صحیح علیٰ شرط مسلم فرمایا ہے)

اللہ تعالیٰ ہم کو اور سب مسلمانوں کو ان آفات سے محفوظ رہنے کی توفیق کامل عطا فرمائیں وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَيْسَ

تجھ سے پوچھتے ہیں حال نئے چاند کا کہہ دے کہ یہ اوقات مقررہ ہیں لوگوں کے واسطے اور حج کے واسطے اور

الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَ

نیکی یہ نہیں کہ گھروں میں آؤ ان کی پشت کی طرف سے اور لیکن نیکی یہ کہ جو کوئی ڈرے اللہ سے اور

اْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾

گھروں میں آؤ دروازوں سے اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم اپنی مراد کو پہنچو،

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ

اور لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو لڑتے ہیں تم سے اور کسی پر زیادتی مت کرو بیشک

اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَ

اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے زیادتی کرنیوالوں کو، اور مار ڈالو اُن کو جس جگہ پاؤ اور

اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ

نکال دو ان کو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا اور دین سے بچلانا مار ڈالنے سے بھی زیادہ سخت ہے،

وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ

اور نہ لڑو ان سے مسجد الحرام کے پاس جب تک کہ وہ نہ لڑیں تم سے اس جگہ پھر اگر وہ

قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾

خود ہی لڑیں تم سے تو ان کو مارو یہی ہے سزا کافروں کی۔

ربط آیات آیت لَیْسَ الْبِرَّ کے تحت بیان ہو چکا ہے کہ اس کے بعد آخر سورۂ بقرہ تک

ابواب البر کا بیان ہوگا، جو اہم احکام شرعیہ پر مشتمل ہیں، ان میں پہلا حکم قصاص کا دوسرا وصیت کا، تیسرا اور چوتھا صوم اور اس کے متعلقہ مسائل کا، پانچواں اعتکاف کا، چھٹا مال حرام سے بچنے کا تھا، مذکورالصدر دو آیتوں میں حج اور جہاد کے احکام و مسائل کا بیان ہے، اور حج کے حکم سے پہلے یہ بتلایا گیا کہ روزہ اور حج وغیرہ میں قمری مہینوں اور دنوں کا اعتبار ہوگا۔

لغات: اَهِلَّة، ہلال کی جمع ہے، قمری مہینہ کی ابتدائی چند راتوں کے چاند کو ھلال کہا جاتا ہے، مَوَاقِيْتُ، میقات کی جمع ہے، جس کے معنی مطلق وقت یا منتہا وقت کے آتے ہیں (قرطبی)

خلاصۂ تفسیر

حکم ہفتم ۷، اعتبار حساب قمری در حج وغیرہ

(بعضے آدمی) آپ سے (ان) چاندوں کے (ہر مہینہ گھٹنے بڑھنے کی) حالت (اور اس میں جو فائدہ ہے اس فائدہ) کی تحقیقات کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ (فائدہ اس کا یہ ہے کہ) وہ چاند (اپنے اس گھٹنے اور بڑھنے کے اعتبار سے لزوماً یا سہولۃً) آلۂ شناخت اوقات ہیں لوگوں کے (اختیاری معاملات مثل عدت و مطالبہ حقوق کے) لئے اور (غیر اختیاری عبادات مثل) حج (و زکوٰۃ و روزہ وغیرہ) کے لئے۔

حکم ہشتم ۸، اصلاح رسم جاہلیت

(بعض لوگ قبل اسلام کے اگر حج کا احرام باندھنے کے بعد کسی ضرورت سے گھر جانا چاہتے تھے، تو دروازہ سے جانا ممنوع جانتے تھے، اس لئے پشت کی دیوار میں نقب دے کر اس میں سے اندر جاتے تھے، اور اس عمل کو فضیلت سمجھتے تھے، حق تعالیٰ اس کے متعلق بعد ذکر حج کے ارشاد فرماتے ہیں) اور اس میں کوئی فضیلت نہیں کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آیا کرو، ہاں لیکن فضیلت یہ ہو کہ کوئی شخص حرام (چیزوں) سے بچے اور (چونکہ گھروں میں دروازہ کی طرف سے آنا حرام نہیں ہے اس لئے اس سے بچنا بھی ضروری نہیں، سو اگر آنا چاہو تو) گھروں میں اُن کے دروازوں سے آؤ، اور (اصل الاصول تو یہ ہو کہ) خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہو (اس سے البتہ) امید ہے کہ تم (دارین میں) کامیاب ہو۔

حکم نہم ۹، قتال کفار

(ذی قعدہ ۶ھ ہجری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ادائے عمرہ کے قصد سے مکہ معظمہ تشریف لے چلے اُس وقت تک مکہ معظمہ مشرکین کے قبضہ اور حکومت میں تھا، ان لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ اور آپ کے ہمراہیوں کو مکہ کے اندر نہ جانے دیا اور عمرہ رہ گیا، آخر بڑی گفتگو کے بعد یہ معاہدہ قرار پایا کہ سال آئندہ

تشریف لاکر عمرہ ادا فرماویں، چنانچہ ذی قعدہ ۷ھ میں پھر آپ اسی قصد سے تشریف لے چلے، لیکن آپ کے ساتھی مسلمانوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ شاید مشرکین اپنا معاہدہ پورا نہ کریں، اور آمادۂ مقابلہ و مقاتلہ نہ ہو جاویں، تو ایسی حالت میں نہ سکوت مصلحت ہے، اور اگر مقابلہ کیا جاوے تو ذی قعدہ میں قتال لازم آتا ہے، اور یہ مہینہ منجملہ اُن چار مہینوں کے ہے جن کو اَشہرِ حُرُم کہا جاتا ہے، ان چاروں مہینوں میں اُس وقت تک قتل و قتال حرام و ممنوع تھا، یہ چار مہینے ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرّم اور رجب تھے، غرض مسلمان اس تردد سے پریشان تھے، حق تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں کہ ان خاص معاہدہ کرنے والوں کے ساتھ بوجہ باہمی معاہدہ کے تم کو اپنی جانب سے ابتداءً قتال کرنے کی اجازت نہیں، لیکن اگر وہ لوگ خود عہد شکنی کریں اور تم سے لڑنے کو آمادہ ہو جاویں تو اُس وقت تم کسی طرح کا اندیشہ دل میں مت لاؤ) اور (بے تکلف) تم (بھی) لڑو اللہ کی راہ میں (یعنی اس نیت سے کہ یہ لوگ دین کی مخالفت کرتے ہیں) ان لوگوں کے ساتھ جو (نقض عہد کرکے) تمہارے ساتھ لڑنے لگیں اور (از خود) حد (معاہدہ) سے مت نکلو، (کہ عہد شکنی کرکے لڑنے لگو،) واقعی اللہ تعالیٰ حد (قانون شرعی) سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے اور (جس حالت میں وہ خود عہد شکنی کریں تو اس وقت دل کھول کر خواہ) ان کو قتل کرو جہاں ان کو پاؤ اور (خواہ) ان کو (مکہ سے) نکال باہر کرو جہاں سے انھوں نے تم کو (تنگ کرکے اور ایذائیں پہنچا کر) نکلنے (اور ہجرت کرنے) پر مجبور کیا ہے، اور (تمھارے اس قتل و اخراج کے بعد بھی عقلاً الزام انھیں پر رہے گا، کیونکہ عہد شکنی جو ان سے واقع ہوگی، بڑی شرارت کی بات ہے اور ایسی) شرارت (ضرر میں) قتل (و اخراج) سے بھی سخت تر ہے (کیونکہ اس قتل و اخراج کی نوبت اس شرارت ہی کی بدولت پہنچی ہے) اور (علاوہ معاہدہ کے ان کے ساتھ ابتداءً قتال کرنے سے ایک اور امر بھی مانع ہو وہ یہ کہ حرم شریف یعنی مکہ اور اس کا گرد اگرد ایک واجب الاحترام جگہ ہے، اور اس میں قتال کرنا اس کے احترام کے خلاف ہے، اس لئے بھی حکم دیا جاتا ہے کہ) ان کے ساتھ مسجد حرام کے قرب (و نواح) میں (جو حرم کہلاتا ہے) قتال مت کرو جب تک کہ وہ لوگ وہاں تم سے خود نہ لڑیں، ہاں اگر وہ (کفار) خود ہی لڑنے کا سامان کرنے لگیں تو (اس وقت پھر تم کو بھی اجازت ہے کہ) تم (بھی) ان کو مارو (دھاڑو) ایسے کافروں کی (جو حرم میں لڑنے لگیں) ایسی ہی سزا ہے۔

معارف و مسائل

پہلی آیت میں صحابۂ کرامؓ کا ایک سوال اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب نقل کیا گیا ہے، امام المفسرین حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ

کی ایک خاص شان ہی، کہ انھوں نے بوجہ عظمت و ہیبت کے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات بہت کم کئے ہیں، بخلاف پچھلی امتوں کے کہ جنھوں نے بکثرت سوالات کئے اور اس ادب کو ملحوظ نہیں رکھا، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ صحابہ کرامؓ کے سوالات جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے کُل چودہ[۱۴] ہیں، جن میں سے ایک سوال ابھی اوپر گذرا ہے، اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ، دوسرا سوال یہ ہے، اور ان کے بعد سورۂ بقرہ ہی میں چھ سوال اور مذکور ہیں، اور باقی چھ سوالات مختلف سورتوں میں آئے ہیں۔

آیتِ مذکورہ میں ذکر یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اَهِلَّة یعنی شروع مہینے کے چاند کے متعلق سوال کیا کہ اس کی صورت آفتاب سے مختلف ہے، کہ وہ کبھی باریک ہلالی شکل میں ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ بڑھتا ہی، پھر پورا دائرہ ہوجاتا ہے، پھر اس میں تدریجی کمی اسی طرح آتی ہے، اس کی حقیقت دریافت کی یا حکمت و مصلحت کا سوال کیا، دونوں احتمال ہیں، مگر جو جواب دیا گیا اس میں حکمت و مصلحت کا بیان ہے، اگر سوال ہی یہ تھا کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے میں حکمت و مصلحت کیا ہی، تب تو جواب اس کے مطابق ہو ہی گیا، اور اگر سوال سے اس گھٹنے بڑھنے کی حقیقت دریافت کرنا مقصود تھا جو صحابہ کرامؓ کی شان سے بعید ہے تو پھر جواب بجائے حقیقت کے حکمت و مصلحت بیان کرنے سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اجرام سماویہ کے حقائق دریافت کرنا انسان کے بس میں بھی نہیں، اور ان کا کوئی دینی یا دنیوی کام اس حقیقت کے علم پر موقوف بھی نہیں، اس لئے حقیقت کا سوال فضول ہے، پوچھنے اور بتلانے کی بات یہ ہے کہ چاند کے اس طرح گھٹنے بڑھنے چھپنے اور طلوع ہونے سے ہمارے کون سے مصالح وابستہ ہیں، اس لئے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرمایا کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ تمھاری مصالح جو چاند سے وابستہ ہیں یہ ہیں کہ اس کے ذریعہ تمھیں اپنے معاملات اور معاہدوں کی میعاد مقرر کرنا اور حج کے ایام معلوم کرنا آسان ہوجائے گا۔

قمری اور شمسی حساب کی شرعی حیثیت

اس آیت سے تو اتنا معلوم ہوا کہ چاند کے ذریعہ تمھیں تاریخوں اور مہینوں کا حساب معلوم ہوجائے گا، جس پر تمھارے معاملات اور عبادات حج وغیرہ کی بنیاد ہے، اسی مضمون کو سورۂ یونس کی آیت ۵ میں اس عنوان سے بیان فرمایا ہے، وَقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ (یونس) جس سے معلوم ہوا کہ چاند کو مختلف منزلوں اور مختلف حالات سے گذارنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سال اور مہینوں اور تاریخوں کا حساب معلوم ہوسکے، مگر سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۲ میں اس حساب کا تعلق آفتاب سے بھی بتلایا گیا ہے وہ یہ ہے:

فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ	"پھر مٹا یا رات کا نمونہ اور بنا دیا دن کا

مُبْصِرَۃً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۝ (۱۷: ۱۲)

نمونہ دیکھنے کو تاکہ تلاش کرو فضل اپنے رب کا اور تاکہ معلوم کرو گنتی برسوں کی اور حساب"

اس تیسری آیت سے اگرچہ یہ ثابت ہوا کہ سال اور مہینوں وغیرہ کا حساب آفتاب سے بھی لگایا جاسکتا ہے (کما ذکرہ فی روح المعانی)

لیکن چاند کے معاملہ میں جو الفاظ قرآن کریم نے استعمال کئے ان سے واضح اشارہ اس طرف نکلتا ہے کہ شریعتِ اسلام میں حساب چاند ہی کا متعین ہے، خصوصاً اُن عبادات میں جن کا تعلق کسی خاص مہینے اور اس کی تاریخوں سے ہے، جیسے روزۂ رمضان، حج کے مہینے، حج کے ایام، محرم، شبِ برأت وغیرہ سے جو احکام متعلق ہیں وہ سب رویتِ ہلال سے متعلق کئے گئے ہیں کیونکہ اس آیت میں ہِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ فرما کر بتلادیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حساب چاند ہی کا معتبر ہے، اگرچہ یہ حساب آفتاب سے بھی معلوم ہوسکتا ہے۔

شریعتِ اسلام نے چاند کے حساب کو اس لئے اختیار فرمایا کہ اس کو ہر آنکھوں والا افق پر دیکھ کر معلوم کرسکتا ہے، عالم، جاہل، دیہاتی، جزیروں، پہاڑوں کے رہنے والے جنگلی سب کو اس کا علم آسان ہے، بخلاف شمسی حساب کے کہ وہ آلاتِ رصدیہ اور قواعد ریاضیہ پر موقوف ہے جس کو ہر شخص آسانی سے معلوم نہیں کرسکتا، پھر عبادات کے معاملہ میں تو قمری حساب کو بطور فرض متعین کردیا، اور عام معاملات تجارت وغیرہ میں بھی اسی کو پسند کیا، جو عبادتِ اسلامی کا ذریعہ ہو اور ایک طرح کا اسلامی شعار ہو، اگرچہ شمسی حساب کو بھی ناجائز قرار نہیں دیا، شرط یہ ہے کہ اس کا رواج اتنا عام نہ ہوجائے کہ لوگ قمری حساب کو بالکل بھلادیں، کیونکہ ایسا کرنے میں عبادات روزہ وحج وغیرہ میں خلل لازم آتا ہے، جیسا اس زمانے میں عام دفتروں اور کاروباری اداروں بلکہ نجی اور شخصی مکاتبات میں بھی شمسی حساب کا ایسا رواج ہوگیا ہے کہ بہت سے لوگوں کو اسلامی مہینے بھی پورے یاد نہیں رہے، یہ شرعی حیثیت کے علاوہ غیرت قومی و ملّی کا بھی دیوالیہ پن ہے، اگر دفتری معاملات میں جن کا تعلق غیر مسلموں سے بھی ہے ان میں صرف شمسی حساب رکھیں، باقی نجی خط وکتابت اور روزمرہ کی ضروریات میں قمری اسلامی تاریخوں کا استعمال کریں تو اس میں فرض کفایہ کی ادائیگی کا ثواب بھی ہوگا، اور اپنا قومی شعار بھی محفوظ رہے گا۔

مسئلہ: لَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُھُوْرِھَا، اس آیت سے یہ مسئلہ بھی نکل آیا کہ جس چیز کو شریعتِ اسلام نے ضروری یا عبادت نہ سمجھا ہو اس کو اپنی طرف سے ضروری اور عبادت سمجھ لینا جائز نہیں، اسی طرح جو چیز شرعاً جائز ہو اس کو گناہ سمجھنا بھی گناہ ہے، ان

لوگوں نے ایسا ہی کر رکھا تھا کہ گھر کے دروازوں سے داخل ہونا جو شرعاً جائز تھا اس کو گناہ قرار دیا، اور مکان کی پشت سے دیوار توڑ کر آنا جو شرعاً ضروری نہیں تھا اس کو ضروری سمجھا، اسی پر ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی، بدعات کے ناجائز ہونے کی بڑی وجہ یہی ہے کہ غیر ضروری چیزوں کو فرض و واجب کی طرح ضروری سمجھ لیا جاتا ہے، یا بعض جائز چیزوں کو حرام و ناجائز قرار دیدیا جاتا ہے، اس آیت سے ایسا کرنے کی ممانعت واضح طور پر ثابت ہوگئی جس سے ہزاروں اعمال کا حکم معلوم ہوگیا۔

حکمِ جہاد و قتال

اس پر ساری امت کا اتفاق ہے کہ ہجرت مدینہ سے پہلے کفار کے ساتھ جہاد و قتال ممنوع تھا، اس وقت کی تمام آیاتِ قرآنی میں مسلمانوں کو کفار کی ایذاؤں پر صبر اور عفو و درگذر ہی تلقین تھی، ہجرتِ مدینہ کے بعد سب سے پہلے اس آیت میں قتالِ کفار کا حکم آیا، (قالہ الربیع بن انسؓ وغیرہ) اور صدیق اکبرؓ سے ایک روایت یہ بھی ہو کہ قتالِ کفار کے متعلق پہلی آیت یہ ہے: اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (۲۲: ۳۹) مگر اکثر حضراتِ صحابہؓ و تابعینؒ کے نزدیک پہلی آیت سورۂ بقرہ کی آیتِ مذکورہ ہی ہو اور صدیق اکبرؓ نے جسکو پہلی فرمایا ہے وہ بھی ابتدائی آیتوں میں ہونے کے سبب پہلی کہی جاسکتی ہے۔

اس آیت میں حکم یہ ہو کہ مسلمان صرف اُن کافروں سے قتال کریں جو اُن کے مقابلہ پر قتال کے لئے آویں، اس سے مراد یہ ہے کہ عورتیں، بچے، بہت بوڑھے اور اپنے مذہبی شغل میں دنیا سے یکسو ہو کر لگے ہوئے عبادت گذار راہب، پادری وغیرہ اور ایسے ہی اپاہج و معذور لوگ، یا وہ لوگ جو کافروں کے یہاں محنت مزدوری کا کام کرتے ہیں ان کے ساتھ جنگ میں شریک نہیں ہوتے ایسے لوگوں کو جہاد میں قتل کرنا جائز نہیں، کیونکہ حکم آیت کا صرف ان لوگوں سے قتال کرنے کا ہو، جو مسلمانوں کے مقابلہ میں قتال کریں، اور مذکورہ قسم کے سب افراد قتال کرنے والے نہیں اسی لئے فقہاء رحمہم اللہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر کوئی عورت یا بوڑھا یا مذہبی آدمی وغیرہ کفار کی طرف سے قتال میں شریک ہوں، یا مسلمانوں کے بالمقابل جنگ میں ان کی مدد کسی طرح سے کر رہے ہوں ان کا قتل جائز ہے، کیونکہ وہ اَلَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ میں داخل ہیں (مظہری، قرطبی، جصاص)

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات جو مجاہدینِ اسلام کو بوقت جہاد دی جاتی تھیں، ان میں اس حکم کی واضح تشریحات مذکور ہیں، صحیح بخاری و مسلم میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایک حدیث میں ہے:

نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قَتْلِ النِّسَآءِ وَالصِّبْيَانِ	"یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا ہے"

اور ابوداؤد میں بروایت انسؓ جہاد پر جانے والے صحابہ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایات منقول ہیں، تم اللہ کے نام پر اور رسول اللہ ﷺ کی ملت پر جہاد کے لئے جاؤ، کسی بوڑھے ضعیف کو اور چھوٹے بچے کو یا کسی عورت کو قتل نہ کرو (مظہری)

حضرت صدیق اکبرؓ نے جب یزید بن ابی سفیانؓ کو ملک شام بھیجا تو ان کو یہی ہدایت دی، اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ عبادت گذار اور راہبوں کو اور کافروں کی مزدوری کرنے والوں کو بھی قتل نہ کریں، جبکہ وہ قتال میں حصہ نہ لیں (قرطبی)

آیت کے آخر میں وَلَا تَعْتَدُوْا کا بھی جمہور مفسرین کے نزدیک یہی مطلب ہے کہ قتال میں حد سے تجاوز نہ کرو، کہ عورتوں بچوں وغیرہ کو قتل کرنے لگو۔

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ۔ خلاصۂ تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ یہ آیت واقعۂ حدیبیہ کے بعد اس وقت نازل ہوئی ہے، جب صلح حدیبیہ کی شرط کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ کے ساتھ اس عمرہ کی قضاء کے لئے سفر کا ارادہ کیا، جس سے اس سے پہلے سال میں کفار مکہ نے روک دیا تھا، صحابۂ کرامؓ کو اس سفر کے وقت یہ خیال ہو رہا تھا کہ کفار کی صلح اور معاہدہ کا کچھ بھروسہ نہیں، اگر وہ لوگ اس سال بھی آمادۂ پیکار ہو گئے تو ہمیں کیا کرنا چاہئے، اس پر آیتِ مذکورہ کے الفاظ نے ان کو اجازت دیدی کہ اگر وہ قتال کرنے لگیں تو تمھیں بھی اجازت ہے، کہ جہاں پاؤ ان کو قتل کرو، اور اگر قدرت میں ہو تو جس طرح انھوں نے مسلمانوں کو مکہ مکرمہ سے نکال دیا تھا تم بھی ان کو مکہ سے نکال دو۔

اور پوری مکی زندگی میں جو مسلمانوں کو کفار کے ساتھ مقاتلہ سے روکا ہوا تھا، اور ہمیشہ عفو و درگذر کی تلقین ہوتی رہی تھی، اس لئے صحابۂ کرامؓ کو اس آیت کے نازل ہونے سے یہی خیال تھا کہ کسی کافر کو قتل کرنا بُرا اور ممنوع ہے، اس خیال کے ازالہ کے لئے فرمایا وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ، یعنی یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ کسی کو قتل کرنا سخت بُرا کام ہے، مگر کفار مکہ کا اپنے کفر و شرک پر جمار ہنا اور مسلمانوں کو ادائے عبادت حج و عمرہ سے روکنا اس سے زیادہ سخت و شدید ہے، اس سے بچنے کے لئے ان کو قتل کرنے کی اجازت دیدی گئی ہے، آیت میں لفظ فتنہ سے کفر و شرک اور مسلمانوں کو ادائے عبادت سے روکنا ہی مراد ہے (جصاص، قرطبی وغیرہ)

البتہ اس آیت کے عموم سے جو یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ کفار جہاں کہیں ہوں ان کا قتل کرنا جائز ہے، اس عموم کی ایک تخصیص آیت کے اگلے جملے میں اس طرح کر دی گئی وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ

اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ، یعنی مسجد حرام کے آس پاس جس سے مراد پورا حرم مکہ ہے اُس میں تم ان لوگوں سے اس وقت تک قتال نہ کرو جب تک وہ خود قتال کی ابتداء نہ کریں۔

مسئلہ: حرم مکہ میں انسان کیا کسی شکاری جانور کو بھی قتل کرنا جائز نہیں، لیکن اسی آیت سے معلوم ہوا کہ اگر حرم محترم میں کوئی آدمی دوسرے کو قتل کرنے لگے تو اس کو بھی مدافعت میں قتال کرنا جائز ہے، اس پر جمہور فقہاء کا اتفاق ہے۔

مسئلہ: اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ابتداءً جہاد و قتال کی ممانعت صرف مسجد حرام کے آس پاس حرم مکہ کے ساتھ مخصوص ہے، دوسرے مقامات میں جیسے دفاعی جہاد ضروری ہے اسی طرح ابتدائی جہاد و قتال بھی درست ہے۔

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ

پھر اگر وہ باز آئیں تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے، اور لڑو ان سے یہاں تک کہ

فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى

نہ باقی رہے فساد اور حکم رہے خدا تعالیٰ ہی کا پھر اگر وہ باز آئیں تو کسی پر زیادتی نہیں مگر

الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ۭ

ظالموں پر، حرمت والا مہینہ بدلہ (مقابل) ہے حرمت والے مہینہ کے اور ادب رکھنے میں بدلہ ہے،

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۠

پھر جس نے تم پر زیادتی کی تم اس پر زیادتی کرو جیسی اس نے زیادتی کی تم پر

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ وَاَنْفِقُوْا فِيْ

اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان لو کہ اللہ ساتھ ہے پرہیزگاروں کے، اور خرچ کرو اللہ

سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ڔ وَاَحْسِنُوْا ڔ

کی راہ میں اور نہ ڈالو اپنی جان کو ہلاکت میں، اور نیکی کرو

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾

بیشک اللہ دوست رکھتا ہے نیکی کرنیوالوں کو

خلاصۂ تفسیر | پھر اگر (بعد شروع قتال کے بھی) وہ لوگ (یعنی مشرکین مکہ اپنے کفر سے) باز آجاویں

(اور اسلام قبول کرلیں) تو (ان کا اسلام بے قدر نہ سمجھا جاوے گا بلکہ) اللہ تعالیٰ (ان کے گذشتہ کفر کو) بخش دے گا اور (مغفرت کے علاوہ بے شمار نعمتیں دے کر ان پر) مہربانی (بھی) فرمادیں گے۔ اور (اگر وہ لوگ اسلام نہ لاویں تو اگرچہ دوسرے کفار کے لئے اسلامی قانون یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب پر رہتے ہوئے بھی اگر اسلامی حکومت کی اطاعت اور جزیہ دینے کا اقرار کرلیں تو ان کا قتل جائز نہیں رہتا، بلکہ ان کے حقوق کی حفاظت اسلامی حکومت پر لازم ہوجاتی ہے، مگر یہ خاص کفار چونکہ اہل عرب ہیں، ان کے لئے قانونِ جزیہ نہیں، بلکہ ان کے لئے صرف دو راستے ہیں اسلام یا قتل اس واسطے) ان کے ساتھ اس حد تک لڑو کہ (ان میں) فساد عقیدہ (یعنی شرک) نہ رہے اور (ان کا) دین (خالص) اللہ ہی کا ہوجاوے (اور کسی کا دین ومذہب کا خالصاً اللہ کے لئے ہوجانا موقوف ہے، قبولِ اسلام پر، تو حاصل یہ ہوا کہ شرک چھوڑ کر اسلام اختیار کرلیں) اور اگر وہ لوگ (کفر سے) باز آجاویں (جس کا ذکر ابھی ہوا ابھی ہے) تو (آخرت میں مغفرت ورحمت کے مستحق ہونے کے ساتھ دنیا میں ان کے لئے تم کو یہ قانون بتلایا جاتا ہے کہ سزا کی) سختی کسی پر نہیں ہوا کرتی، بجز بے انصافی کرنے والوں کے (جو براہ بے انصافی خدائی احسانات کو بھول کر کفر وشرک کرنے لگیں اور جب یہ لوگ اسلام لے آئے تو بے انصاف نہ رہے، لہٰذا ان پر سزائے قتل کی سختی نہ رہی، اور مسلمانو! تم کو جو یہ خیال ہے کہ کفارِ مکہ اگر اپنے عہد پر قائم نہ رہے تو شہر حرام یعنی ذی قعدہ میں اُن سے لڑنا پڑے گا، سو اس سے بھی بے فکر رہو، کیونکہ) حرمت والا مہینہ (تم کو قتال کفار سے مانع ہوسکتا) ہے بعوض (اس کے کہ اس) حرمت والے مہینہ کے (سبب وہ بھی تم سے قتال نہ کریں) اور (وجہ یہ ہے کہ) یہ حرمتیں تو عوض معاوضہ کی چیزیں ہیں (سو جو تمہارے ساتھ ان حرمتوں کی رعایت کرے تو تم بھی رعایت رکھو اور) جو تم پر (ایسی حرمتوں کی رعایت نہ کرکے) زیادتی کرے تو تم بھی اس پر زیادتی کرو، جیسی اس نے تم پر زیادتی کی ہے اور (ان سب احکام مذکورہ کے برتاؤ میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (کہ کسی امر میں حدِ قانونی سے تجاوز نہ ہونے پاوے) اور یقین کرلو کہ اللہ تعالیٰ (اپنی عنایت ورحمت سے) ان ڈرنے والوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔

حکم دہم انفاق فی الجہاد

اور تم لوگ (جان کے ساتھ مال بھی) خرچ کیا کرو اللہ کی راہ (یعنی جہاد) میں اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں مت ڈالو (کہ ایسے مواقع میں جان ومال خرچ کرنے سے جبن یا بخل کرنے لگو، جس کا نتیجہ تمہارا ضعیف اور مخالف کا قوی ہوجانا ہے، جو کہ عین تباہی ہے) اور (جو) کام (کرو) اچھی طرح کیا کرو (مثلاً اس موقع پر خرچ کرنا ہو دل کھول کر خوشی سے اچھی نیت کیساتھ خرچ کرو) بلاشبہ اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں اچھی طرح

کام کرنے والوں کو۔

معارف و مسائل

۶ھ ہجری میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے قانون کے مطابق فوت شدہ عمرہ ادا کرنے کے لئے بہ معیت صحابہؓ مکہ کے سفر کا ارادہ کیا تو صحابہ کرامؓ جانتے تھے کہ ان کفار کے معاہدوں اور صلح کا کچھ اعتبار نہیں، ممکن ہو کہ وہ جنگ کرنے لگیں، تو اس جنگ میں صحابہؓ کے لئے ایک اشکال تو یہ تھا کہ حرم مکہ میں جنگ کی نوبت آئے گی، جو اسلام میں ناجائز ہو، اس کا جواب پچھلی آیت میں دیدیا گیا، کہ حرم مکہ کی حرمت مسلمانوں پر ضرور لازم ہے، لیکن اگر کفار حدود حرم میں ہی مسلمانوں سے جنگ کرنے لگیں تو ان کو بھی مدافعت میں جنگ کرنا جائز ہے۔

دوسرا اشکال یہ تھا کہ یہ مہینہ ذیقعدہ کا ہے جو اُن چار مہینوں میں سے ہے، جن کو اشہر حُرُم کہا جاتا ہو، اور ان میں کسی سے کسی جگہ جنگ کرنا جائز نہیں، تو اگر مشرکین مکہ نے ہمارے خلاف جنگ شروع کر دی تو ہم اس مہینے میں دفاعی جنگ کیسے کر سکتے ہیں، اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی، کہ جیسے حرم مکہ کی حرمت سے حالتِ دفاع مستثنیٰ ہے، اسی طرح اگر اشہر حُرُم میں کافر ہم سے قتال کرنے لگیں تو ہم کو بھی اُن سے دفاعی جنگ لڑنا جائز ہے۔

مسئلہ: اشہر حرم چار مہینے ہیں، ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرّم یہ تین ماہ تو مسلسل ہیں، چوتھا مہینہ رجب کا ہے، اسلام سے پہلے بھی ان چار مہینوں میں جنگ کو حرام سمجھا جاتا تھا، اور مشرکین مکہ بھی اس کے پابند تھے، ابتداءِ اسلام میں بھی ۶ھ ہجری تک یہی قانون نافذ تھا، اسی لئے صحابہ کرامؓ کو اشکال پیش آیا، اس کے بعد یہ حرمتِ قتال منسوخ کر کے عام قتال کی اجازت باجماعِ اُمت دیدی گئی مگر افضل اب بھی یہی ہے کہ ان چار مہینوں میں ابتداءً بالقتال نہ کی جائے، صرف مدافعت کی ضرورت سے قتال کیا جائے، اس لحاظ سے یہ کہنا بھی فی الجملہ درست ہو کہ اشہر حرم کی حرمت منسوخ نہیں، باقی ہے، جیسے حرم مکہ میں قتال کی اجازت بضرورت مدافعت دینے سے حرم مکہ کی حرمت منسوخ نہیں ہوئی، بلکہ صرف ایک استثنائی صورت پر عمل ہوا۔

دسواں حکم جہاد کے لئے مال خرچ کرنا

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ، اس میں مسلمانوں پر لازم کیا گیا ہے کہ جہاد کے لئے بقدر ضرورت اپنے اموال بھی اللہ کی راہ میں خرچ کریں، اس سے فقہاء نے یہ حکم بھی نکالا ہے کہ مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض کے علاوہ بھی دوسرے حقوق فرض ہیں، مگر وہ نہ دائمی ہیں اور نہ اُن کے لئے کوئی نصاب اور مقدار

متعین ہے، بلکہ جب اور جتنی ضرورت ہو اس کا انتظام کرنا سب مسلمانوں پر فرض ہے، اور ضرورت نہ ہو تو کچھ فرض نہیں، جہاد کا خرچ بھی اسی میں داخل ہے۔

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ کے لفظی معنے تو ظاہر ہیں، کہ اپنے اختیار سے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کی ممانعت بیان فرمائی ہے، اب یہ بات کہ ہلاکت میں ڈالنے سے اس جگہ کیا مراد ہے؟ اس میں حضرات مفسرین کے اقوال مختلف ہیں، اور امام جصاصؒ رازی نے فرمایا کہ ان سب اقوال میں کوئی تضاد نہیں، سب ہی مراد ہو سکتے ہیں، حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے فرمایا کہ یہ آیت ہمارے ہی بارے میں نازل ہوئی ہے، ہم اس کی تفسیر بخوبی جانتے ہیں، بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ اور قوت عطا فرما دیا تو ہم میں یہ گفتگو ہوئی کہ اب جہاد کی کیا ضرورت ہے، ہم اپنے وطن میں ٹھہر کر اپنے مال و جائداد کی خبر گیری کریں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس نے یہ بتلا دیا کہ ہلاکت سے مراد اس جگہ ترکِ جہاد ہے، اور اس سے ثابت ہوا کہ ترکِ جہاد مسلمانوں کی ہلاکت و بربادی کا سبب ہے، اسی لئے حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے عمر بھر جہاد میں صرف کردی، یہاں تک کہ آخر میں قسطنطنیہ میں وفات پاکر وہیں مدفون ہوئے۔

حضرت ابن عباسؓ، حذیفہؓ، قتادہؒ، مجاہدؒ، ضحاکؒ ائمہ تفسیر سے بھی یہی مضمون منقول ہے۔

حضرت براء بن عازبؓ نے فرمایا کہ گناہوں کی وجہ سے اللہ کی رحمت اور مغفرت سے مایوس ہو جانا اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں ڈالنا ہے، اس لئے مغفرت سے مایوس ہونا حرام ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے میں حد سے تجاوز کرنا کہ بیوی بچوں کے حقوق ضائع ہو جائیں، یہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے، ایسا اسراف جائز نہیں۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ ایسی صورت میں قتال کے لئے اقدام کرنا اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے، جبکہ یہ اندازہ ظاہر ہے کہ دشمن کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، خود ہلاک ہو جائیں گے، ایسی صورت میں اقدامِ قتال اس آیت کی بناء پر ناجائز ہے۔

اور جصاصؒ کے فرمانے کے مطابق یہ سب ہی احکام اس آیت سے مستفاد ہوتے ہیں۔

وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔ اس جملے میں ہر کام کو اچھی طرح کرنے کی ترغیب ہے، اور کام کو اچھی طرح کرنا جس کو قرآن میں احسان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، دو طرح کا ہے، ایک عبادت میں دوسرے آپس کے معاملات و معاشرت میں، عبادت میں احسان کی تفسیر حدیثِ جبرئیلؑ میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ہے کہ ایسی طرح عبادت کرو جیسے تم خدا کو دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ درجہ حاصل نہ ہو تو کم از کم یہ تو اعتقاد لازم ہی

ہو کہ خدا تعالیٰ تمھیں دیکھ رہے ہیں۔

اور معاملات و معاشرت میں احسان کی تفسیر مسند احمد میں بروایت حضرت معاذؓ حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ہے کہ تم سب لوگوں کے لئے وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو اور جس چیز کو تم اپنے لئے برا سمجھتے ہو وہ دوسروں کے لئے بھی برا سمجھو۔ (مظہری)

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ

اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ کے واسطے پھر اگر تم روک دیئے جاؤ تو تم پر ہے جو کچھ کہ میسر ہو

الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ

قربانی سے اور حجامت نہ کرو اپنے سروں کی جب تک نہ پہونچ چکے قربانی اپنے ٹھکانے پر پھر جو

كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ

کوئی تم میں سے بیمار ہو یا اس کو تکلیف ہو سر کی تو بدلہ دیوے روزے یا خیرات

اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ٭ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى

یا قربانی، پھر جب تمہاری خاطر جمع ہو تو جو کوئی فائدہ اٹھاوے عمرہ ملا کر

الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ

حج کے ساتھ تو اس پر ہے جو کچھ میسر ہو قربانی سے پھر جس کو قربانی نہ ملے تو روزے رکھے تین

اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ

حج کے دنوں میں اور سات روزے جب لوٹو یہ دس روزے ہوئے پورے، یہ حکم

لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ

اس کے لئے ہے جس کے گھر والے نہ رہتے ہوں مسجد الحرام کے پاس اور ڈرتے رہو اللہ سے اور

ع ۲۴ ۸ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ

جان لو کہ بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے، حج کے چند مہینے ہیں معلوم،

فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِى

پھر جس شخص نے لازم کر لیا ان میں حج تو بے حجاب ہونا جائز نہیں عورت سے اور نہ گناہ کرنا اور نہ جھگڑا کرنا

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللَّهُ ۗ وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ

حج کے زمانے میں اور جو کچھ تم کرتے ہو نیکی اللہ اس کو جانتا ہے اور زادِ راہ لے لیا کرو کہ بیشک بہتر

الزَّادِ التَّقْوَىٰ ۚ وَاتَّقُونِ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ ﴿١٩٧﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ

فائدہ زادِ راہ کا بچنا ہے سوال سے اور مجھ سے ڈرتے رہو اے عقلمندو، کچھ گناہ نہیں تم پر کہ

أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ ۚ فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا

تلاش کرو فضل اپنے رب کا پھر جب طواف کے لئے لوٹو عرفات سے تو یاد کرو

اللَّهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۖ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ ۚ وَإِنْ كُنْتُمْ

اللہ کو نزدیک مشعر الحرام کے اور اس کو یاد کرو جس طرح تم کو سکھلایا اور بیشک تم تھے

مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ ﴿١٩٨﴾ ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ

اس سے پہلے ناواقف، پھر طواف کے لئے پھرو جہاں سے سب لوگ پھریں،

وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٩٩﴾ فَإِذَا قَضَيْتُمْ

اور مغفرت چاہو اللہ سے بےشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے مہربان، پھر جب پورے کر چکو

مَنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۗ

اپنے حج کے کاموں کو تو یاد کرو اللہ کو جیسے تم یاد کرتے تھے اپنے باپ دادوں کو بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ

پھر کوئی آدمی تو کہتا ہے اے رب ہمارے دے ہم کو دنیا میں اور اس کے لئے آخرت میں کچھ

مِنْ خَلَاقٍ ﴿٢٠٠﴾ وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً

حصہ نہیں، اور کوئی ان میں کہتا ہے اے رب ہمارے دے ہم کو دنیا میں خوبی اور

وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿٢٠١﴾ أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ

آخرت میں خوبی اور بچا ہم کو دوزخ کے عذاب سے، انہی لوگوں کے واسطے حصہ ہے

مِمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٢٠٢﴾ وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ

اپنی کمائی سے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے، اور یاد کرو اللہ کو گنتی کے چند

مَّعۡدُوۡدٰتٍؕ فَمَنۡ تَعَجَّلَ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡهِۚ وَمَنۡ تَاَخَّرَ

دنوں میں پھر جو کوئی جلدی چلا گیا دو ہی دن میں تو اس پر گناہ نہیں اور جو کوئی رہ گیا

فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡهِۙ لِمَنِ اتَّقٰىؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّكُمۡ اِلَیۡهِ

تو اس پر بھی کچھ گناہ نہیں جو کہ ڈرتا ہے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان لو بیشک تم سب

تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۲۰۳﴾

اسی کے پاس جمع ہوگے۔

خلاصۂ تفسیر

گیارہواں حکم متعلق حج و عمرہ

اور (جب حج یا عمرہ کرنا ہو تو اس) حج اور عمرہ کو اللہ تعالیٰ کے (راضی کرنے کے) واسطے پورا پورا ادا کیا کرو (کہ اعمال و آداب بھی سب بجا لاؤ اور نیت بھی خالص ثواب ہی کی ہو) پھر اگر (کسی دشمن کی جانب سے یا کسی مرض کے سبب سے حج و عمرہ کے پورا کرنے سے) روک دیئے جاؤ تو (اس حالت میں یہ حکم ہے کہ) قربانی کا جانور جو کچھ میسر ہو (ذبح کرے اور حج و عمرہ کی جو وضع اختیار کر رکھی تھی موقوف کرے اس کو احرام کھولنا کہتے ہیں جس کا طریقہ شرع میں سر منڈانا ہے، اور بال کٹا دینے کا بھی یہی اثر ہے) اور (یہ نہیں کہ فوراً روک ٹوک کے ساتھ ہی تم کو احرام کھولنا درست ہو جاوے، بلکہ) اپنے سروں کو (احرام کھولنے کی غرض سے) اس وقت تک مت منڈاؤ جب تک کہ (وہ) قربانی (کا جانور جس کے ذبح کا اس حالت میں حکم تھا) اپنے موقع پر نہ پہنچ جاوے (اور وہ موقع حرم ہے کہ اس قربانی کا جانور حدود حرم ہی میں ذبح کیا جا سکتا ہے وہاں اگر خود نہ جا سکے، تو کسی کے ہاتھ بھیج کر ذبح کرایا جاوے جب جانور ذبح ہو جاوے اس وقت احرام کھولنا جائز ہوگا) البتہ اگر کوئی تم میں سے (کچھ) بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ (زخم یا درد یا جوؤں وغیرہ کی) تکلیف ہو (اور اس بیماری یا تکلیف کی وجہ سے پہلے ہی سر منڈانے کی ضرورت پڑے) تو (اس کو اجازت ہے کہ وہ سر منڈا کر) فدیہ (یعنی اس کا شرعی بدلہ) دیدے (یعنی خواہ تین) روزے سے یا (چھ مسکینوں کو فی مسکین صدقۂ فطر کے برابر یعنی نصف صاع گیہوں) خیرات (کے طور پر) دیدینے سے یا (ایک بکری) ذبح کر دینے سے پھر جب تم امن کی حالت میں ہو (خواہ تو پہلے ہی سے کوئی خوف و مزاحمت پیش نہیں آیا، یا ہو کر جاتا رہا) تو (اس صورت میں حج و عمرہ

کے متعلق قربانی کرنا ہر ایک کے ذمہ نہیں ہر بلکہ خاص) جو شخص عمرہ سے اس کو حج کے ساتھ ملا کر منتفع ہوا ہو (یعنی ایام حج میں عمرہ بھی کیا ہو) تو (فقط اس پر واجب ہے کہ) جو کچھ قربانی میسر ہو (ذبح کرے اور جس نے صرف عمرہ کیا ہو یا صرف حج کیا ہو اس پر حج یا عمرہ کے متعلق کوئی قربانی نہیں) پھر (ایام حج میں حج و عمرہ کو جمع کرنے والوں میں سے) جس شخص کو قربانی کا جانور میسر نہ ہو (مثلاً غریب ہے) تو (اس کے ذمہ بجائے قربانی کے) تین دن کے روزے ہیں (ایام) حج میں (کہ آخر ان ایام کا نویں تاریخ ذی الحجہ ہی) اور سات (دن کے روزے) ہیں، جبکہ حج سے تمہارے لوٹنے کا وقت آجاوے (یعنی حج کر چکو خواہ لوٹنا ہو یا کہ وہیں رہنا ہو) یہ پورے دس (دن کے روزے) ہوئے (اور یہ بھی یاد رکھو کہ ابھی جو حج و عمرہ کے ملانے کا حکم ہوا ہے) یہ (ملانا ہر ایک کو درست نہیں بلکہ خاص) اس شخص کے لئے (درست) ہے جس کے اہل (و عیال) مسجد حرام (یعنی کعبہ) کے قرب (نواح) میں نہ رہتے ہوں (یعنی حدود حرم مکہ میں ان کا وطن نہ ہو) اور (ان سب احکام کی بجاآوری میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (کہ کسی امر میں خلاف نہ ہو جاوے) اور (خوب) جان لو کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ (بیباکی اور مخالفت کرنے والوں کو) سزائے سخت دیتے ہیں۔

(زمانہ افعال) حج (کا) چند مہینے ہیں جو (مشہور و) معلوم ہیں (ایک شوال، دوسرا ذی قعدہ تیسرا دس تاریخیں ذی الحجہ کی) سو جو شخص ان (ایام) میں (اپنے ذمہ) حج مقرر کرلے (کہ حج کا احرام باندھ لے) تو پھر (اس شخص کو) نہ کوئی فحش بات (جائز) ہے اور نہ کوئی بے حکمی (درست) ہے، اور نہ کسی قسم کا نزاع (و تکرار) زیبا ہے، (بلکہ اس کو چاہیئے کہ ہر وقت نیک ہی کاموں میں لگا رہے) اور جو نیک کام کرو گے خدا تعالیٰ کو اس کی اطلاع ہوتی ہے (سو اس کا ثمرہ تم کو عنایت ہوگا) اور (جب حج کو جانے لگو تو) خرچ ضرور (ساتھ) لیلیا کرو، سب سے بڑی بات (اور خوبی) خرچ میں (گداگری سے) بچا رہنا ہے اور اے ذی عقل لوگو (ان احکام کی تعمیل میں) مجھ سے ڈرتے رہو (اور کسی حکم کے خلاف مت کرو)۔

(اور اگر حج میں کچھ اسباب تجارت ہمراہ لیجانا مصلحت سمجھو تو) تم کو اس میں ذرا بھی گناہ نہیں کہ (حج میں) معاش کی تلاش کرو جو (تمہاری قسمت میں) تمہارے پروردگار کی طرف سے (لکھی) ہے، پھر جب تم لوگ عرفات (میں ٹھہر کر وہاں) سے واپس آنے لگو تو مشعرِ حرام کے پاس (یعنی مزدلفہ میں آکر شب کو وہاں قیام کرکے) خدا تعالیٰ کی یاد کرو اور (یاد کرنے کے طریقہ میں اپنی رائے کو دخل مت دو، بلکہ) اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو (اللہ تعالیٰ نے) بتلا رکھا ہے، اور حقیقت میں قبل اس (بتلانے) کے تم محض ہی ناواقف تھے، پھر (اس میں اور بھی بات یاد رکھو کہ جیسا قریش نے دستور نکال رکھا تھا کہ تمام حجاج تو عرفات میں ہو کر پھر وہاں سے مزدلفہ کو آتے تھے اور یہ مزدلفہ ہی

میں رہ جاتے تھے، عرفات نہ جاتے تھے، یہ جائز نہیں، بلکہ) تم سب کو (خواہ قریش ہوں یا غیر قریش) ضروری ہے کہ اسی جگہ ہو کر واپس آؤ، جہاں اور لوگ جا کر وہاں سے واپس آتے ہیں اور (احکامِ حج میں پرانی رسموں پر عمل کرنے سے) خدا تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کردینگے اور مہربانی فرمادیں گے۔

(جاہلیت میں بعضوں کی تو یہ عادت تھی کہ حج سے فارغ ہو کر منیٰ میں جمع ہو کر اپنے آباء و اجداد کے مفاخر و فضائل بیان کیا کرتے، حق تعالیٰ بجائے اس بیہودہ شغل کے اپنے ذکر کی تعلیم کے لئے فرماتے ہیں کہ) پھر جب تم اپنے اعمالِ حج پورے کرچکا کرو تو حق تعالیٰ کا (شکر و عظمت کے ساتھ) ذکر کیا کرو جس طرح تم اپنے آباء (و اجداد) کا ذکر کیا کرتے ہو بلکہ یہ ذکر اس سے (بدرجہا) بڑھ کر ہو (نا چاہئے اور بعضوں کی عادت تھی کہ حج میں ذکر تو اللہ تعالیٰ ہی کا کرتے تھے لیکن چونکہ آخرت کے قائل نہ تھے، لہٰذا تمامتر ذکر ان کا صرف دنیا کے لئے دعاء مانگنا ہوتا تھا، حق تعالیٰ صرف دنیا طلبی کی مذمت بیان فرما کر بجائے اس کے خیر دارین طلب کرنے کی ترغیب دینے کے لئے فرماتے ہیں) سو بعضے آدمی (جو کہ کافر ہیں) ایسے ہیں جو (دعاء میں یوں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو (جو کچھ دینا ہو) دنیا میں دیدیجئے (وبس، سو ان کو جو کچھ ملنا ہوگا دنیا ہی میں مل رہے گا) اور ایسے شخص کو آخرت میں (بوجہ انکار آخرت کے) کوئی حصہ نہ ملے گا، اور بعضے آدمی (جو کہ مومن ہیں) ایسے ہیں جو (دعاء میں یوں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں بھی بہتری عنایت کیجئے، اور آخرت میں بھی بہتری دیجئے، اور ہم کو عذابِ دوزخ سے بچائیے (سو یہ لوگ اوپر کے لوگوں کی طرح بے بہرہ نہیں بلکہ) ایسے لوگوں کو (دونوں جہان میں) بڑا حصہ ملے گا، بدولت ان کے اس عمل (یعنی طلب خیر دارین) کے اور اللہ تعالیٰ جلدی ہی حساب لینے والے ہیں (کیونکہ قیامت میں حساب ہوگا، اور قیامت نزدیک آتی جاتی ہے، جب حساب جلدی ہونے والا ہے تو وہاں کی بہتری کو مت بھولو) اور (منیٰ میں خاص طریقہ سے بھی) اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، کئی روز تک (وہ خاص طریقہ کنکریوں کا خاص تین پتھروں پر مارنا ہے، اور وہ کئی روز دسویں گیارہویں بارہویں تاریخیں ذی الحجہ کی ہیں، یا تیرہویں بھی کہ ان میں کنکریاں ماری جاتی ہیں) پھر جو شخص (کنکریاں مار کر دسویں تاریخ کے بعد) دو دن میں (مکہ واپس آنے میں) تعجیل کرے اس پر بھی کچھ گناہ نہیں اور جو شخص (ان) دو دن میں (واپسی مکہ میں) تاخیر کرے (یعنی بارہویں کو نہ آوے، بلکہ تیرہویں کو آوے) اس پر بھی کچھ گناہ نہیں (اور یہ سب باتیں) اس شخص کے واسطے (ہیں) جو (خدا سے) ڈرے (اور نہ ڈرنے والے کو گناہ ثواب ہی سے غرض نہیں) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور خوب یقین رکھو کہ تم سب کو خدا ہی کے پاس جمع ہونا ہے۔

معارف و مسائل

احکامِ حج و عمرہ

ابوابُ البِرّ کے بیان کا سلسلہ نصف سورۂ بقرہ سے چل رہا ہے اُن میں گیارھواں حکم حج کا ہے، حج کا تعلق چونکہ مکہ مکرمہ اور بیت اللہ یعنی کعبہ سے ہے اس لئے اس کے متعلقہ کچھ مسائل تو قبلہ کے بیان میں ضمنی طور پر سورۂ بقرہ کی آیات ۱۲۵ سے ۱۲۸ تک وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً سے شروع ہو کر وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا تک ذکر میں آگئے ہیں، پھر بحثِ قبلہ کے ختم پر ایک آیت ۱۵۸ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ میں صفا مروہ کے درمیان سعی کرنے کا حکم بھی ضمنی طور پر بیان ہو چکا ہے، اب آیت نمبر ۱۹۶ سے آیت نمبر ۲۰۳ تک اَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ سے شروع ہو کر فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ الخ تک آٹھ آیات مسلسل حج و عمرہ کے احکام و مسائل سے متعلق ہیں۔

حج باجماعِ امت اسلام کے ارکان میں سے ایک رکن اور فرائضِ اسلام میں سے ایک اہم فرض ہے، جس کی تاکید و اہمیت قرآن کریم کی بہت سی آیات اور بے شمار احادیثِ صحیحہ میں وارد ہوئی ہے، جمہور کے قول کے مطابق حج کی فرضیت ہجرت کے تیسرے یعنی غزوۂ احد کے سال میں سورۂ آلِ عمران کی اس آیت ۹۷ سے ہوتی ہے: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ الآیۃ (ابن کثیر) اسی آیت میں فرضیتِ حج کی شرائط کا بیان اور باوجود قدرت ہونے کے حج نہ کرنے پر سخت وعید مذکور ہے۔

مذکور الصدر آٹھ آیتوں میں سے پہلی آیت اَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ، باتفاقِ مفسرین قصۂ حدیبیہ میں نازل ہوئی، جو ۶ھ میں واقع ہوا ہے، اسی سے یہ معلوم ہو گیا کہ اس آیت کا مقصد حج کی فرضیت بتلانا نہیں وہ پہلے بتلائی جا چکی ہے بلکہ اس جگہ حج و عمرہ کے کچھ خاص احکام بتلانا مقصود ہے۔

عمرہ کا حکم اور چونکہ سورۂ آلِ عمران جس میں حج کا فرض ہونا مذکور ہے اس میں صرف حج ہی کا ذکر ہے عمرہ کا نہیں، اور یہ آیت جس میں عمرہ کا ذکر ہے اس میں اصل وجوب و فرضیت کا بیان نہیں بلکہ ذکر اس کا ہے کہ جب کوئی شخص حج یا عمرہ کو بذریعہ احرام شروع کر دے تو اس کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے، جیسا عام نفلی نماز اور روزہ کا بھی حکم یہی ہے کہ شروع کرنے سے واجب ہو جاتے ہیں، اس لئے اس آیت سے یہ مسئلہ معلوم نہیں ہوتا کہ عمرہ واجب ہے یا نہیں، صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شروع کر دے تو اس کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

ابن کثیرؒ نے بحوالہ ترمذی، احمد، بیہقی حضرت جابرؓ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ عمرہ واجب ہے، آپؐ نے فرمایا واجب تو نہیں، لیکن کر لو تو بہتر و افضل ہے، (وقال الترمذی ہذا حدیث حسن صحیح) اس وجہ سے امام اعظم ابوحنیفہؒ،

مالکؒ وغیرہ کے نزدیک عمرہ واجب نہیں، سنت ہے، آیت مذکورہ میں جب یہ بیان ہوا کہ حج یا عمرہ کا احرام باندھ لیں تو ان کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے، تو اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر احرام باندھنے کے بعد کوئی مجبوری پیش آجائے، حج وعمرہ ادا نہ کرسکیں تو کیا کریں، اس کا بیان بعد کے جملہ میں فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ سے فرمادیا۔

احرام کے بعد کوئی مجبوری پیش آجائے حج وعمرہ ادا نہ کرسکیں تو کیا کریں یہ آیت چونکہ واقعہ حدیبیہ میں نازل ہوئی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ عمرہ کا احرام باندھا ہوا تھا، کفار مکہ نے مکہ میں داخل ہونے اور عمرہ ادا کرنے سے روک دیا، اس پر یہ حکم نازل ہوا کہ احرام کا فدیہ ایک قربانی دینا ہے، بکری، گائے، اونٹ وغیرہ کی جو آسان ہو، قربانی دے کر احرام کھول دیں، مگر ساتھ ہی اگلے جملے وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ میں یہ بھی بتلادیا کہ احرام کھولنا جس کی شرعی صورت سر کے بال منڈوانا یا کٹوانا ہے اس وقت تک جائز نہیں، جب تک مُحرِم کی قربانی اپنے موقع پر پہونچ کر ذبح نہ ہوجائے۔

موقع پر پہونچنے سے مراد امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ ہے کہ حدودِ حرم میں پہونچ کر ذبح کی جائے، خود نہ کرسکیں تو کسی دوسرے سے کرادیں، اس آیت میں مجبوری کی یہ صورت کہ کوئی دشمن حائل ہوجائے صراحۃً مذکور ہے، امام اعظم ابوحنیفہؒ اور بعض دوسرے ائمہ نے بیماری وغیرہ کی مجبوری کو بھی اس میں باشتراکِ علت داخل قرار دیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی بیان سے یہ امر بھی ثابت ہوگیا کہ مجبوری کی حالت میں قربانی دے کر احرام کھول دینا جائز ہے مگر بعد میں قضاء کرنا واجب ہے، جیسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ نے اگلے سال عمرہ کی قضا کی ہے۔

اس آیت میں سر منڈانے کو احرام کھولنے کی علامت قرار دیا گیا، جس سے ثابت ہوا کہ حالت احرام میں سر منڈانا یا بال کٹوانا ممنوع ہے، اس کی مناسبت سے اگلا حکم یہ بتلایا گیا کہ جو شخص حج وعمرہ کے افعال ادا کرنے سے تو مجبور نہیں، مگر حالتِ احرام میں کوئی مجبوری سر کے بال منڈانے یا کٹوانے کی پیش آجائے تو وہ کیا کرے۔

حالتِ احرام میں بال منڈانے پر کوئی مجبور ہوجائے تو وہ کیا کرے فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ میں ارشاد فرمایا کہ اگر کسی بیماری کے سبب سر یا بدن کے کسی دوسرے حصہ کے بال منڈانے کی مجبوری ہو، یا سر میں جُوئیں پیدا ہوکر تکلیف دے رہی ہوں تو ایسی صورت میں بال منڈانا بقدرِ ضرورت جائز ہے، مگر اس کا فدیہ اور بدلہ یہ ہے کہ روزے رکھے، یا صدقہ دے یا قربانی کرے، قربانی کے لئے تو حدودِ حرم کی جگہ متعین ہے، روزے اور صدقہ کے لئے کوئی جگہ متعین نہیں، ہر جگہ ادا کرسکتا ہے، قرآن کے الفاظ میں صیام کا کوئی عدد اور صدقہ کی کوئی مقدار مذکور

نہیں ہی، مگر حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب بن عجرہؓ صحابی کی ایسی ہی حالت میں یہ فرمایا کہ تین روزے رکھیں یا چھ مسکینوں کو آدھا صاع گندم کا بطور صدقہ دیدیں (صحیح بخاری) آدھا صاع ہمارے اسّی تولہ کے سیر کے حساب سے تقریبًا پونے دو سیر گندم ہوتے ہیں، اُن کی قیمت صدقہ کردینا بھی کافی ہے۔

حج کے مہینوں میں حج وعمرہ کو جمع کرنے کے احکام

اسلام سے پہلے عرب اہل جاہلیت کا خیال تھا کہ جب حج کے مہینے شروع ہوجائیں یعنی ماہ شوال شروع ہوجائے تو ان ایام میں حج وعمرہ کا جمع کرنا سخت گناہ ہے، اس آیت کے آخری حصے میں ان کے اس خیال کی اصلاح اس طرح کردی گئی کہ حدود میقات کے اندر رہنے والوں کے لئے تو حج وعمرہ دونوں کو اشہر حج میں جمع کرنا ممنوع رکھا گیا، کیونکہ ان کو اشہر حج کے بعد دوبارہ عمرہ کے لئے سفر کرنا مشکل نہیں، لیکن حدود میقات کے باہر سے آنے والوں کے لئے جمع کرنے کو جائز قرار دیا، کہ دور دراز سے عمرہ کے لئے مستقل سفر کرنا ان کے لئے آسان نہیں میقات، وہ معین مقامات ہیں جو اطراف عالم سے مکہ میں آنے والوں کے ہر راستہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین ہیں کہ جب بقصد مکہ آنے والا مسافر یہاں پہنچے تو یہاں سے حج یا عمرہ کی نیت سے احرام باندھنا لازم ہے بغیر احرام کے یہاں سے آگے بڑھنا جرم وگناہ ہے، لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کا یہی مفہوم ہے، کہ جس شخص کے اہل وعیال مسجد حرام کے قرب وجوار یعنی حدود میقات کے اندر نہیں رہتے، مقصد یہ ہے کہ اس کا وطن حدود میقات کے اندر نہیں ہے اس کیلئے حج وعمرہ کو اشہرِ حج میں جمع کرنا جائز ہے۔

البتہ جو لوگ حج وعمرہ کو اشہر حج میں جمع کریں اُن پر واجب ہے کہ دونوں عبادتوں کو جمع کرنے کا شکرانہ ادا کریں، وہ یہ ہو کہ جس کو قربانی دینے کی قدرت ہو وہ ایک قربانی دیدے، بکری، گائے، اونٹ جو اس کے لئے آسان ہو، لیکن جس شخص کی مالی حیثیت قربانی ادا کرنے کے قابل نہیں اس پر دس روزے اس طرح واجب ہیں کہ تین روزے تو ایام حج کے اندر ہی رکھے یعنی نویں ذی الحجہ تک پورے کرلے، باقی سات روزے حج سے فارغ ہوکر جہاں چاہے اور جب چاہے رکھے، وہیں مکہ مکرمہ میں رہ کر پورے کرے یا گھر واپس آکر، اختیار ہے، اگر کوئی شخص تین روزے ایام حج میں نہ رکھ سکا تو پھر امام ابوحنیفہؒ اور اکابر صحابہؓ کے نزدیک اس کے لئے قربانی کرنا ہی متعین ہے، جب قدرت ہو کسی کے ذریعہ حرم میں قربانی کرادے (جصاص)

تمتّع وقران

اشہر حج میں حج کے ساتھ عمرہ کو جمع کرنے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ میقات سے ہی حج اور عمرہ دونوں کا احرام ایک ساتھ باندھے اس کو اصطلاحِ حدیث میں قران کہا گیا ہے اس کا احرام حج کے احرام کے ساتھ کھلتا ہے، آخر ایام

حج تک اس کو احرام ہی کی حالت میں رہنا پڑتا ہے، دوسرے یہ کہ میقات سے صرف عمرہ کا احرام باندھ اور مکہ مکرمہ پہونچ کر عمرہ کے افعال ادا کرکے احرام کھول دے، پھر آٹھویں تاریخ ذی الحجہ کو منیٰ جانے کے وقت حج کا احرام حرم شریف کے اندر ہی باندھ لے، اس کو اصطلاح میں تمتّع کہا جاتا ہے، اور لفظی معنی کے اعتبار سے لفظ تمتع دونوں صورتوں پر حاوی ہے، کیونکہ اس کے معنی ہیں حج و عمرہ کو جمع کرکے نفع اٹھانا اور وہ دونوں صورتوں میں برابر ہے، قرآن کی آیت مذکورہ میں فَمَنْ تَمَتَّعَ اسی عام معنی میں ہے۔

احکام حج و عمرہ میں خلاف ورزی اور کوتاہی موجب عذاب ہے

آخر آیت میں اوّل تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا جس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی سے ڈرنے اور بچنے کے، اس کے بعد فرمایا: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ، یعنی جو شخص جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا عذاب سخت ہے، آجکل حج و عمرہ کو جانے والے بکثرت اس سے غافل ہیں، اوّل تو حج و عمرہ کے احکام معلوم کرنے ہی کی پوری کوشش نہیں کرتے، پھر معلوم بھی ہو تو بکثرت ان کے مطابق عمل نہیں کرتے، غلط کار معلّموں اور ساتھیوں کی بے پروائی سے بہت سے واجبات تک چھوٹ جاتے ہیں، اور آداب و سنن کا تو کہنا کیا، اللہ تعالیٰ سب کو اصلاحِ عمل کی توفیق عطا فرما دیں۔

احکام حج کی آٹھ آیتوں میں سے دوسری آیت اور اس کے مسائل

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ، اَشْهُر، شَهْر کی جمع ہے جس کے معنی ہیں مہینہ، پچھلی آیت میں بتلایا گیا تھا کہ جو کوئی حج یا عمرہ کا احرام باندھ لے، تو اس پر لازم آتا ہے کہ اس کے احکام پورے ادا کرے، ان دونوں میں عمرہ کے لئے تو کوئی تاریخ اور مہینہ مقرر نہیں، سال بھر میں جب چاہیں کر سکتے ہیں، لیکن حج کے لئے مہینے اور اس کے افعال و اعمال کے لئے خاص تاریخیں اور اوقات مقرر ہیں، اس لئے اس آیت کے شروع میں یہ بتلا دیا کہ حج کا معاملہ عمرہ کی طرح نہیں ہے، اس کے لئے کچھ مہینے مقرر ہیں، جو معروف و مشہور ہیں، جاہلیتِ عرب سے لیکر زمانۂ اسلام تک یہی مہینے حج کے مقرر رہے ہیں، وہ مہینے شوّال ذیقعدہ اور دس روز ذی الحجہ کے ہیں، جیسا کہ حدیث میں بروایت ابو امامہؓ و ابن عمرؓ منقول ہے (مظہری) شوال سے حج کے مہینے شروع ہونے کا حاصل یہ ہے کہ اس سے پہلے حج کا احرام باندھنا جائز نہیں، بعض ائمہ کے نزدیک تو قبل شوال کے احرام سے حج کی ادائیگی ہی نہیں ہو سکتی، امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس احرام سے حج تو ادا ہو جائے گا مگر مکروہ ہوگا (مظہری)

فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ، اس میں حج کا احرام باندھنے والے کے لئے کچھ منفی آداب و احکام کا بیان ہے، جن سے حالتِ احرام میں

پرہیز کرنا لازم و واجب ہے، وہ تین چیزیں ہیں : رفث، فسوق، جدال۔

رفث ایک لفظ جامع ہے، جس میں عورت سے مباشرت اور اس کے مقدمات یہاں تک کہ زبان سے عورت کے ساتھ اس کی کھلی گفتگو بھی داخل ہے، مُحرِم کو حالتِ احرام میں یہ سب چیزیں حرام ہیں، تعریض وکنایہ کا مضائقہ نہیں۔

فسوق کے لفظی معنی خروج کے ہیں، اصطلاحِ قرآن میں عدولِ حکمی اور نافرمانی کو فسوق کہا جاتا ہے، جو اپنے عام معنی کے اعتبار سے سب گناہوں کو شامل ہے، اسی لئے بعض حضرات نے اس جگہ عام معنی ہی مراد لئے ہیں، مگر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس جگہ فسوق کی تفسیر محظوراتِ احرام سے فرمائی ہے، یعنی وہ کام جو حالتِ احرام میں ممنوع و ناجائز ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ اس مقام کے مناسب یہی تفسیر ہے، کیونکہ عام گناہوں کی ممانعت احرام کے ساتھ خاص نہیں ہر حال میں حرام ہیں۔

وہ چیزیں جو اصل سے گناہ نہیں مگر احرام کی وجہ سے ناجائز ہو جاتی ہیں چھ چیزیں ہیں، اوّل عورت کے ساتھ مباشرت اور اس کے تمام متعلقات یہاں تک کہ کھلی گفتگو بھی، دوسرے برّی جانوروں کا شکار، خود کرنا یا شکاری کو بتلانا، تیسرے بال یا ناخن کٹوانا، چوتھے خوشبو کا استعمال، یہ چار چیزیں تو مرد و عورت دونوں کے لئے حالتِ احرام میں ناجائز ہیں، باقی دو چیزیں مردوں کے ساتھ خاص ہیں، یعنی سِلے ہوئے کپڑے پہننا، اور سَر اور چہرے کو ڈھانپنا، امام اعظم ابوحنیفہؒ و مالکؒ کے نزدیک چہرہ کو ڈھانپنا حالتِ احرام میں عورت کے لئے بھی ناجائز ہے، اس لئے یہ بھی مشترک محظوراتِ احرام میں شامل ہے۔

ان چھ چیزوں میں پہلی یعنی عورت سے مباشرت وغیرہ، اگرچہ فسوق میں داخل ہے لیکن اس کو فسوق سے پہلے الگ کر کے لفظ رفث سے اس لئے بتلا دیا کہ احرام میں اس سے اجتناب سب سے زیادہ اہم ہے، کیونکہ دوسرے محظوراتِ احرام کا تو کوئی بدل اور کفارہ بھی ہو جاتا ہے، اور مباشرت کی بعض صورتیں ایسی بھی ہیں کہ اگر ان میں کوئی مبتلا ہو جائے تو حج ہی فاسد ہو جاتا ہے اس کا کوئی کفارہ بھی نہیں ہو سکتا، مثلاً وقوفِ عرفات سے پہلے بی بی سے صحبت کر لی، تو حج فاسد ہو گیا، اور اس کا جرمانہ بھی گائے یا اونٹ کی قربانی سے دینا پڑے گا، اور اگلے سال پھر حج کرنا پڑے گا، اس مزید اہمیت کی بنا پر اس کو فَلَا رَفَثَ کے لفظ سے مستقلاً بیان فرما دیا۔

جدال کے معنی ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی کوشش کے ہیں، اس لئے سخت قسم کے جھگڑے کو جدال کہا جاتا ہے، یہ لفظ بھی بہت عام ہے، اور بعض حضرات مفسرین نے عام ہی معنی مراد لئے ہیں، اور بعض حضرات نے مقامِ حج و احرام کی مناسبت سے اس جگہ جدال کے معنی یہ

لئے ہیں، کہ جاہلیتِ عرب کے لوگ مقامِ وقوف میں اختلاف رکھتے تھے، کچھ لوگ عرفات میں وقوف کرنا ضروری سمجھتے تھے جیسا کہ حقیقت ہے، اور کچھ مزدلفہ میں وقوف ضروری کہتے تھے، عرفات میں جانے کو ضروری نہیں سمجھتے تھے، اور اسی کو موقفِ ابراہیم علیہ السلام قرار دیتے تھے، اسی طرح اوقاتِ حج کے معاملہ میں بھی اختلاف تھا، کچھ لوگ ذی الحجہ میں حج کرتے تھے، اور کچھ ذیقعدہ ہی میں کرلیتے تھے، اور پھر ان معاملات میں باہمی نزاعات اور جھگڑے ہوتے تھے، ایک دوسرے کو گمراہ کہتا تھا، قرآن کریم نے لَا جِدَالَ فرما کر ان جھگڑوں کا خاتمہ فرمایا، اور جو بات حق تھی کہ وقوفِ فرض عرفات میں اور پھر وقوفِ واجب مزدلفہ میں کیا جائے، اور حج صرف ذی الحجہ کے ایام میں کیا جائے، اس کا اعلان کرکے اس کے خلاف جھگڑا کرنے کو ممنوع کردیا۔

اس تفسیر و تقریر کے لحاظ سے اس آیت میں صرف محظوراتِ احرام کا بیان ہوا جو اگرچہ فی نفسہٖ جائز ہیں، مگر احرام کی وجہ سے ممنوع کردی گئی ہیں، جیسے نماز، روزہ کی حالت میں کھانا پینا، کلام کرنا وغیرہ جائز چیزوں کو منع کردیا گیا ہے۔

اور بعض حضرات نے اس جگہ فسوق و جدال کو عام معنی میں لیکر مقصد یہ قرار دیا کہ اگرچہ فسق و گناہ اسی طرح باہم جدال و خلاف ہر جگہ ہر حال میں مذموم و گناہ ہے، لیکن حالتِ احرام میں اس کا گناہ اور زیادہ شدید ہو جاتا ہے، مبارک ایام اور مقدس سرزمین میں جہاں صرف اللہ کے لئے عبادت کے واسطے آتے ہیں، اور لبیک لبیک پکار رہے ہیں، احرام کا لباس ان کو ہر وقت اس کی یاددہانی کرارہا ہو کہ تم اس وقت عبادت میں ہو، ایسی حالت میں فسق و فجور اور نزاع و جدال انتہائی بیباکی اور اشد ترین گناہ ہو جاتا ہے۔

اس عام معنی کے اعتبار سے اس جگہ رفث، فسوق، جدال سے روکنے اور ان کی حرمت کو بیان کرنے میں ایک حکمت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ مقامِ حج اور زمانۂ حج کے حالات ایسے ہیں کہ ان میں انسان کو ان تینوں چیزوں میں ابتلاء کے مواقع بہت پیش آتے ہیں، حالتِ احرام میں اکثر اپنے اہل و عیال سے ایک طویل مدت تک علیحدہ رہنا پڑتا ہے، اور پھر مطاف و مسعیٰ، عرفات، مزدلفہ منیٰ کے اجتماعات میں کتنی بھی احتیاط برتی جائے عورتوں مردوں کا اختلاط ہو ہی جاتا ہے، ایسی حالت میں نفس پر قابو پانا آسان نہیں، اس لئے سب سے پہلے رفث کی حرمت کا بیان فرمایا، اسی طرح اس عظیم الشان اجتماع میں چوری وغیرہ دوسرے گناہوں کے مواقع بھی بے شمار پیش آتے ہیں، اس لئے لَا فُسُوْقَ کی ہدایت فرمادی، اسی طرح سفرِ حج میں اوّل سے آخر تک بے شمار مواقع اس کے بھی پیش آتے ہیں کہ رفقاءِ سفر اور دوسرے لوگوں سے جگہ کی تنگی اور دوسرے اسباب کی بناء پر جھگڑا لڑائی ہو جائے، اس لئے لَا جِدَالَ کا حکم دیا گیا۔

بلاغتِ قرآن اس آیت فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ کے الفاظ نفی کے الفاظ ہیں کہ یہ سب چیزیں حج میں نہیں ہیں، حالانکہ مقصود ان چیزوں سے نہی اور ممانعت کرنا ہے، جس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ لا ترفثوا ولا تفسقوا ولا تجادلوا کہا جاتا، مگر یہاں نہی کی جگہ نفی کے الفاظ رکھ کر اس طرف اشارہ فرمادیا کہ ان افعال کی حج میں کوئی گنجائش اور تصوّر ہی نہیں۔

وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ یَّعْلَمْہُ اللّٰہُ۔ محظورات وممنوعاتِ احرام بیان فرمانے کے بعد آخر میں اس جملے میں یہ ہدایت دی گئی کہ حج کے مبارک ایام اور مقدس مقامات میں تو صرف یہی نہیں کہ محظورات اور گناہوں سے بچو، بلکہ غنیمت جان کر عبادت و ذکر اللہ اور نیک کاموں میں لگے رہو، تم جو بھی نیک کام کرو گے وہ اللہ کے علم میں ہے اور تمھیں اس پر بڑے انعامات ملیں گے۔

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی۔ اس میں ان لوگوں کی اصلاح ہے جو حج وعمرہ کے لئے بے سروسامانی کے ساتھ نکل کھڑے ہوتے ہیں، اور دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ ہم اللہ پر توکل کرتے ہیں، پھر راستہ میں بھیک مانگنا پڑتی ہے، یا خود بھی تکلیف اٹھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی پریشان کرتے ہیں، اُن کی ہدایت کے لئے حکم ہوا کہ سفر حج کے لئے ضروریات سفر ساتھ لینا چاہئے، یہ توکل کے منافی نہیں، بلکہ توکل کی حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اسباب و وسائل کو اپنے مقدور کے مطابق حاصل اور جمع کرے، پھر اللہ پر توکل کرے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے توکل کی یہی تفسیر منقول ہے بالکل ترکِ اسباب کا نام توکل رکھنا جہالت ہے۔

سفر حج میں تجارت یا مزدوری کرنا کیسا ہے لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ، یعنی تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ تم سفر حج میں تجارت یا مزدوری کے ذریعے کچھ روزی کمالو اور اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق حاصل کرو،، واقعہ نزول اس آیت کا یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں اہلِ عرب نے جس طرح تمام عبادات ومعاملات کو مسخ کر کے طرح طرح کی بیہودہ رسمیں ان میں شامل کر دی تھیں، اور عبادات کو بھی کھیل تماشہ بنا دیا تھا، اسی طرح افعالِ حج میں بھی طرح طرح کی بیہودگیاں کرتے تھے، منیٰ کے عظیم اجتماع میں ان کے خاص خاص بازار لگتے تھے، نمائش ہوتی تھی، تجارتوں کے فروغ کے ذرائع لگائے جاتے تھے، اسلام آیا، اور حج مسلمانوں پر فرض کیا گیا تو ان تمام بیہودہ رسموں کا قلع قمع کیا گیا، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو اللہ تعالیٰ کی رضا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر مٹ جانے والے تھے، اب ان کو یہ خیال ہوا کہ ایامِ حج میں تجارت کرنا یا مزدوری کر کے کچھ کما لینا یہ بھی جاہلیت کی پیداوار ہے، شاید اسلام میں اس کی مطلقاً حرمت وممانعت ہوجائے، یہاں تک کہ ایک صاحب حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے

پاس آئے، اور یہ سوال کیا کہ ہمارا پیشہ پہلے سے یہ ہے کہ ہم اونٹ کرایہ پر چلاتے ہیں، کچھ لوگ ہمارے اونٹ حج کے لئے کرایہ پر لیجاتے ہیں۔ ہم اُن کے ساتھ جاتے ہیں اور حج کرتے ہیں، کیا ہمارا حج نہیں ہوگا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، اور آپؐ سے وہی سوال کیا تھا، جو تم مجھ سے کر رہے ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس وقت کوئی جواب نہ دیا، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ، اُس وقت آپؐ نے اس شخص کو بلوایا اور فرمایا کہ ہاں تمھارا حج صحیح ہے۔

الغرض اس آیت نے یہ واضح کردیا کہ اگر کوئی شخص دورانِ حج میں کوئی بیع وشرا یا مزدوری کرے جس سے کچھ نفع ہو جائے تو اس میں کوئی گناہ نہیں، ہاں کفارِ عرب نے جو حج کو تجارت کی منڈی اور نمائش گاہ بنالیا تھا اس کی اصلاح قرآن کے دو لفظوں سے کردی گئی، ایک تو یہ کہ جو کچھ کمائیں اس کو اللہ تعالیٰ کا فضل اور عطا سمجھ کر حاصل کریں، شکر گذار ہوں، محض سرمایہ سمیٹنا مقصد نہ ہو، فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ میں اسی کی طرف اشارہ ہے، دوسرے لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ کے لفظ نے یہ بتلادیا کہ اس کمائی میں تم پر کوئی گناہ نہیں، جس میں ایک اشارہ اس طرف ہے کہ اگر اس سے بھی اجتناب کیا جائے تو بہتر ہے، کیونکہ اخلاص کامل میں فرق آتا ہے، اور حقیقت مسئلہ کی یہ ہے کہ اس کا مدار اصل نیت پر ہے، اگر کسی شخص کی نیت اصل میں دنیوی نفعِ تجارت یا مزدوری ہے اور ضمنی طور پر حج کا بھی قصد کرلیا، یا نفع تجارت اور قصدِ حج دونوں مساوی صورت میں ہیں تب تو یہ اخلاص کے خلاف ہے، حج کا ثواب اس سے کم ہو جائے گا اور برکاتِ حج جیسی حاصل ہونی چاہئے وہ حاصل نہ ہوں گی، اور اگر اصل نیت حج کی ہے اسی کے شوق میں نکلا ہے، لیکن مصارفِ حج میں یا گھر کی ضروریات میں تنگی ہے، اس کو پورا کرنے کے لئے کوئی معمولی تجارت یا مزدوری کرلی، یہ اخلاص کے بالکل منافی نہیں، ہاں اس میں بھی بہتر یہ ہے، کہ خاص اُن پانچ ایام میں جن میں حج کے افعال ادا ہوتے ہیں، ان میں کوئی مشغلہ تجارت و مزدوری کا نہ رکھے، بلکہ ان ایام کو خالص عبادت و ذکر میں گذارے، اسی وجہ سے بعض علماء نے خاص ان ایام میں تجارت و مزدوری کو ممنوع بھی فرمایا ہے۔

عرفات میں وقوف اور اس کے بعد مزدلفہ کا وقوف

اس کے بعد اسی آیت میں ارشاد ہے، فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ "یعنی پھر جب تم عرفات سے واپس آنے لگو تو مشعرِ حرام کے پاس خدا تعالیٰ کی یاد کرو، اور اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو بتلا رکھا ہے، اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے بتلانے سے پہلے تم محض ہی ناواقف تھے"، اس میں بتلایا گیا ہے کہ عرفات

سے واپسی میں رات کو مزدلفہ میں قیام اور اس کا خاص ذکر واجب ہیں۔

عرفات، لفظاً جمع ہے، اور ایک خاص میدان کا نام ہے، جس کے حدود اربعہ معروف و مشہور ہیں، یہ میدان حرم سے خارج واقع ہوا ہے، حجاج کو اس میں پہونچنا اور زوالِ آفتاب سے مغرب تک یہاں قیام کرنا حج میں حج کا اہم ترین فرض ہے، جس کے فوت ہونے کا کوئی کفارہ اور فدیہ نہیں ہو سکتا۔

عرفات کو عرفات کہنے کی بہت سی وجوہ بتلائی جاتی ہیں، اُن میں واضح یہ ہے کہ اس میدان میں انسان اپنے رب کی معرفت اور بذریعہ عبادت و ذکر اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتا ہے، نیز مشرق و مغرب کے مسلمانوں کو آپس میں تعارف کا ایک موقع ملتا ہے، ارشادِ قرآنی میں اس کی تاکید فرمائی ہے کہ عرفہ کے دن بعد مغرب عرفات سے واپس آتے ہوئے مشعرِ حرام کے پاس ٹھہرنا چاہئے، مشعرِ حرام ایک پہاڑ کا نام ہے، جو مزدلفہ میں واقع ہے، مشعر کے معنی شعار اور علامت کے ہیں اور حرام بمعنی محترم و مقدس کے ہے، معنی یہ ہیں کہ یہ پہاڑ شعارِ اسلام کے اظہار کے لئے ایک مقدس مقام ہے، اس کے آس پاس کے میدان کو مزدلفہ کہتے ہیں، اس میدان میں رات گذارنا اور مغرب وعشاء دونوں نمازوں کو ایک وقت میں مزدلفہ میں پڑھنا واجب ہے، مشعرِ حرام کے پاس اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا، اگرچہ ہر طرح کے ذکر اللہ کو شامل ہے، مگر خصوصیت سے دونوں نمازوں کو ایک وقت یعنی مغرب کو عشاء کے ساتھ ادا کرنا اس جگہ کی مخصوص عبادت ہے، آیت کے جملہ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدٰىكُمْ میں شاید اسی کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی یاد اور ذکر کے لئے جو طریقہ بتلایا ہے اسی طرح اس کو یاد کرو، اپنی رائے اور قیاس کو اس میں دخل نہ دو کیونکہ رائے اور قیاس کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ مغرب کی نماز مغرب کے وقت میں پڑھی جاتی، عشاء کی عشاء کے وقت میں، لیکن اُس روز اُس مقام پر حق تعالیٰ کو یہی پسند ہو کہ مغرب کی نماز مؤخر کی جائے، اس کو عشاء کے ساتھ پڑھا جائے، ارشادِ قرآنی وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدٰىكُمْ سے ایک اور بھی اصولی مسئلہ نکل آیا، کہ ذکر اللہ اور عبادت میں آدمی خود مختار نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو جس طرح چاہے یاد کرے، اور جس طرح چاہے اس کی عبادت کرے، بلکہ ذکر اللہ اور ہر عبادت کے خاص آداب ہیں، اُن کے موافق ادا کرنا ہی عبادت ہے، اس کے خلاف کرنا جائز نہیں، اور اس میں کمی بیشی یا مقدم مؤخر کرنا خواہ اس میں ذکر اللہ کی کچھ زیادتی بھی ہو وہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں، نفلی عبادات اور صدقہ خیرات وغیرہا میں جو لوگ بلا دلیل شرعی اپنی طرف سے کچھ خصوصیات اور اضافے کر لیتے ہیں، اور ان کی پابندی کو ضروری سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ضروری قرار نہیں دیا، اور ان افعال کے نہ کرنے والوں کو خطاوار سمجھتے ہیں

اس آیت نے اُن کی غلطی کو واضح کر دیا، کہ وہ اہلِ جاہلیت کی سی عبادت ہے، کہ اپنی رائے و قیاس سے عبادت کی صورتیں گھڑ رکھی تھیں، اور چند رسموں کا نام عبادت رکھ لیا تھا۔

اس کے بعد تیسری آیت میں ارشاد ہے: ثُمَّ اَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ "یعنی پھر تم سب کو ضروری ہے کہ اسی جگہ ہو کر واپس آؤ جہاں اور لوگ جاکر واپس آتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے اور مہربانی فرمادیں گے"۔

اس جملے کا شانِ نزول یہ ہے کہ قریشِ عرب جو بیت اللہ کے محافظ و مجاور تھے اور سارے عرب میں ان کا اقتدار مسلّم تھا، اور ان کی ایک ممتاز حیثیت تھی، زمانۂ جاہلیت میں وہ اپنی امتیازی شان بنانے کے لئے یہ حرکت کرتے تھے، اور سب لوگ تو عرفات کو جاتے اور وہاں وقوف کر کے واپس آتے تھے، یہ لوگ راستہ میں مزدلفہ کے اندر ہی ٹھہر جاتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم چونکہ بیت اللہ اور حرم کے مجاور ہیں، اس لئے حدودِ حرم سے باہر جانا ہمارے لئے مناسب نہیں، مزدلفہ حدودِ حرم کے اندر ہے، اور عرفات اس سے خارج، یہ بہانہ کر کے مزدلفہ ہی میں قیام کر لیتے، اور وہیں سے واپس آجایا کرتے تھے، اور درحقیقت وجہ اس حیلہ بہانہ کی اپنا فخر و غرور اور عام لوگوں سے ممتاز ہو کر رہنا تھا، حق تعالیٰ کے اس فرمان نے ان کی غلط کاری واضح فرمادی، اور ان کو حکم دیا کہ تم بھی وہیں جاؤ جہاں سب لوگ جاتے ہیں، یعنی عرفات میں اور پھر وہیں سے سب کے ساتھ واپس آؤ۔

اوّل تو عام انسانوں سے اپنے آپ کو ممتاز کر کے رکھنا خود ایک متکبرانہ فعل ہے، جس سے ہمیشہ ہی پرہیز لازم ہے، خصوصاً حج کے ایام میں جہاں لباسِ احرام اور پھر قیام و مقام کی یکسانیت کے ذریعہ اسی کا سبق دینا ہے کہ انسان سب برابر ہیں، امیر و غریب یا عالم و جاہل یا بڑے چھوٹے کا یہاں کوئی امتیاز نہیں، حالتِ احرام میں یہ امتیازی شان بنانا اور بھی زیادہ جرم ہے۔

انسانی مساوات کا زریں سبق اور اس کی بہترین عملی صورت

اس ارشادِ قرآنی سے اصولِ معاشرت کی ایک اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ رہن سہن قیام و مقام میں بڑوں کو چاہئے کہ چھوٹوں سے الگ ممتاز ہو کر نہ رہیں، بلکہ مل جل کر رہیں، کہ اس میں باہمی اخوت و ہمدردی اور محبت و تعلق پیدا ہوتا ہے، اور امیر و غریب کی تفریق مٹتی ہے، مزدور و سرمایہ دار کی جنگ ختم ہو جاتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری حج کے خطبہ میں اس کو خوب واضح کر کے ارشاد فرمایا، کہ کسی عربی کو عجمی پر یا گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں، فضیلت کا مدار تقویٰ اور اطاعتِ خداوندی پر ہے، اسی لئے جو لوگ ان کے خلاف مزدلفہ میں قیام کر کے اپنی ممتاز حیثیت بنانا چاہتے تھے، ان کے اس فعل کو گناہ قرار دے کر ان پر لازم کیا کہ اپنے اس گناہ سے توبہ و استغفار کریں، کہ اللہ تعالیٰ ان کی خطائیں

معاف فرما دیں اور اپنی رحمت فرما دیں۔

رسوم جاہلیت کی اصلاح منیٰ میں فضول اجتماعات کی ممانعت

چوتھی پانچویں اور چھٹی آیات میں چند رسوم جاہلیت کی اصلاح کی گئی ہے، ایک تو یہ کہ عرب زمانۂ جاہلیت میں عرفات و مزدلفہ اور طواف وقربانی سے فارغ ہو کر جب منیٰ میں قیام کرتے تھے تو ان کی مجلسیں صرف اس کام کے لئے ہوتی تھیں کہ مشاعرے منعقد کریں، اور ان میں اپنے مفاخر اور اپنے آباء و اجداد کے مفاخر اور کارناموں کا بیان کریں، ان کی مجلسیں ذکر اللہ سے یکسر خالی ہوتی تھیں، ان مبارک ایام کو ایسی لغو اور فضول چیزوں میں ضائع کرتے تھے، اس لئے ارشاد ہوا کہ جب تم اپنے افعال احرام کو پورا کر چکو اور منیٰ میں قیام کرو، تو وہاں رہ کر اللہ تعالیٰ کو یاد کرو، اپنے آباء و اجداد کو یاد کرنا اور خصوصاً ان کے جھوٹے سچے مفاخر اور کارناموں کو بیان کرنا چھوڑو، جتنا تم ان کو یاد کرتے ہو اس کی جگہ بلکہ اس سے زیادہ خدا تعالیٰ کو یاد کرو، اور ذکر اللہ میں مشغول رہو، قرآن کی اس آیت نے عرب کی ایک جاہلانہ رسم کو مٹا کر مسلمانوں کو یہ ہدایت کی کہ یہ ایام اور یہ مقام عبادت اور ذکر اللہ کے لئے مخصوص ہیں، ان میں ذکر اللہ و عبادت کے جو فضائل و برکات ہیں وہ پھر ہاتھ نہ آئیں گے ان کو غنیمت جاننا چاہئے۔

علاوہ ازیں حج ایک ایسی عبادت ہے جو عموماً سفر طویل کی مشقت، اہل و عیال کی مفارقت کاروبار کو ترک کرنے اور ہزاروں روپے اور بہت سا وقت خرچ کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے، اس میں حوادث کا پیش آجانا کچھ بعید نہیں، کہ آدمی باوجود کوشش کے اپنے مقصدِ حج میں کامیاب نہ ہو سکے، جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے تمام موانع ہٹا کر آپ کے مقصد میں کامیاب فرمایا اور فرائض حج پورے ہو گئے، تو یہ مقام شکر ہے، جس کا اقتضاء یہ ہے کہ اور زیادہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہو، ان اوقات کو فضول اجتماعات اور فضول کام یا کلام میں ضائع نہ کرو، اہلِ جاہلیت ان اوقات میں اپنے آباء و اجداد کے تذکرے کرتے تھے، جن کا کوئی نفع دین و دنیا میں نہ تھا، تم اس کی جگہ اللہ کا ذکر کرو جو نور ہی نور اور نفع ہی نفع ہے، دنیا کے لئے بھی آخرت کے لئے بھی، آجکل اگرچہ مسلمانوں میں وہ رسم جاہلیت تو نہیں رہی، کہ مشاعرے قائم کریں اور آباء و اجداد کے تذکرے کریں، لیکن آج بھی ہزاروں مسلمان ہیں جو ان ایام کو فضول اجتماعات میں فضول دعوتوں اور تفریحات میں صرف کرتے ہیں، یہ آیت ان کی تنبیہ کے لئے کافی ہے۔

بعض حضرات مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کو ایسا یاد کرو جیسے بچپن میں اپنے باپ کو یاد کرتے ہیں کہ ان کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ کلام با آبا یا آب ہوتا ہے،

تم اب بالغ ہو، جوان ہو، عاقل ہو، یَا اَبِ یَا اَبِ کی جگہ یَا رَبِّ یَا رَبِّ کو اختیار کرو، اور اس پر نظر ڈالو کہ بچہ اپنے باپ کو اس لئے پکارتا ہے کہ وہ اپنے تمام کاموں میں اپنے آپ کو باپ کا محتاج سمجھتا ہے، انسان اگر ذرا غور کرے تو وہ ہر وقت ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا محتاج اس سے زیادہ ہے، جیسا بچہ اپنے باپ کا محتاج ہے، نیز بعض اوقات کچھ لوگ اپنے باپ کا ذکر فخراً بھی کیا کرتے ہیں، جیسے اہل جاہلیت کرتے تھے تو اس آیت نے یہ بھی ہدایت کردی کہ فخر و عزت کے لئے بھی ذکر اللہ سے زیادہ کوئی چیز مؤثر نہیں (روح البیان)

ایک اور رسم جاہلیت کی اصلاح دین و دنیا کی طلب میں اسلامی اعتدال

جس طرح جاہلیت کی یہ رسم بیہودہ تھی کہ ان مبارک ایام کو اپنے باپ دادوں کے تذکروں اور مشاعروں میں گذاریں، اسی طرح کچھ لوگوں کی یہ عادت تھی کہ اگرچہ ایام حج میں شغل تو ذکر اللہ اور دعاؤں ہی کا رکھتے تھے، مگر اُن کی تمامتر دعائیں صرف دنیوی حاجات اور دنیا کی راحت و عزت یا دولت کے لئے ہوتی تھیں آخرت کی طرف کوئی دھیان نہ ہوتا تھا، ان کی اصلاح کے لئے اس آیت کے آخر میں فرمایا کہ بعض لوگ وہ ہیں جو حج میں دعا بھی مانگتے ہیں تو صرف دنیا کی بھلائی مانگتے ہیں، آخرت کی فکر نہیں کرتے، ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، کیونکہ ان کے اس طرز عمل سے معلوم ہوا کہ فریضۂ حج بھی انھوں نے محض رسماً ادا کیا ہے، یا دنیا میں فخر و وجاہت حاصل کرنے کے لئے کیا ہے، اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا اور آخرت میں نجات حاصل کرنا ان کے پیش نظر ہے ہی نہیں۔

اس جگہ یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ صرف دنیاوی دعا مانگنے والوں کا ذکر اس آیت میں اس طرح کیا گیا ہے کہ وہ کہتے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا اس کے ساتھ حَسَنَۃً کا لفظ مذکور نہیں، جس میں اشارہ اس کی طرف ہو کہ وہ دنیا کے لئے بھی حسنہ کے طلبگار نہیں، بلکہ اغراض دنیویہ میں ایسے مست و سرشار ہیں کہ ان کی طلب یہ رہ گئی ہے کہ اپنی خواہش کسی طرح پوری ہو، خواہ وہ اچھی ہو یا بُری اور اچھے طریقہ سے حاصل ہو یا بُرے راستہ سے، لوگ اُن کو اچھا کہیں یا بُرا۔

اس آیت میں اُن مسلمانوں کے لئے بھی بڑی تنبیہ ہے جو موسم حج اور مقاماتِ مقدسہ میں بھی دعاؤں میں اپنی اغراضِ دنیویہ ہی کو ترجیح دیتے ہیں، اور بیشتر اوقات انھیں کے لئے صرف کرتے ہیں، اور اگر ہمارے حالات کا جائزہ لیا جائے تو ثابت ہوگا کہ بہت سے دولتمند لوگ یہاں بھی جو وظائف اور دعائیں کرتے ہیں یا بزرگوں سے کراتے ہیں ان میں بکثرت لوگ ایسے ہیں کہ ان کی غرض ان تمام وظائف و دعاؤں سے بھی صرف دولت کی ترقی، تجارت میں برکت اغراض دنیویہ میں کامیابی ہوتی ہے وہ بہت سے وظائف اور نوافل پڑھ کر یہ بھی سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم بہت عبادت گذار ہیں، لیکن وہ حقیقت میں ایک طرح کی دنیا پرستی ہوتی ہے، بہت سے حضرات

زندہ بزرگوں سے اور وفات یافتہ اولیاء اللہ سے بڑا تعلق رکھتے ہیں، لیکن اس تعلق کا بھی بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی دعاء یا تعویذ سے ہمارے کام نکلیں گے، دنیا کی آفات دور ہوں گی، مال میں برکت ہوگی، ایسے لوگوں کے لئے بھی اس آیت میں خاص ہدایت ہے، معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے جو علیم وخبیر ہے، ہر شخص کو اپنے اعمال کا جائزہ لینا چاہئے، کہ وظائف و نوافل اور دعاء و درود سے اور حج وزیارت سے اس کی نیت کیا ہے۔ اس آیت کے آخری حصہ میں کم نصیب محروم القسمۃ لوگوں کا تذکرہ کرنے کے بعد حق تعالیٰ نے نیک اور مقبول بندوں کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۔ "یعنی اُن میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے دنیا کی بھلائی اور بہتری بھی مانگتے ہیں اور آخرت کی بہتری بھی اور عذابِ جہنم سے پناہ مانگتے ہیں"۔

اس میں لفظ حسنۃ تمام ظاہری اور باطنی خوبیوں اور بھلائیوں کو شامل ہے، مثلاً دنیا کی حسنہ میں بدن کی صحت، اہل وعیال کی صحت، رزقِ حلال میں وسعت وبرکت دنیوی سب ضروریات کا پورا ہونا اعمالِ صالحہ، اخلاقِ محمودہ علم نافع، عزت ووجاہت، عقائد کی درستی، صراطِ مستقیم کی ہدایت، عبادات میں اخلاص کامل سب داخل ہیں، اور آخرت کی حسنہ میں جنت اور اس کی بے شمار اور لازوال نعمتیں اور حق تعالیٰ کی رضا اور اس کا دیدار یہ سب چیزیں شامل ہیں۔

الغرض یہ دعاء ایک ایسی جامع ہے کہ اس میں انسان کے تمام دنیوی اور دینی مقاصد آجاتے ہیں، دنیا وآخرت دونوں جہان میں راحت وسکون میسر آتا ہے، آخر میں خاص طور پر جہنم کی آگ سے پناہ کا بھی ذکر ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت یہ دعاء مانگا کرتے تھے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ، اور حالتِ طواف میں خصوصیت کے ساتھ یہ دعاء مسنون ہے، اس آیت میں ان جاہل درویشوں کی بھی اصلاح کی گئی ہے جو صرف آخرت ہی کی دعاء مانگنے کو عبادت جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں دنیا کی کوئی پرواہ نہیں ہے، کیونکہ درحقیقت یہ ان کا دعویٰ غلط اور خیالِ خام ہے، انسان اپنے وجود اور بقاء اور عبادت وطاعت سب میں ضروریاتِ دنیوی کا محتاج ہے، وہ نہ ہوں تو دین کا بھی کوئی کام کرنا مشکل ہے، اسی لئے انبیاء علیہم السلام کی سنت یہ ہے کہ جس طرح وہ آخرت کی بھلائی اور بہتری اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں اسی طرح دنیا کی بھلائی اور آسائش بھی طلب کرتے ہیں، جو شخص دنیوی حاجات کے لئے دعاء مانگنے کو زہد وبزرگی کے خلاف سمجھے وہ مقامِ انبیاءؑ سے بے خبر اور جاہل ہے، ہاں صرف دنیوی حاجات ہی کو مقصدِ زندگی نہ بنائے،

اس سے زیادہ آخرت کی فکر کرے اور اس کے لئے دعا مانگے۔

آیت کے آخر میں اسی دوسرے طبقہ کا جو کہ اپنی دعاؤں میں دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی مانگتا ہے، انجام ذکر کیا گیا ہے کہ ان کے اس صحیح اور نیک عمل اور دعاؤں کا نتیجہ ان کو دنیا و آخرت میں ملے گا، اس کے بعد ارشاد ہے وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ، "یعنی اللہ جلد حساب لینے والا ہے" کیونکہ اس کا علم محیط اور قدرتِ کاملہ کے لئے ساری مخلوقات کے ایک ایک فرد اور پھر اس کی عمر بھر کے اعمال کا حساب لینے میں اُن آلات و ذرائع کی ضرورت نہیں جن کا انسان محتاج ہے، اس لئے وہ بہت جلد ساری مخلوقات کا حساب لے لیں گے، اور اُن پر جزاء و سزا مرتب فرمائیں گے۔

منیٰ میں دو یا تین دن کا قیام اور ذکر اللہ کی تاکید

آٹھویں آیت جو اس جگہ احکامِ حج کی آخری آیت ہے اس میں حجاج کو ذکر اللہ کی طرف متوجہ کر کے ان کے مقصدِ حج کی تکمیل اور آئندہ زندگی کو درست رکھنے کی ہدایت اس طرح فرمائی گئی ہے، وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ، "یعنی اللہ کو یاد کرو گنتی کے چند دنوں میں" ان چند دنوں سے مراد ایام تشریق ہیں، جن میں ہر نماز کے بعد تکبیر کہنا واجب ہے۔

آگے ایک مسئلہ کی وضاحت کی گئی کہ منیٰ میں قیام اور جمرات پر کنکریاں مارنا کب تک ضروری ہے، اس میں اہلِ جاہلیت کا اختلاف رہا کرتا تھا، بعض لوگ تیرہویں تاریخ ذی الحجہ تک منیٰ میں قیام اور جمرات پر رمی کرنے کو ضروری سمجھتے تھے، اس سے پہلے بارہویں کو واپس آجانے کو ناجائز اور ایسا کرنے والوں کو گنہگار کہا کرتے تھے، اسی طرح دوسرے لوگ بارہویں تاریخ کو چلے آنا ضروری سمجھتے، اور تیرھویں تک ٹھہرنے کو گناہ جانتے تھے، اس آیت میں ان دونوں کی اصلاح اس طرح کی گئی، کہ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ، "یعنی جو شخص عید کے بعد صرف دو دن منیٰ میں قیام کر کے واپس آجائے، اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، اور جو تیسرے دن تک مؤخر کرے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں" یہ دونوں فریق جو ایک دوسرے کو گنہگار کہتے ہیں غلو اور غلطی میں مبتلا ہیں۔

صحیح یہ ہے کہ حُجاج کو دونوں صورتوں میں اختیار ہے جس پر چاہیں عمل کریں، ہاں افضل و اولیٰ یہی ہے کہ تیسرے دن تک ٹھہریں، فقہاء نے فرمایا ہے کہ جو شخص دوسرے دن غروبِ آفتاب سے پہلے منیٰ سے چلا آیا اس پر تیسرے دن کی رمی واجب نہیں، لیکن اگر آفتاب منیٰ میں غروب ہو گیا پھر تیسرے دن کی رمی کرنے سے پہلے وہاں سے واپس آجانا جائز نہیں رہتا، البتہ تیسرے دن کی رمی میں یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ وہ زوالِ آفتاب سے پہلے صبح کے بعد بھی ہو سکتی ہے۔

منیٰ سے واپسی کا اور اس میں حجاج کو اختیار دینے کا ذکر فرمانے کے بعد جو کچھ کہا گیا کہ دوسرے دن واپس آجائے تو کچھ گناہ نہیں، اور تیسرے دن واپس آجائے تو کچھ گناہ نہیں، یہ سب اس شخص

کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور اس کے احکام کی پابندی کرنے والا ہے، کیونکہ درحقیقت حج اسی کا ہے، جیسا قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہے، اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (۵: ۲۷) "یعنی اللہ تعالیٰ عبادت انہی کی قبول کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے اور اطاعت شعار بندے ہیں"، اور جو شخص حج سے پہلے بھی گناہوں میں ملوّث تھا، اور حج کے اندر بھی بے پروائی سے کام لیتا رہا حج کے بعد بھی گناہوں سے پرہیز نہ کیا تو اس کو اس کا حج کوئی فائدہ نہ دے گا، اگرچہ اس کا حج فرض ادا ہوگیا، ترکِ حج کا مجرم نہیں رہا۔

آخر میں ارشاد فرمایا وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ۔ "یعنی ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے اور یقین کرو کہ تم سب اللہ کے پاس جمع ہونے والے ہو"، وہ تمہارے کھلے ہوئے اور چھپے ہوئے اعمال کا حساب لیں گے، اور ان پر جزاء و سزا دیں گے، احکامِ حج جو اوپر کی آیات میں بیان کئے گئے ہیں یہ جملہ درحقیقت اُن سب کی رُوح ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ خاص ایامِ حج میں جب کہ اعمالِ حج میں مشغول ہو، اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرو، احکامِ حج میں کوئی کوتاہی نہ کرو، اور بعد میں بھی اپنے حج پر مغرور نہ ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور گناہوں سے اجتناب کرو، کیونکہ وزنِ اعمال کے وقت انسان کے گناہ اس کے نیک اعمال کو کھا جائیں گے، نیک اعمال کا اثر اور وزن ظاہر نہ ہونے دیں گے، عبادتِ حج کے متعلق حدیث میں ہے کہ جب انسان حج سے فارغ ہو کر آتا ہے تو اپنے سابقہ گناہوں سے ایسا پاک صاف ہو جاتا ہے جیسے وہ ماں کے پیٹ سے آج پیدا ہوا ہے، اس لئے خاص طور سے حجاج کو آئندہ کے لئے تقویٰ کی ہدایت کی گئی کہ پچھلے گناہوں سے پاک ہو چکے ہو، آگے احتیاط رکھو، تو دنیا و آخرت کی بھلائی تمہارے لئے ہے، ورنہ جو شخص حج کے بعد پھر گناہوں میں مبتلا ہوگیا تو پچھلے گناہوں کی معافی اس کو کوئی خاص کام نہ آوے گی، بلکہ علماء نے فرمایا ہے کہ حج مقبول کی علامت یہ ہے کہ اپنے حج سے اس طرح واپس آئے کہ اس کا دل دنیا کی محبت سے فارغ اور آخرت کی طرف راغب ہو، ایسے شخص کا حج مقبول اور گناہ معاف ہیں، اور دعاء اس کی مقبول ہے، دورانِ حج میں جگہ جگہ انسان اللہ تعالیٰ سے اطاعت و فرمانبرداری کا معاہدہ اس کے بیت کے سامنے کرتا ہے، اگر حج کرنے والے اس کا دھیان رکھیں تو اس معاہدہ کے پورا کرنے کا آئندہ اہتمام میسّر آسکتا ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں حج سے واپس آیا تو اتفاقاً میرے دل میں ایک گناہ کا وسوسہ پیدا ہوا، مجھے غیب سے ایک آواز آئی کہ کیا تو نے حج نہیں کیا؟ کیا تو نے حج نہیں کیا؟ یہ آواز میرے اور اس گناہ کے درمیان ایک دیوار بن گئی، اللہ تعالیٰ نے مجھے محفوظ فرما دیا۔

ایک ترکی بزرگ جو مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کے مُریدتھے ان کا حال یہ تھا کہ ہمیشہ اپنے سر پر

ایک نور کا مشاہدہ کیا کرتے تھے، وہ حج کو گئے اور فارغ ہو کر واپس آئے تو یہ کیفیت بجائے بڑھنے کے بالکل سلب ہوگئی، اپنے مرشد مولانا جامیؒ سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے فرمایا کہ حج سے پہلے تمھارے اندر تواضع و انکسار تھا، اپنے آپ کو گنہگار سمجھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے الحاح و زاری کرتے تھے، حج کے بعد تم اپنے آپ کو نیک اور بزرگ سمجھنے لگے، اس لئے یہ حج ہی تمھارے لئے غرور کا سبب بن گیا، اسی وجہ سے یہ کیفیت زائل ہوگئی۔

احکام حج کے ختم پر تقویٰ کی تاکید میں ایک راز یہ بھی ہے کہ حج ایک بڑی عبادت ہے، اس کے ادا کرنے کے بعد شیطان عموماً انسان کے دل میں اپنی بڑائی اور بزرگی کا خیال ڈالتا ہے، جو اس کے تمام عمل کو بیکار کر دینے والا ہے، اس لئے خاتمۂ کلام میں فرمایا کہ جس طرح حج سے پہلے اور حج کے اندر اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اس کی اطاعت لازم ہے اسی طرح حج کے بعد اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور گناہوں سے پرہیز کا اہتمام کرتے رہو کہیں یہ کی کرائی عبادت ضائع نہ ہو جائے۔ اللّٰھُمّ وفقنا لما تحب وترضی من القول والفعل والنیۃ۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ

اور بعضا آدمی وہ ہے کہ پسند آتی ہے تجھ کو اس کی بات دنیا کی زندگانی کے کاموں میں اور گواہ کرتا ہے

عَلٰي مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَھُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ

اللہ کو اپنے دل کی بات پر اور وہ سخت جھگڑالو ہے، اور جب پھرے تیرے پاس سے تو دوڑتا پھرے ملک

لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾

میں تاکہ اس میں خرابی ڈالے اور تباہ کرے کھیتیاں اور جانیں اور اللہ ناپسند کرتا ہے فساد کو،

وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ

اور جب اُس سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈر تو آمادہ کرے اس کو غرور گناہ پر سو کافی ہے اس کو دوزخ

وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ

اور وہ بے شک بُرا ٹھکانا ہے، اور لوگوں میں ایک شخص وہ ہے کہ بیچتا ہے اپنی جان کو اللہ کی رضا جوئی

اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

میں، اور اللہ نہایت مہربان ہے اپنے بندوں پر

ربط آیات اوپر کی آیتوں میں دعا مانگنے والے آدمیوں کی دو قسمیں ٹھہرائی تھیں، ایک کافر کہ منکرِ آخرت ہی، اس لئے صرف دنیا مانگتا ہے، دوسرا مؤمن کہ معتقدِ آخرت ہی، دنیا کی بھلائی کے ساتھ آخرت کی بھلائی بھی مانگتا ہے، اب اگلی آیت میں اسی طرح کی تقسیم نفاق و اخلاص کے اعتبار سے فرماتے ہیں کہ بعض منافق ہوتے ہیں اور بعض مخلصین۔

خلاصۂ تفسیر (کوئی شخص تھا اَخنَس بن شُریق، بڑا فصیح و بلیغ، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر قسمیں کھا کھا کر دعوئِ اسلام کیا کرتا اور مجلس سے اٹھ کر جاتا تو فساد و شرارت وایذاء رسانیِ خلق میں لگ جاتا، اس منافق کے باب میں فرماتے ہیں) اور بعضا آدمی ایسا بھی ہے کہ آپ کو اس کی گفتگو جو محض دنیوی غرض سے ہوتی ہے، (کہ اظہارِ اسلام سے مسلمانوں کی طرح قربِ خصوصیت کے ساتھ رہوں گا، اس کی فصاحت و بلاغت کی وجہ سے) مزہ دار معلوم ہوتی ہے، اور وہ (اپنا اعتبار بڑھانے کو) اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتا ہے اپنے دل کی سچائی پر، حالانکہ (بالکل جھوٹا ہے، کیونکہ واقع میں) وہ (آپ کی) مخالفت میں (نہایت) شدید ہے، اور (جس طرح آپ کا مخالف ہو اسی طرح اور مسلمانوں کو بھی ایذا پہنچاتا ہی، چنانچہ) جب (آپ کی مجلس سے) پیٹھ پھیرتا ہے تو اس دوڑ دھوپ میں پھرتا رہتا ہی کہ شہر میں (کوئی) فساد کرے اور (کسی کی) کھیت اور مواشی کو تلف کرے، (چنانچہ ایک مسلمان کا اس طرح نقصان کر دیا) اور اللہ تعالیٰ فساد (کی باتوں) کو پسند نہیں فرماتے، اور (اس مخالفت وایذار کے ساتھ مغرور اس درجہ ہی کہ) جب اس سے کوئی کہتا ہے خدا سے ڈر تو (اور زیادہ) آمادہ کر دیتا ہے اس کو غرور گناہ پر، سو ایسے شخص کی کافی سزا ہے جہنم، اور وہ بُرا ٹھکانا ہے، اور (بعض آدمی ایسے بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے بدلہ میں اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کے حال پر نہایت مہربان ہیں۔

معارف و مسائل

آیت کا آخری حصہ جس میں مؤمن و مخلص کا یہ حال بیان کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اپنی جان کی بھی بازی لگا دیتا ہے، یہ اُن مخلص صحابۂ کرامؓ کی شان میں نازل ہوئی ہی جنھوں نے بے مثال قربانیاں اللہ کی راہ میں پیش کی ہیں، مستدرک حاکم، ابن جریر، مسند ابن ابی حاتم وغیرہ میں بسندِ صحیح منقول ہے کہ یہ آیت حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ میں نازل ہوئی ہی کہ جب وہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کے لئے روانہ ہوئے تو راستہ میں کفار قریش کی ایک جماعت

۳۱

نے راستہ روک لیا یہ دیکھ کر حضرت صہیب رومیؓ اپنی سواری سے اُتر کر کھڑے ہوگئے، اور ان کے ترکش میں جتنے تیر تھے سب نکال لئے، اور قریش کی اس جماعت سے خطاب کیا کہ اے قبیلۂ قریش تم سب جانتے ہو کہ میں تیراندازی میں تم سب سے زیادہ ماہر ہوں، میرا تیر کبھی خطا نہیں کرتا، اور اب میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ تم میرے پاس اس وقت تک نہ پہونچ سکوگے جب تک میرے ترکش میں ایک تیر بھی باقی ہے، اور تیروں کے بعد میں تلوار سے کام لوں گا جب تک مجھ میں دم رہے گا، پھر جو تم چاہو کرلینا، اور اگر تم نفع کا سودا چاہتے ہو تو میں تمھیں اپنے مال کا پتہ دیتا ہوں جو مکہ مکرمہ میں رکھا ہے، تم وہ مال لے لو، اور میرا راستہ چھوڑ دو، اس پر قریش کی جماعت راضی ہوگئی، اور حضرت صہیب رومیؓ نے صحیح سالم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہونچ کر واقعہ سُنایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ فرمایا

رَبِحَ الْبَیْعُ اَبَا یَحْیٰی رَبِحَ الْبَیْعُ اَبَا یَحْیٰی | "تمھارا بیوپار نفع بخش رہا، تمھاری بیع نفع بخش رہی۔"

اسی واقعہ میں آیت مذکورہ کے نزول نے اس کلام کی تصدیق کردی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے نکلا تھا۔

اور بعض حضرات مفسرین نے کچھ دوسرے صحابۂ کرامؓ کے ایسے ہی واقعات کو آیت کا شانِ نزول بتلایا ہے (مظہری)

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ

اے ایمان والو داخل ہوجاؤ اسلام میں پورے اور مت چلو قدموں پر

الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا

شیطان کے بیشک وہ تمھارا صریح دشمن ہے، پھر اگر تم بچلنے لگو بعد اس کے کہ پہنچ چکے

جَآءَتْكُمُ الْبَیِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۰۹﴾ هَلْ

تم کو صاف حکم تو جان رکھو کہ بیشک اللہ زبردست ہے حکمت والا، کیا وہ

یَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیَهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ

اسی کی راہ دیکھتے ہیں کہ آوے اُن پر اللہ ابر کے سائبانوں میں اور فرشتے

۲۵ ع ۱۴ ۹ وَقُضِیَ الْاَمْرُ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾

اور طے ہوجاوے قصہ اور اللہ ہی کی طرف لوٹیں گے سب کام

ربطِ آیات

اوپر مخلص کی مدح تھی، بعض اوقات اس اخلاص میں غلطی سے غلو اور افراط ہو جاتا ہے یعنی قصد تو ہوتا ہے زیادہ اطاعت کا مگر وہ اطاعت بنظر غائر حدِ شریعت وسنت سے متجاوز ہوتی ہے، اس کو بدعت کہتے ہیں، چنانچہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ وغیرہ جو پہلے علماء یہود سے تھے، اور اس مذہب میں ہفتہ کا روز معظم تھا، اور اونٹ کا گوشت حرام تھا، ان صاحبوں کو بعد اسلام کے یہ خیال ہوا کہ شریعتِ موسویہ میں ہفتہ کی تعظیم واجب تھی، اور شریعتِ محمدیہ میں اس کی بے تعظیمی واجب نہیں، اسی طرح شریعت موسویہ میں اونٹ کا گوشت کھانا حرام تھا اور شریعت محمدیہ میں اس کا کھانا فرض نہیں، سو اگر ہم بدستور ہفتہ کی تعظیم کرتے رہیں اور اونٹ کا گوشت باوجود حلال اعتقاد رکھنے کے صرف عملاً ترک کر دیں تو شریعتِ موسویہ کی بھی رعایت ہو جاوے اور شریعتِ محمدیہ کے بھی خلاف نہ ہوگا، اور اس میں خدا تعالیٰ کی زیادہ اطاعت اور دین کی زیادہ رعایت معلوم ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اس خیال کی اصلاح آیت آئندہ میں کسی قدر اہتمام سے فرماتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلام کامل فرض ہے اور اس کا کامل ہونا جب ہے کہ جو امر اسلام میں قابلِ رعایت نہ ہو اس کی رعایت دین ہونے کی حیثیت سے نہ کی جاوے، اور ایسے امر کو دین سمجھنا ایک شیطانی لغزش ہے، اور بہ نسبت ظاہری معاصی کے اس کا عذاب زیادہ سخت ہونے کا خطرہ ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو اسلام میں پورے پورے داخل ہو (یہ نہیں کہ کچھ یہودیت کی بھی رعایت کرو) اور (ایسے خیالات میں پڑ کر) شیطان کے قدم بقدم مت چلو، واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہے (کہ ایسی پٹی پڑھا دیتا ہے کہ ظاہر میں تو سراسر دین معلوم ہو اور فی الحقیقت بالکل دین کے خلاف) پھر اگر تم بعد اس کے کہ تم کو واضح دلیلیں (احکام وشرائع اسلام کی) پہنچ چکی ہیں، (پھر بھی صراطِ مستقیم سے) لغزش کرنے لگو تو یقین رکھو کہ حق تعالیٰ (بڑے) زبردست ہیں (سخت سزا دینگے اور کچھ دنوں تک سزا نہ دیں تو اس سے دھوکہ مت کھانا کیونکہ وہ) حکمت والے (بھی) ہیں (کسی حکمت ومصلحت سے کبھی سزا میں دیر بھی کر دیتے ہیں معلوم ہوتا ہے) یہ لوگ (جو کہ بعد وضوح دلائل حق کے کج راہی اختیار کرتے ہیں) صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ حق تعالیٰ اور فرشتے بادل کے سائبانوں میں ان کے پاس (سزا دینے کے لئے) آویں اور سارا قصہ ہی ختم ہو جاوے (یعنی کیا اس وقت امر حق قبول کریں گے جس وقت کا قبول کرنا مقبول بھی نہ ہوگا) اور یہ سارے (جزا وسزا کے) مقدمات اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کئے جاویں گے (کوئی دوسرا صاحبِ اختیار نہ ہوگا، سو ایسے زبردست کے ساتھ مخالفت کرنے کا انجام بجز خرابی کے کیا ہو سکتا ہے)۔

معارف ومسائل

اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ، سِلم بالکسر و بالفتح دو معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک صلح دوسرے اسلام، اس جگہ جمہور صحابہؓ و تابعینؒ کے نزدیک اسلام مراد ہے (ابن کثیر) لفظ کآفۃ جمیعاً اور عامۃً کے معنی میں آتا ہے، یہ لفظ اس جگہ ترکیب میں حال واقع ہوا ہے، جس میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ ضمیر اُدْخُلُوْا کا حال قرار دیا جائے، دوسرے یہ کہ سلم بمعنی اسلام کا حال ہو، پہلی صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ تم پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ، یعنی تمہارے ہاتھ پاؤں، آنکھ، کان، دل اور دماغ سب کا سب دائرۂ اسلام واطاعتِ الٰہیہ کے اندر داخل ہونا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ ہاتھ پاؤں سے تو احکامِ اسلامیہ بجا لا رہے ہو مگر دل و دماغ اس پر مطمئن نہیں، یا دل دماغ سے تو اس پر مطمئن ہو مگر ہاتھ پاؤں اور اعضاء و جوارح کا عمل اس سے باہر ہے۔

اور دوسری صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ تم داخل ہو جاؤ مکمل اور پورے اسلام میں، یعنی ایسا نہ ہو کہ اسلام کے بعض احکام کو تو قبول کرو بعض میں پس وپیش رہے، اور چونکہ اسلام نام ہے اس مکمل نظامِ حیات کا جو قرآن وسنت میں بیان ہوا ہے خواہ اس کا تعلق عقائد و عبادات سے ہو، یا معاملات و معاشرت سے، حکومت و سیاست سے اس کا تعلق ہو یا تجارت وصنعت وغیرہ سے، اسلام کا جو مکمل نظامِ حیات ہے تم سب اس پورے نظام میں داخل ہو جاؤ۔

خلاصہ دونوں صورتوں کا قریب قریب یہی ہے کہ احکامِ اسلام خواہ وہ کسی شعبۂ زندگی سے متعلق ہوں اور اعضاءِ ظاہری سے متعلق ہوں یا قلب اور باطن سے ان کا تعلق ہو، جب تک ان تمام احکام کو سچے دل سے قبول نہ کرو گے مسلمان کہلانے کے مستحق نہیں ہو گے۔

اس آیت کا شانِ نزول جو اوپر بیان ہوا ہے اس کا بھی حاصل یہی ہے کہ صرف اسلام ہی کی تعلیمات تمہارا مطمحِ نظر ہونا چاہئے، اس کو پورا پورا اختیار کر لو تو وہ تمہیں سارے مذاہب و ملل سے بے نیاز کر دے گا۔

تنبیہ:۔ اس میں اُن لوگوں کے لئے بڑی تنبیہ ہے جنھوں نے اسلام کو صرف مسجد اور عبادات کے ساتھ مخصوص کر رکھا ہے، معاملات اور معاشرت کے احکام کو گویا دین کا جزء ہی نہیں سمجھتے، اصطلاحی دینداروں میں یہ غفلت عام ہے، حقوق و معاملات اور خصوصاً حقوق معاشرت سے بالکل بیگانہ ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام کو وہ اسلام کے احکام ہی یقین نہیں کرتے، نہ اُن کے معلوم کرنے یا سیکھنے کا اہتمام کرتے ہیں نہ اُن پر عمل کرنے کا، نعوذ باللہ، کم از کم مختصر رسالہ آدابِ معاشرت حضرت سیدی حکیم الامتؒ کا ہر مسلمان مرد و عورت کو ضرور پڑھ لینا چاہئے۔

اور یہ واقعہ کہ اللہ تعالیٰ اور فرشتے بادل کے سائبانوں میں اُن کے پاس آجائیں قیامت میں پیش آئے گا، اور اللہ تعالیٰ کا اس طرح آنا متشابہات میں سے ہے جس کے متعلق جمہور صحابہؓ و تابعینؒ اور اسلافِ امت کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے مضمون کے حق و صحیح ہونے کا اعتقاد و یقین رکھے، اور کیفیت کہ کس طرح یہ کام ہوگا اس کی دریافت کی فکر میں نہ پڑے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات اور تمام صفات کی حقیقت اور کیفیت کا معلوم کرنا انسان کی عقل سے بالاتر ہے یہ بھی اسی میں داخل ہے۔

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰھُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَمَنْ يُّبَدِّلْ

پوچھ بنی اسرائیل سے کس قدر عنایت کیں ہم نے انکو نشانیاں کھلی ہوئی، اور جو کوئی بدل ڈالے

نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۲۱۱

اللہ کی نعمت بعد اس کے کہ پہنچ چکی ہو وہ نعمت اس کو تو اللہ کا عذاب سخت ہے،

زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ

فریفتہ کیا ہے کافروں کو دنیا کی زندگی پر اور ہنستے ہیں ایمان والوں

اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ

سے اور جو پرہیزگار ہیں وہ ان کافروں سے بالاتر ہوں گے قیامت کے دن اور اللہ روزی

وقف لازم

مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۲۱۲

دیتا ہے جسکو چاہے بے شمار

ربطِ آیات

اوپر فرمایا تھا کہ بعد دلائلِ واضحہ آجانے کے حق کی مخالفت کرنا موجبِ سزا ہے، پہلی آیت میں اس کی دلیل بیان فرماتے ہیں کہ جیسے بعض بنی اسرائیل کو ایسی ہی مخالفت پر سزا دی گئی:

خلاصۂ تفسیر

آپ (علماء) بنی اسرائیل سے (ذرا) پوچھئے (تو سہی) ہم نے ان کو (یعنی اُن کے بزرگوں کو) کتنی واضح دلیلیں دی تھیں (مگر ان لوگوں نے بجائے اس کے کہ اس سے ہدایت حاصل کرتے اور الٹی گمراہی پر کمر باندھی پھر دیکھو سزائیں بھی بھگتیں، مثلاً توراۃ ملی، چاہئے تو یہ تھا کہ اس کو قبول کرتے، مگر انکار کیا، آخر کوہِ طور گرانے کی ان کو دھمکی دی گئی، اور مثلاً حق تعالیٰ کا کلام سنا، چاہئے تھا سر آنکھوں پر رکھتے مگر شبہات نکالے آخر بجلی سے ہلاک ہوئے اور مثلاً دریا میں شگاف کرکے فرعون سے نجات دی گئی، احسان مانتے مگر گوسالہ پرستی شروع کی، جس پر

سزائے قتل دی گئی، اور مثلاً منّ وسلویٰ نازل ہوا شکر کرنا چاہئے تھا، نافرمانی کی وہ سڑنے لگا، اور اس سے نفرت ظاہر کی تو وہ موقوف ہوگیا، اور کھیتی کی مصیبت سر پر پڑی، اور مثلاً انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ ان میں جاری رہا، غنیمت سمجھتے ان کو قتل کرنا شروع کردیا، جس پر یہ سزا دی گئی کہ ان سے حکومت وسلطنت چھین لی گئی، وعلیٰ ھٰذا بہت سے معاملات اسی سورۂ بقرہ کے شروع میں بھی مذکور ہوچکے ہیں) اور (ہمارا قانون ہی یہ ہے کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کی (ایسی بڑی) نعمت (دلائلِ واضحہ) کو بدلتا ہے، اس کے پاس پہنچنے کے بعد (یعنی بجائے اس کے کہ اس سے ہدایت حاصل کرے اور اُلٹا گمراہ بنتا ہو) تو یقیناً حق تعالیٰ (ایسے شخص کو) سخت سزا دیتے ہیں۔

(دوسری آیت میں مخالفتِ حق کی اصلی علت اکثر یہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ دنیا کی محبت ہو، جس کے آثار میں سے اہلِ دین کو حقیر سمجھنا بھی ہے، کیونکہ جب دنیا کا غلبہ ہوتا ہے دین کی طلب نہیں رہتی، بلکہ دین کو اپنی دنیوی اغراض کے خلاف دیکھ کر ترک کر بیٹھتا ہے، اور دوسرے طالبانِ دین پر ہنستا ہو، چنانچہ بعض رؤسائے بنی اسرائیل اور جہلائے مشرکین غریب مسلمانوں کے ساتھ باستہزاء پیش آیا کرتے تھے، ان لوگوں کا بیان فرماتے ہیں کہ) دنیوی معاش کفار کو آراستہ پیراستہ معلوم ہوتی ہے اور (اسی وجہ سے) ان مسلمانوں سے تمسخر کرتے ہیں، حالانکہ یہ (مسلمان) جو کفر وشرک سے بچتے ہیں ان کافروں سے اعلیٰ درجہ (کی حالت) میں ہوں گے قیامت کے روز (کیونکہ کفار جہنم میں ہوں گے اور مسلمان جنّت میں) اور (آدمی کو محض معاشی وسعت پر مغرور نہ ہونا چاہئے، کیونکہ روزی تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے انداز (یعنی بکثرت) دیدیتے ہیں (پس اس کا مدار قسمت پر ہے نہ کہ کمال اور مقبولیت پر، سو یہ ضرور نہیں کہ جو روزی میں بڑا ہو وہ اللہ کے نزدیک بھی معزز ہو اور بڑی عزت وہی ہے جو اللہ کے نزدیک معتبر ہو پھر محض اس کے اوپر اپنے کو معزز اور دوسرے کو ذلیل سمجھنا بیوقوفی ہے)۔

معارف ومسائل

دنیا کے مال ودولت اور عزت وجاہ پر مغرور ہونے اور غریب لوگوں کا استہزاء کرنے کی حقیقت قیامت کے روز آنکھوں کے سامنے آجائے گی۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص کسی مومن مرد یا عورت کو اس کے فقر وفاقہ کی وجہ سے ذلیل وحقیر سمجھتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو اوّلین وآخرین کے مجمع میں رسوا اور ذلیل کریں گے، اور جو شخص کسی مسلمان مرد یا عورت پر بہتان باندھتا ہے اور کوئی ایسا عیب اس کی طرف منسوب کرتا ہے جو اس میں نہیں ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو آگ

کے ایک اونچے ٹیلہ پر کھڑا کریں گے جب تک کہ وہ خود اپنی تکذیب نہ کرے۔
(تذکرۃ الحدیث القرطبی)

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً قف فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ

تھے سب لوگ ایک دین پر پھر بھیجے اللہ نے پیغمبر خوش خبری سنانے والے اور

مُنْذِرِيْنَ ص وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ

ڈرانے والے اور اُتاری اُن کے ساتھ کتاب سچی کہ فیصلہ کرے لوگوں میں جس بات

فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ط وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْ بَعْدِ

میں وہ جھگڑا کریں، اور نہیں جھگڑا ڈالا کتاب میں مگر انہی لوگوں نے جن کو کتاب ملی تھی اس

مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ج فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

کے بعد کہ ان کو پہنچ چکے صاف حکم آپس کی ضد سے پھر اب ہدایت کی اللہ نے ایمان والوں کو

لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ط وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى

اس سچی بات کی جس میں وہ جھگڑا کر رہے تھے اپنے حکم سے اور اللہ بتلاتا ہے جس کو چاہے

صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۲۱۳)

سیدھا راستہ۔

ربطِ آیات اوپر دینِ حق سے اختلاف کرنے کی علت حُبِّ دنیا کو بتایا ہے، آگے اسی مضمون کی تائید فرماتے ہیں کہ مدت سے یہی قصہ چلا آرہا ہے کہ ہم دلائل واضحہ دینِ حق پر قائم کرتے ہیں، اور طالبانِ دنیا اپنی دنیوی اغراض کے سبب اس سے خلاف کرتے رہے۔

خلاصۂ تفسیر (ایک زمانہ میں) سب آدمی ایک ہی طریق پر تھے (کیونکہ اوّل دنیا میں حضرت آدم علیہ السلام مع اپنی بی بی کے تشریف لائے اور جو اولاد ہوتی گئی ان کو دینِ حق کی تعلیم فرماتے رہے اور وہ ان کی تعلیم پر عمل کرتے رہے، ایک مدت اسی حالت میں گذر گئی، پھر اختلافِ طبائع سے اغراض میں اختلاف ہونا شروع ہوا حتیٰ کہ ایک عرصہ کے بعد اعمال وعقائد میں اختلاف کی نوبت آگئی) پھر (اس اختلاف کے رفع کرنے کو) اللہ تعالیٰ نے (مختلف) پیغمبروں کو بھیجا جو کہ (حق ماننے والوں کو) خوشی (کے وعدے) سناتے تھے اور (نہ ماننے والوں کو عذاب سے) ڈراتے تھے، اور ان (پیغمبروں کی مجموعی جماعت) کے ساتھ (آسمانی) کتابیں بھی

ٹھیک طور پر نازل فرمائیں (اور ان پیغمبروں کا بھیجنا اور کتابوں کا نازل فرمانا) اس غرض سے (تھا) کہ اللہ تعالیٰ (ان رسل وکتب کے ذریعہ سے اختلاف کرنے والے) لوگوں میں ان کے امور اختلافیہ (مذہبی) میں فیصلہ فرمادیں (کیونکہ رسل وکتب امر واقعی کا اظہار کردیتے ہیں اور امر واقعی کے متعین ہونے سے ظاہر ہے کہ غیر واقعی کا غلط ہوجانا معلوم ہوجاتا ہے، اور یہی فیصلہ ہے، اور ان پیغمبروں کے ساتھ کتاب اللہ آنے سے چاہئے تھا کہ اس کتاب کو قبول کرتے، اور اس پر مدار کار رکھ کر اپنے سب اختلافات مٹا دیتے، مگر بعضوں نے خود اس کتاب ہی کو نہ مانا، اور خود اسی میں اختلاف کرنا شروع کردیا) اور اس کتاب میں (یہ) اختلاف اور کسی نے نہیں کیا، مگر صرف ان لوگوں نے جن کو (اولاً) وہ کتاب ملی تھی (یعنی اہل علم واہل فہم نے کہ اوّل مخاطب وہی لوگ ہوتے ہیں، دوسرے عوام اُن کے ساتھ لگ لیا کرتے ہیں، اور اختلاف بھی کیسے وقت کیا) بعد اس کے کہ ان کے پاس دلائل واضحہ پہنچ چکے تھے (یعنی ان کے ذہن نشین ہوچکے تھے، اور اختلاف کیا کس وجہ سے صرف) باہمی ضدا ضدی کی وجہ سے (اور اصلی وجہ ضدا ضدی کی حُبّ دنیا ہوتی ہے، حُبّ مال ہو یا حُبّ جاہ پس مدار علت مخالفت حق کا وہی حُبّ دنیا ٹھہری اور یہی مضمون تھا سابق میں) پھر (یہ اختلاف کفار کا کبھی اہل ایمان کو مضر نہیں ہوا، بلکہ) اللہ تعالیٰ نے (ہمیشہ) ایمان والوں کو وہ امر حق جس میں (مختلفین) اختلاف کیا کرتے تھے بفضلہ تعالیٰ (رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانے کی بدولت) بتلادیا اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اسی کو راہ راست بتلا دیتے ہیں۔

معارف ومسائل

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کسی زمانہ میں تمام انسان ایک ہی مذہب وملت اور عقیدہ وخیال پر تھے جو ملّتِ حق اور دین فطرت تھی، پھر انہیں مزاج ومذاق اور رائے وفکر کے اختلاف سے بہت سے مختلف خیالات وعقائد پیدا ہوگئے، جن میں یہ امتیاز کرنا دشوار تھا کہ ان میں حق کونسا ہے اور باطل کونسا، حق کو واضح کرنے اور صحیح راہِ حق بتلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام بھیجے، اور ان پر کتابیں اور وحی نازل فرمائی، انبیاء علیہم السلام کی جد وجہد اور تبلیغ واصلاح کے بعد انسان دو گروہوں میں منقسم ہوگئے، ایک وہ جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایات کو قبول کیا اور انبیاء علیہم السلام کے متبع ہوگئے، جن کو مومن کہا جاتا ہے، دوسرے وہ جنھوں نے آسمانی ہدایات اور انبیاء علیہم السلام کو جھٹلایا، ان کی بات نہ مانی، یہ لوگ کافر کہلاتے ہیں، اس آیت کے پہلے جملہ میں ارشاد ہے: كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً، امام راغب اصفہانیؒ نے مفردات القرآن میں فرمایا ہے کہ لفظ "امّۃ" عربی لغت کے اعتبار سے ہر ایسی جماعت کو کہا جاتا ہے جس میں کسی وجہ سے رابطہ واتحاد اور وحدت

قائم ہو، خواہ یہ وحدت نظریات وعقائد کی ہو، یا ایک زمانہ میں یا کسی ایک خطۂ ملک میں جمع ہونے کی، یا کسی دوسرے علاقہ یعنی نسب، زبان، رنگ وغیرہ کی، مفہوم اس جملہ کا یہ ہے کہ کسی زمانہ میں تمام انسان باہم متفق ومتحد ایک جماعت تھے، اس میں دو باتیں قابلِ غور ہیں:

اوّل یہ کہ اس جگہ وحدت سے کس قسم کی وحدت مراد ہے، دوسرے یہ کہ وحدت کس زمانہ میں تھی، امر اوّل کا فیصلہ تو اسی آیت کے آخری جملہ نے کر دیا جس میں اس وحدت کے بعد اختلاف واقع ہونے کا اور مختلف راہوں میں حق متعین کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے کا ذکر ہے، کیونکہ یہ اختلاف جس میں فیصلہ کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں بھیجی گئی ہیں، ظاہر ہے کہ وہ نسب یا زبان یا رنگ یا وطن اور زمانہ کا اختلاف نہ تھا، بلکہ نظریات اور عقائد وخیالات کا اختلاف تھا، اسی کے مقابلہ سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں وحدت سے بھی وحدتِ فکر وخیال اور وحدتِ عقیدہ ومسلک مراد ہے۔

تو اب مفہوم آیت کا یہ ہوگیا کہ ایک زمانہ ایسا تھا جب کہ تمام افرادِ انسانی صرف ایک ہی عقیدہ وخیال اور ایک ہی مذہب ومسلک رکھتے تھے، وہ عقیدہ ومسلک کیا تھا، اس میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ سب عقیدۂ توحید وایمان پر متفق تھے، دوسرے یہ کہ سب کفر وضلال پر متحد تھے۔ مگر جمہور مفسرین کے نزدیک راجح یہ ہے کہ مراد عقائدِ صحیحہ توحید وایمان پر سب کا متحد ہونا ہے، سورۂ یونسؑ میں بھی اسی مضمون کی ایک آیت آئی ہے:

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ (۱۰: ۱۹)	"یعنی سب آدمی ایک ہی امت تھے، پھر آپس میں اختلاف پڑ گیا، اور اگر اللہ تعالیٰ کا یہ ازلی فیصلہ نہ ہوتا کہ اس عالم میں حق وباطل کھرا کھوٹا، سچ اور جھوٹ ملے جلے چلیں گے) تو قدرت الٰہیہ ان سب

جھگڑوں کا ایسا فیصلہ کر دیتی کہ حق سے اختلاف کرنے والوں کا نام ہی نہ رہتا"

اور سورۂ انبیاءؑ میں فرمایا:

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ۝ (۲۱: ۹۲)	"یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں، اس لئے سب میری ہی عبادت کرتے رہو"

اسی طرح سورۂ مؤمنون میں فرمایا:

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝ (۲۳: ۵۲)	"یعنی یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں، اس لئے مجھ سے ہی ڈرتے رہو"

ان تمام آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ وحدت سے عقیدہ و مسلک کی وحدت اور دینِ حق توحید و ایمان میں سب کا متحد ہونا مراد ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ دینِ حق اسلام و ایمان پر تمام انسانوں کا اتفاق و اتحاد کس زمانہ کا واقعہ ہے، یہ وحدت کہاں تک قائم رہی؟ مفسرینِ صحابہؓ میں سے حضرت ابی بن کعبؓ اور ابن زیدؓ نے فرمایا کہ یہ واقعہ عالمِ ازل کا ہے، جب تمام انسانوں کی ارواح کو پیدا کر کے ان سے سوال کیا گیا تھا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ۔ یعنی "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں"، اور سب نے بلا استثناء یہ جواب دیا تھا کہ بیشک آپ ہمارے رب اور پروردگار ہیں، اس وقت تمام افرادِ انسانی ایک ہی عقیدۂ حقہ پر قائم تھے جس کا نام ایمان و اسلام ہے (قرطبی)

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ وحدتِ عقیدہ کا واقعہ اس وقت کا ہے جبکہ آدم علیہ السلام مع اپنی زوجہ محترمہ کے دنیا میں تشریف لائے، اور آپ کی اولاد ہوئی اور پھیلتی گئی، وہ سب کے سب حضرت آدم علیہ السلام کے دین اور انہی کی تعلیم و تلقین کے تابع توحید کے قائل تھے، اور سب کے سب باستثناء قابیل وغیرہ متبعِ شریعت و فرمانبردار تھے۔

مسند بزار میں حضرت ابن عباسؓ کے اس قول کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ وحدتِ عقیدہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت ادریس علیہ السلام تک قائم رہی، اس وقت تک سب کے سب مسلم اور توحید کے معتقد تھے، اور آدم علیہ السلام اور ادریس علیہ السلام کے درمیان زمانہ دس قرن ہے، بظاہر قرن سے ایک صدی مراد ہو تو کل زمانہ ایک ہزار سال کا ہو گیا۔

اور بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ وحدتِ عقیدہ کا زمانہ وہ ہے جب کہ نوح علیہ السلام کی بد دعاء سے دنیا میں طوفان آیا، اور بجز اُن لوگوں کے جو نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار ہو گئے تھے، باقی ساری دنیا غرق ہو گئی تھی، طوفان ختم ہونے کے بعد جتنے آدمی اُس دنیا میں رہے وہ سب مسلمان موحّد اور دینِ حق کے پیرو تھے۔

اور درحقیقت ان تینوں اقوال میں کوئی اختلاف نہیں، یہ تینوں زمانے ایسے ہی تھے جن میں سارے انسان ملتِ واحدہ اور امتِ واحدہ بنے ہوئے دینِ حق پر قائم تھے۔

آیت کے دوسرے جملہ میں ارشاد ہے: فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ "یعنی پھر اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو بھیجا جو خوشی سناتے تھے اور ڈراتے تھے، اور ان کے ساتھ کتابیں بھی ٹھیک طور پر نازل فرمائیں اس غرض سے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں میں ان کے امورِ اختلافیہ میں فیصلہ فرما دیں"۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ اوپر کے جملہ میں تمام انسانوں کا امتِ واحدہ اور ملتِ واحدہ ہونا بیان کیا تھا، اور اس جملہ میں اسی پر تفریع کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ ہم نے انبیاءؑ اور کتابیں بھیجی تاکہ اختلاف کا فیصلہ کیا جائے، ان دونوں جملوں میں بظاہر جوڑ نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ انبیاءؑ اور کتابوں کے بھیجنے کی علت لوگوں کا اختلاف ہے، اور اختلاف اس وقت تھا نہیں، مگر جواب بالکل واضح ہے کہ مراد آیتِ مذکورہ کی یہ ہے کہ ابتداء عالم میں تمام انسان ایک ہی عقیدۂ حق کے قائل اور پابند تھے، پھر رفتہ رفتہ اختلافات پیدا ہوگئے، اختلافات پیدا ہونے کے بعد انبیاء علیہم السلام اور کتابیں بھیجنے کی ضرورت پیش آئی۔

اب ایک بات رہ جاتی ہے کہ اوپر صرف امت واحدہ ہونے کا ذکر کیا گیا، اختلاف پیدا ہونے کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا، جو لوگ قرآن کریم کے اسلوب حکیم پر کچھ نظر رکھتے ہیں، ان کے لئے اس کا جواب مشکل نہیں، کہ قرآن کریم احوالِ ماضیہ کے بیان میں قصہ کہانی یا تاریخ کی کتابوں کے سارے قصہ کو کہیں نقل نہیں کرتا، بلکہ درمیان سے وہ حصہ حذف کر دیتا ہے جو اس سیاقِ کلام سے خود بخود سمجھا جاسکے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں جو قیدی رہا ہو کر آیا اور خواب کی تعبیر حاصل کرنے کے لئے اس نے بادشاہ سے کہا کہ مجھے یوسف علیہ السلام کے پاس بھیجدو، تو قرآن میں اس قیدی کی تجویز نقل کرنے کے بعد بات یہاں سے شروع ہوتی ہے: يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ، اس کا ذکر نہیں کیا کہ بادشاہ نے اس کی تجویز کو پسند کیا، اور اس کو جیل خانہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس بھیجا، وہ وہاں پہونچ کر ان سے مخاطب ہوا، کیونکہ پچھلے اور اگلے جملوں کے ملانے سے یہ ساری باتیں خود بخود سمجھ میں آجاتی ہیں۔

اسی طرح اس آیت میں وحدتِ ملت کے بعد اختلاف واقع ہونے کا تذکرہ اس لئے ضروری نہیں سمجھا گیا کہ اختلافات کا وقوع تو ساری دنیا جانتی ہے، ہر وقت مشاہدہ میں آتا ہے، ضرورت اس امر کے اظہار کی تھی کہ ان اختلافاتِ کثیرہ سے پہلے ایک زمانہ ایسا بھی گذر چکا ہے جس میں سارے انسان ایک ہی مذہب و ملت اور ایک ہی دینِ حق کے پیرو تھے، اسی کو بیان فرمایا، پھر جو اختلاف دنیا میں پھیلے ہوئے اور سب کے مشاہدہ میں آرہے ہیں ان کے وقوع کا بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی، ہاں یہ بتلایا گیا کہ ان اختلافات میں راہِ حق کی ہدایت اور رہنمائی کا سامان حق تعالیٰ نے کیا فرمایا، اس کے متعلق ارشاد ہوا فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ، یعنی حق تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا جو دینِ حق کا اتباع کرنے والوں کو دائمی آرام و راحت کی خوش خبری اور اس سے اعراض کرنے والوں کو عذابِ جہنم کی وعید سنا دیں، اور ان کے ساتھ اپنی وحی اور کتابیں بھیجی جو مختلف عقائد و خیالات میں سے صحیح اور حق کو واضح کر کے بتلا دیں، اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ انبیاء

رسلؑ اور آسمانی کتابوں کے کھلے ہوئے فیصلوں کے بعد بھی یہ دنیا دو گروہوں میں تقسیم ہوگئی، کچھ لوگوں نے ان ہدایاتِ واضحہ کو قبول نہ کیا، اور تعجب کی بات یہ ہے کہ قبول نہ کرنے والے اول وہی لوگ ہوئے جن کے پاس یہ انبیاءؑ اور آیاتِ الٰہیہ بھیجی گئی تھیں، یعنی اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ، اور اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ آسمانی کتابوں میں کوئی اشتباہ یا التباس کی گنجائش نہ تھی، کہ ان کی سمجھ میں نہ آئے یا غلط فہمی کا شکار ہوجائیں، بلکہ حقیقت یہ تھی کہ جاننے بوجھنے کے باوجود ان لوگوں نے محض ضد اور ہٹ دھرمی سے انکار کیا۔

اور دوسرا گروہ وہ ہوا جن کو اللہ تعالیٰ نے راہِ ہدایت پر لگادیا اور جس نے انبیاء و رسلؑ اور آسمانی کتابوں کے فیصلے ٹھنڈے دل سے تسلیم کئے، انھیں دونوں گروہوں کا بیان قرآن کریم نے سورۂ تغابن میں اس طرح فرمایا ہے:

خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۔ (۶۴: ۲)	"یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو پیدا کیا پھر تم میں سے کچھ کافر و منکر ہوگئے کچھ مومن و مسلم"

خلاصۂ مضمون آیت كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً کا یہ ہے کہ پہلے دنیا کے سب انسان دینِ حق پر قائم تھے، پھر اختلافِ طبائع سے اغراض میں اختلاف ہونا شروع ہوا، ایک عرصہ کے بعد اعمال و عقائد میں اختلاف کی نوبت آگئی، یہاں تک کہ حق و باطل میں التباس ہونے لگا، تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام اور اپنی کتابیں راہِ حق کی ہدایت کرنے کے لئے اور اسی دینِ حق پر دوبارہ قائم ہوجانے کے لئے بھیجی جس پر سب انسان پہلے قائم تھے، لیکن ان سب ہدایات واضحہ اور آیات بینات کے ہوتے ہوئے کچھ لوگوں نے مانا اور کچھ لوگوں نے ضد اور عناد سے انکار و انحراف کی راہ اختیار کرلی۔

مسائل

مسئلہ: اس آیت سے چند باتیں معلوم ہوئیں، اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو بہت سے انبیاءؑ اور کتابیں دنیا میں بھیجیں یہ سب اس واسطے تھیں کہ یہ لوگ جو دینِ حق کی ملّتِ واحدہ کو چھوڑ کر مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہیں پھر اُن کو اسی ملّتِ واحدہ پر قائم کردیں، انبیاءؑ کا یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا کہ جب لوگ اس راہِ حق سے بچلے تو ان کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے کوئی نبیؑ بھیجا، اور کتاب اتاری کہ اس کے موافق چلیں، پھر کبھی بہکے تو دوسرا نبیؑ اور کتاب اللہ تعالیٰ نے اسی راہِ حق پر قائم کرنے کے لئے بھیجدیا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے تندرستی ایک ہے اور بیماریاں بے شمار، جب ایک مرض پیدا ہوا تو اس کے موافق دوا اور پرہیز مقرر فرمایا، جب دوسرا مرض پیدا ہوا تو دوسری دوا

اور پرہیز اس کے موافق بتلایا، اب آخر میں ایسا جامع نسخہ تجویز فرمایا جو ساری بیماریوں سے بچانے میں اس وقت تک کے لئے کامیاب ثابت ہو جب تک اس عالم کو باقی رکھنا منظور ہو، یہ مکمل اور جامع نسخہ، ایک جامع اصولِ علاج سب پچھلے نسخوں کے قائم مقام اور آئندہ سے بے نیاز کرنے والا ہو، اور وہ نسخۂ جامع اسلام ہے، جس کے لئے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن بھیجے گئے، اور پچھلی کتابوں میں تحریف ہو کر جو پچھلے انبیاءؑ کی تعلیمات ضائع اور گم ہو جانے کا سلسلہ اوپر سے چلا آیا تھا جس کے سبب نئے نبی اور نئی کتاب کی ضرورت پیش آتی تھی اس کا یہ انتظام فرمادیا گیا کہ قرآن کریم کے تحریف سے محفوظ رہنے کا ذمہ خود حق تعالیٰ نے لے لیا اور قرآن کریم کی تعلیمات کو قیامت تک ان کی اصلی صورت میں قائم اور باقی رکھنے کے لئے اللہ جل شانہٗ نے امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں تاقیامت ایک ایسی جماعت قائم رکھنے کا وعدہ فرمالیا جو ہمیشہ دینِ حق پر قائم رہ کر کتاب وسنت کی صحیح تعلیم مسلمانوں میں شائع کرتی رہے گی، کسی کی مخالفت وعداوت، اُن پر اثر انداز نہ ہوگی، اس لئے اس کے بعد دروازۂ نبوّت اور وحی کا بند ہو جانا ناگزیر امر تھا، آخر ختمِ نبوّت کا اعلان کر دیا گیا۔

خلاصہ یہ ہو کہ مختلف زمانوں میں مختلف انبیاءؑ اور ان کی مختلف کتابیں آنے سے کوئی اس دھوکہ میں نہ پڑ جائے کہ انبیاءؑ اور کتابیں لوگوں کو مختلف فرقوں میں تقسیم کرنے اور افتراق پیدا کرنے کے لئے نازل کی گئی ہیں، بلکہ منشاء ان سب انبیاءؑ اور کتابوں کا یہ ہے کہ جس طرح پہلے سارے انسان ایک ہی دینِ حق کے پیرو ہو کر ملت واحدہ تھے، اسی طرح پھر اُسی دینِ حق پر سب جمع ہو جائیں۔

مسئلہ: دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ مذہب کی بناء پر قومیت کی تقسیم مسلم وغیر مسلم کا دو قومی نظریہ عین منشاء قرآنی کے مطابق ہی، آیت فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ (۲:۶۴) اس پر شاہد ہی، اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح ہوگیا کہ اسلام میں اس دو قومی نظریے کی اصل بنیاد درحقیقت صحیح متحدہ قومیت پیدا کرنے پر ہے جو ابتداءِ آفرینش میں قائم تھی، جس کی بنیاد وطنیت پر نہ تھی بلکہ عقیدۂ حق اور دینِ حق کی پیروی پر تھی، ارشادِ قرآنی كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً نے بتلایا کہ ابتداء عالم میں اعتقادِ صحیح اور دینِ حق کی پیروی کے اعتبار سے ایک صحیح اور حقیقی وحدتِ قومی قائم تھی، بعد میں لوگوں نے اختلافات پیدا کئے، انبیاءؑ نے لوگوں کو اسی اصلی وحدت کی طرف بلایا، جنھوں نے ان کی دعوت کو قبول نہ کیا، وہ اس متحدہ قومیت سے کٹ گئے اور جداگانہ قوم قرار دیئے گئے۔

مسئلہ: تیسری بات اس آیت سے یہ معلوم ہوئی کہ ازل سے سنت اللہ یہی جاری ہے کہ بُرے لوگ ہر نبی مبعوث کے خلاف اور ہر کتابِ الٰہی سے اختلاف کو پسند کرتے رہے اور ان کے مقابلہ ومخالفت میں پورا زور خرچ کرنے کے لئے آمادہ رہے ہیں، تو اب اہلِ ایمان کو ان کی بدسلوکی اور فساد سے تنگدل نہ ہونا چاہئے، جس طرح کفار نے اپنے بڑوں کا طریقہ کفر وعناد اور انبیاءؑ کی مخالفت

کا اختیار کیا، اسی طرح مؤمنین صالحین کو چاہئے کہ وہ اپنے بزرگوں کا یعنی انبیاء علیہم السلام کا وظیفہ اختیار کریں، کہ اُن لوگوں کی ایذاؤں اور مخالفتوں پر صبر کریں، اور حکمت و موعظت اور نرمی کے ساتھ ان کو دین حق کی طرف بلاتے رہیں، اور شاید اسی مناسبت سے اگلی آیت میں مسلمانوں کو مصائب و آفات پر تحمل اور صبر کی تلقین کی گئی ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ

کیا تم کو یہ خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ تم پر نہیں گزرے حالات اُن

الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَ

لوگوں کے جیسے جو ہو چکے تم سے پہلے کہ پہنچی ان کو سختی اور تکلیف اور

زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى

جھڑ جھڑائے گئے یہاں تک کہ کہنے لگا رسول اور جو اُس کے ساتھ ایمان لائے کب آوے گی

نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾

اللہ کی مدد، سُن رکھو اللہ کی مدد قریب ہے۔

ربط آیات اوپر کی آیت میں کفار کا ہمیشہ سے انبیاءؑ و مؤمنین کے ساتھ اختلاف اور خلاف کرتے رہنا مذکور تھا، جس میں ایک گونہ مسلمانوں کو اس طور پر تسلّی دینا بھی مقصود تھا جن کو استہزاء کفار سے ایذا ہوتی تھی، کہ یہ خلاف تمھارے ساتھ نیا نہیں ہے ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، آگے ان کفار مخالفین سے انبیاءؑ و مؤمنین کو انواع انواع کی ایذائیں اور شدائد پہنچنے کی حکایت بیان فرماتے ہیں، اور اس سے بھی مسلمانوں کو تسلّی دلاتے ہیں کہ تم کو بھی کفار سے جو ایذائیں پہنچتی ہیں اُن پر صبر کرنا چاہئے، کیونکہ کامل راحت تو آخرت کی محنت ہی اٹھانے سے ہے۔

خلاصۂ تفسیر (دوسری بات سنو کیا تمھارا یہ خیال ہو کہ جنت میں (بے مشقت) جا داخل ہو گے، حالانکہ (ابھی کچھ مشقت تو اٹھائی ہی نہیں، کیونکہ) تم کو ہنوز ان (مسلمان) لوگوں کا سا عجیب واقعہ پیش نہیں آیا جو تم سے پہلے ہو گذرے ہیں، ان پر (مخالفین کے سبب) ایسی ایسی تنگی اور سختی واقع ہوئی اور (مصائب سے) ان کو یہاں تک جنبشیں

ہوئیں کہ (اس زمانہ کے) پیغمبر تک اور جوان کے ہمراہ اہلِ ایمان تھے (بے قرار ہوکر) بول اٹھے کہ اللہ تعالیٰ کی امداد (موعود) کب ہوگی (جس پر ان کو جواب سے تسلّی کی گئی کہ) یاد رکھو! بیشک اللہ تعالیٰ کی امداد (بہت) نزدیک (ہونے والی) ہے۔

معارف ومسائل

اس آیت میں چند باتیں قابلِ غور ہیں:

اوّل یہ کہ اس آیت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بغیر مشقت و محنت کے اور بغیر مصائب و آفات میں مبتلا ہوئے کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا، حالانکہ ارشاداتِ قرآنی اور ارشادا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ بہت سے گنہگار محض اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور مغفرت سے جنت میں داخل ہوں گے، اُن پر کوئی مشقت بھی نہ ہوگی، وجہ یہ ہو کہ مشقت و محنت کے درجات مختلف ہیں، ادنیٰ درجہ نفس و شیطان سے مزاحمت کرکے یا دینِ حق کے مخالفین کے ساتھ مخالفت کرکے اپنے عقائد کا درست کرنا ہے، اور یہ ہر مؤمن کو حاصل ہے، آگے اوسط اور اعلیٰ درجات ہیں، جس درجہ کی محنت و مشقت ہوگی اسی درجہ کا دخولِ جنت ہوگا اس طرح محنت و مشقت سے خالی کوئی نہ رہا، ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اَشَدُّ النَّاسِ بلاءً الانبیاء ثمّ الامثل فالامثل	"سب سے زیادہ سخت بلائیں اور مصیبتیں انبیا علیہم السلام کو پہنچتی ہیں، اُن کے بعد جو اُن کے قریب تر ہیں"

دوسری بات یہاں قابلِ نظر یہ ہو کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے ساتھیوں کا یہ عرض کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کب آئے گی کسی شک وشبہ کی وجہ سے نہ تھا جو اُن کی شان کے خلاف ہے، بلکہ اس سوال کا منشاء یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ مدد کا وعدہ فرمایا ہے، مگر اس کا وقت اور مقام متعین نہیں فرمایا، اس لئے حالتِ اضطرار میں ایسے الفاظ عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ مدد جلد بھیجی جائے، اور ایسی دعا کرنا توکل یا منصبِ نبوت کے منافی نہیں، بلکہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کی الحاح وزاری کو پسند فرماتے ہیں، اس لئے انبیاءؑ اور صلحاء امت اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ

تجھ سے پوچھتے ہیں کیا چیز خرچ کریں کہہ دو کہ جو کچھ تم خرچ کرو مال سو ماں باپ کے لئے

وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا

اور قرابت والوں کے اور یتیموں کے اور محتاجوں کے اور مسافروں کے اور جو کچھ

تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

کروگے تم بھلائی سو وہ بے شک اللہ کو خوب معلوم ہے۔

خلاصۂ تفسیر

بارہواں حکم، صدقہ کے مصارف لوگ آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ (ثواب کے واسطے) کیا چیز خرچ کیا کریں (اور کس موقع پر صرف کیا کریں) آپؐ فرما دیجئے کہ جو مال تم کو صرف کرنا ہو سو (اس کی تعیین تو تمہاری ہمت پر ہے، مگر ہاں موقع ہم بتلائے دیتے ہیں کہ) ماں باپ کا حق ہے اور قرابت داروں اور بے باپ کے بچوں کا اور محتاجوں کا اور مسافر کا اور جو نسا نیک کام کروگے (خواہ راہِ خدا میں خرچ کرنا ہو یا اور کچھ ہو) سو اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے (وہ اس پر ثواب دیں گے)۔

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیتوں میں مجموعی حیثیت سے یہ مضمون بہت تاکید کے ساتھ بیان ہوا ہے، کہ کفر و نفاق کو چھوڑ دو اور اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ، حکمِ الٰہی کے مقابل میں کسی کی بات مت سنو، اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جان اور مال خرچ کیا کرو، اور ہر طرح کی شدت اور تکلیف پر تحمل کرو، اب یہاں سے اسی اطاعت و فرمانبرداری اور اللہ کی راہ میں جان و مال خرچ کرنے کے متعلق کچھ جزئیات کی تفصیل بیان ہوتی ہے، جو کہ مال اور جان اور دیگر معاملات مثل نکاح و طلاق وغیرہ کے متعلق ہیں، اور اوپر سے جو سلسلہ احکام ابواب البر کا جاری ہے اس میں داخل ہیں۔

اور ان جزئیات کا بیان بھی ایک خاص نوعیت رکھتا ہے کہ اکثر ان میں سے وہ ہیں جن کے متعلق صحابۂ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا، ان کے استفسار اور سوالات کا جواب براہِ راست عرشِ رحمٰن سے بواسطۂ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم دیا گیا، اس کو اگر یوں سمجھا جائے کہ حق تعالیٰ نے خود فتویٰ دیا تو یہ بھی صحیح ہے، اور قرآن کریم کی آیت قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ (۴: ۲۷) میں صراحۃً حق تعالیٰ نے فتویٰ دینے کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے، اس لئے اس نسبت میں کوئی استبعاد بھی نہیں۔

اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ فتاویٰ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں جو آپؐ کو بذریعہ وحی تلقین کئے گئے ہیں، بہرحال اس رکوع میں جو احکامِ شرعیہ صحابۂ کرامؓ کے چند سوالات کے جواب میں بیان ہوئے ہیں، وہ ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں، پورے قرآن میں اس طرح سوال و جواب کے انداز سے خاص احکام تقریباً سترہ جگہ میں آئے ہیں، جن میں سے سات تو اسی جگہ سورۂ بقرہ میں

ہیں، ایک سورۂ مائدہ میں، ایک سورۂ انفال میں، یہ نو سوالات تو صحابۂ کرامؓ کی طرف سے ہیں، سورۂ اعراف میں دو اور سورۂ بنی اسرائیل، سورۂ کہف، سورۂ طٰہٰ، سورۂ نازعات میں ایک ایک، یہ کُل چھ سوال کفار کی طرف سے ہیں، جن کا جواب قرآن میں جواب کے عنوان سے دیا گیا ہے۔

مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی جماعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ سے بہتر نہیں دیکھی کہ دین کے ساتھ انتہائی شغف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی محبت و تعلق کے باوجود انھوں نے سوالات بہت کم کئے کل تیرہ ۱۳ مسائل میں سوال کیا ہے، جن کا جواب قرآن میں دیا گیا ہے، کیونکہ یہ حضرات بےضرورت سوال نہ کرتے تھے (قرطبی)

متذکرہ بالا آیات میں سے پہلی آیت میں صحابۂ کرامؓ کا استفتاء یعنی سوال ان الفاظ سے نقل فرمایا گیا ہے، یَسۡـَٔلُوۡنَكَ مَاذَا يُنۡفِقُوۡنَ، یعنی "لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں" یہی سوال اس رکوع میں تین آیتوں کے بعد پھر انہی الفاظ کے ساتھ دُہرایا گیا، وَيَسۡـَٔلُوۡنَكَ مَاذَا يُنۡفِقُوۡنَ، لیکن اس ایک ہی سوال کا جواب آیتِ متذکرہ میں کچھ اور دیا گیا ہے، اور تین آیتوں کے بعد آنے والے سوال کا جواب اور ہے۔

اس لئے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ایک ہی سوال کے دو مختلف جواب کس حکمت پر مبنی ہیں یہ حکمت اُن حالات و واقعات میں غور کرنے سے واضح ہوجاتی ہے جن میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں مثلاً آیت متذکرہ کا شانِ نزول یہ ہے کہ عمرو بن جموحؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا کہ مَا نُنۡفِقُ مِنۡ اَمۡوَالِنَا وَاَيۡنَ نَضَعُهَا (اخرجہ ابن المنذر مظہری) "یعنی ہم اپنے اموال میں سے کیا خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں" اور ابن جریرؒ کی روایت کے موافق یہ سوال تنہا عمرو ابن جموحؓ کا نہیں تھا، بلکہ عام مسلمانوں کا سوال تھا، اس سوال کے دو جزو ہیں، ایک یہ کہ مال میں سے کیا اور کتنا خرچ کریں، دوسرے یہ کہ اس کا مصرف کیا ہو کن لوگوں کو دیں۔

اور دوسری آیت جو دو آیتوں کے بعد اسی سوال پر مشتمل ہے اس کا شانِ نزول بروایت ابن ابی حاتمؒ یہ ہے کہ جب قرآن میں مسلمانوں کو اس کا حکم دیا گیا کہ اپنے مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کریں، تو چند صحابۂ کرامؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ انفاق فی سبیل اللہ کا جو حکم ہمیں ملا ہے ہم اس کی وضاحت چاہتے ہیں، کہ کیا مال اور کونسی چیز اللہ کی راہ میں خرچ کیا کریں، اس سوال میں صرف ایک ہی جزء ہے، یعنی کیا خرچ کریں، اس طرح ان دونوں سوالوں کی نوعیت کچھ مختلف ہوگئی کہ پہلے سوال میں کیا خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں، کا سوال تھا، اور دوسرے میں صرف کیا خرچ کریں کا سوال ہے، اور پہلے سوال کے جواب میں جو کچھ قرآن میں ارشاد فرمایا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال کے دوسرے جزء کو یعنی کہاں

۳۱

خرچ کریں زیادہ اہمیت دے کر اس کا جواب تو صریح طور پر دیا گیا، اور پہلے جز یعنی کیا خرچ کریں کا جواب ضمنی طور پر دیدینا کافی سمجھا گیا، اب الفاظِ قرآنی میں دونوں اجزاء پر نظر فرمائیں،

پہلے جزء یعنی "کہاں خرچ کریں" کے متعلق ارشاد ہوا ہے مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ "یعنی جو کچھ بھی تم کو اللہ کے لئے خرچ کرنا ہو اس کے مستحق ماں باپ اور رشتہ دار اور بے باپ کے بچے اور مساکین اور مسافر ہیں"

اور دوسرے جزء یعنی کیا خرچ کریں کا جواب ضمنی طور پر ان الفاظ سے دیا گیا وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ "یعنی تم جو کچھ بھلائی کرو گے اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے" اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر کوئی تحدید اور پابندی نہیں کہ مال کی اتنی ہی مقدار صرف کرو، بلکہ جو کچھ بھی اپنی استطاعت کے موافق خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ کے پاس اس کا اجر و ثواب پاؤ گے۔

الغرض پہلی آیت میں شاید سوال کرنے والوں کے پیشِ نظر زیادہ اہمیت اسی سوال کی ہو کہ ہم جو مال خرچ کریں، اس کا مصرف کیا ہو کہاں خرچ کریں، اسی لئے اس کے جواب میں اہمیت کے ساتھ مصارف بیان فرمائے گئے، اور کیا خرچ کریں اس سوال کا جواب ضمنی طور پر دیدینا کافی سمجھا گیا، اور بعد والی آیت میں سوال صرف اتنا ہی تھا کہ ہم کیا چیز اور کیا مال خرچ کریں، اس لئے اس کا جواب ارشاد ہوا قُلِ الْعَفْوَ، یعنی آپؐ فرمادیں کہ جو کچھ بچے اپنی ضروریات سے وہ خرچ کیا کریں، ان دونوں آیتوں سے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں مال خرچ کرنے کے متعلق چند ہدایات و مسائل معلوم ہوئے۔

مسئلہ ۱: اول یہ کہ دونوں آیتیں زکوٰۃ فرض کے متعلق نہیں، کیونکہ زکوٰۃ فرض کے لئے تو نصابِ مال بھی معتبر رہا ہے اور اس میں جتنی مقدار خرچ کرنا فرض ہے، وہ بھی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پوری طرح متعین و مقرر فرمادی گئی ہے، ان دونوں آیتوں میں نہ کسی نصابِ مال کی قید ہے، نہ خرچ کرنے کی مقدار بتلائی گئی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں آیتیں صدقاتِ نافلہ کے متعلق ہیں، اس سے یہ شبہ بھی رفع ہوگیا کہ پہلی آیت میں خرچ کا مصرف والدین کو بھی قرار دیا گیا ہے، حالانکہ ماں باپ کو زکوٰۃ دینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق جائز نہیں، کیونکہ ان آیتوں کا تعلق فریضۂ زکوٰۃ سے ہے ہی نہیں۔

مسئلہ ۲: دوسری ہدایت اس آیت سے یہ حاصل ہوئی کہ ماں باپ اور دوسرے اعزاء و اقرباء کو جو کچھ بطور ہدیہ دیا یا کھلایا جاتا ہے اگر اس میں بھی اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانے کی نیت ہو تو وہ بھی موجب اجر و ثواب اور انفاق فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔

مسئلہ ۳: تیسری ہدایت یہ حاصل ہوئی کہ نفلی صدقات میں اس کی رعایت ضروری ہے، کہ جو مال اپنی ضروریات سے زائد ہو وہی خرچ کیا جائے، اپنے اہل وعیال کو تنگی میں ڈال کر اور ان کے حقوق کو تلف کر کے خرچ کرنا ثواب نہیں، اسی طرح جس کے ذمہ کسی کا قرض ہے قرضخواہ کو ادا نہ کرے اور نفلی صدقات وخیرات میں اڑائے یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نہیں، پھر ضروریات سے زائد مال کے خرچ کرنے کا جو ارشاد اس آیت میں ہے اس کو حضرت ابوذر غفاریؓ اور بعض دوسرے حضرات نے حکم وجوبی قرار دیا، کہ اپنی ضروریات سے زائد مال زکوٰۃ اور تمام حقوق ادا کرنے کے بعد بھی اپنی ملک میں جمع رکھنا جائز نہیں، ضروریات سے زائد جو کچھ ہے سب کا صدقہ کر دینا واجب ہے، مگر جمہور صحابہؓ وتابعینؒ اور ائمہ دینؒ اس پر ہیں کہ ارشاد قرآنی کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہو وہ ضروریات سے زائد ہونا چاہئے، یہ نہیں کہ ضرورت سے زائد جو کچھ ہو اس کو صدقہ کر دینا ضروری یا واجب ہے، صحابہ کرامؓ کے تعامل سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا

فرض ہوئی تم پر لڑائی اور وہ بری لگتی ہے تم کو اور شاید کہ بری لگے تم کو

شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ

ایک چیز اور وہ بہتر ہو تمہارے حق میں اور شاید تم کو بھلی لگے ایک چیز اور وہ بری ہو تمہارے حق میں

وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢١٦﴾ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ　ع ۲۶ / ۱۰

اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے، تجھ سے پوچھتے ہیں مہینہ حرام کو

الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ ۖ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ ۖ وَصَدٌّ عَن سَبِيلِ

کہ اس میں لڑنا کیسا، کہہ دے اس میں لڑائی بڑا گناہ ہے، اور روکنا اللہ کی راہ سے

اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ

اور اس کو نہ ماننا اور مسجد الحرام سے روکنا اور نکال دینا اس کے لوگوں کو وہاں سے

أَكْبَرُ عِندَ اللَّهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۗ وَلَا يَزَالُونَ

اس سے بھی زیادہ گناہ ہے اللہ کے نزدیک، اور لوگوں کو دین سے بچلانا قتل سے بھی بڑھ کر ہے اور کفار تو ہمیشہ تم سے

يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمْ عَن دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا ۚ وَمَن

لڑتے ہی رہیں گے یہاں تک کہ تم کو پھیر دیں تمہارے دین سے اگر قابو پاویں، اور جو کوئی

يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ

پھر تم میں سے اپنے دین سے پھر مر جاوے حالتِ کفر ہی میں تو ایسوں کے ضائع ہوئے

اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ

عمل دنیا اور آخرت میں ، اور وہ لوگ رہنے والے ہیں دوزخ میں وہ اس میں

فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢١٧﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا

ہمیشہ رہیں گے ، بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور لڑے

فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ

اللہ کی راہ میں وہ امیدوار ہیں اللہ کی رحمت کے اور اللہ بخشنے والا

رَّحِيْمٌ ﴿٢١٨﴾

مہربان ہے۔

خلاصۂ تفسیر

تیرہواں۱۳ حکم فرضیتِ جہاد جہاد کرنا تم پر فرض کیا گیا ہے اور وہ تم کو (طبعًا) گراں (معلوم ہوتا) ہے، اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی بات کو گراں سمجھو اور (واقع میں) وہ تمہارے حق میں خیر (اور مصلحت) ہو اور یہ (بھی) ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور (واقع میں) وہ تمہارے حق میں (باعث) خرابی (کا) ہو اور (ہر شے کی حقیقتِ حال کو) اللہ تعالیٰ جانتے ہیں، اور تم (پورا پورا) نہیں جانتے (اچھے بُرے کا فیصلہ اپنی خواہش کی بنیاد پر نہ کرو جو کچھ اللہ کا حکم ہو جاوے، اسی کو اجمالاً مصلحت سمجھ کر اس پر کاربند رہا کرو)

چودہواں۱۴ حکم تحقیقِ قتال در شہرِ حرام (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چند صحابہؓ کا ایک سفر میں اتفاق سے کفار کے ساتھ مقابلہ ہو گیا، ایک کافر اُن کے ہاتھ سے مارا گیا، اور جس روز یہ قصہ ہوا رجب کی پہلی تاریخ تھی، مگر صحابہؓ اس کو جمادی الاخریٰ کی تیس سمجھتے تھے، اور رجب اشہرِ حُرُم میں سے ہے، کفار نے اس واقعہ پر طعن کیا کہ مسلمانوں نے شہرِ حرام کی حرمت کا بھی خیال نہیں کیا، مسلمانوں کو اس کی فکر ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اور بعض روایات میں ہے کہ خود بعض کفارِ قریش نے بھی حاضر ہو کر اعتراضًا سوال کیا، اس کا جواب ارشاد ہوتا ہے):-

لوگ آپ سے شہر حرام میں قتال کرنے کے متعلق سوال کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ اس میں خاص طور پر (یعنی عمداً) قتال کرنا جرم عظیم ہے (مگر مسلمانوں سے یہ فعل بالقصد صادر نہیں ہوا، بلکہ تاریخ کی تحقیق نہ ہونے کے سبب غلطی سے ایسا ہوگیا یہ تو تحقیقی جواب ہے) اور (الزامی جواب یہ ہے کہ کفار و مشرکین کا تو کسی طرح منہ ہی نہیں مسلمانوں پر اعتراض کرنے کا، کیونکہ اگرچہ شہر حرام میں لڑنا جرم عظیم ہے، لیکن ان کفار کی جو حرکتیں ہیں یعنی) اللہ تعالیٰ کی راہ (دین) سے (لوگوں کو) روک ٹوک کرنا (یعنی مسلمان ہونے پر تکلیفیں پہنچانا کہ ڈر کے مارے لوگ مسلمان نہ ہوں) اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام (یعنی کعبہ) کے ساتھ کفر کرنا کہ وہاں بہت سے بت رکھ چھوڑے تھے، اور بجائے خدا کی عبادت کے ان کی عبادت اور طواف کرتے تھے) اور جو لوگ مسجدِ حرام کے اہل تھے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر مؤمنین) ان کو (تنگ اور پریشان کرکے) اس (مسجد حرام) سے خارج (ہونے پر مجبور) کر دینا (جس سے نوبت ہجرت یعنی ترکِ وطن کی پہنچی، سو یہ حرکتیں شہر حرام میں قتال کرنے سے بھی زیادہ) جرم عظیم ہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک (کیونکہ یہ حرکتیں دینِ حق کے اندر فتنہ پردازی کرنا ہے) اور (ایسی) فتنہ پردازی کرنا (اس) قتل (خاص) سے (جو مسلمانوں سے صادر ہوا) بدرجہا (قباحت میں) بڑھ کر ہے (کیونکہ اس قتل سے دینِ حق کو تو کوئی مضرت نہیں پہنچی بہت سے بہت اگر کوئی جان کر کرے، خود ہی گنہگار ہوگا اور ان حرکتوں سے تو دین حق کو ضرر پہنچتا ہے کہ اس کی ترقی رُکتی ہے) اور یہ کفار تمھارے ساتھ ہمیشہ جنگ (وجدال کا سلسلہ جاری ہی) رکھیں گے، اس غرض سے کہ اگر (خدانہ کرے) قابو پا دیں تو تم کو تمھارے دین (اسلام) سے پھیر دیں (ان کے اس فعل سے دین کی مزاحمت ظاہر ہے)۔

انجامِ ارتداد

اور جو شخص تم میں سے اپنے دین (اسلام) سے پھر جاوے، پھر کافر ہی ہونے کی حالت میں مرجاوے تو ایسے لوگوں کے (نیک) اعمال دنیا اور آخرت میں سب غارت ہو جاتے ہیں، (اور) یہ لوگ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

شہر حرام میں قتال کرنے کے بارے میں مسلمانوں کو جواب مذکور سنکر گناہ نہ ہونے کا تو اطمینان ہوگیا تھا، مگر اس خیال سے دل شکستہ تھے کہ ثواب تو ہوا ہی نہ ہوگا، آگے اس میں تسلی کی گئی۔

وعدۂ ثواب بر اخلاصِ نیت

حقیقۃً جو لوگ ایمان لائے ہوں اور جن لوگوں نے راہِ خدا میں ترکِ وطن کیا ہو اور جہاد کیا ہو، ایسے لوگ تو رحمتِ خداوندی کے امیدوار ہوا کرتے ہیں، (اور تم لوگوں میں یہ صفات علی سبیل منع الخلو موجود ہیں، چنانچہ ایمان اور ہجرت تو ظاہر ہے، رہا اس جہاد خاص میں شبہ ہو سکتا ہے، سو چونکہ تمھاری نیت تو جہاد ہی کی تھی، لہٰذا ہمارے نزدیک وہ بھی جہاد ہی میں شمار ہے، پھر ان صفات کے ہوتے ہوئے تم کیوں ناامید

ہوتے ہو) اور اللہ تعالیٰ (اس غلطی کو) معاف کردیں گے اور (ایمان وجہاد و ہجرت کی وجہ سے تم پر) رحمت کریں گے۔

معارف و مسائل

بعض احکام جہاد

مسئلہ:۔ مذکور الصدر آیات میں سے پہلی آیت میں جہاد کے فرض ہونے کا حکم ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِتَالُ، "یعنی تم پر جہاد فرض کیا گیا"، ان الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاد ہر مسلمان پر ہر حالت میں فرض ہے؛ بعض آیاتِ قرآنی اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فریضہ فرضِ عین کے طور پر ہر ہر مسلم پر عائد نہیں، بلکہ فرضِ کفایہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت اس فرض کو ادا کردے تو باقی مسلمان سبکدوش سمجھے جائیں گے، ہاں کسی زمانہ یا کسی ملک میں کوئی جماعت بھی فریضہ جہاد ادا کرنے والی نہ رہے تو سب مسلمان ترکِ فرض کے گنہگار ہوجائیں گے، حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اَلۡجِهَادُ مَاضٍ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیَامَۃِ کا یہ مطلب ہے کہ "قیامت تک ایسی جماعت کا موجود رہنا ضروری ہے جو فریضہ جہاد ادا کرتی رہے"، قرآن مجید کی دوسری آیت میں ارشاد ہے:

فَضَّلَ اللّٰهُ الۡمُجٰهِدِیۡنَ بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ عَلَی الۡقٰعِدِیۡنَ دَرَجَةً وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الۡحُسۡنٰی (۴: ۹۵)

"یعنی اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو تارکینِ جہاد پر فضیلت دی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے دونوں سے بھلائی کا وعدہ کیا ہے"۔

اس میں ایسے لوگوں سے جو کسی عذر کے سبب یا کسی دوسری دینی خدمت میں مشغول ہونے کی وجہ سے جہاد میں شریک نہ ہوں اُن سے بھی بھلائی کا وعدہ مذکور ہے، ظاہر ہے کہ اگر جہاد ہر فردِ مسلم پر فرضِ عین ہوتا تو اس کے چھوڑنے والوں سے وعدہ حُسنیٰ یعنی بھلائی کا وعدہ ہونے کی صورت نہ تھی،

اسی طرح ایک دوسری آیت میں ہے:

فَلَوۡلَا نَفَرَ مِنۡ كُلِّ فِرۡقَةٍ مِّنۡهُمۡ طَآئِفَةٌ لِّیَتَفَقَّهُوۡا فِی الدِّیۡنِ (۹: ۱۲۲)

"اور کیوں نہ نکل کھڑی ہوئی تمہاری ہر بڑی جماعت میں سے چھوٹی جماعت اس کام کیلئے کہ وہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں"۔

اس میں خود قرآن کریم نے یہ تقسیمِ عمل پیش فرمائی کہ کچھ مسلمان جہاد کا کام کریں اور کچھ تعلیمِ دین میں مشغول رہیں، اور یہ جبھی ہوسکتا ہے جبکہ جہاد فرضِ عین نہ ہو بلکہ فرضِ کفایہ ہو۔

نیز صحیح بخاری و مسلم کی حدیث ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شرکتِ جہاد کی اجازت چاہی تو آپ نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تمہارے ماں باپ زندہ ہیں؟

اس نے عرض کیا کہ ہاں زندہ ہیں، آپؐ نے فرمایا کہ "پھر جاؤ، ماں باپ کی خدمت کرکے جہاد کا ثواب حاصل کرو"، اس سے بھی یہ معلوم ہوا کہ جہاد فرض کفایہ ہے، جب مسلمانوں کی ایک جماعت فریضۂ جہاد کو قائم کئے ہوئے ہو تو باقی مسلمان دوسری خدمتوں اور کاموں میں لگ سکتے ہیں، ہاں اگر کسی وقت امام المسلمین ضرورت سمجھ کر نفیرِ عام کا حکم دے اور سب مسلمانوں کو شرکتِ جہاد کی دعوت دے تو پھر جہاد سب پر فرض عین ہو جاتا ہے، قرآن کریم نے سورۂ توبہ میں ارشاد فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ۔ (۹: ۳۸)	"اے مسلمانو! تمھیں کیا ہو گیا کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو تم بوجھل بن جاتے ہو"

اس آیت میں اسی نفیرِ عام کا حکم مذکور ہے، اسی طرح اگر خدانخواستہ کسی وقت کفار کسی اسلامی ملک پر حملہ آور ہوں اور مدافعت کرنے والی جماعت ان کی مدافعت پر پوری طرح قادر اور کافی نہ ہو تو اُس وقت بھی یہ فریضہ اس جماعت سے متعدی ہو کر پاس والے سب مسلمانوں پر عائد ہو جاتا ہے، اور اگر وہ بھی عاجز ہوں تو ان کے پاس والے مسلمانوں پر، یہاں تک کہ پوری دنیا کے ہر ہر فرد مسلم پر ایسے وقت جہاد فرض عین ہو جاتا ہے، قرآن مجید کی مذکورہ بالا تمام آیات کے مطالعہ سے جمہور فقہاء و محدثین نے یہ حکم قرار دیا ہے کہ عام حالات میں جہاد فرض کفایہ ہے۔

مسئلہ: اسی لئے جب تک جہاد فرض کفایہ ہو اولاد کو بغیر ماں باپ کی اجازت کے جہاد میں جانا جائز نہیں۔

مسئلہ: جس شخص کے ذمہ کسی کا قرض ہو اس کے لئے جب تک قرض ادا نہ کر دے اس فرض کفایہ میں حصہ لینا درست نہیں، ہاں اگر کسی وقت نفیرِ عام کے سبب یا کفار کے نرغہ کے باعث جہاد سب پر فرضِ عین ہو جائے تو اس وقت نہ والدین کی اجازت شرط ہے نہ شوہر کی اور نہ قرضخواہ کی، اس آیت کے آخر میں جہاد کی ترغیب کے لئے ارشاد فرمایا ہے کہ جہاد اگرچہ طبعی طور پر تمھیں بھاری معلوم ہو، لیکن خوب یاد رکھو کہ انسانی بصیرت و دانشمندی اور تدبیر و محنت عواقب و نتائج کے بارے میں بکثرت فیل ہوتی ہے، کسی مفید کو مضر یا مضر کو مفید سمجھ لینا بڑے سے بڑے ہوشیار عقلمند سے بھی مستبعد نہیں، ہر انسان اگر اپنی عمر میں پیش آنے والے وقائع پر نظر ڈالے تو اپنی ہی زندگی میں اس کو بہت سے واقعات ایسے نظر پڑیں گے کہ وہ کسی چیز کو نہایت مفید سمجھ کر حاصل کر رہے تھے، اور انجام کار یہ معلوم ہوا کہ وہ انتہائی مضر تھی یا کسی چیز کو نہایت مضر سمجھ کر اس سے اجتناب کر رہے تھے، اور انجام کار یہ معلوم ہوا کہ وہ نہایت مفید تھی، انسانی عقل و تدبیر کی رُسوائی اس معاملہ میں بکثرت مشاہدہ میں آتی رہتی ہے ع

خویش را دیدم در سوائی خویش

اس لئے فرمایا کہ جہاد و قتال میں اگرچہ بظاہر مال اور جان کا نقصان نظر آتا ہے، لیکن جب حقائق سامنے آئیں گے تو کھلے گا کہ یہ نقصان ہرگز نقصان نہ تھا بلکہ سراسر نفع اور دائمی راحت کا سامان تھا۔

اشہر حُرُم میں قتال کا حکم

آیات مذکورہ میں سے دوسری آیت اس پر شاہد ہو کہ اشہُرِ حُرُم یعنی چار مہینے رجب، ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم میں قتال حرام ہو، اسی طرح قرآن کریم کی متعدد آیتوں میں پوری تصریح کے ساتھ اشہر حُرُم میں قتال کی ممانعت آئی ہے، مثلاً مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ، اور حجۃ الوداع کے معروف و مشہور خطبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا منھا اربعۃ حرم ثلاث متوالیات ورجب مضر۔

ان آیات و روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ چار مہینوں میں قتال حرام ہے، اور یہ حرمت ہمیشہ کے لئے ہے۔

اور امام تفسیر عطاء بن ابی رباحؒ قسم کھا کر فرماتے تھے کہ یہ حکم ہمیشہ کے لئے باقی ہے، اور بھی متعدد حضرات تابعین اس حکم کو ثابت، غیر منسوخ قرار دیتے ہیں، مگر جمہور فقہاء کے نزدیک اور بقول جصّاص عام فقہاء امصار کے مسلک پر یہ حکم منسوخ ہے، اب کسی مہینہ میں قتال ممنوع نہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ اس کا ناسخ کونسی آیت ہے، اس میں فقہاء کے مختلف اقوال ہیں بعض نے فرمایا کہ آیت کریمہ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً (۹: ۳۶) اس کی ناسخ ہے، اور اکثر حضرات نے آیت فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (۹: ۵) کو ناسخ قرار دیا ہے، اور لفظ حیث کو اس جگہ زمانے کے معنی میں لیا ہے، کہ مشرکین کو جس مہینہ اور جس زمانے میں پاؤ قتل کر دو اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس حکم کا ناسخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل ہے کہ خود آپ نے طائف کا محاصرہ اشہر حرم میں فرمایا، اور حضرت عامر اشعری کو اشہر حرم ہی میں اوطاس کے جہاد کے لئے بھیجا، اسی بناء پر عامۃ فقہاء اس حکم کو منسوخ قرار دیتے ہیں، جصاص نے فرمایا وھو قول فقہاء الامصار۔

روح المعانی نے اسی آیت کے تحت میں اور بیضاوی نے سورۂ برأت کے پہلے رکوع کی تفسیر میں اشہر حرم میں حرمتِ قتال کے منسوخ ہونے پر اجماعِ امت نقل کیا ہو (بیان القرآن) مگر تفسیر مظہری میں مذکورہ تمام دلائل کا جواب یہ دیا ہے کہ اشہر حرم کی حرمت کی تصریح خود اس آیت میں موجود ہے جس کو آیۃ السیف کہا جاتا ہے، یعنی اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ (۹: ۳۶) اور یہ آیت آیاتِ قتال میں سب سے آخر میں نازل ہوئی ہے، اور خطبہ حجۃ الوداع جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف اسّی روز پہلے ہوا ہے اس میں بھی اشہر حرم کی حرمت کی تصریح موجود ہے، اس لئے آیات

متذکرہ کو اس کا ناسخ نہیں کہا جا سکتا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا محاصرۂ طائف ذوالقعدہ میں نہیں، شوال میں ہوا ہے اس لئے اس کو بھی ناسخ نہیں کہہ سکتے، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اشہر حرم میں قتال کی حرمت مطلقہ جو مذکورہ آیات سے معلوم ہوتی ہے، اس میں سے وہ صورت مستثنیٰ کردی گئی ہے کہ خود کفار ان مہینوں میں مسلمانوں سے قتال کرنے لگیں تو جوابی حملہ اور دفاع مسلمانوں کے لئے بھی جائز ہے، اتنے حصّہ کو منسوخ کہا جا سکتا ہے جس کی تصریح اس آیت میں ہے: اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ الآیہ۔ (۲: ۱۹۴)

تو خلاصہ یہ ہوا کہ ابتداءً قتال تو ان مہینوں میں ہمیشہ کے لئے حرام ہے، مگر جب کفار ان مہینوں میں حملہ آور ہوں تو مدافعانہ قتال کی مسلمانوں کو بھی اجازت ہے، جیسا کہ امام جصاص رحؒ نے بروایت حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ نقل کیا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی شہر حرام میں اس وقت تک قتال نہ کرتے تھے جب تک قتال کی ابتداء کفار کی طرف سے نہ ہو جائے۔

انجامِ ارتداد

آیتِ مذکورہ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ کے آخر میں مسلمان ہونے کے بعد کفر و ارتداد اختیار کرنے کا یہ حکم ذکر فرمایا ہے کہ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ یعنی "ان لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت میں سب غارت ہو جائیں گے"۔

مسئلہ: دنیا میں اعمال کا ضائع ہونا یہ ہو کہ اس کی بی بی نکاح سے نکل جاتی ہے، اگر اس کا کوئی مورث مسلمان مرے اس شخص کو میراث کا حصہ نہیں ملتا، حالتِ اسلام میں نماز، روزہ جو کچھ کیا تھا سب کالعدم ہو جاتا ہے، مرنے کے بعد جنازے کی نماز نہیں پڑھی جاتی، مسلمانوں کے مقابر میں دفن نہیں ہوتا۔

اور آخرت میں ضائع ہونا یہ ہے کہ عبادات میں ثواب نہیں ملتا، ابدالآباد کے لئے دوزخ میں داخل ہوتا ہے۔

مسئلہ: اگر یہ شخص پھر مسلمان ہو جاوے تو آخرت میں دوزخ سے بچنے اور دنیا میں آئندہ کے لئے احکامِ اسلام کا جاری ہونا تو یقینی ہے، لیکن دنیا میں اگر حج کر چکا تو بشرطِ وسعت دوبارہ اس کا فرض ہونا نہ ہونا اور آخرت میں پچھلے نماز روزہ کے ثواب کا عود کرنا نہ کرنا اس میں اختلاف ہو، امام ابوحنیفہ رحؒ دوبارہ حج کو فرض کہتے ہیں، اور گذشتہ نماز و روزہ پر ثواب ملنے کے قائل نہیں اور امام شافعی رحؒ دونوں امر میں اختلاف کرتے ہیں۔

مسئلہ: لیکن جو کافر اصلی ہو اور اس حالت میں کوئی نیک کام کرلے اس کا ثواب معلق رہتا ہے، اگر کبھی اسلام لے آیا سب پر ثواب ملتا ہے، اور اگر کفر پر مرگیا تو سب بیکار جاتا ہو، حدیث میں اسلمت علیٰ ما اسلفت من خیر اسی معنی میں وارد ہے۔

مسئلہ: غرض مرتد کی حالت کافر اصلی سے بدتر ہے، اسی واسطے کافر اصلی سے جزیہ قبول ہوسکتا ہے، اور مرتد اگر اسلام نہ لاوے اگر مرد ہے قتل کر دیا جاتا ہے، اگر عورت ہے تو دوام حبس کی سزا دی جاتی ہے، کیونکہ اس سے اسلام کی اہانت ہوئی ہے، سرکاری اہانت اسی سزا کے لائق ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ

تجھ سے پوچھتے ہیں حکم شراب کا اور جوئے کا کہہ دے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور فائدے

لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَاؕ

بھی لوگوں کو اور ان کا گناہ بہت بڑا ہے اُن کے فائدے سے۔

خلاصۂ تفسیر

پندرہواں حکم متعلقہ شراب و قمار [15]

لوگ آپؐ سے شراب اور قمار کی نسبت دریافت کرتے ہیں، آپؐ فرما دیجئے کہ ان دونوں (چیزوں کے استعمال) میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں بھی (پیدا ہو جاتی) ہیں اور لوگوں کو (بعضے) فائدے بھی ہیں اور (وہ) گناہ کی باتیں ان فائدوں سے زیادہ بڑھی ہوئی ہیں (اس لئے دونوں قابلِ ترک ہیں)

معارف و مسائل

صحابۂ کرامؓ کے سوالات اور ان کے جوابات کا جو سلسلہ اس سورت میں بیان ہو رہا ہے، اس میں یہ آیت بھی ہے، اس میں شراب اور جوئے کے متعلق صحابۂ کرامؓ کا سوال اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ہے، یہ دونوں مسئلے نہایت اہم ہیں، اس لئے کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان کی پوری حقیقت اور احکام سنئے:۔

حُرمتِ شراب اور اُس کے متعلقہ احکام

ابتداءِ اسلام میں عام رسوم جاہلیت کی طرح شراب خوری بھی عام تھی، جب رسول کریم صلی اللہ

علیہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ تشریف لائے تو اہلِ مدینہ میں بھی شراب اور قمار یعنی جُوا کھیلنے کا رواج تھا، عام لوگ تو ان دونوں چیزوں کے صرف ظاہری فوائد کو دیکھ کر اُن پر فریفتہ تھے، ان کے اندر جو بہت سے مفاسد اور خرابیاں ہیں اُن کی طرف نظر نہیں تھی، لیکن عادۃ اللہ یہ بھی ہے کہ ہر قوم اور ہر خطہ میں کچھ عقل والے بھی ہوتے ہیں، جو طبیعت پر عقل کو غالب رکھتے ہیں، کوئی طبعی خواہش اگر عقل کے خلاف ہو تو وہ اس خواہش کے پاس نہیں جاتے، اس معاملہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام تو بہت ہی بلند تھا، کہ جو چیز کسی وقت حرام ہونے والی تھی آپؐ کی طبیعت اس سے پہلے ہی نفرت کرتی تھی، صحابۂ کرامؓ میں بھی کچھ ایسے حضرات تھے جنھوں نے حلال ہونے کے زمانے میں بھی کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا، مدینہ طیبہ پہونچنے کے بعد چند حضرات صحابہؓ کو ان کے مفاسد کا زیادہ احساس ہوا حضرت فاروق اعظمؓ اور معاذ بن جبلؓ اور چند انصاری صحابہؓ اسی احساس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ شراب اور قمار انسان کی عقل کو بھی خراب کرتے ہیں، اور مال بھی برباد کرتے ہیں، ان کے بارے میں آپؐ کا کیا ارشاد ہے، اس سوال کے جواب میں آیت مذکورہ نازل ہوئی، یہ پہلی آیت ہے جس میں شراب اور جوئے سے مسلمانوں کو روکنے کا ابتدائی قدم اٹھایا گیا۔

اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ شراب اور جوئے میں اگرچہ لوگوں کے کچھ ظاہری فوائد ضرور ہیں، لیکن ان دونوں میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں پیدا ہوجاتی ہیں جو ان کے منافع اور فوائد سے بڑھی ہوئی ہیں، اور گناہ کی باتوں سے وہ چیزیں مراد ہیں جو کسی گناہ کا سبب بنجائیں، مثلاً شراب میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ عقل و ہوش زائل ہوجاتا ہے جو تمام کمالات اور شرفِ انسانی کا اصل اصول ہے، کیونکہ عقل ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسانوں کو بُرے کاموں سے روکتی ہے، جب وہ نہ رہی تو ہر بُرے کام کے لئے راستہ ہموار ہوگیا۔

اس آیت میں صاف طور پر شراب کو حرام تو نہیں کہا گیا، مگر اس کی خرابیاں اور مفاسد بیان کردیئے گئے، کہ شراب کی وجہ سے انسان بہت سے گناہوں اور خرابیوں میں مبتلا ہوسکتا ہے گویا اس کے ترک کرنے کے لئے ایک قسم کا مشورہ دیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بعض صحابۂ کرامؓ تو اس مشورہ ہی کو قبول کرکے اسی وقت شراب کو چھوڑ بیٹھے، اور بعض نے یہ خیال کیا کہ اس آیت نے شراب کو حرام تو کیا نہیں بلکہ مفاسدِ دینی کا سبب بننے کی وجہ سے اس کو سببِ گناہ قرار دیا ہے۔ ہم اس کا اہتمام کریں گے کہ وہ مفاسد واقع نہ ہوں، تو پھر شراب میں کوئی حرج نہیں، اس لئے پیتے رہے، یہاں تک کہ ایک روز یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے صحابۂ کرامؓ میں سے چند اپنے دوستوں کی دعوت کی، کھانے کے بعد

حسب دستور شراب پی گئی، اسی حال میں نماز مغرب کا وقت آگیا، سب نماز کے لئے کھڑے ہوگئے، تو ایک صاحب کو امامت کے لئے آگے بڑھایا، انھوں نے نشہ کی حالت میں جو تلاوت شروع کی تو سورۂ قُلْ یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ کو غلط پڑھا، اس پر شراب سے روکنے کے لئے دوسرا قدم اٹھایا گیا اور یہ آیت نازل ہوئی:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی (۴: ۴۳)	"یعنی اے ایمان والو تم نشہ کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ"

اس میں خاص اوقاتِ نماز کے اندر شراب کو قطعی طور پر حرام کردیا گیا، باقی اوقات میں اجازت رہی، جن حضرات صحابہؓ نے پہلی آیت نازل ہونے کے وقت شراب کو نہ چھوڑا تھا اس آیت کے نازل ہونے کے وقت شراب کو مطلقاً ترک کردیا کہ جو چیز انسان کو نماز سے روکے اُس میں کوئی خیر نہیں ہوسکتی، جب نشہ کی حالت میں نماز کی ممانعت ہوگئی تو ایسی چیز کے پاس نہ جانا چاہئے جو انسان کو نماز سے محروم کردے، مگر چونکہ علاوہ اوقاتِ نماز کے شراب کی حرمت صاف طور پر اب بھی نازل نہیں ہوئی تھی، اس لئے کچھ حضرات اَب بھی اوقاتِ نماز کے علاوہ دوسرے اوقات میں پیتے رہے، یہاں تک کہ ایک اور واقعہ پیش آیا، عتبان بن مالکؓ نے چند صحابہ کرامؓ کی دعوت کی، جن میں سعد بن ابی وقاصؓ بھی تھے، کھانے کے بعد حسب دستور شراب کا دَور چلا، نشہ کی حالت میں عرب کی عام عادت کے مطابق شعر و شاعری اور اپنے اپنے مفاخر کا بیان شروع ہوا، سعد بن ابی وقاصؓ نے ایک قصیدہ پڑھا، جس میں انصار مدینہ کی ہجو اور اپنی قوم کی مدح و ثنا تھی، اس پر ایک انصاری نوجوان کو غصہ آگیا، اور اونٹ کے جبڑے کی ہڈی سعد رضی اللہ عنہ کے سر پر دے ماری، جس سے ان کو شدید زخم آگیا، حضرت سعدؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اس انصاری جوان کی شکایت کی، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاء فرمائی: اَللّٰھُمَّ بَیِّنْ لَنَا فِی الْخَمْرِ بَیَانًا شَافِیًا۔ "یعنی یا اللہ شراب کے بارے میں ہمیں کوئی واضح بیان اور قانون عطا فرمادے" اس پر شراب کے متعلق تیسری آیت سورۂ مائدہ کی مفصل نازل ہوگئی، جس میں شراب کو مطلقاً حرام قرار دیدیا گیا، آیت یہ ہے:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْہُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ	"یعنی اے ایمان والو بات یہی ہے کہ شراب اور جُوا اور بُت اور جُوئے کے تیر، یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں سو اس سے بالکل الگ رہو، تاکہ تم کو فلاح ہو، شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جُوئے کے ذریعہ تمھارے آپس میں بغض اور عداوت پیدا کردے

وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ○ (۵: ۹۱)	اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز سے تم کو باز رکھے، سو کیا اب بھی باز آؤ گے "۔

حُرمتِ شراب کے تدریجی احکام

احکامِ الٰہیہ کی اصلی اور حقیقی حکمتوں کو تو احکم الحاکمین ہی جانتا ہے، مگر احکامِ شرعیہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعتِ اسلام نے احکام میں انسانی جذبات کی بڑی رعایت فرمائی ہے، تاکہ انسان کو ان کے اتباع میں زیادہ تکلیف نہ ہو، خود قرآن کریم نے فرمایا: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲: ۲۸۶) "یعنی اللہ تعالیٰ کسی انسان کو ایسا حکم نہیں دیتا جو اس کی قدرت اور وسعت میں نہ ہو"۔ اسی رحمت وحکمت کا تقاضا تھا کہ اسلام نے شراب کے حرام کرنے میں بڑی تدریج سے کام لیا۔

شراب کی تدریجی ممانعت اور حرمت کی قرآنی تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں شراب کے متعلق چار آیتیں نازل ہوئی ہیں، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، ان میں سے ایک آیت سورۂ بقرہ کی ہے جس کی تفسیر آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں، اس میں تو شراب سے پیدا ہو جانے والے گناہوں اور مفاسد کا ذکر کرکے چھوڑ دیا گیا ہے، حرام نہیں کیا، گویا ایک مشورہ دیا کہ یہ چھوڑنے کی چیز ہے، مگر چھوڑنے کا حکم نہیں دیا۔

دوسری آیت سورۂ نساء کی لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى میں خاص اوقاتِ نماز کے اندر شراب کو حرام کر دیا گیا، باقی اوقات میں اجازت رہی۔

تیسری اور چوتھی دو آیتیں سورۂ مائدہ کی ہیں، جو اوپر مذکور ہو چکی ہیں، ان میں صاف اور قطعی طور پر شراب کو حرام قرار دیدیا۔

شریعتِ اسلام نے شراب کے حرام کرنے میں اس تدریج سے اس لئے کام لیا کہ عمر بھر کی عادت خصوصاً نشہ کی عادت کو چھوڑ دینا انسانی طبیعت پر انتہائی شاق اور گراں ہوتا، علماء نے فرمایا فِطَامُ الْعَادَةِ اَشَدُّ مِنْ فِطَامِ الرَّضَاعَةِ "یعنی جیسے بچے کو ماں کا دودھ پینے کی عادت چھوڑ دینا بھاری معلوم ہوتا ہے انسان کو اپنی کسی عادتِ مستمرہ کو بدلنا اس سے زیادہ شدید اور سخت ہے"، اس لئے اسلام نے حکیمانہ اصول کے مطابق اوّل اس کی برائی ذہن نشین کرائی، پھر نمازوں کے اوقات میں ممنوع کیا، پھر ایک خاص مدت کے بعد قطعی طور پر حرام کر دیا گیا۔

ہاں جس طرح ابتداءً تحریم شراب میں آہستگی اور تدریج سے کام لینا حکمت کا تقاضا تھا اسی طرح حرام کر دینے کے بعد اس کی ممانعت کے قانون کو پوری شدت کے ساتھ نافذ کرنا بھی حکمت ہی کا تقاضا تھا، اسی لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے بارے میں اوّل سخت وعیدیں عذاب کی بتلائیں، ارشاد فرمایا کہ یہ امّ الخبائث اور امّ الفواحش ہے، اس کو پی کر آدمی بُرے سے بُرے

گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ شراب اور ایمان جمع نہیں ہو سکتے، یہ روایتیں نسائی میں ہیں، اور جامع ترمذی میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے کے بارے میں دس آدمیوں پر لعنت فرمائی، نچوڑنے والا، بنانے والا، پینے والا، پلانے والا، اس کو لاد کر لانے والا، اور جس کے لئے لائی جائے، اور اس کا بیچنے والا، خریدنے والا، اس کو ہبہ کرنے والا، اس کی آمدنی کھانے والا، اور پھر صرف زبانی تعلیم و تبلیغ پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ عملی اور قانونی طور پر اعلان فرمایا کہ جس کے پاس کسی قسم کی شراب موجود ہو اس کو فلاں جگہ جمع کر دے۔

صحابہؓ میں تعمیلِ حکم کا بے مثال جذبہ فرمانبردار صحابہ کرامؓ نے پہلا حکم پاتے ہی اپنے اپنے گھروں میں جو شراب استعمال کیلئے رکھی تھی اُس کو تو اسی وقت بہا دیا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے مدینہ کی گلیوں میں یہ آواز دی کہ شراب حرام کر دی گئی ہے تو جس کے ہاتھ میں جو برتن شراب کا تھا اس کو وہیں پھینک دیا جس کے پاس کوئی سبو یا خم شراب کا تھا اس کو گھر سے باہر لا کر توڑ دیا، حضرت انسؓ اُس وقت ایک مجلس میں دَورِ جام کے ساقی بنے ہوئے تھے، ابو طلحہ، ابو عبیدہ بن جراح، ابی بن کعب، سہیل رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے جلیل القدر صحابہؓ موجود تھے، منادی کی آواز کان میں پڑتے ہی سب نے کہا کہ اب یہ شراب سب گرا دو، اس کے جام و سبو توڑ دو، بعض روایات میں ہے کہ اعلانِ حرمت کے وقت جس کے ہاتھ میں جامِ شراب لبوں تک پہنچا ہوا تھا اُس نے وہیں سے اس کو پھینک دیا، مدینہ میں اُس روز شراب اس طرح بہہ رہی تھی جیسے بارش کی رَو کا پانی، اور مدینہ کی گلیوں میں عرصۂ دراز تک یہ حالت رہی کہ جب بارش ہوتی تو شراب کی بُو اور رنگ مٹی میں نکھر آتا تھا۔

جس وقت اُن کو یہ حکم ملا کہ جس کے پاس کسی قسم کی شراب ہو وہ فلاں جگہ جمع کر دے، اس وقت صرف وہ ذخیرے کچھ رہ گئے تھے جو مالِ تجارت کی حیثیت سے بازار میں تھے، اُن کو فرمانبردار صحابہ کرامؓ نے بلا تامل مقررہ جگہ پر جمع فرما دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس تشریف لے گئے، اور اپنے ہاتھ سے شراب کے بہت سے مشکیزوں کو چاک کر دیا اور باقی دوسرے صحابہ کرامؓ کے حوالے کر کے چاک کرا دیا، ایک صحابیؓ جو شراب کی تجارت کرتے تھے اور ملکِ شام سے شراب درآمد کیا کرتے تھے اتفاقاً اس زمانے میں ابھی ساری رقم جمع کر کے ملک شام سے شراب لینے کے لئے گئے ہوئے تھے، اور جب یہ تجارتی مال لے کر واپس ہوئے تو مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی اُن کو اعلانِ حرمت کی خبر مل گئی، جاں نثار صحابیؓ نے اپنے پورے سرمائے اور محنت کی حاصلات کو جس سے بڑے نفع کی امیدیں لئے ہوئے آرہے تھے اعلانِ حرمت

سن کراسی جگہ ایک پہاڑی پر ڈال دیا، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سوال کیا کہ اب میرے اس مال کے متعلق کیا حکم ہے، اور مجھ کو کیا کرنا چاہئے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمانِ خداوندی کے مطابق حکم دیدیا کہ سب مشکیزوں کو چاک کر کے شراب بہادو، فرمانبردار محبِّ خدا و رسولؐ نے بلا کسی جھجک کے اپنے ہاتھ سے اپنا پورا سرمایہ زمین پر بہادیا، یہ بھی اسلام کا ایک معجزہ اور صحابہ کرامؓ کی حیرت انگیز و بے مثال اطاعت ہے جو اس واقعہ میں ظاہر ہوئی، کہ جس چیز کی عادت ہو جائے سب جانتے ہیں کہ چھوڑنا سخت دشوار ہے اور یہ حضرات بھی اس کے ایسے عادی تھے کہ تھوڑی دیر اس سے صبر کرنا دشوار تھا، ایک حکمِ الٰہی اور فرمانِ نبویؐ نے ان کی عادات میں ایسا عظیم الشان انقلاب برپا کر دیا کہ اب یہ شراب اور جوئے سے ایسے ہی متنفر ہیں، جیسے اس سے پہلے ان کے عادی تھے۔

اسلامی سیاست اور عام ملکی سیاستوں کا فرق عظیم

مذکورہ آیات پھر واقعات میں حرمتِ شراب کے حکم پر مسلمانوں کے عمل کا ایک نمونہ سامنے آگیا ہے، جس کو اسلام کا معجزہ کہو یا پیغمبرانہ تربیت کا بے مثال اثر، یا اسلامی سیاست کا لازمی نتیجہ کہ نشہ کی عادت جس کے چھوڑنے کا انتہائی دشوار ہونا ہر شخص کو معلوم ہے، اور عرب میں اس کا رواج اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ چند گھنٹے اس کے بغیر صبر نہیں کر سکتے تھے، وہ کیا چیز تھی جس نے ایک ہی اعلان کی آواز کان میں پڑتے ہی ان سب کے مزاجوں کو بدل ڈالا، اُن کی عادتوں میں وہ انقلاب پیدا کر دیا کہ اب چند منٹ پہلے جو چیز انتہائی مرغوب بلکہ زندگی کا سرمایہ تھی وہ چند منٹ کے بعد انتہائی مبغوض اور فحش و ناپاک ہوگئی۔

اس کے بالمقابل آج کی ترقی یافتہ سیاست کی ایک مثال کو سامنے رکھ لیجئے کہ اب چند سال پہلے امریکہ کے ماہرین صحت اور سماجی مصلحین نے جب شراب نوشی کی بے شمار اور انتہائی مہلک خرابیوں کو محسوس کر کے ملک میں شراب نوشی کو قانوناً ممنوع کرنا چاہا تو اس کے لئے اپنے نشر و اشاعت کے وہ نئے سے نئے ذرائع جو اس ترقی یافتہ سیاست کا بڑا کمال سمجھے جاتے ہیں سب ہی شراب نوشی کے خلاف ذہن ہموار کرنے پر لگا دیئے، سینکڑوں اخبارات اور رسائل اس کی خرابیوں پر مشتمل ملک میں لاکھوں کی تعداد میں شائع کئے گئے، پھر امریکی دستور میں ترمیم کر کے امتناع شراب کا قانون نافذ کیا گیا، مگر ان سب کا اثر جو کچھ امریکہ میں آنکھوں نے دیکھا، اور وہاں کے اربابِ سیاست کی رپورٹوں سے دنیا کے سامنے آیا وہ یہ تھا کہ اس ترقی یافتہ اور تعلیمیافتہ قوم نے اس ممانعتِ قانونی کے زمانے میں عام زمانوں کی نسبت بہت زیادہ شراب استعمال کی، یہاں تک کہ مجبور ہو کر حکومت کو اپنا قانون منسوخ کرنا پڑا۔

عرب مسلمانوں اور موجودہ ترقی یافتہ امریکنوں کے حالات و معاملات کا یہ عظیم فرق تو ایک حقیقت اور واقعہ ہے جس کا کسی کو انکار کرنے کی گنجائش نہیں، یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس عظیم الشان فرق کا اصلی سبب اور راز کیا ہے۔

ذرا سا غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ شریعتِ اسلام نے صرف قانون کو قوم کی اصلاح کے لئے کبھی کافی نہیں سمجھا، بلکہ قانون سے پہلے ان کی ذہنی تربیت کی اور عبادت و زہادت اور فکرِ آخرت کے کیمیاوی نسخے سے ان کے مزاجوں میں ایک بڑا انقلاب لا کر ایسے افراد پیدا کر دیئے جو رسولؐ کی آواز پر اپنی جان و مال آبرو سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہو جائیں مکیّ زندگی کے پورے دَور میں یہی افراد سازی کا کام ریاضتوں کے ذریعے ہوتا رہا، جب جاں نثاروں کی جماعت تیار ہو گئی اس وقت قانون جاری کیا گیا، ذہنوں کو ہموار کرنے کے لئے تو امریکہ نے بھی اپنے بے مثال ذرائع استعمال کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی، ان کے سامنے سب کچھ تھا مگر فکرِ آخرت نہیں تھی، اور مسلمانوں کے رگ و پے میں فکرِ آخرت سمائی ہوئی تھی۔

کاش! آج بھی ہمارے عقلاء اس نسخہ کیمیا کو استعمال کر کے دیکھیں تو دنیا کو امن و سکون نصیب ہو جائے۔

شراب کے مفاسد اور فوائد میں موازنہ

اس آیت میں شراب اور قمار دونوں کے متعلق قرآن کریم نے یہ بتلایا ہے کہ ان دونوں میں کچھ مفاسد بھی ہیں اور کچھ فوائد بھی، مگر اس کے مفاسد فوائد سے بڑھے ہوئے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ اس پر نظر ڈالی جائے کہ ان کے فوائد کیا ہیں اور مفاسد کیا، اور پھر یہ کہ فوائد سے زیادہ مفاسد ہونے کے کیا وجوہ ہیں، آخر میں چند فقہی ضابطے بیان کئے جائیں گے، جو اس آیت سے مستفاد ہوتے ہیں۔

پہلے شراب کو لے لیجئے، اس کے فوائد تو عام لوگوں میں مشہور و معروف ہیں کہ اس سے لذت و فرحت حاصل ہوتی ہے، اور وقتی طور پر قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے، رنگ صاف ہو جاتا ہے، مگر ان حقیر وقتی فوائد کے مقابلے میں اس کے مفاسد اتنے کثیر و سیع اور گہرے ہیں کہ شاید کسی دوسری چیز میں اتنے مفاسد اور مضرات نہ ہوں گے، بدنِ انسانی پر شراب کے مضرات یہ ہیں کہ وہ رفتہ رفتہ معدے کے فعل کو فاسد کر دیتی ہے، کھانے کی خواہش کم کر دیتی ہے، چہرے کی ہیئت بگاڑ دیتی ہے، پیٹ بڑھ جاتا ہے، مجموعی حیثیت سے تمام قوٰی پر یہ اثر ہوتا ہے جو ایک جرمن ڈاکٹر نے بیان کیا ہے کہ "جو شخص شراب کا عادی ہو چالیس سال کی عمر میں اس کے بدن کی ساخت ایسی ہو جاتی ہے، جیسے ساٹھ سالہ بوڑھے کی" وہ جسمانی اور قوت کے اعتبار سے سٹھیائے ہوئے بوڑھوں کی طرح ہو جاتا ہے، اس کے علاوہ

شراب جگر اور گردوں کو خراب کر دیتی ہے، سِل کی بیماری شراب کا خاص اثر ہے، یورپ کے شہروں میں سِل کی کثرت کا بڑا سبب شراب ہی کو بتلایا جاتا ہے، وہاں کے بعضے ڈاکٹروں کا قول ہے کہ یورپ میں آدھی اموات مرض سِل میں ہوتی ہیں، اور آدھی دوسرے امراض میں، اور اس بیماری کی کثرت یورپ میں اسی وقت سے ہوئی جب سے وہاں شراب کی کثرت ہوئی۔

یہ تو شراب کی جسمانی اور بدنی مضرتیں ہیں، اب عقل پر اس کی مضرت کو تو ہر شخص جانتا ہے، مگر صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ شراب پی کر جب تک نشہ رہتا ہے اُس وقت تک عقل کام نہیں کرتی، لیکن اہلِ تجربہ اور ڈاکٹروں کی تحقیق یہ ہے کہ نشہ کی عادت خود قوتِ عاقلہ کو بھی ضعیف کر دیتی ہے، جس کا اثر ہوش میں آنے کے بعد بھی رہتا ہے، بعض اوقات جنون تک اس کی نوبت پہنچ جاتی ہے، اطباء اور ڈاکٹروں کا اتفاق ہے کہ شراب نہ جزو بدن بنتی ہے اور نہ اس سے خون بنتا ہے، جس کی وجہ سے بدن میں طاقت آئے بلکہ اس کا فعل صرف یہ ہوتا ہے کہ خون میں ہیجان پیدا کر دیتی ہے جس سے وقتی طور پر قوت کی زیادتی محسوس ہونے لگتی ہے، اور یہی خون کا دفعۃً ہیجان بعض اوقات اچانک موت کا سبب بھی بن جاتا ہے، جس کو ڈاکٹر ہارٹ فیل ہونے سے تعبیر کرتے ہیں۔

شراب سے شرائین یعنی وہ رگیں جن کے ذریعے سارے بدن میں رُوح پہنچتی ہے سخت ہو جاتی ہیں جس سے بڑھاپا جلدی آجاتا ہے، شراب کا اثر انسان کے حلقوم اور تنفس پر بھی خراب ہوتا ہے، جس کی وجہ سے آواز بھاری ہو جاتی ہے، اور کھانسی دائمی ہو جاتی ہے، اور وہی آخر کار سِل تک نوبت پہنچا دیتی ہے، شراب کا اثر نسل پر بھی بُرا پڑتا ہے، شرابی کی اولاد کمزور رہتی ہے، اور بعض اوقات اس کا نتیجہ قطعِ نسل تک پہنچتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شراب پینے کی ابتدائی حالت میں بظاہر انسان اپنے جسم میں چستی وچالاکی اور قوت محسوس کرتا ہے، اسی لئے بعض لوگ جو اس میں مبتلا ہوتے ہیں وہ ان طبی حقائق کا انکار کرتے ہیں، لیکن انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ شراب کا یہ زہر ایسا زہر ہے جس کا اثر تدریجی طور پر ظاہر ہونا شروع ہوتا ہے، اور کچھ عرصہ کے بعد یہ سب مضرتیں مشاہدہ میں آجاتی ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔

شراب کا ایک بڑا مفسدہ تمدنی یہ ہے کہ وہ اکثر لڑائی جھگڑے کا سبب بنتی ہے، اور پھر یہ بغض و عداوت دور تک انسان کو نقصان پہنچاتی ہیں، شریعتِ اسلام کی نظر میں یہ مفسدہ سب سے بڑا ہے، اس لئے قرآن نے سورۂ مائدہ میں خصوصیت کے ساتھ اس مفسدہ کا ذکر فرمایا ہے، اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ (۵: ۹۱)

"یعنی شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمھارے آپس میں بغض و عداوت پیدا کردے"

شراب کا ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ مدہوشی کے عالم میں بعض اوقات آدمی اپنا پوشیدہ راز بیان کر ڈالتا ہے جس کی مضرت اکثر بڑی تباہ کن ہوتی ہے، خصوصاً وہ اگر کسی حکومت کا ذمہ دار آدمی ہے اور راز بھی حکومت کا راز ہے، جس کے اظہار سے پورے ملک میں انقلاب آسکتا ہے اور ملکی سیاست اور جنگی مصالح سب برباد ہو جاتے ہیں، ہوشیار جاسوس ایسے مواقع کے منتظر رہتے ہیں۔

شراب کا ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ وہ انسان کو ایک کھلونا بنا دیتی ہے، جس کو دیکھ کر بچے بھی ہنستے ہیں، کیونکہ اس کا کلام اور اس کی حرکات سب غیر متوازن ہو جاتی ہیں، شراب کا ایک عظیم تر مفسدہ یہ ہے کہ وہ اُمّ الخبائث ہے، انسان کو تمام بُرے سے بُرے جرائم پر آمادہ کر دیتی ہے، زنا اور قتل اکثر اس کے نتائج ہوتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ عام شراب خانے زنا اور قتل کے اڈے ہوتے ہیں، یہ شراب کی جسمانی مضرتیں ہیں، اور اس کی روحانی مضرت تو ظاہر ہی ہے، کہ نشہ کی حالت میں نہ نماز ہو سکتی ہے نہ اللہ کا ذکر نہ اور کوئی عبادت، اسی لئے قرآن کریم میں شراب کی مضرت کے بیان میں فرمایا: وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ (۵: ۹۱) "یعنی شراب تم کو ذکر اللہ اور نماز سے روکتی ہے"۔

اب مالی مضرت اور نقصان کا حال سنئے جس کو ہر شخص جانتا ہے، کسی بستی میں اگر ایک شراب خانہ کھل جاتا ہے تو وہ پوری بستی کی دولت کو سمیٹ لیتا ہے، اس کی قسمیں بے شمار ہیں، اور بعض اقسام تو بے حد گراں ہیں، بعض اعداد و شمار لکھنے والوں نے صرف ایک شہر میں شراب کا مجموعی خرچہ پوری مملکتِ فرانس کے مجموعی خرچ کے برابر بتلایا ہے۔

یہ شراب کے دینی، دنیوی جسمانی اور روحانی مفاسد کی مختصر فہرست ہے جس کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کلمہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ وہ "اُم الخبائث" یا "اُمّ الفواحش" ہے، جرمنی کے ایک ڈاکٹر کا یہ مقولہ ضرب المثل کی طرح مشہور ہے کہ اس نے کہا کہ اگر آدھے شراب خانے بند کر دیئے جائیں تو میں اس کی ضمانت لیتا ہوں کہ آدھے شفاخانے اور آدھے جیل خانے بے ضرورت ہو کر بند ہو جائیں گے۔ (تفسیر المنار لمفتی عبدہ، ص ۲۲۶ ج ۲)

علامہ طنطاوی نے اپنی کتاب الجواہر میں اس سلسلے کی چند اہم معلومات لکھی ہیں، اُن میں سے بعض یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

ایک فرانسیسی محقق ہنری اپنی کتاب "خواطر و سوانح فی الاسلام" میں لکھتے ہیں:

"بہت زیادہ مہلک ہتھیار جس سے اہلِ مشرق کی بیخ کنی کی گئی اور وہ دودھاری

تلوار جس سے مسلمانوں کو قتل کیا گیا ــــ یہ شراب تھی ــــ ہم نے الجزائر کے لوگوں کے خلاف یہ ہتھیار آزمایا، لیکن ان کی اسلامی شریعت ہمارے راستہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہوگئی، اور وہ ہمارے اس ہتھیار سے متاثر نہیں ہوئے اور نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کی نسل بڑھتی ہی چلی گئی، یہ لوگ اگر ہمارے اس تحفہ کو قبول کر لیتے جس طرح کہ اُن کے ایک منافق قبیلے نے اس کو قبول کر لیا ہے تو یہ بھی ہمارے سامنے ذلیل و خوار ہو جاتے، آج جن لوگوں کے گھروں میں ہماری شراب کے دَور چل رہے ہیں وہ ہمارے سامنے اتنے حقیر و ذلیل ہوگئے ہیں کہ سر نہیں اُٹھا سکتے"۔

ایک انگریز قانون داں بنتام لکھتے ہیں کہ:

"اسلامی شریعت کی بے شمار خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں شراب حرام ہے، ہم نے دیکھا کہ جب افریقہ کے لوگوں نے اسے استعمال کرنا شروع کیا تو ان کی نسلوں میں پاگل پن سرایت کرنے لگا، اور یورپ کے جن لوگوں کو اس کا چسکہ لگ گیا اُن کی بھی عقلوں میں تغیر آنے لگا، لہٰذا افریقہ کے لوگوں کے لئے بھی اس کی ممانعت ہونی چاہئے، اور یورپین لوگوں کو بھی اس پر شدید سزائیں دینی چاہئیں"

غرض جس بھلے مانس نے بھی ٹھنڈے دل سے غور کیا وہ بے اختیار پکار اٹھا کہ یہ رِجس ہے، شیطانی عمل ہے، زہر ہے، تباہی اور بربادی کا ذریعہ ہے، اس اُمّ الخبائث سے باز آجاؤ، فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ۔ (۵: ۹۱)

شراب کی حرمت و ممانعت کے متعلق قرآن کریم کی چار آیتوں کا بیان اوپر آچکا ہے سورۂ نحل میں ایک جگہ اور بھی نشہ کی چیزوں کا ذکر ایک دوسرے انداز سے آیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بھی یہاں ذکر کر دیا جائے، تاکہ شراب و نشہ کے متعلق تمام قرآنی ارشادات مجموعی طور پر سامنے آجائیں، وہ آیت یہ ہے:

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا، اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○ (۱۶: ۶۷)	"اور کھجور اور انگور کے پھلوں سے تم لوگ نشہ کی چیز اور عمدہ کھانے کی چیزیں بناتے ہو، بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے بڑی دلیل ہے جو عقل رکھتے ہیں"

تشریح و تفسیر پچھلی آیتوں میں حق تعالیٰ کی اُن نعمتوں کا ذکر تھا جو انسانی غذائیں پیدا کرنے میں عجیب و غریب صنعت و قدرت کا مظہر ہیں، اس میں

پہلے دُودھ کا ذکر کیا، جس کو قدرت نے حیوان کے پیٹ میں خون اور فضلہ کی آلائشوں سے الگ کر کے صاف ستھری غذا انسان کے لئے عطا کر دی، جس میں انسان کو کسی مزید صنعت کی ضرورت نہیں، اسی لئے یہاں لفظ نسقیکم استعمال فرمایا، کہ ہم نے دُودھ پلایا، اس کے بعد فرمایا کہ کھجور اور انگور کے کچھ پھلوں میں سے بھی انسان اپنی غذا اور نفع کی چیزیں بناتا ہے، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ کھجور اور انگور کے پھلوں میں سے اپنی غذا اور منفعت کی چیزیں بنانے میں انسانی صنعت کا کچھ دخل ہے، اور اسی دخل کے نتیجہ میں دو طرح کی چیزیں بنائی گئیں، ایک نشہ آور چیز، جس کو خمر یا شراب کہا جاتا ہے، دوسری رزق حسن یعنی عمدہ رزق کہ کھجور اور انگور کو تر و تازہ کھانے میں استعمال کریں یا خشک کر کے ذخیرہ کر لیں، مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے کھجور اور انگور کے پھل انسان کو دیدیئے، اور ان سے اپنی غذا وغیرہ بنانے کا اختیار بھی دیدیا، اب یہ اس کا انتخاب ہے کہ اس سے کیا بنائے، نشہ آور چیز بنا کر عقل کو خراب کرے یا غذا بنا کر قوت حاصل کرے۔

اس تفسیر کے مطابق اس آیت سے نشہ آور شراب کے حلال ہونے پر کوئی استدلال نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہاں مقصود قدرت کے عطیات اور ان کے استعمال کی مختلف صورتوں کا بیان ہے، جو ہر حال میں نعمتِ خداوندی ہے، جیسے تمام غذائیں اور انسانی منفعت کی چیزیں کہ اُن کو بہت سے لوگ ناجائز طریقوں پر بھی استعمال کرتے ہیں، مگر کسی کے غلط استعمال سے اصل نعمت نعمت ہونے سے نہیں نکل جاتی، اس لئے یہاں یہ تفصیل بتلانے کی ضرورت نہیں، کہ ان میں کونسا استعمال حلال ہے کونسا حرام ہے، تاہم ایک لطیف اشارہ اس میں بھی اس طرف کر دیا کہ "سَکَر" کے مقابل "رِزقِ حَسَن" رکھا، جس سے معلوم ہوا کہ سکر اچھا رزق نہیں، سَکَر کے معنی جمہور مفسرینؒ کے نزدیک نشہ آور چیز کے ہیں، (روح المعانی، قرطبی، جصاص)

یہ آیات باتفاق امت مکی ہیں، اور شراب کی حرمت اس کے بعد مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی، نزولِ آیات کے وقت اگرچہ شراب حلال تھی اور مسلمان عام طور پر پیتے تھے، مگر اُس وقت بھی اس آیت میں اشارہ اس طرف کر دیا گیا کہ اس کا پینا اچھا نہیں، بعد میں صراحةً شراب کو شدت کے ساتھ حرام کرنے کے لئے قرآنی احکام نازل ہوگئے (ہذا ملخص ما فی الجصاص والقرطبی)

---

۱ بعض علماء نے اس کے معنی سرکہ یا بے نشہ نبیذ کے بھی لئے ہیں (جصاص، قرطبی) مگر اس جگہ اس اختلاف کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ۱۲ منہ

حرمتِ قمار (جوا)

میسر مصدر ہے، اور اصل لغت میں اس کے معنی تقسیم کرنے کے ہیں، یاسر تقسیم کرنیوالے کو کہا جاتا ہے، جاہلیتِ عرب میں مختلف قسم کے جوئے رائج تھے جن میں ایک قسم یہ بھی تھی کہ اونٹ ذبح کرکے اس کے حصے تقسیم کرنے میں جوا کھیلا جاتا تھا، بعض کو ایک یا زیادہ حصے ملتے بعض محروم رہتے تھے، محروم رہنے والے کو پورے اونٹ کی قیمت ادا کرنا پڑتی تھی، گوشت سب فقراء میں تقسیم کیا جاتا خود استعمال نہ کرتے تھے۔

اس خاص جوئے میں چونکہ فقراء کا فائدہ اور جوا کھیلنے والوں کی سخاوت بھی تھی، اسی لئے اس کھیل کو باعثِ فخر سمجھتے تھے، جو اس میں شریک نہ ہوتا اس کو کنجوس اور منحوس کہتے تھے۔

تقسیم کی مناسبت سے قمار کو میسر کہا جاتا ہے، تمام صحابہؓ و تابعینؒ اس پر متفق ہیں کہ میسر میں قمار یعنی جوئے کی تمام صورتیں داخل اور سب حرام ہیں، ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اور جصاصؒ نے احکام القرآن میں نقل کیا ہے کہ مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور ابن عمرؓ اور قتادہؒ اور معاویہ بن صالحؒ اور عطاءؒ اور طاؤسؒ نے فرمایا:

المیسر القمار حتیٰ لعب الصبیان بالکعاب والجوز، "یعنی ہر قسم کا قمار مَیْسِر ہی، یہاں تک کہ بچوں کا کھیل لکڑی کے گٹکوں اور اخروٹ وغیرہ کے ساتھ"

اور ابن عباسؓ نے فرمایا اَلْمُخَاطَرَۃُ مِنَ الْقِمَارِ "یعنی مخاطرہ قمار میں سے ہے" (جصاص)

ابن سیرینؒ نے فرمایا جس کام میں مخاطرہ ہو وہ مَیْسِر میں داخل ہے۔ (روح البیان)

مخاطرہ کے معنی ہیں کہ ایسا معاملہ کیا جائے جو نفع و ضرر کے درمیان دائر ہو، یعنی یہ بھی احتمال ہو کہ بہت سا مال مل جائے اور یہ بھی کہ کچھ نہ ملے، جیسے آجکل کی لاٹری کے مختلف طریقوں میں پایا جاتا ہے، یہ سب قسمیں قمار اور میسر میں داخل اور حرام ہیں، اس لئے میسر یا قمار کی تعریف یہ ہے کہ جس معاملہ میں کسی مال کا مالک بنانے کو ایسی شرط پر موقوف رکھا جائے جس کے وجود و عدم کی دونوں جانبیں مساوی ہوں، اور اسی بناء پر نفع خالص یا تاوان خالص برداشت کرنے کی دونوں جانبیں بھی برابر ہوں (شامی، ص ۳۵۵ جلد ۵ کتاب الحظر والاباحۃ) مثلاً یہ بھی احتمال ہے کہ زید پر تاوان پڑجائے، اور یہ بھی ہے کہ عمر پر پڑجائے، اس کی جتنی قسمیں اور صورتیں پہلے زمانے میں رائج تھیں یا آج رائج ہیں یا آئندہ پیدا ہوں وہ سب مَیْسِر اور قمار اور جوا کہلائے گا، معمے حل کرنے کا چلتا ہوا کاروبار اور تجارتی لاٹری کی عام صورتیں سب اس میں داخل ہیں، ہاں اگر صرف ایک جانب سے انعام مقرر کیا جائے

کہ جو شخص فلاں کام کرے گا اس کو یہ انعام ملے گا، اس میں مضائقہ نہیں، بشرطیکہ اس شخص سے کوئی فیس وصول نہ کی جائے، کیونکہ اس میں معاملہ نفع وضرر کے درمیان دائر نہیں، بلکہ نفع اور عدم نفع کے درمیان دائر ہے۔

اسی لئے احادیثِ صحیحہ میں شطرنج اور چوسر وغیرہ کو حرام قرار دیا گیا ہے، جن میں مال کی ہار جیت پائی جاتی ہے، تاش پر اگر روپیہ کی ہار جیت ہو تو وہ بھی مَیْسِر میں داخل ہے۔

صحیح مسلم میں بروایت بریدہؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص نردشیر (چوسر) کھیلتا ہے وہ گویا خنزیر کے گوشت اور خون میں اپنے ہاتھ رنگتا ہے، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے فرمایا کہ شطرنج مَیْسِر یعنی جوئے میں داخل ہے، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا شطرنج تو نردشیر سے بھی زیادہ بُری ہے (تفسیر ابن کثیر)

ابتداء اسلام میں شراب کی طرح قمار بھی حلال تھا، مکہ میں جب سورۂ رُوم کی آیات غُلِبَتِ الرُّوْمُ نازل ہوئیں، اور قرآن نے خبر دی کہ اس وقت رُوم اگرچہ اپنے حریف کسرٰی سے مغلوب ہوگئے، لیکن چند سال بعد پھر رومی غالب آجائیں گے اور مشرکین مکہ نے اس کا انکار کیا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان سے اسی طرح قمار کی شرط ٹھہرائی، کہ اگر اتنے سال میں رُومی غالب آگئے تو اتنا مال تمھیں دینا پڑے گا، یہ شرط مان لی گئی، اور واقعہ قرآن کی خبر کے مطابق پیش آیا، تو ابوبکرؓ نے یہ مال وصول کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے، آپؐ نے اس واقعہ پر اظہار مسرت فرمایا مگر مال کو صدقہ کرنے کا حکم دیدیا۔

کیونکہ جو چیز آئندہ حرام ہونے والی تھی اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حلال ہونے کے زمانے میں بھی اس سے محفوظ فرما دیا تھا، اسی لئے شراب اور قمار سے ہمیشہ آپؐ نے اجتناب کیا، اور خاص خاص صحابۂ کرامؓ بھی ان چیزوں سے ہمیشہ محفوظ رہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جبریل امین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جعفر طیار کی چار خصلتیں زیادہ محبوب ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفرؓ سے پوچھا کہ آپ میں وہ چار خصلتیں کیا ہیں، عرض کیا کہ میں نے اس کا اظہار اب تک کسی سے نہیں کیا تھا، مگر جب کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے خبر دیدی تو عرض کرتا ہوں کہ وہ چار خصلتیں یہ ہیں کہ میں نے دیکھا کہ شراب عقل کو زائل کر دیتی ہے اس لئے میں کبھی اس کے پاس نہیں گیا، اور میں نے بُتوں کو دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں کسی کا نفع وضرر نہیں، اس لئے جاہلیت میں بھی کبھی بُت پرستی نہیں کی، اور مجھے چونکہ اپنی بیوی اور لڑکیوں کے معاملہ میں سخت غیرت ہے اس لئے میں نے کبھی زنا نہیں کیا، اور میں نے دیکھا کہ جھوٹ بولنا دنائت اور رذالت کی بات ہے

اس لئے کبھی جہالت میں بھی جھوٹ نہیں بولا (روح البیان)

قمار کے سماجی اور اجتماعی نقصانات قمار یعنی جوئے کے متعلق بھی قرآن کریم نے وہی ارشاد فرمایا جو شراب کے متعلق آیا ہے، کہ اس میں کچھ منافع بھی ہیں مگر نفع سے اس کا نقصان وضرر بڑھا ہوا ہے، اس کے منافع کو تو ہر شخص جانتا ہے، کہ جیت جائے تو بیٹھے بیٹھے ایک فقیر بدحال آدمی ایک ہی دن میں مالدار و سرمایہ دار بن سکتا ہے، مگر اس کی معاشی، اجتماعی، سماجی اور روحانی خرابیاں اور مفاسد بہت کم لوگ جانتے ہیں، اس کا اجمالی بیان یہ ہے کہ جوئے کا کھیل سارا اس پر دائر ہے کہ ایک شخص کا نفع دوسرے کے ضرر پر موقوف ہے، جیتنے والے کا نفع ہی نفع ہارنے والے کے نقصان ہی نقصان کا نتیجہ ہوتا ہے، کیونکہ اس کاروبار سے کوئی دولت بڑھتی نہیں وہ اسی طرح منجمد حالت میں رہتی ہے، اس کھیل کے ذریعے ایک کی دولت سلب ہو کر دوسرے کے پاس پہنچ جاتی ہے، اس لئے قمار مجموعی حیثیت سے قوم کی تباہی اور انسانی اخلاق کی موت ہے، کہ جس انسان کو نفع رسانی خلق اور ایثار و ہمدردی کا پیکر ہونا چاہئے، وہ ایک خونخوار درندہ کی خاصیت اختیار کرلے کہ دوسرے بھائی کی موت میں اپنی زندگی، اس کی مصیبت میں اپنی راحت اس کے نقصان میں اپنا نفع سمجھنے لگے، اور اپنی پوری قابلیت اس خودغرضی پر صرف کرے، بخلاف تجارت اور بیع وشراء کی جائز صورتوں کے، ان میں طرفین کا فائدہ ہوتا ہے، اور بذریعہ تجارت اموال کے تبادلہ سے دولت بڑھتی ہے، اور خریدنے والا اور بیچنے والا دونوں اس کا فائدہ محسوس کرتے ہیں۔

ایک بھاری نقصان جوئے میں یہ ہے کہ اس کا عادی اصل کمائی اور کسب سے عادۃً محروم ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کی خواہش یہی رہتی ہے کہ بیٹھے بٹھائے ایک شرط لگا کر دوسرے کا مال چند منٹ میں حاصل کرے، جس میں نہ کوئی محنت ہے نہ مشقت، بعض حضرات نے جوئے کا نام میسر رکھنے کی یہ وجہ بھی بیان کی ہو کہ اس کے ذریعہ آسانی سے دوسرے کا مال اپنا بن جاتا ہے، جوئے کا معاملہ اگر دو چار آدمیوں کے درمیان دائر ہو تو اس میں بھی مذکورہ مضرتیں بالکل نمایاں نظر آتی ہیں، لیکن اس نئے دور میں جس کو بعض سطحی نظر والے انسان عاقبت نا اندیشی سے ترقی کا دور کہتے ہیں، جیسے شراب کی نئی نئی قسمیں اور نئے نئے نام رکھ لئے گئے، سود کی نئی نئی قسمیں اور نئے نئے اجتماعی طریقے بنکنگ کے نام سے ایجاد کرلئے گئے ہیں، اسی طرح قمار اور جوئے کی بھی ہزاروں قسمیں چل گئیں، جن میں بہت سی قسمیں ایسی اجتماعی ہیں کہ قوم کا تھوڑا تھوڑا روپیہ جمع ہوتا ہے، اور جو نقصان ہوتا ہو وہ ان سب پر تقسیم ہو کر نمایاں نہیں رہتا، اور جس کو یہ رقم ملتی ہے اس کا فائدہ نمایاں ہوتا ہے، اس لئے بہت سے لوگ اس کے شخصی نفع کو دیکھتے ہیں، لیکن قوم کے اجتماعی نقصان پر دھیان نہیں دیتے، اس لئے ان کا خیال ان نئی قسموں کے جواز کی طرف چلا جاتا ہے، حالانکہ

اس میں وہ سب مضرتیں موجود ہیں جو دو چار آدمیوں کے جوئے میں پائی جاتی ہیں، اور ایک حیثیت سے اس کا ضرر اس قدیم قسم کے قمار سے بہت زیادہ اور اس کے خراب اثرات دور رس اور پوری قوم کی بربادی کا سامان ہیں، کیونکہ اس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ ملت کے عام افراد کی دولت گھٹتی جائیگی اور چند سرمایہ داروں کے سرمایہ میں مزید اضافہ ہوتا رہے گا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پوری قوم کی دولت سمٹ کر محدود افراد اور محدود خاندانوں میں مرتکز ہو جائے گی، جس کا مشاہدہ سٹہ بازار اور قمار کی دوسری قسموں میں روزمرہ ہوتا رہتا ہے، اور اسلامی معاشیات کا اہم اصول یہ ہے کہ ہر ایسے معاملے کو حرام قرار دیا جس کے ذریعے دولت پوری ملت سے سمٹ کر چند سرمایہ داروں کے حوالے ہو سکے، قرآن کریم نے اس کا اعلان خود تقسیم دولت کا اصول بیان کرتے ہوئے اس طرح فرمادیا ہے: كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاۤءِ مِنْكُمْ (۵۹: ۷) یعنی مال فئے کی تقسیم مختلف طبقوں میں کرنے کا جو اصول قرآن نے مقرر کیا ہے اس کا منشاء یہ ہے کہ دولت سمٹ کر صرف سرمایہ داروں میں جمع نہ ہو جائے۔

قمار یعنی جوئے کی خرابی یہ بھی ہے کہ شراب کی طرح قمار بھی آپس میں لڑائی جھگڑے اور فتنہ وفساد کا سبب ہوتا ہے، ہارنے والے کو طبعی طور پر جیت جانے والے سے نفرت اور عداوت پیدا ہوتی ہے، اور یہ تمدن و معاشرت کے لئے سخت مہلک چیز ہے، اسی لئے قرآن حکیم نے خاص طور پر اس مفسدہ کو ذکر فرمایا ہے:

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۤءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ (۵: ۹۱)	"شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے آپس میں عداوت اور بغض و نفرت پیدا کردے اور تم کو اللہ کے ذکر اور نماز سے روک دے"

اسی طرح قمار کا ایک لازمی اثر یہ ہے کہ شراب کی طرح آدمی اس میں مست ہو کر ذکر اللہ اور نماز سے غافل ہو جاتا ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے شراب اور قمار کو ایک ہی جگہ ایک انداز سے ذکر فرمایا ہے کہ معنوی طور پر قمار کا بھی ایک نشہ ہوتا ہے جو آدمی کو اس کے بھلے برے کی فکر سے غافل کر دیتا ہے، مذکورہ آیت میں بھی ان دونوں چیزوں کو جمع کر کے دونوں کے یہ مفاسد ذکر فرمائے ہیں، کہ وہ آپس کی عداوت و بغض کا سبب بنتی ہیں، اور ذکر اللہ اور نماز سے مانع بن جاتی ہیں۔

قمار کی ایک اصولی خرابی یہ بھی ہے کہ یہ باطل طریقہ پر دوسرے لوگوں کا مال ہضم کرنے کا ایک طریق ہے، کہ بغیر کسی معقول معاوضہ کے دوسرے بھائی کا مال لے لیا جاتا ہے، اسی کو

قرآن کریم نے ان الفاظ میں منع فرمایا ہے:

لَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔ (۲: ۱۸۸)	"لوگوں کے مال باطل طریقہ پر مت کھاؤ"

قمار میں ایک بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ دفعۃً بہت سے گھر برباد ہوجاتے ہیں، لکھ پتی آدمی فقیر بن جاتا ہے، جس سے صرف یہی شخص متاثر نہیں ہوتا، جس نے جرم قمار کا ارتکاب کیا ہے، بلکہ اس کا پورا گھرانہ اور خاندان مصیبت میں پڑجاتا ہے، اور اگر غور کیا جائے تو پوری قوم اس سے متاثر ہوتی ہے، کیونکہ جن لوگوں نے اس کی مالی ساکھ کو دیکھ کر اس سے معاہدے اور معاملات کئے ہوئے ہیں یا قرض دیئے ہوئے ہیں وہ اب دیوالیہ ہوجائے گا تو ان سب پر اس کی بربادی کا اثر پڑنا لازمی ہے۔

قمار میں ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ اس سے انسان کی قوتِ عمل سُست ہو کر وہمی منافع پر لگ جاتی ہے، اور وہ بجائے اس کے کہ اپنے ہاتھ یا دماغ کی محنت سے کوئی دولت بڑھاتا رہے اُس کی فکر اس بات میں محصُور ہو کر رہ جاتی ہے کہ کسی طرح دوسرے کی کمائی پر اپنا قبضہ جمائے۔

یہ مختصر فہرست ہے قمار کے مفاسد کی جن سے نہ صرف اِس جرم کا مرتکب متاثر ہوتا ہے بلکہ اس کے سب متعلقین، اہل و عیال اور پوری قوم متاثر ہوتی ہے، اسی لئے قرآن کریم نے فرمایا: وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا "یعنی شراب و قمار کے مفاسد ان کے نفع سے زیادہ ہیں"۔

چند فقہی ضابطے اور فوائد

اس آیت میں شراب اور قمار کے بعض فوائد کو تسلیم کرتے ہوئے اُن سے رُکنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے جس سے ایک اہم نتیجہ یہ نکل آیا کہ کسی چیز یا کسی کام میں کچھ دنیوی منافع ہونا اس کے منافی نہیں ہے کہ اس کو شرعاً حرام قرار دیا جائے، کیونکہ جس طرح محسوسات میں اُس دوا اور غذا کو مضر کہا جاتا ہے جس کی مضرتیں بہ نسبت اُس کے فائدے کے زیادہ سخت ہوں، ورنہ یوں تو دنیا کی کوئی بُری سے بُری چیز بھی منافع سے خالی نہیں، زہر قاتل میں، سانپ اور بچھو میں، درندوں میں کتنے فوائد ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے اُن کو مُضر کہا جاتا ہے، اور ان کے پاس جانے سے بچنے کی ہدایت کی جاتی ہے، اسی طرح معنوی اعتبار سے جن کاموں کے مفاسد ان کے منافع سے زائد ہوں شرعاً ان کو حرام کردیا جاتا ہے، چوری، ڈاکہ، زنا، اغواء، دھوکہ، فریب وغیرہ تمام جرائم میں کونسا جُرم ایسا ہے جس میں کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ اگر یہ بالکل بے فائدہ ہوتے تو کوئی عقل و ہوش والا انسان اُن کے پاس نہ جاتا، حالانکہ ان سب جرائم میں کامل وہی لوگ ہوتے ہیں جو ہوشیاری عقلمندی میں معروف سمجھے جاتے ہیں، اس سے ہی معلوم ہوا کہ فوائد تو کچھ نہ کچھ تمام جرائم میں ہیں، مگر چونکہ اُن کی

مضرت فائدہ سے بڑھی ہوئی ہے، اس لئے کوئی عقلمند انسان اُن کو مفید اور جائز نہیں کہتا، شریعت اسلام نے شراب اور جوّے کو اسی اصول کے تحت حرام قرار دیا ہے، کہ اس کے فوائد سے زیادہ مفاسد اور دینی و دنیوی مضرتیں ہیں۔

ایک اور فقہی ضابطہ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جلبِ منفعت سے دفعِ مضرت مقدم ہے، یعنی ایک کام کے ذریعے کچھ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے اور ساتھ ہی کوئی مضرت بھی پہنچتی ہے تو مضرت سے بچنے کے لئے اس منفعت کو چھوڑ دینا ہی ضروری ہوتا ہے، ایسی منفعت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جو مضرت کے ساتھ حاصل ہو۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۥ قُلِ الْعَفْوَ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ

اور تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہدے جو بچے اپنے خرچ سے اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ

لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ

تمہارے واسطے حکم تاکہ تم فکر کرو، دنیا و آخرت کی باتوں میں

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۭ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۭ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ

اور تجھ سے پوچھتے ہیں یتیموں کا حکم کہدے سنوارنا ان کے کام کا بہتر ہے اور اگر ان کا خرچ ملا لو تو وہ

فَاِخْوَانُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ

تمہارے بھائی ہیں اور اللہ جانتا ہے خرابی کرنے والے اور سنوارنے والے کو اور اگر اللہ چاہتا تو

لَاَعْنَتَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ

تم پر مشقت ڈالتا بیشک اللہ زبردست ہے تدبیر والا، اور نکاح مت کرو مشرک عورتوں سے

حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ

جب تک ایمان نہ لے آئیں اور البتہ لونڈی مسلمان بہتر ہے مشرک بی بی سے اگرچہ وہ تم کو بھلی لگے،

وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۭ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ

اور نکاح نہ کر دو مشرکین سے جب تک وہ ایمان نہ لے آویں اور البتہ غلام مسلمان بہتر ہے مشرک

مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ښ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا

سے اگرچہ وہ تم کو بھلا لگے وہ بلاتے ہیں دوزخ کی طرف اور اللہ بلاتا ہے

اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ

جنت کی طرف اور بخشش کی طرف اپنے حکم سے اور بتلاتا ہے اپنے حکم لوگوں کو تاکہ وہ

يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾ ع ۲۷ ۵ ۱۱

نصیحت قبول کریں۔

خُلاصۂ تفسیر

سولھواں حکم ۱۶، مقدار انفاق اور لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ (خیر خیرات میں) کتنا خرچ کیا کریں آپ فرمادیجئے کہ جتنا آسان ہو (کہ اس کے خرچ کرنے سے خود پریشان ہو کر دنیوی تکلیف میں یا کسی کا حق ضائع کر کے اُخروی تکلیف میں پڑ جائیں) اللہ تعالیٰ اس طرح احکام کو صاف صاف بیان فرماتے ہیں تاکہ تم (ان کا علم ہوجائے اور اس علم کی وجہ سے ہر عمل کرنے سے پہلے) دنیا و آخرت کے معاملات میں (ان احکام کو) سوچ لیا کرو (اور سوچ کر ہر معاملہ میں اُن احکام کے موافق عمل کیا کرو)

سترہواں حکم ۱۷، مخالطتِ یتیم (چونکہ ابتدا میں مثل ہندوستان کے عرب میں بھی یتیموں کا حق دینے میں پوری احتیاط نہ تھی، اس لئے یہ وعید سُنائی گئی کہ یتیموں کا مال کھانا ایسا ہے جیسا دوزخ کے انگارے پیٹ میں بھرنا، تو سننے والے ڈر کے مارے اتنی احتیاط کرنے لگے کہ اُن کا کھانا بھی الگ پکواتے اور الگ رکھواتے، اور اتفاقاً اگر بچہ کم کھاتا تو کھانا بچتا اور سڑتا تھا، کیونکہ اس کا استعمال نہ اُن لوگوں کے لئے جائز تھا، اور نہ یتیم کے مال کو صدقہ کردینے کا اختیار تھا، اس طرح تکلیف بھی ہوتی اور یتیم کا نقصان بھی، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا، اس کے متعلق آیت میں یہ ارشاد آیا) اور لوگ آپ سے یتیم بچوں (کے خرچ علٰحدہ یا شامل رکھنے) کا حکم پوچھتے ہیں آپ فرمادیجئے کہ (اصل مقصود ہمارا ان کے اموال کھانے کی ممانعت سے یہ ہے کہ ان کی مصلحت کو ضائع نہ کیا جائے، اور جب خرچ شامل رکھنے میں ان کی مصلحت ہے تو) ان کی مصلحت کی رعایت رکھنا (علٰحدہ خرچ رکھنے سے جو خلافِ مصلحت ہے) زیادہ بہتر ہے اور تم ان کے ساتھ خرچ شامل رکھو تو (کچھ ڈر کی بات نہیں کیونکہ) وہ (بچے) تمہارے (دینی) بھائی ہیں (اور بھائی بھائی شامل رہا ہی کرتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ مصلحت کے ضائع کرنے والے کو اور مصلحت کی رعایت رکھنے والے کو (الگ الگ) جانتے ہیں (اس لئے کھانے پینے میں اشتراک ایسا نہ ہونا چاہئے جس میں یتیم کی مصلحت ضائع ہوجائے اور بلا علم و بلا قصد کچھ کمی بیشی ہو بھی جائے تو چونکہ اللہ تعالیٰ کو اس کی

نیک نیتی معلوم ہے اس لئے اس پر مواخذہ نہ ہوگا) اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو (اس معاملہ میں سخت قانون مقرر کرکے) تم کو مصیبت میں ڈال دیتے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ زبردست ہیں (مگر قانون سہل اس لئے مقرر فرمایا کہ وہ) حکمت والے (بھی) ہیں (ایسا حکم نہیں دیتے جو نہ ہو سکے)

اٹھارہواں حکم مناکحتِ کفار اور نکاح مت کرو کافر عورتوں کے ساتھ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جاویں اور مسلمان عورت (چاہے) لونڈی (کیوں نہ ہو وہ ہزار درجہ) بہتر ہے کافر عورت سے (چاہے وہ آزاد بی بی ہی کیوں نہ ہو) گو وہ (کافر عورت بوجہ مال یا جمال کے) تم کو اچھی معلوم ہو (مگر پھر بھی واقع میں مسلمان عورت ہی اس سے اچھی ہے) اور (اسی طرح اپنے اختیار کی) عورتوں کو کافر مردوں کے نکاح میں مت دو جب تک وہ مسلمان نہ ہو جاویں اور مسلمان مرد (چاہے) غلام (ہی کیوں نہ ہو وہ ہزار درجہ) بہتر ہے کافر مرد سے (چاہے وہ آزاد ہی کیوں نہ ہو) گو وہ (کافر مرد بوجہ مال یا جاہ کے) تم کو اچھا ہی معلوم ہو (مگر پھر بھی واقع میں مسلمان ہی اس سے اچھا ہے، اور وجہ ان کافروں کے بُرا ہونے کی، اور وہی اصل سبب ان سے ممانعتِ نکاح کا ہے، یہ ہے کہ) یہ (کافر) لوگ دوزخ (میں جانے) کی تحریک دیتے ہیں (کیونکہ کفر کی تحریک کرتے ہیں اور اس کا انجام جہنم ہے) اور اللہ تعالیٰ جنت اور مغفرت (کے حاصل کرنے) کی تحریک کرتے ہیں اپنے حکم سے (اور اس حکم کا ظہور اس طرح ہوا کہ کفار کے متعلق یہ حکم صادر فرما دیا کہ ان سے نکاح نہ کیا جائے، تاکہ اُن کی تحریک کے اثر سے پوری حفاظت رہ سکے، اور اس سے محفوظ رہ کر جنت اور مغفرت حاصل ہو جائے) اور اللہ تعالیٰ اس واسطے اپنے احکام بتلا دیتے ہیں تاکہ وہ لوگ نصیحت پر عمل کریں (اور مستحق جنت و مغفرت ہو جاویں)

فوائد از بیان القرآن مسئلہ: جو قوم اپنی وضع اور طرز سے اہل کتاب سمجھے جاتے ہوں، لیکن عقائد کی تحقیق کرنے سے کتابی ثابت نہ ہوں اس قوم کی عورتوں سے نکاح درست نہیں، جیسے آجکل عموماً انگریزوں کو عام لوگ عیسائی سمجھتے ہیں، حالانکہ تحقیق سے اُن کے بعض عقائد بالکل ملحدانہ ثابت ہوئے کہ نہ خدا کے قائل نہ عیسیٰ علیہ السلام کی نبوّت کے معتقد نہ انجیل کی نسبت آسمانی کتاب ہونے کا اعتقاد، سو ایسے لوگ عیسائی نہیں، ایسی جماعت میں کی جو عورت ہو اس سے نکاح درست نہیں، لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں کہ بلا تحقیق یورپ کی عورتیں بیاہ لاتے ہیں۔

مسئلہ: اس طرح جو مرد ظاہری حالت سے مسلمان سمجھا جائے لیکن عقائد اس کے کفر تک پہنچے ہوں اس سے مسلمان عورت کا نکاح درست نہیں، اور اگر نکاح ہو جانے کے بعد ایسے عقائد خراب ہو جاویں تو نکاح ٹوٹ جاتا ہے، جیسے آجکل بہت سے آدمی اپنے مذہب سے ناواقف سائنس کے اثر سے اپنے عقائد تباہ کر لیتے ہیں، لڑکی والوں پر واجب ہے کہ پیام آنے کے وقت اوّل عقائد کی تحقیق کر لیا کریں تب زبان دیں۔

معارف و مسائل

مُسلم و کافر کا باہمی ازدواج ممنوع ہے

آیاتِ مذکورہ میں ایک اہم مسئلہ یہ بیان فرمایا گیا کہ مسلمان مردوں کا نکاح کافر عورتوں سے اور کافر مَردوں کا نکاح مسلمان عورتوں سے جائز نہیں وجہ یہ ہے کہ کافر مرد اور عورتیں انسان کو جہنم کی طرف لے جانیکے سبب بنتے ہیں، کیونکہ ازدواجی تعلقات، آپس کی محبت و مودّت اور یگانگت کو چاہتے ہیں، اور بغیر اس کے ان تعلقات کا اصلی مقصد پورا نہیں ہوتا، اور مشرکین کے ساتھ اس قسم کے تعلقاتِ قریبہ محبت و مودّت کا لازمی اثر یہ ہے کہ اُن کے دل میں بھی کفر و شرک کی طرف میلان پیدا ہو یا کم از کم کفر و شرک سے نفرت اُن کے دلوں سے نکل جائے، اور اس کا انجام یہ ہے کہ یہ بھی کفر و شرک میں مبتلا ہو جائیں، اور اس کا نتیجہ جہنم ہے، اس لئے فرمایا گیا کہ یہ لوگ جہنم کی طرف دعوت دیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ انسان کو جنت اور مغفرت کی طرف دعوت دیتا ہے، اور صاف صاف اپنے احکام بیان فرما دیتا ہے، تاکہ لوگ نصیحت پر عمل کریں، اس جگہ چند باتیں قابلِ غور ہیں:۔

اول یہ کہ اس آیت میں لفظ مشرک سے اگر مطلقاً غیر مسلم مراد ہوں تو قرآن کریم کی ایک دوسری آیت کی بنا پر اہلِ کتاب کی غیر مسلم عورتیں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ (۵:۵) اور اگر مشرک سے خاص وہ غیر مسلم مراد ہیں جو اہلِ کتاب نہیں تو یہ آیت اپنی جگہ عام ہے تمام اُن غیر مسلموں کو جو کسی پیغمبر اور آسمانی کتاب پر ایمان نہیں رکھتے۔

دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ مسلم و کافر کے درمیان ازدواجی تعلقات کو حرام قرار دینے کی جو وجہ قرآن کریم میں بیان فرمائی گئی ہے کہ ان کے ساتھ ایسے تعلقات قریبہ کفر و شرک میں مبتلا ہو جانے کا سبب بن سکتے ہیں، یہ بات تو بظاہر تمام غیر مسلم فرقوں میں مساوی ہے، پھر اہلِ کتاب کی عورتوں کو مستثنیٰ کرنے کی کیا وجہ ہے۔

جواب ظاہر ہے کہ اہلِ کتاب کا اختلاف اسلام کے ساتھ بہ نسبت دوسرے غیر مسلموں کے کم اور ہلکا ہے، کیونکہ عقائدِ اسلام کے تین عمود ہیں، توحید، آخرت، رسالت، ان میں سے عقیدۂ آخرت میں تو اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ بھی اپنے اصل مذہب کے اعتبار سے مسلمانوں کے ساتھ متفق ہیں، اسی طرح خدا کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا خود ان کے اصل مذہب میں بھی کفر ہے، یہ دوسری بات ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت و محبت کے غلو میں شرک تک جا پہنچے۔

اب بنیادی اختلاف صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول نہیں

مانتے، اور اسلام میں یہ عقیدہ بھی بنیادی عقیدہ ہے، اس کے بغیر کوئی انسان مؤمن نہیں ہو سکتا بہر حال دوسرے غیر مسلم فرقوں کی نسبت سے اہلِ کتاب کا اختلاف ہلکا اور کم ہے، اس لئے اس میں مفسدہ کا خطرہ زیادہ نہیں۔

تیسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ جب اہلِ کتاب کا اختلاف ہلکا قرار دے کر ان کی عورتوں سے نکاح مسلمان کا جائز ہوا تو اس کے برعکس مسلمان عورتوں کا نکاح بھی غیر مسلم اہلِ کتاب سے جائز ہو جانا چاہئے، مگر ذرا غور کرنے سے فرق واضح ہو جاتا ہے کہ عورت کچھ فطرۃً ضعیف ہے، اور پھر شوہر اس پر حاکم اور نگراں بنایا گیا ہے، اس کے عقائد و نظریات سے عورت کا متأثر ہو جانا مستبعد نہیں، اس لئے اگر مسلمان عورت غیر مسلم کتابی کے نکاح میں رہے تو اس کے عقائد خراب ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے، بخلاف اس کے کہ غیر مسلم کتابی عورت مسلمان کے نکاح میں رہے تو اس کے خیالات کا اثر شوہر پر پڑنا اصولاً مستبعد ہے، کوئی بے اصول اور افراط کا شکار ہو جائے یہ اس کا اپنا قصور ہے۔

چوتھی بات قابلِ غور یہ ہے کہ ازدواجی تعلقات میں جو کچھ اثر ہوتا ہے وہ طرفین پر یکساں ہوتا ہے، اس لئے جیسے یہ اندیشہ ہے کہ مسلمان کے عقائد غیر مسلم سے متاثر ہو جائیں اسی طرح یہ بھی تو احتمال ہے کہ معاملہ برعکس ہو، غیر مسلم کے عقائد مسلمان سے متأثر ہوں اور وہ بھی اسلام قبول کر لے تو اس کا مقتضا یہ ہے کہ مسلم و غیر مسلم کے ازدواجی تعلقات کو ممنوع نہ کیا جائے۔

لیکن یہاں حکمت کی بات یہ ہے کہ جب کسی چیز میں ایک نفع کی امید بھی ہو اور کسی ضرر کا خطرہ بھی ہو تو عقلِ سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ ضرر سے بچنے کا اہتمام نفع کی فکر سے زیادہ ضروری ہے، فارسی کا ایک حکیمانہ مقولہ مشہور ہے کہ "عقلمند تریاق بیقین و زہر بگمان نخورد" اس لئے اس نفع کی امید کو نظر انداز کیا گیا کہ شاید وہ غیر مسلم متاثر ہو کر اسلام قبول کر لے، اہتمام اس کا کیا گیا کہ مسلمان متاثر ہو کر کفر میں مبتلا نہ ہو جائے۔

پانچویں بات قابلِ غور یہ ہے کہ اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے مسلمان مردوں کو نکاح کی اجازت کے بھی معنی یہ ہیں کہ اگر نکاح کر لیا جائے تو نکاح صحیح ہو جائے گا، اولاد ثابت النسب ہوگی، لیکن روایاتِ حدیث اس پر شاہد ہیں کہ یہ نکاح بھی پسندیدہ نہیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کو اپنے نکاح کے لئے دیندار صالح عورت تلاش کرنا چاہئے، تاکہ خود اس کے لئے بھی دین میں معین ثابت ہو، اور اس کی اولاد کو بھی دیندار ہونے کا موقع میسّر آئے، اور جب غیر متدین مسلمان عورت سے نکاح پسند نہیں کیا گیا تو کسی غیر مسلم سے کیسے پسند کیا جاتا، یہی وجہ ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو جب خبر پہنچی کہ عراق و شام کے مسلمانوں میں کچھ ایسے ازدواج

کی کثرت ہونے لگی تو بذریعہ فرمان اُن کو اس سے روک دیا گیا، اور اس پر توجہ دلائی گئی کہ یہ ازدواجی تعلق دیانۃً بھی مسلم گھرانوں کے لئے خرابی کا سبب ہے، اور سیاسۃً بھی (کتاب الآثار للامام محمدؒ) اور آج کے غیر مسلم اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ اور ان کے سیاسی مکر و فریب اور سیاسی شادیاں اور مسلم گھرانوں میں داخل ہو کر ان کو اپنی طرف مائل کرنا اور ان کے راز حاصل کرنا وغیرہ جس کا اقرار خود بعض مسیحی مصنفین کی کتابوں میں میجر جنرل اکبر کی کتاب "حدیث دفاع" میں اس کی کچھ تفصیلات حوالوں کے ساتھ مذکور ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاروق اعظمؓ کی دُور بین نظریں ان واقعات کو دیکھ رہی تھیں خصوصاً اس زمانہ کے یورپ کے اکثر وہ لوگ جو عیسائی یا یہودی کہلائے جاتے ہیں، اور مردم شماری کے رجسٹروں میں ان کی نسبت عیسائی یا یہودی لکھی جاتی ہے اگر ان کے حالات کی تحقیق کی جائے تو ان میں بکثرت ایسے لوگ ملیں گے جن کو عیسائیت اور یہودیت سے کوئی تعلق نہیں وہ بالکل ملحد بے دین ہیں، نہ عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں نہ انجیل کو، نہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان ہے نہ تورات پر نہ خدا تعالیٰ پر نہ آخرت پر، ظاہر ہے کہ حلتِ نکاح کا قرآنی حکم ایسے لوگوں کو شامل نہیں، ان کی عورتوں سے نکاح قطعاً حرام ہے، ایسے لوگ ظاہر ہے کہ آیتِ قرآن وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کے استثناء میں داخل نہیں ہوتے، غیر مسلموں کی طرح ان کی عورتوں کے ساتھ نکاح بھی قطعاً حرام ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي

اور تجھ سے پوچھتے ہیں حکم حیض کا کہدے وہ گندگی ہے سو تم الگ رہو عورتوں سے حیض

الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْھُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْھُنَّ

کے وقت اور نزدیک نہ ہو ان کے جب تک پاک نہ ہو ویں پھر جب خوب پاک ہو جاویں تو جاؤ ان کے

مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّـوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ

پاس جہاں سے حکم دیا تم کو اللہ نے بیشک اللہ کو پسند آتے ہیں توبہ کرنے والے اور پسند آتے ہیں

الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝۲۲۲ نِسَاۗؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى

گندگی سے بچنے والے، تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں سو جاؤ اپنی کھیتی میں جہاں سے

شِئْتُمْ ۡ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ

چاہو اور آگے کی تدبیر کرو اپنے واسطے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان رکھو کہ تم کو

مُّلٰقُوۡهُ ؕ وَبَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۲۲۳﴾

اس سے ملنا ہے اور خوش خبری سُنا ایمان والوں کو

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۱۹، حیض میں جماع کی حرمت اور پاکی کی شرائط

وَيَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡمَحِيۡضِ ؕ (الیٰ قولہ) وَبَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝ اور لوگ آپؐ سے حیض کی حالت میں صحبت وغیرہ کرنے کا حکم پوچھتے ہیں، آپؐ فرما دیجئے کہ وہ (حیض) گندگی کی چیز ہے، تو حالتِ حیض میں عورتوں (کے ساتھ صحبت کرنے) سے علٰحدہ رہا کرو اور (اس حالت میں) ان سے قربت مت کرو جب تک وہ (حیض سے) پاک نہ ہو جاویں پھر جب وہ (عورتیں) اچھی طرح پاک ہو جاویں (کہ ناپاکی کا شک و شبہ نہ رہے) تو ان کے پاس آؤ جاؤ (یعنی ان سے صحبت کرو) جس جگہ سے تم کو خدا تعالیٰ نے اجازت دی ہے (یعنی آگے سے) یقیناً اللہ تعالیٰ محبت رکھتے ہیں توبہ کرنے والوں سے (مثلاً اتفاقاً یا بے احتیاطی سے حالتِ حیض میں صحبت کر بیٹھا پھر متنبہ ہو کر توبہ کرلی) اور محبت رکھتے ہیں پاک صاف رہنے والوں سے (جو حالتِ حیض میں صحبت کرنے سے اور دوسرے منہیات سے بچتے ہیں، اور حالتِ پاکی میں اجازتِ صحبت کی دینا پھر اس قید سے اجازت دینا کہ آگے کے موقع میں صحبت ہو، اس لئے ہے کہ) تمھاری بیبیاں تمھارے لئے (بمنزلہ) کھیت (کے) ہیں (جس میں نطفہ بجائے تخم کے اور بچہ بجائے پیداوار کے ہے) سو اپنے کھیت میں جس طرف سے چاہو آؤ (اور جس طرح کھیتوں میں اجازت ہے اسی طرح بیبیوں کے پاس پاکی کی حالت میں ہر طرف سے آنے کی اجازت ہے خواہ کروٹ سے ہو یا پیچھے سے یا آگے بیٹھ کر ہو یا اوپر یا نیچے لیٹ کر ہو، یا جس ہیئت سے ہو، مگر آنا ہو ہر حال میں کھیت کے اندر کہ وہ خاص آگے کا موقع ہے، کیونکہ پیچھے کا موقع کھیت کے مشابہ نہیں، اس میں صحبت نہ ہو، اور ان لذات میں ایسے مشغول مت ہو جاؤ کہ آخرت ہی کو بھول جاؤ، بلکہ آئندہ کے واسطے اپنے لئے کچھ (اعمالِ صالحہ) کرتے رہو اور اللہ تعالیٰ سے (ہر حال میں) ڈرتے رہو، اور یہ یقین رکھو کہ بے شک تم اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے والے ہو اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسے) ایمان داروں کو (جو نیک کام کریں، خدا سے ڈریں، خدا تعالیٰ کے سامنے جانے کا یقین رکھیں) خوشی کی خبر سُنا دیجئے (کہ ان کو آخرت میں ہر طرح کی نعمتیں ملیں گی)۔

وَلَا تَجۡعَلُوا اللّٰهَ عُرۡضَةً لِّاَيۡمَانِكُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡا وَتَتَّقُوۡا وَتُصۡلِحُوۡا

اور مت بناؤ اللہ کے نام کو نشانہ اپنی قسمیں کھانے کے لئے کہ سلوک کرنے سے اور پرہیزگاری سے اور لوگوں

بَيۡنَ النَّاسِ‌ؕ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۲۲۴﴾

میں صلح کرانے سے بچ جاؤ اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر۲، نیک کام نہ کرنے کی قسم کی ممانعت

اور اللہ کے نام کو اپنی قسموں کے ذریعے سے ان امور کا حجاب مت بناؤ کہ تم نیکی کے اور تقویٰ کے اور اصلاح فیما بین خلق کے کام کرو (یعنی اللہ کے نام کی یہ قسم نہ کھاؤ کہ ہم یہ نیک کام نہ کریں گے) اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتے جانتے ہیں (تو زبان سنبھال کر بات کرو، اور دل میں برے خیالات مت لاؤ)

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغۡوِ فِىۡۤ اَيۡمَانِكُمۡ وَلٰـكِنۡ يُّؤَاخِذُكُمۡ

نہیں پکڑتا تم کو اللہ بیہودہ قسموں پر تمہاری، لیکن پکڑتا ہے تم کو ان قسموں پر

بِمَا كَسَبَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ حَلِيۡمٌ ﴿۲۲۵﴾

جن کا قصد کیا تمھارے دلوں نے اور اللہ بخشنے والا تحمل کرنے والا ہے

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر۱۲، جھوٹی قسمیں کھانیکا حکم

اللہ تعالیٰ تم پر آخرت میں دارو گیر نہ فرماویں گے تمہاری قسموں میں ایسی بیہودہ قسم پر (جس میں بلا قصد جھوٹ بولا گیا) لیکن دارو گیر فرماویں گے اس جھوٹی قسم پر جس میں تمھارے دلوں نے (جھوٹ بولنے کا) ارادہ کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ غفور ہیں (کہ ایسی بیہودہ قسم پر دارو گیر نہ فرمائی) حلیم ہیں (کہ قصداً جھوٹی قسم کھانے کی سزا میں آخرت تک کی مہلت دی)

لِلَّذِيۡنَ يُؤۡلُوۡنَ مِنۡ نِّسَآٮِٕهِمۡ تَرَبُّصُ اَرۡبَعَةِ اَشۡهُرٍ‌ۚ فَاِنۡ

جو لوگ قسم کھالیتے ہیں اپنی عورتوں کے پاس جانے سے اُن کے لئے مہلت ہے چار مہینے کی پھر اگر

فَآءُوۡ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنۡ عَزَمُوا الطَّلَاقَ

باہم مل گئے تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے، اور اگر ٹھہرالیا چھوڑ دینے کو

۳۷

فَإِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۲۷﴾

تو بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۲۲، ایلاء کا حکم لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ (الیٰ قولہ) سَمِيعٌ عَلِيمٌ یعنی جو لوگ (بلا قید مدت یا چار ماہ یا زائد مدت کے لئے) قسم کھا بیٹھتے ہیں اپنی بیبیوں کے پاس جانے سے ان کیلئے چار مہینے تک کی مہلت ہے سو اگر (ان چار مہینے کے اندر) یہ لوگ (اپنی قسم کو توڑکر عورت کی طرف) رجوع کرلیں (تب تو نکاح باقی رہے گا اور) اللہ تعالیٰ (ایسی قسم کو توڑنے کا گناہ کفارہ سے) معاف کردیں گے (اور چونکہ اب بی بی کے حقوق ادا کرنے لگا اس پر) رحمت فرمادیں گے، اور اگر بالکل چھوڑ ہی دینے کا پختہ ارادہ کرلیا ہے (اور اس لئے چار ماہ کے اندر قسم توڑکر رجوع نہیں کیا) تو (چار ماہ گذرتے ہی قطعی طلاق پڑجاویں گی اور) اللہ تعالیٰ (ان کی قسم کو بھی) سنتے ہیں (اور ان کے اس پختہ ارادے کو بھی) جانتے ہیں (اس لئے اس کے متعلق حکم مناسب ارشاد فرمایا)۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوٓءٍ ۚ وَلَا يَحِلُّ

اور طلاق والی عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو تین حیض تک اور ان کو حلال

لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيٓ أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ

نہیں کہ چھپا رکھیں جو پیدا کیا اللہ نے ان کے پیٹ میں اگر وہ ایمان رکھتی ہیں

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذٰلِكَ إِنْ أَرَادُوٓا

اللہ پر اور پچھلے دن پر اور اُن کے خاوند حق رکھتے ہیں ان کے لوٹا لینے کا اس مدت میں اگر چاہیں

إِصْلَاحًا ۚ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۖ وَلِلرِّجَالِ

سلوک سے رہنا، اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ مردوں کا اُن پر حق ہے دستور کے موافق اور مردوں کو

۲۸ ع ۷ ۱۲ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۲۸﴾ ع

عورتوں پر فضیلت ہے، اور اللہ زبردست ہے تدبیر والا۔

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۲۳ و ۲۴، مطلقہ کی عدّت اور مدّتِ رجعت کا بیان وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ (الیٰ قولہ) إِنْ أَرَادُوٓا إِصْلَاحًا اور طلاق دی ہوئی عورتیں جن میں اتنی صفتیں ہوں، خاوند نے اُن سے صحبت یا خلوت صحیحہ کی ہو،

ان کو حیض آتا ہو، آزاد ہوں، یعنی شرعی قاعدہ سے لونڈی نہ ہوں) اپنے آپ کو (نکاح سے) روکے رکھیں، تین حیض (ختم ہونے) تک (اور اس کو عدّت کہتے ہیں) اور ان عورتوں کو یہ بات حلال نہیں کہ خدا تعالیٰ نے جو کچھ ان کے رحم (بچہ دان) میں پیدا کیا ہو (خواہ حمل ہو یا حیض) اس کو پوشیدہ کریں (کیونکہ اس کے پوشیدہ کرنے سے عدّت کا حساب غلط ہو جاوے گا) اگر وہ عورتیں اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخرت پر یقین رکھتی ہیں (بوجہ اس کے کہ اس یقین کا مقتضایہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈریں کہ قیامت میں نافرمانی پر سزا نہ ہو جاوے) اور ان عورتوں کے شوہر (جب کہ اُن کو طلاق رجعی ملی ہو جس کا بیان آگے آئے گا) ان کے (بلا تجدید نکاح) پھر لوٹا لینے کا حق رکھتے ہیں، اس عدّت کے اندر (اور اس لوٹا لینے کو رجعت کہتے ہیں) بشرطیکہ (رجعت کرنے سے) اصلاح کا قصد رکھتے ہوں (ورنہ تنگ کرنے کے لئے رجعت کرنا لاحاصل ہے، گو رجعت تو ہو ہی جاوے گی، اور (یہ حکم اصلاح کا اس لئے کیا گیا کہ) عورتوں کے حقوق ہیں (مردوں پر) جو کہ (نفسِ وجوب میں) مثل انہی کے حقوق کے ہیں جو اُن عورتوں پر ہیں (مردوں کے کہ ان کو) قاعدہ (شرعی) کے موافق (ادا کیا جاوے) اور (اتنی بات ضرور ہے کہ) مَردوں کا اُن کے مقابلہ میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے (اس لئے ان کے حقوق کی نوعیت عورتوں کے حقوق کی نوعیت سے بڑھی ہوئی ہے) اور اللہ تعالیٰ زبردست (حاکم) ہیں، (اور) حکیم (بھی) ہیں۔

مسائل متعلقہ آیت از بیان القرآن

(۱) اگر غلبۂ شہوت سے حالتِ حیض میں صحبت ہو گئی، تو خوب توبہ کرنا واجب ہے اور کچھ خیر خیرات بھی دیدے تو زیادہ بہتر ہے۔

(۲) پیچھے کے موقع میں اپنی بی بی سے بھی صحبت کرنا حرام ہے۔

(۳) لغو قسم کے دو معنی ہیں، ایک تو یہ کہ کسی گذری ہوئی بات پر جھوٹی قسم بلا ارادہ نکل گئی، یا نکلی تو ارادے سے، مگر اس کو اپنے گمان میں صحیح سمجھتا ہے جیسے اپنے علم و گمان کے مطابق قسم کھا بیٹھا کہ زید آگیا ہے، اور واقع میں وہ نہ آیا تھا، یا آئندہ بات پر اس طرح قسم نکل گئی کہ کہنا چاہتا تھا کچھ اور بے ارادہ مُنہ سے قسم نکل گئی اس میں گناہ نہیں ہوتا، اور اس کو اسی واسطے لغو کہتے ہیں، آخرت میں اس پر مؤاخذہ نہیں ہوگا، اور اس کے مقابلہ میں جس پر مؤاخذہ ہونے کا ذکر فرمایا ہے یہ وہ قسم ہے جو قصداً جھوٹی سمجھ کر کھائی ہو اس کو غموس کہتے ہیں، اس میں گناہ ہوتا ہے، مگر امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کفارہ نہیں آتا، اور لغو بالمعنے المذکور میں بدرجہ اَولیٰ کفارہ نہیں، اس آیت میں انہی دونوں کا بیان ہے، جن میں کفارہ نہیں۔

دوسرے معنی لغو کے یہ ہیں جس پر کفارہ نہ ہو اور اس کو لغو اس لئے کہیں گے کہ مؤاخذہ دنیوی یعنی کفارہ اس پر نہیں آتا، اس معنی کے لحاظ سے لفظ لغو غموس کو بھی شامل ہے، کہ اس میں

اگرچہ گناہ ہوتا ہے لیکن کفارہ نہیں آتا، اس کے مقابلہ میں وہ قسم جس پر کفارہ بھی آتا ہے منعقدہ کہلاتی ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ قصداً یوں قسم کھائے کہ میں فلاں فعل کروں گا، یا فلاں کام نہ کروں گا اس میں خلاف کرنے سے کفارہ لازم آتا ہے۔

(۴) اگر کوئی قسم کھالے کہ اپنی بیوی سے صحبت نہ کروں گا اس کی چار صورتیں ہیں:

ایک یہ کہ کوئی مدت معین نہ کرے، دوم یہ کہ چار مہینے کی مدت کی قید لگادے، سوم یہ کہ چار ماہ سے زیادہ کی مدت کی قید لگادے، چہارم یہ کہ چار ماہ سے کم کی مدت کا نام لے، پس صورت اوّل، دوم اور سوم کو شرع میں ایلاء کہتے ہیں، اور اس کا حکم یہ ہے کہ اگر چار ماہ کے اندر اپنی قسم توڑ ڈالے اور بیوی کے پاس چلا آوے تو قسم کا کفارہ دے اور نکاح باقی ہے، اور اگر چار ماہ گذر گئے اور قسم نہ توڑی، تو اس عورت پر قطعی طلاق پڑ گئی، یعنی بلا نکاح رجوع کرنا درست نہیں رہا، البتہ اگر دونوں رضامندی سے پھر نکاح کرلیں تو درست ہے، حلالہ کی ضرورت نہ ہوگی، اور چوتھی صورت کا حکم یہ ہے کہ اگر قسم توڑے تو کفارہ لازم ہوگا، اور اگر قسم پوری کرلی جب بھی نکاح باقی ہے، (بیان القرآن)

معارف و مسائل

مرد و عورت کے فرق اور میاں بیوی کے باہمی حقوق و درجات پر ایک جامع آیت

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ الآیۃ، یہ آیت عورتوں اور مردوں کے باہمی حقوق و فرائض اور ان کے درجات کے بیان میں ایک شرعی ضابطہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد کئی رکوع تک اسی ضابطہ کی اہم جزئیات کا بیان ہوا ہے۔

اسلام میں عورت کا موقف

اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے عورت کے اس موقف کی کچھ تشریح کردی جائے جو اسلام نے اس کو عطا کیا ہے، جس کو سمجھ لینے کے بعد یقینی طور پر اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ایک عادلانہ اور معتدلانہ نظام کا مقتضیٰ یہی تھا، اور یہی وہ مقام ہے جس سے اونچ نیچ یا انحراف انسان کے دین و دنیا کے لئے عظیم خطرہ بن جاتا ہے۔

غور کیا جائے تو دنیا میں دو چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو اس عالم کی بقاء اور تعمیر و ترقی میں عمود کا درجہ رکھتی ہیں، ایک عورت، دوسرے دولت، لیکن تصویر کا دوسرا رُخ دیکھا جائے تو یہی دونوں چیزیں دنیا میں فساد و خوں ریزی اور طرح طرح کے فتنوں کا سبب بھی ہیں، اور غور کرنے سے اس نتیجہ پر پہنچنا کچھ دشوار نہیں کہ یہ دونوں چیزیں اپنی اصل میں دنیا کی تعمیر و ترقی اور اس کی رونق کا ذریعہ ہیں، لیکن جب کہیں ان کو اپنے اصلی مقام اور موقف سے اِدھر اُدھر کردیا جاتا ہے تو یہی

چیزیں دنیا میں سب سے بڑا زلزلہ بھی بن جاتی ہیں۔

قرآن نے انسان کو نظامِ زندگی دیا ہے اس میں ان دونوں چیزوں کو اپنے اپنے صحیح مقام پر ایسا رکھا گیا ہے کہ اُن کے فوائد و ثمرات زیادہ سے زیادہ حاصل ہوں، اور فتنہ و فساد کا نام نہ رہے، دولت کا صحیح مقام، اس کے حاصل کرنے کے ذرائع اور خرچ کرنے کے طریقے اور تقسیمِ دولت کا عادلانہ نظام یہ ایک مستقل علم ہے جس کو "اسلام کا معاشی نظام" کہا جا سکتا ہے، اس کا بیان انشاء اللہ کسی اور موقع پر ہوگا، احقر کا مطبوعہ رسالہ "تقسیمِ دولت" بھی ضروری اشارات کا کام دے سکتا ہے۔

اس وقت عورت اور اس کے حقوق و فرائض کا ذکر ہے، اس کے متعلق آیتِ مذکورہ میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جس طرح عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں جن کی ادائیگی ضروری ہے اسی طرح مردوں پر عورتوں کے حقوق ہیں جن کا ادا کرنا ضروری ہے، ہاں اتنا فرق ضروری ہے کہ مردوں کا درجہ عورتوں سے بڑھا ہوا ہے، اور تقریباً یہی مضمون سورۃ نساء کی آیت میں اس طرح آیا ہے:۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (۴: ۳۴)	"یعنی مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس واسطے کہ بڑائی اللہ نے دی ایک کو ایک پر اور اس واسطے کہ خرچ کئے انھوں نے اپنے مال"

اسلام سے پہلے معاشرہ میں عورت کا درجہ

اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں تمام دنیا کی اقوام میں جاری تھا کہ عورت کی حیثیت گھریلو استعمال کی اشیاء سے زیادہ نہ تھی، چوپاؤں کی طرح اس کی خرید و فروخت ہوتی تھی، اس کو اپنی شادی بیاہ میں کسی قسم کا کوئی اختیار نہ تھا، اس کے اولیاء جس کے حوالے کر دیتے وہاں جانا پڑتا تھا، عورت کو اپنے رشتہ داروں کی میراث میں کوئی حصہ نہ ملتا تھا بلکہ وہ خود گھریلو اشیاء کی طرح مالِ وراثت سمجھی جاتی تھی، وہ مَردوں کی ملکیت تصوّر کی جاتی تھی، اس کی ملکیت کسی چیز پر نہ تھی، اور جو چیزیں عورت کی ملکیت کہلاتی تھیں ان میں اس کو مرد کی اجازت کے بغیر کسی قسم کے تصرّف کا کوئی اختیار نہ تھا ہاں اس کے شوہر کو ہر قسم کا اختیار تھا کہ اس کے مال کو جہاں چاہے اور جس طرح چاہے خرچ کر ڈالے، اس کو پوچھنے کا بھی کوئی حق نہ تھا، یہاں تک کہ یورپ کے وہ ممالک جو آجکل دنیا کے سب سے زیادہ متمدّن ملک سمجھے جاتے ہیں ان میں بعض لوگ اس حد کو پہنچے ہوئے تھے کہ عورت کے انسان ہونے کو بھی تسلیم نہ کرتے تھے۔

عورت کے لئے دین و مذہب میں بھی کوئی حصّہ نہ تھا نہ اس کو عبادت کے قابل سمجھا جاتا تھا نہ جنّت کے، رومہ کی بعض مجلسوں میں باہمی مشورہ سے یہ طے کیا گیا تھا کہ وہ ایک ناپاک جانور ہے جس میں رُوح نہیں، عام طور پر باپ کے لئے لڑکی کا قتل بلکہ زندہ درگور کر دینا جائز سمجھا جاتا تھا،

بلکہ یہ عمل باپ کے لئے عزت کی نشانی اور شرافت کا معیار تصوّر کیا جاتا تھا، بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ عورت کو کوئی بھی قتل کردے نہ تو اس پر قصاص واجب ہے نہ خوں بہا، اور اگر شوہر مرجائے تو بیوی کو بھی اس کی لاش کے ساتھ جلا کر سَتی کردیا جاتا تھا، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بعد اور آپؐ کی نبوّت سے پہلے ۵۸۶ء میں فرانس نے عورت پر یہ احسان کیا کہ بہت سے اختلافات کے بعد یہ قرارداد پاس کی کہ عورت ہے تو انسان مگر وہ صرف مرد کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

الغرض پوری دنیا اور اس میں بسنے والے تمام اقوام و مذاہب نے عورت کے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہوا تھا کہ جس کو سُن کر بدن کے رُونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، اس بیچاری مخلوق کے لئے نہ کہیں عقل و دانش سے کام لیا جاتا تھا نہ عدل و انصاف سے۔

قربان جایئے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے لائے ہوئے دینِ حق کے جس نے دنیا کی آنکھیں کھولیں، انسان کو انسان کی قدر کرنا سکھلایا، عدل و انصاف کا قانون جاری کیا، عورتوں کے حقوق مَردوں پر ایسے ہی لازم کئے جیسے عورتوں پر مَردوں کے حقوق ہیں، اس کو آزاد و خود مختار بنایا، وہ اپنی جان و مال کی ایسی ہی مالک قرار دی گئی جیسے مرد، کوئی شخص خواہ باپ دادا ہی ہو بالغ عورت کو کسی شخص کے ساتھ نکاح پر مجبور نہیں کرسکتا، اور اگر بلا اس کی اجازت کے نکاح کردیا جائے تو وہ اس کی اجازت پر موقوف رہتا ہے، اگر نامنظور کردے تو باطل ہوجاتا ہے، اس کے اموال میں کسی مرد کو بغیر اس کی رضا و اجازت کے کسی تصرّف کا کوئی حق نہیں، شوہر کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد وہ خود مختار ہے کوئی اس پر جبر نہیں کرسکتا، اپنے رشتہ داروں کی میراث میں اس کو بھی ایسا ہی حصّہ ملتا ہے جیسا لڑکوں کو، اس پر خرچ کرنے اور اس کے راضی رکھنے کو شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام نے ایک عبادت قرار دیا، شوہر اس کے حقوقِ واجبہ ادا نہ کرے تو وہ اسلامی عدالت کے ذریعہ اس کو ادائے حقوق پر ورنہ طلاق پر مجبور کرسکتی ہے۔

عورتوں کو مردوں کی سیادت اور نگرانی سے بالکل آزاد کردینا بھی فسادِ عالم کا بہت بڑا سبب ہے

عورت کو اس کے حقوقِ مناسبہ نہ دینا ظلم و جور اور قساوت و شقاوت تھی جس کو اسلام نے مٹایا ہے، اسی طرح ان کو کھُلے مہار چھوڑ دینا اور مَردوں کی نگرانی و سیادت سے آزاد کردینا، اس کو اپنے گذارے اور معاش کا خود متکفل بنانا بھی اس کی حق تلفی اور بربادی ہے نہ اس کی ساخت اس کی متحمل ہے اور نہ گھریلو کاموں کی ذمہ داری اور اولاد کی تربیت کا عظیم الشان کام جو فطرۃً اس کے سپرد ہے وہ اس کا متحمل ہے۔

علاوہ ازیں مَردوں کی سیادت و نگرانی سے نکل کر عورت پورے انسانی معاشرہ کے لئے خطرۂ عظیم ہے جس سے دنیا میں فساد و خوں ریزی اور طرح طرح کے فتنے پیدا ہونا لازمی اور روزمرّہ کا مشاہدہ

ہے، اس لئے قرآن کریم نے عورتوں کے حقوقِ واجبہ کے بیان کے ساتھ ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ یعنی مردوں کا درجہ عورتوں سے بڑھا ہوا ہے، اور دوسرے لفظوں میں یہ کہ مرد ان کے نگراں اور ذمہ دار ہیں۔

مگر جس طرح اسلام سے پہلے جاہلیتِ اُولیٰ میں اقوامِ عالم سب اس غلطی کا شکار تھیں کہ عورتوں کو ایک گھریلو سامان یا چوپایہ کی حیثیت میں رکھا ہوا تھا، اسی طرح اسلام کے زمانۂ انحطاط میں جاہلیتِ اُخریٰ کا دَور شروع ہوا، اس میں پہلی غلطی کا ردِ عمل اس کے بالمقابل دوسری غلطی کی صورت میں کیا جا رہا ہے، کہ عورتوں پر مَردوں کی اتنی سیادت سے بھی چھٹکارا حاصل کرنے اور کرانے کی سعیِ مسلسل جاری ہے، جس کے نتیجے میں فحش و بے حیائی عام ہوگئی، دنیا جھگڑوں اور فساد کا گھر بن گئی، قتل و خوں ریزی کی اتنی کثرت ہوگئی کہ جاہلیتِ اُولیٰ کو مات دیدی، عرب کا مشہور مقولہ ہے "اَلْجَاهِلُ اِمَّا مُفْرِطٌ اَوْ مُفَرِّطٌ" (یعنی جاہل آدمی کبھی اعتدال پر نہیں رہتا، اگر افراط یعنی حد سے زیادہ کرنے سے باز آجاتا ہے تو کوتاہی اور تقصیر میں مبتلا ہو جاتا ہے)۔

یہی حال اس وقت ابنائے زمانہ کا ہے کہ یا تو عورت کو انسان کہنے اور سمجھنے کے لئے بھی تیار نہ تھے اور آگے بڑھے تو یہاں تک پہنچے کہ مَردوں کی سیادت و نگرانی جو مَردوں، عورتوں اور پوری دنیا کے لئے عین حکمت و مصلحت ہے اس کا جُوا بھی گردن سے اُتارا جا رہا ہے، جس کے نتائج بد روزانہ آنکھوں کے سامنے آرہے ہیں، اور یقین کیجئے کہ جب تک وہ قرآن کے اُس ارشاد کے سامنے نہ جھکیں گے ایسے فتنے روز بڑھتے رہیں گے۔

آج کی حکومتیں دنیا میں قیامِ امن کے لئے روز نئے نئے قانون بناتی ہیں، اس کے لئے نئے نئے ادارے قائم کرتی ہیں، کروڑوں روپیہ اُن پر صرف ہوتا ہے، لیکن فتنے جس چشمے سے پھوٹ رہے ہیں اس کی طرف دھیان نہیں دیتیں، اگر آج کوئی کمیشن اس تحقیق کے لئے بٹھایا جائے کہ فساد و خوں ریزی اور باہمی جنگ و جدل کے اسباب کی تحقیق کرے تو خیال یہ ہے کہ پچاس فی صد سے زائد ایسے جرائم کا سبب عورت اور اس کی بے مہار آزادی نکلے گی، مگر آج کی دنیا میں نفس پرستی کے غلبہ نے بڑے بڑے حکماء کی آنکھوں کو خیرہ کیا ہوا ہے، خواہشاتِ نفسانی کے خلاف کسی مصلحانہ قدغن کو گوارا نہیں کیا جاتا۔

اللہ تعالیٰ ہمارے قلوب کو نورِ ایمان سے منور فرمائیں اور اپنی کتاب اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات پر پورا عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، کہ وہی دنیا و آخرت میں سرمایۂ سعادت ہے۔

مسئلہ : اس آیت کے ضمن میں یہ معلوم ہوا کہ قرآن حکیم نے زوجین کو اُن کے ذمہ عائد ہونے والے فرائض بتلائے کہ مردوں کے ذمہ عورتوں کے حقوق ادا کرنا ایسا ہی فرض ہے جیسے کہ عورتوں پر مردوں کے حقوق کا ادا کرنا فرض ہے اس میں اشارہ ہے کہ ہر فریق کو اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے کے بجائے اپنے فرائض پر نظر رکھنا چاہئے، اور اگر وہ ایسا کرلیں تو مطالبۂ حقوق کا قضیہ ہی درمیان میں نہیں آئے گا، کیونکہ مرد کے فرائض ہی عورت کے حقوق ہیں اور عورت کے فرائض ہی مرد کے حقوق ہیں، جب فرائض ادا ہوگئے تو خود بخود حقوق ادا ہو جائیں گے، آجکل دنیا کے سارے جھگڑے یہاں سے چلتے ہیں کہ ہر شخص اپنے حقوق کا مطالبہ تو سامنے رکھتا ہے مگر اپنے فرائض کی ادائیگی سے غافل ہے۔

اس کا نتیجہ مطالبۂ حقوق کی جنگ ہوتی ہے جو آجکل عام طور پر حکومتوں اور عوام میں، زوجین میں، اور دوسرے اہلِ معاملہ میں چلی ہوئی ہے، قرآنِ کریم کے اس اشارہ نے معاملہ کے رُخ کو یوں بدلا ہے کہ ہر شخص کو چاہئے کہ اپنے فرائض پورا کرنے کا اہتمام کرے، اور اپنے حقوق کے معاملہ میں مساہلت اور عفو و درگذر سے کام لے، اگر اس قرآنی تعلیم پر دنیا میں عمل ہونے لگے تو گھروں اور خاندانوں کے بلکہ ملکوں اور حکومتوں کے بیشتر نزاعات ختم ہو جائیں۔

مرد و عورت میں درجہ کا تفوّق دنیوی معاملات میں ہے، آخرت کی فضیلت میں اس کا کوئی اثر نہیں

دنیا میں نظامِ عالم اور انسانی فطرت اور خود عورتوں کی مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ مردوں کو عورتوں پر ایک قسم کی حاکمیت اور نگرانی کا نہ صرف حق دیا جائے بلکہ اُن پر لازم کیا جائے، اسی کا بیان آیت "اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ" میں آیا ہے، لیکن اس سے سب مردوں کا سب عورتوں سے افضل ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ فضیلت عند اللہ کا تمام تر مدار ایمان اور عمل صالح پر ہے، وہاں درجات کی ترقی و تنزل ایمان اور عمل کے درجات کے مطابق ہوتا ہے، اس لئے امورِ آخرت میں یہ ضروری نہیں کہ مردوں ہی کا درجہ عورتوں سے بلند رہے، یہ بھی ہو سکتا ہے اور حسب تصریح آیات و روایات ایسا ہوگا بھی کہ بعض عورتیں اپنی طاعت و عبادت کے ذریعہ بہت سے مردوں پر فائق ہو جائیں گی، اُن کا درجہ بہت سے مردوں سے بڑھ جائے گا۔

قرآن مجید میں احکامِ شرعیہ اور اعمال کی جزاء و سزا اور ثواب و عذاب کے بیان میں اگرچہ حسبِ تصریح قرآن کریم عورتیں اور مرد بالکل برابر ہیں اور جن احکام میں کچھ فرق ہے، ان کو مستقل طور پر وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے، لیکن عام طور پر خطاب مردوں کو کیا گیا ہے، اور صیغے مذکر کے استعمال کئے گئے ہیں، اور یہ بات صرف قرآن کریم کے ساتھ مخصوص نہیں، عام طور پر حکومتوں کے قوانین میں بھی صیغے مذکر کے استعمال کئے جاتے ہیں، حالانکہ قانون مرد و عورت کے لئے عام ہوتا ہے، اس کا ایک سبب تو وہی فرق ہے جس کا ذکر قرآن کریم کی آیات میں مذکور ہوا ہے، کہ مردوں کو عورتوں

ہر ایک حیثیت سے تفوّق حاصل ہے۔

دوسری بات شاید یہ بھی مضمر ہو کہ مستورات کے ذکر کے لئے بھی ستر ہی بہتر ہے، لیکن قرآن کریم میں جا بجا مردوں کی طرح عورتوں کا ذکر نہ ہونے سے اُن کو خیال پیدا ہوا تو اُم المؤمنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا اظہار کیا تو سورۃ احزاب کی یہ آیت نازل ہوگئی، اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ الآیہ (۳۳: ۳۵) جس میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا مستقل ذکر واضح کر دیا گیا کہ طاعت و عبادت اور اس کی وجہ سے حق تعالیٰ کے قرب و رضا اور درجاتِ جنّت میں عورتوں کا درجہ مَردوں سے کچھ کم نہیں، (یہ روایت نسائی، مسندِ احمد، اور تفسیر ابن جریر وغیرہ میں مفصّل مذکور ہے)

اور تفسیر ابن کثیر میں ایک روایت یہ ہے کہ بعض مسلمان عورتیں ازواجِ مطہراتؓ کے پاس آئیں اور کہا کہ قرآن کریم میں جا بجا مردوں کا تو ذکر ہے عورتوں میں سے ازواجِ مطہراتؓ کا بھی مستقل تذکرہ ہے مگر عام مسلمان عورتوں کا ذکر نہیں، اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

خلاصہ یہ ہے کہ دنیوی نظام میں عورتوں پر مردوں کا ایک گونہ تفوّق اور حاکمیت انکی مصلحت اور حکمت کا تقاضا ہے، ورنہ نیک و بد عمل کی جزاء و سزا اور درجات، کا آخرت میں کوئی فرق نہیں۔

قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ یہی مضمون اور بھی وضاحت سے اس طرح مذکور ہے:-

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّهٗ حَیٰوةً طَیِّبَةً ج (۱۶: ۹۷)

"یعنی جو مرد و عورت نیک عمل کرے اور وہ مؤمن بھی ہو تو ہم اس کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے۔"

اس تمہید کے بعد اصل آیت کے الفاظ پر غور کیجئے، ارشاد فرمایا لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ "یعنی ان کے حقوق مردوں کے ذمہ ہیں جیسے کہ اُن کے ذمہ مردوں کے حقوق ہیں"، اس میں عورتوں کے حقوق کا ذکر مردوں کے حقوق سے پہلے کیا جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مرد تو اپنی قوت اور خداداد تفوّق کی بناء پر عورت سے اپنے حقوق وصول کر ہی لیتا ہے، فکر عورتوں کے حقوق کی ہونی چاہئے، کہ وہ عادۃً اپنے حقوق زبردستی وصول نہیں کر سکتیں۔

دوسرا اشارہ اس میں یہ بھی ہے کہ مردوں کو عورت کے حقوق ادا کرنے میں مسابقت کرنا چاہئے، اور یہاں جو لفظ "مثل" کے ساتھ دونوں کے حقوق کی مثلیت اور مساوات کا ارشاد ہے اس کا یہ مطلب تو ہو ہی نہیں سکتا کہ جس طرح کے کام مرد کرے اسی طرح کے عورت بھی، یا برعکس کیونکہ مرد و عورت میں تقسیم کار اور ہر ایک کے فرائض فطرۃً جُدا جُدا ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ دونوں کے حقوق کی

ادائیگی یکساں طور پر واجب ہے، اور اس میں کوتاہی اور تقصیر کی سزا بھی یکساں ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ قرآن کریم نے ایک مختصر سے جملے میں ایک عظیم الشان دفترِ حقوق و فرائض کو کیسا سمویا ہے، کیونکہ مفہومِ آیت میں عورتوں کے تمام حقوق مردوں پر اور مردوں کے تمام حقوق عورتوں پر داخل اور شامل ہیں (بحر محیط) اس جملے کے آخر میں ایک لفظ بِالْمَعْرُوْفِ اور بڑھا کر آپس میں پیش آنے والے جھگڑوں کا خاتمہ فرما دیا کہ حقوق کی ادائیگی معروف طریقے پر کی جائے، کیونکہ معروف کے معنی یہ ہیں کہ جو شرعاً بھی منکر و ناجائز نہ ہو اور عام عادات اور عرف کے لحاظ سے بھی اس میں کوئی تشدد اور زیادتی نہ ہو، اس کا حاصل یہ ہوا کہ زوجین کے حقوق اور ان کو اذیت سے بچانے کے معاملہ میں خالص ضابطہ پرستی کافی نہیں، بلکہ عام عرف و عادت کے اعتبار سے دیکھا جائے گا کہ اس معاملہ میں دوسرے کو کوئی ایذاء یا ضرر تو نہیں پہنچا، جو چیزیں عرف و عادت کے اعتبار سے ایذاء اور اضرار کی قرار دی جائیں وہ ممنوع و ناجائز ہوں گی، مثلاً بے رخی، بے التفاتی یا ایسے افعال اور حرکات جن سے دوسرے کو ایذاء پہنچے، یہ چیزیں قانونی دفعات میں تو نہیں آسکتیں، مگر بِالْمَعْرُوْفِ کے لفظ نے ان کا احاطہ کر لیا، اس کے بعد فرمایا وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ اس کا مشہور مطلب و مفہوم تو یہی ہے کہ حقوقِ طرفین مساوی ہونے کے باوجود حق تعالیٰ نے مَردوں کو عورتوں پر ایک درجہ کا تفوّق اور حاکمیت عطا فرما دی ہے، اور اس میں بڑی حکمتیں ہیں جن کی طرف آخرِ آیت کے الفاظ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ میں اشارہ فرما دیا ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس جملے کا مطلب یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ مَردوں کو اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے مقابلہ میں بڑا درجہ دیا ہے، اس لئے اُن کو زیادہ تحمّل سے کام لینا چاہئے کہ اگر عورتوں کی طرف سے اُن کے حقوق میں کوئی کوتاہی ہو بھی جائے تو اُن کا درجہ یہ ہے کہ یہ اس کو برداشت کریں، اور صبر سے کام لیں، اور ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کریں (قرطبی)

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ وَلَا

طلاق رجعی ہے دو بار تک اس کے بعد رکھ لینا موافق دستور کے یا چھوڑ دینا بھلی طرح سے اور تم کو

يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ

روا نہیں کہ لے لو کچھ اپنا دیا ہوا عورتوں سے مگر جبکہ خاوند عورت دونوں ڈریں اس

اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ

بات سے کہ قائم نہ رکھ سکیں گے حکم اللہ کا پھر اگر تم لوگ ڈرو اس بات سے کہ وہ دونوں قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کا حکم

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا

تو کچھ گناہ نہیں دونوں پر اس میں کہ عورت بدلہ دیکر چھوٹ جاوے یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں سو ان سے آگے مت بڑھو

وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٢٢٩﴾ فَإِن طَلَّقَهَا

اور جو کوئی بڑھ چلے اللہ کی باندھی ہوئی حدوں سے سو وہی لوگ ہیں ظالم ، پھر اگر اس عورت کو طلاق

فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِن بَعْدُ حَتَّىٰ تَنكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۗ فَإِن طَلَّقَهَا

دی (یعنی تیسری بار) تو اب حلال نہیں اسکو وہ عورت اسکے بعد جبتک کہ نکاح نہ کرے کسی خاوند سے اسکے سوا پھر اگر طلاق دیدے

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَن يَتَرَاجَعَا إِن ظَنَّا أَن يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۗ وَ

دوسرا خاوند تو کچھ گناہ نہیں اُن دونوں پر کہ باہم مل جاویں اگر خیال کریں کہ قائم رکھیں گے اللہ کا حکم اور یہ حدیں

تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿٢٣٠﴾

باندھی ہوئی ہیں اللہ کی بیان فرماتا ہے ان کو واسطے جاننے والوں کے

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۲۵، طلاق رجعی کی تعداد طلاق دو مرتبہ کی ہے پھر (دو مرتبہ طلاق دینے کے بعد دو اختیار ہیں) خواہ (یہ کہ رجعت کر کے عورت کو) قاعدہ کے مطابق رکھ لے، خواہ (یہ کہ رجعت نہ کرے، عدت پوری ہونے دے، اور اس طرح) اچھے طریقے سے اس کو چھوڑ دے۔

حکم نمبر ۲۶، خلع اور تمہارے لئے یہ بات حلال نہیں کہ (بیبیوں کو چھوڑنے کے وقت ان سے) کچھ بھی لو (اگرچہ وہ لیا ہو) اسی (مال) میں سے (کیوں نہ ہو) جو تم نے (ہی مہر میں) ان کو دیا تھا مگر (ایک صورت البتہ حلال ہے وہ) یہ کہ (کوئی) میاں بیوی (ایسے ہوں کہ) دونوں کو خطرہ ہو کر (دربارۂ حقوقِ زوجیت) وہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ ضابطوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے سو اگر تم کو (یعنی میاں بیوی کو) یہ خطرہ ہو کہ وہ دونوں ضوابطِ خداوندی کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہ ہوگا، اس مال کے لینے دینے میں جس کو دے کر عورت اپنی جان چھڑالے، (بشرطیکہ مہر سے زیادہ نہ ہو) یہ سب احکام خدائی ضابطے ہیں، تم ان سے باہر نہ نکلنا اور جو شخص خدائی ضابطوں (کو توڑ کر) باہر نکل جائے تو ایسے لوگ اپنا ہی نقصان کرنے والے ہیں۔

حکم نمبر ۲۷، تین طلاقوں کے بعد حلالہ پھر اگر (دو طلاقوں کے بعد) کوئی (تیسری) طلاق (بھی) دیدے تو پھر وہ عورت اس (تیسری طلاق

دینے کے بعد اس شخص کے لئے حلال نہ ہوگی جب تک وہ اس خاوند کے سوا دوسرے شخص کے ساتھ (عدت کے بعد) نکاح نہ کرے، (اور حقوقِ زوجیت صحبت کے ادا نہ کرے) پھر اگر یہ دوسرا خاوند اس کو طلاق دیدے (اور اس کی عدت بھی گذر جائے) تو ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ دوبارہ آپس میں نکاح کرکے بدستور پھر مل جاویں، بشرطیکہ دونوں کو اپنے اوپر یہ اعتماد ہو کہ آئندہ خداوندی ضابطوں کو قائم رکھیں گے اور یہ خداوندی ضابطے ہیں، حق تعالیٰ انکو بیان فرماتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے جو دانشمند ہیں۔

معارف و مسائل

طلاق و نکاح کے احکام پورے قرآن کریم میں بہت سی آیتوں میں آئے ہیں، مگر یہ چند آیتیں جو یہاں مذکور ہیں طلاق کے معاملہ میں اہم ضابطوں کی حیثیت رکھتی ہیں، ان کو سمجھنے کیلئے پہلے نکاح کی شرعی حیثیت کو جاننا ضروری ہے۔

نکاح و طلاق کی شرعی حیثیت اور حکیمانہ نظام | نکاح کی ایک حیثیت تو ایک باہمی معاملے اور معاہدے کی ہے، جیسے بیع و شراء، اور لین دین کے معاملات ہوتے ہیں، دوسری حیثیت ایک سنت اور عبادت کی ہے، اس پر تو تمام امت کا اتفاق ہے کہ نکاح عام معاملات و معاہدات سے بالاتر ایک حیثیت شرعی عبادت و سنت کی رکھتا ہے، اسی لئے نکاح کے منعقد ہونے کے لئے باجماعِ امت کچھ ایسی شرائط ضروری ہیں جو عام معاملات بیع و شراء میں نہیں ہوتیں۔

اوّل تو یہ کہ ہر عورت سے اور ہر مرد سے نکاح نہیں ہوسکتا، اس میں شریعت کا ایک مستقل قانون ہے جس کے تحت بہت سی عورتوں اور مردوں کا آپس میں نکاح نہیں ہوسکتا۔

دوسرے تمام معاملات و معاہدات کے منعقد اور مکمل ہونے کے لئے کوئی گواہی شرط نہیں، گواہی کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب فریقین میں اختلاف ہوجائے، لیکن نکاح ایسا معاملہ نہیں، یہاں اس کے منعقد ہونے کیلئے بھی گواہوں کا سامنے ہونا شرط ہے، اگر دو مرد و عورت بغیر گواہوں کے آپس میں نکاح کرلیں، اور دونوں میں کوئی فریق کبھی اختلاف و انکار بھی نہ کرے اس وقت بھی شرعاً وہ نکاح باطل کالعدم ہے جب تک گواہوں کے سامنے دونوں کا ایجاب و قبول نہ ہو، اور سنت یہ ہے کہ نکاح اعلانِ عام کے ساتھ کیا جائے، اسی طرح کی اور بہت سی شرائط اور آداب ہیں، جو معاملۂ نکاح کے لئے ضروری یا مسنون ہیں۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ اور بہت سے دوسرے حضرات ائمہ کے نزدیک تو نکاح میں معاملہ اور معاہدہ کی حیثیت سے زیادہ عبادت و سنت کی حیثیت غالب ہے، اور قرآن و سنت کے شواہد اس پر قائم ہیں۔

نکاح کی اجمالی حقیقت معلوم کرنے کے بعد طلاق کو سمجھئے، طلاق کا حاصل نکاح کے

معاملے اور معاہدے کو ختم کرنا ہے، جس طرح شریعتِ اسلام نے نکاح کے معاملے اور معاہدے کو ایک عبادت کی حیثیت دے کر عام معاملات و معاہدات کی سطح سے بلند رکھا ہے اور بہت سی پابندیاں اس پر لگائی ہیں اسی طرح اس معاملہ کا ختم کرنا بھی عام لین دین کے معاملات کی طرح آزاد نہیں رکھا، کہ جب چاہے جس طرح چاہے اس معاملہ کو فسخ کر دے، اور دوسرے سے معاملہ کرلے، بلکہ اس کے لئے ایک خاص حکیمانہ قانون بنایا ہے، جس کا بیان آیات مذکورہ میں کیا گیا ہے۔

اسلامی تعلیمات کا اصل رخ یہ ہے کہ نکاح کا معاملہ اور معاہدہ عمر بھر کے لئے ہو، اس کے توڑنے اور ختم کرنے کی کبھی نوبت ہی نہ آئے، کیونکہ اس معاملہ کے انقطاع کا اثر صرف فریقین پر نہیں پڑتا، نسل و اولاد کی تباہی و بربادی اور بعض اوقات خاندانوں اور قبیلوں میں فساد تک کی نوبت پہونچتی ہے، اور پورا معاشرہ بُری طرح اس سے متاثر ہوتا ہے، اسی لئے جو اسباب اور وجوہ اس معاملہ کو توڑنے کا سبب بن سکتے ہیں قرآن و سنت کی تعلیمات نے ان تمام اسباب کو راہ سے ہٹانے کا پورا انتظام کیا ہے، زوجین کے ہر معاملے اور ہر حال کے لئے جو ہدایتیں قرآن و سنت میں مذکور ہیں ان سب کا حاصل یہی ہے کہ یہ رشتہ ہمیشہ زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوتا چلا جائے، ٹوٹنے نہ پائے، ناموافقت کی صورت میں اوّل افہام و تفہیم کی پھر زجر و تنبیہ کی ہدایتیں دی گئیں، اور اگر بات بڑھ جائے اور اس سے بھی کام نہ چلے تو خاندان ہی کے چند افراد کو حَکَم اور ثالث بنا کر معاملہ طے کرنے کی تعلیم دی، آیت حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا (۴: ۳۵) میں خاندان ہی کے افراد کو ثالث بنانے کا ارشاد کس قدر حکیمانہ ہے، کہ اگر معاملہ خاندان سے باہر گیا تو بات بڑھ جانے اور دلوں میں زیادہ بُعد پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے۔

لیکن بعض اوقات ایسی صورتیں بھی پیش آتی ہیں، کہ اصلاحِ حال کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں، اور تعلقِ نکاح کے مطلوبہ ثمرات حاصل ہونے کے بجائے طرفین کا آپس میں مل کر رہنا ایک عذاب بن جاتا ہے، ایسی حالت میں اس ازدواجی تعلق کا ختم کر دینا ہی طرفین کے لئے راحت اور سلامتی کی راہ ہو جاتی ہے، اس لئے شریعتِ اسلام نے بعض دوسرے مذاہب کی طرح یہ بھی نہیں کیا، کہ رشتۂ ازدواج ہر حال میں ناقابلِ فسخ ہی رہے، بلکہ طلاق اور فسخ نکاح کا قانون بنایا، طلاق کا اختیار تو صرف مرد کو دیا، جس میں عادۃً فکر و تدبّر اور تحمل کا مادہ عورت سے زائد ہوتا ہے، عورت کے ہاتھ میں یہ آزاد اختیار نہیں دیا، تاکہ وقتی تاثرات سے مغلوب ہو جانا جو عورت میں بہ نسبت مرد کے زیادہ ہے وہ طلاق کا سبب نہ بن جائے۔

لیکن عورت کو بھی بالکل اس حق سے محروم نہیں رکھا کہ وہ شوہر کے ظلم و ستم سہنے ہی پر مجبور ہو جائے، اس کو یہ حق دیا کہ حاکمِ شرعی کی عدالت میں اپنا معاملہ پیش کر کے اور شکایات

کا ثبوت دے کر نکاح فسخ کرا سکے یا طلاق حاصل کر سکے، پھر مرد کو طلاق کا آزادانہ اختیار تو دیدیا، مگر اوّل تو یہ کہہ دیا کہ اس اختیار کا استعمال کرنا اللہ کے نزدیک بہت مبغوض و مکروہ ہے، صرف مجبوری کی حالت میں اجازت ہے، حدیث میں ارشادِ نبوی ہے:

ابغض الحلال الی اللہ الطلاق	یعنی حلال چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض اور مکروہ اللہ کے نزدیک طلاق ہے۔

دوسری پابندی یہ لگائی کہ حالتِ غیظ و غضب میں یا کسی وقتی اور ہنگامی ناگواری میں اس اختیار کو استعمال نہ کریں، اسی حکمت کے ماتحت حالتِ حیض میں طلاق دینے کو ممنوع قرار دیا، اور حالتِ طہر میں بھی، جس طہر میں صحبت و ہمبستری ہو چکی ہے، اس میں طلاق دینے کو اس بنا پر ممنوع قرار دیا کہ اس کی وجہ سے عورت کی عدت طویل ہو جائے گی، اس کو تکلیف ہوگی، ان دونوں چیزوں کے لئے قرآن کریم کا ارشاد یہ آیا فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ (۶۵: ۱) یعنی طلاق دینا ہو تو ایسے وقت میں دو جس میں بلا وجہ عورت کی عدت طویل نہ ہو، حیض کی حالت میں طلاق ہوئی تو موجودہ حیض عدت میں شمار نہ ہوگا، اس کے بعد طہر اور پھر طہر کے بعد حیض سے عدّت شمار ہوگی، اور جس طہر میں ہمبستری ہو چکی ہے، اس میں یہ امکان ہے کہ حمل رہ گیا ہو تو عدّت وضعِ حمل تک طویل ہو جائیگی، طلاق دینے کے لئے مذکورہ وقتِ طہر کا مقرر کرنے میں یہ بھی حکمت ہے کہ اس انتظار کے وقفہ میں بہت ممکن ہی کہ غصہ فرو ہو، معافی تلافی ہو کر طلاق کا ارادہ ہی ختم ہو جائے۔

تیسری پابندی یہ لگائی کہ معاہدۂ نکاح توڑنے اور فسخ کرنے کا طریقہ بھی وہ نہیں رکھا جو عام بیع و شراء کے معاملات و معاہدات کا ہے کہ ایک مرتبہ معاہدہ فسخ کر دیا تو اسی وقت اسی منٹ میں فریقین آزاد ہو گئے، اور پہلا معاملہ بالکل ختم ہو گیا، ہر ایک کو اختیار ہو گیا کہ دوسرے سے معاہدہ کر لے، بلکہ معاملۂ نکاح کو قطع کرنے کے لئے اوّل تو اس کے تین درجے تین طلاقوں کی صورت میں رکھے گئے، پھر اس پر عدّت کی پابندی لگا دی کہ عدّت پوری ہونے تک معاملۂ نکاح کے بہت سے اثرات باقی رہیں گے، عورت کو دوسرا نکاح حلال نہ ہوگا، مرد کے لئے بھی بعض پابندیاں باقی رہیں گی۔

چوتھی پابندی یہ لگائی کہ اگر صاف و صریح لفظوں میں ایک یا دو طلاق دی گئی ہے تو طلاق دیتے ہی نکاح نہیں ٹوٹتا، بلکہ رشتۂ ازدواج عدّت پوری ہونے تک قائم ہے، دورانِ عدت میں اگر یہ اپنی طلاق سے رجوع کر لے تو نکاح سابق بحال ہو جائے گا۔

لیکن یہ رجوع کرنے کا اختیار صرف ایک یا دو طلاق تک محدود کر دیا گیا، تاکہ کوئی ظالم شوہر ایسا نہ کر سکے کہ ہمیشہ طلاق دیتا رہے، پھر رجوع کر کے اپنی قید میں رکھتا رہے، اس لئے

حکم یہ دیدیا کہ اگر کسی نے تیسری طلاق بھی دیدی تو اب اس کو رجوع کرنے کا بھی اختیار نہیں، بلکہ اگر دونوں راضی ہو کر آپس میں دوبارہ بھی نکاح کرنا چاہیں تو بغیر ایک مخصوص صورت کے جس کا ذکر آگے آتا ہے، دوبارہ نکاح بھی آپس میں حلال نہیں۔

آیاتِ مذکورہ میں اسی نظامِ طلاق کے اہم احکام کا ذکر ہے، اب ان آیات کے الفاظ پر غور کیجئے، پہلی آیت میں اوّل تو ارشاد فرمایا: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ یعنی طلاق دو ہی مرتبہ ہے، پھر ان دونوں مرتبہ کی طلاقوں میں یہ لچک رکھ دی کہ ان سے نکاح بالکل ختم نہیں ہوا، بلکہ عدت پوری ہونے تک مرد کو اختیار رہے کہ رجوع کر کے بیوی کو اپنے نکاح میں روک لے، یا پھر رجوع نہ کرے، عدّت پوری ہونے دے، عدّت پوری ہونے پر نکاح کا تعلق ختم ہو جائے گا، اسی مضمون کو ان الفاظ میں ارشاد فرمایا فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ یعنی یا تو شرعی قاعدے کے مطابق رجعت کر کے بیوی کو اپنے نکاح میں روک لے، یا پھر خوب صورتی اور خوش معاملگی کے ساتھ اس کی عدت پوری ہونے دے تاکہ وہ آزاد ہو جائے۔

ابھی تیسری طلاق کا ذکر نہیں آیا، درمیان میں ایک اور مسئلہ بیان فرما دیا جو ایسے حالات میں عموماً زیر بحث آجاتا ہے، وہ یہ کہ بعض ظالم شوہر بیوی کو نہ رکھنا چاہتے ہیں، نہ اُس کے حقوق کی فکر کرتے ہیں، نہ طلاق دیتے ہیں، بیوی تنگ ہوتی ہے، اس کی مجبوری سے یہ ناجائز فائدہ اٹھا کر طلاق دینے کے لئے اس سے کچھ مال کا یا کم از کم مہر کی معافی یا واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں، قرآن کریم نے اس کو حرام قرار دیا، ارشاد فرمایا وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا "یعنی تمھارے لئے حلال نہیں کہ طلاق کے معاوضہ میں اُن سے اپنا دیا ہوا مال اور مہر وغیرہ واپس لیلو"

البتہ ایک صورت اس سے مستثنیٰ فرما دی کہ اس میں مہر کی واپسی یا معافی جائز کر دی، وہ یہ کہ عورت بھی یہ محسوس کرے کہ طبیعتوں میں بُعد و مخالفت کی وجہ سے میں شوہر کے حقوق ادا نہیں کر سکتی، اور مرد بھی یہی سمجھے تو ایسی صورت میں یہ بھی جائز ہے کہ مہر کی واپسی یا معافی کے بدلے میں طلاق دی جائے اور لی جائے۔

یہ مسئلہ ضمنی بیان فرمانے کے بعد پھر تیسری طلاق کا ذکر اس طرح فرمایا فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ۔ یعنی اگر اس شخص نے تیسری طلاق بھی دے ڈالی (جو شرعاً پسندیدہ نہ تھی) تو اب نکاح کا معاملہ بالکلیہ ختم ہو گیا، اس کو رجعت کرنے کا کوئی اختیار نہ رہا، اور چونکہ اس نے شرعی حدود سے تجاوز کیا کہ بلا وجہ تیسری طلاق دیدی تو اس کی سزا یہ ہے کہ اب اگر یہ دونوں راضی ہو کر پھر آپس میں نکاح کرنا چاہیں تو وہ بھی نہیں کر سکتے اب ان کے آپس میں دوبارہ نکاح کے لئے شرط یہ ہے کہ یہ عورت (عدّتِ طلاق پوری کرکے)

کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے اور حقوقِ زوجیت ادا کر کے دوسرے شوہر کے ساتھ رہے، پھر اگر اتفاق سے وہ دوسرا شوہر بھی طلاق دیدے (یا مر جائے) تو اس کی عدت پوری کرنے کے بعد پہلے شوہر سے نکاح ہو سکتا ہے، آیت کے آخری جملے فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ أَنْ يَتَرَاجَعَا کا یہی مطلب ہے۔

تین طلاق اور اس کے احکام کی تفصیل

یہاں قرآن کریم کے اسلوبِ بیان پر غور کرنے سے یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتی ہے کہ طلاق دینے کا اصل شرعی طریقہ یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ دو طلاق تک پہونچا جائے، تیسری طلاق تک نوبت پہونچانا مناسب نہیں، الفاظ آیت اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ کے بعد تیسری طلاق کو حرف اِنْ کے ساتھ فَإِنْ طَلَّقَهَا فرمانے میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے، ورنہ سیدھی تعبیر یہ تھی کہ اَلطَّلَاقُ ثَلٰثٌ کہا جاتا، اس کو چھوڑ کر یہ تعبیر اختیار کرنے میں واضح اشارہ ہے کہ تیسری طلاق تک پہونچنا نہیں چاہئے، یہی وجہ ہے کہ امام مالکؒ اور بہت سے فقہاء نے تیسری طلاق کی اجازت ہی نہیں دی وہ اس کو طلاقِ بدعت کہتے ہیں، اور دوسرے فقہاء نے تین طلاق کو صرف اس شرط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے کہ الگ الگ تین طہروں میں تین طلاقیں دی جائیں، اِن فقہاء کی اصطلاح میں اس کو بھی طلاقِ سنت کے لفظ سے تعبیر کر دیا گیا ہے، مگر اس کا یہ مطلب کسی کے نزدیک نہیں ہے کہ اس طرح تین طلاقیں دینا مسنون اور محبوب ہے، بلکہ طلاقِ بدعت کے مقابلے میں اس کو طلاقِ سنت اس معنی سے کہہ دیا گیا کہ یہ صورت بھی بدعت میں داخل نہیں۔

قرآن و سنت کے ارشادات اور تعاملِ صحابہؓ و تابعین سے عددِ طلاق کے متعلق جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب طلاق دینے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہے تو طلاق کا احسن طریقہ یہ ہے کہ صرف ایک طلاق حالتِ طہر میں دیدے جس میں مجامعت نہ کی ہو، اور یہ ایک طلاق دے کر چھوڑ دے، عدت ختم ہونے کے ساتھ رشتہ نکاح خود ٹوٹ جائے گا، اس کو فقہاء نے طلاقِ احسن کہا ہے، اور حضراتِ صحابہؓ نے اسی کو طلاق کا بہتر طریق قرار دیا ہے۔

ابن ابی شیبہؒ نے اپنے مصنَّف میں حضرت ابراہیم نخعیؒ سے نقل کیا ہے کہ صحابہ کرامؓ طلاق دینے میں اس کو پسند کرتے تھے کہ صرف ایک طلاق دے کر چھوڑ دی جائے اور عدت طلاق تین حیض پورے ہونے دیئے جائیں تاکہ عورت آزاد ہو جائے۔

قرآن کریم کے الفاظ مذکورہ سے اس کی بھی اجازت نکلتی ہے کہ دو طلاق تک دیدی جائیں

مگر مَرَّتَانِ کے لفظ میں اس طرف اشارہ فرما دیا گیا ہے کہ دو طلاق بیک لفظ و بیک وقت نہ ہوں بلکہ دو طہروں میں الگ الگ ہوں، اَلطَّلَاقُ طَلَاقَانِ سے بھی دو طلاق کی اجازت ثابت ہو سکتی تھی، مگر مَرَّتٰنِ ایک ترتیب و تراخی کی طرف مشیر ہے، جس سے مستفاد ہوتا ہے کہ دو طلاقیں ہوں تو الگ الگ ہوں، مثال سے یوں سمجھئے کہ کوئی شخص کسی کو دو روپیہ ایک دفعہ دیدے تو اس کو دو مرتبہ دینا نہیں کہتے، الفاظِ قرآن میں دو مرتبہ دینے کا مقصد یہی ہے کہ الگ الگ طہر میں دو طلاق دی جائیں (روح المعانی)

بہرحال دو طلاقوں تک قرآن حکیم کے الفاظ سے ثابت ہے، اس لئے باتفاق ائمہ فقہاء یہ طلاق سنت میں داخل ہے، یعنی بدعت نہیں، تیسری طلاق کے غیر مستحسن ہونے کی طرف تو خود اسلوبِ قرآن میں واضح اشارہ پایا جاتا ہے، اس کے غیر مستحسن ہونے میں کسی کا بھی اختلاف نہیں۔

اور حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے تیسری طلاق کا مبغوض و مکروہ ہونا ثابت ہوتا ہے، امام نسائی نے بروایت محمود بن لبیدؓ نقل کیا ہے کہ:۔

اخبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن رجل طلق امرأتہ ثلاث تطلیقات جمیعا فقام غضبانا ثم قال ایلعب بکتاب اللہ وانا بین اظہرکم حتی قام رجل وقال یارسول اللہ الا اقتلہ (نسائی کتاب الطلاق، ص ۹۹ ج ۲)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک آدمی کے متعلق خبر دی گئی جس نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دی تھیں، آپ غصہ ہو کر کھڑے ہوگئے، اور فرمایا کیا اللہ کی کتاب کیساتھ کھیل کیا جاتا ہے، حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں، اتنے میں ایک آدمی کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا، اے اللہ کے رسول کیا میں کو قتل کردوں؟

اس حدیث کی اسناد کو حافظ ابن قیمؒ نے صحیح علیٰ شرط مسلم قرار دیا ہے، (زاد المعاد) اور جوہر نقی میں علامہ ماوردیؒ نے اس حدیث کی سند کو صحیح اور ابن کثیرؒ نے اسناد جید، ابن حجرؒ نے رُوَاتُہٗ موثقون فرمایا ہے۔

اسی بناء پر حضرت امام مالکؒ اور بعض دوسرے ائمہ فقہاء نے تیسری طلاق کو مطلقاً ناجائز اور طلاق بدعت قرار دیا ہے، دوسرے ائمہ نے تین طہروں میں تین طلاقوں کو اگرچہ طلاق سنت میں داخل کہہ کر طلاقِ بدعت سے نکال دیا ہے، مگر اس کے غیر مستحسن ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ شریعتِ اسلام نے جو طلاق کے تین درجے تین طلاقوں کی صورت میں رکھے ہیں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان تینوں درجوں کو عبور کرنا ضروری یا بہتر ہے، بلکہ منشاء

شریعت کا تو یہ ہو کہ اول تو طلاق پر اقدام ہی ایک مبغوض و مکروہ فعل ہے، اگر بمجبوری اس اقدام کی نوبت آجائے تو اس کے کم سے کم درجے یعنی ایک طلاق پر اکتفا کیا جائے اور عدت گذرنے دیں، تو عدت ختم ہوتے ہی یہی ایک طلاق رشتہ زوجیت قطع کرنے کے لئے کافی ہوجائے گی، اور عورت آزاد ہو کر دوسرے شخص سے نکاح کرسکے گی، یہی طریقہ طلاق احسن کہلاتا ہے، اس طریقے میں یہ حکمت اور فائدہ بھی ہے کہ صریح الفاظ طلاق سے ایک طلاق دینے کی صورت میں طرفین کے لئے مصالحت کی راہیں کھلی رہیں گی، عدت ختم ہونے سے پہلے پہلے تو صرف طلاق سے رجوع کرلینا بقاء نکاح کے لئے کافی ہوگا، اور عدت ختم ہوجانے کے بعد اگرچہ نکاح ٹوٹ چکے گا اور عورت آزاد ہوجائے گی، مگر پھر بھی یہ گنجائش باقی رہے گی کہ اگر دونوں میں اب مصالحت ہوجائے اور باہم نکاح کرنا چاہیں تو نکاح جدید اسی وقت ہوسکتا ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص اس طلاق احسن کے طریقے پر اکتفاء نہ کرے، دوران عدت میں مزید ایک طلاق صریح اور صاف لفظوں میں دیدے تو اس نے قطع نکاح کے دو درجے طے کرلئے جس کی ضرورت نہ تھی، اور ایسا کرنا شرعاً پسندیدہ بھی نہ تھا، مگر بہرحال دو درجے طے ہوگئے، مگر ان دو درجوں کے طے ہوجانے تک بھی بات وہیں رہی، کہ دوران عدت میں رجعت کا اختیار باقی ہو، اور عدت ختم ہوجانے کے بعد بتراضی طرفین نکاح جدید ہوسکتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ دو طلاق تک پہونچنے میں شوہر نے اپنے اختیارات کی ایک کڑی اور توڑ ڈالی اور اس سرحد پر پہونچ گیا کہ اگر اب ایک مرتبہ بھی طلاق دیدے تو معاملہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائے۔

جس شخص نے یہ دو درجے طلاق کے طے کرلئے اس کے لئے آگے یہ ہدایت دی گئی فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ، اس میں فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ کے لفظوں میں دو حکم بتلائے گئے، اوّل یہ کہ عدت کے دوران رجعت کرلینا نکاح جدید کا محتاج نہیں، بلکہ صرف امساک یعنی طلاق سے رجعت کرکے روک لینا کافی ہے، اگر ایسا کرلیا تو سابق نکاح ہی کی بنیاد پر تعلق زوجیت بحال ہوجائے گا۔

دوسرے اس میں شوہر کو یہ ہدایت دی گئی کہ اگر اس کا ارادہ اصلاح حال اور صلح و صفائی کے ساتھ زندگی گذارنے کا ہے تب تو رجعت پر اقدام کرے ورنہ چھوڑ دے کہ عدت گزرکر تعلق زوجیت ختم ہوجائے، ایسا نہ ہو کہ بغیر ارادہ اصلاح کے محض عورت کو پریشان کرنے کے لئے رجعت کرے۔

اس کے بالمقابل اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ فرمایا، تسریح کے معنے کھول دینے اور چھوڑ دینے کے ہیں، اس سے اشارہ کردیا کہ قطع تعلق کے لئے کسی مزید طلاق یا دوسرے کسی عمل کی

ضرورت نہیں، بغیر رجعت کے عدت ختم ہو جانا ہی تعلقاتِ زوجیت ختم کرنے کے لئے کافی ہے۔

امام حدیث ابو داؤد نے بروایت ابو رزین اسدی نقل کیا ہے کہ اس آیت کے نزول پر ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فرمایا، تیسری طلاق کا یہاں کیوں ذکر نہیں کیا؟ آپ نے فرمایا کہ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ جو بعد میں مذکور ہے وہی تیسری طلاق ہے، (روح المعانی) مطلب اس کا جمہور علماء کے نزدیک یہ ہے کہ جو کام تعلقاتِ زوجیت کے کلی انقطاع کا تیسری طلاق سے ہوتا وہی کام اس طرزِ عمل سے ہو جائیگا کہ عدت کے اندر رجعت نہ کرے، اور جس طرح اِمْسَاکٌ کے ساتھ بِمَعْرُوْفٍ کی قید لگا کر یہ ہدایت فرمادی کہ رجعت کرکے بیوی کو روکا جائے تو حسنِ سلوک کے ساتھ روکا جائے، اسی طرح تَسْرِیْحٌ کے ساتھ بِاِحْسَانٍ کی قید لگا کر یہ ہدایت دیدی کہ طلاق ایک معاملہ کا فسخ ہے، شریف انسان کا کام یہ ہے کہ جس طرح معاملہ اور معاہدہ خوش دلی اور حُسنِ سلوک کے ساتھ کیا جاتا ہے، اسی طرح اگر فسخِ معاہدہ کی ضرورت پیش آجائے تو اس کو بھی غصہ یا لڑائی جھگڑے کے ساتھ نہ کریں، بلکہ وہ بھی احسان وسلوک کے ساتھ کریں، کہ رخصت کے وقت مطلقہ بیوی کو کچھ تحفہ، کپڑے وغیرہ کا دے کر رخصت کریں، جس کا ذکر قرآن کریم کی دوسری آیت میں ہے:

مَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ۔ (۲: ۲۳۶)	"یعنی مطلقہ بیوی کو کچھ جوڑا کپڑے کا دے کر رخصت کریں مالی حیثیت کے مطابق"

اور اگر اس نے اس پر بھی ایسا نہ کیا بلکہ تیسری طلاق بھی دے ڈالی تو اب اس نے اپنے سارے اختیارات شریعت کی دی ہوئی آسانیوں کو نظر انداز کرکے بلا وجہ اور بلا ضرورت ختم کردیئے تو اب اس کی سزا یہ ہے کہ نہ رجعت ہو سکے اور نہ بغیر دوسری شادی کے آپس میں نکاح ہو سکے۔

اگر کسی نے غیر مستحسن یا غیر مشروع طریقہ سے تین طلاق دیدی تو اس کا اثر کیا ہوگا؟

اس کا جواب عقلی اور عرفی طور پر تو یہی ہے کہ کسی فعل کا جرم و گناہ ہونا اس کے مؤثر ہونے میں کہیں بھی مانع نہیں ہوتا، قتلِ ناحق جرم وگناہ ہے، مگر جس کو گولی یا تلوار مار کر قتل کیا گیا ہے وہ تو قتل ہو ہی جاتا ہے، اس کی موت تو اس کا انتظار نہیں کرتی کہ یہ گولی جائز طریقہ سے ماری گئی ہے یا ناجائز طریقہ سے، چوری کرنا باتفاق مذاہب جرم وگناہ ہے، مگر جو مال اس طرح غائب کردیا گیا وہ تو ہاتھ سے نکل ہی جاتا ہے، اسی طرح تمام معاصی اور جرائم کا یہی حال ہے کہ ان کا جرم وگناہ ہونا اُن کے مؤثر ہونے میں مانع نہیں ہوتا۔

اس اصول کا مقتضیٰ یہی ہے کہ شریعت کی دی ہوئی آسانیوں کو نظر انداز کرنا اور بلا وجہ

اپنے سارے اختیاراتِ طلاق کو ختم کر کے تین طلاق تک پہنچا اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کا سبب ہوا جیسا کہ سابقہ روایت میں لکھا جاچکا ہے، اور اسی لئے جمہور امت کے نزدیک یہ فعل غیر مستحسن اور بعض کے نزدیک ناجائز ہے، مگر ان سب باتوں کے باوجود جب کسی نے ایسا اقدام کرلیا تو اس کا وہی اثر ہونا چاہئے جو جائز طلاق کا ہوتا، یعنی تین طلاق واقع ہو جائیں، اور رجعت ہی کا اختیار نہیں، نکاحِ جدید کا اختیار بھی سلب ہو جائے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ اس پر شاہد ہے کہ اظہارِ غضب کے باوجود آپ نے تینوں طلاقوں کو نافذ فرمایا، جس کے بہت سے واقعات کتبِ حدیث میں مذکور ہیں اور جن علماء نے اس مسئلہ پر مستقل کتابیں لکھی ہیں ان میں ان واقعات کو جمع کر دیا ہے، حال میں مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز صاحب کی کتاب "عمدۃ الاثاث" بھی اس مسئلہ پر شائع ہوگئی ہے جو بالکل کافی ہے، یہاں صرف دو تین حدیثیں نقل کی جاتی ہیں۔

محمود بن لبید کی روایت جو بحوالہ نسائی اوپر لکھی گئی ہے اس میں تین طلاقیں بیک وقت دینے پر انتہائی ناراضگی کا اظہار تو منقول ہے، یہاں تک کہ بعض صحابہؓ نے اس شخص کو مستوجبِ قتل سمجھا، مگر یہ کہیں منقول نہیں کہ آپ نے اس کی طلاق کو ایک رجعی طلاق قرار دیکر بیوی اس کے حوالے کر دی ہو۔

بلکہ دوسری روایت جو آگے آتی ہے جس طرح اس میں اس کی تصریح موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عویمرؓ کی بیک وقت تین طلاق کو باوجود ناراضی کے نافذ فرمادیا، اسی طرح مذکورہ حدیث محمود بن لبید کے متعلق قاضی ابوبکر بن عربی نے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عویمرؓ کی تین طلاقوں کی طرح اس کی بھی تین طلاقوں کو نافذ فرمادیا تھا، اُن کے الفاظ یہ ہیں:

فلم یردہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بل امضاہ کما فی حدیث عویمر العجلانی فی اللعان حیث امضی طلاقہ الثلاث ولم یردہ (تھذیب سنن ابی داؤد طبع مصر ص ۱۲۹ ج ۳ ازعمدۃ الاثاث)	"تو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے رد نہیں کیا، بلکہ اُسے نافذ فرمادیا، جیسا کہ عُویمر عجلانیؓ کی لعان والی حدیث میں ہے کہ آپؐ نے اُن کی تین طلاقوں کو نافذ فرمادیا تھا اور رد نہیں کیا تھا"

دوسری حدیث صدیقہ عائشہؓ کی صحیح بخاری میں بالفاظ ذیل ہے:

ان رجلاً طلق امرأتہ ثلاثاً	"ایک آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاق

فتزوجت فطلق فسئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم اتحل للاوّل قال لاحتیٰ یذوق عسیلتہا کماذاقہا الاوّل (صحیح بخاری، ص ۷۹۱ ج ۲، صحیح مسلم ص ۴۶۳)	دی، اس عورت نے دوسری جگہ نکاح کیا تو اس دوسرے شوہر نے بھی اُسے طلاق دیدی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کیا یہ عورت پہلے شوہر کے لئے حلال ہے؟ آپؐ نے فرمایا نہیں جب تک کہ دوسرا شوہر اس سے ہمبستری کرکے لطف اندوز نہ ہوجائے

جس طرح پہلے شوہر نے کیا تھا، اس وقت تک طلاق دینے سے پہلے شوہر کے لئے حلال نہیں ہوگی"۔

الفاظِ روایت سے ظاہر یہی ہے کہ یہ تینوں طلاق بیک وقت دی گئی تھیں، شروح حدیث فتح الباری عمدۃ القاری قسطلانی وغیرہ میں روایت کا مفہوم یہی قرار دیا گیا ہے کہ بیک وقت تین طلاق دی تھیں، اور حدیث میں یہ فیصلہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین طلاق کو نافذ قرار دے کر یہ حکم دیا کہ جب تک شوہر ثانی سے ہمبستری اور صحبت نہ ہوجائے، تو اس کے طلاق دینے سے شوہر اوّل کے لئے حلال نہیں ہوگی۔

تیسری روایت حضرت عویمر عجلانی رضؓ کی ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی بیوی سے لعان کیا، اور اس کے بعد عرض کیا:

فلمّا فرغا قال عویمر کذبتُ علیھا یارسول اللہ ان امسکتھا فطلّقھا ثلاثاً قبل ان یامرہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم (صحیح بخاری مع فتح الباری، ص ۳۰۱ ج ۹ صحیح مسلم ص ۴۸۹ ج ۱)	"پس جب وہ دونوں لعان سے فارغ ہوگئے تو عویمرؓ نے کہا اے اللہ کے رسول میں اس پر جھوٹ بولنے والا ہوں گا، اگر میں نے اس کو اپنے پاس رکھ لیا تو عویمر رضی اللہ عنہ نے اس کو تین طلاقیں دیدی قبل اس کے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم انھیں حکم دیتے"

اور ابوداؤدؒ نے اس واقعہ کو بروایت حضرت سہل بن سعدؓ نقل کرکے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

فانفذہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکان ماصنع عند رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سنۃ قال سعد حضرت ھٰذا عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فمضت السنۃ بعد فی	"تو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے نافذ فرما دیا، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جو کچھ پیش آیا وہ سنت قرار پایا سعدؓ فرماتے ہیں اس موقع پر میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھا پس اس کے بعد لعان کرنے والوں کے

المتلاعنین ان یفرّق بینھما ثمّ لا یجتمعان ابداً (ابوداؤد ص ۳۰۶، طبع اصح المطابع)	بارے میں یہ طریقہ رائج ہوگیا کہ اُن کے درمیان تفریق کردی جائے، اور پھر وہ کبھی بھی جمع نہ ہوں"

اس حدیث میں پوری وضاحت کے ساتھ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عویمرؓ کی بیک وقت تین طلاق کو تین ہی قرار دے کر نافذ فرمایا ہے۔

اور محمود بن لبید کی سابقہ روایت میں بھی ابوبکر ابن عربی کی روایت کے مطابق تین طلاق کو نافذ کرنے کا ذکر موجود ہے، اور بالفرض یہ بھی نہ ہوتا تو یہ کہیں منقول نہیں کہ آپؐ نے اس کو ایک طلاق رجعی قرار دے کر بیوی اس کے سپرد کردی ہو۔

الحاصل مذکورہ تینوں احادیث سے یہ ثابت ہوگیا کہ اگرچہ تین طلاق بیک وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک سخت ناراضی کا موجب تھیں مگر بہر حال اثر اُن کا یہی ہوا کہ تینوں طلاقیں واقع قرار دی گئیں۔

حضرت فاروق اعظمؓ کا واقعہ اور اس پر اشکال وجواب مذکورالصدر تحریر سے یہ ثابت ہوا کہ بیک وقت تین طلاق کو تین قرار دینا خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ تھا، مگر یہاں ایک اشکال حضرت فاروق اعظمؓ کے ایک واقعہ سے پیدا ہوتا ہے، جو صحیح مسلم اور اکثر کتب حدیث میں منقول ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابن عباسؓ قال کان الطلاق علیٰ عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم وابی بکر وسنتین من خلافۃ عمر طلاق الثلاث واحدۃ فقال عمر بن الخطاب ان النّاس قد استعجلوا فی امر کانت لھم فیہ اناۃ فلو أمضینا علیھم فامضاہ علیھم	"حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی دّو سالوں میں طلاق کا یہ طریقہ تھا کہ تین طلاقوں کو ایک قرار دیا جاتا تھا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ لوگ جلدی کرنے لگے ہیں، ایک ایسے معاملہ میں جس میں اُن کے لئے مہلت تھی تو مناسب رہے گا ہم اس کو ان پر نافذ کردیں، تو آپؓ نے اُن پر نافذ کردیا"

(صحیح مسلم ص ۴۷۷ ج ۱)

فاروق اعظمؓ کا یہ اعلان فقہاء صحابہؓ کے مشورہ سے صحابہ و تابعین کے مجمع عام میں ہوا کسی سے اس پر انکار یا تردّد منقول نہیں، اسی لئے حافظِ حدیث امام ابن عبدالبر مالکی نے اس پر اجماع نقل کیا ہے، زرقانی شرح مؤطا میں یہ الفاظ ہیں:

والجمھور علی وقوع الثلاث بل حکی ابن عبد البر الاجماع قائلا ان خلافه لا یلتفت الیه (زرقانی شرح مؤطا، ص ۱۶۷ ج ۳)	"اور جمہور امت تین طلاقوں کے واقع ہونے پر متفق ہیں، بلکہ ابن عبد البر نے اس پر اجماع نقل کر کے فرمایا کہ اس کا خلاف شاذ ہے جس کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا۔"

اور شیخ الاسلام نوویؒ نے شرح مسلم میں فرمایا:

قال الشافعی ومالک وابو حنیفة واحمد وجماھیر العلماء من السلف والخلف یقع الثلاث۔ وقال طاؤس وبعض اھل الظاھر لا یقع بذلک الا واحدة۔	"امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام ابو حنیفہؒ، امام احمدؒ اور سلف وخلف کے جماہیر علماء نے فرمایا کہ تین طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں، اور طاؤس اور بعض اہلِ ظاہر نے کہا کہ اس سے ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے۔"

(شرح مسلم، ص ۴۷۸ ج ۱)

امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں فرمایا:

فخاطب عمرؓ بذلک الناس جمیعًا وفیھم اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم رضی اللہ عنھم الذین قد علموا ما تقدم من ذلک فی زمن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فلم ینکر علیه منھم منکر ولم یدفعه دافع (شرح معانی الآثار، ص ۲۹ ج ۲)	"پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے ساتھ لوگوں کو مخاطب فرمایا، اور ان لوگوں میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ صحابہؓ بھی تھے جن کو اس سے پہلے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے طریقے کا علم تھا، تو ان میں سے کسی انکار کرنے والے نے انکار نہیں کیا، اور کسی رَد کرنے والے نے اسے رَد نہیں کیا۔"

مذکورہ واقعہ میں اگرچہ امت کے لئے عمل کی راہ باجماع صحابہؓ وتابعین معتبر رہوگئی کہ تین طلاقیں بیک وقت دینا اگرچہ غیر مستحسن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کا سبب ہے، مگر اس کے باوجود جس نے اس غلطی کا ارتکاب کیا اس کی بیوی اس پر حرام ہوجائے گی، اور بغیر دوسرے شخص سے نکاح وطلاق کے اس کے لئے حلال نہ ہوگی۔

لیکن علمی اور نظری طور پر یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں، اوّل تو یہ کہ سابقہ تحریر میں متعدد روایاتِ حدیث کے حوالے سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ تین طلاق بیک وقت دینے والے پر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین طلاق کو نافذ فرمایا ہے، اس کو رجعت یا نکاحِ جدید کی

اجازت نہیں دی، پھر اس واقعہ میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے اس کلام کا کیا مطلب ہوگا، کہ عہدِ رسالتؐ میں اور عہدِ صدیقی میں اور دو سال تک عہدِ فاروقی میں تین طلاق کو ایک ہی مانا جاتا تھا، فاروق اعظمؓ نے تین طلاق کا فیصلہ فرمایا؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر واقعہ اسی طرح تسلیم کرلیا جائے کہ عہدِ رسالت، عہدِ صدیقی میں تین طلاق کو ایک مانا جاتا تھا، تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس فیصلہ کو کیسے بدل دیا، اور بالفرض ان سے کوئی غلطی بھی ہوگئی تھی تو تمام صحابہؓ کرامؓ نے اس کو کیسے تسلیم کرلیا؟

ان دونوں سوالوں کے حضرات فقہاء و محدثین نے مختلف جوابات دیئے ہیں، ان میں صاف اور بے تکلف جواب وہ ہے جس کو امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اصح کہہ کر نقل کیا ہے، کہ فاروق اعظمؓ کا یہ فرمان اور اس پر صحابہؓ کرامؓ کا اجماع طلاق ثلاث کی ایک خاص صورت کے متعلق قرار دیا جائے، وہ یہ کہ کوئی شخص تین مرتبہ تجھ کو طلاق تجھ کو طلاق تجھ کو طلاق کہے یا میں نے طلاق دی طلاق دی طلاق دی کہے۔

یہ صورت ایسی ہے کہ اس کے معنی میں دو احتمال ہوتے ہیں، ایک یہ کہ کہنے والے نے تین طلاق دینے کی نیت سے یہ الفاظ کہے ہوں، دوسرے یہ کہ تین مرتبہ محض تاکید کے لئے مکرر کہا ہو، تین طلاق کی نیت نہ ہو، اور یہ ظاہر ہے کہ نیت کا علم کہنے والے ہی کے اقرار سے ہوسکتا ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں صدق و دیانت عام اور غالب تھی، اگر ایسے الفاظ کہنے کے بعد کسی نے یہ بیان کیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی، بلکہ محض تاکید کے لئے یہ الفاظ مکرر بولے تھے تو آپؐ اس کے حلفی بیان کی تصدیق فرما دیتے اور اس کو ایک ہی طلاق قرار دیتے تھے۔

اس کی تصدیق حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہوتی ہے، جس میں مذکور ہے کہ انھوں نے اپنی بیوی کو لفظ البتۃ کے ساتھ طلاق دیدی تھی، یہ لفظ عرب کے عرف عام میں تین طلاق کے لئے بولا جاتا تھا، مگر تین اس کا مفہوم صریح نہیں تھا، اور حضرت رکانہؓ نے کہا کہ میری نیت تو اس لفظ سے تین طلاق کی نہیں تھی، بلکہ ایک طلاق دینے کا قصد تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قسم دی، انھوں نے اس پر حلف کرلیا، تو آپؐ نے ایک ہی طلاق قرار دیدی۔

یہ حدیث ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی میں مختلف سندوں اور مختلف الفاظ کے ساتھ منقول ہے، بعض الفاظ میں یہ بھی ہے کہ حضرت رکانہؓ نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدی تھیں مگر ابوداؤد نے ترجیح اس کو دی ہے کہ دراصل رکانہؓ نے لفظ البتۃ سے طلاق دی تھی، یہ لفظ چونکہ عام طور پر تین طلاق کے لئے بولا جاتا تھا، اس لئے کسی راوی نے اس کو تین طلاق سے تعبیر کردیا ہے

بہرحال اس حدیث سے یہ بات باتفاق ثابت ہو کہ حضرت رکانہؓ کی طلاق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اُس وقت قرار دیا جب کہ انھوں نے حلف کے ساتھ بیان دیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی، اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے تین طلاق کے الفاظ صریح اور صاف نہیں کہے تھے ورنہ پھر تین کی نیت نہ کرنے کا کوئی احتمال ہی نہ رہتا، نہ اُن سے سوال کی کوئی ضرورت رہتی۔

اس واقعہ نے یہ بات واضح کر دی کہ جن الفاظ میں یہ احتمال ہو کہ تین کی نیت کی ہے یا ایک ہی کی تاکید کی ہے، اُن میں آپؐ نے حلفی بیان پر ایک قرار دیدیا، کیونکہ زمانہ صدق و دیانت کا تھا، اس کا احتمال بہت بعید تھا کہ کوئی شخص جھوٹی قسم کھالے۔

صدیق اکبرؓ کے عہد میں اور فاروق اعظمؓ کے ابتدائی عہد میں دو سال تک یہی طریقہ جاری رہا، پھر حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے زمانے میں یہ محسوس کیا کہ اب صدق و دیانت کا معیار گھٹ رہا ہے، اور آئندہ حدیث کی پیشینگوئی کے مطابق اور گھٹ جائے گا، دوسری طرف ایسے واقعات کی کثرت ہوگئی کہ تین مرتبہ الفاظِ طلاق کہنے والے اپنی نیت صرف ایک طلاق کی بیان کرنے لگے تو یہ محسوس کیا گیا کہ اگر آئندہ اسی طرح طلاق دینے والے کے بیان نیت کی تصدیق کر کے ایک طلاق قرار دی جاتی رہی تو بعید نہیں کہ لوگ شریعت کی دی ہوئی اس سہولت کو بے جا استعمال کرنے لگیں، اور بیوی کو واپس لینے کے لئے جھوٹ کہہ دیں کہ نیت ایک ہی کی تھی، فاروق اعظمؓ کی فراست اور انتظامِ دین میں دوربینی کو سبھی صحابہؓ نے درست سمجھ کر اتفاق کیا، یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس تھے، انھوں نے سمجھا کہ اگر ہمارے اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہوتے تو یقیناً وہ بھی اب دلوں کی مخفی نیت اور صاحبِ معاملہ کے بیان پر مدار رکھ کر فیصلہ نہ فرماتے، اس لئے قانون یہ بنادیا کہ اب جو شخص تین مرتبہ لفظ طلاق کا تکرار کرے گا اس کی تین ہی طلاقیں قرار دی جائینگی، اس کی یہ بات نہ سُنی جائے گی کہ اس نے نیت صرف ایک طلاق کی کی تھی۔

حضرت فاروق اعظمؓ کے مذکور الصدر واقعہ میں جو الفاظ منقول ہیں وہ بھی اسی مضمون کی شہادت دیتے ہیں، انھوں نے فرمایا:

ان الناس قد استعجلوا فی امرٍ کانت لھم فیہ اناۃ فلو امضیناعلیھم	"لوگ جلدی کرنے لگے ہیں ایک ایسے معاملہ میں جس میں اُن کے لئے مہلت تھی، تو مناسب ہوگا کہ ہم اس کو ان پر نافذ کر دیں"

حضرت فاروق اعظمؓ کے اس فرمان اور اس پر صحابہ کرامؓ کے اجماع کی یہ توجیہ جو بیان کی گئی ہے اس کی تصدیق روایاتِ حدیث سے بھی ہوتی ہے، اور اس سے ان دونوں سوالوں

کا خود بخود حل نکل آتا ہے کہ روایاتِ حدیث میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تین طلاق کو تین ہی قرار دے کر نافذ کرنا متعدد واقعات سے ثابت ہے، تو حضرت ابن عباس رضؓ کا یہ فرمانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ عہدِ رسالتؐ میں تین کو ایک ہی مانا جاتا تھا، کیونکہ معلوم ہوا کہ ایسی طلاق جو تین کے لفظ سے دی گئی یا تکرارِ طلاق تین کی نیت سے کیا گیا اس میں عہدِ رسالت میں بھی تین ہی قرار دی جاتی تھیں، ایک قرار دینے کا تعلق ایسی طلاق سے ہے جس میں ثلاث کی تصریح نہ ہو یا تین طلاق دینے کا اقرار نہ ہو، بلکہ تین بطور تاکید کے کہنے کا دعویٰ ہو۔

اور یہ سوال بھی ختم ہو جاتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کو ایک قرار دیا تھا تو فاروق اعظمؓ نے اس کی مخالفت کیوں کی، اور صحابۂ کرام رضؓ نے اس سے اتفاق کیسے کر لیا، کیونکہ اس صورت میں فاروق اعظمؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی سہولت کے بے جا استعمال سے روکا ہے، معاذ اللہ، آپ کے کسی فیصلہ کے خلاف کا یہاں کوئی شائبہ نہیں۔

اس طرح تمام اشکالات رفع ہو گئے، والحمد للہ، اس جگہ مسئلہ طلاق ثلاث کی مکمل بحث اور اس کی تفصیلات کا احاطہ مقصود نہیں، وہ شروح حدیث میں بہت مفصّل ہے، اور بہت سے علماء نے اس کو مفصّل رسالوں میں بھی واضح کر دیا ہے، سمجھنے کے لئے اتنا بھی کافی ہے، واللہ الموفق والمعین۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ

اور جب طلاق دی تم نے عورتوں کو پھر پہنچیں اپنی عدّت کو تو رکھ لو اُن کو موافق دستور کے یا

سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۠ وَّلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ

چھوڑ دو اُن کو بھلی طرح سے اور نہ روکے رکھو ان کو ستانے کیلئے تاکہ اُن پر زیادتی کرو اور جو ایسا

يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۡ

کریگا وہ بیشک اپنا ہی نقصان کرے گا، اور مت ٹھہراؤ اللہ کے احکام کو ہنسی،

وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ

اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے اور اس کو جو اتاری تم پر کتاب اور

وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ

علم کی باتیں کہ تم کو نصیحت کرتا اس کے ساتھ اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان رکھو کہ اللہ سب کچھ

۲۹ ع ۳ ۱۳

عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاۗءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ

جانتا ہے، اور جب طلاق دی تم نے عورتوں کو پھر پورا کر چکیں اپنی عدت کو تو اب نہ روکو ان کو

اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ ذٰلِكَ

اس سے کہ نکاح کرلیں اپنے انہی خاوندوں سے جبکہ راضی ہو جاویں آپس میں موافق دستور کے یہ نصیحت

يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى

اس کو کی جاتی ہے جو کہ تم میں سے ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اس میں تمہارے واسطے

لَكُمْ وَاَطْهَرُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾

بڑی ستھرائی ہے اور بہت پاکیزگی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۲۸، عورتوں کو معلق رکھنے کی ممانعت اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دی ہو، پھر وہ اپنی عدت گزرنے کے قریب پہنچ جائیں تو تم ان کو قاعدہ کے موافق (رجعت کرکے) نکاح میں رہنے دو، یا قاعدے کے موافق ان کو رہائی دو، اور ان کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے مت روکو، اس ارادہ سے کہ اُن پر ظلم کیا جائے، اور جو شخص ایسا برتاؤ کرے گا تو وہ اپنا ہی نقصان کرے گا، اور حق تعالیٰ کے احکام کو کھیل نہ بناؤ، اور حق تعالیٰ کی جو تم پر نعمتیں ہیں ان کو یاد کرو، اور خصوصاً کتاب و حکمت کی باتوں کو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر (اس حیثیت سے) نازل فرمائی ہے کہ ان کے ذریعے تم کو نصیحت فرماتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔

حکم نمبر ۲۹، عورتوں کو نکاح ثانی سے منع کرنے کی ممانعت اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دیدو اور عورتیں اپنی میعادِ عدت پوری کر چکیں تو تم ان کو اس امر سے مت روکو کہ وہ اپنے (تجویز کئے ہوئے) شوہروں سے نکاح کرلیں، جبکہ باہم سب رضامند ہو جائیں قاعدہ کے موافق، اس مضمون سے نصیحت کی جاتی ہے اس شخص کو جو تم میں سے اللہ تعالیٰ اور روز قیامت پر یقین رکھتا ہو، اس نصیحت کا قبول کرنا تمہارے لئے زیادہ صفائی اور زیادہ پاکی کی بات ہے، اور اللہ تعالیٰ (تمہاری مصلحتوں کو) جانتے ہیں تم نہیں جانتے۔

معارف و مسائل

ان سے پہلے بھی دو آیتوں میں قانونِ طلاق کی اہم دفعات اور اسلام میں طلاق کا عادلانہ اور معتدلانہ نظام قرآن کریم کے حکیمانہ اسلوب کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے، اب مذکور الصدر دو آیتوں میں چند احکام و مسائل مذکور ہیں۔

احکام طلاق کے بعد رجعت یا انقطاعِ نکاح دونوں کے لئے خاص ہدایات

پہلی آیت میں پہلا مسئلہ یہ ارشاد ہوا ہے کہ جب مطلقہ رجعی عورتوں کی عدّت گذرنے کے قریب آئے تو شوہر کو دو اختیار حاصل ہیں، ایک یہ کہ رجعت کرکے اس کو اپنے نکاح میں رہنے دے، دوسرے یہ کہ رجعت نہ کرے، اور تعلقِ نکاح ختم کرکے اس کو بالکل آزاد کردے۔

لیکن دونوں اختیاروں کے ساتھ قرآن کریم نے یہ قید لگائی کہ رکھنا ہو تو قاعدہ کے مطابق رکھا جائے، اور چھوڑنا ہو تب بھی شرعی قاعدے کے مطابق چھوڑا جائے، اس میں بِالْمَعْرُوْفِ کا لفظ دونوں جگہ علیحدہ علیحدہ لاکر اس کی طرف اشارہ فرمادیا ہے کہ رجعت کے لئے بھی کچھ شرائط اور قواعد ہیں اور آزاد کرنے کے لئے بھی، دونوں حالتوں میں سے جس کو بھی اختیار کرے شرعی قاعدے کے موافق کرے، محض وقتی غصّے یا جذبات کے ماتحت نہ کرے، دونوں صورتوں کے شرعی قواعد کا کچھ حصّہ تو خود قرآن میں بیان کردیا گیا ہے، باقی تفصیلات رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں۔

مثلاً اگر واقعہ طلاق کے بعد مفارقت کے ناگوار عواقب کا خیال کرکے رائے یہ ہو جائے کہ رجعت کرکے نکاح قائم رکھنا ہے تو اس کے لئے شریعت کا قاعدہ یہ ہے کہ پچھلے غصّہ و ناراضی کو دل سے نکال کر حُسنِ معاشرت کے ساتھ زندگی گذارنا اور حقوق کی ادائیگی کا خیال رکھنا پیشِ نظر ہو، عورت کو اپنی قید میں رکھ کر ستانا اور تکلیف پہنچانا مقصود نہ ہو، اسی کے لئے آیتِ متذکرہ میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے گئے، وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا۔ "یعنی عورتوں کو اپنے نکاح میں اس لئے نہ روکو کہ اُن پر ظلم کرو"۔

دوسرا قاعدہ رجعت کا یہ ہے جو سورۂ طلاق میں ذکر کیا گیا ہے: وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ (۲:۶۵) "اور آپس میں سے دو معتبر شخصوں کو گواہ کرلو، پھر اگر گواہی کی حاجت پڑے تو ٹھیک اللہ کے واسطے بلا رو و رعایت گواہی دو"۔

مطلب یہ ہے کہ جب رجعت کا ارادہ کرو تو اس پر دو معتبر مسلمانوں کو گواہ بنالو، اس میں کئی فائدے ہیں، ایک یہ کہ اگر عورت کی طرف سے رجعت کے خلاف کوئی دعویٰ ہو تو اس گواہی سے کام لیا جاسکے۔

دوسرے خود انسان کو اپنے نفس پر بھی بھروسہ نہیں کرنا چاہئے، اگر رجعت پر شہادت کا قاعدہ نہ جاری کیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص عدّت پوری گذر جانے کے بعد بھی اپنی غرض یا شیطانی اغواء سے یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ میں نے عدّت گذرنے سے پہلے رجعت کرلی تھی۔

ان مفاسد کے انسداد کے لئے قرآن نے یہ قاعدہ مقرر فرمادیا کہ رجعت کرو تو اس پر

دو معتبر گواہ بنالو۔

معاملہ کا دوسرا رخ یہ تھا کہ عدت کی مہلت اور غور و فکر کا وقت ملنے کے باوجود دونوں کا انقباض اور ناراضی ختم نہ ہوئی اور قطع تعلق ہی برقرار رکھنا ہی تو اس صورت میں بہت اندیشہ ہوتا ہو کہ دشمنی اور انتقامی جذبے بھڑک اٹھیں جن کا اثر دو شخصوں سے متعدی ہوکر دو خاندانوں تک پہنچ سکتا ہی، اور طرفین کی دنیا و آخرت کے لئے خطرہ بن سکتا ہے، اس کے انسداد کے لئے مختصر طور پر تو یہی ارشاد فرمایا گیا کہ اَوْ سَرِّحُوْھُنَّ بِمَعْرُوْفٍ یعنی چھوڑنا اور قطع کرنا ہی ہو تو وہ بھی قاعدے کے موافق کریں اس قاعدہ کی کچھ تفصیلات خود قرآن کریم میں مذکور ہیں، باقی تفصیلات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قولی اور عملی بیان سے ثابت ہیں۔

مثلاً اس سے پہلی آیت میں ارشاد فرمایا: وَلَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَیْتُمُوْھُنَّ شَیْـًٔا، یعنی بلا کسی عذر شرعی کے ایسا نہ کرو کہ عورت سے طلاق کے معاوضہ میں اپنا دیا ہوا سامان یا مہر واپس لے لو، یا کچھ اور معاوضہ طلب کرو۔

اور اس کے بعد کی ایک آیت میں ارشاد فرمایا وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَی الْمُتَّقِیْنَ (۲: ۲۴۱) "سب طلاق دی ہوئی عورتوں کے لئے کچھ فائدہ پہنچانا قاعدہ کے موافق مقرر ہوا ہے، اُن پر جو اللہ سے ڈرتے ہیں"۔ فائدہ پہنچانے کی تفسیر، رخصت کے وقت مطلقہ عورت کو کچھ تحفہ نقد یا کم از کم ایک جوڑا کپڑے کا دینا ہے، اس میں طلاق دینے والے شوہر پر مطلقہ بی بی کے کچھ حقوق واجب و لازم کرکے اور کچھ بطور احسان و سلوک کے عائد کردیئے گئے ہیں، جو بلند اخلاق اور حُسنِ معاشرت کی پاکیزہ تعلیم ہے، اور جس میں اس طرف ہدایت ہے کہ جس طرح نکاح ایک معاملہ اور باہمی معاہدہ تھا اسی طرح طلاق بھی ایک معاملہ کا ختم کرنا ہے، اس فسخ معاملہ کو دشمنی اور جنگ و جدل کا سامان بنانے کی کوئی وجہ نہیں، معاملہ کا انقطاع بھی خوب صورتی اور حُسنِ سلوک کے ساتھ ہونا چاہئے، کہ طلاق کے بعد مطلقہ بی بی کو فائدہ پہنچایا جائے۔

اس فائدہ کی تفصیل یہ ہے کہ ایام عدت میں اس کو اپنے گھر میں رہنے دے، اس کا پورا خرچ برداشت کرے، اگر مہر اب تک نہیں دیا ہے اور خلوت ہوچکی تو پورا مہر ادا کرے، اور خلوت سے پہلے ہی طلاق کا واقعہ پیش آگیا ہے تو آدھا مہر خوش دلی کے ساتھ ادا کرے، یہ تو سب حقوق واجبہ ہیں جو طلاق دینے والے کو لازمی طور پر ادا کرنا ہیں، اور مستحب اور افضل یہ بھی ہے کہ مطلقہ بی بی کو رخصت کرنے کے وقت کچھ نقد یا کم از کم ایک جوڑا دے کر رخصت کیا جائے، سبحان اللہ کیا پاکیزہ تعلیم ہے کہ جو چیزیں عرفاً جنگ و جدال اور لڑائی جھگڑے کے اسباب اور خاندانوں کی تباہی تک پہنچانے والی ہیں ان کو دائمی محبت و مسرّت میں تبدیل کردیا گیا۔

ان سب احکام کے بعد ارشاد فرمایا وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ، یعنی جو شخص ان حدود خداوندی کے خلاف کرے گا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا، آخرت میں تو ظاہر ہے کہ وہاں ہر ظلم وجور کا انتقام بارگاہِ خداوندی میں لیا جائے گا، اور جب تک مظلوم کا بدلہ ظالم سے نہ لے لیا جائے گا آگے نہ بڑھے گا۔

اور دنیا میں بھی اگر بصیرت اور تجربہ کے ساتھ غور کیا جائے تو نظر آئے گا کوئی ظالم بظاہر تو مظلوم پر ظلم کر کے اپنا دل ٹھنڈا کر لیتا ہے، لیکن اس کے نتائج بد اس دنیا میں بھی اس کو اکثر ذلیل وخوار کرتے ہیں، اور وہ سمجھے یا نہ سمجھے اکثر ایسی آفتوں میں مبتلا ہوتا ہے کہ ظلم کا نتیجہ اس کو دنیا میں بھی کچھ نہ کچھ چکھنا پڑتا ہے، اسی کو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے فرمایا ؎

پنداشت ستمگر کہ جفا بر ما کرد
برگردنِ وے بماند و بر ما بگذشت

قرآن کریم کا اسلوبِ حکیم اور خاص اندازِ بیان ہے، کہ وہ قانون کو دنیا کے قوانینِ تعزیرات کی طرح بیان نہیں کرتا، بلکہ مربیانہ انداز میں قانون کا بیان اس کی حکمت ومصلحت کی وضاحت اس کے خلاف کرنے میں انسان کی مضرت ونقصان کا ایسا سلسلہ بیان کرتا ہے جس کو دیکھ کر کوئی انسان جو انسانیت کے جامے سے باہر نہ ہو ان جرائم پر اقدام کر ہی نہیں سکتا، ہر قانون کے پیچھے خدا کا خوف و آخرت کا حساب یاد دلایا جاتا ہے۔

نکاح وطلاق کو کھیل نہ بناؤ دوسرا مسئلہ اس آیت میں یہ ارشاد فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو کھیل نہ بناؤ، وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا، کھیل بنانے کی ایک تفسیر تو یہ ہے کہ نکاح وطلاق کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو حدود و شروط مقرر کر دیتے ہیں اُن کی خلاف ورزی کرنا، اور دوسری تفسیر حضرت ابوالدرداءؓ سے منقول ہے وہ یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں بعض لوگ طلاق دے کر یا غلام آزاد کر کے مُکر جاتے اور کہتے تھے کہ میں نے تو ہنسی مذاق میں کہدیا تھا، طلاق یا عتاق کی نیت نہیں تھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس نے یہ فیصلہ کر دیا کہ طلاق ونکاح کو اگر کسی نے کھیل یا مذاق میں بھی پورا کر دیا تو وہ نافذ ہو جائیں گے نیت نہ کرنے کا عذر مسموع نہ ہوگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن میں ہنسی کے طور پر کرنا اور واقعی طور پر کرنا دونوں برابر ہیں، ایک طلاق، دوسرے عتاق، تیسرے نکاح (اخرجہ ابن مردویہ عن ابن عباسؓ وابن المنذر عن عبادۃ بن الصامتؓ)۔

اور حضرت ابوہریرۃؓ سے اس حدیث میں یہ الفاظ منقول ہیں:

ثلاث جدھن جد وھزلھن جد النکاح والطلاق والرجعۃ	"یعنی تین چیزیں ایسی ہیں جن کو قصد و ارادہ سے کہنا اور ہنسی مذاق کے طور پر کہنا برابر ہے، ایک نکاح دوسرے طلاق تیسری رجعت" (مظہری)

ان تینوں چیزوں میں حکم شرعی یہ ہے کہ دو مرد و عورت اگر بلا قصد نکاح ہنسی ہنسی میں گواہوں کے سامنے نکاح کا ایجاب و قبول کرلیں تو بھی نکاح منعقد ہو جاتا ہے، اسی طرح اگر بلا قصد ہنسی ہنسی میں صریح طور پر طلاق دیدے تو طلاق ہو جاتی ہے، یا رجعت کرے تو رجعت ہو جاتی ہے، ایسے ہی کسی غلام کو ہنسی میں آزاد کرنے کو کہہ دے تو غلام، باندی آزاد ہو جاتے ہیں، ہنسی مذاق کوئی عذر نہیں مانا جاتا۔

اس حکم کے بیان کے بعد پھر قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز میں انسان کو حق تعالیٰ کی اطاعت اور آخرت کے خوف کا سبق دیا، ارشاد فرمایا: وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ "یعنی یاد کرو اللہ تعالیٰ کی نعمت کو جو تم پر نازل فرمائی اور یاد کرو اس خاص نعمت کو جو کتاب و حکمت کی صورت میں بھیجی گئی اور اللہ سے ڈرو، اور سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں" تمھاری نیتوں اور ارادوں اور دلوں میں چھپے ہوئے بھیدوں سے باخبر ہیں، اس لئے اگر بیوی کو طلاق دے کر آزاد ہی کرنا ہو تو باہمی نزاع اور ایک دوسرے کی حق تلفی اور ظلم سے بچنے بچانے کی نیت سے کرو، غصہ کے انتقام یا بیوی کو ذلیل رسوا کرنے یا تکلیف پہنچانے کی نیت سے نہ کرو۔

طلاق میں اصل یہی ہے کہ صریح اور رجعی طلاق دی جائے

تیسرا مسئلہ جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا یہ ہے کہ شریعت وسنت کی نظر میں اصل یہی ہے کہ کوئی آدمی اگر طلاق دینے پر مجبور ہی ہو جائے تو صاف و صریح لفظوں میں ایک طلاق رجعی دیدے، تاکہ عدت تک رجعت کا حق باقی رہے، ایسے الفاظ نہ بولے جن سے فوری طور پر تعلقِ زوجیت منقطع ہو جائے جس کو طلاق بائن کہتے ہیں، اور نہ تین طلاق تک پہنچے، جس کے بعد آپس میں نکاح جدید بھی حرام ہو جائے، یہ اشارہ لفظ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ کو مطلق بلا قید کے ذکر کرنے سے حاصل ہوا، کیونکہ جو حکم اس آیت میں بتلایا ہے وہ اگرچہ صرف طلاقِ رجعی ایک دو تک کے لئے ہے، طلاق بائن یا تین طلاق کا یہ حکم نہیں، مگر قرآن کریم نے کوئی قید اس کی ذکر نہ فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ اصل طلاق مشروع رجعی طلاق ہی ہے، دوسری صورتیں کراہت یا ناپسندیدگی سے خالی نہیں۔

مطلقہ عورتوں کو اپنی مرضی کی شادی کرنے سے بلا وجہ شرعی روکنا حرام ہے

دوسری آیت میں اس ناروا ظالمانہ سلوک کا انسداد کیا گیا ہے، جو عام طور پر مطلقہ عورتوں کے ساتھ کیا جاتا ہے،

کہ اُن کو دوسری شادی کرنے سے روکا جاتا ہے، پہلا شوہر بھی عموماً اپنی مطلقہ بیوی کو دوسرے شخص کے نکاح میں جانے سے روکتا اور اس کو اپنی عزت کے خلاف سمجھتا ہے، اور بعض خاندانوں میں لڑکی کے اولیاء بھی اس کو دوسری شادی کرنے سے روکتے ہیں، اور ان میں بعض اس طمع میں روکتے ہیں کہ اس کی شادی پر ہم کوئی رقم اپنے لئے حاصل کرلیں، بعض اوقات مطلقہ عورت پھر اپنے سابق شوہر سے نکاح پر راضی ہوجاتی ہے، مگر عورت کے اولیاء واقرباء کو طلاق دینے کی وجہ سے ایک قسم کی عداوت اس سے ہوجاتی ہے، وہ اب دونوں کے راضی ہونے کے بعد بھی ان کے باہمی نکاح سے مانع ہوتے ہیں، آزاد عورتوں کو اپنی مرضی کی شادی سے بلا عذر شرعی روکنا خواہ پہلے شوہر کی طرف سے ہو یا لڑکی کے اولیاء کی طرف سے بڑا ظلم ہے، اس ظلم کا انسداد اس آیت میں فرمایا گیا ہے۔

اس آیت کا شانِ نزول بھی ایک ایسا ہی واقعہ ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت معقل بن یسارؓ نے اپنی بہن کی شادی ایک شخص کے ساتھ کردی تھی، اس نے طلاق دیدی اور عدت بھی گذر گئی، اس کے بعد یہ شخص اپنے فعل پر پشیمان ہوا، اور چاہا کہ دوبارہ نکاح کرلیں، اس کی بیوی یعنی معقل بن یسارؓ کی بہن بھی اس پر آمادہ ہوگئی، لیکن جب اس شخص نے معقلؓ سے اس کا ذکر کیا تو ان کو طلاق دینے پر غصہ تھا، انھوں نے کہا کہ میں نے تمھارا اعزاز کیا، اپنی بہن تمھارے نکاح میں دیدی تم نے اسکی قدر نہ کی کہ اسکو طلاق دیدی، اب پھر تم میرے پاس آئے ہو، کہ دوبارہ نکاح کردوں، خدا کی قسم: اب وہ تمھارے نکاح میں نہ لوٹے گی۔

اسی طرح ایک واقعہ جابر بن عبد اللہؓ کی چچازاد بہن کا پیش آیا تھا، ان واقعات پر آیتِ مذکورہ نازل ہوئی، جس میں معقلؓ اور جابرؓ کے اس رویہ کو ناپسند و ناجائز قرار دیا گیا۔

صحابۂ کرامؓ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے عاشق تھے، آیتِ کریمہ کے سنتے ہی معقل بن یسارؓ کا سارا غصہ ٹھنڈا ہوگیا، اور خود جاکر اس شخص سے بہن کا دوبارہ نکاح کردیا، اور قسم کا کفارہ ادا کیا، اسی طرح جابر بن عبد اللہؓ نے بھی تعمیل فرمائی۔

اس آیت کے خطاب میں وہ شوہر بھی داخل ہیں جنھوں نے طلاق دی ہے، اور لڑکی کے اولیاء بھی، دونوں کو یہ حکم دیا گیا کہ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ، "یعنی مت روکو مطلقہ عورتوں کو اس بات سے کہ وہ اپنے تجویز کئے ہوئے شوہروں سے نکاح کریں"، خواہ پہلے ہی شوہر ہوں جنھوں نے طلاق دی تھی، یا دوسرے لوگ، مگر اس کے ساتھ ہی یہ شرط لگادی گئی اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ "یعنی جب دونوں مرد و عورت شرعی قاعدہ کے مطابق رضامند ہوجائیں، تو نکاح سے نہ روکو، جس میں اشارہ

فرمایا گیا کہ اگر ان دونوں کی رضامندی نہ ہو کوئی کسی پر زور زبردستی کرنا چاہے تو سب کو روکنے کا حق ہے، یا رضامندی بھی ہو مگر شرعی قاعدہ کے موافق نہ ہو، مثلاً بلا نکاح آپس میں میاں بیوی کی طرح رہنے پر رضامند ہو جائیں، یا تین طلاقوں کے بعد ناجائز طور پر آپس میں نکاح کرلیں، یا ایامِ عدت میں دوسرے شوہر سے نکاح کا ارادہ ہو تو ہر مسلمان کو بالخصوص اُن لوگوں کو جن کا اِن مرد و عورت کے ساتھ تعلق ہے روکنے کا حق حاصل ہے، بلکہ بقدرِ استطاعت روکنا واجب ہے۔

اسی طرح کوئی لڑکی بلا اجازت اپنے اولیاء کے اپنے کفو کے خلاف دوسرے کفو میں نکاح کرنا چاہے، یا اپنے مہرِ مثل سے کم پر نکاح کرنا چاہے جس کا اثر خاندان پر پڑتا ہے جس کا اس کو حق نہیں، تو یہ رضامندی بھی قاعدۂ شرعی کے مطابق نہیں، اس صورت میں لڑکی کے اولیاء کو اس نکاح سے روکنے کا حق حاصل ہے، اِذَا تَرَاضَوْا کے الفاظ سے اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ عاقلہ بالغہ لڑکی کا نکاح بغیر اس کی رضا یا اجازت کے نہیں ہو سکتا۔

آیت کے آخر میں تین جملے ارشاد فرمائے گئے، ایک یہ کہ ذٰلِكَ يُوعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ، یعنی یہ احکام اُن لوگوں کے لئے ہیں جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں" اس میں اشارہ فرما دیا گیا کہ اللہ پر اور روزِ قیامت پر ایمان رکھنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آدمی ان احکامِ الٰہیہ کا پورا پابند ہو، اور جو لوگ ان احکام کے اتباع میں کوتاہی کرتے ہیں وہ سمجھ لیں کہ ان کے ایمان میں خلل ہے۔

دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ "یعنی ان احکام کی پابندی تمہارے لئے پاکی اور صفائی کا ذریعہ ہے" اس میں اشارہ فرمایا گیا کہ ان کی خلاف ورزی کا نتیجہ گناہوں کی غلاظت میں آلودگی اور فتنہ و فساد ہے، کیونکہ عاقلہ بالغہ جوان لڑکیوں کو مطلقاً نکاح سے روکا گیا تو ایک طرف اُن پر ظلم اور ان کی حق تلفی ہے، اور دوسری طرف اُن کی عفت و عصمت کو خطرہ میں ڈالنا ہے، تیسرے اگر خدانخواستہ وہ کسی گناہ میں مبتلا ہوں، تو اس کا وبال ان لوگوں پر بھی عائد ہوگا جنھوں نے ان کو نکاح سے روکا، اور وبالِ آخرت سے پہلے بہت ممکن ہے کہ ان مجبور عورتوں کا یہ ابتلاء خود مَردوں میں جنگ و جدال اور قتل و قتال تک نوبت پہنچا دے جیسا کہ رات دن مشاہدہ میں آتا ہے، اس صورت میں وبالِ آخرت سے پہلے ان کا عمل دنیا ہی میں وبال بن جائے گا، اور اگر مطلقاً نکاح سے تو نہ روکا، مگر ان کی پسند کے خلاف دوسرے شخص سے نکاح پر مجبور کیا گیا تو اس کا نتیجہ بھی دائمی مخالفت اور فتنہ و فساد یا طلاق و خلع ہوگا، جس کے ناگوار

اثرات ظاہر ہیں، اس لئے فرمایا گیا کہ ان کو ان کے تجویز کئے ہوئے شوہروں سے نکاح کرنے سے نہ روکنا ہی تمھارے لئے پاکی اور صفائی کا ذریعہ ہے۔

تیسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ "یعنی تمہاری مصلحتوں کو اللہ تعالیٰ جانتے ہیں تم نہیں جانتے"، اس ارشاد کا منشا یہ ہے کہ جو لوگ مطلقہ عورتوں کو نکاح سے روکتے ہیں وہ اپنے نزدیک اس میں کچھ مصالح اور فوائد سوچتے ہیں، مثلاً اپنی عزت وغیرت کا تخیل، یا یہ کہ اُن کی شادی کے بدلے کچھ مالی منفعت حاصل کی جائے، اس شیطانی تلبیس اور بے جا مصلحت اندیشی کے ازالہ کے لئے فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ تمھاری مصلحتوں اور فائدوں سے خوب واقف ہیں، اُن کی رعایت کرکے احکام دیتے ہیں، اور تم چونکہ حقائق امور اور معاملات کے انجام سے بے خبر ہو، اس لئے اپنے ناتمام غور و فکر اور ناقص رائے سے کبھی ایسی چیزوں کو مصلحت اور فائدہ سمجھ لیتے ہو جس میں تمھاری ہلاکت و بربادی ہے، تم جس عزت وغیرت کو تھامتے پھرتے ہو اگر مطلقہ عورتیں بے قابو ہوگئیں تو سب عزت خاک میں مل جائے گی، اور مالی منافع کے ناجائز تصورات ممکن ہے کہ تھیں ایسے فتنوں اور جھگڑوں میں مبتلا کر دیں جن میں مال کے ساتھ جان کا بھی خطرہ ہو جائے۔

قانون سازی اور اسکی تنفیذ میں قرآن کریم کا بینظیر حکیمانہ اصول

قرآن کریم نے اس جگہ ایک قانون پیش فرمایا کہ مطلقہ عورتوں کو اپنی مرضی کے مطابق نکاح سے روکنا جرم ہے، اس قانون کو بیان فرمانے کے بعد اس پر عمل کرنے کو سہل اور اس کے لئے عوام کے ذہنوں کو ہموار کرنے کے واسطے تین جملے ارشاد فرمائے جن میں سے پہلے جملے میں روزِ قیامت کے حساب اور جرائم کی سزا سے ڈرا کر انسان کو اس قانون پر عمل کرنے کے لئے آمادہ فرمایا، دوسرے جملے میں اس قانون کی خلاف ورزی میں جو مفاسد اور انسانیت کے لئے مضرتیں ہیں ان کو بتلا کر قانون کی پابندی کے لئے تیار کیا، تیسرے جملے میں یہ ارشاد فرمایا کہ تمھاری اپنی مصلحت بھی اسی میں ہے کہ خدا تعالیٰ کے بتائے ہوئے قانون کی پابندی کرو، اس کے خلاف کرنے میں اگر تم کوئی مصلحت سوچتے ہو تو وہ تمھاری کوتاہ نظری اور عواقب سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔

قرآنِ کریم کا یہ اسلوب اور طرزِ بیان صرف یہیں نہیں بلکہ تمام احکام میں جاری ہے، کہ ایک قانون بتایا جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ اور آخرت کے حساب و عذاب سے ڈرایا جاتا ہے، ہر قانون کے آگے پیچھے اِتَّقُوا اللّٰهَ یا اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ، اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ، وغیرہ جملے لگائے ہوئے ہیں، قرآن ساری دنیا اور قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے ایک مکمل نظامِ حیات اور ہر شعبۂ زندگی پر حاوی قانون

ہو، اس میں حدود و تعزیرات کا بھی بیان ہے، لیکن اس کی ادا ساری دنیا کے قانون کی کتابوں سے نرالی ہے، اس کا طرزِ بیان حاکمانہ سے زیادہ مربیانہ ہے، اس میں ہر قانون کے بیان کے ساتھ اس کی کوشش کی گئی ہے کہ کوئی انسان اس قانون کی خلاف ورزی کر کے مستحق سزا نہ بنے، دنیا کی حکومتوں کی طرح نہیں کہ انھوں نے ایک قانون بنا دیا، اور شائع کر دیا، جو کوئی اس قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ اپنی سزا بھگتتا ہے۔

اس کے علاوہ اس اسلوبِ قرآن اور اس کے مخصوص اندازِ بیان سے ایک دُوررس بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کو دیکھنے سننے کے بعد انسان اس قانون کی پابندی صرف اس بناء پر نہیں کرتا کہ اگر خلاف کرے گا تو دنیا میں اس کو کوئی سزا مل جائے گی، بلکہ دنیا کی سزا سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور آخرت کی سزا کی فکر ہوتی ہے، اور اسی فکر کی بناء پر اس کا ظاہر و باطن، خفیہ و علانیہ برابر ہو جاتا ہے، وہ کسی ایسی جگہ میں بھی قانون کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا جہاں کسی ظاہری یا خفیہ پولیس کی بھی رسائی نہ ہو، کیونکہ اس کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ ہر جگہ حاضر و ناظر اور ذرہ ذرہ سے باخبر ہیں، یہی سبب ہو کہ قرآنی تعلیم نے جو اصولِ معاشرت تیار کئے تھے ہر مسلمان اس کی پابندی کو اپنا مقصدِ حیات تصوّر کرتا تھا۔

قرآنی نظامِ حکومت کا یہی امتیاز ہے کہ اس میں ایک طرف قانون کی حدود و قیود کا ذکر ہے تو دوسری طرف ترغیب و ترہیب کے ذریعہ انسان کے اخلاق و کردار کو ایسا بلند کیا گیا ہے کہ قانونی حدود و قیود اس کے لئے ایک طبعی چیز بن جاتی ہیں، جس کے سامنے وہ اپنے جذبات اور تمام نفسانی خواہشات کو پس پشت ڈال دیتا ہے، دنیا کی حکومتوں اور قوموں کی تاریخ اور انہیں جرم و سزا کے واقعات پر ذرا گہری نظر ڈالئے تو معلوم ہو گا کہ نرے قانون سے کبھی کسی قوم یا فرد کی اصلاح نہیں ہوئی محض پولیس اور فوج سے کبھی جرائم کا انسداد نہیں ہوا جب تک قانون کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے خوف و عظمت کا سکہ اس کے قلب پر نہ بیٹھے، جرائم سے روکنے والی چیز در اصل خوفِ خدا اور خوفِ حسابِ آخرت ہے، یہ نہ ہو تو کوئی شخص کسی سے جرائم کو نہیں چھڑا سکتا۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ

اور بچے والی عورتیں دودھ پلادیں اپنے بچوں کو دو برس پورے جو کوئی چاہے کہ پوری

اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۭ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ

کرے دودھ کی مدّت اور لڑکے والے یعنی باپ پر ہے کھانا اور کپڑا اُن عورتوں کا

بِالْمَعْرُوْفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا

موافق دستور کے، تکلیف نہیں دی جاتی کسی کو مگر اس کی گنجائش کے موافق، نہ نقصان دیا جائے ماں کو اس کے بچہ کی

وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا

وجہ سے اور نہ اسکو جس کا وہ بچہ ہے یعنی باپ کو اسکے بچہ کی وجہ سے اور وارثوں پر بھی یہی لازم ہے پھر اگر ماں باپ چاہیں کہ دودھ

عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ

چھڑا لیں یعنی دو برس کے اندر ہی اپنی رضا اور مشورے سے تو اُن پر کچھ گناہ نہیں اور اگر تم لوگ چاہو کہ دودھ

تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ

بلواؤ کسی دایہ سے اپنی اولاد کو تو بھی تم پر کچھ گناہ نہیں جب کہ حوالے کر دو جو تم نے دینا ٹھہرایا تھا

بِالْمَعْرُوْفِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ

موافق دستور کے اور ڈرو اللہ سے اور جان رکھو کہ اللہ تمہارے سب کاموں کو خوب دیکھتا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۳، رضاعت: اور مائیں اپنی اولاد کو دو سال کامل دودھ پلایا کریں (یہ مدت اس کے لئے ہے) جو شیر خوارگی کی تکمیل کرنا چاہے، اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ ہے ان ماؤں کا کھانا کپڑا قاعدہ کے موافق، اور کسی شخص کو کوئی حکم نہیں دیا جاتا مگر اس کی برداشت کے موافق، کسی ماں کو تکلیف نہیں پہونچانا چاہئے اس کے بچے کی وجہ سے اور نہ کسی کے باپ کو تکلیف دینی چاہئے اس کے بچہ کی وجہ سے اور (اگر باپ زندہ نہ ہو تو) مثل طریق مذکور کے (بچے کی پرورش کا انتظام) اس کے (محرم قرابت دار کے) ذمہ ہے جو (شرعاً بچے کا) وارث (ہونے کا حق رکھتا) ہے پھر (یہ سمجھ لو کہ) اگر دونوں (ماں اور باپ دو سال سے کم ہی) دودھ چھڑانا چاہیں باہمی رضامندی اور مشورے سے تو بھی ان دونوں پر کسی قسم کا گناہ نہیں اور اگر تم لوگ (ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی کسی مصلحت ضروریہ سے مثلاً یہ کہ ماں کا دودھ اچھا نہیں بچے کو ضرر ہوگا) اپنے بچوں کو کسی اور انّا کا دودھ پلوانا چاہو تب بھی تم پر کوئی گناہ نہیں، جبکہ اُن کے حوالے کر دو جو کچھ ان کو دینا طے کیا ہے، قاعدہ کے موافق، اور حق تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھ رہے ہیں۔

معارف و مسائل

اس آیت میں رضاعت یعنی بچوں کو دودھ پلانے کے متعلق احکام ہیں، اس سے پہلی اور بعد کی آیات میں طلاق کے احکام مذکور ہیں، درمیان میں دودھ پلانے کے احکام اس مناسبت سے

ذکر کئے گئے ہیں کہ عموماً طلاق کے بعد بچوں کی پرورش اور دودھ پلانے یا پلوانے کے معاملات زیر نزاع آجاتے ہیں، اور ان میں جھگڑے فساد ہوتے ہیں، اس لئے اس آیت میں ایسے معتدل احکام بیان فرمادیئے گئے جو عورت و مرد دونوں کے لئے سہل اور مناسب ہیں، خواہ دودھ پلانے یا چھڑانے کے معاملات قیام نکاح کی حالت میں پیش آئیں یا طلاق دینے کے بعد، بہردو صورت اس کا ایک ایسا نظام بتا دیا گیا جس سے جھگڑے فساد یا کسی فریق پر ظلم و تعدی کا راستہ نہ رہے۔

مثلاً آیۃ کے پہلے جملے میں ارشاد فرمایا: وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ، یعنی "مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلایا کریں دو سال کامل جبکہ کوئی عذر قوی اس سے پہلے دودھ چھڑانے کے لئے مجبور نہ کرے"۔

اس آیت سے رضاعت کے چند مسائل معلوم ہوئے :۔

دودھ پلانا ماں کے ذمہ واجب ہے اوّل یہ کہ دودھ پلانا دیانۃً ماں کے ذمہ واجب ہے، بلا عذر کسی ضد یا ناراضی کے سبب دودھ نہ پلائے تو گنہگار ہوگی، اور دودھ پلانے پر وہ شوہر سے کوئی اجرت و معاوضہ نہیں لے سکتی، جبتک وہ اس کے اپنے نکاح میں ہے، کیونکہ وہ اس کا اپنا فرض ہے۔

پوری مدتِ رضاعت دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ پوری مدتِ رضاعت دو سال ہے، جب تک کوئی خاص عذر مانع نہ ہو بچے کا حق ہے کہ یہ مدت پوری کی جائے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دودھ پلانے کے لئے پوری مدت دو سال دی گئی ہے، اس کے بعد دودھ نہ پلایا جائے، البتہ بعض آیاتِ قرآن اور احادیث کی بناء پر امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر تین۳ مہینے یعنی ڈھائی سال کے عرصہ میں بھی دودھ پلا دیا تو احکام رضاعت کے ثابت ہوجائیں گے، اور اگر بچے کی کمزوری وغیرہ کے عذر سے ایسا کیا گیا تو گناہ بھی نہ ہوگا، ڈھائی سال پورے ہونے کے بعد بچہ کو ماں کا دودھ پلانا باتفاق حرام ہے۔

اس آیت کے دوسرے جملے میں ارشاد ہے وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا، یعنی "باپ کے ذمہ ہے ماؤں کا کھانا اور کپڑا قاعدہ کے موافق، کسی شخص کو ایسا حکم نہیں دیا جاتا جس کو وہ برداشت نہ کرسکے"۔

اس میں پہلی بات قابلِ غور یہ ہے کہ ماؤں کے لئے تو قرآن نے لفظ وَالْوَالِدٰتُ استعمال کیا، مگر باپ کے لئے مختصر لفظ وَالِدُ چھوڑ کر اَلْمَوْلُودِ لَهُ اختیار فرمایا، حالانکہ قرآن میں دوسری جگہ لفظ والد بھی مذکور ہے، لَا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَلَدِهٖ (۳۱: ۳۳)، مگر یہاں والد کی جگہ مَوْلُوْدٌ لَهُ کے اختیار کرنے میں ایک خاص راز ہے، وہ یہ کہ پورے قرآن کریم کا ایک خاص اسلوب اور طرز بیان ہے کہ وہ کسی قانون کو دنیا کی حکومتوں کی طرح بیان نہیں کرتا، بلکہ مربیانہ اور مشفقانہ

طرز سے بیان کرتا ہے، اور ایسے انداز سے بیان کرتا ہے، جس کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا انسان کے لئے آسان ہو جائے۔

یہاں بھی چونکہ بچّہ کا نفقہ باپ کے ذمہ ڈالا گیا ہے، حالانکہ وہ ماں اور باپ کی متاع مشترک ہے، تو ممکن تھا کہ باپ کو یہ حکم کچھ بھاری معلوم ہو اس لئے بجائے وَالِد کے مَوْلُوْدٌ لَّهٗ کا لفظ اختیار کیا (وہ شخص جس کا بچّہ ہے) اس میں اس طرف اشارہ کر دیا کہ اگرچہ بچے کی تولید میں ماں اور باپ دونوں کی شرکت ضرور ہے، مگر بچّہ باپ ہی کا کہلاتا ہے، نسب باپ ہی سے چلتا ہے، اور جب بچہ اس کا ہوا تو ذمہ داری خرچ کی اس کو بھاری نہ معلوم ہونی چاہئے۔

بچے کو دودھ پلانا ماں کے ذمّہ اور ماں کا نان و نفقہ، ضروریات باپ کے ذمہ ہیں

تیسرا مسئلہ شرعیہ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ اگرچہ دودھ پلانا ماں کے ذمہ ہے، لیکن ماں کا نان نفقہ اور ضروریاتِ زندگی باپ کے ذمہ ہے، اور یہ ذمّہ داری جس وقت تک بچّے کی ماں اس کے نکاح میں یا عدت میں ہے اس وقت تک ہے اور طلاق اور عدّت پوری ہونے کے بعد نفقۂ زوجیت تو ختم ہو جائے گا، مگر بچّے کو دودھ پلانے کا معاوضہ دینا باپ کے ذمہ پھر بھی لازم رہے گا (مظہری)

زوجہ کا نفقہ شوہر کی حیثیت کے مناسب ہونا چاہئے یا زوجہ کی

چوتھا مسئلہ اس پر تو اتفاق ہے کہ میاں بیوی دونوں امیر مالدار ہوں تو نفقہ امیرانہ واجب ہوگا اور دونوں غریب ہوں تو نفقہ غریبانہ واجب ہوگا، البتہ جب دونوں کے حالات مالی مختلف ہوں تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، صاحبِ ہدایہ نے خصّاف کے اس قول پر فتوی دیا ہے کہ اگر عورت غریب اور مرد مالدار ہو تو اس کا نفقہ درمیانہ حیثیت کا دیا جائے گا کہ غریبوں سے زائد مالداروں سے کم، اور کرخیؒ کے نزدیک اعتبار شوہر کے حال کا ہوگا، فتح القدیر میں بہت سے فقہاء کا فتوٰی اس پر نقل کیا ہے، واللہ اعلم (فتح القدیر ص ۴۲۲ ج ۳)

آیت مذکورہ میں احکام کے بعد ارشاد فرمایا لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ "یعنی نہ تو کسی ماں کو اُس کے بچّے کی وجہ سے تکلیف میں ڈالنا جائز ہے، اور نہ کسی باپ کو اس کے بچّے کی وجہ سے"، مطلب یہ ہے کہ بچے کے ماں باپ آپس میں ضد اضدی نہ کریں، مثلاً ماں دودھ پلانے سے معذور ہو اور باپ اس پر یہ سمجھ کر زبردستی کرے کہ آخر اس کا بھی تو بچہ ہے، یہ مجبور ہوگی اور پلا دے گی، یا باپ مفلس ہے، اور ماں کو کوئی معذوری بھی نہیں پھر دودھ پلانے سے اس لئے انکار کرے کہ اس کا بھی تو بچّہ ہے، جھک مار کر کسی سے پلوائے گا۔

ماں کو دودھ پلانے پر مجبور کرنے یا نہ کرنے کی تفصیل

لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا سے **پانچواں مسئلہ** یہ معلوم ہوا کہ ماں اگر بچّہ کو دودھ پلانے سے کسی ضرورت کے سبب انکار کرے

توباپ کو اسے مجبور کرنا جائز نہیں، اور اگر بچہ کسی دوسری عورت یا جانور کا دودھ نہیں لیتا تو ماں کو مجبور کیا جائے گا، یہ مسئلہ وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ سے معلوم ہوا۔

عورت جب تک نکاح میں ہے تو اپنے بچے کو دودھ پلانے کی اجرت کا مطالبہ نہیں کر سکتی، طلاق وعدت کے بعد کر سکتی ہے

چھٹا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اگر بچے کی ماں دودھ پلانے کی اجرت مانگتی ہے تو جب تک اس کے نکاح یا عدت کے اندر ہے، اجرت کے مطالبہ کا حق نہیں، یہاں اس کا نان نفقہ جو باپ کے ذمہ ہے وہی کافی ہے، مزید اجرت کا مطالبہ باپ کو ضرر پہنچانا ہے، اور اگر طلاق کی عدت گذر چکی ہے اور نفقہ کی ذمہ داری ختم ہو چکی ہے، اب اگر یہ مُطلقہ بیوی اپنے بچے کو دودھ پلانے کا معاوضہ باپ سے طلب کرتی ہے تو باپ کو دینا پڑے گا، کیونکہ اس کے خلاف کرنے میں ماں کا نقصان ہے، شرط یہ ہے کہ یہ معاوضہ اتنا ہی طلب کرے کہ جتنا کوئی دوسری عورت لیتی ہے، زائد کا مطالبہ کرے گی تو باپ کو حق ہوگا کہ اس کی بجائے کسی اَنّا کا دُودھ پلوائے۔

یتیم بچے کے دودھ پلوانے کی ذمہ داری کس پر ہے؟

آیت متذکرہ میں اس کے بعد یہ ارشاد ہے: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ یعنی اگر باپ زندہ نہ ہو تو بچے کو دودھ پلانے یا پلوانے کا انتظام اس شخص پر ہے جو بچے کا جائز وارث اور محرم ہو، یعنی اگر بچہ مرجائے تو جن کو اس کی وراثت پہنچتی ہو وہی باپ نہ ہونے کی حالت میں اس کے نفقہ کے ذمہ دار ہوں گے، اگر ایسے وارث کئی ہوں تو ہر ایک پر بقدر میراث اس کی ذمہ داری عائد ہوگی، امام اعظم ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ یتیم بچے کو دودھ پلوانے کی ذمہ داری وارث پر ڈالنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نابالغ بچے کا خرچہ دودھ چھڑانے کے بعد بھی وارثوں پر ہوگا، کیونکہ دودھ کی کوئی خصوصیت نہیں، مقصود بچے کا گذارہ ہے، مثلاً اگر یتیم بچے کی ماں اور دادا زندہ ہیں تو یہ دونوں اس بچے کے محرم بھی ہیں اور وارث بھی، اس لئے اس کا نفقہ ان دونوں پر بقدر حصہ میراث عائد ہوگا، یعنی ایک تہائی خرچہ ماں کے ذمہ اور دو تہائی دادا کے ذمہ ہوگا، اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یتیم پوتہ کا حق دادا پر اپنے بالغ بیٹوں سے بھی زیادہ ہو، کیونکہ بالغ اولاد کا نفقہ اس کے ذمہ نہیں اور یتیم پوتے کا نفقہ اس کے ذمہ واجب ہے، ہاں میراث میں بیٹوں کے موجود ہوتے ہوئے پوتے کو حقدار بنانا اصولِ میراث اور انصاف کے خلاف ہے، کہ قریب تر اولاد کے ہوتے ہوئے بعید کو دینا معقول بھی نہیں، اور صحیح بخاری کی حدیث لِأَوْلٰى رَجُلٍ ذَكَرٍ کے بھی خلاف ہے، البتہ دادا کو یہ حق ہے کہ اگر ضرورت سمجھے تو یتیم پوتہ کے لئے کچھ وصیت کر جائے، اور یہ وصیت بیٹوں کے حصہ سے زائد بھی ہو سکتی ہے اسی طرح یتیم پوتہ کی ضرورت کو بھی پورا کر دیا گیا اور وراثت کا اصول کہ قریب کے ہوتے ہوئے بعید کو نہ دیا جائے یہ بھی محفوظ رہا۔

دودھ چھڑانے کے احکام اس کے بعد آیتِ متذکرہ میں ارشاد ہوتا ہے فَاِنۡ اَرَادَا فِصَالًا عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا "یعنی اگر بچے کے ماں باپ دونوں آپس کی رضامندی اور باہمی مشورے سے یہ ارادہ کریں کہ شیرخوارگی کی مدت یعنی دو سال سے کم میں ہی دودھ چھڑا دیں، خواہ ماں کی معذوری کے سبب یا بچے کی کسی بیماری کے سبب، تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں" آپس کے مشورے اور رضامندی کی شرط اس لئے لگائی کہ دودھ چھڑانے میں بچے کی مصلحت پیش نظر ہونی چاہئے، آپس کے لڑائی جھگڑے کا بچے کو تختۂ مشق نہ بنائیں۔

ماں کے سوا دوسری عورت کا دودھ پلوانے کے احکام آخر میں ارشاد فرمایا گیا وَاِنۡ اَرَدۡتُّمۡ اَنۡ تَسۡتَرۡضِعُوۡۤا اَوۡلَادَكُمۡ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ اِذَا سَلَّمۡتُمۡ مَّاۤ اٰتَيۡتُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ "یعنی اگر تم یہ چاہو کہ اپنے بچوں کی کسی مصلحت سے ماں کی بجائے کسی انّا کا دودھ پلواؤ تو اس میں بھی کچھ گناہ نہیں، شرط یہ ہے کہ دودھ پلانے والی کی جو اجرت مقرر کی گئی تھی وہ پوری پوری ادا کر دیں" اور اگر اس کو مقررہ اجرت نہ دی گئی تو اس کا گناہ ان کے ذمہ رہے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ماں دودھ پلانے پر راضی ہے لیکن باپ یہ دیکھتا ہے کہ ماں کا دودھ بچے کے لئے مضر ہے تو ایسی حالت میں اس کو حق ہے کہ ماں کو دودھ پلانے سے روک دے اور کسی انّا سے پلوائے۔

اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ جس عورت کو دودھ پلانے پر رکھا جائے اس سے معاملہ تنخواہ یا اُجرت کا پوری صفائی کے ساتھ طے کر لیا جائے کہ بعد میں جھگڑا نہ پڑے، اور پھر وقت مقررہ پر یہ طے شدہ اجرت اس کو سپرد بھی کر دے، اس میں ٹال مٹول نہ کرے۔

یہ سب احکامِ رضاعت بیان کرنے کے بعد پھر قرآن نے اپنے مخصوص انداز اور اسلوب کے ساتھ قانون پر عمل کو آسان کرنے اور ظاہر و غائب ہر حال میں اس کا پابند رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کے علمِ محیط کا تصور سامنے کر دیا، ارشاد ہوتا ہے وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ "یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور یہ سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کھلے اور چھپے اور ظاہر و غائب کو پوری طرح دیکھ رہے ہیں" اور وہ تمہارے دلوں کے مخفی ارادوں اور نیتوں سے باخبر ہیں، اگر کسی فریق نے دودھ پلانے یا چھڑانے کے مذکورہ احکام کی خلاف ورزی کی یا بچے کی مصلحت کو نظر انداز کر کے اس بارے میں کوئی فیصلہ کیا تو وہ مستحق سزا ہوگا۔

وَالَّذِيۡنَ يُتَوَفَّوۡنَ مِنۡكُمۡ وَيَذَرُوۡنَ اَزۡوَاجًا يَّتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِهِنَّ

اور جو لوگ مر جاویں تم میں سے اور چھوڑ جاویں اپنی عورتیں تو چاہئے کہ وہ عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپکو

اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا

چار مہینے اور دس دن ، پھر جب پورا کر چکیں اپنی عدت کو تو تم پر کچھ گناہ نہیں اس بات میں کہ کریں وہ

فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾ وَلَا جُنَاحَ

اپنے حق میں قاعدے کے موافق اور اللہ کو تمہارے تمام کاموں کی خبر ہے ، اور کچھ گناہ نہیں

عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاۗءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ

تم پر اس میں کہ اشارہ میں کہو پیغام نکاح اُن عورتوں کا یا پوشیدہ رکھو اپنے دل میں

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ

اللہ کو معلوم ہے کہ تم البتہ اُن عورتوں کا ذکر کرو گے لیکن ان سے نکاح کا وعدہ نہ کر رکھو چھپکر مگر یہی کہ

تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ڛ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ

کہہ دو کوئی بات رواج شریعت کے موافق اور نہ ارادہ کرو نکاح کا یہاں تک کہ پہنچ جاوے عدت مقررہ

الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ

اپنی انتہاء کو اور جان رکھو کہ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ تمہارے دل میں ہے سو اس سے ڈرتے رہو

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾ ع ۳۰ / ۱۴

اور جان رکھو کہ اللہ بخشنے والا اور تحمل کرنیوالا ہے

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۳۱، شوہر کی وفات ہونیکی صورت میں عدت کا بیان

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ (الیٰ قولہ) وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ اور جو لوگ تم میں وفات پا جاتے ہیں، اور بیبیاں چھوڑ جاتے ہیں وہ بیبیاں اپنے آپ کو (نکاح وغیرہ سے) روکے رکھیں چار مہینے اور دس دن پھر جب اپنی (عدت کی) میعاد ختم کرلیں تو تم کو (بھی) کچھ گناہ نہ ہوگا، ایسی بات (کے جائز رکھنے) میں کہ وہ عورتیں اپنی ذات کے لئے کچھ کارروائی (نکاح کی) کریں قاعدہ کے موافق (البتہ اگر کوئی بات خلاف قاعدۂ شرع کے کریں اور تم باوجود روک سکنے کے نہ روکو تو تم بھی شریک گناہ ہوگے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے تمام افعال کی خبر رکھتے ہیں۔

حکم نمبر ۳۲، عدت میں نکاح کا پیغام دینا

اور تم پر کوئی گناہ نہیں ہوگا جو ان مذکورہ عورتوں کو (جو عدتِ وفات میں ہیں) پیغام (نکاح) دینے کے بارے میں کوئی بات اشارۃً کہدو (مثلاً یہ کہ مجھ کو ایک نیک عورت سے نکاح کی ضرورت ہے) یا اپنے دل میں (آئندہ نکاح کرنے کے ارادہ کو) پوشیدہ رکھو (جب بھی گناہ نہیں اور وجہ اس اجازت کی یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ کو یہ بات معلوم ہے کہ تم ان عورتوں کا (ضرور) ذکر مذکور کروگے (سو خیر ذکر مذکور کرو) لیکن ان سے (صاف لفظوں میں) نکاح کا وعدہ (اور گفتگو) مت کرو مگر یہ کہ کوئی بات قاعدہ کے موافق کہو (تو مضائقہ نہیں، اور وہ بات قاعدہ کے مطابق یہی ہے کہ اشارۃً کہو) اور تم تعلقِ نکاح (فی الحال) کا ارادہ بھی مت کرو، یہاں تک کہ عدت اپنے مقررہ وقت پر ختم ہوجائے، اور یقین رکھو اس کا کہ اللہ کو اطلاع ہے تمہارے دلوں کی بات کی سو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو (اور ناجائز امر کا دل میں ارادہ بھی مت کیا کرو) اور (یہ بھی) یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ معاف بھی کرنے والے ہیں اور حلیم بھی ہیں۔

معارف و مسائل

عدت کے بعض احکام

(۱) جس کا خاوند مرجائے اس کو عدت کے اندر خوشبو لگانا، سنگھار کرنا، سُرمہ اور تیل بلاضرورتِ دوا لگانا، مہندی لگانا، رنگین کپڑے پہننا درست نہیں، اور صریح گفتگوئے نکاحِ ثانی بھی درست نہیں، جیسا اگلی آیت میں آتا ہے، اور رات کو دوسرے گھر میں رہنا بھی درست نہیں، ترجمہ میں "نکاح" کے ساتھ جو "وغیرہ" کہا گیا ہے اس سے یہی امور مراد ہیں، اور یہی حکم ہے اس عورت کا جس پر طلاق بائن واقع ہوئی، یعنی جس میں رجعت درست نہیں، مگر اس کو اپنے گھر سے دن کو بھی بدون سخت مجبوری کے نکلنا درست نہیں۔

(۲) اگر چاند رات کو خاوند کی وفات ہوئی تب تو یہ مہینے خواہ تیس کے ہوں خواہ انتیس کے ہوں، چاند کے حساب سے پورے کئے جاویں گے، اور اگر چاند رات کے بعد وفات ہوئی ہے تو یہ سب مہینے تیس تیس دن کے حساب سے پورے کئے جاویں گے، پس کُل ایک سو تیس دن پورے کریں گے، اس مسئلہ سے بہت لوگ غافل ہیں، اور جس وقت وفات ہوئی ہو جب یہ مدت گزر کر وہی وقت آوے گا، عدت ختم ہوجاوے گی، اور یہ جو فرمایا کہ اگر عورتیں قاعدہ کے موافق کچھ کریں تو تم کو بھی گناہ نہ ہوگا، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کوئی کام خلافِ شرع کرے تو اوروں پر بھی واجب ہوتا ہے کہ بشرطِ قدرت اس کو روکیں، ورنہ یہ لوگ بھی گنہگار ہوتے ہیں، اور قاعدہ کے موافق سے یہ مراد ہے کہ جو نکاح تجویز ہو وہ شرعاً صحیح اور جائز ہو، تمام شرائط حلت کی وہاں جمع ہوں۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ

کچھ گناہ نہیں تم پر اگر طلاق دو تم عورتوں کو اس وقت کہ اُن کو ہاتھ بھی نہ لگایا ہو اور نہ مقرر کیا ہو اُن کے

فَرِيْضَةً ۚۖ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا

لئے کچھ مہر اور اُن کو کچھ خرچ دو مقدور والے پر اس کے موافق ہو اور تنگی والے پر اس کے موافق جو خرچ کہ

بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾ وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ

قاعدے کے موافق ہے لازم ہے نیکی کرنے والوں پر ، اور اگر طلاق دو اُن کو ہاتھ لگانے سے پہلے اور

اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ

ٹھہرا چکے تھے تم اُن کے لئے مہر تو لازم ہوا آدھا اس کا کہ تم مقرر کر چکے تھے مگر یہ کہ درگذر

اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ

کریں عورتیں یا درگذر کرے وہ شخص کہ اس کے اختیار میں ہے گرہ نکاح کی یعنی خاوند اور تم مرد درگذر کرو تو قریب

لِلتَّقْوٰى ۭ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾

ہے پرہیزگاری سے اور نہ بھلا دو احسان کرنا آپس میں بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو خوب دیکھتا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۳۳، طلاق قبل الدخول کی صورت میں مہر کے وجوب اور عدم وجوب کا بیان طلاق قبل الدخول کے معنی یہ ہیں کہ زوجین میں یک جائی اور خلوتِ صحیحہ سے پہلے ہی طلاق کی نوبت آجائے، اس کی دو صورتیں ہیں، یا تو اس نکاح کے وقت مہر مقرر کی مقدار متعین نہیں کی گئی، یا مقدار مہر متعین کر دی گئی، پہلی صورت کا حکم اولاً مذکور ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ (الیٰ قولہ) حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ۝

یعنی تم پر (مہر کا) کچھ مواخذہ نہیں اگر بیبیوں کو ایسی حالت میں طلاق دے دو کہ نہ ان کو تم نے ہاتھ لگایا ہے اور نہ ان کے لئے کچھ مہر مقرر کیا ہے، (سو اس صورت میں مہر اپنے ذمہ مت سمجھو) اور (صرف) ان کو (ایک) فائدہ پہنچاؤ صاحب وسعت کے ذمہ اس کی حیثیت کے موافق ہے، اور تنگدست کے ذمہ اس کی حیثیت کے موافق ہے، ایک خاص قسم کا فائدہ پہنچانا جو قاعدہ کے موافق واجب ہے، خوش معاملہ لوگوں پر (یعنی سب مسلمانوں پر، کیونکہ خوش معاملگی کا بھی سب ہی کو حکم ہے، مراد اس

سے ایک جوڑا کپڑوں کا دینا ہے)۔

اور دوسری صورت کا حکم یہ ہے: وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ (الیٰ قولہ) اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ اور اگر تم ان بیبیوں کو طلاق دو قبل اس کے کہ اُن کو ہاتھ لگاؤ، اور ان کے لئے کچھ مہر بھی مقرر کر چکے تھے تو (اس صورت میں) جتنا مہر تم نے مقرر کیا ہو اس کا نصف (واجب) ہے، (اور نصف معاف) مگر (دو صورتیں اس مجموعی حکم سے مستثنیٰ ہیں، ایک صورت تو) یہ کہ وہ عورتیں (اپنا نصف) بھی معاف کر دیں (تو اس صورت میں نصف بھی واجب نہ رہا) یا (دوسری صورت) یہ (ہے) کہ وہ شخص رعایت کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کا تعلق (رکھنا اور توڑنا) ہے (یعنی خاوند پورا مہر ہی اس کو دیدے تو اس صورت میں خاوند کی مرضی سے پورا ہی مہر ادا کرنا ہوگا) اور (اے اہل حق) تمہارا (اپنے حقوق کو) معاف کر دینا (بہ نسبت وصول کرنے کے) تقویٰ سے زیادہ قریب ہے (کیونکہ معاف کرنے سے ثواب ملتا ہے، اور ثواب کا کام کرنا ظاہر ہے کہ تقویٰ کی بات ہے) اور آپس میں احسان (اور رعایت) کرنے سے غفلت مت کرو، (بلکہ ہر شخص دوسرے کے ساتھ رعایت کرنے کا خیال رکھا کرے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو خوب دیکھتے ہیں (تو تم اگر کسی کے ساتھ رعایت و احسان کروگے اللہ تعالیٰ اس کی جزائے خیر تم کو دیں گے) (بیان القرآن)

معارف ومسائل

لَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ (الیٰ قولہ) اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ طلاق کی، مہر اور صحبت کے لحاظ سے چار صورتیں ہو سکتی ہیں، ان میں سے دو کا حکم ان آیات میں بیان کیا گیا ہے، ایک یہ کہ نہ مہر مقرر ہو نہ صحبت وخلوت، دوسری یہ کہ مہر تو مقرر ہو لیکن صحبت وخلوت کی نوبت نہ آئے، تیسری صورت یہ ہے کہ مہر بھی مقرر ہو اور صحبت کی بھی نوبت آ دے، اس میں جو مہر مقرر کیا ہے پورا دینا ہوگا، یہ حکم قرآن مجید میں دوسرے مقام پر بیان کیا گیا ہے، چوتھی صورت یہ ہے کہ مہر معین نہ کیا، اور صحبت یا خلوت کے بعد طلاق دی، اس میں مہر مثل پورا دینا ہوگا، یعنی جو اس عورت کی قوم میں رواج ہے، اس کا بیان بھی ایک دوسری آیت میں آیا ہے۔

مذکورہ آیت میں پہلی دو قسموں کا حکم بیان کیا گیا ہے، اس میں سے پہلی صورت کا حکم یہ ہے کہ مہر کچھ واجب نہیں مگر زوج پر واجب ہے کہ اپنے پاس سے عورت کو کچھ دیدے، کم از کم یہی کہ ایک جوڑا کپڑے کا دیدے، دراصل قرآن کریم نے اس عطیہ کی کوئی مقدار متعین نہیں کی، البتہ یہ بتلا دیا کہ مالدار کو اپنی حیثیت کے مطابق دینا چاہئے، جس میں اس کی ترغیب ہے کہ صاحب وسعت

اس میں تنگی سے کام نہ لے، حضرت حسنؓ نے ایسے ہی ایک واقعہ میں مطلقہ عورت کو بیس ہزار کا عطیہ دیا، اور قاضی شریحؒ نے پانسو درہم کا، اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ ایک جوڑا کپڑے کا دیدے (قرطبی)

اور دوسری صورت کا حکم یہ ہے کہ جس عورت کا مہر نکاح کے وقت مقرر ہوا ہو، اور اس کو قبل صحبت و خلوتِ صحیحہ کے طلاق دیدی ہو تو مقرر کئے ہوئے مہر کا نصف مرد کے ذمے واجب ہوگا، البتہ اگر عورت معاف کردے یا مرد پورا دیدے تو اختیاری بات ہے، جیسا کہ آیت اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ سے معلوم ہوتا ہے۔

(۱) مرد کے پورا مہر دینے کو بھی معاف کرنے کے لفظ سے شاید اس لئے تعبیر کیا کہ عام عادت عرب کی یہ تھی کہ مہر کی رقم شادی کے ساتھ ہی دیدی جاتی تھی، تو طلاق قبل از خلوت کی صورت میں وہ نصف واپس لینے کا حق دار ہوگیا، اب اگر وہ رعایت کرکے اپنا نصف واپس نہ لے تو یہ بھی معاف ہی کرنا ہے، اور معاف کرنے کو افضل اور اقرب للتقویٰ قرار دیا، کیونکہ یہ معافی علامت اس کی ہے کہ تعلق نکاح کا قطع کرنا بھی احسان اور حسنِ سلوک کے ساتھ ہوا جو مقصدِ شریعت اور موجبِ ثوابِ عظیم ہے، خواہ معافی عورت کی طرف سے ہو یا مرد کی طرف سے۔

(۲) اَلَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ کی تفسیر خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ولی عقدة النكاح الزوج، یعنی "عقدۂ نکاح کا مالک شوہر ہے" یہ حدیث دارقطنی میں بروایت عمرو بن شعیبؒ عن ابیہ عن جدہٖ منقول ہے، اور حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی (قرطبی)

اس سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ نکاح مکمل ہوجانے کے بعد نکاح کو قائم رکھنے یا ختم کرنے کا مالک شوہر ہے، طلاق وہی دے سکتا ہے، عورت کا طلاق میں کوئی اختیار نہیں۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾

خبردار رہو سب نمازوں سے اور بیچ والی نماز سے اور کھڑے رہو اللہ کے آگے ادب سے

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا

پھر اگر تم کو ڈر ہو کسی کا تو پیادہ پڑھ لو یا سوار پھر جس وقت تم امن پاؤ تو یاد کرو اللہ کو جس طرح

عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾

کہ تم کو سکھایا ہے جس کو تم نہ جانتے تھے۔

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۳۴، نمازوں کی حفاظت کا بیان اس سے آگے پیچھے طلاق وغیرہ کے احکام ہیں، درمیان میں نماز کے احکام بیان فرمانا اشارہ اس طرف ہے کہ مقصود اصلی توجہ الی الحق ہے، اور معاشرت اور معاملات کے احکام سے علاوہ اور مصلحتوں کے اس توجہ کی حفاظت اور ترقی بھی مقصود ہے، چنانچہ جب ان کو خدائی احکام سمجھ کر عمل کیا جاوے گا تو توجہ لازم ہو گی، پھر یہ کہ ان احکام میں ادائے حقوقِ عباد بھی ہے اور حقوقِ عباد کے اتلاف سے درگاہِ الٰہی سے دوری ہوتی ہے، جس کے لوازم میں سے حق و عبد دونوں کی طرف سے بے توجہی ہے، چونکہ نماز میں یہ توجہ زیادہ ظاہر ہے اس لئے اس کے درمیان میں لانے سے اس توجہ کے مقصود ہونے پر زیادہ دلالت ہو گی، تاکہ بندہ اس توجہ کو ہر وقت پیش نظر رکھے۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى (الیٰ قولہ) مَا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۔ محافظت کرو سب نمازوں کی (عموماً) اور درمیان والی نماز (یعنی عصر) کی (خصوصاً) اور (نماز میں) کھڑے ہوا کرو اللہ کے سامنے عاجز بنے ہوئے، پھر اگر تم کو (باقاعدہ نماز پڑھنے میں کسی دشمن وغیرہ کا) اندیشہ ہو تو کھڑے کھڑے یا سواری پر چڑھے چڑھے (جس طرح بن سکے خواہ قبلہ کی طرف بھی منہ ہو یا نہ ہو اور گو رکوع و سجود صرف اشارہ ہی سے ممکن ہو) پڑھ لیا کرو (اس حالت میں بھی اس پر محافظت رکھو اس کو ترک مت کرو) پھر جب تم کو (بالکل) اطمینان ہو جاوے (اور اندیشہ جاتا رہے) تو تم خدا تعالیٰ کی یاد (یعنی ادائے نماز) اس طریق سے کرو جو تم کو (اطمینان کی حالت میں) سکھلایا ہے جس کو تم (پہلے سے) نہ جانتے تھے۔

معارف و مسائل

کثرت سے علماء کا قول بعض احادیث کی دلیل سے یہ ہے کہ بیچ والی نماز سے مراد نمازِ عصر ہے کیونکہ اس کے ایک طرف دو نمازیں دن کی ہیں فجر اور ظہر اور ایک طرف دو نمازیں رات کی ہیں، مغرب اور عشاء، اس کی تاکید خصوصیت کے ساتھ اس لئے کی گئی کہ اکثر لوگوں کو یہ وقت کام کی مصروفیت کا ہوتا ہے، اور "عاجزی" کی تفسیر حدیث میں "سکوت" کے ساتھ آئی ہے۔

اسی آیت سے نماز میں باتیں کرنے کی ممانعت ہوئی ہے، پہلے کلام کرنا درست تھا۔
اور یہ نماز کھڑے کھڑے اشارہ سے جب صحیح ہو گی جب ایک جگہ کھڑا ہو سکے، اور اس میں سجدے کا اشارہ ذرا زیادہ پست کرے، اور چلنے سے نماز نہیں ہو گی، البتہ جب ایسا ممکن نہ ہو، مثلاً عین لڑائی کا وقت ہو، تو نماز کو قضا کر دیا جاوے گا، دوسرے وقت پڑھ لیں۔ (بیان القرآن)

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ

اور جو لوگ تم میں سے مر جاویں اور چھوڑ جاویں اپنی عورتیں تو وہ وصیت کردیں اپنی عورتوں کے واسطے

مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا

خرچ دینا ایک برس تک بغیر نکالنے کے گھر سے پھر اگر وہ عورتیں آپ نکل جاویں تو کچھ گناہ نہیں تم پر اس میں کہ

فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾

کریں وہ عورتیں اپنے حق میں بھلی بات اور اللہ زبردست ہے حکمت والا،

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ

اور طلاق دی ہوئی عورتوں کے واسطے خرچ دینا ہے قاعدہ کے موافق لازم ہے پرہیزگاروں پر، اسی طرح

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾ ع ۳۱/۷ ۱۵

بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے واسطے اپنے حکم تاکہ تم سمجھ لو۔

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۳۵، بیوہ عورت کی سکونت اور متاع کی بعض اقسام کا بیان

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ (الیٰ قولہ) وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ اور جو لوگ وفات پا جاتے ہیں تم میں سے اور چھوڑ جاتے ہیں بیبیوں کو (ان کے ذمہ لازم ہے کہ) وہ وصیت کرجایا کریں اپنی بیبیوں کے واسطے ایک سال تک (نان و نفقہ اور گھر میں سکونت رکھنے سے) منتفع ہونے کی اس طور پر کہ وہ گھر سے نکالی نہ جاویں، ہاں اگر (چار مہینے دس دن کے بعد یا وضع حمل کے بعد عدت گذار کر) خود نکل جاویں تو تم کو کوئی گناہ نہیں، اس قاعدہ کی بات میں جس کو اپنے بارے میں (تجویز) کریں (جیسے نکاح وغیرہ) اور اللہ تعالےٰ زبردست ہیں (ان کے خلاف حکم مت کرو) اور حکمت والے ہیں (کہ تمام احکام میں تمہاری مصلحتیں ملحوظ رکھی ہیں گو تمہاری فہم میں نہ آسکیں)

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ (الیٰ قولہ) لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ اور سب طلاق دی ہوئی عورتوں کے لئے کچھ کچھ فائدہ پہنچانا (کسی درجہ میں مقرر ہی) قاعدہ کے موافق (اور یہ) مقرر ہوا ہے ان پر جو (شرک و کفر سے) پرہیز کرتے ہیں (یعنی مسلمانوں پر خواہ یہ مقرر ہونا وجوب کے درجہ میں ہو یا استحباب کے مرتبہ میں) اسی طرح حق تعالیٰ تمہارے (عمل کرنے کے) لئے اپنے احکام

بیان فرماتے ہیں اس توقع پر کہ تم (ان کو) سمجھو (اور عمل کرو) ۔

معارف و مسائل

(۱) وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ (الیٰ قولہ) وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ زمانۂ جاہلیت میں وفاتِ زوج کی عدت ایک سال تھی، اور اسلام میں بجائے ایک سال کے، چار مہینے دس دن مقرر ہوئے جیساکہ ماقبل میں آیت يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا، سے معلوم ہو چکا ہے، مگر اس میں عورت کی اتنی رعایت رکھی گئی تھی کہ چونکہ اس وقت تک میراث کا حکم نازل نہ ہوا تھا، اور بیوی کا کوئی حصہ میراث میں مقرر نہ ہوا تھا، بلکہ اوروں کے حق کا مدار محض مُردے کی وصیت پر تھا جیساکہ آیت كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ (۲: ۱۸۰) کی تفسیر میں معلوم ہو چکا ہے، اسلئے یہ حکم ہو گیا تھا کہ اگر عورت اپنی مصلحت سے خاوند کے ترکہ کے گھر میں رہنا چاہے تو سال بھر تک اس کو رہنے کا حق حاصل ہے، اور اسی کے ترکہ سے اس مدت میں اس کو نان نفقہ بھی دیا جاوے اس آیت میں اسی کا بیان ہے، اور خاوندوں کو حکم ہے کہ اس طرح کی وصیت کر جایا کریں، اور چونکہ یہ حق عورت کا تھا، اس کو اس کے وصول کرنے نہ کرنے کا اختیار حاصل تھا اس لئے وارثوں کو تو گھر سے نکالنا جائز نہ تھا، لیکن خود اس کو جائز تھا کہ خود اس کے گھر نہ رہے، اور اپنا حق ورثہ کو چھوڑ دے، بشرطیکہ عدت پوری ہو چکے، اور نکاح وغیرہ سب درست تھا، اور یہی مراد ہے قاعدہؑ کی بات سے، البتہ عدت کے اندر نکلنا اور نکاح کرنا وغیرہ سب گناہ تھا، عورت کے لئے بھی، اور جو منع کر سکے اور نہ روکے اس کے لئے بھی، پھر جب آیت میراث کی نازل ہوئی، گھر بار سب ترکہ میں سے عورت کا حق مل گیا، سو اپنے حصّہ میں رہے، اور اپنے حصہ سے خرچ کرے، یہ آیت منسوخ ہو گئی۔

(۲) وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ط مطلقہ عورتوں کو متعہ یعنی فائدہ پہنچانا اس سے پہلی آیات میں بھی آچکا ہے مگر وہ صرف دو قسم کی مطلقات کے لئے تھا، جن کو صحبت یا خلوت سے پہلے طلاق ہو گئی ہو، ایک کو فائدہ پہنچانا یہ تھا کہ جوڑا دیا جائے، دوسری کو فائدہ پہنچانا یہ تھا کہ آدھا مہر دیا جائے، اب وہ طلاق والیاں رہ گئیں جن کو صحبت یا خلوت کے بعد طلاق دی جاوے سو ان میں جس کا مہر مقرر کیا گیا ہو اس کو فائدہ پہنچانا یہ ہے کہ پورا مہر دینا چاہئے، اور جس کا مہر مقرر

؎ اور قاعدہ سے مراد یہی تفصیل ہو جائے گی، اور ہر صورت کے وجوب اور استحباب کا فرق دوسرے دلائل سے ثابت کیا جائے گا، اور حقًّا کو واجب کے معنی میں نہ لیں گے اور "علیٰ" الزام کے لئے نہ ہوگا، بلکہ محض تاکید کے لئے ہوگا گو درجۂ استحباب ہی سہی (بیان القرآن)

نہ کیا جاوے اس کے لئے بعد دخول کے مہر مثل واجب ہو، یہ متاع بمعنی مطلق فائدہ پہنچانا اس تفصیل سے تو واجب ہے، اور اگر متاع سے مراد فائدہ خاص یعنی تحفہ یا جوڑا دینا ہی لیا جائے تو ایک مطلقہ کو تو دینا واجب ہے، جس کا ذکر ما قبل میں آچکا ہے، اور باقی سب اقسام میں مستحب ہے، اور اگر متاع سے مراد نفقہ لیا جاوے تو جس طلاق میں عدت ہے اس میں عدت گزرنے تک واجب ہے، خواہ طلاق رجعی ہو یا بائن، غرض آیت اپنے الفاظِ عامہ سے سب صورتوں کو شامل ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ

کیا نہ دیکھا تونے اُن لوگوں کو جو کہ نکلے اپنے گھروں سے اور وہ ہزاروں تھے موت کے ڈر سے

فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى

پھر فرمایا اُن کو اللہ نے کہ مر جاؤ پھر اُن کو زندہ کر دیا بیشک اللہ فضل کرنے والا ہے

النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

لوگوں پر لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے ، اور لڑو اللہ کی راہ میں

وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾

اور جان لو کہ اللہ بے شک خوب سنتا جانتا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

(اے مخاطب) کیا تجھ کو ان لوگوں کا قصہ تحقیق نہیں ہوا جو کہ اپنے گھروں سے نکل گئے اور وہ لوگ ہزاروں ہی تھے موت سے بچنے کے لئے سو اللہ نے اُن کے لئے (حکم) فرما دیا کہ مر جاؤ (سب مر گئے) پھر اُن کو جلا دیا، بیشک اللہ تعالیٰ بڑا فضل کرنے والے ہیں لوگوں (کے حال) پر مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے (اور اس واقعہ پر غور کر کے) اللہ کی راہ میں قتال کرو اور یقین رکھو اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ خوب سننے والے اور خوب جاننے والے ہیں (جہاد کرنے اور نہ کرنیوالوں کی باتیں سنتے اور ہر ایک کی نیت جانتے ہیں، اور سب کو مناسب جزا دیں گے)

معارف و مسائل

یہ تین آیتیں جو اوپر مذکور ہوئی ہیں ان میں ایک عجیب بلیغ انداز میں اللہ تعالےٰ کی راہ میں جان و مال کی قربانی پیش کرنے کی ہدایت ہے کہ ان احکام کے بیان کرنے سے پہلے تاریخ کا ایک اہم واقعہ ذکر کیا گیا ہے، جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ موت و حیات تقدیر الٰہی کے

۱/۱۰

تابع ہے، جنگ وجہاد میں جانا موت کا سبب نہیں، اور بزدلی سے جان چرانا موت سے بچنے کا ذریعہ نہیں، تفسیر ابنِ کثیر میں سلفِ صحابہؓ اور تابعینؒ کے حوالہ سے اس واقعہ کی تشریح یہ بیان کی ہے کہ بنی اسرائیل کی کوئی جماعت ایک شہر میں بستی تھی، اور وہاں کوئی سخت وبا۔ طاعون وغیرہ پھیلا، یہ لوگ جو تقریباً دس ہزار کی تعداد میں تھے گھبرا اٹھے، اور موت کے خوف سے اس شہر کو چھوڑ کر سب کے سب دو پہاڑوں کے درمیان ایک وسیع میدان میں جاکر مقیم ہوگئے، اللہ تعالیٰ نے ان پر اور دنیا کی دوسری قوموں پر یہ واضح کرنے کے لئے کہ موت سے کوئی شخص بھاگ کر جان نہیں چھڑا سکتا، دو فرشتے بھیج دیئے، جو میدان کے دونوں سروں پر آکھڑے ہوئے، اور کوئی ایسی آواز دی جس سے سب کے سب بیک وقت مَرے ہوئے رہ گئے، ایک بھی زندہ نہ رہا، آس پاس کے لوگوں کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی، یہاں پہنچے، دس ہزار انسانوں کے کفن دفن کا انتظام آسان نہ تھا، اس لئے ان کے گرد ایک احاطہ کھینچ کر حظیرہ جیسا بنا دیا، اُن کی لاشیں حسب دستور گل سڑ گئیں، ہڈیاں پڑی رہ گئیں، ایک زمانۂ دراز کے بعد بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر جن کا نام حزقیلؑ بتلایا گیا ہے، اس مقام پر گذرے، اس حظیرہ میں جگہ جگہ انسانی ہڈیوں کے ڈھانچے بکھرے ہوئے دیکھ کر حیرت میں رہ گئے، بذریعہ وحی ان کو ان لوگوں کا پورا واقعہ بتلا دیا گیا، حضرت حزقیل علیہ السلام نے دعا کی کہ یا اللہ ان لوگوں کو پھر زندہ فرما دے، اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعا قبول فرمائی، اور انھیں حکم دیا گیا کہ آپ ان شکستہ ہڈیوں کو اس طرح خطاب فرمائیں۔

ایتھا العظام البالیۃ ان اللہ	"یعنی اے پرانی ہڈیوں اللہ تمھیں حکم دیتا ہے
یأمرکِ ان تجتمعی	کہ ہر جوڑ کی ہڈی اپنی جگہ جمع ہو جائے"

پیغمبر کی زبان سے خدا تعالیٰ کا حکم ان ہڈیوں نے سُنا اور حکم کی تعمیل کی، جن کو دنیا بے عقل و بے شعور سمجھتی ہے مگر دنیا کے ہر ذرّہ ذرّہ کی طرح وہ بھی تابعِ فرمان اور اپنے وجود کے مناسب عقل وادراک رکھتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی مطیع ہیں، قرآن کریم نے آیت اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی (۲۰: ۵۰) میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا فرمایا پھر اس کو اس کے مناسبِ حال ہدایت فرمائی، مولانا رومیؒ نے ایسے ہی امور کے متعلق فرمایا ہے ؎

خاک وباد وآب وآتش بندہ اند

با من وتو مردہ باحق زندہ اند

بہرحال ایک آواز پر ہر انسان کی ہڈیاں اپنی اپنی جگہ لگ گئیں، پھر حکم ہوا کہ اب ان کو یہ آواز دو:۔

ایتھا العظام ان اللہ یأمرکِ	یعنی اے ہڈیو! اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتا ہے کہ

ان تکتسی لحماً وعصباً وجلداً | اپنا گوشت پہن لو اور پٹھے اور کھال درست کرو"

یہ کہنا تھا کہ ہڈیوں کا ہر ڈھانچہ ان کے دیکھتے دیکھتے ایک مکمل لاش بن گئی، پھر حکم ہوا کہ اب ارواح کو یہ خطاب کیا جائے:-

ایتھا الارواح ان اللہ یأمرك	"یعنی اے ارواح تمہیں اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے
ان ترجع کل روح الی الجسد	کہ اپنے اپنے بدنوں میں لوٹ آئیں جن کی تعمیر
الذی کانت تعمرہ	وحیات اُن سے وابستہ تھی"

یہ آواز دیتے ہی اُن کے سامنے سارے لاشے زندہ ہو کر کھڑے ہوگئے، اور حیرت سے چارطرف دیکھنے لگے، سب کی زبانوں پر تھا سُبْحَانَكَ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ۔

یہ واقعۂ ہائلہ دنیا کے فلاسفروں اور عقلاء کے لئے دعوتِ فکر اور منکرینِ قیامت پر حجت قاطعہ ہونے کے ساتھ اس ہدایت پر بھی مشتمل ہے کہ موت کے خوف سے بھاگنا خواہ جہاد سے ہو یا کسی وباء وطاعون سے اللہ تعالیٰ اور اس کی تقدیر پر ایمان رکھنے والے کے لئے ممکن نہیں، جس کا یہ ایمان ہے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے، نہ اس سے ایک سیکنڈ پہلے آسکتی ہے، اور نہ ایک سیکنڈ مؤخر ہو سکتی ہے، اس لئے یہ حرکت فضول بھی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب ہونے کی وجہ بھی۔

اب اس واقعہ کو قرآن کے الفاظ سے دیکھئے، بیان واقعہ کے لئے قرآن نے فرمایا اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ، یعنی کیا آپ نے ان لوگوں کے واقعہ کو نہیں دیکھا جو اپنے گھروں سے بخوف موت نکل کھڑے ہوئے تھے"۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے ہزاروں برس پہلے کا ہے، اس کے دیکھنے کا حضورؐ سے سوال ہی نہیں ہو سکتا، تو یہاں اَلَمْ تَرَ فرمانے کا کیا منشاء ہے، مفسرینؒ نے فرمایا ہے کہ ایسے تمام مواقع میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لفظ اَلَمْ تَرَ کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے، حالانکہ واقعہ آپؐ کے زمانے سے پہلے کا ہے، جس کے دیکھنے کا کوئی تصوّر نہیں ہو سکتا، ان سب مواقع میں رویت سے رویتِ قلبی مراد ہوتی ہے جس کے معنی ہیں علم وادراک یعنی اَلَمْ تَرَ ایسے مواقع میں اَلَمْ تَعْلَمْ کے معنی میں ہوتا ہے، لیکن اس کو لفظ اَلَمْ تَرَ سے تعبیر کرنے میں حکمت اس واقعہ کے مشہور ومشہود ہونے کی طرف اشارہ کرنا ہے، کہ یہ واقعہ ایسا یقینی ہے جیسے کوئی آج دیکھ رہا ہو اور دیکھنے کے قابل ہو، اَلَمْ تَرَ کے بعد حرف اِلٰی بڑھانے سے ازروئے زبان اس کی طرف اشارہ بھی ہوتا ہے۔

اس کے بعد قرآن میں اُن کی ایک بڑی تعداد ہونے کا بیان فرمایا گیا وَهُمْ اُلُوْفٌ

یعنی وہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے، اس تعداد کی تعیین میں روایات مختلف ہیں، لیکن عربی زبان کے قاعدہ سے یہ لفظ جمع کثرت ہے، جس کا اطلاق دس سے کم پر نہیں ہوتا، اس سے معلوم ہوا کہ ان کی تعداد دس ہزار سے کم نہ تھی۔

اس کے بعد ارشاد ہے فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا، یعنی کہہ دیا اُن کو اللہ تعالیٰ نے کہ مر جاؤ" اللہ تعالیٰ کا یہ حکم بلا واسطہ بھی ہوسکتا ہے اور بواسطہ کسی فرشتے کے بھی، جیسے دوسری آیت میں ارشاد ہے: اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔ (۳۶: ۸۲)

اس کے بعد فرمایا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ، یعنی "اللہ تعالیٰ بڑا فضل کرنے والے ہیں لوگوں پر" اس میں وہ فضل بھی داخل ہے جو بنی اسرائیل کی اس قوم کو دوبارہ زندہ کرکے فرمایا، اور یہ فضل بھی شامل ہے جو یہ واقعہ امتِ محمدیہ کو بتلا کر ان کے لئے درسِ عبرت بنایا۔

آخر میں غفلت شعار انسان کو بیدار کرنے کے لئے فرمایا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ یعنی "اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کے ہزاروں مظاہر انسان کے سامنے آتے رہتے ہیں، مگر اس کے باوجود اکثر انسان شکر گذار نہیں ہوتے"۔

مسائل متعلقہ

اس آیت سے چند مسائل اور احکام مستفاد ہوئے:۔

تدبیر پر تقدیر غالب ہے

اول یہ کہ تقدیر الٰہی کے مقابلے میں کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوسکتی، اور جہاد سے یا طاعون وغیرہ سے بھاگنا جان بچانے کا ذریعہ نہیں ہوسکتا، اور نہ اُن میں قائم رہنا موت کا باعث ہوتا ہے، بلکہ موت کا ایک وقت معیّن ہے نہ اُس میں کمی ہوسکتی ہے نہ زیادتی۔

جس بستی میں کوئی وبا، طاعون وغیرہ ہو اس میں جانا یا وہاں سے بھاگ کر کہیں اور جانا دونوں ناجائز ہیں

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جس شہر میں کوئی وبائی مرض طاعون وغیرہ پھیل جائے وہاں سے بھاگ کر دوسری جگہ جانا جائز نہیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں اس پر اتنا اور اضافہ ہے کہ دوسرے لوگوں کو وہاں جانا بھی درست نہیں، حدیث میں ہے:

ان ھٰذا السقم عذب بہ الامم قبلکم فاذا سمعتم بہ فی الارض فلا تدخلوھا واذا وقع بارض وانتم بھا فلا تخرجوا فرارًا (بخاری ومسلم، ابن کثیر)

"یعنی اس بیماری (طاعون) کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے تم سے پہلی قوموں پر عذاب نازل فرمایا ہے، سو جب تم یہ سنو کہ کسی شہر میں طاعون وغیرہ وبائی مرض پھیل رہا ہے تو وہاں نہ جاؤ، اور اگر کسی بستی میں یہ مرض پھیل جائے اور تم وہاں موجود ہو تو وہاں سے بھاگ کر نہ نکلو"

تفسیر قرطبی میں ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے ایک مرتبہ ملکِ شام کے قصد سے سفر کیا، سرحدِ شام پر تبوک کے قریب ایک مقام سَرْغ ہے، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ملکِ شام میں سخت طاعون پھیلا ہوا ہے، یہ طاعون ملکِ شام کی تاریخ میں ایک عظیم سانحہ تھا، یہ طاعون عمواس کے نام سے مشہور ہے، کیونکہ اول یہ طاعون ایک بستی عمواس نامی میں شروع ہوا، جو بیت المقدس کے قریب ہے، پھر سارے ملک میں پھیل گیا، ہزارہا انسان جن میں بہت سے صحابہؓ و تابعینؒ بھی تھے، اس طاعون میں شہید ہوئے۔

فاروقِ اعظمؓ نے طاعون کی شدت کی خبر سنی تو اسی مقام پر ٹھہر کر صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا کہ ہمیں ملکِ شام میں اس وقت جانا چاہئے یا واپس ہونا مناسب ہے، اُس وقت جتنے حضرات مشورہ میں شریک تھے اُن میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق کوئی حکم سُنا ہو، بعد میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے اطلاع دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس معاملے کے متعلق یہ ہے:

ان رسول اللّٰہ صلے اللّٰہ علیہ وسلم ذکر الوجع فقال رجز وعذاب عُذِّبَ بہ الامم ثم بقی منہ بقیۃ فیذھب المرۃ ویأتی الاخری فمن سمع بہ بارض فلا یقدمنّ علیہ ومن کان بارض وقع بھا فلا یخرج فرارًا منہ، رواہ البخاری عن اسامۃ بن زید واخرجہ الائمۃ بمثلہ۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (طاعونی گلٹی کے) درد کا ذکر کیا تو فرمایا کہ یہ ایک عذاب ہے جس سے بعض امتوں کو عذاب دیا گیا تھا پھر اس کا کچھ بقیہ رہ گیا، اب اس کا یہ حال ہے کہ کبھی چلا جاتا ہے اور پھر آجاتا ہے، تو جو شخص یہ سنے کہ فلاں خطۂ زمین میں یہ عذاب آیا ہوا ہے تو اس کو چاہئے کہ اس خطۂ زمین میں نہ جائے، اور جو شخص اس خطہ میں پہلے سے موجود ہو تو طاعون سے بھاگنے کے لئے وہاں سے نہ نکلے (بخاری)۔"

حضرت فاروق اعظمؓ نے جب یہ حدیث سُنی تو رفقاء کو واپسی کا حکم دیدیا، حضرت ابوعبیدہؓ ملکِ شام کے عامل وامیر (گورنر) بھی اس مجلس میں موجود تھے، فاروقِ اعظمؓ کا یہ حکم سُنکر فرمانے لگے، افرارًا من قدر اللّٰہ، یعنی کیا آپ اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے بھاگنا چاہتے ہیں؟ فاروق اعظمؓ نے جواب میں فرمایا، ابوعبیدہ! کاش یہ بات کوئی اور کہتا، یعنی تمھاری زبان سے ایسی بات قابلِ تعجب ہے، اور پھر فرمایا:

نعم نفرّ من قدر اللّٰہ الیٰ قدر اللّٰہ

"بیشک ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ ہی کی تقدیر کی طرف بھاگتے ہیں۔"

مطلب یہ تھا کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ اللہ ہی کے حکم کے مطابق کر رہے ہیں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔

دربارۂ طاعون ارشادِ نبویؐ کی حکمتیں

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ مذکور سے معلوم ہوا کہ جس شہر یا بستی میں طاعون وغیرہ امراض وبائی پھیلے ہوئے ہوں باہر والوں کو وہاں جانا ممنوع ہے اور وہاں کے رہنے والوں کو اُس جگہ سے بخوفِ موت بھاگنا ممنوع ہے۔

اور اس کے ساتھ اسلام کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ نہ کسی جگہ جانا موت کا سبب ہے، نہ کہیں سے بھاگنا نجات کا سبب، اس اہم عقیدہ کے ہوتے ہوئے حکم مذکور بڑی دور رس حکمتوں پر مبنی ہے، باہر والوں کو وہاں جانے سے روکنے کی ایک حکمت تو یہ ہے کہ ممکن ہے وہاں پہنچ کر کسی کی عمر ختم ہو چکی ہو اور اس مرض میں مبتلا ہو کر انتقال ہو گیا تو مرنے والے کو کبھی یہ گمان ہو گا کہ اگر میں یہاں نہ آتا تو زندہ رہتا، اور دوسروں کو بھی یہی خیال ہو گا کہ یہاں آنے سے اس کی موت واقع ہوئی، حالانکہ جو کچھ ہوا وہ پہلے سے لکھا ہوا تھا، اس کی عمر اتنی ہی تھی، کہیں بھی رہتا، اس وقت اس کی موت لازمی تھی، اس حکم میں مسلمانوں کے عقیدہ کو تذبذب سے بچایا گیا کہ وہ غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔

دُوسری حکمت یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے انسان کو یہ ہدایت دی ہے کہ جس جگہ تکلیف پہنچنے کا خطرہ ہو یا جہاں ہلاکت کا اندیشہ ہو وہاں نہ جائے، بلکہ مقدور بھر ایسی چیزوں سے بچنے کی فکر کرے جو اس کے لئے مضر یا ہلاکت کا سبب بن سکتی ہیں، اور اپنی جان کی حفاظت ہر انسان کے ذمے پر واجب قرار دی ہے، اس قاعدہ کا مقتضیٰ بھی یہی ہے کہ تقدیرِ الٰہی پر ایمان کامل رکھتے ہوئے احتیاطی تدبیروں میں کمی نہ کرے، اور ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ ایسی جگہ نہ جائے جہاں جان کا خطرہ ہو۔

اسی طرح اُس بستی کے رہنے والوں کو بخوفِ موت وہاں سے بھاگنے کی ممانعت میں بھی بہت سی حکمتیں ہیں۔

ایک حکمت تو اجتماعی اور عوامی ہے کہ اگر یہ بھاگنے کا سلسلہ چلا تو امیر اور پیسے والے اور قدرت و طاقت والے آدمی تو بھاگ جائیں گے، مگر بستی میں ایسے ضعفاء مرد و عورت کا بھی عادۃً ہونا لازمی ہے جو کہیں جانے پر قدرت نہیں رکھتے، اُن کا حشر کیا ہو گا، اوّل تو وہ تنہا رہ کر ہیبت ہی سے مرنے لگیں گے، پھر اُن میں جو بیمار رہیں اُن کی خبر گیری کون کرے گا، مر جائیں گے تو دفن کفن کا انتظام کیسے ہو گا۔

دوسری حکمت یہ ہے کہ جو لوگ اس جگہ موجود ہیں بعید نہیں کہ ان میں اس مرض کے جراثیم اثر کر چکے ہوں ایسی حالت میں وہ سفر کریں گے تو اور زیادہ مصیبتوں اور مشقتوں کے شکار ہوں گے

سفر کی حالت میں بیمار ہوئے تو ظاہر ہے کہ ان پر کیا گذرے گی، ابن المدینی نے علماء کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

مافر احد من الوباء فسلم (قرطبی)	"یعنی جو شخص وباء سے بھاگتا ہے وہ کبھی سالم نہیں رہتا"

تیسری حکمت یہ بھی ہے کہ اگر ان میں مرض کے جراثیم سرایت کرچکے ہیں تو یہ مختلف بستیوں میں پہنچیں گے، تو وہاں وبائی جراثیم پھیلیں گے، اور اگر اپنی جگہ صبر و توکل کے ساتھ ٹھہرے رہے تو بہت ممکن ہے کہ مرض سے نجات حاصل ہو جائے، اور بالفرض اسی مرض میں موت مقدر تھی تو ان کو اپنے صبر و ثبات کی وجہ سے درجہ شہادت کا ملے گا، جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے:

روی البخاری عن یحیی بن یعمر عن عائشۃؓ انھا اخبرتہ انھا سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الطاعون فاخبرھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ کان عذابًا یبعثہ اللہ علی من یشاء فجعلہ اللہ رحمۃ للمؤمنین فلیس من عبد یقع الطاعون فیمکث فی بلدہ صابرًا یعلم انہ لن یصیبہ الا ماکتب اللہ لہ الا کان لہ مثل اجر شہید وھذا تفسیر لقولہ صلی اللہ علیہ وسلم الطاعون شہادۃ والمطعون شہید (قرطبی ص ۲۳۵ ج ۳)	"امام بخاریؒ نے یحیی بن یعمرؒ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اُن کو خبر دی کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طاعون کے متعلق سوال کیا تھا، تو آپؐ نے ان کو بتلایا کہ یہ بیماری اصل میں عذاب کی حیثیت سے نازل ہوئی تھی اور جس قوم کو عذاب دینا منظور ہوتا تھا اس پر بھیجدی جاتی تھی پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو مؤمنین کے لئے رحمت بنا دیا، تو جو اللہ کا بندہ طاعون پھیلنے کے بعد اپنی بستی میں صبر و سکون کے ساتھ ٹھہرا رہے اور یہ اعتقاد رکھے کہ اس کو صرف وہی مصیبت پہونچ سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے لکھ دی ہے، تو ایسے شخص کو شہید کے برابر ثواب ملے گا۔ اور یہی تشریح ہے اس حدیث کی جس میں ارشاد ہے کہ طاعون شہادت ہے اور طاعون زدہ شخص شہید ہے"

بعض خاص صورتوں کا استثناء حدیث کے الفاظ میں فلا تخرجوا فرارا منہ آیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص موت سے فرار کے لئے نہیں بلکہ اپنی کسی دوسری ضرورت سے دوسری جگہ چلا جائے تو وہ اس ممانعت میں داخل نہیں، اسی طرح اگر کسی شخص کا عقیدہ اپنی جگہ پختہ ہو

کہ یہاں سے دوسری جگہ چلا جانا مجھے موت سے نجات نہیں دے سکتا، اگر میرا وقت آ گیا ہے تو جہاں جاؤں گا موت لازمی ہے، اور وقت نہیں آیا تو یہاں رہنے سے بھی موت نہیں آئے گی، یہ عقیدہ پختہ رکھتے ہوئے محض آب و ہوا کی تبدیلی کے لئے یہاں سے چلا جائے تو وہ بھی ممانعت سے مستثنیٰ ہے۔

اسی طرح کوئی آدمی کسی ضرورت سے اس جگہ میں داخل ہو جہاں وبا پھیلی ہوئی ہے، اور عقیدہ اس کا پختہ ہو کہ یہاں آنے سے موت نہیں آئے گی وہ اللہ کی مشیئت کے تابع ہے، تو ایسی حالت میں اُس کے لئے وہاں جانا بھی جائز ہوگا۔

تیسرا مسئلہ اس آیت سے یہ مستفاد ہوا کہ بخوف موت جہاد سے بھاگنا بھی حرام ہے، قرآن کریم میں یہ مسئلہ دوسری جگہ زیادہ تفصیل اور وضاحت سے آیا ہے، جس میں بعض خاص صورتوں کو مستثنیٰ بھی فرمایا گیا ہے۔

جو مضمون اس آیت کا ہے تقریباً یہی مضمون دوسری آیت میں جہاد سے بھاگنے والوں یا اس میں شامل نہ ہونے والوں کے بارے میں آیا ہے، ارشاد یہ ہے:

اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ۭ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ؀ (۳: ۱۶۸)

"یعنی کچھ لوگ خود بھی جہاد میں شریک ہوئے، اور جہاد میں شریک ہو کر شہید ہو جانیوالوں کے متعلق لوگوں سے کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے ہماری بات نہ سُنی اس لئے مارے گئے، اگر یہ ہماری بات مانتے تو قتل نہ ہوتے، (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ) آپؐ ان سے فرمادیں کہ اگر موت سے بچنا تمہارے اختیار میں ہے، تو اوروں کی کیا فکر کرتے ہو تم خود اپنی فکر کرو اور اپنے آپ کو موت سے بچالو، یعنی جہاد میں جانے نہ جانے پر موقوف نہیں، تمہیں گھر بیٹھے ہوئے بھی آخر موت آئے گی"۔

عجائبِ قدرت سے ہے کہ صحابہ کرامؓ کے سب سے بڑے جنگی جرنیل سیف اللہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کی اسلامی عمر ساری جہاد ہی میں گذری ہے، وہ کسی جہاد میں شہید نہیں ہوئے، بیمار ہو کر گھر میں وفات پائی، وفات کے قریب اپنے بستر پر مرنے کا افسوس کرتے ہوئے گھر والوں کو خطاب کرکے فرمایا کہ میں فلاں فلاں عظیم الشان جنگوں اور جہادوں میں شریک ہوا، اور میرا کوئی عضو ایسا نہیں جس میں تیر یا نیزے یا چوٹ کے زخم کا اثر و نشان نہ ہو، مگر افسوس ہے کہ میں اب گدھے کی طرح بستر پر مر رہا ہوں، خدا تعالیٰ بزدلوں کو آرام نہ دے، اُن کو میری نصیحت پہنچاؤ۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کا یہ واقعہ بطور تمہید لایا گیا تھا، اگلی آیت میں جہاد و قتال

کا حکم دیا گیا جو اس قصہ کے ذکر کرنے سے اصل مقصود تھا، کہ جہاد میں جانے کو موت یا بھاگنے کو نجات نہ سمجھو، بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کرکے فلاح دارین حاصل کرو، اللہ تعالیٰ تمہاری سب باتیں سننے والے اور جاننے والے ہیں۔

تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی فضیلت کا ذکر ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗٓ اَضْعَافًا

کون شخص ہے ایسا جو قرض دے اللہ کو اچھا قرض پھر دوگنا کردے اللہ اس کو کئی

کَثِیْرَۃً ؕ وَاللّٰہُ یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ ۪ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

گنا اور اللہ ہی تنگی کردیتا ہے اور وہی کشائش کرتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

خلاصۂ تفسیر

جہاد وغیرہ کار خیر میں انفاق کی ترغیب: کون شخص ہے (ایسا) جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے اچھے طور پر قرض دینا (یعنی اخلاص کے ساتھ) پھر اللہ تعالیٰ اس (قرض کے ثواب) کو بڑھا کر بہت سے حصے کردیوے اور (اس کا اندیشہ مت کرو کہ خرچ کرنے سے مال کم ہوجائے گا، کیونکہ یہ تو) اللہ (ہی کے قبضہ میں ہے وہی) کمی کرتے ہیں اور (وہی) فراخی کرتے ہیں (کچھ خرچ کرنے نہ کرنے پر اس کا اصلی مدار نہیں) اور تم اُسی کی طرف (بعد مرنے کے) لے جائے جاؤ گے (سو اس وقت نیک کام میں خرچ کرنے کی جزاء اور واجب موقع پر خرچ نہ کرنے کی سزا تم کو ملے گی)۔

معارف و مسائل

(۱) یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا، قرض سے مراد نیک عمل کرنا اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنا ہے، اس کو قرض مجازاً کہہ دیا، ورنہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہے، مطلب یہ ہے کہ جیسے قرض کا عوض ضروری دیا جاتا ہے اسی طرح تمہارے انفاق کا عوض ضروری ملے گا، اور بڑھانے کا بیان ایک حدیث میں آیا ہے، کہ ایک خرما اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کیا جاوے تو خدا تعالیٰ اس کو اتنا بڑھاتے ہیں کہ وہ اُحد پہاڑ سے بڑا ہوجاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو قرض دینے کا یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ اس کے بندوں کو قرض دیا جائے

اور اُن کی حاجت برآری کی جائے، چنانچہ حدیث میں قرض دینے کی بہت فضیلت وارد ہوئی ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ما من مسلم یقرض مسلمًا قرضًا مرّۃ الا کان کصدقتہ مرّتین (مظہری بحوالۂ ابن ماجہ)	"جو مسلمان دوسرے مسلمان کو قرض دیتا ہے، یہ قرض دینا اللہ کے راستے میں اس مال کے دو دفعہ صدقہ کرنے کے برابر ہے"

(۲) ابن عربیؒ فرماتے ہیں اس آیت کو سُنکر لوگوں کے تین فرقے ہوگئے، پہلا فرقہ اُن بدنصیب لوگوں کا ہے جنھوں نے یہ آیت سن کر کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رب ہماری طرف محتاج ہے، اور ہم غنی ہیں، ــــ اس کا جواب قرآن کریم کی ایک اور آیت لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَاۗءُ (۳: ۱۸۱) سے دیا ــــ دوسرا فرقہ اُن لوگوں کا ہے جنھوں نے اس آیت کو سُن کر اس کے خلاف کیا، اور بخل ہی کو اختیار کر لیا، مال کی طرف زیادہ رغبت اور اس کی حرص نے ان کو اس طرح باندھ لیا کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوئی ــــ تیسرا فرقہ ان مخلص مسلمانوں کا ہے جنھوں نے فوراً ہی اس آیت پر عمل کر لیا، اور اپنا پسندیدہ مال اللہ کے راستے میں دیدیا، جیسا کہ ابوالدّحداحؓ وغیرہ، جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ابوالدّحداحؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور آپؐ سے پوچھا، اللہ کے رسولؐ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں، کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض مانگتے ہیں، حالانکہ وہ قرض سے مستغنی ہیں؟ آپؐ نے فرمایا، ہاں اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ اس کے ذریعے سے تم کو جنّت میں داخل کردیں، ابوالدّحداحؓ نے یہ سُنکر کہا، اللہ کے رسول ہاتھ بڑھائیں، آپؐ نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا، ابوالدّحداحؓ نے کہنا شروع کیا:

میں کھجور کے دّو باغوں کا مالک ہوں، اس کے علاوہ میری مِلک میں کچھ نہیں، میں اپنے یہ دونوں باغ اللہ تعالیٰ کو قرض دیتا ہوں۔

آپؐ نے اُن سے فرمایا ایک اللہ کے راستے میں وقف کردو اور دوسرا اپنے اہل وعیال کی معاشی ضرورت کے لئے باقی رکھو ــــ ابوالدّحداحؓ نے کہا آپؐ گواہ رہئے، ان دونوں میں سے بہترین باغ جس میں کھجور کے چھ سو درخت ہیں، اس کو میں اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہوں، آپؐ نے فرمایا اللہ تمھیں اس کے بدلے میں جنّت عطا کریں گے۔

ابوالدّعداحؓ اپنے گھر آئے اور بیوی کو اس کی اطلاع دیدی، تو وہ بھی ابوالدّحداحؓ کے اس بہترین سودے پر بہت خوش ہوئیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كَمْ مِّنْ عِذْقٍ رَدَاحٍ وَدَارٍ فَيَاحٍ	"کھجوروں سے لبریز بے شمار درخت اور کشادہ

لأبی الدحداح (قرطبی)	محلات کس قدر ابوالدحداحؓ کے لئے تیار ہیں، (یعنی جنت میں)"

(۳) قرض میں واپسی کے وقت اگر زیادتی کی شرط نہ ٹھہرائی گئی ہو اور اپنی طرف سے قرض سے کچھ زیادہ ادا کر دیا، تو یہ پسندیدہ ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انّ خیارکم احسنکم قضاءً	"تم میں بہترین شخص وہ ہی جو اپنے حق (قرض) کو اچھے طریقے سے ادا کرے"

لیکن اگر زیادتی کی شرط ٹھہرائی گئی تو وہ حرام ہے اور سود ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰٓ إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ

کیا نہ دیکھا تو نے ایک جماعت بنی اسرائیل کو موسیٰ کے بعد جب انھوں نے کہا اپنے نبی سے

لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِن كُتِبَ

مقرر کرو ہمارے لئے ایک بادشاہ تاکہ ہم لڑیں اللہ کی راہ میں پیغمبر نے کہا کیا تم سے بھی یہ توقع ہو کہ

عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا ۖ قَالُوا وَمَا لَنَآ أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَ

اگر حکم ہو لڑائی کا تو تم اس وقت نہ لڑو وہ بولے ہم کو کیا کہ ہم نہ لڑیں اللہ کی راہ میں اور ہم

قَدْ أُخْرِجْنَا مِن دِيَارِنَا وَأَبْنَآئِنَا ۖ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا

تو نکال دیئے گئے اپنے گھروں سے اور بیٹوں سے پھر جب حکم ہوا اُن کو لڑائی کا تو وہ سب پھر گئے

إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌۢ بِالظَّٰلِمِينَ ﴿٢٤٦﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ

مگر تھوڑے سے ان میں کے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے گنہگاروں کو، اور فرمایا اُن سے اُن کے نبی نے

إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوٓا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ

بیشک اللہ نے مقرر فرما دیا تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ کہنے لگے کیونکر ہو سکتی ہے اس کو حکومت

عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ

ہم پر اور ہم زیادہ مستحق ہیں سلطنت کے اس سے اور اس کو نہیں ملی کشایش مال میں

قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُۥ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ

پیغمبر نے کہا بیشک اللہ نے پسند فرمایا اس کو تم پر اور زیادہ فراخی دی اس کو علم اور جسم میں

وَاللّٰهُ يُؤْتِىْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾ وَقَالَ لَهُمْ

اور اللہ دیتا ہے ملک اپنا جسکو چاہے اور اللہ ہے فضل کرنیوالا سب کچھ جاننے والا، اور کہا بنی اسرائیل

نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ

سے اُن کے نبی نے کہ طالوت کی سلطنت کی نشانی یہ ہے کہ آوے تمہارے پاس ایک صندوق کہ جس میں تسلّی خاطر ہے

مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ

تمہارے رب کی طرف سے اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں اُن میں سے جو چھوڑ گئی تھی، موسیٰ اور ہارون کی اولاد اور

ع ۳۲ / ۱۶ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾

اٹھا لاویں گے اس صندوق کو فرشتے، بیشک اُس میں پوری نشانی ہے تمہارے واسطے اگر تم یقین رکھتے ہو،

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ

پھر جب باہر نکلا طالوت فوجیں لے کر کہا بے شک اللہ تمہاری آزمائش کرتا ہے ایک نہر سے

فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّىْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّىْٓ اِلَّا

سو جس نے پانی پیا اس نہر کا تو وہ میرا نہیں اور جس نے اس کو نہ چکھا تو وہ بیشک میرا ہے مگر

مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً ۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ

جو کوئی بھرے ایک چلّو اپنے ہاتھ سے، پھر پی لیا سب نے اس کا پانی مگر تھوڑوں نے ان میں سے

فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ

پھر جب پار ہوا طالوت اور ایمان والے ساتھ اس کے تو کہنے لگے طاقت نہیں ہم کو آج

بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ

جالوت اور اس کے لشکروں سے لڑنے کی کہنے لگے وہ لوگ جن کو خیال تھا کہ ان کو اللہ سے ملنا ہے، بارہا

مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾

تھوڑی جماعت غالب ہوئی بڑی جماعت پر اللہ کے حکم سے اور اللہ صبر کرنیوالوں کے ساتھ ہے

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ

اور جب سامنے ہوئے جالوت کے اور اس کی فوجوں کے تو بولے اے رب ہمارے ڈال دے ہمارے دلوں میں صبر اور جمائے

أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوْهُمْ بِإِذْنِ اللّٰهِ

رکھ ہمارے پاؤں اور ہماری مدد کر اس کافر قوم پر ، پھر شکست دی مومنوں نے جالوت کے لشکر کو اللہ کے حکم سے

وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا

اور مار ڈالا داؤد نے جالوت کو اور دی داؤد کو اللہ نے سلطنت اور حکمت اور سکھایا اُن کو جو چاہا

يَشَآءُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ

اور اگر نہ ہوتا دفع کرا دینا اللہ کا ایک کو دوسرے سے تو خراب ہو جاتا ملک ۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾

لیکن اللہ بہت مہربان ہے جہان کے لوگوں پر۔

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات مقصود اس مقام میں زیادہ ترغیب قتال کی ہے، اوپر کا قصہ اسی کی تمہید ہے، انفاق فی سبیل اللہ کا مضمون اسی کی تائید ہے، آگے طالوت و جالوت کا قصہ اسی کی تاکید ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے اس قصے میں قبض و بسط کا بھی مشاہدہ کرا دیا، جس کا ذکر ماقبل کی آیت وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ میں آیا ہے، کہ فقیر کو بادشاہ بنانا اور بادشاہ سے بادشاہت چھین لینا سب اسی کے اختیار میں ہے۔

طالوت اور جالوت کا قصہ (اے مخاطب) کیا تجھ کو بنی اسرائیل کی جماعت کا قصہ جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا ہے، تحقیق نہیں ہوا، (جن سے پہلے اُن پر کافر جالوت غالب آچکا تھا، اور ان کے کئی صوبے دبا لئے تھے) جب کہ ان لوگوں نے اپنے ایک پیغمبر سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے کہ ہم (اس کے ساتھ ہو کر) اللہ کی راہ میں (جالوت سے) قتال کریں، اس پیغمبر نے فرمایا کہ کیا یہ احتمال ہے اگر تم کو جہاد کا حکم دیا جائے کہ تم (اس وقت) جہاد نہ کرو، وہ لوگ کہنے لگے کہ ہمارے واسطے ایسا کونسا سبب ہوگا کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں، حالانکہ (جہاد کے لئے ایک محرک بھی ہے، وہ یہ کہ) ہم (اُن کافروں کے ہاتھوں) اپنی بستیوں اور اپنے فرزندوں سے بھی جدا کر دیئے گئے ہیں (کیونکہ ان کی بعض بستیاں بھی کافروں نے دبا لی تھیں اور ان کی اولاد کو بھی قید کر لیا گیا تھا) پھر جب ان لوگوں کو جہاد کا حکم ہوا تو باستثناء ایک قلیل مقدار کے (باقی) سب پھر گئے، (جیسا کہ آگے جہاد کی غرض سے بادشاہ کے مقرر ہونے کا اور ان لوگوں کے پھر جانے کا تفصیلاً بیان آتا ہے) اور

اللہ تعالیٰ ظالموں کو (یعنی خلاف حکم کرنے والوں کو) خوب جانتے ہیں، (سب کو مناسب سزا دیں گے) اور ان لوگوں سے ان کے پیغمبر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر فرمایا، کہنے لگے ان کو ہم پر حکمرانی کا کیسے حق حاصل ہو سکتا ہے، حالانکہ بہ نسبت ان کے ہم حکمرانی کے زیادہ مستحق ہیں، اور اُن کو کچھ مالی وسعت بھی نہیں دی گئی، (کیونکہ طالوت غریب آدمی تھے) ان پیغمبر نے (جواب میں) فرمایا کہ (اول تو) اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقابلے میں اُن کو منتخب فرمایا ہے (اور انتخاب کی مصلحتوں کو اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں) اور (دوسرے) علم (سیاست و حکمرانی) اور جسامت میں اس کو زیادتی دی ہے (اور بادشاہ ہونے کے لئے اس علم کی زیادہ ضرورت ہے، تاکہ ملکی انتظام پر قادر ہو اور جسامت بھی بایں معنی ہے کہ موافق و مخالف کے قلب میں وقعت و ہیبت ہو) اور (تیسرے) اللہ تعالیٰ (مالک الملک ہیں) اپنا ملک جس کو چاہیں دیں (ان سے کوئی سوال کا منصب نہیں رکھتا) اور (چوتھے) اللہ تعالیٰ وسعت دینے والے ہیں (ان کو مال دیدینا کیا مشکل ہے، جس کے اعتبار سے تم کو شبہ ہو اور) جاننے والے ہیں (کہ کون لیاقت سلطنت کی رکھتا ہے) اور (جب ان لوگوں نے پیغمبر سے یہ درخواست کی کہ اگر کوئی ظاہری حجت بھی ان کی منجانب اللہ بادشاہ ہونے کی ہم مشاہدہ کرلیں تو اور زیادہ اطمینان ہو جائے، اس وقت) اُن سے اُن کے پیغمبر نے فرمایا کہ ان کے (منجانب اللہ) بادشاہ ہونے کی یہ علامت ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق (بدون تمہارے لائے ہوئے) آجاویگا جس میں تسکین (اور برکت) کی چیز ہے، تمہارے رب کی طرف سے (یعنی توراۃ اور توراۃ کا منجانب اللہ ہونا ظاہر ہے) اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں جن کو حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام چھوڑ گئے ہیں (یعنی ان حضرات کے کچھ ملبوسات وغیرہ، غرض) اُس صندوق کو فرشتے لے آویں گے اس (طرح کے صندوق کے آجانے) میں تم لوگوں کے واسطے پوری نشانی ہے اگر تم یقین لانے والے ہو، پھر جب (بنی اسرائیل نے طالوت کو بادشاہ تسلیم کرلیا اور جالوت کے مقابلے کے لئے لوگ جمع ہوگئے اور) طالوت فوجوں کو لے کر (اپنے مقام یعنی بیت المقدس سے عمالقہ کی طرف) چلے تو انھوں نے (اپنے ہمراہی پیغمبر کی وحی کے ذریعے دریافت کرکے ساتھیوں سے) کہا کہ اب حق تعالیٰ (استقلالی و بے استقلالی میں) تمہارا امتحان کریں گے ایک نہر کے ذریعے (جو راہ میں آوے گی اور تم شدّتِ تشنگی کے وقت اُس پر گذرو گے) سو جو شخص اس سے (افراط کے ساتھ) پانی پیوے گا وہ تو میرے ساتھیوں میں نہیں، اور جو اس کو زبان پر بھی نہ رکھے (اور اصل حکم یہی ہے) وہ میرے ساتھیوں میں ہے، لیکن جو شخص اپنے ہاتھ سے ایک چلّو بھرلے (تو اتنی رخصت ہے، غرض وہ نہر راستے میں آئی، پیاس کی تھی شدّت) سو سب نے اس سے (بے تحاشا) پینا شروع کردیا، مگر تھوڑے سے آدمیوں نے ان میں سے (احتیاط کی، کسی نے بالکل نہ پیا ہوگا، کسی نے

چُلّو سے زیادہ نہ پیا ہوگا) سو جب طالوت اور جو مؤمنین اُن کے ہمراہ تھے نہر سے پار اتر گئے (اور اپنے مجمع کو دیکھا تو تھوڑے سے آدمی رہ گئے، اُس وقت بعضے آدمی آپس میں) کہنے لگے کہ آج تو (ہمارا مجمع اتنا کم ہے کہ اس حالت سے) ہم میں جالوت اور اس کے لشکر کے مقابلے کی طاقت نہیں معلوم ہوتی (یہ سُن کر) ایسے لوگ جن کو یہ خیال (پیش نظر) تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے روبرو (پیش) ہونے والے ہیں کہنے لگے کہ کثرت سے (ایسے واقعات ہو چکے ہیں کہ) بہت سی چھوٹی چھوٹی جماعتیں بڑی بڑی جماعتوں پر خدا کے حکم سے غالب آگئی ہیں، (اصل چیز استقلال ہے) اور اللہ تعالیٰ استقلال والوں کا ساتھ دیتے ہیں، اور جب (دیارِ عمالقہ میں پہنچے اور) جالوت اور اس کی فوجوں کے سامنے میدان میں آگئے تو (دعاء میں حق تعالیٰ سے) کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار ہم پر (یعنی ہمارے قلوب پر) استقلال (غیب سے) نازل فرمائیے اور (مقابلہ کے وقت) ہمارے قدم جمائے رکھئے، اور ہم کو اس کافر قوم پر غالب کیجئے، پھر طالوت والوں نے جالوت والوں کو خدا تعالیٰ کے حکم سے شکست دیدی اور داؤد علیہ السلام نے (جو کہ اس وقت طالوت کے لشکر میں تھے اور اس وقت تک نبوت وغیرہ نہ ملی تھی) جالوت کو قتل کر ڈالا (اور مظفر و منصور واپس آئے) اور (اس کے بعد) ان کو (یعنی داؤد علیہ السلام کو) اللہ تعالیٰ نے سلطنت اور حکمت (یہاں حکمت سے مراد نبوت ہے) عطاء فرمائی اور بھی جو منظور ہوا انکو تعلیم فرمایا (جیسے بغیر آلات کے زرہ بنانا اور جانوروں کی بولی سمجھنا، آگے اس واقعہ کی مصلحتِ عامہ فرماتے ہیں) اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ بعض آدمیوں کو (جو کہ مفسد ہوں) بعضوں کے ذریعے سے (جو کہ مصلح ہوں وقتاً فوقتاً) دفع کرتے رہا کرتے ہیں (یعنی اگر مصلحین کو مفسدین پر غالب نہ کرتے رہتے) تو سرزمین (تمامتر) فساد سے پُر ہوجاتی، ولیکن اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں جہان والوں پر (اس لئے وقتاً فوقتاً اصلاح فرماتے رہتے ہیں)۔

معارف و مسائل

۱۔ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ، ان بنی اسرائیل نے حق تعالیٰ کے احکام کو چھوڑ دیا تھا، کفارِ عمالقہ ان پر مسلط کر دیئے گئے، اُس وقت ان لوگوں کو اصلاح کی فکر ہوئی، ـــــ اور جس نبی کا یہاں ذکر ہے ان کا نام شموئیل مشہور ہے۔

۲۔ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ التَّابُوْتُ، بنی اسرائیل میں ایک صندوق چلا آتا تھا، اس میں تبرکات تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام وغیرہ انبیاء کے، بنی اسرائیل اس صندوق کو لڑائی میں آگے رکھتے، اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے فتح دیتا، جب جالوت بنی اسرائیل پر غالب آیا، تو یہ صندوق بھی وہ

لے گیا تھا، جب اللہ تعالیٰ کو صندوق کا پہنچانا منظور ہوا تو یہ کیا کہ وہ کافر جہاں صندوق کو رکھتے وہیں وباء اور بلاء آئی، پانچ شہر ویران ہو گئے، ناچار ہو کر دو بیلوں پر اس کو لاد کر ہانک دیا، فرشتے بیلوں کو ہانک کر طالوت کے دروازے پر پہنچا گئے، بنی اسرائیل اس نشانی کو دیکھ کر طالوت کی بادشاہت پر یقین لائے، اور طالوت نے جالوت پر فوج کشی کر دی اور موسم نہایت گرم تھا۔

۳۔ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ، اس امتحان کی حکمت اور توجیہ احقر کے ذوق میں یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایسے مواقع پر جوش و خروش میں بھیڑ بھڑکا بہت ہو جایا کرتا ہے، لیکن وقت پر جمنے والے کم ہوتے ہیں، اور اُس وقت ایسوں کا اکھڑ جانا باقی لوگوں کے پاؤں بھی اکھاڑ دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کو ایسے لوگوں کا علیحدہ کرنا منظور تھا، اس کا یہ امتحان مقرر کیا گیا جو کہ نہایت ہی مناسب ہے، کیونکہ قتال میں ضرورت استقلال و جفاکشی کی ہوتی ہے، سو شدتِ پیاس کے وقت بے منّت پانی ملنے پر ضبط کرنا دلیل استقلال کی اور اندھے باؤلوں کی طرح جا گرنا دلیل بے استقلالی کی ہو، آگے خرقِ عادت ہو کہ زیادہ پانی پینے والے غیبی طور پر بھی زیادہ بیکار اور درماندہ ہو گئے، جیسا روح المعانی میں بسندِ ابن ابی حاتمؒ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے، اور اس قصّے میں جو احوال و اقوال مذکور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں تین قسم کے لوگ تھے:۔
ناقص الایمان جو امتحان میں پورے نہ اُترے، اور کامل جو امتحان میں پورے اُترے، مگر اپنی قلّت کی فکر ہوئی، اور اکمل جن کو یہ بھی فکر نہیں ہوئی۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

یہ آیتیں اللہ کی ہیں ہم تجھ کو سُناتے ہیں ٹھیک ٹھیک اور تو بیشک ہمارے رسولوں میں ہے۔

خلاصۂ تفسیر

چونکہ قرآن کریم کا ایک بڑا مقصد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کا اثبات بھی ہے، اس لئے جس جگہ مضمون کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے اس کا اعادہ کر دیا جاتا ہے، اس موقع پر اس قصہ کی صحیح صحیح خبر دینا جب کہ آپؐ نے نہ کسی سے پڑھا نہ کہیں سُنا نہ دیکھا، ایک معجزہ ہے جو آپؐ کی نبوّت کی صحیح دلیل ہے، اس لئے ان آیات میں آپؐ کی نبوّت پر استدلال فرماتے ہیں:

نبوتِ محمدیہ پر استدلال	یہ (آیتیں جن میں یہ قصہ مذکور ہوا) اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جو صحیح صحیح طور پر ہم تم کو پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور (اس سے ثابت ہوتا ہے کہ) آپؐ بلاشبہ پیغمبروں میں سے ہیں۔

وقف لازم

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ م مِنْهُمْ

یہ سب رسول فضیلت دی ہم نے ان میں بعض کو بعض سے کوئی تو وہ ہے

مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ط وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ

کہ کلام فرمایا اس سے اللہ نے اور بلند کئے بعضوں کے درجے اور دیئے ہم نے عیسیٰ مریم کے بیٹے

الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ط وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ

کو معجزے صریح اور قوت دی اس کو روح القدس یعنی جبرئیل سے اور اگر اللہ چاہتا تو نہ لڑتے وہ لوگ

مِنْ بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ

جو ہوئے ان پیغمبروں کے پیچھے بعد اس کے کہ پہنچ چکے ان کے پاس صاف حکم لیکن اُن میں اختلاف پڑ گیا،

مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ط وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا قف وَلٰكِنَّ

پھر کوئی تو ان میں ایمان لایا اور کوئی کافر ہوا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ باہم نہ لڑتے، لیکن

اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۲۵۳ ع ۳۳ ع ۵ ا

اللہ کرتا ہے جو چاہے۔

خلاصۂ تفسیر

بعض انبیاءؑ اور امتوں کے کچھ احوال

یہ حضرات مرسلین (جن کا ذکر ابھی اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ میں آیا ہے) ایسے ہیں کہ ہم نے ان میں سے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے، (مثلاً) بعضے ان میں وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ (بلا واسطہ فرشتہ کے) ہم کلام ہوئے ہیں، (مراد موسیٰ علیہ السلام) اور بعضوں کو ان میں بہت سے درجوں میں (اعلیٰ مقام سے) سرفراز کیا، اور ہم نے حضرت عیسےٰ بن مریم (علیہ السلام) کو کھلے کھلے دلائل (یعنی معجزات) عطا فرمائے، اور ہم نے ان کی تائید روح القدس (یعنی جبرئیل علیہ السلام) سے فرمائی (ہر وقت یہود سے انکی حفاظت کرنے کے لئے ساتھ رہتے تھے) اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو (اُمت کے) جو لوگ ان (پیغمبروں) کے بعد ہوئے ہیں (کبھی دین میں اختلاف کرکے) باہم قتل وقتال نہ کرتے بعد اس کے کہ اُن کے پاس (امرِ حق کے) دلائل (پیغمبروں کی معرفت) پہنچ چکے تھے (جن کا مقتضا تھا دینِ حق کے قبول پر متفق رہنا) ولیکن (چونکہ اللہ تعالیٰ کو بعض حکمتیں منظور تھیں، اس لئے ان میں اتفاق

مذہبی نہیں پیدا کیا) وہ لوگ باہم (دین میں) مختلف ہوئے، سو اُن میں کوئی تو ایمان لایا، اور کوئی کافر رہا، (پھر اس اختلاف میں نوبتِ قتل و قتال بھی پہنچ گئی) اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو وہ لوگ باہم قتل و قتال نہ کرتے، لیکن اللہ تعالیٰ (اپنی حکمت سے) جو چاہتے ہیں (اپنی قدرت سے) وہی کرتے ہیں۔

معارف ومسائل

(۱) تِلْكَ الرُّسُلُ الآیہ اس مضمون میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک گونہ تسلی دینا ہے، کیونکہ جب آپؐ کی رسالت دلیل سے ثابت تھی جس کو اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ میں بھی فرمایا ہے، اور پھر بھی منکرین نہ مانتے تھے، تو یہ آپؐ کے رنج و افسوس کا محل تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ بات سُنادی کہ اور بھی پیغمبرؑ مختلف درجوں کے گزرے ہیں، لیکن ایمان عام کسی کی امت میں نہیں ہوا، کسی نے موافقت کی کسی نے مخالفت، اور اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہوتی ہیں گو ہر شخص پر منکشف نہ ہوں، مگر اجمالاً اتنا عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ کوئی حکمت ضرور ہے۔

(۲) تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ، یہاں یہ اشکال پیش آسکتا ہے کہ یہ آیت صراحۃً اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ بعض انبیاءؑ بعض سے افضل ہیں، حالانکہ حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تفضلوا بین انبیاء اللہ	"انبیاءؑ کے درمیان تفضیل نہ کیا کرو"

نیز فرمایا:

لا تخیرونی علی موسیٰ۔	"مجھے موسیٰؑ پر فضیلت نہ دو"

اور فرمایا:

لا اقول ان احداً افضل من یونس بن متی	"میں نہیں کہہ سکتا کہ کوئی یونس بن متیؑ سے افضل ہے"

ان احادیث میں بعض انبیاءؑ کو بعض پر فضیلت دینے کی ممانعت وارد ہوئی ہے؟

جواب یہ ہے کہ احادیث کا مطلب یہ ہے کہ دلیل کے بغیر اپنی رائے سے بعض کو بعض پر فضیلت دو، اس لئے کہ کسی نبیؑ کے افضل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے یہاں ان کا مرتبہ بہت زیادہ ہے، اور ظاہر ہے کہ اس کا علم رائے اور قیاس سے حاصل نہیں ہو سکتا، لیکن قرآن و سنت کی کسی دلیل سے اگر بعض انبیاءؑ کی بعض پر فضیلت معلوم ہوگئی تو اس کے مطابق اعتقاد رکھا جائے گا۔

رہا آپ کا یہ ارشاد کہ لا اقول ان احدا افضل من یونس بن متیٰ اور لا تخیر ونی علےٰ موسیٰ تو یہ اس وقت سے متعلق ہے جب کہ آپؐ کو یہ علم نہیں دیا گیا تھا کہ آپؐ تمام انبیاءؑ سے افضل ہیں، بعد میں بذریعہ وحی آپؐ کو یہ بات بتلادی گئی اور صحابہ کرامؓ سے آپؐ نے اس کا اظہار بھی فرمادیا (مظہری)

(۳) مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ، موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہم کلامی گو بلا واسطہ فرشتہ کے ہو مگر بے حجاب نہ تھی، پس سورۃ شوریٰ کی آیت مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ الخ (۴۲: ۵۱) جس میں بے حجاب کلام کی نفی کی گئی اس سے کچھ تعارض نہ رہا، البتہ بعد موت کے بے حجاب کلام ہونا بھی شرعاً ممکن ہے، پس وہ شوریٰ کی آیت دنیا کے اعتبار سے ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا

اے ایمان والو خرچ کرو اس میں سے جو ہم نے تم کو روزی دی پہلے اس دن کے آنے سے

بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾

کہ جس میں نہ خرید و فروخت ہے اور نہ آشنائی اور نہ سفارش اور جو کافر ہیں وہی ہیں ظالم۔

خلاصۂ تفسیر

انفاق فی سبیل اللہ میں تعجیل کرنا، | اے ایمان والو خرچ کرلو ان چیزوں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں قبل اس کے کہ وہ دن آجاوے (یعنی قیامت کا دن) جس میں (کوئی چیز اعمال خیر کا بدل نہ ہوسکے گی، کیونکہ اس میں) نہ تو خرید و فروخت ہوگی (کہ کوئی چیز دے کر اعمال خیر کی خرید کرلو) اور نہ (ایسی) دوستی ہوگی (کہ کوئی تم کو اپنے اعمال خیر دیدے) اور نہ (بلا اذن الٰہی کسی کی) کوئی سفارش ہوگی (جس سے اعمال خیر کی تم کو حاجت نہ رہے) اور کافر ہی لوگ ظلم کرتے ہیں (کہ اعمال اور مال کو بے موقع استعمال کرتے ہیں، اس طرح کہ طاعاتِ بدنیہ و مالیہ کو ترک اور معصیتِ مالیہ و بدنیہ کو اختیار کرتے ہیں تم تو ایسے نہ بنو)۔

معارف و مسائل

اس سورۃ میں عبادات و معاملات کے متعلق احکامِ کثیرہ بیان فرمائے، جن میں سب کی تعمیل نفس کو ناگوار اور بھاری ہے، اور تمام اعمال میں زیادہ دشوار انسان کو جان اور مال کا خرچ

کرنا ہوتا ہے، اور احکام الٰہی اکثر جو دیکھے جاتے ہیں یا جان کے متعلق ہیں یا مال کے، اور گناہ میں بندہ کو جان یا مال کی محبت اور رعایت ہی اکثر مبتلا کرتی ہے، گویا ان دونوں کی محبت گناہوں کی جڑ اور اس سے نجات جملہ طاعات کی سہولت کا منشاء ہے، اس لئے ان احکامات کو بیان فرما کر قتال اور انفاق کو بیان فرمانا مناسب ہوا، وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الخ میں اوّل کا بیان تھا اور مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ الخ میں دوسرے کا ذکر ہے، اس کے بعد قصہ طالوت سے اول کی تاکید ہوئی تو اب اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ الخ سے دوسرے کی تاکید منظور ہے، اور چونکہ انفاق مال پر بہت سے امور عبادات و معاملات کے موقوف ہیں، تو اس کے بیان میں زیادہ تفصیل اور تاکید سے کام لیا، چنانچہ اب جو رکوع آتے ہیں ان میں اکثروں میں امر ثانی یعنی انفاقِ مال کا ذکر ہے، خلاصہ معنی یہ ہوا کہ عمل کا وقت ابھی ہے، آخرت میں تو نہ عمل بکتے ہیں، نہ کوئی دوستی سے دیتا ہے، نہ کوئی سفارش سے چھڑا سکتا ہے، جب تک پکڑنے والا نہ چھوڑے۔

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، زندہ ہے سب کا تھامنے والا نہیں پکڑ سکتی اس کو اونگھ اور نہ نیند

لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۭ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا

اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور ایسا کون ہے جو سفارش کرے اس کے پاس مگر اسکی

بِاِذْنِہٖ ۭ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ

اجازت سے جانتا ہے جو کچھ خلقت کے روبرو ہے اور جو کچھ اُن کے پیچھے ہے اور وہ سب احاطہ نہیں

مِّنْ عِلْمِہٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ

کر سکتے کسی چیز کا اس کی معلومات میں سے مگر جتنا کہ وہی چاہے گنجائش ہے اس کی کرسی میں تمام آسمانوں اور زمین کو

وَلَا یَئُوْدُہٗ حِفْظُھُمَا ۚ وَھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ﴿۲۵۵﴾

اور گراں نہیں اس کو تھامنا ان کا اور وہی ہے سب سے برتر عظمت والا

خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ (ایسا ہے کہ) اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، زندہ ہے (جس کو کبھی موت نہیں آسکتی) سنبھالنے والا ہے (تمام عالم کا) نہ اس کو اُونگھ دبا سکتی ہے اور نہ نیند (دبا سکتی ہے)

اسی کے مملوک ہیں سب جو کچھ (بھی) آسمانوں میں (موجودات) ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں ایسا کون شخص ہے جو اس کے پاس (کسی کی) سفارش کرسکے بدون اس کی اجازت کے وہ جانتا ہے ان (تمام موجودات) کے تمام حاضر و غائب حالات کو اور وہ موجودات اس کی معلومات میں سے کسی چیز کو اپنے احاطہ علمی میں نہیں لاسکتے مگر جس قدر (علم دینا وہی) چاہے اس کی کرسی (اتنی بڑی ہے کہ اس) نے سب آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر لے رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ کو ان دونوں (آسمان و زمین) کی حفاظت کچھ گراں نہیں گذرتی اور وہ عالی شان عظیم الشان ہے۔

معارف و مسائل

آیۃ الکرسی کے خاص فضائل یہ آیت قرآن کریم کی عظیم ترین آیت ہے، احادیث میں اس کے بڑے فضائل و برکات مذکور ہیں، مسند احمد کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سب آیات سے افضل فرمایا ہے، اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ قرآن میں کونسی آیت سب سے زیادہ عظیم ہے، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا آیت الکرسی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا، اے ابو المنذر تمھیں علم مبارک ہو۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن میں عظیم تر آیت کونسی ہے؟ فرمایا آیت الکرسی، (ابن کثیر عن احمد فی المسند)

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورۃ بقرہ میں ایک آیت ہے جو سیدۃ آیات القرآن ہے، وہ جس گھر میں پڑھی جائے شیطان اس سے نکل جاتا ہے۔

نسائی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص ہر نماز فرض کے بعد آیت الکرسی پڑھا کرے تو اس کو جنت میں داخل ہونے کے لئے بجز موت کے کوئی مانع نہیں ہے، یعنی موت کے بعد فوراً وہ جنت کے آثار اور راحت و آرام کا مشاہدہ کرنے لگے گا۔

اس آیت میں اللہ جل شانہٗ کی توحید ذات و صفات کا بیان ایک عجیب و غریب انداز میں بیان کیا گیا ہے، جس میں اللہ جل شانہٗ کا موجود ہونا، زندہ ہونا، سمیع و بصیر ہونا، متکلم ہونا، واجب الوجود ہونا، دائم و باقی ہونا، سب کائنات کا موجد و خالق ہونا، تغیرات اور تاثرات سے بالاتر ہونا، تمام کائنات کا مالک ہونا، صاحب عظمت و جلال ہونا، کہ اس کے آگے کوئی بغیر اس کی اجازت کے بول نہیں سکتا، ایسی قدرت کاملہ کا مالک ہونا کہ سارے عالم اور اس کی کائنات کو پیدا کرنے باقی رکھنے اور ان کا نظام محکم قائم رکھنے سے اس کو نہ کوئی تھکان پیش آتا ہے نہ سستی، ایسے علم

محیط کا مالک ہونا جس سے کوئی کھلی یا چھپی چیز کا کوئی ذرّہ یا قطرہ باہر نہ رہے، یہ اجمالی مفہوم ہے اس آیت کا، اب تفصیل کے ساتھ اس کے الفاظ کے معنی سنئے:

اس آیت میں دس جملے ہیں، پہلا جملہ ہے اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، اس میں لفظ اَللّٰهُ اسم ذات ہے، جس کے معنی ہیں "وہ ذات جو تمام کمالات کی جامع اور تمام نقائص سے پاک ہے" لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ میں اسی ذات کا بیان ہے، کہ قابلِ عبادت اس ذات کے سوا کوئی چیز نہیں۔

دوسرا جملہ ہے اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لفظ حَیّ کے معنے عربی زبان میں ہیں "زندہ" اسمائے الٰہیہ میں سے یہ لفظ لاکر یہ بتلانا ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے والا ہے، وہ موت سے بالاتر ہے، لفظ قیّوم، قیام سے نکلا ہے، قیام کے معنے کھڑا ہونا، قائم کھڑا ہونے والے کو کہتے ہیں، قیّوم اور قیّام مبالغہ کے صیغے کہلاتے ہیں، انکے معنی ہیں وہ جو خود قائم رہ کر دوسروں کو قائم رکھتا اور سنبھالتا ہے، قیّوم حق تعالیٰ کی خاص صفت ہے، جس میں کوئی مخلوق شریک نہیں ہو سکتی، کیونکہ جو چیزیں خود اپنے وجود و بقاء میں کسی دوسرے کی محتاج ہوں وہ کسی دوسری چیز کو کیا سنبھال سکتی ہیں؟ اس لئے کسی انسان کو قیّوم کہنا جائز نہیں، جو لوگ عبد القیّوم کے نام کو بگاڑ کر صرف قیّوم بولتے ہیں گنہگار ہوتے ہیں۔

اللہ جل شانہٗ کے اسماء صفات میں حیّ و قیّوم کا مجموعہ بہت سے حضرات کے نزدیک اسم اعظم ہے، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ بدر میں میں نے ایک وقت یہ چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھوں آپ کیا کر رہے ہیں، پہنچا تو دیکھا کہ آپ سجدہ میں پڑے ہوئے بار بار یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ کہہ رہے ہیں۔

تیسرا جملہ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ہے۔ لفظ "سِنَةٌ" سین کے زیر کے ساتھ، اُونگھ کو کہتے ہیں، جو نیند کے ابتدائی آثار ہوتے ہیں، اور "نَوْمٌ" مکمل نیند کو، اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ اونگھ اور نیند سب سے بَری و بالا ہے، پچھلے جملے میں لفظ قیّوم نے جب انسان کو یہ بتلایا کہ اللہ جل شانہٗ سارے آسمانوں، زمینوں اور ان میں سمانے والی تمام کائنات کو تھامے اور سنبھالے ہوئے ہیں اور ساری کائنات اسی کے سہارے قائم ہے، تو ایک انسان کا خیال اپنی جبلّت و فطرت کے مطابق اس طرف جانا ممکن ہے کہ جو ذات پاک اتنا بڑا کام کر رہی ہے اس کو کسی وقت تھکان بھی ہونا چاہئے کچھ وقت آرام اور نیند کے لئے بھی ہونا چاہئے، اس دوسرے جملے میں محدود علم و بصیرت اور محدود قدرت رکھنے والے انسان کو اس پر متنبہ کر دیا کہ اللہ جل شانہٗ کو اپنے اوپر یا دوسری مخلوقات پر قیاس نہ کرے، اپنا جیسا نہ سمجھے، وہ مثل و مثال سے بالاتر ہے، اس کی قدرتِ کاملہ کے سامنے یہ سارے کام نہ کچھ مشکل ہیں، نہ اُس کے لئے تکان کا سبب ہیں، اور اس کی ذات پاک تمام تاثرات اور تکان و تعب اور اونگھ اور نیند سے بالاتر ہے۔

چوتھا جملہ ہے لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ، اس کے شروع میں لفظ لَهٗ کا لام تملیک کے معنے کے لئے آیا ہے، جس کے معنے یہ ہوئے کہ تمام چیزیں جو آسمانوں یا زمین میں ہیں سب اللہ تعالیٰ کی مملوک ہیں، وہ مختار ہے، جس طرح چاہے اُن میں تصرّف فرماوے۔

پانچواں جملہ ہے مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ، یعنی "ایسا کون ہے جو اس کے آگے کسی کی سفارش کرسکے بدون اس کی اجازت کے"، اس میں چند مسائل بیان فرمادیئے ہیں:

اوّل یہ کہ جب اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا مالک ہے، کوئی اس سے بڑا اور اس کے اوپر حاکم نہیں تو کوئی اس سے کسی کام کے بارے میں باز پرس کرنے کا بھی حق دار نہیں، وہ جو حکم جاری فرمائیں اس میں کسی کو چون وچرا کی مجال نہیں، ہاں یہ ہوسکتا تھا کہ کوئی شخص کسی کی سفارش و شفاعت کرے سو اس کو بھی واضح فرمادیا کہ بارگاہِ عزت وجلال میں کسی کو مجالِ دم زدن نہیں، ہاں کچھ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے ہیں جن کو خاص طور پر کلام اور شفاعت کی اجازت دیدیجائیگی، غرض بلا اجازت کوئی کسی کی سفارش وشفاعت بھی نہ کرسکے گا، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر میں سب سے پہلے میں ساری امتوں کی شفاعت کروں گا، اسی کا نام مقامِ محمود ہے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے۔

چھٹا جملہ ہے يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ یعنی "اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کے آگے پیچھے کے تمام حالات و واقعات سے واقف وباخبر ہے"، آگے اور پیچھے کا یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ اُن کے پیدا ہونے سے پہلے اور پیدا ہونے کے بعد کے تمام حالات وواقعات حق تعالیٰ کے علم میں ہیں، اور یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ آگے سے مراد وہ حالات ہیں جو انسان کے لئے کھلے ہوئے ہیں، اور پیچھے سے مراد اس سے مخفی واقعات وحالات ہوں تو معنی یہ ہوں گے کہ انسان کا علم تو بعض چیزوں پر ہے، اور بعض پر نہیں، کچھ چیزیں اس کے سامنے کھلی ہوئی ہیں کچھ چھپی ہوئی، مگر اللہ جل شانہٗ کے سامنے یہ سب چیزیں برابر ہیں، اس کا علم ان سب چیزوں کو یکساں محیط ہے، اور ان دونوں مفہوموں میں کوئی تعارض نہیں، آیت کی وسعت میں یہ دونوں داخل ہیں۔

ساتواں جملہ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ہے، "یعنی انسان اور تمام مخلوقات اللہ کے علم کے کسی حصّہ کا بھی احاطہ نہیں کرسکتے، مگر اللہ تعالیٰ ہی خود جس کو جتنا حصہ علم عطا کرنا چاہیں صرف اتنا ہی اس کو علم ہوسکتا ہے"، اس میں بتلا دیا گیا کہ تمام کائنات کے ذرہ ذرہ کا علم محیط صرف اللہ جل شانہٗ کی خصوصی صفت ہے، انسان یا کوئی مخلوق اس میں شریک نہیں ہوسکتی۔

آٹھواں جملہ ہے وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ، یعنی "اس کی کرسی اتنی بڑی ہے

جس کی وسعت کے اندر ساتوں آسمان اور زمین سمائے ہوئے ہیں" اللہ جل شانہ نشست و برخاست اور حیز و مکان سے بالاتر ہیں، اس قسم کی آیات کو اپنے معاملات پر قیاس نہ کیا جائے، اس کی کیفیت و حقیقت کا ادراک انسانی عقل سے بالاتر ہے، البتہ مستند روایاتِ حدیث سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ عرش اور کرسی بہت عظیم الشان جسم ہیں جو تمام آسمان اور زمین سے بدرجہا بڑے ہیں،

ابن کثیرؒ نے بروایت حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کرسی کیا اور کیسی ہے، آپؐ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ ساتوں آسمانوں اور زمینوں کی مثال کرسی کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے ایک بڑے میدان میں کوئی حلقہ انگشتری جیسا ڈال دیا جائے۔

اور بعض دوسری روایات میں ہے کہ عرش کے سامنے کرسی کی مثال بھی ایسی ہی ہے جیسے ایک بڑے میدان میں انگشتری کا حلقہ۔

نواں جملہ ہے وَلَا يَؤُدُهٗ حِفْظُهُمَا، یعنی اللہ تعالیٰ کو ان دونوں عظیم مخلوقات آسمان و زمین کی حفاظت کچھ گراں نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ اس قادرِ مطلق کی قدرتِ کاملہ کے سامنے یہ سب چیزیں نہایت آسان ہیں۔

دسواں آخری جملہ ہے وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ یعنی "وہ عالی شان اور عظیم الشان ہے"، پچھلے نو جملوں میں حق تعالیٰ کی ذات و صفات کے کمالات بیان ہوئے ہیں، ان کو دیکھنے اور سمجھنے کے بعد ہر عقل رکھنے والا انسان یہی کہنے پر مجبور ہے کہ ہر عزت و عظمت اور بلندی و برتری کی مالک و سزاوار وہی ذات پاک ہے، ان دس جملوں میں اللہ جل شانہ کی صفاتِ کمال اور اس کی توحید کا مضمون پوری وضاحت اور تفصیل کے ساتھ آگیا۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۟ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ

زبردستی نہیں دین کے معاملہ میں بیشک جدا ہو چکی ہے ہدایت گمراہی سے اب جو کوئی نہ مانے گمراہ

بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ

کرنے والوں کو اور یقین لاوے اللہ پر تو اس نے پکڑ لیا حلقہ مضبوط جو ٹوٹنے والا

لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾

نہیں اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے

خلاصۂ تفسیر

دین (اسلام کے قبول کرنے) میں زبردستی (کا فی نفسہٖ کوئی موقع) نہیں (کیونکہ) ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے (یعنی اسلام کا حق ہونا دلائل سے واضح ہو چکا ہے، تو اس میں اکراہ کا موقع ہی کیا ہے، اکراہ تو غیر پسندیدہ چیز پر مجبور کرنے سے ہوتا ہے، اور جب اسلام کی خوبی یقیناً ثابت ہے) تو جو شخص شیطان سے بد اعتقاد ہو اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ خوش اعتقاد (یعنی اسلام قبول کرے) تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا جو کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والے ہیں (اقوالِ ظاہری کے) اور خوب جاننے والے ہیں (احوالِ باطنی کے)

معارف و مسائل

اسلام کو مضبوط پکڑنے والا چونکہ ہلاکت اور محرومی سے محفوظ رہتا ہے، اس لئے اس کو ایسے شخص سے تشبیہ دی جو کسی مضبوط رسّی کا حلقہ ہاتھ میں مضبوط تھام کر گرنے سے مامون رہتا ہے اور جس طرح ایسی رسّی کے ٹوٹ کر گرنے کا خطرہ نہیں اور یوں کوئی رسّی ہی چھوڑ دے تو اور بات ہے، اسی طرح اسلام میں کسی قسم کی ہلاکت اور خسران نہیں ہے، اور خود کوئی اسلام کو ہی چھوڑ دے تو اور بات ہے (بیان القرآن)

اس آیت کو دیکھتے ہوئے بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں زبردستی نہیں ہے، حالانکہ اسلام میں جہاد اور قتال کی تعلیم اس کے معارض ہے۔

اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اعتراض صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اسلام میں جہاد اور قتال کی تعلیم لوگوں کو قبولِ ایمان پر مجبور کرنے کے لئے نہیں ہے، ورنہ جزیہ لے کر کفار کو اپنی ذمہ داری میں رکھنے اور ان کی جان و مال و آبرو کی حفاظت کرنے کے اسلامی احکام کیسے جاری ہوتے، بلکہ دفعِ فساد کے لئے ہے، کیونکہ فساد اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے، جس کے درپے کافر رہتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ (۵: ۶۴)	"یہ لوگ زمین میں فساد کرتے پھرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا"

اس لئے اللہ تعالیٰ نے جہاد اور قتال کے ذریعے سے ان لوگوں کے فساد کو دور کرنے کا حکم دیا ہے، پس ان لوگوں کا قتل ایسا ہی ہے جیسے سانپ، بچھو اور دیگر موذی جانوروں کا قتل۔

اسلام نے عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور اپاہج وغیرہ کے قتل کو عین میدانِ جہاد میں بھی سختی سے روکا ہے، کیونکہ وہ فساد کرنے پر قادر نہیں ہوتے، ایسے ہی اُن لوگوں کے بھی قتل کرنے کو روکا ہے جو جزیہ ادا کرنے کا وعدہ کر کے قانون کے پابند ہو گئے ہوں۔

اسلام کے اس طرزِ عمل سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ جہاد اور قتال سے لوگوں کو ایمان قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا، بلکہ اس سے وہ دنیا میں ظلم وستم کو مٹا کر عدل وانصاف اور امن وامان قائم رکھنا چاہتا ہے، حضرت عمرؓ نے ایک نصرانی بڑھیا کو اسلام کی دعوت دی تو اس کے جواب میں اس نے کہا: "اَنَا عَجُوْزٌ کَبِیْرَۃٌ وَّالْمَوْتُ اِلَیَّ قَرِیْبٌ" یعنی میں ایک قریب المرگ بڑھیا ہوں، آخری وقت میں اپنا مذہب کیوں چھوڑوں؟ حضرت عمرؓ نے یہ سُنکر اس کو ایمان پر مجبور نہیں کیا، بلکہ یہی آیت تلاوت فرمائی: "لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ" یعنی دین میں زبردستی نہیں ہے"۔

درحقیقت ایمان کے قبول پر جبر واکراہ ممکن بھی نہیں ہے، اس لئے کہ ایمان کا تعلق ظاہری اعضاء سے نہیں ہے، بلکہ قلب کے ساتھ ہے، اور جبر واکراہ کا تعلق صرف ظاہری اعضاء سے ہوتا ہے، اور جہاد وقتال سے صرف ظاہری اعضاء ہی متاثر ہو سکتے ہیں، لہٰذا اس کے ذریعہ سے ایمان کے قبول کرنے پر جبر ممکن ہی نہیں ہے، اس سے ثابت ہوا کہ آیاتِ جہاد و قتال آیت "لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ" کے معارض نہیں ہیں۔ (مظہری، قرطبی)

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ڛ وَالَّذِيْنَ

اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا نکالتا ہے ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف اور جو لوگ

كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔــھُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَـھُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ

کافر ہوئے اُن کے رفیق ہیں شیطان نکالتے ہیں اُن کو روشنی سے اندھیروں کی طرف

اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ۲۵۷ ع ۳۴ / ۲

یہی لوگ ہیں دوزخ میں رہنے والے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

خلاصۂ تفسیر

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (الیٰ قولہ) خٰلِدُوْنَ ۝ اللہ تعالیٰ ساتھی ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے، ان کو (کفر کی) تاریکیوں سے نکال کر یا بچا کر نور (اسلام) کی طرف لاتا ہے، اور جو لوگ کافر ہیں اُن کے ساتھی شیاطین ہیں (انسی یا جنی) وہ ان کو نور (اسلام) سے نکال کر یا بچا کر (کفر کی) تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں، ایسے لوگ (جو اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کریں) دوزخ میں رہنے والے ہیں (اور) یہ لوگ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے"۔

معارف و مسائل

اس آیت سے ایمان کا سب سے بڑی نعمت اور کفر کا سب سے بڑی مصیبت ہونا بھی معلوم ہوا اور یہ بھی کہ کافروں کی دوستی میں بھی ظلمت ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ

کیا نہ دیکھا تو نے اس شخص کو جس نے جھگڑا کیا ابراہیمؑ سے اس کے رب کی بابت اس وجہ سے کہ دی تھی اللہ

إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ

نے اسکو سلطنت، جب کہا ابراہیمؑ نے میرا رب وہ ہی جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے وہ بولا میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں

قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا

کہا ابراہیمؑ نے بیشک وہ لاتا ہے سورج کو مشرق سے اب تو لے آ اس کو

مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ

مغرب سے تب حیران رہ گیا وہ کافر اور اللہ سیدھی راہ نہیں دکھاتا

الظَّالِمِينَ ﴿۲۵۸﴾

بے انصافوں کو۔

خلاصۂ تفسیر

(اے مخاطب) کیا تجھ کو اس شخص کا قصہ تحقیق نہیں ہوا (یعنی نمرود کا) جس نے ابراہیم (علیہ السلام) سے مباحثہ کیا تھا اپنے پروردگار کے (وجود کے) بارے میں (یعنی توبہ توبہ وہ خدا کے وجود ہی کا منکر تھا) اس وجہ سے کہ خدا تعالیٰ نے اس کو سلطنت دی تھی (یعنی چاہئے تو یہ تھا کہ نعمتِ سلطنت پر احسان مانتا اور ایمان لاتا، اس کے برعکس انکار اور کفر شروع کر دیا اور یہ مباحثہ اس وقت شروع ہوا تھا) جب ابراہیم علیہ السلام نے (اس کے پوچھنے پر کہ خدا کیسا ہے جواب میں) فرمایا کہ میرا پروردگار ایسا ہے کہ وہ جلاتا ہے اور مارتا ہے (یعنی زندہ کرنا اور مارنا اس کی قدرت میں ہے) وہ کوڑھ مغز جلانے مارنے کا مطلب تو سمجھا نہیں) کہنے لگا کہ (یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں کہ) میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں (چنانچہ جسکو چاہوں قتل کردوں یہ تو مارنا ہے اور جسکو چاہوں قتل سے معاف کردوں یہ جلانا ہے) ابراہیم علیہ السلام نے (جب دیکھا کہ بالکل ہی بھدی عقل کا ہے کہ اس کو جلانا اور مارنا سمجھتا ہے، حالانکہ جلانے کی حقیقت بے جان چیز میں جان ڈال دینا ہے، اسی طرح مارنے کا معاملہ سمجھو، اور قرائن سے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ جلانے اور مارنے کی حقیقت سمجھے گا نہیں، اس لئے اس ضرورت سے دوسرے جواب کی طرف متوجہ ہوئے اور) فرمایا کہ (اچھا) اللہ تعالیٰ آفتاب کو (روزانہ) مشرق

سے نکالتا ہے تو (ایک ہی دن) مغرب سے نکال (کر دکھلا) اس پر متحیر رہ گیا وہ کافر اور کچھ جواب نہ بن آیا اس کا مقتضی یہ تھا کہ وہ ہدایت کو قبول کرتا، مگر وہ اپنی گمراہی پر جما رہا اس لئے ہدایت نہ ہوئی) اور اللہ تعالیٰ (کی عادت ہے کہ) ایسے بے جا راہ چلنے والوں کو ہدایت نہیں فرماتے۔

معارف ومسائل

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کافر کو دنیاوی عزت و شرف اور ملک و سلطنت عطا کر دیں تو اس نام سے تعبیر کرنا جائز ہے، نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت مناظرہ اور مجادلہ کرنا بھی جائز ہے، تاکہ حق و باطل میں فرق ظاہر ہو جائے (قرطبی)

بعضوں کو یہ شبہ ہوا کہ اس کو یہ کہنے کی گنجائش تھی کہ اگر خدا موجود ہے تو وہی مغرب سے نکالے، دفع اس شبہ کا یہ ہے کہ اس کے قلب میں بلا اختیار یہ بات پڑ گئی کہ خدا ضرور ہے، اور یہ مشرق سے نکالنا اسی کا فعل ہے، اور وہ مغرب سے بھی نکال سکتا ہے، اور یہ شخص پیغمبر ہے، اس کے کہنے سے ضرور ایسا ہوگا اور ایسا ہونے سے انقلابِ عظیم عالم میں پیدا ہوگا، کہیں اور لینے کے دینے نہ پڑ جائیں، مثلاً لوگ اس معجزے کو دیکھ کر مجھ سے منحرف ہو کر ان کی راہ پر ہولیں، ذرا سی حجت میں سلطنت جاتی رہے، یہ جواب تو اس لئے نہ دیا اور دوسرا کوئی جواب تھا نہیں، اس لئے حیران رہ گیا (بیان القرآن)

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ

کیا نہ دیکھا تو نے اس شخص کو کہ گذرا وہ ایک شہر پر اور وہ گر پڑا تھا اپنی چھتوں پر بولا کیونکر زندہ کرے گا

هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ

اس کو اللہ مر گئے پیچھے، پھر مردہ رکھا اس شخص کو اللہ نے سو برس پھر اٹھایا اس کو کہا تو کتنی

كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ

دیر یہاں رہا، بولا میں رہا ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم کہا نہیں بلکہ تو رہا سو برس

عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰی حِمَارِكَ

اب دیکھ اپنا کھانا اور پینا، سڑ نہیں گیا، اور دیکھ اپنے گدھے کو

وَلِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ

اور ہم نے تجھ کو نمونہ بنانا چاہا لوگوں کے واسطے اور دیکھ ہڈیوں کی طرف کہ ہم اُنکو کس طرح اُبھار کر جوڑ دیتے ہیں

نَكْسُوهَا لَحْمًا ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ ۙ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ

پھر اُن پر پہناتے ہیں گوشت، پھر جب اس پر ظاہر ہوا یہ حال تو کہہ اٹھا کہ مجھ کو معلوم ہے کہ بیشک

قَدِيرٌ ﴿٢٥٩﴾

اللہ ہر چیز پر قادر ہے

خلاصۂ تفسیر

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ (الیٰ قولہ) أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

کیا تم کو اس طرح کا قصہ بھی معلوم ہے، جیسے ایک شخص تھا کہ (چلتے چلتے) ایک بستی پر ایسی حالت میں اس کا گذر ہوا کہ اس کے مکانات اپنی چھتوں پر گر گئے تھے، (یعنی پہلے چھتیں گریں پھر اُن پر دیواریں گر گئیں، مراد یہ ہے کہ کسی حادثہ سے وہ بستی ویران ہوگئی تھی، اور سب آدمی مرمرا گئے تھے، وہ شخص یہ حالت دیکھ کر حیرت سے) کہنے لگا کہ (معلوم نہیں) اللہ تعالیٰ اس بستی کو (یعنی اس کے مُردوں کو) اس کے مرے پیچھے کس کیفیت سے (قیامت میں) زندہ کریں گے (یہ تو یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں مُردوں کو جلادیں گے، مگر اس وقت کے جِلانے کا جو خیال غالب ہوا تو بوجہ اس امر کے عجیب ہونے کے ایک حیرت سی دِل پر غالب ہوگئی، اور چونکہ خدا تعالیٰ ایک کام کو کئی طرح کر سکتے ہیں، اس لئے طبیعت اس کی متلاشی ہوئی کہ خدا جانے جِلا دینا کس صورت سے ہوگا، اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اس کا تماشا اس کو دنیا ہی میں دکھلادیں، تاکہ ایک نظیر کے واقع ہو جانے سے لوگوں کو زیادہ ہدایت ہو) سو (اس لئے) اللہ تعالیٰ نے اس شخص (کی جان قبض کر کے اس کو) سَو برس تک مُردہ رکھا، پھر (سو برس کے بعد) اس کو زندہ اٹھایا (اور پھر) پوچھا کہ تو کتنی مدت اس حالت میں رہا؟ اس شخص نے جواب دیا کہ ایک دن رہا ہوں گا، یا ایک دن سے بھی کم (کنایہ ہے مدتِ قلیل سے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ تو (اس حالت میں) سَو برس رہا ہے، (اور اگر اپنے بدن کے اندر تغیر نہ ہونے سے تعجب ہو) تو اپنے کھانے پینے (کی) چیز کو دیکھ لے کہ (ذرا) نہیں سڑی گلی (ایک قدرت تو ہماری یہ ہے) اور (دوسری قدرت دیکھنے کے واسطے) اپنے (سواری کے) گدھے کی طرف نظر کر (کہ گل سڑ کر کیا حال ہوگیا ہے، اور ہم عنقریب اس کو تیرے سامنے زندہ کئے دیتے ہیں) اور (ہم نے تجھ کو اس لئے مار کر زندہ کیا ہے) تاکہ ہم تجھ کو (اپنی قدرت کی) ایک نظیر لوگوں کے لئے بنا دیں (کہ اس نظیر سے بھی قیامت کے روز زندہ ہونے پر استدلال کرسکیں) اور (اب اس گدھے کی) ہڈیوں کی طرف نظر کر کہ ہم ان کو کس طرح

ترکیب دیئے دیتے ہیں، پھر اُن پر گوشت چڑھا دیتے ہیں (پھر اس میں جان ڈال دیتے ہیں، غرض یہ سب امور یوں ہی کر دیئے گئے) پھر جب یہ سب کیفیت اس شخص کو (مشاہدہ سے) واضح ہو گئی تو (بے اختیار جوش میں آکر) کہہ اٹھا کہ میں (دل سے) یقین رکھتا ہوں کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ

اور یاد کر جب کہا ابراہیمؑ نے اے پروردگار میرے دکھلا دے مجھ کو کیونکر زندہ کرے گا تو مردے، فرمایا کیا تو نے یقین نہیں کیا

قَالَ بَلٰي وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِيْ ۭ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ

کہا کیوں نہیں لیکن اس واسطے کہ چاہتا ہوں کہ تسکین ہو جاوے میرے دل کو فرمایا تو پکڑ لے چار جانور اُڑنے والے

فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰي كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ

پھر اُن کو ہلا لے اپنے ساتھ، پھر رکھ دے ہر پہاڑ پر اُن کے بدن کا ایک ایک ٹکڑا پھر اُن کو بُلا،

٣٥ ع ٣ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ۭ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۲۶۰) ع

چلے آویں گے تیرے پاس دوڑتے ہوئے اور جان لے کہ بیشک اللہ زبردست ہے حکمت والا

خلاصۂ تفسیر

اور اس وقت (کے واقعہ) کو یاد کرو جبکہ ابراہیم علیہ السلام نے (حق تعالیٰ سے) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار مجھ کو (یہ) دکھلا دیجئے کہ آپ مُردوں کو (قیامت میں مثلاً) کس کیفیت سے زندہ کریں گے (یعنی زندہ کرنے کا تو یقین ہے، لیکن زندہ کرنے کی مختلف صورتیں اور کیفیتیں ہو سکتی ہیں وہ معلوم نہیں، اس لئے وہ معلوم کرنے کو دل چاہتا ہے، اس سوال سے کسی کم سمجھ آدمی کو اس کا شبہ ہو سکتا تھا کہ معاذ اللہ ابراہیم علیہ السلام کو مرنے کے بعد زندہ ہونے پر ایمان و یقین نہیں، اس لئے حق تعالیٰ نے خود یہ سوال قائم کرکے بات کھول دی، چنانچہ ابراہیم علیہ السلام سے اس سوال کے جواب میں اول) ارشاد فرمایا کہ کیا تم (اس پر) یقین نہیں لاتے، انھوں نے (جواب میں) عرض کیا کہ یقین کیوں نہ لاتا، لیکن اس غرض سے یہ درخواست کرتا ہوں تاکہ میرے قلب کو (معیّن صورت زندہ کرنے کی مشاہدہ کرنے سے) سکون ہو جاوے (ذہن دوسرے احتمالات سے چکر میں نہ پڑے) ارشاد ہوا کہ اچھا تو تم چار پرندے لو پھر ان کو (پال کر) اپنے لئے ہلا لو،

(تاکہ اُن کی خوب شناخت ہو جاوے) پھر (سب کو ذبح کر کے اور ہڈیوں پروں سمیت ان کا قیمہ سا کر کے اس کے کئی حصے کر دو اور کئی پہاڑ اپنی مرضی سے انتخاب کر کے) ہر پہاڑ پر اُن میں سے ایک ایک حصہ رکھ دو (اور) پھر اُن سب کو بلاؤ (دیکھو) تمہارے پاس (زندہ ہو کر) دوڑے دوڑے چلے آویں گے اور خوب یقین رکھو اس بات کا کہ حق تعالیٰ زبردست (قدرت والے) ہیں (سب کچھ کر سکتے ہیں پھر بھی بعض باتیں نہیں کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ) حکمت والے (بھی) ہیں، (ہر کام حکمت و مصلحت کے مطابق کرتے ہیں)

معارف و مسائل

حضرت خلیل اللہؑ کی درخواست حیات بعد الموت کا مشاہدہ اور شبہات کا ازالہ

یہ تیسرا قصہ ہے جو آیتِ مذکورہ میں بیان فرمایا گیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے حق تعالیٰ سے یہ درخواست کی کہ مجھے اس کا مشاہدہ کرا دیجئے کہ آپ مُردوں کو کس طرح زندہ کریں گے؟ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اس درخواست کی کیا وجہ ہے؟ کیا آپ کو ہماری قدرتِ کاملہ پر یقین نہیں کہ وہ ہر چیز پر حاوی ہے، ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنا واقعی حال عرض کیا کہ یقین تو کیسے نہ ہوتا، کیونکہ آپ کی قدرتِ کاملہ کے مظاہر ہر لحظہ ہر آن مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں، اور غور و فکر کرنے والے کے لئے خود اس کی ذات میں اور کائنات کے ذرہ ذرہ میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے، لیکن انسانی فطرت ہے کہ جس کام کا مشاہدہ نہ ہو خواہ وہ کتنا ہی یقینی ہو اس میں اس کے خیالات منتشر رہتے ہیں، کہ یہ کیسے اور کس طرح ہوگا؟ یہ ذہنی انتشار سکونِ قلب اور اطمینان میں خلل انداز ہوتا ہے، اس لئے یہ مشاہدہ کی درخواست کی گئی کہ احیاءِ موتیٰ کی مختلف صورتوں اور کیفیتوں میں ذہنی انتشار واقع نہ ہو کر قلب کو سکون و اطمینان حاصل ہو جائے۔

حق تعالیٰ نے ان کی درخواست قبول فرما کر ان کے مشاہدہ کی بھی ایک ایسی عجیب صورت تجویز فرمائی جس میں منکرین کے تمام شبہات و خدشات کے ازالہ کا بھی مشاہدہ ہو جائے، وہ صورت یہ تھی کہ آپ کو حکم دیا گیا کہ چار پرندے جانور اپنے پاس جمع کر لیں، پھر اُن کو پاس رکھ کر ہلا لیں کہ وہ ایسے ہل جائیں کہ آپ کے بُلانے سے آجایا کریں، اور ان کی پوری طرح شناخت بھی ہو جائے، یہ شبہ نہ رہے کہ شاید کوئی دوسرا پرندہ آگیا ہو، پھر ان چاروں کو ذبح کر کے اور ہڈیوں اور پروں سمیت اُن کا خوب قیمہ سا کر کے اس کے کئی حصے کر دیں، اور پھر اپنی تجویز سے مختلف پہاڑوں پر اس قیمہ کا ایک ایک حصہ رکھ دیں، پھر اُن کو بُلائیں، تو وہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ سے زندہ ہو کر دوڑے دوڑے آپ کے پاس آجائیں گے۔

تفسیر روح المعانی میں بسند ابن المنذر حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسا ہی کیا، پھر ان کو پکارا تو فوراً ہڈی سے ہڈی، پَر سے پَر، خون سے خون، گوشت سے گوشت مل ملا کر سب اپنی اپنی اصلی ہیئت میں زندہ ہو کر دوڑتے ہوئے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس آگئے، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابراہیمؑ قیامت کے روز اسی طرح سب اجزاء و اجساد کو جمع کرکے ایک دم سے ان میں جان ڈالدونگا۔

قرآن کے الفاظ میں یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا آیا ہے، کہ یہ پرندے دوڑتے ہوئے آئیں گے، جس سے معلوم ہوا کہ اُڑ کر نہیں آئیں گے، کیونکہ آسمان میں اُڑ کر آنے میں نظروں سے اوجھل ہو کر بدل جانے کا شبہ ہو سکتا ہے، زمین پر چل کر آنے میں یہ بالکل سامنے رہیں گے، اس واقعہ میں حق تعالیٰ نے قیامت کے بعد حیات بعد الموت کا ایسا نمونہ حضرت خلیل اللہ کو دکھلا دیا جس نے مشرکین اور منکرین کے سارے شبہات کا ازالہ مشاہدہ سے کرا دیا۔

حیات بعد الموت اور عالمِ آخرت کی زندگی پر سب سے بڑا اشکال منکرین کو یہی ہوتا ہے کہ انسان مرنے کے بعد مٹی ہو جاتا ہے، پھر یہ مٹی کہیں ہوا کے ساتھ اُڑ جاتی ہے، کہیں پانی کے ساتھ بہہ جاتی ہے، کہیں درختوں اور کھیتوں کی شکل میں برآمد ہوتی ہے، پھر اس کا ذرہ ذرہ دنیا کے اطرافِ بعیدہ میں پھیل جاتا ہے، ان منتشر ذرّوں اور اجزاءِ انسانی کو جمع کر دینا اور پھر ان میں روح ڈال دینا سطحی نظر والے انسان کی اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ سب کو اپنی قدرت و اپنی حیثیت پر قیاس کرتا ہے، وہ اپنے سے مافوق اور ناقابلِ قیاس قدرت میں غور نہیں کرتا۔

حالانکہ اگر وہ ذرا سا اپنے ہی وجود میں غور کرلے تو اسے نظر آئے کہ آج بھی اس کا وجود ساری دنیا میں بکھرے ہوئے اجزاء و ذرّات کا مجموعہ ہے، انسان کی آفرینش جن ماں اور باپ کے ذریعے ہوتی ہے، اور جن غذاؤں سے اُن کا خون اور جسم بنتا ہے وہ خود جہان کے مختلف گوشوں سے سمٹے ہوئے ذرات ہوتے ہیں، پھر پیدائش کے بعد انسان جن غذا کے ذریعے نشو و نما پاتا ہے، جس سے اس کا خون اور گوشت پوست بنتا ہے، اس میں غور کرے تو اس کی غذاؤں میں ایک ایک چیز ایسی ہے جو تمام دنیا کے مختلف ذرّات سے بنی ہوئی ہے، دودھ پیتا ہے تو وہ کسی گائے، بھینس یا بکری کے اجزاء ہیں، اور ان جانوروں میں یہ اجزاء اُس گھاس دانے سے پیدا ہوئے جو انھوں نے کھائے ہیں، یہ گھاس دانے معلوم نہیں کس کس خطۂ زمین سے آئے ہیں، اور ساری دنیا میں پھرنے والی ہواؤں نے کہاں کہاں کے ذرّات کو ان کی تربیت میں شامل کر دیا ہے، اسی طرح دنیا کا دانہ دانہ اور پھل اور ترکاریاں اور انسان کی تمام غذائیں اور دوائیں جو اس کے بدن کا جُزو بنتی ہیں وہ کس کس گوشۂ عالم سے کس کس طرح حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ

اور نظامِ محکم نے ایک انسان کے بدن میں جمع فرما دیئے، اگر غافل اور کوتاہ نظر انسان دنیا کو چھوڑ کر اپنے ہی تن بدن کی تحقیق (ریسرچ) کرنے بیٹھ جائے تو اس کو یہ نظر آئے گا کہ اس کا وجود خود ایسے بے شمار اجزاء سے مرکب ہی جو کوئی مشرق کا ہے کوئی مغرب کا، کوئی جنوبی دنیا کا کوئی شمالی حصہ کا، آج بھی دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اجزاء قدرت کے نظامِ محکم نے اس کے بدن میں جمع فرما دیئے ہیں، اور مرنے کے بعد یہ اجزاء پھر اسی طرح منتشر ہو جائیں گے، تو اب دوسری مرتبہ پھر ان کا جمع فرما دینا اس کی قدرتِ کاملہ کے لئے کیا دشوار ہے، جس نے پہلی مرتبہ اس کے وجود میں ان منتشر ذرات کو جمع فرما دیا تھا۔

واقعۂ مذکورہ پر چند سوالات مع جوابات

آیت متذکرہ بالا کے مضمون میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:

اوّل یہ کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ سوال ہی کیوں پیدا ہوا، جبکہ وہ حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ پر ایمان لانے میں اس وقت کی ساری دنیا سے زیادہ یقین پر تھے؟

اس کا جواب اس تقریر کے ضمن میں آچکا ہے جو اوپر کی گئی ہے کہ درحقیقت حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سوال کسی شک وشبہ کی بناء پر تھا ہی نہیں، بلکہ سوال کا منشاء صرف یہ تھا کہ حق تعالیٰ قیامت میں مُردوں کو زندہ کریں گے، اُن کی قدرتِ کاملہ سے یہ کسی طرح بھی مستبعد یا حیرت انگیز نہیں، بلکہ یقینی ہے، لیکن مُردہ کو زندہ کرنے کا کام انسان کی طاقت سے باہر ہے، اس نے کبھی کسی مردہ کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھا نہیں اور مردہ کو زندہ کرنے کی کیفیات اور صورتیں مختلف ہو سکتی ہیں، انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز اس کے مشاہدہ میں نہ ہو اس کی کیفیات کی کھوج لگانے کی فکر میں رہا کرتا ہے، اس میں اس کا خیال مختلف راہوں پر چلتا ہی جس میں ذہنی انتشار کی تکلیف بھی برداشت کرتا ہے، اس ذہنی انتشار کو رفع کر کے قلب کو سکون مل جانے ہی کا نام اطمینان ہے، اسی کے لئے حضرت خلیل اللہؑ نے یہ درخواست پیش فرمائی تھی۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ایمان اور اطمینان میں کیا فرق ہے، ایمان اس اختیاری یقین کا نام ہے جو انسان کو رسولؐ کے اعتماد پر کسی غیب کی بات کے متعلق حاصل ہو جائے، اور اطمینان سکونِ قلب کا نام ہی، بعض اوقات نظروں سے غائب کسی چیز پر یقینِ کامل تو ہوتا ہے، مگر قلب کو سکون اس لئے نہیں ہوتا کہ اس کی کیفیات کا علم نہیں ہوتا، یہ سکون صرف مشاہدہ سے حاصل ہو سکتا ہے، حضرت خلیل اللہؑ کو بھی حیات بعد الموت پر تو کامل ایمان ویقین تھا، سوال صرف کیفیتِ احیاء کے متعلق تھا۔

۴۰

دُوسرا سوال یہ ہے کہ جب حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سوال زندہ کرنے کی کیفیت سے متعلق تھا، اصل حیات بعد الموت میں کوئی شک و شبہ نہ تھا، تو پھر ارشاد ربانی اَوَلَمْ تُؤْمِنْ "یعنی کیا آپ کو یقین نہیں" فرمانے کا کوئی موقع نہیں رہتا ؟

جواب یہ ہے کہ جو سوال حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیش فرمایا کہ اصل واقعہ میں کوئی شک نہیں، لیکن اس سوال کا ایک مفہوم تو یہی ہے کہ زندہ کرنے کی کیفیت دریافت کرنا منظور ہے۔

انہی الفاظِ سوال کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہو سکتا ہے جو اصل قدرت میں شبہ یا انکار سے پیدا ہوا کرتا ہے، جیسے آپ کسی بوجھ کے متعلق یہ یقین رکھتے ہیں کہ فلاں آدمی اس کو نہیں اٹھا سکتا اور آپ اس کا عاجز ہونا ظاہر کرنے کے لئے کہیں کہ دیکھیں تم کیسے اس بوجھ کو اٹھاتے ہو، چونکہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سوال کا یہ غلط مفہوم بھی کوئی لے سکتا تھا اس لئے حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس غلط بات سے بَری ثابت کرنے کے لئے ہی یہ ارشاد فرمایا اَوَلَمْ تُؤْمِنْ تاکہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کے جواب میں بَلٰی فرما کر افتراء پردازوں کی زد سے نکل جائیں۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ اس سوالِ ابراہیمیؑ سے کم از کم اتنا تو معلوم ہوا کہ ان کو حیات بعد الموت پر اطمینان حاصل نہ تھا، حالانکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر عالمِ غیب سے پردہ اٹھا دیا جائے تو میرے یقین و اطمینان میں کوئی زیادتی نہ ہوگی، کیونکہ مجھے ایمان بالغیب ہی سے اطمینان کامل حاصل ہے، تو جب بعض امتیوں کو درجۂ اطمینان حاصل ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ کے خلیلؑ کو اطمینان کا درجہ حاصل نہ ہو ؟

اس کے متعلق یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اطمینان کے بھی بہت سے درجات ہیں، ایک وہ اطمینان ہے جو اولیاء اللہؒ اور صدیقینؒ کو حاصل ہوتا ہے، اور ایک اس سے اعلیٰ مقام اطمینان ہے جو عام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو حاصل ہوتا ہے، اور ایک اس سے بھی مافوق ہے، جو خاص خاص کو بصورتِ مشاہدہ عطا فرمایا جاتا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو جو درجہ اطمینان کا حاصل تھا وہ بلاشبہ حضرت خلیل اللہؑ کو حاصل تھا، بلکہ اس سے اعلیٰ درجۂ اطمینان جو مقامِ نبوت کے ساتھ خاص ہے، اس اطمینان میں حضرت خلیل اللہؑ اور سب امتیوں سے فائق تھے، پھر جس کو وہ طلب فرما رہے ہیں وہ سب سے اعلیٰ مقام اطمینان ہے جو خاص خاص انبیاءؑ کو عطا فرمایا جاتا ہے، جیسے سرورِ کائنات سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت و دوزخ کا مشاہدہ کرا کر اطمینان خاص بخشا گیا۔

الغرض اس سوال کی وجہ سے یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اطمینان حاصل نہ تھا، یہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اطمینانِ کامل جو مشاہدہ سے حاصل ہوا کرتا ہے وہ نہ تھا، اسی کے لئے یہ درخواست فرمائی تھی۔

آیت کے آخر میں فرمایا، اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ؏ یعنی اللہ تعالیٰ زبردست ہیں، اور حکمت والے ہیں"، زبردست ہونے میں قدرت کاملہ کا بیان فرمایا، اور حکمت والا کہہ کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ بمقتضائے حکمت ہر ایک کو حیات بعد الموت کا مشاہدہ نہیں کرایا جاتا، ورنہ حق جلّ شانہٗ کے لئے کوئی دشوار نہیں کہ ہر انسان کو مشاہدہ کرادیں، مگر پھر ایمان بالغیب کی جو فضیلت ہے وہ قائم نہیں رہ سکتی۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ

مثال اُن لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں ایسی ہے کہ جیسے ایک دانہ اس سے اُگیں

سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ

سات بالیں ہر بالی میں سَو سَو دانے اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے واسطے

يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ

چاہے اور اللہ بے نہایت بخشش کرنے والا ہے، سب کچھ جانتا ہے، جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال

سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ

اللہ کی راہ میں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان رکھتے ہیں اور نہ ستاتے ہیں انہی کے لئے ہے

اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾

ثواب اُن کا اپنے رب کے یہاں، اور نہ ڈر ہے اُن پر اور نہ غمگین ہوں گے،

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۭ وَاللّٰهُ

جواب دینا نرم اور درگذر کرنا بہتر ہے اس خیرات سے جس کے پیچھے ہو ستانا اور اللہ بے پروا

غَنِىٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ

ہے نہایت تحمّل والا، اے ایمان والو مت ضائع کرو اپنی خیرات احسان رکھ کر

وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ

اور ایذا دے کر اس شخص کی طرح جو خرچ کرتا ہے اپنا مال لوگوں کے دکھانے کو اور یقین نہیں رکھتا ہے اللہ

الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ

پر اور قیامت کے دن پر سو اس کی مثال ایسی ہے جیسے صاف پتھر کہ اس پر پڑی ہے کچھ مٹی پھر برسا اس پر

وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَىْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ

زور کا مینھ تو کر چھوڑا اس کو بالکل صاف کچھ ہاتھ نہیں لگتا ایسے لوگوں کے ثواب اس چیز کا جو انھوں نے کمایا اور اللہ

لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ

نہیں دکھاتا سیدھی راہ کافروں کو، اور مثال ان کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ

ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ ۭ بِرَبْوَةٍ

کی خوشی حاصل کرنے کو اور اپنے دلوں کو ثابت کر کر ایسی ہے جو ایک باغ ہو بلند زمین پر

اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ

اس پر پڑا زور کا مینھ تو لایا وہ باغ اپنا پھل دوچند اور اگر نہ پڑا اس پر مینھ تو پھوار ہی کافی ہے،

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ

اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتا ہے، کیا پسند آتا ہے تم میں سے کسی کو یہ کہ ہووے اس کا ایک باغ

مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ

کھجور کا اور انگور کا بہتی ہوں نیچے اس کے نہریں اس کو اس باغ میں اور بھی سب

الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۚ فَاَصَابَهَآ

طرح کا میوہ ہو حاصل اور آ گیا اس پر بڑھاپا اور اس کی اولاد ہیں ضعیف تب آ پڑا اس باغ پر

اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ

ایک بگولا جس میں آگ تھی جس سے وہ باغ جل اٹھا، یوں سمجھاتا ہے تم کو اللہ آیتیں

۳۶ ع ۴ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾ ع

تاکہ تم غور کرو۔

خلاصۂ تفسیر

جو لوگ اللہ کی راہ میں (یعنی امور خیر میں) اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اُن کے خرچ کئے ہوئے مالوں کی حالت (عند اللہ) ایسی ہے جیسے ایک دانہ کی حالت جس سے (فرض کرو) سات بالیں جمیں (اور) ہر بالی کے اندر سَو دانے ہوں (اسی طرح خدا تعالیٰ ان کا ثواب سات سو حصّہ تک بڑھاتا ہے) اور یہ افزونی خدا تعالیٰ جسکو چاہتا ہے (بقدر اس کے اخلاص اور مشقت کے) عطا فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں (ان کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں وہ سب کو یہ افزونی دے سکتے ہیں مگر ساتھ ہی) جاننے والے (بھی) ہیں (اس لئے اخلاص نیت وغیرہ کو دیکھ کر عطا فرماتے ہیں) جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر خرچ کرنے کے بعد نہ تو (جس کو دیا ہے اس پر زبان سے) احسان جتلاتے ہیں اور نہ (برتاؤ سے اس کو) آزار پہنچاتے ہیں ان لوگوں کو ان (کے عمل) کا ثواب ملے گا اُن کے پروردگار کے پاس (جاکر) اور نہ (قیامت کے دن) ان پر کوئی خطرہ ہوگا اور نہ یہ مغموم ہوں گے (ناداری کے وقت جواب میں معقول و) مناسب بات کہہ دینا اور (اگر سائل بدتمیزی سے غصہ دلاوے یا اصرار سے تنگ کرے تو اس سے) درگذر کرنا (ہزار درجہ) بہتر ہے ایسی خیرات (دینے) سے جس کے بعد آزار پہنچایا جائے اور (اللہ تعالیٰ (خود) غنی ہیں (کسی کے مال کی ان کو حاجت نہیں، جو کوئی خرچ کرتا ہے اپنے واسطے پھر آزار کس بناء پر پہنچایا جائے اور آزار دینے پر جو فوراً سزا نہیں دیتے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ) حلیم (بھی) ہیں، اے ایمان والو تم احسان جتلا کر یا ایذاء پہنچا کر اپنی خیرات (کے ثواب بڑھنے) کو برباد مت کرو جس طرح وہ شخص (خود خیرات کے اصل ثواب ہی کو برباد کر دیتا ہے) جو اپنا مال خرچ کرتا ہے (محض) لوگوں کو دکھلانے کی غرض سے اور ایمان نہیں رکھتا اللہ پر اور یوم قیامت پر (مراد اس سے بقرینہ نفیِ ایمان کے منافق ہے) سو اس شخص کی حالت ایسی ہے جیسے ایک چکنا پتھر (فرض کرو اس پر) جب کچھ مٹی (آگئی) ہو (اور اس مٹی میں کچھ گھاس پھونس جم آیا ہو) پھر اس پر زور کی بارش پڑجائے سو اس کو (جیسا تھا ویسا ہی) بالکل صاف کر دے (اسی طرح اُس منافق کے ہاتھ سے اللہ کی راہ میں کچھ خرچ ہوگیا جو ظاہر میں ایک نیک عمل جس میں امید ثواب ہو معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کے نفاق نے اس شخص کو ویسا ہی کورا ثواب سے خالی چھوڑ دیا، چنانچہ قیامت میں) ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی (کیونکہ کمائی نیک عمل ہے اور اس کا ہاتھ لگنا ثواب کا ملنا ہے، اور ثواب ملنے کی شرط ایمان اور اخلاص ہے اور ان لوگوں میں یہ مفقود ہے، کیونکہ ریاکار بھی ہیں اور کافر بھی ہیں) اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو (قیامت کے

روز ثواب کے گھر یعنی جنت کا) راستہ نہ بتلائیں گے (کیونکہ کفر کی وجہ سے اُن کا کوئی عمل مقبول نہیں ہوا جس کا ثواب آخرت میں ذخیرہ ہوتا اور وہاں حاضر ہو کر اس کے صلہ میں جنّت میں پہنچائے جاتے) اور ان لوگوں کے خرچ کئے ہوئے مال کی حالت جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کی غرض سے (جو کہ خاص اس عمل سے ہوگی) اور اس غرض سے کہ اپنے نفسوں (کو اس عملِ شاق کا خوگر بنا کر ان) میں پختگی پیدا کریں (تاکہ دوسرے اعمالِ صالحہ سہولت سے پیدا ہوا کریں پس ان لوگوں کے نفقات وصدقات کی حالت) مثل حالت ایک باغ کے ہے جو کسی ٹیلے پر ہو کہ (اس جگہ کی ہوا لطیف اور بارآور ہوتی ہے اور) اس پر زور کی بارش پڑی ہو پھر وہ (باغ لطافتِ ہوا اور بارش کے سبب اَور باغوں سے یا اَور دفعوں سے) دونا (چوگنا) پھل لایا ہو اور اگر ایسے زور کا مینھ نہ پڑے تو ہلکی پھوار (یعنی خفیف بارش) بھی اس کو کافی ہے (کیونکہ زمین اور موقع اس کا اچھا ہے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتے ہیں (اس لئے جب وہ اخلاص دیکھتے ہیں ثواب بڑھا دیتے ہیں) بھلا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہو کہ اس کا ایک باغ ہو کھجوروں کا اور انگوروں کا (یعنی زیادہ درخت اس میں ان کے ہوں اور) اس (باغ) کے (درختوں کے) نیچے نہریں چلتی ہوں (جس سے وہ خوب سرسبز و شاداب ہوں اور) اس شخص کے یہاں اس باغ میں (علاوہ کھجوروں اور انگوروں کے) اور بھی ہر قسم کے (مناسب) میوے ہوں اور اس شخص کا بڑھاپا آ گیا ہو (جو کہ زمانہ زیادہ احتیاج کا ہوتا ہے) اور اس کے اہل وعیال بھی ہوں جنہیں (کمانے کی) قوت نہیں (اس صورت میں اہل وعیال سے بھی اس کو توقع خبرگیری کی نہیں ہوگی، بس وجہِ معاش صرف وہی باغ ہوا) سو (ایسی حالت میں یہ قصہ ہو کہ) اس باغ پر ایک بگولہ آئے جس میں آگ (کا مادہ) ہو پھر (اس سے) وہ باغ جل جائے (ظاہر بات ہے کسی کو اپنے لئے یہ بات پسند نہیں آسکتی، پھر اسی کے مشابہ تو یہ بات بھی ہے کہ اوّل صدقہ دیا یا کوئی اور نیک کام کیا جس کے قیامت میں کارآمد ہونے کی امید ہو جو کہ وقت ہوگا غایت احتیاج کا اور زیادہ مدارِ قبول ہوگا انہی طاعات پر پھر ایسے وقت میں معلوم ہوگا کہ ہمارے احسان جتلانے یا غریب کو ایذاء دینے سے ہماری طاعات باطل یا بے برکت ہوگئیں، اس وقت کیسی سخت حسرت ہوگی کہ کیسی کیسی آرزوؤں کا خون ہوگیا پس جب تم مثال کے واقعہ کو پسند نہیں کرتے تو ابطالِ طاعات کو کیسے گوارا کرتے ہو) اللہ تعالیٰ اسی طرح نظائر بیان فرماتے ہیں تمہارے (سمجھانے کے) لئے تاکہ تم سوچا کرو (اور سوچ کر اس کے موافق عمل کیا کرو)۔

معارف و مسائل

یہ سورۂ بقرہ کا چھتیسواں رکوع ہے جو آیت نمبر ۲۶۱ سے شروع ہوتا ہے، اب سورۂ بقرہ کے پانچ رکوع باقی ہیں جن میں آخری رکوع میں تو کلیات اور اہم اصولی چیزوں کا بیان ہے، اس سے پہلے چار رکوع میں آیت نمبر ۲۶۱ سے ۲۸۳ تک کُل ۲۳ آیات ہیں، جن میں مالیات سے متعلق خاص ہدایات اور ایسے ارشادات ہیں کہ اگر دنیا آج ان پر پوری طرح عامل ہوجائے تو معاشی نظام کا وہ مسئلہ خود بخود حل ہوجائے جس میں آج کی دنیا چار سُو بھٹک رہی ہے، کہیں سرمایہ داری کا نظام ہے تو کہیں اس کا رَدِّ عمل اشتراکیت اور اشتمالیت کا نظام ہے، اور ان نظاموں کے باہمی ٹکراؤ نے دنیا کو قتل و قتال اور جنگ و جدال کا ایک جہنم بنا رکھا ہے، ان آیات میں اسلام کے معاشی نظام کے ایک اہم پہلو کا بیان ہے، جس کے دو حصّے ہیں:

۱۔ اپنی ضرورت سے زائد مال کو اللہ کی رضا کے لئے حاجت مند، مفلس لوگوں پر خرچ کرنے کی تعلیم جسکو صدقہ وخیرات کہا جاتا ہے۔

۲۔ دوسرے سود کے لین دین کو حرام قرار دے کر اس سے بچنے کی ہدایات۔

ان میں سے پہلے دو رکوع صدقہ وخیرات کے فضائل اور اس کی ترغیب اور اس کے متعلقہ احکام وہدایات پر مشتمل ہیں، اور آخری دو رکوع سُودی کاروبار کی حرمت و ممانعت، اور قرض اُدھار کے جائز طریقوں کے بیان میں ہیں۔

جو آیات اوپر لکھی گئی ہیں ان میں اوّل اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے فضائل کا بیان فرمایا گیا ہے اس کے بعد ایسی شرائط کا بیان ہے جن کے ذریعے صدقہ خیرات اللہ کے نزدیک قابلِ قبول اور موجبِ ثواب بنجائے، پھر ایسی چیزوں کا بیان ہے جو انسان کے صدقہ وخیرات کو برباد کر کے نیکی برباد گناہ لازم کا مصداق بنا دیتی ہیں۔

اس کے بعد دو مثالیں بیان کی گئی ہیں، ایک اُن نفقات وصدقات کی جو اللہ کے نزدیک مقبول ہوں، دوسرے اُن نفقات وصدقات کی جو غیر مقبول اور فاسد ہوں۔

یہ پانچ مضمون ہیں جو اس رکوع میں بیان ہوئے ہیں۔

یہاں ان مضامین سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم نے اللہ کے راستے میں مال خرچ کرنے کو کہیں بہ لفظ انفاق بیان فرمایا ہے، کہیں بہ لفظ اطعام، کہیں بہ لفظ صدقہ اور کہیں بہ لفظ ایتاء الزکوٰۃ، ان الفاظ قرآنی اور ان کے جگہ جگہ استعمال پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ لفظ انفاق، اطعام، صدقہ عام ہیں، جو ہر قسم کے صدقہ خیرات اور رضائے الٰہی حاصل کرنے

کے لئے ہر قسم کے خرچ پر حاوی ہے، خواہ فرض و واجب ہوں، یا نفلی اور مستحب، اور زکوٰۃ فرض کے لئے قرآن نے ایک ممتاز لفظ ایتاء الزکوٰۃ استعمال فرمایا ہے، جس میں اس کی طرف اشارہ ہو کہ اس خاص صدقہ کے لئے حاصل کرنے اور خرچ کرنے دونوں میں کچھ خصوصیات ہیں۔

اس رکوع میں اکثر لفظ انفاق سے اور کہیں لفظ صدقہ سے تعبیر کی گئی ہے، جس کا مفہوم یہ ہو کہ یہاں عام صدقات و مبرات کا بیان ہے، اور جو احکام یہاں ذکر کئے گئے ہیں وہ ہر قسم کے صدقات اور اللہ کے لئے خرچ کرنے کی سب صورتوں کو شامل اور حاوی ہیں۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ایک مثال

پہلی آیت میں ارشاد فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں یعنی حج میں یا جہاد میں، یا فقراء و مساکین اور بیواؤں اور یتیموں پر یا بہ نیت امداد اپنے عزیزوں دوستوں پر، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایک دانہ گیہوں کا عمدہ زمین میں بوئے، اس دانہ سے گیہوں کا ایک پودا نکلے، جس میں سات خوشے گیہوں کے پیدا ہوں، اور ہر خوشے میں سَو دانے ہوں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دانہ سے سات سَو دانے حاصل ہوگئے۔

مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے کا اجر و ثواب ایک سے لے کر سات سَو تک پہنچتا ہے، ایک پیسہ خرچ کرے تو سات سو پیسوں کا ثواب حاصل ہو سکتا ہے۔

صحیح و معتبر احادیث میں ہے کہ ایک نیکی کا ثواب اس کا دس گنا ملتا ہے، اور سات سَو گنے تک پہنچ سکتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ جہاد اور حج میں ایک درہم خرچ کرنے کا ثواب سات سو درہم کے برابر ہے، یہ روایت ابن کثیر نے بحوالہ مسند احمد بیان کی ہے۔

الغرض اس آیت نے بتلایا کہ اللہ کی راہ میں ایک روپیہ خرچ کرنے والے کا ثواب سات سو روپے کے خرچ کے برابر ملتا ہے۔

قبولیتِ صدقات کی مثبت شرائط

لیکن قرآن حکیم نے اس مضمون کو بجائے مختصر اور صاف لفظوں میں بیان کرنے کے دانۂ گندم کی مثال کی صورت میں بیان فرمایا، جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح کاشتکار ایک دانۂ گندم سے سات سو دانے اُسی وقت حاصل کر سکتا ہو جب کہ یہ دانہ عمدہ ہو خراب نہ ہو، اور دانہ ڈالنے والا کاشتکار بھی کاشتکاری کے فن سے پورا واقف ہو، اور جس زمین میں ڈالے وہ بھی عمدہ زمین ہو، کیونکہ ان میں سے اگر ایک چیز بھی کم ہوگئی تو یا یہ دانہ ضائع ہو جائے گا ایک دانہ بھی نہ نکلے گا، اور یا پھر ایسا بارآور نہ ہوگا کہ ایک دانہ سے سات سو دانے بن جائیں۔

اسی طرح عام اعمالِ صالحہ اور خصوصاً انفاق فی سبیل اللہ کی مقبولیت اور زیادتی اجر کے لئے بھی یہی تین شرطیں ہیں کہ جو مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے وہ پاک اور حلال ہو،

کیونکہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ پاک اور حلال مال کے سوا کسی چیز کو قبول نہیں فرماتے۔

دوسرے خرچ کرنے والا بھی نیک نیت اور صالح ہو، بدنیتی یا نام ونمود کے لئے خرچ کرنے والا اس ناواقف کاشتکار کی طرح ہے جو دانہ کو کسی ایسی جگہ ڈال دے کہ وہ ضائع ہو جائے۔

تیسرے جس پر خرچ کرے وہ بھی صدقہ کا مستحق ہو، کسی نااہل پر خرچ کر کے ضائع نہ کرے، اس طرح اس مثال سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بہت بڑی فضیلت بھی معلوم ہوگئی، اور ساتھ ہی اس کی تین شرطیں بھی، کہ مال حلال سے خرچ کرے، اور خرچ کرنے کا طریقہ بھی سنت کے مطابق ہو، اور مستحقین کو تلاش کر کے اُن پر خرچ کرے، محض جیب سے نکال ڈالنے سے یہ فضیلت حاصل نہیں ہوتی۔

دوسری آیت میں صدقہ کرنے کے صحیح اور مسنون طریقہ کا بیان اس طرح فرمایا گیا، ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں، اور نہ جن کو دیا گیا ہے ان کو کوئی ایذاء پہنچاتے ہیں ان کا ثواب ان کے رب کے پاس محفوظ ہے، نہ اُن پر آئندہ کے لئے کوئی خطرہ ہے اور نہ گذشتہ پر کوئی رنج و غم۔

قبولیتِ صدقہ کی منفی شرائط اس آیت میں صدقہ کے قبول ہونے کی دو منفی شرطیں بیان فرمائی گئی ہیں، ایک یہ کہ دے کر احسان نہ جتائیں، دوسرے یہ کہ جس کو دیں اس کو عملاً ذلیل و خوار نہ سمجھیں، اور کوئی ایسا برتاؤ نہ کریں جس سے وہ اپنی حقارت و ذلت محسوس کرے یا اس کو ایذاء پہنچے۔

تیسری آیت قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ میں بھی صدقات و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی ان دو شرطوں کی مزید وضاحت کی گئی ہے، جن کا بیان اس سے پہلی آیت میں ہو چکا ہے، ایک یہ کہ مال اللہ کی راہ میں خرچ کر کے کسی پر احسان نہ جتائیں، دوسرے یہ کہ جس کو دیں اس کے ساتھ کوئی ایسا برتاؤ نہ کریں جس سے وہ اپنی ذلت و حقارت محسوس کرے، یا جس سے اس کو ایذاء پہنچے۔

وضاحت اس طرح کی گئی کہ ناداری یا معذوری کی حالت میں سائل کے جواب میں کوئی معقول و مناسب عذر پیش کر دینا، اور اگر سائل بدتمیزی سے غصہ دلا دے تو اس سے درگذر کرنا ہزار درجے بہتر ہے، ایسی خیرات دینے سے جس کے بعد اس کو ایذاء پہنچائی جائے، اور اللہ تعالیٰ خود غنی و حلیم ہیں، اُن کو کسی کے مال کی حاجت نہیں، جو خرچ کرتا ہے اپنے نفع کے لئے کرتا ہے، تو ایک عاقل انسان کو خرچ کرنے کے وقت اس کا لحاظ رکھنا چاہئے، کہ میرا کسی پر احسان نہیں، میں اپنے نفع کے لئے خرچ کر رہا ہوں، اور اگر لوگوں کی طرف سے کوئی ناشکری بھی محسوس کرے تو اخلاقِ الٰہیہ کے تابع ہو کر عفو و درگذر سے کام لے۔

چوتھی آیت میں اسی مضمون کو دوسرے عنوان سے اور بھی تاکید کے ساتھ اس طرح ارشاد فرمایا کہ اپنے صدقات کو برباد نہ کرو، زبان سے احسان جتلا کر یا برتاؤ سے ایذاء پہنچا کر۔

اس سے واضح ہوگیا کہ جس صدقہ وخیرات کے بعد احسان جتلانے یا مستحقین کو ایذا پہنچانے کی صورت ہوجائے وہ صدقہ باطل کالعدم ہے، اُس پر کوئی ثواب نہیں، اس آیت میں صدقہ کے قبول ہونے کی ایک اور شرط کا اس طرح بیان فرمایا ہے کہ جو شخص لوگوں کے دکھاوے اور نام ونمود کے واسطے خرچ کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی صاف پتھر پر کچھ مٹی جم جائے، اور اس میں کوئی دانہ بوئے پھر اس پر زور کی بارش پڑجائے اور وہ اس کو بالکل صاف کردے، ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی، اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو راستہ نہ دکھلائیں گے، اس سے قبولیتِ صدقہ وخیرات کی یہ شرط معلوم ہوئی، کہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی اور ثوابِ آخرت کی نیت سے خرچ کرے، دکھلاوے یا نام ونمود کی نیت سے نہ ہو، نام ونمود کی نیت سے خرچ کرنا، اپنے مال کو برباد کرنا ہے، اور آخرت پر ایمان رکھنے والا مؤمن بھی اگر کوئی خیرات محض نام ونمود اور ریاء کے لئے کرتا ہے تو اس کا بھی یہی حال ہے کہ اس کو کوئی ثواب نہیں ملتا، پھر اس جگہ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ کے اضافہ سے شاید اس طرف اشارہ کرنا منظور ہو کہ "ریاء کاری" اور نام ونمود کے لئے کام کرنا اس شخص سے متصوّر ہی نہیں جو اللہ تعالیٰ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے، ریاء کاری اس کے ایمان میں خلل کی علامت ہے۔

آیت کے آخر میں جو یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو راستہ نہ دکھائیں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایات اور آیات جو سب انسانوں کے لئے عام ہیں، کافر جو ان ہدایات پر نظر نہیں کرتے بلکہ تمسخر اور استہزاء کرتے ہیں، اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ اُن کو توفیق سے محروم کردیتے ہیں، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی ہدایت قبول نہیں کرتے۔

پانچویں آیت میں صدقۂ مقبولہ اور انفاقِ مقبول کی ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ جو لوگ اپنے مال خالص اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کی نیت سے خرچ کرتے ہیں کہ اپنے نفسوں میں پختگی پیدا کریں ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی باغ ہو کسی ٹیلے پر اور اس پر زور کی بارش پڑی ہو، پھر وہ اپنا پھل لایا ہو دو چند، اور اگر ایسے زور کی بارش بھی نہ پڑے تو ہلکی پھوار بھی اس کے لئے کافی ہے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتے جانتے ہیں۔

اس میں اخلاصِ نیت اور رعایت شرائطِ مذکورہ کے ساتھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بڑی فضیلت اس مثال سے واضح کردی گئی کہ نیک نیتی اور اخلاص کے ساتھ تھوڑا بھی خرچ کیا جائے تو وہ کافی اور موجب ثمراتِ آخرت ہے۔

چھٹی آیت میں صدقہ وخیرات میں شرائطِ مذکورہ کی خلاف ورزی کرنے پر صدقہ کے باطل ومردود ہونے کا بیان بھی ایک مثال میں اس طرح واضح فرمایا کہ کیا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہو کہ اس کا ایک باغ ہو کھجور اور انگوروں کا اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اور اس شخص کے باغ میں ہر قسم کے میوے ہوں اور اس شخص کا بڑھاپا آ گیا ہو، اور اس کے اہل وعیال بھی ہوں جن میں قوت نہیں، ان حالات میں اس باغ پر ایک بگولہ آوے جس میں آگ ہو، پھر وہ باغ جل جاوے، اللہ تعالیٰ اسی طرح نظائر بیان فرماتے ہیں تمہارے لئے تاکہ تم سوچا کرو۔

مطلب یہ ہے کہ خلاف شرائط صدقہ کرنے کی مثال ایسی ہی ہے کہ بظاہر وہ صدقہ کر کے آخرت کے لئے بہت سا ذخیرہ جمع کر رہا ہے، لیکن اللہ کے نزدیک یہ ذخیرہ کچھ بھی کام نہیں آتا۔

اور اس مثال میں جو چند قیدیں بڑھائی گئیں کہ اس کا بڑھاپا آ گیا، اس کے اولاد بھی ہو اور اولاد بھی چھوٹے بچے جو ضعیف کمزور ہیں، ان قیدوں کا مقصد یہ ہے کہ جوانی کی حالت میں کسی کا باغ یا کھیتی جل جائے تو اسے یہ امید ہو سکتی ہے کہ پھر باغ لگا لوں گا، اور جس شخص کے اولاد نہ ہو اور اس کو دوبارہ باغ لگانے کی امید بھی نہ ہو تو باغ جل جانے کے بعد بھی اس کو کوئی خاص فکر معاش کی نہیں ہوتی، اکیلا آدمی جس طرح چاہے تنگی ترشی سے گذارا کر سکتا ہے، اور اگر اولاد بھی ہو مگر جوان صالح ہوں جن سے یہ توقع کی جائے کہ وہ باپ کا ہاتھ بٹائیں گے، اور مدد کریں گے، ایسی صورت میں بھی انسان کو باغ کے جل جانے یا اُلٹ جانے پر بھی کچھ زیادہ صدمہ نہیں ہوتا، کیونکہ اولاد کی فکر سے فارغ ہے، بلکہ اولاد اس کا بھی بوجھ اُٹھا سکتی ہے، غرض یہ تینوں قیدیں شدّتِ احتیاج کو بیان کرنے کے لئے لائی گئیں، کہ ایسا شخص جس نے اپنا مال اور محنت خرچ کر کے ایک باغ لگایا، اور وہ باغ تیار ہو کر پھل بھی دینے لگا، اور اسی حالت میں اس کا بڑھاپا اور کمزوری کا زمانہ بھی آ گیا، اور یہ شخص صاحبِ عیال بھی ہے، اور عیال بھی چھوٹے اور کمزور بچے ہیں، تو ان حالات میں اگر لگا یا ہوا باغ جل جائے تو صدمہ شدید ہو گا، اور تکلیف بے حد ہو گی۔

اسی طرح جس شخص نے ریاکاری سے صدقہ وخیرات کیا یہ گویا اس نے باغ لگایا، پھر موت کے بعد اس کی حالت اس بوڑھے جیسی ہو گئی جو کمانے اور دوبارہ باغ لگانے کی قدرت نہیں رکھتا، کیونکہ موت کے بعد انسان کا کوئی عمل ہی نہیں رہا، اور جس طرح عیالدار بوڑھا اس کا بہت محتاج ہوتا ہے کہ پچھلی کمائی محفوظ ہو تاکہ ضعیفی میں کام آئے، اور اگر اس حالت میں اس کا باغ اور مال ومتاع جل جائے تو اس کے دُکھ اور درد کی انتہا نہ رہے گی، اسی طرح یہ صدقہ وخیرات جو ریاء ونمود کے لئے کیا گیا تھا عین ایسے وقت ہاتھ سے جاتا رہے گا جب کہ وہ اس کا بہت حاجتمند ہو گا۔

اس پوری آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ صدقہ وخیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی ایک بڑی شرط اخلاص ہے، کہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے خرچ کیا جائے، کسی نام ونمود کا اس میں دخل نہ ہو۔

اب اس پورے رکوع کی تمام آیات پر مکرر نظر ڈالئے تو ان سے انفاق فی سبیل اللہ اور صدقہ وخیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی چھ شرائط معلوم ہوں گی:

اوّل اس مال کا حلال ہونا جو اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے، دوسرے طریق سنت کے مطابق خرچ کرنا، تیسرے صحیح مصرف میں خرچ کرنا، چوتھے خیرات دے کر احسان نہ جتلانا، پانچویں ایسا کوئی معاملہ نہ کرنا جس سے اُن لوگوں کی تحقیر ہو جن کو یہ مال دیا گیا ہے، چھٹے جو کچھ خرچ کیا جائے اخلاص نیت کے ساتھ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہو، نام ونمود کے لئے نہ ہو۔

دوسری شرط یعنی طریق سنت کے مطابق خرچ کرنا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے وقت اس کا لحاظ رہے کہ کسی حقدار کی حق تلفی نہ ہو، اپنے عیال کے ضروری اخراجات بغیر ان کی رضامندی کے بند یا کم کر کے صدقہ وخیرات کرنا کوئی امر ثواب نہیں، حاجتمند وارثوں کو محروم کر کے سارے مال کو صدقہ وخیرات یا وقف کر دینا تعلیم سنت کے خلاف ہے، پھر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ہزاروں صورتیں ہیں۔

طریق سنت یہ ہے کہ مصرف کی اہمیت اور ضرورت کی شدت کا لحاظ کر کے مصرف کا انتخاب کیا جائے، عام طور پر خرچ کرنے والے اس کی رعایت نہیں کرتے۔

تیسری شرط کا حاصل یہ ہے کہ ثواب ہونے کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں کہ اپنے خیال میں کسی کام کو نیک سمجھ کر نیک نیتی سے اس میں صرف کر دے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مصرف شریعت کی رُو سے جائز اور مستحسن بھی ہو، کوئی شخص ناجائز کھیل تماشوں کے لئے اپنی جائداد وقف کر دے تو وہ بجائے ثواب کے عذاب کا مستحق ہوگا، یہی حال تمام اُن کاموں کا ہے جو شریعت کی رُو سے مستحسن نہیں ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا

اے ایمان والو خرچ کرو ستھری چیزیں اپنی کمائی میں سے اور اس چیز میں سے کہ جو

لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ

ہم نے پیدا کیا تمہارے واسطے زمین سے اور قصد نہ کرو گندی چیز کا اس میں سے کہ اس کو خرچ کرو، حالانکہ تم

بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾

اس کو کبھی نہ لوگے مگر یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ اور جان رکھو کہ اللہ بے پروا ہے خوبیوں والا ،

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاۗءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ

شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو تنگدستی کا اور حکم کرتا ہے بیحیائی کا اور اللہ وعدہ دیتا ہے تم کو

مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۸﴾ۖۙ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ

اپنی بخشش اور فضل کا اور اللہ بہت کشائش والا ہے سب کچھ جانتا ہے ، عنایت کرتا ہے سمجھ جسکو

يَّشَاۗءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ وَمَا يَذَّكَّرُ

چاہے اور جسکو سمجھ ملی ہے اُس کو بڑی خوبی ملی اور نصیحت وہی قبول کرتے ہیں

اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ

جو عقل والے ہیں ، اور جو خرچ کروگے تم خیرات یا قبول کروگے کوئی منّت تو

نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾ اِنْ تُبْدُوا

بیشک اللہ کو سب معلوم ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ، اگر ظاہر کرکے دو

الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا ھِىَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْھَا وَتُؤْتُوْھَا الْفُقَرَاۗءَ فَھُوَ

خیرات تو کیا اچھی بات ہے ، اور اگر اس کو چھپاؤ اور فقیروں کو پہنچاؤ تو وہ

خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

بہتر ہے تمہارے حق میں اور دور کرے گا کچھ گناہ تمہارے اور اللہ تمہارے کاموں سے

خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ ھُدٰىھُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ

خوب خبردار ہے تیرا ذمہ نہیں اُن کو راہ پر لانا اور لیکن اللہ راہ پر لادے جسکو چاہے ،

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ

اور جو کچھ خرچ کروگے تم مال سو اپنے ہی واسطے جب تک کہ خرچ کروگے اللہ ہی کی رضا جوئی

اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾

میں اور جو خرچ کروگے خیرات سو پوری ملے گی تم کو اور تمہارا حق نہ رہے گا ،

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا

خیرات اُن فقیروں کیلئے ہے جو رُکے ہوئے ہیں اللہ کی راہ میں چل پھر نہیں سکتے

فِی الْاَرْضِ٘ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ٘ تَعْرِفُهُمْ

ملک میں سمجھے ان کو ناواقف مالدار اُن کے سوال نہ کرنے سے تو پہچانتا ہے اُن کو

بِسِیْمٰهُمْ٘ لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ

اُن کے چہرے سے، نہیں سوال کرتے لوگوں سے لپٹ کر، اور جو کچھ خرچ کرو گے کام کی چیز وہ

اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ﴿۲۷۳﴾ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ ع ۳۷ ۵

بیشک اللہ کو معلوم ہے، جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں رات کو اور دن کو

سِرًّا وَّعَلَانِیَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ٘ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ

چھپا کر اور ظاہر میں تو اُن کے لئے ثواب ہے ان کا اپنے رب کے پاس اور نہ ڈر ہے اُن پر

وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو (نیک کام میں) خرچ کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی میں سے اور (عمدہ چیز کو) اس میں سے جو کہ ہم نے تمہارے (کام میں لانے کے) لئے زمین سے پیدا کیا اور ردی (ناکارہ) چیز کی طرف نیت مت لے جایا کرو کہ اس میں سے خرچ کرو حالانکہ (ویسی ہی چیز اگر کوئی تم کو تمہارے حق واجب کے عوض یا سوغات میں دینے لگے تو) تم کبھی اس کے لینے والے نہیں، ہاں مگر چشم پوشی (اور رعایت) کر جاؤ (تو اور بات ہے) اور یہ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں (جو ایسی ناکارہ چیزوں سے خوش ہوں) تعریف کے لائق ہیں (یعنی ذات و صفات میں کامل ہیں تو ان کے دربار میں چیز بھی کامل تعریف کے لائق ہی پیش کرنا چاہئے) شیطان تم کو محتاجی سے ڈراتا ہے، (کہ اگر خرچ کرو گے یا اچھا مال خرچ کرو گے تو محتاج ہو جاؤ گے) اور (تم کو بُری بات (یعنی بخل) کا مشورہ دیتا ہے، اور (اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ کرتا ہے (خرچ کرنے پر اور اچھی چیز خرچ کرنے پر) اپنی طرف سے گناہ معاف کر دینے کا اور زیادہ دینے کا (یعنی چونکہ نیک جگہ خرچ کرنا طاعت ہے

اور طاعت سے معصیت کا کفارہ ہو جاتا ہے، لہٰذا اس سے گناہ بھی معاف ہوتے ہیں اور حق تعالیٰ کسی کو دنیا میں بھی اور آخرت میں تو سبھی کو خرچ کا عوض بھی زیادہ کر کے دیتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ وسعت والے ہیں (وہ سب کچھ دے سکتے ہیں) خوب جاننے والے ہیں (نیت کے موافق ثمرہ دیتے ہیں اور یہ سب مضامین بہت ظاہر ہیں، لیکن ان کو وہی سمجھتا ہے جس کو دین کا فہم ہو اور اللہ تعالیٰ) دین کا فہم جسکو چاہتے ہیں دیدیتے ہیں اور (سچ تو یہ ہے کہ) جس کو دین کا فہم مل جاوے اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی (کیونکہ دنیا کی کوئی نعمت اس کے برابر نافع نہیں) اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں (یعنی جو عقل صحیح رکھتے ہیں) اور تم لوگ جو کسی قسم کا خرچ کرتے ہو یا کسی طرح کی نذر مانتے ہو سو حق تعالیٰ کو سب کی یقیناً اطلاع ہے اور بے جا کام کرنے والوں کا (قیامت میں) کوئی ہمراہی (حمایتی) نہ ہوگا، اگر تم ظاہر کر کے دو صدقات کو تب بھی اچھی بات ہے اور اگر ان کا اخفا کرو اور (اخفا کے ساتھ) فقیروں کو دیدو تب اخفا تمھارے لئے زیادہ بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ (اس کی برکت سے) تمھارے کچھ گناہ بھی دور کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ تمھارے کئے ہوئے کاموں کی خوب خبر رکھتے ہیں، (چونکہ بہت سے صحابہؓ کفار کو بایں مصلحت خیرات نہ دیتے تھے کہ شاید اسی تدبیر سے کچھ لوگ مسلمان ہو جاویں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی رائے دی تھی اس لئے اس آیت میں دونوں طرح کے خطاب کر کے ارشاد فرماتے ہیں کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان (کافروں) کو ہدایت پر لے آنا کچھ آپ کے ذمہ (فرض واجب) نہیں (جس کے لئے اتنی دور دراز اہتمام کئے جاویں) ولیکن (یہ تو) خدا تعالیٰ (کا کام ہے) جس کو چاہیں ہدایت پر لے آویں، (آپ کا کام صرف ہدایت کا پہنچا دینا ہے خواہ کوئی ہدایت پر آوے یا نہ آوے اور ہدایت کا پہنچا دینا کچھ اس ممانعت پر موقوف نہیں) اور (اے مسلمانو!) جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اپنے فائدہ کی غرض سے کرتے ہو اور (اُس فائدہ کا بیان یہ ہے کہ) تم اور کسی غرض سے خرچ نہیں کرتے بجز رضا جوئی ذات پاک حق تعالیٰ کے (کہ ثواب اس کے لوازم سے ہے اور یہ ہر حاجتمند کی رفع حاجت کرنے سے حاصل ہوتی ہے، پھر مسلمان فقیر کی تخصیص کیوں کی جاوے) اور (نیز) جو کچھ مال خرچ کر رہے ہو یہ سب (یعنی اس کا عوض اور ثواب) پورا پورا تم (ہی) کو (آخرت میں) مل جاویگا اور تمھارے لئے اس میں ذرا کمی نہ کی جاوے گی (سو تم کو اپنے عوض سے مطلب رکھنا چاہئے، اور عوض ہر حال میں ملے گا پھر تم کو اس سے کیا بحث کہ ہمارا صدقہ مسلمان ہی کو ملے کافر کو نہ ملے، صدقات) اصل حق اُن حاجت مندوں کا ہے جو مقید ہو گئے ہوں اللہ کی راہ (یعنی دین کی خدمت) میں، (اور اسی خدمتِ دین میں مقید اور مشغول رہنے سے) وہ لوگ (طلب معاش کے لئے) کہیں ملک میں چلنے پھرنے کا (عادۃً) امکان نہیں رکھتے (اور) ناواقف ان کو مالدار خیال کرتا ہے اُن کے

سوال سے بچنے کے سبب سے (البتہ) تم ان لوگوں کو اُن کے طرز (ہیئت) سے پہچان سکتے ہو (کیونکہ فقر وفاقہ سے چہرے اور بدن میں ایک گونہ اضمحلال ضرور آجاتا ہے اور یوں) وہ لوگوں سے لپٹ کر مانگتے نہیں پھرتے (جس سے کوئی اُن کو حاجت مند سمجھے، یعنی مانگتے ہی نہیں، کیونکہ اکثر جو لوگ مانگنے کے عادی ہیں وہ لپٹ کر ہی مانگتے ہیں) اور (ان لوگوں کی خدمت کرنے کو) جو مال خرچ کروگے بیشک حق تعالیٰ کو اس کی خوب اطلاع ہے (اور لوگوں کو دینے سے اُن کی خدمت کا فی نفسہ زیادہ ثواب دیں گے) جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو رات میں اور دن میں (یعنی بلاتخصیص اوقات) پوشیدہ اور آشکارا (یعنی بلاتخصیص حالات) سو اُن لوگوں کو ان کا ثواب ملے گا (قیامت کے روز) ان کے رب کے پاس (جاکر) اور نہ (اس روز) اُن پر کوئی خطرہ (واقع ہونے والا ہی) ہے اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

معارف ومسائل

اس سے قبل کے رکوع میں اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا بیان تھا، اب اسی سے متعلقہ امور کا مزید بیان اس رکوع کی سات آیات میں کیا گیا ہے، جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا (الی قولہ) غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ۝ شانِ نزول سے طیبٰت کے معنے عمدہ کے کئے گئے ہیں، کیونکہ بعض لوگ خراب چیزیں لے آتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی تھی، اور بعض نے عموم لفظ سے طیب کی تفسیر حلال سے کی ہے، کیونکہ پوری عمدہ جب ہی ہوتی ہے جب حلال بھی ہو، پس اس بناء پر آیت میں اس کی بھی تاکید ہوگی، اور پہلی تفسیر پر دوسرے دلائل سے اس تاکید کو ثابت کیا جاوے گا، اور یاد رکھو کہ یہ اس شخص کے لئے ہے جس کے پاس عمدہ چیز ہو اور پھر وہ بُری نکمی چیز خرچ کرے، جیسا کہ لفظ مَا کَسَبْتُمْ اور اخرجنا اس کے موجود ہونے پر اور لَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْہُ تُنْفِقُوْنَ، عمداً نکمی چیز کے خرچ کرنے پر دلالت کر رہا ہے، اور جس کے پاس اچھی چیز ہو ہی نہیں وہ اس ممانعت سے بَری ہے، اور اس کی وہ بُری بھی مقبول ہے۔

لفظ مَا کَسَبْتُمْ سے بعض علماء نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ والد کا اپنے بیٹے کی کمائی سے کھانا جائز ہے، لقولہ علیہ السلام:-

اَوْلَادُکُمْ مِنْ طَیِّبِ اَکْسَابِکُمْ فَکُلُوْا مِنْ اَمْوَالِ اَوْلَادِکُمْ هَنِیْئًا (قرطبی)	"تمہاری اولاد تمہاری کمائی کا ایک پاکیزہ حصہ ہے، پس تم اپنی اولاد کی کمائی سے مزے سے کھاؤ۔"

عشر اراضی کے احکام

مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ میں لفظ اَخْرَجْنَا سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ عشری زمین میں عشر واجب ہے، اس آیت کے

عموم سے امام ابوحنیفہؒ نے استدلال کیا ہے کہ عُشری زمین کی ہر قلیل وکثیر پیداوار پر عُشر واجب ہے، سورۂ انعام کی آیت اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ (۶: ۱۴۱) وجوب عشر میں بالکل صریح اور واضح ہے، عُشر وخراج شریعتِ اسلامی کے دو اصطلاحی لفظ ہیں، ان دونوں میں ایک بات مشترک ہے کہ اسلامی حکومت کی طرف سے زمینوں پر عائد کردہ ٹیکس کی ایک حیثیت اِن دونوں میں ہے فرق یہ ہے کہ عُشر فقط ٹیکس نہیں بلکہ اس میں ٹیکس سے زیادہ اصلی حیثیت عبادت مالی کی ہے، مثل زکوٰۃ کے، اسی لئے اس کو زکوٰۃ الارض بھی کہا جاتا ہے، اور خراج خالص ٹیکس ہے، جس میں عبادت کی کوئی حیثیت نہیں، مسلمان چونکہ عبادت کے اہل اور پابند ہیں، ان سے جو زمین کی پیداوار کا حصّہ لیا جاتا ہے اس کو عُشر کہتے ہیں، اور غیر مسلم چونکہ عبادت کے اہل نہیں، ان کی زمینوں پر جو کچھ عائد کیا جاتا ہے اس کا نام خراج ہے، عملی طور پر زکوٰۃ اور عُشر میں یہ بھی فرق ہے کہ سونا چاندی اور تجارت کے مال پر زکوٰۃ سال بھر گذرنے کے بعد عائد ہوتی ہے، اور عُشر زمین سے پیداوار حاصل ہوتے ہی واجب ہوجاتا ہے۔

دوسرا فرق یہ بھی ہے کہ اگر زمین سے کوئی پیداوار نہ ہو تو عُشر ساقط ہوجاتا ہے لیکن اموالِ تجارت اور سونے چاندی پر اگر کوئی نفع بھی نہ ہو تب بھی سال پورا ہونے پر ان پر زکوٰۃ فرض ہوگی، عُشر وخراج کے مسائل کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، کتبِ فقہ میں مذکور ہے، اور احقر نے اپنی کتاب "نظام الاراضی" میں بھی تفصیل سے لکھ دیا ہے، جس میں پاکستان وہندوستان کی زمینوں کے خصوصی احکام بھی لکھے گئے ہیں۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ (الیٰ قولہ) وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ، جب کسی کے دل میں یہ خیال آئے کہ اگر خیرات کروں گا تو مفلس ہوجاؤں گا، اور حق تعالیٰ کی تاکید سُنکر بھی اسکی ہمت نہ ہو، اور دل چاہے کہ اپنا مال خرچ نہ کرے، اور وعدۂ الٰہی سے اعراض کرکے وعدۂ شیطانی پر طبیعت کو میلان اور اعتماد ہو تو اس کو یقین کرلینا چاہئے کہ یہ مضمون شیطان کی طرف سے ہے، یہ نہ کہے کہ "شیطان کی تو ہم نے کبھی صورت بھی نہیں دیکھی، حکم کرنا تو درکنار رہا" اور اگر یہ خیال آوے کہ صدقہ وخیرات سے گناہ بخشے جائیں گے، اور مال میں بھی ترقی اور برکت ہوگی، تو جان لے کہ یہ مضمون اللہ کی طرف سے آیا ہے، اور خدا کا شکر کرے اور اللہ کے خزانے میں کمی نہیں، سب کے ظاہر وباطن نیت وعمل کو خوب جانتا ہے۔

حکمت کے معنے اور تفسیر

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاۗءُ۔ لفظ حکمت قرآن کریم میں بار بار آیا ہے، اور ہر جگہ اس کی تفسیر میں مختلف معنی بیان کئے گئے ہیں، تفسیر بحر محیط میں اس جگہ تمام اقوال مفسرین کو جمع کیا ہے، وہ تقریباً تیس ہیں، مگر آخر میں فرمایا

کہ درحقیقت یہ سب اقوال متقارب ہیں، ان میں کوئی اختلاف نہیں، صرف تعبیرات کا فرق ہے، کیونکہ لفظ حکمت، اِحکام بالکسر کا مصدر ہے، جس کے معنی ہیں کسی عمل یا قول کو اس کے تمام اوصاف کے ساتھ مکمل کرنا۔

اسی لئے بحر محیط میں آیت بقرہ اٰتٰہُ اللّٰہُ الْمُلْکَ وَ الْحِکْمَۃَ (۲: ۲۵۱) جو حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق ہے، اس کی تفسیر میں فرمایا:

وَالْحِکْمَۃُ وَضْعُ الْاُمُوْرِ فِیْ مَحَلِّھَا عَلَی الصَّوَابِ وَکَمَالُ ذٰلِکَ اِنَّمَا یَحْصُلُ بِالنُّبُوَّۃِ

"حکمت کے اصلی معنی ہر شے کو اس کے محل میں رکھنے کے ہیں اور اس کا کمال صرف نبوت سے ہو سکتا ہے، اس لئے یہاں حکمت کی تفسیر نبوت سے کی گئی ہے۔"

امام راغب اصفہانیؒ نے مفردات القرآن میں فرمایا کہ لفظ حکمت جب حق تعالیٰ کے لئے استعمال کیا جائے تو معنی تمام اشیاء کی پوری معرفت اور مستحکم ایجاد کے ہوتے ہیں، اور جب غیر اللہ کی طرف اس کی نسبت کی جاتی ہے تو موجودات کی صحیح معرفت اور اس کے مطابق عمل مراد ہوتا ہے۔

اسی مفہوم کی تعبیریں مختلف الفاظ میں کی گئی ہیں، کہیں جگہ اس سے مراد قرآن ہے، کسی جگہ حدیث، کسی جگہ علم صحیح، کہیں عمل صالح، کہیں قول صادق، کہیں عقل سلیم، کہیں فقہ فی الدین کہیں اصابتِ رائے اور کہیں خشیۃ اللہ، اور آخری معنی تو خود حدیث میں بھی مذکور ہیں، رأس الحکمۃ خشیۃ اللہ یعنی اصل حکمت خدا تعالیٰ سے ڈرنا ہے، اور آیت یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ (۲: ۶۲) میں حکمت کی تفسیر صحابہؓ و تابعینؒ سے حدیث و سنت منقول ہے، اور بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ آیت زیر نظر یُؤْتِی الْحِکْمَۃَ میں یہ سب چیزیں مراد ہیں۔ (بحر محیط، ص ۳۲۰، ج ۲)

اور ظاہر یہی قول ہے، اور ارشاد قرآنی وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا سے بھی اس کی طرف اشارہ نکلتا ہے، کہ معنی اس کے یہ ہیں کہ جس شخص کو حکمت دیدی گئی اس کو خیر کثیر دیدی گئی، واللہ اعلم۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَۃٍ (الیٰ قولہ) وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ، کسی قسم کے خرچ کرنے میں" سب خرچ آگئے، وہ بھی جس میں سب شرائط مذکورہ کی رعایت ہو، اور وہ بھی جس میں کل کی یا بعض کی رعایت نہ ہو، مثلاً فی سبیل اللہ نہ ہو، بلکہ معصیت میں ہو یا انفاق میں ریاء شامل ہو یا انفاق کر کے اس پر احسان جتلانا ہو، یا حلال یا عمدہ مال نہ ہو، اسی طرح نذر کے عموم میں سب نذریں آگئیں، مثلاً عبادتِ مالیہ کی نذر، اور اسی مناسبت سے انفاق کے ساتھ نذر کو لائے ہیں یا عبادتِ بدنیہ کی نذر ہو، پھر وہ مطلق ہو یا کسی امر پر معلق ہو، پھر یہ کہ اس کا ایفاء کیا گیا ہو یا نہ

کیا گیا ہو، اور مقصود اس کہنے سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان سب چیزوں کا علم ہے وہ اس کی جزا دیں گے، یہ اس لئے سُنایا تاکہ حدود و شرائط کی رعایت کی ترغیب اور عدم رعایت سے ترہیب ہو، اور بے جا کام کرنے والوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو ضروری شرائط کی رعایت نہیں کرتے، ان کو صریحاً وعید سنا دی۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ (الیٰ قولہ) وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ۔ بظاہر یہ آیت فرض اور نفل سب صدقات کو شامل ہے، اور سب میں اخفاء ہی افضل ہے، اس میں دینی مصلحت بھی ہے، کہ ریاء سے ابعد ہے، لینے والا بھی نہیں شرماتا، اور دنیوی مصلحت بھی ہے کہ اپنے مال کی مقدار عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتی، اور مراد افضلیتِ اخفاء سے آیت میں افضلیت فی نفسہٖ ہے، پس اگر کسی مقام پر کسی عارض سے مثلاً رفعِ تہمت یا امیدِ اقتداء وغیرہ سے اظہار کو ترجیح ہو جاوے تو افضلیت فی نفسہٖ کے منافی نہیں، یُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَیِّاٰتِكُمْ کفارہ سیئات کچھ اخفاء کے ساتھ تو خاص نہیں، صرف اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے اخفاء کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے کہ اخفاء میں تجھے اگر کوئی ظاہری فائدہ نظر نہ آئے تو منقبض نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ تمہارے گناہ اللہ معاف کرتا ہے، اور یہ تمہارے لئے فائدۂ عظیمہ ہے۔

لَیْسَ عَلَیْكَ هُدٰىهُمْ (الیٰ قولہ) وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ نیّت بھی تمہاری اصل میں اپنے ہی نفع حاصل کرنے کی ہے، اور واقع میں بھی حاصل خاص تم ہی کو ہوگا، پھر ان زوائد پر کیوں نظر کی جاتی ہے، کہ یہ نفع خاص اسی طریق سے حاصل کیا جاوے کہ مسلمان ہی کو صدقہ دیں، اور کافر کو نہ دیں۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ اس صدقہ سے مراد صدقۂ نفلی ہے جس کا ذمی کافر کو بھی دینا جائز ہے، زکوٰۃ مراد نہیں ہے، کیونکہ وہ سوائے مسلمان کے کسی دوسرے کو دینا جائز نہیں۔ (مظہری)

مسئلہ[1]: حربی کافر کو کسی قسم کا صدقہ وغیرہ دینا جائز نہیں۔

مسئلہ[2]: کافر ذمی یعنی غیر حربی کو صرف زکوٰۃ وعُشر دینا جائز نہیں، اور دوسرے صدقات واجبہ و نفل سب جائز ہیں، اور آیت میں زکوٰۃ داخل نہیں۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (الیٰ قولہ) فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ۝ یہاں فقراء سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو دینی مشغولیت کی وجہ سے دوسرا کوئی کام نہیں کرسکتے۔

یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ، اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی فقیر قیمتی کپڑے پہنے ہوئے ہو تو اس کی وجہ سے اس کو غنی نہیں کہا جائے گا، بلکہ اس کو فقیر ہی کہا جائے گا

اور ایسے آدمی کو زکوٰۃ دینا بھی صحیح ہوگا (قرطبی)

تَعۡرِفُهُم بِسِيمَٰهُمۡ سے معلوم ہوا کہ علامات کو دیکھ کر حکم لگانا صحیح ہے، چنانچہ اگر کوئی مردہ اس قسم کا پایا جائے کہ اس پر زنار ہے اور اس کا ختنہ بھی نہیں کیا ہوا ہو تو اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا (قرطبی)

لَا يَسۡـَٔلُونَ ٱلنَّاسَ إِلۡحَافٗا، اس آیت سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ لپٹ کر نہیں مانگتے لیکن بغیر لپٹ کر مانگنے کی نفی نہیں ہے، چنانچہ بعض حضرات کا یہی قول ہے، لیکن جمہور کے نزدیک اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ سوال بالکل ہی نہیں کرتے، لِاَنَّهُمْ مُتَعَفِّفُوْنَ عَنِ الْمَسْأَلَةِ عِفَّةً تَامَّةً (قرطبی)

آٹھویں آیت اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ میں ان لوگوں کے اجرِ عظیم اور فضیلت کا بیان ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے عادی ہیں، تمام حالات و اوقات میں رات میں اور دن میں، خفیہ اور علانیہ ہر طرح فی سبیل اللہ خرچ کرتے رہتے ہیں، اس کے ضمن میں یہ بھی بتلا دیا کہ صدقہ و خیرات کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں، نہ رات اور دن کی کوئی تعیین ہے، اس طرح خفیہ اور علانیہ دونوں طرح سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ثواب ہی، بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ خرچ کیا جائے، نام و نمود مقصود نہ ہو، خفیہ خرچ کرنے کی فضیلت بھی اسی حد تک ہی کہ علانیہ خرچ کرنے کے لئے کوئی ضرورت داعی نہ ہو، اور جہاں ایسی ضرورت ہو وہاں علانیہ خرچ کرنا ہی افضل ہے۔

رُوح المعانی میں بحوالہ ابن عساکر نقل کیا ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے چالیس ہزار دینار اللہ کی راہ میں اسی طرح خرچ کئے کہ دس ہزار دن میں، دس ہزار رات میں، دس ہزار خفیہ اور دس ہزار علانیہ، بعض مفسرین نے اس آیت کا شانِ نزول اسی واقعہ صدیق اکبرؓ کو لکھا ہے، اسکے شانِ نزول کے متعلق اور بھی مختلف اقوال ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ

جو لوگ کھاتے ہیں سود نہیں اٹھیں گے قیامت کو مگر جس طرح اٹھتا ہے وہ شخص کہ جس کے حواس

الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ

کھو دیئے ہوں جن نے لپٹ کر یہ حالت اُن کی اس واسطے ہوگی کہ انھوں نے کہا کہ سوداگری بھی تو ایسی ہی ہے جیسے سود لینا

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ

حالانکہ اللہ نے حلال کیا ہی سوداگری کو اور حرام کیا ہی سود کو، پھر جس کو پہنچی نصیحت اپنے رب کی

رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ

طرف سے اور وہ باز آگیا تو اس کیواسطے ہے جو پہلے ہو چکا اور معاملہ اس کا اللہ کے حوالے ہے اور جو کوئی

فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾ يَمْحَقُ اللّٰهُ

پھر لیوے سود تو وہی لوگ ہیں دوزخ والے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، مٹاتا ہے اللہ

الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾

سود اور بڑھاتا ہے خیرات کو اور اللہ خوش نہیں کسی ناشکر گنہگار سے،

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ

جو لوگ ایمان لائے اور عمل نیک کئے اور قائم رکھا نماز کو اور

اٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ

دیتے رہے زکوٰۃ ان کیلئے ہے ثواب اُن کا ان کے رب کے پاس اور نہ اُن کو خوف ہے اور

لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا

نہ وہ غمگین ہوں گے، اے ایمان والو ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو کچھ

بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا

باقی رہ گیا ہے سود اگر تم کو یقین ہے اللہ کے فرمانے کا، پس اگر نہیں چھوڑتے تو تیار ہو جاؤ

بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ

لڑنے کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اگر توبہ کرتے ہو تو تمہارے واسطے ہے اصل مال تمہارا

لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى

نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر کوئی، اور اگر ہے تنگدست تو مہلت دینی چاہئے کشائش

مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَاتَّقُوْا

ہونے تک اور بخش دو تو بہت بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم کو سمجھ ہے، اور ڈرتے رہو

يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ

اس دن سے جس دن لوٹائے جاؤ گے اللہ کی طرف پھر پورا دیا جائے گا ہر شخص کو جو کچھ اس نے کمایا اور

۳۸۶

لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٨١﴾

اُن پر ظلم نہ ہوگا

خلاصۂ تفسیر

جو لوگ سُود کھاتے ہیں (یعنی لیتے ہیں) نہیں کھڑے ہوں گے (قیامت میں قبروں سے) مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے ایسا شخص جس کو شیطان نے خبطی بنا دیا ہو لپٹ کر (یعنی حیران مدہوش) یہ سزا اس لئے ہوگی کہ ان (سود خوار) لوگوں نے (سود کے حلال ہونے پر استدلال کرنے کے لئے) کہا تھا کہ بیع بھی تو مثل سُود کے ہے، (کیونکہ اس میں بھی مقصود نفع حاصل کرنا ہوتا ہے، اور بیع یقیناً حلال ہے، پھر سود بھی جو کہ اس کا مثل ہے حلال ہونا چاہئے) حالانکہ (دونوں میں کھلا فرق ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے (جو کہ مالک ہیں احکام کے) بیع کو حلال فرمایا ہے اور سود کو حرام کر دیا ہے (اس سے زیادہ اور کیا فرق ہوگا) پھر جس شخص کو اس کے پروردگار کی طرف سے (اس بارہ میں) نصیحت پہنچی اور وہ (اس سود کے فعل اور اس کفر کے قول سے یعنی حلال کہنے سے) باز آگیا (یعنی حرام سمجھنے لگا اور لینا بھی چھوڑ دیا) تو جو کچھ (اس حکم کے آنے سے) پہلے (لینا) ہو چکا ہے وہ اس کا رہا (یعنی ظاہر شرع کے نزدیک اس کی یہ توبہ قبول ہوگئی، اور لیا ہوا مال اسی کی ملک ہے) اور (باطنی) معاملہ اس کا (کہ وہ دل سے باز آیا ہے یا منافقانہ توبہ کرلی ہے، یہ) خدا کے حوالے رہا، (اگر دل سے توبہ کی ہوگی عند اللہ نافع ہوگی ورنہ کالعدم ہوگی، تم کو بدگمانی کا کوئی حق نہیں) اور جو شخص (نصیحت مذکور سُنکر بھی اسی قول اور اسی فعل کی طرف) پھر عود کرے تو (بوجہ اس کے کہ ان کا یہ فعل خود گناہ کبیرہ ہے) یہ لوگ دوزخ میں جائیں گے (اور بوجہ اس کے کہ اُن کا یہ قول کفر ہے اس لئے) وہ اس (دوزخ) میں ہمیشہ رہیں گے (اور گو سود لینے سے فی الحال مال بڑھتا نظر آتا ہے، لیکن مآل کار) اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں (کبھی تو دنیا ہی میں سب برباد ہو جاتا ہے ورنہ آخرت میں تو یقینی بربادی، کیونکہ وہاں اس پر عذاب ہوگا) اور (برخلاف اس کے صدقہ دینے میں گو فی الحال مال گھٹتا معلوم ہوتا ہے، لیکن مآل کار اللہ تعالیٰ) صدقات کو بڑھاتے ہیں، (کبھی تو دنیا میں بھی ورنہ آخرت میں تو یقیناً بڑھتا ہے، کیونکہ وہاں اس پر بہت سا ثواب ملے گا، جیسا اوپر آیات میں مذکور ہوا) اور اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا (بلکہ مبغوض رکھتے ہیں) کسی کفر کرنے والے کو (جو کہ قول مذکور کے مثل کلمات کفر مُنہ سے بکے، اور اسی طرح پسند نہیں کرتے) کسی گناہ کے کام کرنے والے کو (جو کہ فعل مذکور یعنی سُود کے مثل کبائر کا مرتکب ہو)۔

بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے اور (بالخصوص) نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ دی، ان کے لئے ان کا ثواب ہوگا اُن کے پروردگار کے نزدیک اور (آخرت میں) ان پر کوئی خطرہ (واقع ہونے والا) نہیں ہوگا اور نہ وہ (کسی مقصود کے فوت ہونے سے) مغموم ہوں گے،

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور جو کچھ سُود کا بقایا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو (کیونکہ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ کی اطاعت کی جاتے) پھر اگر تم (اس پر عمل) نہ کرو گے تو اشتہار سن لو جنگ کا اللہ کی طرف سے اور اس کے رسولؐ کی طرف سے (یعنی تمھارے خلاف جہاد ہوگا) اور اگر تم توبہ کرلو گے تو تم کو تمھارے اصل اموال مل جاویں گے (اس قانون کے بعد) نہ تم کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے (کہ تم اصل مال سے زیادہ لینے لگو) اور نہ تم پر کوئی ظلم کرنے پاوے گا (کہ تمھارا اصل مال بھی نہ دلایا جاوے) اور اگر (قرضدار) تنگ دست ہو (اور اس لئے میعاد پر نہ دے سکے) تو (اس کو) مہلت دینے کا حکم ہے آسودگی تک (یعنی جب اس کے پاس ادا کی گنجائش ہو) اور یہ (بات) کہ (بالکل معاف ہی کردو اور زیادہ بہتر ہے تمھارے لئے، اگر تم کو (اس کے ثواب کی) خبر ہو۔

اور (مسلمانو!) اس دن سے ڈرو جس میں تم (سب) اللہ تعالیٰ کی پیشی میں لائے جاؤ گے پھر ہر شخص کو اس کا کیا ہوا (یعنی اس کا بدلہ) پورا پورا ملے گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا، (تو تم پیشی کے لئے اپنی کارگذاری درست رکھو، اور کسی قسم کی خلاف ورزی مت کرو)؛

معارف و مسائل

ان آیات میں ربا، یعنی سود کی حرمت اور اس کے احکام کا بیان شروع ہوا ہے، یہ مسئلہ کئی حیثیتوں سے بہت اہم ہے، ایک طرف سود و ربٰو پر قرآن و سنت کی شدید وعیدیں اور دوسری طرف دنیا کی اقتصادیات میں اس کا جزء لازم بن جانا اور اس سے نجات کی مشکلات کا مسئلہ طویل الذیل ہے، اور کئی حیثیتوں سے اس پر غور کرنا ہے۔

اول اس بارے میں قرآن کی آیات کی صحیح تفسیر اور احادیث صحیحہ کے ارشادات میں غور کرکے یہ متعین کرنا کہ قرآن و سنت کی اصطلاح میں ربٰو کیا چیز ہے، اور کن کن معاملات کو شامل ہے، اور اس کی حرمت کس حکمت و مصلحت پر مبنی ہے، اس میں کس قسم کی مضرتیں ہیں۔

دوسری حیثیت اس کی عقلی اور معاشی ہے کہ کیا فی الواقع سود و ربٰو ایسی چیز ہے جو دنیا کی اقتصادی ترقی کی ضامن ہو سکے، اور جس کو نظر انداز کرنے کا لازمی نتیجہ تجارت اور عام اقتصادیات کی تباہی ہو، یا سارا چکر صرف خدا تعالیٰ اور آخرت سے غافل دماغوں کی پیداوار ہے، ورنہ بغیر اس کے بھی تمام معاشی مسائل حل ہو سکتے ہیں، اور نہ صرف مشکلات کا حل بلکہ دنیا میں اقتصادی امن و اطمینان سود کے چھوڑنے پر موقوف ہے، اور یہ کہ دنیا کے اقتصادی مصائب کا سب سے بڑا سبب سود و ربا ہے۔

یہ دوسری بحث ایک معاشی اور اقتصادی مسئلہ ہے، جس کے تحت میں بہت سی اصولی اور فروعی طویل بحثیں ہیں، جن کا تعلق تفسیر قرآن سے نہیں، اس لئے اس جگہ پہلی ہی بحث پر اکتفاء کیا جاتا ہے، وہ بھی خاصی طویل ہے۔

یہ چھ آیتیں ہیں جن میں سود کی حرمت اور احکام کا بیان ہے، ان میں سے پہلی آیت کے پہلے جملہ میں سود خوروں کے انجامِ بد اور محشر میں ان کی رسوائی اور گمراہی کا ذکر ہے، ارشاد ہے کہ جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں کھڑے ہوتے مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے وہ آدمی جس کو کسی شیطان جن نے لپٹ کر خبطی بنا دیا ہو، حدیث میں ہے کہ کھڑے ہونے سے مراد محشر میں قبر سے اٹھنا ہے کہ سود خور جب قبر سے اٹھے گا تو اُس پاگل و مجنون کی طرح اٹھے گا جس کو کسی شیطان جن نے خبطی بنا دیا ہو۔

اس جملہ سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ جنات و شیاطین کے اثر سے انسان بیہوش یا مجنون ہو سکتا ہے، اور اہلِ تجربہ کے متواتر مشاہدات اس پر شاہد ہیں، اور حافظ ابن قیم جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اطبا اور فلاسفہ نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے، کہ صرع، بیہوشی، یا جنون مختلف اسباب سے ہوا کرتا ہے، ان میں بعض اوقات جنات و شیاطین کا اثر بھی اس کا

سبب ہوتا ہے، جن لوگوں نے اس کا انکار کیا ہے ان کے پاس بجز ظاہری استبعاد کے کوئی دلیل نہیں۔

دوسری بات یہ غور طلب ہو کہ قرآن نے یہ نہیں فرمایا کہ سود خور محشر میں پاگل یا مجنون ہو کر اٹھیں گے، بلکہ دیوانہ پن یا بے ہوشی کی ایک خاص صورت کا ذکر کیا ہے، کہ جیسے کسی کو شیطان نے لپٹ کر خبطی بنا دیا ہو، اس میں شاید یہ اشارہ ہے کہ بیہوش و مجنون تو بعض اوقات چپ چاپ پڑا بھی رہتا ہے، اُن کا یہ حال نہ ہوگا، بلکہ شیطان کے خبطی بنائے ہوؤں کی طرح بکواس اور ہذیان اور دوسری مجنونانہ حرکتوں کی وجہ سے پہچانے جائیں گے۔

اور شاید اس طرف بھی اشارہ ہو کہ بیماری سے بیہوش یا مجنون ہو جانے کے بعد چونکہ احساس بالکل باطل ہو جاتا ہے، اس کو تکلیف یا عذاب کا بھی احساس نہیں رہتا، اُن کا یہ حال نہ ہوگا، بلکہ آسیب زدہ کی طرح تکلیف و عذاب کو پوری طرح محسوس کرے گا۔

اب یہاں یہ دیکھنا ہے کہ جرم و سزا میں کوئی مناسبت ہونی چاہئے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو سزا کسی شخص یا جماعت کے کسی جُرم کے مقابلہ میں دی جاتی ہے، وہ یقیناً اس جرم کے مناسب ہوتی ہے، اس لئے سود خوروں کو خبطی بنا کر محشر میں اٹھانا شاید اس کا اظہار ہو کہ سود خور روپے پیسہ کی حرص میں اس قدر مدہوش ہوتا ہے کہ اس کو نہ کسی غریب پر رحم آتا ہے نہ کسی کی شرم مانع ہوتی ہے، وہ چونکہ اپنی زندگی میں درحقیقت بیہوش تھا، اس لئے محشر میں بھی اسی حالت میں اٹھایا گیا، یا یہ سزا اس لئے دی گئی کہ دنیا میں اس نے عقلی رنگ میں اپنی بے عقلی کو ظاہر کیا، کہ بیع کو مثل سود قرار دیا، اس لئے اس کو بے عقل کر کے اٹھا دیا گیا۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ آیت میں سود کھانے کا ذکر ہے اور مراد مطلقاً سود لینا اور اس کا استعمال کرنا ہے، خواہ کھانے میں استعمال کرے یا لباس میں یا مکان اور اس کے فرنیچر میں، لیکن اس کو "کھانے" کے لفظ سے اس لئے تعبیر کیا کہ جو چیز کھائی جائے اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں رہتا، بخلاف دوسری ضرورتوں کے استعمال کے کہ اس چیز کو واپس لیا دیا جا سکتا ہے، اس لئے مکمل قبضہ اور تصرف کو کھا جانے کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور نہ صرف عربی زبان میں بلکہ اردو، فارسی وغیرہ اکثر زبانوں کا یہی محاورہ ہے۔

اس کے بعد دوسرے جملہ میں سود خوروں کی اس سزا کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ ان لوگوں نے دو جرم کئے ایک تو بذریعہ سود کے حرام مال کھایا، دوسرے اس کو حلال سمجھا اور

حرام کہنے والوں کے جواب میں یہ کہا بیع وشراء بھی تو ربوٰ ہی کی مثل ہے، جس طرح ربوٰ کے ذریعہ نفع حاصل کیا جاتا ہے اسی طرح بیع وشراء کے ذریعہ نفع مقصود ہے، اگر سود حرام ہے تو بیع بھی حرام ہونی چاہئے، حالانکہ اس کے حرام ہونے کا کوئی قائل نہیں، اس جگہ بظاہر مقتضائے مقام یہ تھا کہ لوگ یوں کہتے کہ ربوٰ بھی تو مثل بیع کے ہے، جب بیع حلال ہو تو ربوٰ بھی حلال ہونا چاہئے، مگر انھوں نے طرزِ بیان بدل کر حرام کہنے والوں پر ایک قسم کا استہزاء کیا، کہ تم ربوٰ کو حرام کہتے ہو تو بیع کو بھی حرام کہو۔

تیسرے جملے میں ان لوگوں کے اس قول کا جواب حق تعالیٰ نے یہ دیا کہ یہ لوگ بیع کو ربوٰ کی مثل اور برابر قرار دیتے ہیں، حالانکہ بحکمِ خداوندی ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو حلال قرار دیا اور دوسرے کو حرام، پھر دونوں برابر کیسے ہوسکتے ہیں۔

اس جواب میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ان لوگوں کا اعتراض تو عقلی طور پر تھا کہ جب دونوں معاملوں کا مقصد نفع کمانا ہے تو دونوں کا حکم ایک ہی ہونا چاہئے، اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کے عقلی شبہ کا جواب عقلی طور پر فرق بیان کرکے نہیں دیا، بلکہ حاکمانہ انداز میں یہ جواب دیا کہ مالک الملک والملکوت اللہ جل شانہٗ ہے وہ ہی ہر چیز کے نفع وضرر اور بھلے بُرے کو پوری طرح جانتا ہے، جب اس نے ایک کو حلال اور دوسرے کو حرام قرار دیدیا، تو سمجھ لو کہ جس چیز کو حرام کیا ہے اس میں ضرور کوئی نقصان وضرر اور کوئی خباثت ہے، خواہ عام انسان اس کو محسوس کرے یا نہ کرے، کیونکہ مجموعۂ نظامِ عالم کی پوری حقیقت اور اس کے نفع وضرر کا احاطہ صرف وہی علیم وخبیر کرسکتا ہے، جس کے علم سے کوئی ذرہ جہان چھپا ہوا نہیں ہے، عالم کے افراد یا جماعتیں اپنے اپنے مصالح اور مضرتوں کو پہچان سکتے ہیں، پورے عالم کے نفع وضرر کا احاطہ نہیں کرسکتے، بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ کسی شخص یا جماعت کے حق میں مفید نظر آتی ہیں، مگر پوری قوم یا پورے ملک کے لئے اس میں مضرت ہوتی ہے۔

اس کے بعد تیسرے جملہ میں یہ ارشاد ہے کہ سود حرام ہونے سے پہلے جس شخص نے کوئی رقم جمع کرلی تھی، لیکن جب سود کو حرام قرار دیدیا گیا، تو اگر آئندہ کے لئے اس نے توبہ کرلی، اور باز آگیا، تو اس سے پہلے جمع شدہ رقم ظاہر شرع کے حکم سے اُسی کی ہوگئی، اور باطنی معاملہ اس کا کہ وہ دل سے باز آیا، یا منافقانہ توبہ کرلی، اس کا یہ معاملہ خدا کے حوالہ ہا۔

اگر دل سے توبہ کی ہے تو عند اللہ نافع ہوگی ورنہ کالعدم ہوگی، عام لوگوں کو بدگمانی کرنے کا حق نہیں ہے، اور جو شخص نصیحت سُنکر بھی اسی قول وفعل کی طرف پھر عود کرے تو

چونکہ یہ فعل سودخوری گناہ ہے، یہ لوگ دوزخ میں جائیں گے، اور چونکہ اُن کا یہ قول کہ سود مثل بیع کے حلال ہے کفر ہے اس لئے وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

دوسری آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں اور صدقات کو بڑھاتے ہیں، یہاں سُود کے ساتھ صدقات کا ذکر ایک خاص مناسبت سے لایا گیا ہے، کہ سود اور صدقہ دونوں کی حقیقت میں بھی تضاد ہے، اور ان کے نتائج بھی متضاد ہیں، اور عموماً ان دونوں کاموں کے کرنے والوں کی غرض و نیت بھی متضاد ہوتی ہے۔

حقیقت کا تضاد تو یہ ہے کہ صدقہ میں تو بغیر کسی معاوضہ کے اپنا مال دوسروں کو دیا جاتا ہے، اور سُود میں بغیر کسی معاوضہ کے دوسرے کا مال لیا جاتا ہے، ان دونوں کاموں کے کرنے والوں کی نیت اور غرض اس لئے متضاد ہے کہ صدقہ کرنے والا محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور ثوابِ آخرت کے لئے اپنے مال کو کم یا ختم کر دینے کا فیصلہ کرتا ہے، اور سود لینے والا اپنے موجودہ مال پر ناجائز زیادتی کا خواہشمند ہے، اور نتائج کا متضاد ہونا قرآن کریم کی اس آیت سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ سود سے حاصل شدہ مال کو یا اس کی برکت کو مٹا دیتے ہیں، اور صدقہ کرنے والے کے مال یا اس کی برکت کو بڑھاتے ہیں جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ مال کی ہوس کرنیوالے کا مقصد پورا نہیں ہوتا، اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے والا جو اپنے مال کی کمی پر راضی تھا، اس کے مال میں برکت ہو کر اس کا مال یا اس کے ثمرات و فوائد بڑھ جاتے ہیں۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ آیت میں سود کو مٹانے اور صدقات کو بڑھانے کا کیا مطلب ہے؟ بعض مفسّرین نے فرمایا کہ یہ مٹانا اور بڑھانا آخرت کے متعلق ہے کہ سودخور کو اس کا مال آخرت میں کچھ کام نہ آئے گا بلکہ اس پر وبال بن جائے گا، اور صدقہ خیرات کرنے والوں کا مال آخرت میں ان کے لئے ابدی نعمتوں اور راحتوں کا ذریعہ بنے گا، اور یہ بالکل ظاہر ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں، اور عامۂ مفسرین نے فرمایا ہے کہ سود کا مٹانا اور صدقہ کا بڑھانا آخرت کے لئے تو ہے ہی، مگر اس کے کچھ آثار دنیا میں بھی مشاہدہ میں آجاتے ہیں۔

سود جس مال میں شامل ہو جاتا ہے، بعض اوقات تو وہ مال خود ہلاک و برباد ہو جاتا ہے، اور پچھلے مال کو بھی ساتھ لے جاتا ہے، جیسے کہ ربٰوا اور سٹہ کے بازاروں میں اس کا ہمیشہ مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، کہ بڑے بڑے کروڑپتی اور سرمایہ دار دیکھتے دیکھتے دیوالیہ اور فقیر بن جاتے ہیں، بے سود کی تجارتوں میں بھی نفع و نقصان کے احتمالات رہتے ہیں، اور بہت سے تاجروں کو نقصان بھی کسی تجارت میں ہو جاتا ہے، لیکن ایسا نقصان کہ کل کروڑپتی تھا، اور آج ایک ایک پیسہ کی بھیک کا محتاج ہے، یہ صرف سود اور سٹہ کے بازاروں میں ہی ہوتا ہے،

اور اہلِ تجربہ کے بے شمار بیانات اس بارے میں مشہور و معروف ہیں کہ سود کا مال فوری طور پر کتنا ہی بڑھ جائے، لیکن وہ عموماً پائیدار اور باقی نہیں رہتا، جس کا فائدہ اولاد اور نسلوں میں چلے، اکثر کوئی نہ کوئی آفت پیش آکر اس کو برباد کردیتی ہے، حضرت معمرؒ نے فرمایا کہ ہم نے بزرگوں سے سُنا ہے کہ سودخور پر چالیس سال گزرنے نہیں پاتے، کہ اس کے مال پر محاق (یعنی گھاٹا) آجاتا ہے۔

اور اگر ظاہری طور پر مال ضائع و برباد بھی نہ ہو تو اس کے فوائد اور برکات و ثمرات سے محرومی تو یقینی اور لازمی ہے، کیونکہ یہ بات کچھ مخفی نہیں کہ سونا چاندی خود تو نہ مقصود ہے نہ کارآمد، نہ اس سے کسی کی بھوک مِٹ سکتی ہے، نہ پیاس نہ سردی، نہ گرمی سے بچنے کے لئے اوڑھا بچھایا جا سکتا ہے، نہ وہ کپڑوں اور برتنوں کا کام دے سکتا ہے، پھر اس کو حاصل کرنے اور محفوظ رکھنے میں ہزاروں مشقتیں اٹھانے کا منشاء ایک عقلمند انسان کے نزدیک اس کے سوا نہیں ہو سکتا کہ سونا چاندی ذریعہ ہیں ایسی چیزوں کے حاصل کرنے کا کہ جن سے انسان کی زندگی خوشگوار بن سکے، اور وہ راحت و عزت کی زندگی گذار سکے، اور انسان کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ یہ راحت و عزت جس طرح اسے حاصل ہوئی اس کی اولاد اور متعلقین کو بھی حاصل ہو۔

یہی وہ چیزیں ہیں جو مال و دولت کے فوائد و ثمرات کہلا سکتے ہیں، اس کے نتیجہ میں یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ جس شخص کو یہ ثمرات و فوائد حاصل ہوئے اس کا مال ایک حیثیت سے بڑھ گیا، اگرچہ دیکھنے میں کم نظر آئے، اور جس کو یہ فوائد و ثمرات کم حاصل ہوئے اس کا مال ایک حیثیت سے گھٹ گیا، اگرچہ دیکھنے میں زیادہ نظر آئے۔

اس بات کو سمجھ لینے کے بعد سود کا کاروبار اور صدقہ و خیرات کے اعمال کا جائزہ لیجئے، تو یہ بات مشاہدہ میں آجائے گی کہ سودخور کا مال اگرچہ بڑھتا ہوا نظر آتا ہے مگر وہ بڑھنا ایسا ہے کہ جیسے کسی انسان کا بدن ورم وغیرہ سے بڑھ جائے، ورم کی زیادتی بھی تو بدن ہی کی زیادتی ہے، مگر کوئی سمجھدار انسان اس زیادتی کو پسند نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ زیادتی موت کا پیغام ہے، اسی طرح سودخور کا مال کتنا ہی بڑھ جائے، مگر مال کے فوائد و ثمرات یعنی راحت و عزت سے ہمیشہ محروم رہتا ہے۔

یہاں شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ آج تو سودخوروں کو بڑی سے بڑی راحت و عزت حاصل ہے وہ کوٹھیوں، بنگلوں کے مالک ہیں، عیش و آرام کے سارے سامان مہیا ہیں، کھانے، پینے، پہننے اور رہنے سہنے کی ضروریات بلکہ فضولیات بھی سب اُن کو حاصل ہیں، نوکر چاکر اور شان و شوکت کے تمام سامان موجود ہیں، لیکن غور کیا جائے تو ہر شخص سمجھ لے گا کہ سامانِ راحت

اور راحت میں بڑا فرق ہے، سامانِ راحت تو فیکٹریوں اور کارخانوں میں بنتا اور بازاروں میں بکتا ہے، وہ سونے چاندی کے عوض حاصل ہو سکتا ہے، لیکن جس کا نام راحت ہے وہ نہ کسی فیکٹری میں بنتی ہے، نہ کسی منڈی میں بکتی ہے، وہ ایک ایسی رحمت ہے جو براہِ راست حق تعالیٰ کی طرف سے دی جاتی ہے، وہ بعض اوقات ہزاروں سامان کے باوجود حاصل نہیں ہو سکتی، ایک نیند کی راحت کو دیکھ لیجئے کہ اس کے حاصل کرنے کے لئے یہ تو کر سکتے ہیں کہ سونے کے لئے مکان کو بہتر سے بہتر بنائیں، ہوا اور روشنی کا پورا اعتدال ہو، مکان کا فرنیچر دیدہ زیب دل خوش کن ہو، چارپائی اور گدے اور تکئے حسبِ منشا ہوں، لیکن کیا نیند کا آجانا ان سامانوں کے مہیا ہونے پر لازمی ہے؟ اگر آپ کو کبھی اتفاق نہ ہوا ہو تو ہزاروں وہ انسان اس کا جواب نفی میں دیں گے جن کو کسی عارضہ سے نیند نہیں آتی، اب امریکہ جیسے مالدار متمدن ملک کے متعلق بعض رپورٹوں سے معلوم ہوا کہ وہاں پچھتّر فی صد آدمی خواب آور گولیوں کے بغیر سو ہی نہیں سکتے، اور بعض اوقات خواب آور دوائیں بھی جواب دیدیتی ہیں، نیند کے سامان تو آپ بازار سے خرید لائے، مگر نیند آپ کسی بازار سے کسی قیمت پر نہیں لا سکتے، اسی طرح دوسری راحتوں اور لذتوں کا حال ہے کہ اُن کے سامان تو روپیہ پیسے کے ذریعہ حاصل ہو سکتے ہیں، مگر راحت و لذت کا حاصل ہونا ضروری نہیں۔

یہ بات سمجھ لینے کے بعد سود خوروں کے حالات کا جائزہ لیجئے تو ان کے پاس آپ کو سب کچھ ملے گا مگر راحت کا نام نہ پائیں گے، وہ اپنے کروڑ کو ڈیڑھ کروڑ اور ڈیڑھ کروڑ کو دو کروڑ بنانے میں ایسے مست نظر آئیں گے، کہ ان کو اپنے کھانے پہننے کا ہوش ہے، نہ اپنی بیوی بچوں کا، کئی کئی مِل چل رہے ہیں، دوسرے ملکوں سے جہاز آرہے ہیں، اُن کی اُدھیڑ بن ہی میں صبح سے شام اور شام سے صبح ہو جاتی ہے، افسوس ہے کہ ان دیوانوں نے سامانِ راحت ہی کا نام راحت سمجھ لیا ہے، اور حقیقت میں راحت سے کوسوں دُور ہیں۔

یہ حال تو ان کی راحت کا ہے، اب عزت کو دیکھ لیجئے، یہ لوگ چونکہ سخت دل اور بے رحم ہو جاتے ہیں، اُن کا پیشہ ہی یہ ہوتا ہے کہ مفلسوں کی مفلسی سے یا کم مایہ لوگوں کی کم مائگی سے فائدہ اٹھائیں، اُن کا خون چوس کر اپنے بدن کو پالیں، اس لئے ممکن نہیں کہ لوگوں کے دلوں میں اُن کی کوئی عزت و وقار ہو، اپنے ملک کے بنیوں اور ملک شام کے یہودیوں کی تاریخ پڑھ جائیے، اُن کے حالات کو دیکھ لیجئے، اُن کی تجوریاں کتنی ہی سونے چاندی اور جواہرات سے بھری ہوں، لیکن دنیا کے کسی گوشہ میں انسانوں کے کسی طبقہ میں ان کی کوئی عزت نہیں، بلکہ ان کے اس عمل کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غریب مفلس لوگوں کے دلوں میں اُن کی طرف سے بغض و نفرت پیدا ہوتی ہے، اور آجکل تو دنیا کی ساری جنگیں اسی بغض و نفرت

کی مظاہر ہیں، محنت و سرمایہ کی جنگ نے ہی دنیا میں اشتراکیت اور اشتمالیت کے نظریئے پیدا کئے، کمیونزم کی تخریبی سرگرمیاں اسی بغض و نفرت کا نتیجہ ہیں، جن سے پوری دنیا قتل و قتال اور جنگ و جدال کا جہنم بن کر رہ گئی ہے، یہ حال تو اپنی راحت و عزت کا ہے، اور تجربہ شاہد ہے کہ سود کا مال سود خور کی آنے والی نسلوں کی زندگی کو بھی کبھی خوشگوار نہیں بناتا، یا ضائع ہو جاتا ہے، یا اس کی نحوست سے وہ بھی مال و دولت کے حقیقی ثمرات سے محروم و ذلیل رہتے ہیں، لوگ یورپ کے سود خوروں کی مثال سے شاید فریب میں آئیں کہ وہ لوگ تو سب کے سب خوش حال ہیں، اور اُن کی نسلیں بھی پھولتی پھلتی ہیں، لیکن اوّل تو ان کی خوش حالی کا اجمالی خاکہ عرض کر چکا ہوں۔

دوسرے ان کی مثال تو ایسی ہے کہ کوئی مردم خور دوسرے انسانوں کا خون چُوس کر اپنا بدن پالتا ہو اور ایسے کچھ انسانوں کا جتھہ ایک محلہ میں آباد ہو جائے، آپ کسی کو اس محلہ میں لے جا کر مشاہدہ کرائیں کہ یہ سب کے سب بڑے صحت مند اور سرسبز و شاداب ہیں، لیکن ایک عقلمند آدمی کو جو انسانیت کی فلاح کا خواہشمند ہے صرف اس محلہ کا دیکھنا نہیں، بلکہ اس کے مقابل ان بستیوں کو بھی دیکھنا ہے جن کا خون چُوس کر ان کو ادھ موا کر دیا گیا ہے، اس محلہ اور ان بستیوں کے مجموعہ پر نظر ڈالنے والا کبھی اس محلہ کے فربہ ہونے پر خوش نہیں ہو سکتا، اور مجموعی حیثیت سے ان کے عمل کو انسانی ترقی کا ذریعہ نہیں بتا سکتا، بلکہ اس کو انسان کی ہلاکت و بربادی ہی کہنے پر مجبور ہوگا۔

اس کے بالمقابل صدقہ خیرات کرنے والوں کو دیکھئے کہ اُن کو کبھی اس طرح مال کے پیچھے حیران و سرگرداں نہ پائیں گے، ان کو راحت کے سامان اگرچہ کم حاصل ہوں، مگر سامان والوں سے زیادہ اطمینان اور سکونِ قلب جو اصلی راحت ہے ان کو حاصل ہوگی، دنیا میں ہر انسان ان کو عزت کی نظر سے دیکھے گا۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا اور صدقہ کو بڑھاتا ہے، یہ مضمون آخرت کے اعتبار سے تو بالکل صاف ہے ہی، دنیا کے اعتبار سے بھی اگر ذرا حقیقت سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بالکل کھلا ہوا ہے، یہی ہے مطلب اس حدیث کا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ الرِّبٰوا وَاِنْ كَثُرَ فَاِنَّ عَاقِبَتَهٗ تَصِيْرُ اِلٰى قُلٍّ	"یعنی سود اگرچہ کتنا ہی زیادہ ہو جائے مگر انجام کار نتیجہ اس کا قلت ہے"۔

یہ روایت مسند احمد اور ابن ماجہ میں مذکور ہے۔

آیت کے آخر میں ارشاد ہے: وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ، یعنی "اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے کسی کفر کرنے والے کو کسی گناہ کا کام کرنے والے کو" اس میں اشارہ فرما دیا ہے کہ جو لوگ سود کو حرام ہی نہ سمجھیں وہ کفر میں مبتلا ہیں اور جو حرام سمجھنے کے باوجود عملاً اس میں مبتلا ہیں وہ گنہگار فاسق ہیں۔

تیسری آیت میں مؤمنین صالحین جو نماز و زکوٰۃ کے پابند ہیں ان کے اجر عظیم اور آخرت کی راحت کا ذکر ہے، چونکہ اس سے پہلی آیت میں سود خوروں کے لئے عذاب جہنم اور اُن کی ذلت و خواری کا ذکر آیا تھا، قرآن کریم کے عام اسلوب کے مطابق اس کے ساتھ ہی ایمان و عمل صالح کے پابند نماز و زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے ثواب اور درجات آخرت کا ذکر کر دیا گیا۔

چوتھی آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ؁ کا خلاصہ یہ ہے کہ سود و ربٰو کی حرمت نازل ہونے کے بعد جو سود کی بقایا رقمیں کسی کے ذمہ باقی تھیں ان کا لینا دینا بھی حرام کر دیا گیا۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ سود کی حرمت نازل ہونے سے پہلے عام عرب میں سود کا رواج پھیلا ہوا تھا، آیاتِ متذکرہ سے پہلی آیتوں میں اس کی ممانعت آئی تو حسبِ عادت تمام مسلمانوں نے سود کے معاملات ترک کر دیئے، لیکن کچھ لوگوں کے مطالبات سود کی بقایا رقموں کے دوسرے لوگوں پر تھے، اسی میں یہ واقعہ پیش آیا کہ بنی ثقیف اور بنی مخزوم کے آپس میں سودی معاملات کا سلسلہ تھا، اور بنو ثقیف کے لوگوں کا کچھ سودی مطالبہ بنی مخزوم کی طرف تھا، بنو مخزوم مسلمان ہوگئے تو اسلام لانے کے بعد انھوں نے سود کی رقم ادا کرنا جائز نہ سمجھا، ادھر بنو ثقیف کے لوگوں نے مطالبہ شروع کیا، کیونکہ یہ لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے، مگر مسلمانوں سے مصالحت کرلی تھی، بنو مخزوم کے لوگوں نے کہا کہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد ہم اپنی اسلامی کمائی کو سود کی ادائیگی میں خرچ نہ کریں گے۔

یہ جھگڑا مکہ مکرمہ میں پیش آیا، اس وقت مکہ فتح ہو چکا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مکہ کے امیر حضرت معاذؓ اور دوسری روایت میں عتاب بن اُسیدؓ تھے، انھوں نے اس جھگڑے کا قضیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بغرض دریافتِ حکم لکھ بھیجا،

اس پر قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد سود کے تمام سابقہ معاملات ختم کر دیئے جائیں، پچھلا سود بھی وصول نہ کیا جائے، صرف راس المال وصول کیا جائے۔

یہ اسلامی قانون رائج کیا گیا تو مسلمان تو اس کے پابند تھے ہی، جو غیر مسلم قبائل بطور صلح و معاہدہ اسلامی قانون کو قبول کر چکے تھے وہ بھی اس کے پابند ہو چکے تھے، لیکن اس کے باوجود جب حجۃ الوداع کے خطبہ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قانون کا اعلان کیا تو اس کا اظہار فرمایا کہ یہ قانون کسی خاص شخص یا قوم یا مسلمانوں کے مالی مفاد کے پیشِ نظر نہیں، بلکہ پوری انسانیت کی تعمیر اور صلاح و فلاح کے لئے جاری کیا گیا ہے، اسی لئے ہم سب سے پہلے مسلمانوں کی بہت بڑی رقمِ سود جو غیر مسلموں کے ذمہ تھی اس کو چھوڑتے ہیں تو اب ان کو بھی اپنے بقایا سود کی رقم چھوڑنے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہیئے، چنانچہ اس خطبہ میں ارشاد فرمایا:

الا ان کل ربا کان فی الجاهلیۃ موضوع عنکم کلّہ لکم رؤس اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون واوّل ربا موضوع ربا العبّاس ابن عبد المطلب کلّہ، (ابن کثیر بحوالہ ابن ابی حاتم) "یعنی زمانۂ جاہلیت میں جو سودی معاملات کئے گئے سب کا سود چھوڑ دیا گیا، اب ہر شخص کو اصل رقم ملے گی، سود کی زائد رقم نہ ملے گی، نہ تم زیادتی وصول کر کے کسی پر ظلم کر سکو گے اور نہ کوئی اصل رأس المال میں کمی کر کے تم پر ظلم کر سکے گا، اور سب سے پہلے جو سود چھوڑا تھا وہ عباسؓ بن عبد المطلب کا سود ہے، جس کی بہت بھاری رقمیں غیر مسلموں کے ذمہ بطور سود کے عائد ہوتی تھیں۔" قرآن مجید کی آیت متذکرہ میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ اور بقایا سود چھوڑنے کا حکم مذکور ہے۔

اس آیت کو شروع اس طرح کیا گیا کہ مسلمانوں کو خطاب کر کے اوّل اِتَّقُوا اللّٰهَ کا حکم سنایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اس کے بعد اصل مسئلہ کا حکم بتلایا گیا، یہ قرآن حکیم کا وہ خاص طرز ہے جس میں وہ دنیا بھر کے قانون کی کتابوں سے ممتاز ہے، کہ جب کوئی ایسا قانون بنایا جاتا ہے جس پر عمل کرنے میں لوگوں کو کچھ دشواری معلوم ہو تو اس کے آگے پیچھے خدا تعالیٰ کے سامنے پیشیِ اعمال کے حساب اور آخرت کے عذاب و ثواب کا ذکر کر کے مسلمانوں کے دلوں اور ذہنوں کو اس پر عمل کرنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے، اس کے بعد حکم سُنایا جاتا ہے، یہاں بھی پچھلے عائد شدہ سود کی رقم کا چھوڑ دینا انسانی طبیعت پر بار ہو سکتا تھا، اس لئے پہلے اِتَّقُوا اللّٰهَ فرمایا، اس کے بعد حکم دیا ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا، یعنی چھوڑ دو بقایا سود کو، آیت کے آخر میں فرمایا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ، یعنی اگر تم ایمان والے ہو، اس میں اشارہ کر دیا کہ ایمان کا تقاضا یہ

کہ حکمِ خداوندی کی اطاعت کی جائے، اس کی خلاف ورزی ایمان کے منافی ہے، یہ حکم چونکہ طبائع پر بھاری تھا، اس لئے حکم سے پہلے اِتَّقُوا اللّٰہَ اور حکم کے بعد اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ کے ارشادات ملا دیئے گئے۔

اس کے بعد پانچویں آیت میں اس حکم کی مخالفت کرنے والوں کو سخت وعید سنائی گئی جس کا مضمون یہ ہے کہ اگر تم نے سود کو نہ چھوڑا تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ؐ کی طرف سے اعلانِ جنگ سُن لو، یہ وعید شدید ایسی ہے کہ کفر کے سوا اور کسی بڑے سے بڑے گناہ پر قرآن میں ایسی وعید نہیں آئی پھر اس آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا ہے:

وَاِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَکُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِکُمۡ لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَلَا تُظۡلَمُوۡنَ، یعنی اگر تم توبہ کرلو اور آئندہ کے لئے سود کی بقایا رقم چھوڑنے کا عزم کرلو تو تمھیں تمھارے اصل رأس المال مل جائیں گے، نہ تم اصل رأس المال سے زائد حاصل کر کے کسی پر ظلم کرنے پاؤگے اور نہ کوئی اصل راس مال میں کمی یا دیر کر کے تم پر ظلم کرنے پائے گا" اس میں اصل رأس المال دینے کو اس شرط کے ساتھ مشروط کیا ہے کہ تم توبہ کرلو اور آئندہ کو سود چھوڑنے کا عزم کرلو، تب اصل رأس المال ملے گا۔

اس سے بظاہر اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اگر سود چھوڑنے کا عزم کر کے توبہ نہ کی تو اصل رأس المال بھی نہ ملے گا، سو اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر مسلمان ہوجانے کے باوجود سود کو حرام ہی نہ سمجھے، اس لئے سود چھوڑنے کے لئے توبہ نہیں کرتا تب تو یہ شخص اسلام سے خارج اور مرتد ہوگیا، جس کا حکم یہ ہے کہ مرتد کا مال اس کی ملک سے نکل جاتا ہے، پھر جو زمانۂ اسلام کی کمائی ہے وہ اس کے مسلمان وارثوں کو مل جاتی ہے، اور جو کفر کے بعد کی کمائی ہے تو وہ بیت المال میں جمع کردی جاتی ہے، اس لئے سُود سے توبہ نہ کرنا اگر حلال سمجھنے کی بناء پر ہو تو اس کو اصل راس المال بھی نہ ملے گا، اور اگر حلال تو نہیں سمجھتا مگر عملاً باز نہیں آتا اور اس کے ساتھ جتھ بنا کر حکومتِ اسلامیہ کا مقابلہ کرتا ہے تو وہ باغی ہے، اس کا بھی سب مال ضبط کر کے بیت المال میں امانت رکھا جاتا ہے، کہ جب یہ توبہ کرلے تب اس کا مال اس کو واپس دیدیا جائے، شاید اس قسم کی جزئیات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے بصورتِ شرط فرمایا گیا، وَاِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَکُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِکُمۡ، یعنی اگر تم توبہ نہ کروگے تو تمھارے رأس المال بھی ضبط ہوجائیں گے۔

اس کے بعد چھٹی آیت میں سودخوری کی انسانیت سوز حرکت کے بالمقابل پاکیزہ اخلاق اور غریبوں اور ناداروں کے ساتھ مساہلت کے سلوک کی تعلیم دی جاتی ہے، ارشاد

۴۲ ہوتا ہے، وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ، یعنی" اگر تمھارا مدیون تنگدست ہو، تمھارا قرض ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو حکم شرعی یہ ہے کہ اس کو فراخی اور آسودگی کے وقت تک مہلت دی جائے، اور اگر تم اس کو اپنا قرض معاف ہی کردو تو یہ تمھارے لئے زیادہ بہتر ہے"۔

سود خوروں کی عادت تو یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی مدیون مفلس ہے اور میعاد مقررہ پر وہ قرض ادا نہیں کرسکتا تو سود کی رقم اصل میں جمع کر کے سود در سود کا سلسلہ چلاتے ہیں، اور سود کی مقدار بھی اور بڑھا دیتے ہیں۔

یہاں احکم الحاکمین نے یہ قانون بنا دیا کہ اگر کوئی مدیون واقعی مفلس ہے، ادائے قرض پر قادر نہیں تو اس کو تنگ کرنا جائز نہیں، بلکہ اس کو اس وقت تک مہلت دینی چاہئے جب تک کہ وہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو جائے، ساتھ ہی اس کی ترغیب بھی دیدی کہ اس غریب کو اپنا قرض معاف کردو تو یہ تمھارے لئے زیادہ بہتر ہے۔

یہاں معاف کرنے کو قرآن نے بلفظ صدقہ تعبیر فرمایا ہے، جس میں اشارہ ہو کہ یہ معافی تمھارے لئے بحکم صدقہ ہو کر موجبِ ثواب عظیم ہوگی، نیز یہ جو فرمایا کہ معاف کردینا تمھارے لئے زیادہ بہتر ہے، حالانکہ بظاہر تو ان کے لئے نقصان کا سبب ہو کہ سود تو چھوڑا ہی تھا اصل راس المال بھی گیا، مگر قرآن نے اس کو بہتر فرمایا، اس کی دو وجہ ہیں، اول تو یہ کہ یہ بہتری اس دنیا کی چند روزہ زندگی کے بعد مشاہدہ میں آجائے گی، جب کہ اس حقیر مال کے بدلہ میں جنت کی دائمی نعمتیں اس کو ملیں گی۔

دوسرے شاید اس میں اس طرف بھی اشارہ ہو کہ دنیا میں بھی تمھیں اس عمل کی بہتری کا مشاہدہ ہو جائے گا، کہ تمھارے مال میں برکت ہوگی، برکت کی حقیقت یہ ہو کہ تھوڑے مال میں کام بہت نکل جائیں، یہ ضروری نہیں کہ مال کی مقدار یا تعداد بڑھ جائے، سو یہ مشاہدہ ہے کہ صدقہ خیرات کرنے والوں کے مال میں بے شمار برکت ہوتی ہے، ان کے تھوڑے مال سے اتنے کام نکل جاتے ہیں کہ حرام مال والوں کے بڑے بڑے اموال سے وہ کام نہیں نکلتے۔

اور جس مال میں بے برکتی ہوتی ہے اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ جس مقصد کے لئے خرچ کرتا ہے وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا، یا غیر مقصود چیزوں میں مثلاً دوا، علاج اور ڈاکٹروں کی فیسوں میں ایسے مالداروں کی بڑی بڑی رقمیں خرچ ہو جاتی ہیں، جس کا غریبوں کو کبھی سابقہ نہیں پڑتا، اوّل تو اللہ تعالیٰ ان کو تندرستی کی نعمت عطا فرماتے ہیں، کہ علاج میں کچھ خرچ کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے، اور اگر کبھی بیماری آئی بھی تو معمولی اخراجات سے تندرستی

حاصل ہو جاتی ہے، اس لحاظ سے مدیون مفلس کو قرض معاف کر دینا جو بظاہر اس کے لئے نقصان دہ نظر آتا تھا، اس قرآنی تعلیم کے پیش نظر وہ ایک مفید و نافع کام بن گیا۔

مدیون مفلس کے ساتھ نرمی و مساہلت کی تعلیم کے لئے احادیثِ صحیحہ میں جو ارشادات وارد ہوئے ہیں، ان کے چند جملے سنئے، طبرانی کی ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص یہ چاہے کہ اس کے سر پر اس روز اللہ کی رحمت کا سایہ ہو جبکہ اس کے سوا کسی کو کوئی سایہ سر چھپانے کے لئے نہ ملے گا تو اس کو چاہئے کہ تنگدست مقروض کے ساتھ نرمی اور مساہلت کا معاملہ کرے، یا اس کو معاف کر دے۔

اسی مضمون کی حدیث صحیح مسلم میں بھی ہے، اور مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی مفلس مدیون کو مہلت دے گا تو اس کو ہر روز اتنی رقم کے صدقہ کا ثواب ملے گا، جتنی اس مدیون کے ذمہ واجب ہے، اور یہ حساب میعادِ قرض پورا ہونے سے پہلے مہلت دینے کا ہے، اور جب میعادِ قرض پوری ہو جائے اور وہ شخص ادا کرنے پر قادر نہ ہو اس وقت اگر کوئی مہلت دے گا تو اس کو ہر روز اس کی دُوگنی رقم صدقہ کرنے کا ثواب ملے گا۔

ایک حدیث میں ہو کہ جو شخص یہ چاہے کہ اس کی دعا، قبول ہو یا اس کی مصیبت دُور ہو تو اس کو چاہئے کہ تنگدست مدیون کو مہلت دیدے۔

اس کے بعد آخری آیت میں پھر روزِ قیامت کا خوف اور محشر کے حساب کتاب اور ثواب و عذاب کے ذکر پر احکام سود کی آیات کو ختم کیا، ارشاد فرمایا:

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ "یعنی ڈرو اس روز سے جس میں تم سب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی میں لائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اپنے اپنے عمل کا پورا پورا بدلہ ملے گا"۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت نزول کے اعتبار سے سب سے آخری آیت ہے، اس کے بعد کوئی آیت نازل نہیں ہوئی، اس کے اکتیس روز بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی، اور بعض روایات میں صرف نَو دن بعد وفات ہونا مذکور ہے۔

یہاں تک ربا کے احکام سے متعلقہ سورۂ بقرہ کی آیات کی تفسیر آئی ہے، ربا کی حرمت و ممانعت پر قرآن کریم میں سورۂ بقرہ میں مذکورہ سات آیتیں اور سورۂ آلِ عمران میں ایک آیت، سورۂ نساء میں دو آیتیں آئی ہیں، اور ایک آیت سورۂ روم میں بھی ہے، جس کی تفسیر میں اختلاف ہو، بعض حضرات نے اس کو بھی سود بیاج کے مفہوم پر محمول کیا ہے، بعض نے دوسری تفسیر بیان کی ہے، اس طرح قرآنِ حکیم کی دس آیتیں ہیں، جن میں سود و ربا کے

احکام مذکور ہیں۔

سود کی پوری حقیقت بتلانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن باقی آیات کا ترجمہ اور تفسیر بھی اسی جگہ لکھدی جائے جو سورۃ آلِ عمرآن اور سورۃ نساء اور سورۃ روم میں آئی ہیں، تاکہ تمام آیات یک جا ہو کر ربا کی حقیقت سمجھنے میں آسانی ہو۔

آل عمران کے تیرہویں رکوع کی ایک سو تیسویں آیت یہ ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰٓوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۚ (۳: ۱۳۰)	"یعنی اے ایمان والو سود مت کھاؤ حصے سے زائد، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، امید ہے کہ تم کامیاب ہو"۔

اس آیت کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے کہ جاہلیتِ عرب میں سود خوری کا عام طور پر یہ طریق تھا کہ ایک خاص میعاد معیّن کے لئے اُدھار سود پر دیا جاتا تھا، اور جب وہ میعاد آگئی اور قرضدار اس کی ادائیگی پر قادر نہ ہوا تو اس کو مزید مہلت اس شرط پر دی جاتی تھی کہ سود کی مقدار بڑھادی جائے، اسی طرح دوسری میعاد پر بھی ادائگی نہ ہوئی تو سُود کی مقدار اور بڑھادی، یہ واقعہ عام کتبِ تفسیر میں بالخصوص لبابُ النقول میں بروایت مجاہدؒ مذکور ہے۔

جاہلیتِ عرب کی اس ملّت کُش رسم کو مٹانے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی، اسی لئے اس آیت میں اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (یعنی کئی حصّے زائد) فرما کر ان کے مروّجہ طریقہ کی مذمت اور ملّت کُشی و خود غرضی پر تنبیہ فرما کر اس کو حرام قرار دیا، اس کے معنی یہ نہیں کہ اضعاف و مضاعف نہ ہو تو حرام نہیں، کیونکہ سورۃ بقرہ اور نساء میں مطلقاً ربا کی حرمت صاف صاف مذکور ہے، اضعاف مضاعف ہو یا نہ ہو، اس کی مثال ایسی ہے جیسے قرآن کریم میں جا بجا فرمایا گیا ہے لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا "یعنی میری آیتوں کے بدلہ میں تھوڑی سی قیمت مت لو"۔ اس میں تھوڑی سی قیمت اس لئے فرمایا کہ آیاتِ الٰہیہ کے بدلہ میں اگر ہفت اقلیم کی سلطنت بھی لے لے تو وہ تھوڑی ہی قیمت ہوگی، اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کی آیات کے بدلے میں تھوڑی قیمت لینا تو حرام ہے اور زیادہ لینا جائز، اسی طرح اس آیت میں اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً کا لفظ ان کے شرمناک طریقہ پر نکیر کرنے کے لئے لایا گیا، حرمت کی شرط نہیں۔

اور اگر سود کے مروّجہ طریقوں پر غور کیا جائے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جب سود خوری کی عادت پڑجائے تو پھر وہ سود تنہا سود ہی نہیں رہتا، بلکہ لازماً اضعاف مضاعف ہو جاتا ہے، کیونکہ جو رقم سُود سے حاصل ہو کر سود خور کے مال میں شامل ہوئی تو اب اس سود کی زائد رقم کو بھی سُود پر چلائے گا تو سود مضاعف ہو جائے گا، اور یہی سلسلہ آگے چلا تو اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً

ہو جائے گا، اس طرح ہر سود اضعاف مضاعفہ بن کر رہے گا۔

اور سورۂ نسآء میں دو آیتیں سود کے متعلق یہ ہیں:

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۙ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ○ (۴: ۱۶۰ - ۱۶۱)

"یعنی یہود کے انہی بڑے بڑے جرائم کے سبب ہم نے بہت سی پاکیزہ چیزیں جو اُن کے لئے حلال تھیں اُن پر حرام کردیں، اور بسبب اس کے کہ وہ بہت آدمیوں کو رشد کی راہ سے مانع بن جاتے تھے، اور بسبب اس کے کہ وہ سود لیا کرتے تھے، حالانکہ ان کو اس سے ممانعت کی گئی تھی، اور بسبب اس کے کہ وہ لوگوں کا مال ناحق طریقے سے کھا جاتے تھے، اور ہم نے ان لوگوں کیلئے جو اُن میں کافر ہیں دردناک سزا کا سامان مقرر کر رکھا ہے"۔

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ شریعتِ موسویہ میں بھی سود حرام تھا، اور یہود نے جب اس کی مخالفت کی تو دنیا میں بھی اُن کو یہ مناسب سزا دی گئی کہ انھوں نے حرصِ دنیا کی خاطر حرام کھانا شروع کردیا، تو اللہ تعالیٰ نے اُن پر بعض حلال چیزیں بھی حرام فرمادیں۔

اور سُورۂ رُوم کے چوتھے رکوع کی اُنتالیسویں آیت میں ہے:

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ○ (۳۰: ۳۹)

"یعنی جو چیز تم اس لئے دو گے کہ وہ لوگوں کے مال میں پہنچ کر زیادہ ہو جائے تو یہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا، اور جو زکوٰۃ دو گے جس سے اللہ کی رضا مطلوب ہو تو ایسے لوگ خدا کے پاس بڑھاتے رہیں گے"۔

بعض حضرات مفسرین نے لفظ ربا اور زیادتی پر نظر کر کے اس آیت کو بھی سود ربیاج پر محمول فرمایا ہے، اور یہ تفسیر فرمائی ہے کہ سود بیاج کے لینے میں اگرچہ بظاہر مال کی زیادتی نظر آتی ہے، مگر درحقیقت وہ زیادتی نہیں، جیسے کسی شخص کے بدن پر ورم ہو جائے تو بظاہر وہ اس کے جسم میں زیادتی ہے، لیکن کوئی عقلمند اس کو زیادتی سمجھ کر خوش نہیں ہوتا، بلکہ اس کو ہلاکت کا مقدمہ سمجھتا ہے، اس کے بالمقابل زکوٰۃ و صدقات دینے میں اگرچہ بظاہر مال میں کمی آتی ہے، مگر درحقیقت وہ کمی نہیں بلکہ ہزاروں زیادتیوں کا موجب ہے۔

جیسے کوئی شخص مادّۂ فاسدہ کے اخراج کے لئے مسہل لیتا ہے، یا فصد کھلوا کر خون نکلواتا ہے، تو بظاہر وہ کمزور نظر آتا ہے اور اس کے بدن میں کمی محسوس ہوتی ہے، مگر جاننے والوں کی نظر میں یہ کمی اس کی زیادتی اور قوت کا پیش خیمہ ہے۔

اور بعض علماءِ تفسیر نے اس آیت کو سود بیاج کی ممانعت پر محمول ہی نہیں فرمایا بلکہ اس کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ جو شخص کسی کو اپنا مال اخلاص و نیک نیتی سے نہیں، بلکہ اس نیت سے دے کہ میں اس کو یہ چیز دوں گا تو وہ مجھے اس کے بدلہ میں اس سے زیادہ دے گا، جیسے بہت سی برادریوں میں نوتا کی رسم ہے کہ وہ ہدیہ کے طور پر نہیں بلکہ بدلہ لینے کی غرض سے دی جاتی ہے، یہ دینا چونکہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنی غرض کے لئے ہے اس لئے آیت میں فرمایا کہ اس طرح اگرچہ ظاہر میں مال بڑھ جائے مگر وہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا، ہاں جو زکوٰۃ صدقات اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے دیئے جائیں ان میں اگرچہ بظاہر مال گھٹتا ہے، مگر اللہ کے نزدیک وہ دگنا اور چوگنا ہوتا جاتا ہے۔

اس تفسیر پر آیت مذکورہ کا وہ مضمون ہو جائے گا جو دوسری ایک آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا ہے، وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (۷۴: ۶) یعنی "آپ کسی پر احسان اس نیت سے نہ کریں کہ اس کے بدلہ میں کچھ مال کی زیادتی آپ کو حاصل ہو جائے گی"۔

اور سورۂ روم کی اس آیت میں بظاہر یہ دوسری تفسیر ہی راجح معلوم ہوتی ہے، اوّل تو اس لئے کہ سورۂ روم مکی ہے، جس کے لئے اگرچہ ضروری نہیں کہ اس کی ہر آیت مکی ہو، مگر غالب گمان مکی ہونے کا ضرور ہے، جب تک اس کے خلاف کوئی ثبوت نہ ملے، اور آیت کے مکی ہونے کی صورت میں اس کو حرمتِ سود کے مفہوم پر اس لئے محمول نہیں کیا جا سکتا کہ حرمتِ سود مدینہ میں نازل ہوئی ہے، اس کے علاوہ اس آیت سے پہلے جو مضمون آیا ہے اس سے بھی دوسری تفسیر ہی کا رجحان معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس سے پہلے ارشاد ہے:

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ (۳۰: ۳۸) "قرابت دار کو اس کا حق دیا کرو اور مسکین اور مسافر کو بھی، یہ ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو اللہ کی رضا کے طالب ہیں"۔

اس آیت میں رشتہ داروں اور مساکین اور مسافروں پر خرچ کرنے کے ثواب ہونے کے لئے یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اس میں نیت اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی ہو، تو اس کے بعد والی آیتِ مذکورہ میں اس کی توضیح اس طرح کی گئی کہ اگر مال کسی کو اس غرض سے دیا جائے کہ اس کا بدلہ اس کی طرف سے زیادہ ملے گا تو یہ رضا جوئیِ حق تعالیٰ کے لئے خرچ نہ ہوا

اس لئے اس کا ثواب نہ ملے گا۔

بہرحال ممانعتِ سود کے مسئلہ میں اس آیت کو چھوڑ کر بھی مذکورۃ الصدر بہت سی آیتیں آئی ہیں، جن میں سے سورۂ آلِ عمران کی ایک آیت[۱۳] میں اضعاف مضاعف سود کی حرمت بیان کی گئی ہے، اور باقی سب آیتوں میں مطلقِ سود کی حرمت کا بیان ہے، اس تفصیل سے یہ تو واضح ہوگیا کہ سود خواہ اضعاف مضاعف اور سود در سود ہو یا اکہرا سود، بہرحال حرام ہے، اور حرام بھی ایسا شدید کہ اس کی مخالفت کرنے پر اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے اعلانِ جنگ سُنایا گیا ہے۔

مسئلہ سُود و رِبا
کی کچھ مزید
تشریح و تفصیل

آجکل ربا چونکہ عام نظامِ تجارت کا رکنِ اعظم اور عمود بن گیا ہے، اس لئے جب کتاب و سنّت کی آیات و روایات میں اس کی حرمت و ممانعت سامنے آتی ہے تو عام طبائع اس کی حقیقت کو سمجھنے سمجھانے کے وقت اس کی حرمت سے ہچکچاتی ہیں، اور حیلہ جوئی کی طرف مائل ہوتی ہیں، مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ بحث کا تجزیہ کرکے اس کے ہر پہلو پر علیحدہ علیحدہ غور و فکر کرنا چاہئے، خلط ملط کرنے کا نتیجہ بحث کے اُلجھنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا، یہاں بحث کے تین حصّے ہیں:

اوّل یہ کہ قرآن و سنت میں رِبا کی کیا حقیقت ہے اور وہ کن کن صورتوں پر حاوی ہے؟

دوسرے یہ کہ اس رِبا کی حرمت و ممانعت کس حکمت و مصلحت پر مبنی ہے؟

تیسرے یہ کہ سود و ربا کتنا ہی بُرا سہی، لیکن آجکل کی دنیا میں وہ نظامِ معاشیات و تجارت کا رکنِ اعظم بن چکا ہے، اگر قرآنی احکام کے ماتحت اس کو چھوڑ دیا جائے تو نظامِ بنک و تجارت کیسے چلے گا؟

اصل ربا کی تعریف میں کبھی کوئی ابہام نہیں رہا ایک مغالطہ کا جواب

اب سنئے کہ لفظ ربوا عربی زبان کا معروف لفظ ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نزولِ قرآن سے قبل جاہلیتِ عرب میں بھی یہ لفظ متعارف تھا، اور نہ صرف متعارف بلکہ ربا کا لین دین عام طور پر جاری تھا، بلکہ سورۂ نسآء کی آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ربا کا لفظ اور اس کے معاملات زمانہ تورات میں بھی معروف تھے، اور تورات میں بھی اس کو حرام

قرار دیا گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ ایسا لفظ جو زمانہ قدیم سے عرب اور اس کے قرب وجوار میں معروف چلا آتا ہو اور اس پر لین دین کا رواج چل رہا ہے، اور قرآن اس کی حرمت وممانعت بیان کرنے کے ساتھ یہ بھی خبر دیتا ہے کہ موسیٰ علیہ السّلام کی امت پر بھی سود ربٰو حرام کیا گیا تھا، اس لفظ کی حقیقت کوئی ایسی مبہم چیز نہیں ہو سکتی جس کے سمجھنے سمجھانے میں دشواریاں پیش آئیں۔

یہی وجہ ہو کہ جب ۸ھ ہجری میں سورۂ بقرہ کی آیات ربٰو کی حرمت کے متعلق نازل ہوئیں تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے کہیں منقول نہیں کہ ان کو لفظ ربٰو کی حقیقت سمجھنے میں کوئی اشتباہ پیش آیا ہو، اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے دوسرے معاملات کی طرح اس کی تحقیق کی نوبت آئی ہو، بلکہ جس طرح شراب کی حرمت نازل ہوتے ہی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس پر عمل کیا، اسی طرح ربٰو کی حرمت نازل ہوتے ہی ربٰو کے سب معاملات ترک کر دیئے، پچھلے زمانہ کے معاملات میں مسلمانوں کا جو ربٰو غیر مسلموں کے ذمہ واجب الادا تھا وہ بھی مسلمانوں نے چھوڑ دیا اور جو غیر مسلموں کا مسلمانوں کے ذمہ واجب الادا تھا، اور مسلمان نزولِ ممانعت کے بعد اس کو دینا نہیں چاہتے تھے اس کا جھگڑا امیر مکہ کی عدالت میں پیش ہوا، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، تو اس کا فیصلہ سورۂ بقرہ کی آیات میں آسمان سے نازل ہوا کہ پچھلے زمانہ کے بقایا ربٰو کا لین دین بھی اب جائز نہیں۔

اور اس میں چونکہ غیر مسلموں کو یہ شکایت کا موقع مل سکتا تھا کہ ایک اسلامی حکم شرعی کی وجہ سے ہمارا روپیہ کیوں مارا جائے، تو اس کے ازالہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں یہ واضح کر دیا کہ اس حکمِ شرعی کا اثر صرف غیر مسلموں پر نہیں، بلکہ مسلمانوں پر بھی یکساں ہے، اور سب سے پہلے جو سود کی رقم چھوڑی گئی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی کثیر التعداد رقم تھی۔

الغرض ربٰو کی ممانعت ہونے کے وقت ربٰو کا مفہوم کچھ مخفی نہ تھا، عام طور پر معروف تھا وہی ربا جس کو عرب ربٰو کہتے تھے، اور اس کا لین دین کرتے تھے، قرآن نے حرام کیا، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو صرف اخلاقی انداز میں نہیں، بلکہ قانونِ مُلک کی حیثیت سے نافذ فرمایا، البتہ بعض ایسی صورتوں کو بھی آپؐ نے ربا میں شامل قرار دیا جس کو عام طور پر ربٰو نہیں سمجھا جاتا تھا، انھیں صورتوں کی تعیین میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اشکال پیش آیا، اور انہی میں ائمہ مجتہدین کے نظریات میں اختلاف ہوا، ورنہ اصل ربا جس کو عرب ربٰو کہتے تھے نہ اس میں کسی کو اشتباہ کا موقع تھا، نہ اس میں کسی کا اختلاف ہوا۔

اب سنئے عرب کا مروّجہ ربا کیا تھا؟ امام تفسیر ابن جریرؒ نے حضرت مجاہدؒ سے نقل کیا ہے کہ جو ربا جاہلیت میں جاری تھا اور قرآن نے اسے منع کیا وہ یہ تھا کہ کسی کو ایک میعاد معین کے لئے قرض دے کر اس پر اصل راس المال سے زائد مقررہ زیادتی لیتے تھے، اور اگر میعاد مقررہ پر وہ قرض ادا نہ کرسکا تو مزید میعاد اس شرط پر بڑھادیتے تھے کہ سود میں اضافہ کیا جائے، یہی مضمون حضرت قتادہؒ اور دوسرے حضرات ائمہ تفسیر سے نقل کیا ہے (تفسیر ابن جریر، ص ۶۲ ج ۳)

اندلس کے مشہور امام تفسیر ابوحیان غرناطی کی تفسیر بحر محیط میں بھی جاہلیت کے رباء کی یہی صورت لکھی ہے کہ اُدھار دے کر اس پر نفع لیتے اور جتنی مدت ادھار کی بڑھ جائے اُتنا ہی سُود اس پر بڑھادینے کا نام ربا تھا، اسی جاہلیتِ عرب کے لوگ یہ کہتے تھے کہ جیسے بیع و شراء میں نفع لینا جائز ہے اسی طرح اپنا روپیہ ادھار دے کر نفع لینا بھی جائز ہونا چاہئے، قرآن کریم نے اس کو حرام قرار دیا، اور بیع و رباء کے احکام کا مختلف ہونا واضح فرمایا۔

یہی مضمون تمام مستند کتب تفسیر ابن کثیر، تفسیر کبیر، اور روح المعانی وغیرہ میں معتبر روایات کے ساتھ منقول ہے۔

ابن عربیؒ نے احکام القرآن میں فرمایا: اَلرِّبٰوا فِی اللُّغَةِ الزِّیَادَةُ وَالْمُرَادُ بِهٖ فِی الْاٰیَةِ کُلُّ زِیَادَةٍ لَّا یُقَابِلُهَا عِوَضٌ (ص ۱۰۱ ج ۲) یعنی رباء کے معنی اصل لغت میں زیادتی کے ہیں، اور آیت میں اس سے مراد وہ زیادتی ہے جس کے مقابلہ میں کوئی مال نہ ہو، بلکہ محض اُدھار اور اس کی میعاد ہو، امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ رباء کی دو قسمیں ہیں، ایک معاملاتِ بیع و شراء کے اندر رباء، دوسرے ادھار کا رباء، اور جاہلیتِ عرب میں دوسری قسم ہی رائج اور معروف تھی کہ وہ اپنا مال کسی کو معیّن میعاد کے لئے دیتے تھے، اور ہر مہینہ اس کا نفع لیتے تھے، اور اگر میعاد معیّن پر ادائیگی نہ کرسکا، تو میعاد اور بڑھادی جاتی تھی، بشرطیکہ وہ سود کی رقم اور بڑھادیتے، یہی جاہلیت کا رباء تھا جس کو قرآن نے حرام کیا۔

امام جصاصؒ نے احکام القرآن میں رباء کے معنی یہ بیان فرماتے ہیں:

هُوَ الْقَرْضُ الْمَشْرُوْطُ فِیْهِ الْاَجَلُ وَزِیَادَةُ مَالٍ عَلَی الْمُسْتَقْرِضِ	"یعنی وہ قرض ہے جس میں کسی میعاد کے لئے اس شرط پر قرض دیا جائے کہ قرضدار اس کو اصل مال سے زائد کچھ رقم ادا کرے گا"

حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رباء کی تعریف یہ فرمائی ہے:

کل قرض جر نفعا فھو ربا	"یعنی جو قرض نفع حاصل کرے وہ ربا ہے"

یہ حدیث جامع صغیر میں ہے اور عزیزی نے اس کو حسن کہا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اُدھار دے کر اس پر نفع لینے کا نام ربا ہے جو جاہلیتِ عرب کے زمانہ میں رائج اور معروف تھا، جس کو قرآن کریم کی آیتِ مذکورہ نے صراحۃً حرام قرار دیا، اور ان آیات کے نازل ہوتے ہی صحابہ کرامؓ نے اس کو چھوڑ دیا، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قانونی خصومات میں اس کو نافذ فرمایا، اس میں نہ کوئی ابہام تھا نہ اجمال، نہ اس میں کسی کو کوئی اشتباہ و اشکال پیش آیا۔

البتہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے رباء کے مفہوم میں بیع و شراء کی چند صورتوں کو بھی داخل فرمایا جن کو عرب رباء نہ سمجھتے تھے، مثلاً چھ چیزوں کی بیع و شراء میں یہ حکم دیا کہ اگر ان کا تبادلہ کیا جائے تو برابر سرابر ہونا چاہئے، اور نقد دست بدست ہونا چاہئے، اس میں کمی بیشی کی گئی یا ادھار کیا گیا تو وہ بھی ربا ہے، یہ چھ چیزیں سونا، چاندی، گیہوں، جو، کھجور اور انگور ہیں۔

اسی اصول کے ماتحت عرب میں معاملات کی جو چند صورتیں مزابنہ اور محاقلہ کے نام سے رائج تھیں آیاتِ رباء نازل ہونے کے بعد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو رباء میں شامل قرار دے کر منع فرمایا (ابن کثیر بحوالہ مستدرک حاکم، ص ۳۲۷ ج ۱)

اس میں یہ بات قابلِ غور تھی کہ ان چھ چیزوں کی خصوصیت ہے، یا اُن کے علاوہ اور بھی کچھ چیزیں ان کے حکم میں ہیں، اور اگر ہیں تو ان کا ضابطہ کیا ہے، کس کس صورت کو داخل ربا سمجھا جائے، یہی اشکال حضرت فاروق اعظمؓ کو پیش آیا، جس کی بناء پر فرمایا:-

ان اٰیۃ الربٰوا من اٰخر ما نزل من القراٰن وان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قبض قبل ان یبینہ لنا فدعوا الربٰوا والریبۃ (احکام القرآن، جصاص، ص ۵۵۱، وتفسیر ابن کثیر بحوالہ ابن ماجہ، ص ۳۲۸ ج ۱)	"یعنی آیتِ ربا قرآن کی آخری آیتوں میں ہے اس کی پوری تفصیلات بیان فرمانے سے پہلے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی، اس لئے اب احتیاط لازم ہے، ربا کو تو چھوڑنا ہی ہے جس صورت میں ربا کا شبہ بھی ہو اس کو بھی چھوڑ دینا چاہئے"۔

ے مزابنہ یہ ہے کہ درخت پر لگے ہوئے پھل کو ٹوٹے ہوئے پھلوں کے بدلے میں اندازہ سے فروخت کیا جائے، اور محاقلہ یہ کہ کھڑے کھیت کے غلہ گندم چنا وغیرہ کو خشک صاف کئے ہوئے غلہ گندم یا چنے سے اندازہ لگا کر فروخت کیا جائے، اندازہ میں چونکہ کمی بیشی کا امکان رہتا ہے، اس لئے اس کو منع کیا گیا ۱۲ منہ

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی مراد معاملات بیع و شراء کی وہ صورتیں اور ان کی تفصیلات ہیں جو جاہلیتِ عرب میں ربا، نہیں سمجھی جاتی تھیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ربا، میں داخل قرار دے کر حرام فرمایا، باقی اصل ربا، جو تمام عرب میں معروف و مشہور تھا اور صحابۂ کرامؓ نے اس کو چھوڑا، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا قانون نافذ فرمایا، اور حجۃ الوداع کے خطبہ میں اس کا اعلان کیا، اس میں فاروق اعظمؓ کو کوئی اشکال یا اشتباہ ہونے کا کوئی امکان نہیں، پھر جب فاروق اعظمؓ کو ربا، کی جن خاص صورتوں میں اشتباہ پیش آیا تو اس کا حل یہ تجویز فرمایا کہ جن صورتوں میں ربا، کا شبہ بھی ہو ان کو بھی چھوڑ دیا جائے۔

مگر حیرت ہے کہ آج بعض وہ لوگ جو یورپ کی ظاہری ٹیپ ٹاپ اور دولت مندی اور موجودہ نظامِ تجارت وغیرہ میں سود کے رکن بن جانے سے مرعوب ہیں، انھوں نے فاروق اعظمؓ کے اس ارشاد کا یہ نتیجہ نکالا کہ ربا کا مفہوم ہی مجمل رہ گیا تھا، اس لئے اس میں رائے کی گنجائش ہے، جس کے غلط ہونے کا کافی مواد سامنے آچکا ہے، احکام القرآن میں ابن عربیؒ نے ان لوگوں پر سخت انکار کیا ہے جنھوں نے اس فاروقی ارشاد کی بناء پر آیاتِ ربا، کو مجمل کہا تھا۔

ابن عربیؒ نے احکام القرآن میں فرمایا:

اِنَّ مَنْ زَعَمَ اَنَّ هٰذِهِ الْاٰيَةَ مُجْمَلَةٌ فَلَمْ يَفْهَمْ مَقَاطِعَ الشَّرِيْعَةِ فَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ اِلٰى قَوْمٍ هُوَ مِنْهُمْ بِلُغَتِهِمْ وَاَنْزَلَ عَلَيْهِ كِتَابَهٗ تَيْسِيْرًا مِّنْهُ بِلِسَانِهٖ وَلِسَانِهِمْ وَالرِّبَا فِي اللُّغَةِ الزِّيَادَةُ وَالْمُرَادُ بِهٖ فِي الْاٰيَةِ كُلُّ زِيَادَةٍ لَا يُقَابِلُهَا عِوَضٌ۔

"یعنی جس نے یہ کہا کہ یہ آیت مجمل ہے، اس نے شریعت کی تصریحات کو نہیں سمجھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو ایسی قوم کی طرف بھیجا کہ وہ خود اسی قوم میں سے تھے انہی کی زبان میں بھیجا، اُن پر اپنی کتاب آسانی کے لئے انہی کی زبان میں نازل فرمائی اور لفظ ربا کے معنی ان کی زبان میں زیادتی کے ہیں، اور مراد آیت میں وہ زیادتی ہے جس کے مقابلہ میں مال نہیں بلکہ میعاد ہے"۔

اور امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں فرمایا کہ ربا کی دو قسمیں ہیں، ایک اُدھار کا ربا دوسرے نقد بیع میں زیادہ لینے کا ربا، پہلی قسم وہ ہے جو زمانۂ جاہلیت میں مشہور و معروف تھی، اور اہلِ جاہلیت اس کا لین دین کرتے تھے، اور دوسری قسم وہ ہے جو حدیث نے بیان کی، کہ فلاں فلاں چیزوں کی بیع و شراء میں کمی زیادتی ربا میں داخل ہے۔

اور احکام القرآن جصاص میں ہے کہ ربا، کی دو قسمیں ہیں، ایک بیع و شراء کے اندر

دوسری بغیر بیع و شراء کے اور زمانہ جاہلیت کا ربٰو یہی دوسری قسم کا تھا، اور اس کی تعریف یہ ہو کہ وہ قرض جس میں بحساب میعاد کوئی نفع لیا جائے، اور یہی مضمون ابن رشد نے بدایۃ المجتہد میں لکھا ہے، اور قرض اُدھار پر نفع لینے کے ربا کا حرام ہونا قرآن، سنت اور اجماعِ امت سے ثابت کیا ہے۔

امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں اس موضوع پر بڑی تفصیل سے کلام کرتے ہوئے یہ بتلایا ہے کہ قرآن میں جو ربا مذکور ہے اس سے جلی اور واضح طور پر وہ ربا مراد ہے جو قرض اُدھار پر لیا دیا جاتا تھا، اور اسی کو زمانۂ جاہلیت میں ربا کہا جاتا تھا، اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور آپؐ کی سنت سے دوسری قسم کے رباء کا علم ہوا، جو خاص خاص اقسام بیع و شراء میں کمی زیادتی یا اُدھار کرنے کا نام ہے، اور اس ربا کے حرام ہونے پر بھی احادیثِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم متواتر آئی ہیں، مگر اس قسم کے ربا کی تفصیلات پوری واضح نہ ہونے کے سبب اس میں بعض صحابہ کرامؓ کو اشکال پیش آیا، اور فقہاء کے اختلافات ہوئے (معانی الآثار ص ۲۳۲ ج ۲)

اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں فرمایا ہے کہ ربا ایک حقیقی ہے اور ایک وہ جو بحکم ربا ہے، حقیقی ربا قرض ادھار پر زیادتی لینے کا نام ہے، اور بحکم ربا وہ ہے جس کا بیان حدیث میں آیا کہ بعض خاص چیزوں کی بیع میں زیادتی لینے کو ربا کہا گیا ہے، اور ایک حدیث میں جو آیا ہے لا ربا الا فی النسیئۃ (رواہ البخاری) یعنی ربا صرف ادھار میں ہے، اس کا یہی مطلب ہے کہ حقیقی اور اصلی ربا جس کو عام طور پر ربا سمجھا اور کہا جاتا ہے وہ اُدھار پر نفع لینے کا نام ہے اس کے سوا جتنی اقسام اس کے ساتھ ملحق کی گئی ہیں وہ سب حکماً ربٰو میں داخل ہیں۔

اس تفصیل سے چند چیزیں واضح ہوگئیں

اوّل یہ کہ نزولِ قرآن سے پہلے ربا ایک متعارف چیز تھی، قرض ادھار پر بحساب میعاد زیادتی لینے کو ربا کہا جاتا تھا۔

دوسرے یہ کہ قرآن میں حرمتِ ربا نازل ہوتے ہی سب صحابہ کرامؓ نے اس ربا کو ترک کر دیا، اس کے معنے سمجھنے سمجھانے میں کسی کو نہ اشکال پیش آیا نہ اشتباہ۔

تیسرے یہ کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ چیزوں کے بارہ میں یہ ارشاد فرمایا کہ ان کی باہمی بیع و شراء میں برابری شرط ہے، کمی بیشی ربا میں داخل ہے، اور ان میں اُدھار

کرنا بھی ربا میں داخل ہے، یہ چھ چیزیں سونا، چاندی، گیہوں، جَو، کھجور، انگور ہیں، اور اسی قانون کے تحت عرب میں مرّوجہ اقسامِ بیع مزابنہ، محاقلہ وغیرہ کو حرام قرار دیا گیا، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں چھ چیزوں کی بیع و شراء میں کمی بیشی اور ادھار کو تو صراحۃً ربا میں داخل کر کے حرام قرار دید یا تھا، لیکن اس میں یہ بات محل تفقہ و اجتہاد تھی کہ یہ حکم ان چھ چیزوں کے ساتھ مخصوص ہے یا دوسری اشیاء میں بھی ہے، اور اس کا ضابطہ کیا ہے؟ اس ضابطہ میں فقہاء نے اپنے اپنے غور و فکر اور اجتہاد سے مختلف صورتیں تجویز کیں، اور چونکہ یہ ضابطہ خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان نہ فرمایا تھا اس میں اشتباہ رہنے کے سبب حضرت فاروق اعظمؓ نے اس پر اظہار افسوس کیا کہ کاش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی اس کا کوئی ضابطہ بیان فرما دیتے تو مشتبہ حالات میں اطمینان پیدا ہو جاتا، اور پھر یہ ارشاد فرمایا کہ جہاں ربا کا شبہ بھی ہو اس سے بچنا چاہیئے۔

چوتھے یہ معلوم ہوا کہ اصلی اور حقیقی ربا جس کو فقہاء نے ربوٰا القرآن یا ربوٰا القرض کے نام سے موسوم کیا ہے وہی ہے جو عرب میں متعارف تھا یعنی قرض ادھار پر بحساب میعاد نفع لینا، دوسری قسم کے ربا جو حدیث میں بتلائے گئے وہ سب اسی ربا کے ساتھ ملحق اور اسی کے حکم میں ہیں، اور جو کچھ خلاف و اختلاف امّت میں ہوا وہ سب اسی دوسری قسم کے معاملاتِ ربا میں ہوا، پہلی قسم کا رِبا جو رِبا القرآن کہلاتا ہے اس کے حرام ہونے میں پوری امّتِ محمدیہ میں کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا۔

اور آجکل جو رِبا انسانی معاشیات کا مدار سمجھا جاتا ہے، اور مسئلۂ سود میں جو زیرِ بحث ہے وہ یہی ربا ہے، جس کی حرمت قرآن کی سات آیات اور چالیس سے زیادہ احادیث اور اجماعِ امّت سے ثابت ہے۔

ربا کی دوسری قسم جو بیع و شراء کے ضمن میں ہوتی ہے نہ اس کا رواج عام ہے نہ اس میں کوئی بحث کرنے کی ضرورت ہے۔

یہاں تک یہ بات واضح ہو گئی کہ قرآن و سنت میں ربا کی حقیقت کیا ہے جو مسئلۂ سود کی پہلی بات ہے۔

حرمتِ سود کی حکمت و مصلحت اس کے بعد دوسری بحث اسکی ہے کہ ربا کی حرمت و ممانعت کس حکمت و مصلحت پر مبنی ہے، اور اس میں وہ کونسی رُوحانی یا معاشی مضرتیں ہیں، جن کی وجہ سے اسلام نے اس کو اتنا بڑا گناہ قرار دیا ہے۔

اس جگہ پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ دنیا کی ساری مخلوقات اور ان کے معاملات

میں ایسی کوئی چیز نہیں جس میں کوئی بھلائی یا فائدہ نہ ہو، سانپ، بچھو، بھیڑیا، شیر اور سنکھیا جیسے زہرِ قاتل میں بھی انسان کے لئے ہزاروں فوائد ہیں ؎

کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

چوری، ڈاکہ، بدکاری، رشوت، ان میں کوئی ایسی چیز نہیں جس میں کچھ نہ کچھ فائدہ نہ ہو، مگر ہر مذہب و ملت اور ہر مکتبِ فکر میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس چیز کے منافع زیادہ اور مضرتیں کم ہیں ان کو نافع و مفید کہا جاتا ہے، اور جن کے مفاسد و مضرات زیادہ اور منافع کم ہیں ان کو مضر اور بیکار سمجھا جاتا ہے، قرآن کریم نے بھی شراب اور قمار کو حرام قرار دیتے ہوئے اس کا اعلان فرمایا کہ ان میں بڑے گناہ بھی ہیں، اور لوگوں کے کچھ منافع بھی، مگر ان کے گناہ کا وبال منافع کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے، اس لئے ان چیزوں کو اچھا یا مفید نہیں کہا جا سکتا بلکہ ان کو نہایت مضر اور تباہ کن سمجھ کر ان سے اجتناب لازم ہے۔

ربا، یعنی سود کا بھی یہی حال ہے، اس میں سود خور کے لئے کچھ وقتی نفع ضرور نظر آتا ہے، لیکن اس کا دنیوی اور اخروی وبال اس نفع کے مقابلہ میں نہایت شدید ہے۔

ہر چیز کے نفع و نقصان یا مفاسد و مصالح کا موازنہ کرنے میں یہ بات بھی ہر عقلمند کے نزدیک قابلِ نظر ہوتی ہے کہ اگر کسی چیز میں نفع محض وقتی اور ہنگامی ہو اور نقصان اس کا دیرپا یا دائمی تو اس کو کوئی عقلمند مفید اشیاء کی فہرست میں شمار نہیں کر سکتا، اسی طرح اگر کسی چیز کا نفع شخصی اور انفرادی ہو اور اس کا نقصان پوری ملت اور جماعت کو پہنچتا ہو تو اس کو بھی کوئی ہوشمند انسان مفید نہیں کہہ سکتا، چوری اور ڈاکہ میں چور ڈاکو کا تو نفع کھلا ہوا ہے، مگر وہ پوری ملت کے لئے مضر اور ان کے امن و سکون کو برباد کرنے والا ہے، اسی لئے کوئی انسان چوری اور ڈاکہ کو اچھا نہیں کہتا۔

اس تمہید کے بعد مسئلہ سود پر نظر ڈالئے تو اس میں ذرا سا غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس میں سود خور کے وقتی اور ہنگامی نفع کے مقابلہ میں اس کا روحانی اور اخلاقی نقصان اتنا شدید ہے کہ وہ اس کو انسانیت سے نکال دیتا ہے، اور یہ کہ اس کا جو وقتی نفع ہے وہ بھی صرف اس کی ذات کا نفع ہے، اس کے مقابلہ میں پوری ملت کو نقصانِ عظیم اور معاشی بحران کا شکار ہونا پڑتا ہے، لیکن دنیا کا حال یہ ہے کہ جب اس میں کوئی چیز رواج پا جاتی ہے تو اس کی خرابیاں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں، اور صرف اس کے فوائد سامنے رہ جاتے ہیں، اگرچہ وہ فوائد کتنے ہی حقیر و ذلیل اور ہنگامی ہوں اس کے نقصانات کی طرف دھیان نہیں جاتا اگرچہ وہ کتنے ہی شدید اور عام ہوں۔

رسم و رواج طبائع انسانی کے لئے ایک کلوروفارم ہے جو اس کو بے حس بنا دیتا ہے، بہت کم افراد ہوتے ہیں جو چلے ہوئے رسم و رواج پر تحقیقی نظر ڈال کر یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اس میں فائدے کتنے ہیں اور نقصان کتنا، بلکہ اگر کسی کے متنبہ کرنے سے اس کے نقصانات سامنے بھی آجائیں، تو پابندیِ رسم و رواج اس کو صحیح راستہ پر نہیں آنے دیتی۔

سود و ربا اس زمانہ میں ایک وبائی مرض کی صورت اختیار کر چکا ہے اور اس کا رواج ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے، اس نے انسانی فطرت کا ذائقہ بدل دیا ہے کہ کڑوے کو میٹھا سمجھنے لگی، اور جو چیز پوری انسانیت کے لئے معاشی بربادی کا سبب ہے، اس کو معاشی مسئلہ کا حل سمجھا جانے لگا، آج اگر کوئی مفکر محقق اس کے خلاف آواز اٹھاتا ہے تو اس کو دیوانہ سمجھا جاتا ہے۔

یہ سب کچھ ہے، لیکن وہ ڈاکٹر ڈاکٹر نہیں بلکہ انسانیت کا ڈاکو ہے جو کسی ملک میں وبا پھیل جانے کو اور علاج کے غیر مؤثر ہونے کا مشاہدہ کرنے کی بناء پر اب یہ طے کرے کہ لوگوں کو یہ سمجھائے کہ یہ مرض مرض ہی نہیں، بلکہ عین شفا اور عین راحت ہے، ماہر ڈاکٹر کا کام ایسے وقت میں بھی یہی ہے کہ لوگوں کو اس مرض اور اس کی مضرت سے آگاہ کرتا رہے، اور علاج کی تدبیریں بتاتا رہے۔

انبیاء علیہم السلام اصلاحِ خلق کے ذمہ دار ہو کر آتے ہیں، وہ کبھی اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ کوئی ان کی بات سنے گا یا نہیں، وہ اگر لوگوں کے سننے اور ماننے کا انتظار کیا کرتے تو ساری دنیا کفر و شرک ہی سے آباد ہوتی، کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا ماننے والا اُس وقت کون تھا جب کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی تبلیغ و تعلیم کا حکم منجانب اللہ ملا تھا؟

سود و ربا کو اگرچہ آج کی معاشیات میں ریڑھ کی ہڈی سمجھا جانے لگا ہے، لیکن حقیقت وہ ہے جو آج بھی بعض حکمائے یورپ نے تسلیم کی کہ وہ معاشیات کے لئے ریڑھ کی ہڈی نہیں بلکہ ریڑھ کی ہڈی میں پیدا ہو جانے والا ایک کیڑا ہے، جو اس کو کھا رہا ہے۔

مگر افسوس ہے کہ آجکل کے اہلِ علم و فن بھی کبھی رسم و رواج کے تنگ دائرہ سے آزاد ہو کر اس طرف نظر نہیں کرتے، اور سیکڑوں برس کے تجربے بھی ان کو اس طرف متوجہ نہیں کرتے کہ سود و ربا کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عام خلقِ خدا اور تمام ملت فقر و فاقہ اور معاشی بحران کا شکار ہو، اور وہ غریب سے غریب تر ہوتے چلے جائیں، اور چند سرمایہ دار پوری ملت کے مال سے فائدہ اٹھا کر، یا یوں کہئے کہ ملت کا خون چوس کر اپنا بدن بڑھاتے اور پالتے چلے جائیں، اور حیرت ہے کہ جب کبھی ان حضرات کے سامنے اس حقیقت کو بیان

کیا جاتا ہو، تو اس کے جھٹلانے کے لئے ہمیں امریکہ، اور انگلینڈ کے بازاروں میں لے جا کر سود کی برکات کا مشاہدہ کرانا چاہتے ہیں، اور یہ دکھلانا چاہتے ہیں کہ یہ لوگ سود و ربا کی بدولت کیسے پھلے اور پھولے ہیں، لیکن اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی مردم خوروں کی کسی قوم اور ان کے عمل کی برکات کا مشاہدہ کرانے کے لئے آپ کو مردم خوروں کے محلہ میں لے جا کر یہ دکھلائے کہ یہ کتنے موٹے تازے اور تندرست ہیں، اور اس سے یہ ثابت کرے کہ ان کا یہ عمل بہترین عمل ہے۔

لیکن اس کو کسی سمجھ دار آدمی سے سابقہ پڑے تو وہ کہے گا کہ تم مردم خوروں کے عمل کی برکات مردم خوروں کے محلہ میں نہیں دوسرے محلوں میں جا کر دیکھو جہاں سیکڑوں ہزاروں مُردے پڑے ہوئے ہیں جن کا خون اور گوشت کھا کر یہ درندے پلے ہیں، اسلام اور اسلامی شریعت کبھی ایسے عمل کو درست اور مفید نہیں مان سکتی جس کے نتیجہ میں پوری انسانیت اور ملّت تباہی کا شکار ہو، اور کچھ افراد یا ان کے جتھے پھُولتے پھلتے چلے جائیں۔

سُود و ربا کی معاشی خرابیاں

سود و ربا میں اگر کوئی دوسرا عیب بھی اس کے سوا نہ ہوتا کہ اس کے نتیجہ میں چند افراد کا نفع اور پوری انسانیت کا نقصان ہے تو یہی اس کی ممانعت اور قابلِ نفرت ہونے کے لئے کافی تھا، حالانکہ اس میں اس کے علاوہ اور بھی معاشی خرابیاں اور روحانی تباہ کاریاں پائی جاتی ہیں۔

پہلے اس کو سمجھئے کہ سود کے ذریعہ ملّت کی تباہی اور خاص افراد کا نفع کیونکر ہے، سود و ربا کے مہاجنی اور دفتر سودہ طریقہ میں تو ایسا بھونڈا پن تھا کہ عام ملّت کا ضرر اور کسی خاص فرد کا نفع ہر موٹی عقل والے کو بھی سمجھ میں آجاتا تھا، مگر آجکل کی نئی روشنی جس کو نئی اندھیری کہنا زیادہ موزوں ہے، اس نے جس طرح شراب کو مشینوں میں صاف کر کے چوری اور ڈاکہ کی نئی نئی صورتیں ایجاد کر کے بدکاری و بے حیائی کے نئے نئے ڈھنگ نکال کر کے سب کو ایسا مہذب بنالیا ہے کہ سطحی نظر والوں کو اس کی اندرونی خرابیاں نظر نہ آئیں، اسی طرح ربا اور سود کے لئے بجائے شخصی دُکانوں کے مشترک کمپنیاں بنالی ہیں جن کو بینک کہا جاتا ہے، اور اب دنیا کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کے لئے یہ بتلایا جاتا ہے کہ ربا کے اس جدید طریقہ سے پوری ملت کا فائدہ ہے، کیونکہ عوام جو اپنے روپے سے تجارت کرنا نہیں جانتے یا قلتِ سرمایہ کی بناء پر نہیں کر سکتے ان سب کا روپیہ بینکوں میں جمع ہو کر ان میں سے ہر ایک کو گو قلیل ہی سہی کچھ نہ کچھ نفع سود کے نام سے مل جاتا ہے، اور بڑے تاجروں کو یہ موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ بینکوں سے سودی قرض لے کر بڑی تجارت کر کے فائدہ اٹھاتے ہیں، اس طرح سود ایسی مبارک چیز بن گئی کہ

ساری ملت کے افراد کو اس سے نفع پہنچ رہا ہے۔

لیکن ذرا انصاف سے کام لیا جائے تو یہ وہ ابلہ فریبی ہے جو شراب کی گندی بھٹیوں کو صاف ستھرے ہوٹلوں میں اور عصمت فروشی کے اڈوں کو سنیماؤں اور شبینہ کلبوں میں تبدیل کر کے زہر کو تریاق اور مضر کو مفید بنا کر دکھلانے کے لئے عمل میں لائی گئی ہے اور جس طرح اہلِ بصیرت پر یہ بات روشن ہے کہ اخلاق سوز جرائم کو جدید غلاف پہنانے کا نتیجہ اس کے سوا نہیں کہ یہ جرائم پہلے سے زیادہ ہوگئے، اور ان کا زہر پہلے سے زیادہ تیز ہوگیا، اسی طرح سود و ربا کی اس نئی شکل نے سود کے چند آنے فی سیکڑہ عوام کے منہ کو لگا کر ایک طرف ان کو اپنے جُرم کا شریک کرلیا، اور دوسری طرف اپنے لئے اس جرم کے ارتکاب کا غیر محدود میدان فراہم کرلیا۔

کون نہیں جانتا کہ یہ چند آنے فی سیکڑہ کا سود جو سیونگ بینکوں اور ڈاکخانہ جات سے لوگوں کو ملتا ہے یہ کسی طرح اُن کے معاش کی کفالت نہیں کرسکتا، اس لئے وہ مجبور رہیں کہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے کوئی مزدوری یا ملازمت تلاش کریں، تجارت کی طرف اوّل تو ان کی نظر خود نہیں جاتی، اور اگر کسی کو اس طرف توجہ بھی ہو جائے تو پوری ملت کا سرمایہ بینکوں میں جمع ہو کر جو صورت تجارت کی بن گئی ہے اس میں کسی چھوٹے سرمایہ والے کو داخل ہونا خود اپنی موت کو دعوت دینے سے کم نہیں، کیونکہ بینک کوئی بڑا سرمایہ قرض پر صرف اسی کو دے سکتے ہیں جس کی بازار میں اپنی ساکھ ہو اور بڑا کاروبار ہو، دس لاکھ کے مالک کو ایک کروڑ قرض مِل سکتا ہے، وہ اپنے ذاتی روپے کی نسبت سے دس گنا زیادہ کی تجارت چلا سکتا ہے، اور تھوڑے سرمایہ والے کی نہ کوئی ساکھ ہوتی ہے نہ بینک اس پر اعتماد کرتے ہیں، کہ ان کو دس گنا زیادہ قرض دیدیں، ایک ہزار کی مالیت والے کو دس ہزار تو کیا ایک ہزار ملنا بھی مشکل ہے، اور جب کہ ایک شخص جو ایک لاکھ کی ملکیت رکھنے والا ہو نو لاکھ بنک کا سرمایہ لگا کر دس لاکھ کی تجارت کرتا ہے، اور فرض کر لیجئے کہ اس کو ایک روپیہ فی صد نفع ہوتا ہے تو گویا اس کو اپنے ایک لاکھ پر دس فی صد نفع ہوا، اس کے بالمقابل اگر کوئی شخص صرف اپنے ذاتی روپے سے ایک لاکھ کی تجارت کرتا ہے اس کو ایک لاکھ پر صرف ایک ہی فی صد کا نفع ہوگا، جو اس کے ضروری اخراجات کے لئے بھی کافی نہ ہوں گے، اُدھر مارکیٹ میں بڑے سرمایہ والے کو خام سامان جس نرخ اور رعایت کے ساتھ ملتا ہے وہ چھوٹے سرمایہ والے کو میسّر نہیں آسکتا، اس لئے چھوٹے سرمایہ والا مفلوج اور محتاج ہو کر رہ جاتا ہے، اور اگر اس کی شامت آئی، اور اس نے بھی کسی ایسی تجارت میں ہاتھ ڈال دیا تو بڑے سرمایہ والا اس کو اپنی خدائی کا شریک

سمجھ کر کچھ اپنی گرہ سے نقصان اٹھا کر بھی بازار کو ایسا ڈاؤن کر دیتا ہے کہ چھوٹے سرمایہ والا اصل اور نفع سب سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تجارت صرف اُن چند افراد میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے جو بڑے سرمایہ دار ہیں۔

۱۔ یہ ملّت پر کتنا بڑا ظلم ہے کہ ساری ملّت اصلی تجارت سے محروم ہو کر صرف بڑے سرمایہ داروں کی دست نگر بن جائے، ان کو وہ جتنا نفع دینا چاہیں بخشش کے طور پر دیدیں۔

۲۔ اور دوسرا اس سے بڑا نقصان جس کی زد میں پورا ملک آجاتا ہے یہ ہے کہ ایسی صورت میں اشیاء کے نرخ پر ان بڑے سرمایہ داروں کا قبضہ ہو جاتا ہے، وہ گراں سے گراں فروخت کر کے اپنی گرہ مضبوط کر لیتے اور پوری ملّت کی گرہیں کھلوا لیتے ہیں، اور قیمت بڑھانے کے لئے جب چاہیں مال کی فروخت بند کر دیتے ہیں، اگر ساری ملّت کا سرمایہ بنکوں کے ذریعہ کھینچ کر ان خود غرض لوگوں کی پرورش نہ کی جاتی اور یہ مجبور ہوتے کہ صرف اپنے ذاتی سرمایہ سے تجارت کریں، تو نہ چھوٹے سرمایہ والوں کو یہ مصیبت پیش آتی، اور نہ یہ خود غرض درندے پوری تجارت کے ناخدا بنتے، چھوٹے سرمایہ والوں کی تجارت کے منافع سامنے آتے تو دوسروں کا حوصلہ بڑھتا، تجارت کا کاروبار عام ہوتا، جس سے ہر ایک کا اسٹاف علیحدہ ہوتا، جس سے ہزاروں حاجتمندوں کی روزی پیدا ہوتی، اور تجارتی نفع بھی عام ہوتا، اور اشیاء کی ارزانی پر بھی یقینی اثر پڑتا، کیونکہ باہمی مقابلہ (کمپیٹیشن) ہی ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ کوئی آدمی اس پر تیار ہوتا ہے کہ اپنا نفع کم کرے، اس عیارانہ طریق کار نے پوری قوم کو ایک مہلک بیماری لگا دی اور دوسرے اس کی ذہنیت خراب کر دی کہ اس بیماری ہی کو شفا سمجھی۔

۳۔ بنکوں کے سود سے ملّت کا ایک تیسرا معاشی نقصان اور دیکھئے کہ جس شخص کا سرمایہ دس ہزار ہے، اور وہ بنک سے سودی قرض لے کر ایک لاکھ کا بیوپار کرتا ہے، اگر کہیں اس کا سرمایہ ڈوب گیا، اور تجارت میں اس کو نقصان پہنچ گیا، اور وہ دیوالیہ ہو گیا، تو غور کیجئے کہ نقصان صرف دس فی صد تو اس پر پڑا، باقی نوّے فی صد نقصان پوری ملّت کا ہوا، جن کا سرمایہ بنک سے لیکر اس نے لگایا تھا، اگر بنک نے دیوالیہ کے نقصان کو سر دست خود ہی برداشت کر لیا، تو یہ ظاہر ہے کہ بنک تو قوم کی جیب ہے، اس کا نقصان انجام کار قوم پر عائد ہوگا، جس کا حاصل یہ ہوا کہ سرمایہ دار کو جب تک نفع ہوتا رہا تو نفع کا وہ تنہا مالک تھا، اس میں ملّت کے لئے کچھ نہ تھا یا برائے نام تھا، اور جب نقصان آیا تو نوّے فی صد نقصان پوری ملّت پر پڑ گیا۔

۴ - سود سے ایک معاشی نقصان یہ بھی ہے کہ سود خور جب گھاٹے میں آجاتے تو پھر وہ پنپنے کے قابل نہیں رہتا، کیونکہ اتنا سرمایہ تو تھا نہیں جس کے نقصان کو یہ برداشت کرسکے، نقصان کے وقت اس پر دوہری مصیبت ہوتی ہے، ایک تو اپنا نفع اور سرمایہ گیا، اور اوپر سے بنک کے قرض میں دب گیا، جس کی ادائیگی کے لئے اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں، اور بے سود کی تجارت میں اگر سارا سرمایہ بھی کسی وقت چلا جائے تو فقیر ہی ہوگا مقروض تو نہ ہوگا ۱۹۵۴ء میں پاکستان میں روئی کے بیوپار پر قرآنی ارشاد کے مطابق محاق کی آفت آئی اور حکومت نے کروڑوں روپے کا نقصان اٹھا کر تاجروں کو سنبھالا، مگر کسی نے اس پر غور نہیں کیا کہ وہ سب سود کی نحوست تھی، کیونکہ کاٹن کے تاجروں نے اس کاروبار میں بیشتر سرمایہ بنکوں کا لگایا ہوا تھا، اپنا سرمایہ برائے نام تھا، بقضائے خداوندی روئی کا بازار اتنا گر گیا کہ اس کے دام ایک سو پچیس سے گر کر دس پر آگئے، تاجر اس قابل نہ رہے کہ بنکوں میں مارجن پوری کرنے کے لئے روپیہ واپس دیں، مجبور ہو کر مارکیٹ بند کر دی گئی، اور حکومت سے فریاد کی، حکومت نے دس کے بجائے نوّے کے دام لگا کر خود مال خریدا اور کروڑوں روپیہ کا نقصان برداشت کر کے ان تاجروں کو دیوالیہ ہونے سے بچالیا، حکومت کا روپیہ کس کا تھا وہی بیچاری غریب ملّت وقوم کا، غرض بنکوں کے کاروبار کا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ پوری ملّت کے سرمایہ سے چند افراد نفع اٹھاتے ہیں اور جہاں نقصان ہو جائے تو وہ پوری قوم و ملّت پر پڑے۔

خویش پروری اور ملّت کُشی کی ایک اور چال

سود و ربا کی ملّت کُشی اور افراد پروری کا اجمالی نقشہ آپ کے سامنے آچکا ہے، اس کے ساتھ ایک اور ہوشیاری اور چالاکی دیکھئے کہ سود خوروں نے جب اپنے تجربہ سے بھی اس چیز کو محسوس کیا جو قرآن کا ارشاد ہے یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا یعنی "سود کے مال میں محاق کی آفتیں آنا لازمی ہیں" جس کے نتیجہ میں دیوالیہ ہونا پڑتا ہے، تو ان آفتوں سے بچنے کے لئے دو مستقل ادارے بنائے، ایک بیمہ (انشورنس) دوسرے سٹہ کا بازار، کیونکہ تجارت میں نقصان آنے کی دو وجہ ہوسکتی ہیں، ایک کوئی آسمانی آفت کہ جہاز ڈوب گیا، یا جل گیا یا کوئی اور ایسی ہی آفت آگئی، دوسرے یہ کہ سامان کا نرخ اس کی قیمتِ خرید سے کم ہوگیا، ان دونوں صورتوں میں لگا ہوا سرمایہ چونکہ اپنا نہیں بلکہ ملّت کا مشترکہ سرمایہ ہے، اس لئے ان کا نقصان کم اور ملّت کا زیادہ ہے، مگر انھوں نے اس تھوڑے سے نقصان کو بھی ملّت ہی کے سر پر

ڈالنے کے لئے، ایک طرف تو بیمہ کمپنیاں کھولیں، جس میں بینکوں کی طرح پوری ملّت کا سرمایہ جمع رہتا ہے، اور جب کسی سماوی آفت سے ان سود خوروں پر کوئی نقصان آتا ہے تو بیمہ کے ذریعہ وہ پورا نقصان بھی ملّت کے مشترک سرمایہ پر ڈال دیتے ہیں۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ بیمہ کمپنیاں خدا کی رحمت ہیں، ڈوبتے کو سہارا دیتی ہیں، لیکن انکی حقیقت کو دیکھیں اور سمجھیں تو یہاں بھی وہی فریب ہے کہ ناگہانی حوادث کے وقت امداد کا لالچ دے کر ملّت کا سرمایہ جمع کیا گیا، مگر اس سے بھاری رقموں کا فائدہ تو صرف اونچے سرمایہ داروں کو ملتا ہے جو بعض اوقات خود ہی اپنی فرسودہ موٹر کو آگ لگا کر یا کہیں ٹکرا کر اور بیمہ کمپنی سے رقم لے کر نئی موٹر خریدنا چاہتے ہیں، ننّو میں ایک دو کوئی غریب بھی ایسا ہوتا ہوگا جس کو ناگہانی موت کے سبب کچھ پیسے مل جاویں۔

اور دوسری قسم یعنی نرخ گھٹ جانے کے خطرے سے بچنے کے لئے سٹّہ کا بازار گرم کیا، اس سٹّہ کے ذریعہ تمام افراد ملت کو متأثر کیا گیا، تاکہ جو نقصان ان کو قیمت گھٹ جانے کی وجہ سے ہونے والا تھا وہ پھر ملّت پر منتقل کر دیں۔

اس مختصر بیان میں آپ نے اتنا سمجھ لیا ہوگا کہ بینکوں کا سود اور اس کی تجارت پوری انسانیت کے لئے فقر و فاقہ اور معاشی تنگدستی کا موجب ہے، ہاں چند مال دار افراد کے اموال میں اس سے اضافہ بھی ہوتا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ملّت بگڑتی ہے اور چند افراد بنتے ہیں، اور ملک کا سرمایہ سمٹ کر اُن کے ہاتھ میں آجاتا ہے، عام حکومتوں نے اس عظیم مفسدہ کو محسوس تو کیا، لیکن اس کا علاج یہ تجویز کیا کہ بڑے سرمایہ داروں کے لئے انکم ٹیکس کی شرح بڑھادی یہاں تک کہ آخری شرح ایک روپیہ میں سے ساڑھے پندرہ آنے کر دی گئی، تاکہ سرمایہ اُن کے پاس سے منتقل ہو کر پھر قومی خزانے میں پہونچ جائے۔

لیکن سب کو معلوم ہے کہ اس قانون کے نتیجہ میں عام طور پر کارخانوں کے حساب فرضی اور جعلی بننے لگے، اور بہت سا سرمایہ حکومت سے چھپانے کے لئے پھر دفینوں کی شکل میں منتقل ہونے لگا۔

خُلاصہ یہ ہے کہ دولت سمٹ کر قوم کے چند افراد میں مقید ہو جانے کی انتہائی مضرّت ملک کے معاشی اور اقتصادی حالات کے لئے سب پر واضح ہے، اسی لئے انکم ٹیکس کی شرح اتنی زیادہ بڑھائی جاتی ہے، لیکن تجربہ شاہد ہے کہ یہ تدبیر مرض کا علاج ثابت نہ ہوئی، جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مرض کے اصلی سبب کو نہیں پہچانا گیا، اس لئے علاج کی مثال یہ ہوگئی کہ ؎

در ببست و دشمن اندر خانہ بود

دولت بڑے سرمایہ داروں کی طرف سمٹنے کا اصلی سبب صرف سودی کاروبار اور قومی سرمایہ سے خاص خاص افراد کی بے جا نفع اندوزی ہے، جب تک اسلام کی تعلیمات کے مطابق اسکو بند نہ کیا جائے اور اس کا رواج نہ دیا جائے کہ ہر شخص صرف اپنے سرمایہ سے تجارت کرے اس وقت تک اس مرض کا علاج نہیں ہوسکتا۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بینکوں کے ذریعہ پوری قوم کا سرمایہ جمع ہو کر کچھ نہ کچھ تو فائدہ عوام کو بھی ملا، وہ کتنا ہی قلیل ہو، اور بڑے سرمایہ داروں نے اس سے زیادہ فائدہ حاصل کر لیا ہو، لیکن اگر یہ بینکوں میں سرمایہ جمع کرنے کا طریقہ نہ ہو تو اس کا نتیجہ وہی ہوگا جو پہلے زمانہ میں تھا، کہ لوگوں کا سرمایہ دفینوں اور خزینوں کی شکل میں زمین کے اندر رہا کرتا تھا، جس سے نہ اُن کو فائدہ ہوگا نہ کسی دوسرے شخص کو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام نے جس طرح سود کو حرام قرار دے کر اس کا دروازہ بند کیا ہے کہ پوری قوم کی دولت سمٹ کر خاص خاص سرمایہ داروں میں محدود ہو جائے، اسی طرح زکوٰۃ کا فریضہ سرمایہ ٹیکس کی صورت میں عائد کر کے ہر مال دار کو اِس پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنے سرمایہ کو منجمد حالت میں نہ رکھے، بلکہ تجارت اور کاروبار میں لگائے، کیونکہ زکوٰۃ سرمایہ ٹیکس کی صورت میں ہونے کی بناء پر اگر کوئی شخص اپنا روپیہ یا سونا چاندی دفینہ کر کے رکھتا ہے تو ہر سال اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں نکلتے نکلتے سرمایہ فنا ہو جائے گا، اس لئے ہر سمجھدار انسان اس پر مجبور ہوگا کہ سرمایہ کو کام میں لگا کر اس سے فائدہ اُٹھائے اور دوسروں کو فائدہ پہنچائے، اور اسی نفع میں سے زکوٰۃ ادا کرے۔

فریضۂ زکوٰۃ ایک حیثیت سے تجارت کی ترقی کا ضامن ہے

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ فریضۂ زکوٰۃ ادا کرنے میں جیسے یہ عظیم الشان فائدہ مضمر ہے کہ قوم کے فقراء و مساکین کی امداد ہو، اسی طرح مسلمانوں کے معاشی حالات کو درست کرنے کے لئے بھی یہ فریضہ تجارت کی ترغیب کا ایک بہترین ذریعہ ہے کیونکہ ہر انسان جب یہ دیکھے گا کہ نقد سرمایہ کو بند رکھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ نفع تو کچھ ہوا نہیں، اور سال کے ختم پر چالیسواں حصہ کم ہوگیا، تو ضرور اس کو اس طرف توجہ کرنا پڑے گی کہ اس مال کو کسی تجارت پر لگائے، اور دوسری طرف چونکہ سود ہے، روپیہ چلانا حرام ٹھہرا تو تجارت کی یہ صورت نہ رہے گی، کہ لاکھوں انسانوں کے سرمایہ سے صرف ایک انسان تجارت کرے بلکہ ہر مالدار خود تجارت میں آنے کی فکر کرے گا، اور جب کہ بڑے سرمایہ دار بھی صرف اپنے ہی

سرمایہ سے تجارت کریں گے تو چھوٹے سرمایہ والوں کو تجارت میں وہ مشکلات پیش نہ آئیں گی جو بینکوں سے سودی روپیہ لے کر بڑی تجارت چلانے کی صورت میں پیش آتی ہیں، اس طرح پورے ملک میں تجارت اور اس کے منافع عام ہوں گے، اور اس کے نتیجہ میں ملک کے غرباء، فقراء کو فائدہ پہونچے گا۔

سُود کی رُوحانی بیماریاں یہاں تک سود کی معاشی اور اقتصادی تباہ کاری کا ذکر تھا اب سنئے کہ سودی کاروبار انسان کے اخلاق اور روحانی کیفیات پر کیسے خراب اثرات ڈالتا ہے۔

۱۔ انسانی اخلاق میں سب سے بڑا جوہر ایثار و سخاوت کا ہے کہ خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو راحت پہنچانے کا جذبہ ہو، سود کے کاروبار کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ یہ جذبہ فنا ہوجاتا ہے، سودخور اپنے پاس سے کسی کو نفع پہنچانا تو کیا دوسرے کو اپنی کوشش اور اپنے سرمایہ سے اپنے برابر آتا نہیں دیکھ سکتا۔

۲۔ وہ مصیبت زدہ پر رحم کھانے کے بجائے اس کی مصیبت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی فکر میں رہتا ہے۔

۳۔ سودخوری کے نتیجہ میں مال کی حرص اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں مست ہو کر اپنے بھلے اور بُرے کو بھی نہیں پہچانتا، اس کے انجامِ بد سے بالکل غافل ہوجاتا ہے۔

کیا سود کے بغیر کوئی تجارت نہیں چل سکتی؟ ربا کی حقیقت اور اس کی دینی و دنیوی خرابیوں کا بیان کسی قدر تفصیل سے آچکا ہے، اب تیسری بحث یہ باقی ہے کہ ربا کی معاشی اور رُوحانی خرابیاں اور قرآن و سنت میں اس کی شدید حرمت و ممانعت تو واضح ہوگئی، لیکن موجودہ دَور میں جبکہ رباہی تجارت کا رکنِ اعظم بنا ہوا ہے، ساری دنیا کے کاروبار اسی پر چل رہے ہیں، اس سے نجات حاصل کرنے کی تدبیر کیا ہے؟ بینک سسٹم کو ترک کر دینا اس زمانہ میں گویا تجارت کو بند کر دینا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب کوئی مرض عام ہو کر وباء کی صورت اختیار کرلے تو علاج معالجہ دشوار ضرور ہوجاتا ہے، لیکن بے کار نہیں ہوتا، اصلاحِ حال کی کوششیں انجام کار کامیاب ہوتی ہیں، البتہ صبر و استقلال اور ہمت سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے، قرآن کریم ہی میں اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے:

مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ط (۲۲: ۷۸)	"یعنی اللہ تعالیٰ نے دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں ڈالی"۔

اس لئے ضرور ہے کہ رباء سے اجتناب کا کوئی ایسا راستہ ضرور ہوگا جس میں معاشی اور

اقتصادی نقصان بھی نہ ہو، اندرونی اور بیرونی تجارت کے دروازے بھی بند نہ ہوں اور ربا سے نجات بھی ہو جائے۔

اس میں پہلی بات تو یہی ہے کہ سطحی نظر میں بنکنگ کے موجودہ اصول کو دیکھتے ہوئے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بینک سسٹم کا مدار ہی سود پر ہے، اس کے بغیر بینک چل ہی نہیں سکتے، لیکن یہ خیال قطعاً صحیح نہیں، ربا کے بغیر بھی بینک سسٹم اسی طرح قائم رہ سکتا ہے، بلکہ اس سے بہتر اور نافع و مفید صورت میں آسکتا ہے، البتہ اس کے لئے ضرورت ہے کہ کچھ حضرات ماہرینِ شریعت اور کچھ ماہرینِ بینک کے مشورہ اور تعاون سے اس کے اصول از سرِ نو تجویز کریں، تو کامیابی کچھ دور نہیں، اور جس دن بینک سسٹم شرعی اصول پر آگیا تو انشاء اللہ دنیا دیکھ لے گی کہ اس میں پوری قوم و ملت کی کیسی فلاح ہے، ان اصول و قواعد کی تشریح کا یہ موقع نہیں[1]، جن کی بناء پر بینک سسٹم کو بغیر ربا کے چلایا جاسکتا ہے۔

ربا اور سود کی ایک ضرورت کچھ تجارتی اغراض کے لئے ہوتی ہے اس کا انتظام تو بینک کے موجودہ اصول میں ترمیم کے ذریعہ ہو جائے گا، اور دوسری ضرورت سود و ربا میں مبتلا ہونے کی فقیر و حاجتمند لوگوں کی ہنگامی اور وقتی ضرورتیں ہوا کرتی ہیں، اس کا بہترین علاج اسلام میں پہلے سے بصورتِ زکوٰۃ و صدقات واجبہ موجود ہے، لیکن دین اور علمِ دین سے بےخبری اور بے پروائی کا نتیجہ ہے جس نے آجکل نظامِ زکوٰۃ بھی معطل کر دیا ہے، بےشمار مسلمان ہیں جو نماز کی طرح زکوٰۃ کے پاس نہیں جاتے، اور جو لوگ نکالتے بھی ہیں ان میں اکثر بڑے سرمایہ والے حضرات حساب کر کے پوری زکوٰۃ ادا نہیں کرتے، اور جو لوگ پوری زکوٰۃ نکالتے بھی ہیں تو وہ بس زکوٰۃ کا نکالنا ہی جانتے ہیں کہ اپنی جیب سے نکال دیں، حالانکہ حکمِ الٰہی زکوٰۃ کے نکالنے کا نہیں، بلکہ ادا کرنے کا ہے اور ادا کرنا جب صحیح ہو سکتا ہے جب اس کے مستحقین کو پہنچا کر ان کو مالکانہ قبضہ دیدیا جائے، اب غور کیجئے کہ ایسے مسلمان کتنے ہیں جو مستحقین کو تلاش کرنے کی فکر کریں، پھر ان کو پہنچانے کا اہتمام کریں، مسلمان قوم کتنی ہی کم سرمایہ سہی، لیکن اگر ہر مسلمان جس پر زکوٰۃ فرض ہے وہ زکوٰۃ پوری ادا کرے، اور ادا کرنے کا صحیح طریقہ اختیار کرے کہ مستحقین کو پہنچائے اور ادا کرنے کا اہتمام کرے، تو یقیناً کسی مسلمان کو اس کی ضرورت نہ رہے، کہ وہ قرض کی ضرورت سے سود و ربا میں مبتلا ہو، اور اگر شرعی قاعدہ کے مطابق

---

[1] احقر نے چند علماء کے مشورے سے بے سود بنکاری کا مسودہ عرصہ ہوا تیار کر بھی دیا تھا اور بنکاری کے بعض ماہرین نے موجودہ دور میں قابلِ عمل تسلیم بھی کر لیا تھا، اور بعض حضرات نے اس کو شروع بھی کرنا چاہا مگر ابھی تک عام تاجروں کی توجہ اس طرف نہ ہونے کے سبب اور حکومت کی طرف سے اس کو منظوری حاصل نہ ہونے کے سبب وہ چل نہیں سکا، فالی اللہ المشتکیٰ منہ

اسلامی حکومتِ عادلہ بن جائے اور اس کے تحت شرعی بیت المال قائم ہو جائے، اور تمام مسلمانوں کے اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ اس میں جمع ہوا کرے تو اس بیت المال سے ہر ایک ضرورت مند کی ضرورت پوری کی جاسکتی ہے، اور کسی بڑی رقم کی ضرورت پڑ جائے تو بطور قرض بھی بغیر سود کے دیا جاسکتا ہے، اور اس طرح بیکار پھرنے والوں کو چھوٹی دُکانیں کرا کر یا کسی صنعت میں لگا کر بھی کام میں لگایا جاسکتا ہے، کسی یوربین ماہر نے صحیح کہا کہ مسلمانوں کا نظامِ زکوٰۃ ایسی چیز ہو کہ اگر مسلمان اس کے پابند ہو جائیں تو اس قوم میں کوئی مفلس اور مصیبت زدہ نظر نہ آئے۔

الغرض اس زمانے میں سود و ربا کے معاملات وبا کی طرح پھیل جانے سے یہ سمجھ بیٹھنا صحیح نہیں کہ موجودہ زمانہ میں سُود کا کاروبار چھوڑ دینا معاشی و اقتصادی خودکشی کے مرادف ہے، اور اس زمانہ کا آدمی سودی کاروبار کرنے میں معذور ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ جب تک پوری قوم یا اس کی کوئی معتدبہ جماعت یا کوئی اسلامی حکومت پوری توجہ کے ساتھ اس کام کا تہیّہ نہ کرے افراد و احاد کے لئے دشواری ضرور ہے، مگر معذور پھر بھی نہیں کہا جاسکتا۔

اس وقت ہمارے اس بیان کے دو مقصد ہیں، اوّل یہ کہ مسلمانوں کی جماعتیں اور حکومتیں جو اس کام کو صحیح طور پر کرسکتی ہیں اس طرف متوجہ ہوں اور مسلمانوں کو بلکہ پوری دنیا کو سُود کے منحوس اثرات سے نجات دلائیں۔

دوسرے یہ کہ کم از کم علم سب کا صحیح ہو جائے، مرض کو مرض تو سمجھنے لگیں، حرام کو حلال سمجھنے کا دوسرا گناہ جو پہلے گناہ سے زیادہ عظیم ہے، کم از کم اس کے تو مرتکب نہ ہوں عملی گناہ میں تو کچھ نہ کچھ ظاہری فائدہ بھی ہے، لیکن یہ دوسرا علمی اور عقیدہ کا گناہ کہ اس کو حلال ثابت کرنے کی کوشش کی جائے، پہلے سے عظیم تر بھی ہے، اور لغو و فضول بھی کیونکہ سود کو حرام سمجھنے اور اپنے گناہ کا اعتراف کرنے میں تو کوئی مالی نقصان بھی نہیں ہوتا، کوئی تجارت بھی بند نہیں ہوتی، ہاں اعترافِ جرم کا نتیجہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ کسی وقت توبہ کی توفیق ہو جانے سے اس سے بچنے کی تدبیر سوچیں۔

اس وقت اسی مقصد کے پیش نظر آخر میں چند روایاتِ حدیث اور ارشاداتِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی پیش کرتا ہوں جو انہی آیاتِ قرآنی کا بیان ہے جن میں سود و ربا کی شدید ممانعت اور اس پر سخت عذاب کی وعیدیں آئی ہیں، تاکہ گناہ کے گناہ ہونے کا احساس تو بیدار رہو، اور اس سے بچنے کی فکر ہو، کم از کم یہ صورت تو نہ رہے کہ

اس حرام کو حلال بنا کر ایک گناہ کے دو گناہ بنالیں، اور بڑے بڑے صالح دیندار مسلمان جو رات کو تہجد اور ذکر اللہ میں گذاریں صبح جب دُکان یا کارخانہ میں پہونچیں تو انھیں یہ خیال بھی نہ آئے کہ ہم سود و قمار کے معاملات میں مبتلا ہو کر کچھ گناہ کر رہے ہیں۔

سُود کے بارے میں رسُولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات

① رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سات مہلک چیزوں سے بچو، اصحابہ کرامؓ نے دریافت کیا، یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وہ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا، ایکؔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ (عبادت میں یا اس کی مخصوص صفات میں) کسی غیر اللہ کو شریک کرنا، دوسرے جادو کرنا، تیسرے کسی شخص کو ناحق قتل کرنا، چوتھے سود کھانا، پانچویں یتیم کا مال کھانا، چھٹے جہاد کے وقت میدان سے بھاگنا، ساتویں کسی پاک دامن عورت پر تہمت باندھنا۔ (یہ حدیث صحیح بخاری اور مسلم میں ہے)

② رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے آج رات دو شخصوں کو دیکھا جو میرے پاس آئے، اور مجھے بیت المقدس تک لے گئے، پھر ہم آگے چلے تو ایک خون کی نہر دیکھی، جس کے اندر ایک آدمی کھڑا ہوا ہے، اور دوسرا آدمی اس کے کنارہ پر کھڑا ہے، جب یہ نہر والا آدمی اس سے باہر آنا چاہتا ہے تو کنارہ والا آدمی اس کے مُنہ پر پتھر مارتا ہے، جس کی چوٹ سے بھاگ کر پھر وہ وہیں چلا جاتا ہے جہاں کھڑا تھا، پھر وہ نکلنے کا ارادہ کرتا ہے، تو پھر یہ کنارہ کا آدمی یہی معاملہ کرتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے اُن دونوں ساتھیوں سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے جو میں دیکھ رہا ہوں؟ انھوں نے بتلایا کہ خون کی نہر میں قید کیا ہوا آدمی سود کھانے والا اپنے عمل کی سزا پا رہا ہے) یہ حدیث صحیح بخاری کتاب البیُوع میں ہے۔

③ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سُود لینے والے پر بھی لعنت فرمائی، اور سود دینے والے پر بھی، اور بعض روایات میں سودی معاملہ پر گواہی دینے والے اور اس کا وثیقہ لکھنے والے پر بھی لعنت آئی ہے۔

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں فرمایا کہ یہ سب گناہ میں برابر ہیں، اور بعض روایات میں شاہد و کاتب پر لعنت اس صورت میں ہے جبکہ ان کو اس کا علم ہو کہ یہ سود کا معاملہ ہے۔

④ اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ چار آدمی ایسے ہیں کہ ان کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لازم کرلیا ہے کہ ان کو جنّت میں نہ داخل کرے، اور جنت کی نعمت

نہ چکھنے دے، وہ چار یہ ہیں: شراب پینے کا عادی اور سُود کھانے والا اور یتیم کا مال ناحق کھانے والا اور اپنے والدین کی نافرمانی کرنے والا۔ (یہ روایت مستدرک حاکم میں ہے)

⑤ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی جو سُود کا ایک درہم کھاتا ہے وہ چھتیس مرتبہ بدکاری کرنے سے زیادہ سخت گناہ ہے، اور بعض روایات میں ہے کہ جو گوشت مالِ حرام سے بنا ہوا اس کے لئے آگ ہی زیادہ مستحق ہے، اسی کے ساتھ بعض روایات میں ہے کہ کسی مسلمان کی آبروریزی سُود سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے۔ (یہ روایت مسند احمد، طبرانی وغیرہ میں ہے)

⑥ اور ایک حدیث میں ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ پھل کو قابلِ استعمال ہونے سے پہلے فروخت کیا جائے، اور فرمایا کہ جب کسی بستی میں بدکاری اور سود کا کاروبار پھیل جائے تو اس نے اللہ تعالیٰ کے عذاب کو اپنے اوپر دعوت دیدی۔ (یہ روایت مستدرک حاکم میں ہے)

⑦ اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کسی قوم میں سُود کے لین دین کا رواج ہو جائے تو اللہ تعالیٰ ان پر ضروریات کی گرانی مسلط کر دیتا ہے، اور جب کسی قوم میں رشوت عام ہو جائے تو دشمنوں کا رعب و غلبہ ان پر ہو جاتا ہے (یہ روایت مسند احمد میں ہے)

⑧ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شبِ معراج میں جب ہم ساتویں آسمان پر پہنچے تو میں نے اپنے اوپر رعد و برق کو دیکھا، اس کے بعد ہم ایک ایسی قوم پر گذرے جن کے پیٹ رہائشی مکانات کی طرح پھُولے اور پھیلے ہوئے ہیں، جن میں سانپ بھرے ہیں جو باہر سے نظر آرہے ہیں، میں نے جبرئیل امینؑ سے پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ یہ سود خور ہیں (یہ روایت مسند احمد کی ہے)

⑨ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عوف بن مالکؓ سے فرمایا کہ ان گناہوں سے بچو جو معاف نہیں کئے جاتے، ان میں سے ایک مالِ غنیمت کی چوری ہے اور دوسرے سود کھانا (طبرانی)

⑩ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو تم نے قرض دیا ہو اس کا ہدیہ بھی قبول نہ کرو ایسا نہ ہو اس نے یہ ہدیہ قرض کے عوض میں دیا ہو، جو سود ہے، اس لئے اس کے ہدیہ قبول کرنے سے بھی احتیاط چاہئے)

رباء کی تعریف اور اس کی حقیقت اور اس کی دنیوی تباہ کاری کے متعلق قرآن مجید کی سات آیتیں اور احادیثِ نبویہ کے دس ارشادات اس جگہ بیان ہو چکے ہیں، سوچنے سمجھنے والے مسلمان کیلئے اتنا کافی ہے، اور اس مسئلے کے باقی ماندہ پہلوؤں پر بحث اور مکمل تحقیق کے لئے احقر کی ایک مستقل کتاب بنام (مسئلہ سود) شائع ہو چکی ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ۚ

اے ایمان والو جب تم آپس میں معاملہ کرو ادھار کا کسی وقت مقرر تک تو اس کو لکھ لیا کرو

وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ۚ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا

اور چاہئے کہ لکھ دے تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف سے اور انکار نہ کرے لکھنے والا اس سے کہ لکھ دیوے جیسا

عَلَّمَهُ اللَّهُ ۚ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ

سکھایا اسکو اللہ نے سو اسکو چاہئے کہ لکھدے اور بتلاتا جاوے وہ شخص کہ جس پر قرض ہو اور ڈرے اللہ سے جو اس کا رب ہے

وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا ۚ فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ

اور کم نہ کرے اس میں سے کچھ پھر اگر وہ شخص کہ جس پر قرض ہو بے عقل ہے یا ضعیف ہے یا

لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ ۚ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ

آپ نہیں بتلا سکتا تو بتلا دے کارگزار اس کا انصاف سے اور گواہ کرو دو شاہد اپنے

مِنْ رِجَالِكُمْ ۖ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ

مردوں میں سے پھر اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے کہ جن کو تم پسند

مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ ۚ وَلَا

کرتے ہو گواہوں میں تاکہ اگر بھول جائے ایک اُن میں سے تو یاد دلا دے اس کو دوسری اور انکار

يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا ۚ وَلَا تَسْأَمُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ

نہ کریں گواہ جس وقت بُلائے جاویں اور کاہلی نہ کرو اس کے لکھنے سے چھوٹا ہو معاملہ یا

كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ

بڑا اس کی میعاد تک اس میں پورا انصاف ہے اللہ کے نزدیک اور بہت درست رکھنے والا ہے گواہی کو

أَلَّا تَرْتَابُوا ۖ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ

اور نزدیک ہے کہ شبہ میں نہ پڑو مگر یہ کہ سودا ہو ہاتھوں ہاتھ لیتے دیتے ہو اس کو آپس میں تو تم پر

فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا ۗ وَأَشْهِدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ ۚ

کچھ گناہ نہیں اگر اس کو نہ لکھو اور گواہ کر لیا کرو جب تم سودا کرو،

وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ۚ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ

اور نقصان نہ کرے لکھنے والا اور نہ گواہ اور اگر ایسا کرو تو یہ گناہ کی بات ہے تمہارے اندر

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾ وَاِنْ كُنْتُمْ

اور ڈرتے رہو اللہ سے اور اللہ تم کو سکھلاتا ہے اور اللہ ہر ایک چیز کو جانتا ہے ، اور اگر تم

عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ۖ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ

سفر میں ہو اور نہ پاؤ کوئی لکھنے والا تو گرو ہاتھ میں رکھنی چاہئے پھر اگر اعتبار کرے ایک دوسرے

بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ۗ وَلَا تَكْتُمُوا

کا تو چاہئے کہ پورا کرے وہ شخص کہ جس پر اعتبار کیا اپنی امانت کو اور ڈرتا رہے اللہ سے جو رب ہے اسکا اور مت چھپاؤ

۳۹ ع ۲ ۷ الشَّهَادَةَ ۚ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾

گواہی کو اور جو شخص اس کو چھپاوے تو بے شک گنہگار ہے دل اس کا اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب جانتا ہے

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو جب معاملہ کرنے لگو اُدھار کا (خواہ دام اُدھار ہوں یا جو چیز خریدنا ہے وہ ادھار ہو جیسے بیع سلم میں) ایک میعاد معین تک (کے لئے) تو اس (کی یادداشت و دستاویز) کو لکھ لیا کرو اور یہ ضرور ہے کہ تمہارے آپس میں (جو) کوئی لکھنے والا (ہو وہ) انصاف کے ساتھ لکھے (یعنی کسی کی رعایت کرکے مضمون میں کمی بیشی نہ کرے) اور لکھنے والا لکھنے سے انکار بھی نہ کرے جیسا کہ خدا نے اس کو (لکھنا) سکھلایا ہے، اس کو چاہئے کہ لکھ دیا کرے اور (کاتب کو) وہ شخص (بتلادے اور) لکھوادے جس کے ذمہ وہ حق واجب ہو (کیونکہ دستاویز کا حاصل اقرار حق کا ہوتا ہے تو جس کے ذمہ حق ہے اسی کا اقرار ضرور ٹھہرا) اور (لکھاتے وقت) اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرتا رہے اور اس (حق) میں سے ذرہ برابر (بتلانے میں) کمی نہ کرے پھر جس شخص کے ذمہ حق واجب تھا وہ اگر ضعیف العقل (یعنی معتوہ یا مجنون) ہو یا ضعیف البدن (یعنی نابالغ یا پیر فرتوت) ہو یا (اور کسی اتفاقی امر سے) خود (بیان کرنے کی اور) لکھانے کی قدرت نہ رکھتا ہو، (مثلاً گونگا ہے اور لکھنے والا اس کا اشارہ نہیں سمجھتا، یا مثلاً دوسرے ممالک کا رہنے والا ہے اور زبان غیر رکھتا ہے اور لکھنے والا اس کی بولی نہیں سمجھتا) تو (ایسی حالت میں) اس کا کارکن

ٹھیک ٹھیک طور پر لکھوا دے اور دو شخصوں کو اپنے مردوں میں سے گواہ (بھی) کر لیا کرو (اور شرعاً اصل مدار ثبوت دعویٰ کا یہی گواہ ہیں گو دستاویز نہ ہو، اور خالی دستاویز بدون گواہوں کے ایسے معاملات میں حجت اور معتبر نہیں دستاویز لکھنا صرف یادداشت کی آسانی کے لئے رہے کہ اس کا مضمون دیکھ کر اور سنکر طبعی طور پر اکثر تمام واقعہ یاد آجاتا ہے، جیسا عنقریب قرآن ہی میں آتا ہے) پھر اگر وہ دو گواہ مرد (میسّر) نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں (گواہ بنالی جائیں) ایسے گواہوں میں سے جن کو تم (ان کے معتبر ہونے کی وجہ سے) پسند کرتے ہو (اور ایک مرد کی جگہ دو عورتیں اس لئے تجویز کی گئیں) تاکہ ان دونوں عورتوں میں سے کوئی ایک بھی (شہادت کے کسی حصّہ کو خواہ ذہن سے یا شہادت کے وقت بیان کرنے سے) بھول جائے تو ایک دوسری کو یاد دلادے، (اور یاد دلانے کے بعد شہادت کا مضمون مکمل ہو جائے) اور (گواہ بھی انکار نہ کیا کریں جب (گواہ بننے کے لئے) بلائے جایا کریں (کہ اس میں اعانت ہے اپنے بھائی کی) اور تم اس (دَین) کے (بار بار) لکھنے سے اکتایا مت کرو خواہ وہ (معاملہ دَین کا) چھوٹا ہو یا بڑا ہو، یہ لکھ لینا انصاف کا زیادہ قائم رکھنے والا ہے اللہ کے نزدیک اور شہادت کا زیادہ درست رکھنے والا ہے اور زیادہ سزاوار ہے اس بات کا کہ تم (معاملہ کے متعلق) کسی شبہ میں نہ پڑو (اس لئے لکھ ہی لینا اچھا ہے) مگر یہ کہ کوئی سودا دست بدست ہو جس کو باہم لیتے دیتے ہو تو اس کے نہ لکھنے میں تم پر کوئی الزام (اور مضرت) نہیں اور (اتنا اس میں بھی ضرور کیا کرو کہ اس کے) خرید و فروخت کے وقت گواہ کر لیا کرو (شاید کل کو کوئی بات نکل آئے مثلاً بائع کہنے لگے کہ مجھ کو دام ہی وصول نہیں ہوئے، یا یہ چیز میں نے فروخت ہی نہیں کی، یا مشتری کہنے لگے کہ میں نے تو واپسی کا اختیار بھی لے لیا تھا یا ابھی تو مبیع پوری میرے پاس نہیں پہونچی) اور (جس طرح ہم نے اوپر کاتب اور گواہ کو منع کیا ہے کہ کتابت اور شہادت سے انکار نہ کریں اسی طرح ہم تم کو بھی تاکید کرتے ہیں کہ تمھاری طرف سے) کسی کاتب کو تکلیف نہ دی جائے اور نہ کسی گواہ کو (مثلاً اپنی مصلحت کے لئے ان کی کسی مصلحت میں خلل ڈالا جائے) اور اگر تم ایسا کرو گے تو اس میں تم کو گناہ ہوگا اور خدا تعالیٰ سے ڈرو (اور جن کاموں سے اس نے منع کیا ہے وہ مت کرو) اور اللہ تعالیٰ (کا تم پر احسان ہے کہ) تم کو (احکام مفیدہ کی) تعلیم فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب چیزوں کے جاننے والے ہیں (تو وہ مطیع اور عاصی کو بھی جانتے ہیں ہر ایک کو مناسب جزاء دیں گے) اور اگر تم (دَین کا معاملہ کرانے کے وقت) کہیں سفر میں ہو اور (دستاویز لکھنے کے واسطے وہاں) کوئی کاتب نہ پاؤ سو (ایسی حالت میں اطمینان کا ذریعہ) رہن رکھنے کی چیزیں (ہیں) جو (مدیون کی طرف سے صاحب حق کے) قبضہ میں دیدی جائیں اور (اگر ایسے وقت میں بھی) ایک دوسرے کا اعتبار کرتا ہو

(اور اس لئے رہن کی ضرورت نہ سمجھے) تو جس شخص کا اعتبار کرلیا گیا ہے (یعنی مدیون) اس کو چاہئے کہ دوسرے کا حق (پورا پورا) ادا کردے اور اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرے (اور اس کا حق نہ مارے) اور شہادت کا اخفاء مت کرو اور جو شخص اس کا اخفاء کرے گا اس کا قلب گنہگار ہوگا، اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں کو خوب جانتے ہیں (سو اگر کوئی اخفاء کرے گا اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ضرور ہے سو وہ سزا دیں گے)۔

معارف و مسائل

قرض اور ادھار کے لئے اقرار نامہ لکھنے کی ہدایت اور متعلقہ احکام

آیاتِ مذکورہ میں قانونِ معاملات جن کو آجکل کے قانون میں معاہدات کہا جاتا ہے اس کے اہم اصول کا بیان ہے اور اس کے بعد ضابطۂ شہادت کے خاص اصول کا ذکر ہے۔

آجکل تو زمانہ لکھنے لکھانے کا ہے، اور تحریر ہی انسان کی زبان کی قائم مقام بن گئی ہے لیکن آپ چودہ سو سال پہلے زمانہ کی طرف مڑ کر دیکھئے تو اس وقت دنیا کا سب کاروبار صرف زبانی ہوتا تھا، لکھنے لکھانے اور دستاویز مہیا کرنے کا اصول نہ تھا، سب سے پہلے قرآن نے اس طرف توجہ دلائی اور فرمایا:

اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ، یعنی "جب تم آپس میں ادھار کا معاملہ کیا کرو کسی معین مدت کے لئے تو اس کو لکھ لیا کرو"۔

اس میں ایک اصول تو یہ بتلا دیا کہ ادھار کے معاملات کی دستاویز لکھنی چاہئے، تاکہ بھول چوک یا انکار کے وقت کام آئے۔

دوسرا مسئلہ یہ بیان فرمایا گیا کہ ادھار کا معاملہ جب کیا جائے تو اس کی میعاد ضرور مقرر کی جائے، غیر معین مدت کے لئے ادھار دینا لینا جائز نہیں، کیونکہ اس سے جھگڑے فساد کا دروازہ کھلتا ہے، اسی وجہ سے فقہاء نے فرمایا کہ میعاد بھی ایسی مقرر ہونا چاہئے جس میں کوئی ابہام نہ ہو، مہینہ اور تاریخ کے ساتھ معین کی جائے، کوئی مبہم میعاد نہ رکھیں، جیسے کھیتی کٹنے کے وقت، کیونکہ وہ موسم کے اختلاف سے آگے پیچھے ہو سکتا ہے، اور چونکہ لکھنا اس زمانے میں عام نہ تھا، اور آج بھی عام ہونے کے بعد دنیا کی بیشتر آبادی وہی ہے جو لکھنا نہیں جانتی تو یہ ممکن تھا کہ لکھنے والا کچھ کا کچھ لکھ دے جس سے کسی کا نفع اور کسی کا نقصان ہو جائے، اس لئے اس کے بعد ارشاد فرمایا:

وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ، یعنی "یہ ضروری ہے کہ تمہارے درمیان کوئی لکھنے

والا انصاف کے ساتھ لکھے"۔

اس میں ایک تو اس طرف ہدایت کی گئی کہ کاتب کسی فریق کا مخصوص آدمی نہ ہو، بلکہ غیر جانبدار ہو، تاکہ کسی کو شبہ اور خلجان نہ رہے، دوسرے کاتب کو ہدایت کی گئی کہ انصاف کے ساتھ لکھے، دوسرے کے فانی نفع کے لئے اپنا دائمی نقصان نہ کرے، اس کے بعد کاتب کو اس کی ہدایت کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ ہنر دیا ہے کہ وہ لکھ سکتا ہے اس کا شکرانہ یہ ہے کہ وہ لکھنے سے انکار نہ کرے۔

اس کے بعد یہ بتلایا گیا کہ دستاویز کی کتابت کس کی طرف سے ہو تو فرمایا:

وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ، یعنی لکھوا دے وہ آدمی جس کے ذمہ حق ہے"، مثلاً سودا خریدا اور قیمت کا ادھار کیا تو جس شخص کے ذمہ ادھار ہے وہ دستاویز کا مضمون لکھوا دے کیونکہ یہ اس کی طرف سے اقرار نامہ ہوگا، اور لکھوانے میں بھی یہ احتمال تھا کہ کوئی کمی بیشی کر دے، اس لئے فرمایا: وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا، یعنی اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرتا رہے اور حق کے لکھوانے میں ذرہ برابر کمی نہ کرے"، معاملات میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس شخص پر حق عائد ہو وہ خفیف العقل یا سٹھیا ہوا بوڑھا یا نابالغ بچہ یا گونگا ہو یا کوئی دوسری زبان بولنے والا ہو جس کو کاتب نہیں سمجھتا، اس لئے دستاویز لکھوانے پر اس کو قدرت نہیں ہوتی اس لئے اس کے بعد فرمایا کہ اگر ایسی صورت پیش آئے تو ان کی طرف سے ان کا ولی لکھوا دے مجنون اور نابالغ کی طرف سے تو ولی کا ہونا ظاہر ہے کہ ان کے سارے معاملات ولی ہی کی معرفت ہوا کرتے ہیں، اور گونگے یا دوسری زبان بولنے والے کا ولی بھی یہ کام کرسکتا ہے، اور اگر وہ کسی کو اپنا وکیل بنا دے تو بھی ہوسکتا ہے، قرآن میں اس جگہ لفظ ولی دونوں معنے پر حاوی ہے۔

ضابطۂ شہادت کے چند اہم اصول

یہاں تک معاملات میں دستاویز لکھنے اور لکھوانے کے اہم اصول کا بیان تھا آگے یہ بتلایا گیا کہ دستاویز کی صرف تحریر کو کافی نہ سمجھیں، بلکہ اس پر گواہ بھی بنالیں کہ اگر کسی وقت باہمی نزاع پیش آجائے تو عدالت میں ان گواہوں کی گواہی سے فیصلہ ہوسکے، یہی وجہ ہے کہ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ محض تحریر حجتِ شرعی نہیں، جب تک کہ اس پر شہادت شرعی موجود نہ ہو خالی تحریر پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، آجکل کی عام عدالتوں کا بھی یہی دستور ہے کہ تحریر پر زبانی تصدیق و شہادت کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتیں۔

گواہی کیلئے دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہونا ضروری ہیں

اس کے بعد ضابطۂ شہادت کے چند اہم اصول بتلائے گئے، مثلاً (۱) گواہ دو مرد یا ایک مرد دو عورتیں ہونا ضروری ہیں، ایک

اکیلا مرد یا صرف دو عورتیں عام معاملات کی گواہی کے لئے کافی نہیں۔

گواہوں کی شرائط (۲) دوسرے یہ کہ گواہ مسلمان ہوں، لفظ مِنۡ رِّجَالِكُمۡ میں اس کی طرف ہدایت کی گئی ہے (۳) تیسرے یہ کہ گواہ ثقہ اور عادل ہوں جن کے قول پر اعتماد کیا جا سکے، فاسق وفاجر نہ ہوں، مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ میں یہ حکم مذکور ہے۔

گواہی دینے سے بلا عذر شرعی انکار کرنا گناہ ہے اس کے بعد لوگوں کو یہ ہدایت کی گئی کہ جب ان کو کسی معاملہ میں گواہ بنانے کے لئے بلایا جائے تو وہ آنے سے انکار نہ کریں، کیونکہ شہادت ہی احیاءِ حق کا ذریعہ اور جھگڑے چکانے کا طریقہ ہے، اس لئے اس کو اہم قومی خدمت سمجھ کر تکلیف برداشت کریں، اس کے بعد پھر معاملات کی دستاویز لکھنے کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا کہ معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا سب کو لکھنا چاہئے، اس میں اُکتائیں نہیں، کیونکہ معاملات کا قلمبند کرلینا انصاف کو قائم رکھنے اور صحیح شہادت دینے اور شک وشبہ سے بچنے کے لئے بہترین ذریعہ ہے، ہاں اگر کوئی معاملہ دست بدست ہو اور ادھار نہ ہو اس کو اگر نہ لکھیں تب بھی کچھ حرج نہیں مگر اتنا اس میں بھی کیا جائے کہ معاملہ پر گواہ بنالیں کہ شاید کبھی وقت فریقین میں کوئی نزاع واختلاف پیش آجائے، مثلاً بائع کہے کہ قیمت وصول نہیں ہوئی، یا مشتری کہے کہ مجھے مبیع پوری وصول نہیں ہوئی، تو اس جھگڑے کے فیصلہ میں شہادت کام آئے گی۔

اسلام میں عدل وانصاف قائم کرنے کا اہم اصول کہ گواہوں کو کوئی نقصان یا تکلیف نہ پہونچے آیت کے شروع میں لکھنے والوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ لکھنے یا شاہد بننے سے انکار نہ کریں، تو یہاں یہ احتمال تھا کہ لوگ ان کو پریشان کریں گے، اس لئے آخر آیت میں فرمایا وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيۡدٌ، یعنی "کسی لکھنے والے یا گواہی دینے والے کو نقصان نہ پہنچایا جائے"، یعنی ایسا نہ کریں کہ اپنی مصلحت اور فائدہ کے لئے اُن کی مصلحت اور فائدہ میں خلل ڈالیں، پھر فرمایا وَاِنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاِنَّهٗ فُسُوۡقٌۢ بِكُمۡ، یعنی "اگر تم نے لکھنے والے یا گواہ کو نقصان پہنچایا تو اس میں تم کو گناہ ہوگا"۔

اس سے معلوم ہوا کہ لکھنے والے یا گواہ کو نقصان پہنچانا حرام ہے، اسی لئے فقہاء نے فرمایا کہ اگر لکھنے والا اپنے لکھنے کی مزدوری مانگے یا گواہ اپنی آمد ورفت کا ضروری خرچ طلب کرے تو یہ اس کا حق ہے، اس کو ادا نہ کرنا بھی اس کو نقصان پہنچانے میں داخل اور ناجائز ہے، اسلام نے اپنے نظامِ عدالت میں جس طرح گواہ کو گواہی دینے پر مجبور کیا ہے، اور گواہی چھپانے کو سخت گناہ قرار دیا ہے، اسی طرح اس کا بھی انتظام کیا کہ لوگ گواہی سے بچنے پر مجبور نہ ہو جائیں، اسی دو طرفہ احتیاط کا یہ اثر تھا کہ ہر معاملہ میں سچے بے غرض گواہ

رل جاتے اور فیصلے جلد اور آسان حق کے مطابق ہو جاتے، آج کی دنیا نے اس قرآنی اصول کو نظر انداز کر دیا ہے تو سارا نظامِ عدالت برباد ہو گیا، واقعہ کے اصلی اور سچے گواہ ملنا تقریباً مفقود ہو گیا ہر شخص گواہی سے جان چرانے پر مجبور ہو گیا، وجہ یہ کہ جس کا نام گواہی میں آ گیا اگر معاملہ پولیس اور فوجداری کا ہے تو روز وقت بے وقت تھانیدار صاحب اس کو بلا بھیجتے ہیں، اور بعض اوقات گھنٹوں بٹھائے رکھتے ہیں، دیوانی عدالتوں میں بھی گواہ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جاتا ہے جیسے یہ کوئی مجرم ہے، پھر روز روز مقدمہ کی پیشیاں بدلتی ہیں، تاریخیں لگتی ہیں، گواہ بیچارہ اپنا کاروبار اور مزدوری اور ضروریات چھوڑ کر آنے پر مجبور ہو، ورنہ وارنٹ کے ذریعہ گرفتار کیا جائے اس لئے کوئی شریف کاروباری آدمی کسی معاملہ کا گواہ بننا اپنے لئے ایک عذاب سمجھنے اور مقدور بھر اس سے بچنے پر مجبور کر دیا گیا، صرف پیشہ ور گواہ ملتے ہیں، جن کے ہاں جھوٹ سچ میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا، قرآن حکیم نے ان بنیادی ضروریات کو اہمیت کے ساتھ بتلا کر ان تمام خرابیوں کا انسداد فرمایا، آیت کے آخر میں ارشاد ہے: وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝ یعنی ڈرو اللہ سے، اور اللہ تعالیٰ تمہیں اصولِ صحیحہ کی تعلیم دیتا ہے (یہ اس کا احسان ہے) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے"، چونکہ اس آیت میں بہت سے احکام آئے ہیں، بعض فقہاء نے بیس اہم مسائلِ فقہی اس آیت سے نکالے ہیں، اور قرآن کریم کی عام عادت ہے کہ قانون بیان کرنے سے آگے اور پیچھے خوفِ خدا اور خوفِ روزِ جزاء دلا کر لوگوں کے ذہنوں کو تعمیلِ حکم کے لئے آمادہ کرتا ہے، اسی طریقہ کے مطابق اس آیت کا خاتمہ خوفِ خداوندی پر کیا اور یہ بتلایا کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں، اگر تم کسی ناجائز حیلہ سے بھی کوئی خلاف ورزی کرو گے تو خدا کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔

دوسری آیت میں دو اہم مضمون بیان فرمائے گئے، ایک یہ کہ اُدھار کے معاملہ میں اگر کوئی یہ چاہے کہ اعتماد کے لئے کوئی چیز گروی رکھ لے تو اس کی بھی اجازت ہے، مگر اس میں لفظ "مَقْبُوضَة" سے اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ شئے مرہونہ سے نفع اٹھانا اس کے لئے جائز نہیں، مرتہن کو صرف اتنا حق ہے کہ اپنے قرض وصول ہونے تک اس کی چیز پر اپنا قبضہ رکھے، اور منافع اس کے وہ سب اصل مالک کا حق ہیں۔

دوسرا مضمون یہ ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو کسی نزاعی معاملہ کا صحیح علم ہو وہ شہادت کو نہ چھپائے، اور اگر اس نے چھپایا تو اس کا دل گنہگار ہے، دل کو اس لئے گنہگار فرمایا کہ کوئی شخص اس کو خالی زبان ہی کا گناہ نہ سمجھے کیونکہ اوّل ارادہ تو دل ہی سے ہوا ہے، اس لئے اوّل گناہ دل ہی کا ہے۔

۴۴

لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ

اللہ ہی کا ہے جو کچھ کہ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اگر ظاہر کرو گے اپنے جی کی بات

اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ

یا چھپاؤ گے اس کو حساب لے گا اس کا تم سے اللہ پھر بخشے گا جسکو چاہے اور عذاب کرے گا جسکو

يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۸۴﴾

چاہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

خُلاصۂ تفسیر

اللہ ہی کی مِلک میں ہیں سب (مخلوقات) جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں، (جیسے خود زمین و آسمان بھی اسی کی مِلک میں ہیں) اور (جب وہ مالک ہیں تو ان کو اپنی مملوکہ اشیاء میں ہر طرح قانون بنانے کا حق ہے، اس میں کسی کو مجالِ کلام نہ ہونی چاہئے، جیسا کہ ایک قانون یہ ہے کہ) جو باتیں (عقائد فاسدہ یا اخلاقِ مذمومہ یا گناہوں پر پختہ عزم وارادہ کی) تمہارے نفسوں میں ہیں ان کو اگر تم (زبان و جوارح سے) ظاہر کرو گے (مثلاً زبان سے کلمۂ کفر کہہ دیا یا اپنے تکبر، حسد وغیرہ کا خود اظہار کر دیا یا کسی گناہ جس کا قصد تھا اس کو کر ہی ڈالا) یا کہ (دل ہی میں) پوشیدہ رکھو گے (دونوں حالتوں میں) حق تعالیٰ تم سے (مثل دوسرے معاصی کے اُن کا) حساب لیں گے پھر (حساب لینے کے بعد بجز کفر و شرک کے) جس کے لئے (بخشنا) منظور ہو گا بخش دیں گے اور جس کو (سزا دینا) منظور ہو گا سزا دیں گے اور اللہ تعالیٰ ہر شے پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔

معارف ومسائل

پہلی آیت میں شہادت کے اظہار کا حکم اور چھپانے کی ممانعت مذکور تھی یہ آیت بھی اسی مضمون کا تکملہ ہے، اسمیں انسان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ شہادت کا چھپانا حرام ہے، اگر تم نے معاملہ کو جانتے ہوئے چھپایا تو رب علیم وخبیر تم سے اس کا حساب لے گا، حضرت ابن عباسؓ، عکرمہؒ، شعبیؒ اور مجاہدؒ سے یہی تفسیر منقول ہے (قرطبی)

اور عمومِ الفاظ کے اعتبار سے عام ہے، اور تمام اعتقادات، عبادات اور معاملات کو شامل ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا مشہور قول اس آیت کی تفسیر میں یہی ہے، اور معنی آیت

کے یہ ہیں کہ حق تعالیٰ اپنی مخلوق کے تمام اعمال کا محاسبہ فرمائیں گے، وہ عمل بھی جن کو وہ کر گذرے ہیں اور وہ بھی جن کا دل سے پختہ ارادہ کرلیا، اور اس کو دل میں چھپا کر رکھا، مگر عمل کی نوبت نہیں آئی، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم میں بروایت حضرت ابن عمرؓ منقول ہے، کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ مومن قیامت کے روز اپنے ربّ عزّوجل وعلیٰ سے قریب کیا جائے گا یہاں تک کہ حق تعالیٰ اس کے ایک ایک گناہ کو یاد دلائیں گے، اور سوال کریں گے کہ تو جانتا ہے کہ تو نے یہ گناہ کیا تھا، بندہ مؤمن اقرار کرے گا، حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے دنیا میں بھی تیری پردہ پوشی کی، اور تیرا گناہ لوگوں میں ظاہر نہیں ہونے دیا، اور میں آج اس کو معاف کرتا ہوں، اور حسنات کا اعمالنامہ اس کو دیدیا جائے گا، لیکن کفار اور منافقین کے گناہوں کو مجمعِ عام میں بیان کیا جائے گا۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا کہ یہ وہ دن ہے جس میں پوشیدہ چیزوں کا جائزہ لیا جائے گا، اور دلوں کے پوشیدہ راز کھولے جائیں گے، اور یہ کہ میرے کاتبِ اعمال فرشتوں نے تو تمہارے صرف وہ اعمال لکھے ہیں جو ظاہر تھے، اور میں اُن چیزوں کو بھی جانتا ہوں جن پر فرشتوں کو اطلاع نہیں، اور نہ انھوں نے وہ چیزیں تمہارے نامۂ اعمال میں لکھی ہیں، اور اب وہ سب تمھیں بتلاتا ہوں، اور ان پر محاسبہ کرتا ہوں، پھر جس کو چاہوں گا بخش دونگا اور جس کو چاہوں گا عذاب دوں گا، پھر مؤمنین کو معاف کردیا جائے گا اور کفار کو عذاب دیا جائے گا۔ (قرطبی)

یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِیْ عَمَّا حَدَّثَتْ اَنْفُسُهَا مَا لَمْ يَتَكَلَّمُوْا اَوْ يَعْمَلُوْا بِهٖ (قرطبی)	"اللہ تعالیٰ نے میری امت کو معاف کردیا ہے وہ جو اُن کے دل میں خیال آیا، جب تک اس کو زبان سے نہ کہا یا عمل نہ کیا ہو"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دل کے ارادہ پر کوئی عذاب و عتاب نہیں ہے، امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث احکامِ دنیا کے متعلق ہے، طلاق، عتاق، بیع، ہبہ وغیرہ محض دل میں ارادہ کرلینے سے منعقد نہیں ہوجاتے، جب تک اُن کو زبان سے یا عمل سے نہ کیا جائے، اور آیت میں جو کچھ مذکور ہے وہ احکامِ آخرت سے متعلق ہے، اس لئے کوئی تعارض نہیں، اور دوسرے حضرات علماءؒ نے اس شبہ کا جواب یہ دیا ہے، کہ جس حدیث میں دل کی چھپی ہوئی چیزوں کی معافی مذکور ہے اس سے مراد وہ وساوس اور غیر اختیاری خیالات ہیں جو انسان کے دل میں بغیر قصد اور ارادہ کے آجاتے ہیں، بلکہ اُن کے خلاف کا ارادہ کرنے پر بھی وہ آتے رہتے ہیں، ایسے غیر

اختیاری خیالات اور وساوس کو اس امت کے لئے حق تعالیٰ نے معاف کر دیا ہے، اور آیتِ مذکور میں جس محاسبہ کا ذکر ہے اس سے مراد وہ ارادے اور نیتیں ہیں جو انسان اپنے قصد اور اختیار سے اپنے دل میں جماتا ہے، اور اس کے عمل میں لانے کی کوشش بھی کرتا ہے، پھر اتفاق سے کچھ موانع پیش آجانے کی بنا پر اُن پر عمل نہیں کر سکتا، قیامت کے دن ان کا محاسبہ ہوگا پھر حق تعالیٰ جس کو چاہیں اپنے فضل و کرم سے بخش دیں، جس کو چاہیں عذاب دیں، جیسا کہ مذکورہ حدیث بخاری و مسلم میں گذر چکا ہے، اور چونکہ آیتِ مذکورہ کے ظاہری الفاظ میں دونوں قسم کے خیالات داخل ہیں خواہ اختیاری ہوں یا غیر اختیاری، اس لئے جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابۂ کرامؓ کو سخت فکر و غم لاحق ہو گیا، کہ اگر غیر اختیاری خیالات و وساوس پر بھی مواخذہ ہونے لگا تو کون نجات پائے گا، صحابۂ کرامؓ نے اس فکر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، تو آپؐ نے سب کو یہ تلقین فرمائی کہ جو کچھ حکمِ ربانی نازل ہوا اس کی تعمیل و اطاعت کا پختہ قصد کرو اور کہو: سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا، "یعنی ہم نے حکم سُن لیا اور تعمیل کی" صحابۂ کرامؓ نے اس کے مطابق کیا اور اس پر یہ جملہ قرآن کا نازل ہوا: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا، "یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی قدرت سے زائد تکلیف نہیں دیتا"

جس کا حاصل یہ ہے کہ غیر اختیاری وساوس اور خیالات پر مواخذہ نہیں ہوگا، اس پر صحابۂ کرامؓ کا اطمینان ہو گیا، یہ حدیث صحیح مسلم میں بروایت ابن عباسؓ نقل کی گئی ہے (قرطبی) یہ پوری آیت آگے آرہی ہے۔

اور تفسیر مظہری میں ہے کہ انسان پر جو اعمال اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کئے گئے ہیں یا حرام کئے گئے ہیں وہ کچھ تو ظاہری اعضاء و جوارح سے متعلق ہیں، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور تمام معاملات اسی قسم میں داخل ہیں، اور کچھ اعمال و احکام وہ بھی ہیں جو انسان کے قلب اور باطن سے تعلق رکھتے ہیں، ایمان و اعتقاد کے تمام مسائل تو اسی میں داخل ہیں، اور کفر و شرک جو سب سے زیادہ حرام و ناجائز ہیں ان کا تعلق بھی انسان کے قلب سے ہی ہے، اخلاق صالحہ تواضع، صبر، قناعت، سخاوت وغیرہ، اسی طرح اخلاق رذیلہ کبر، حسد، بغض، حُبِّ دنیا، حرص وغیرہ یہ سب چیزیں ایک درجہ میں حرام قطعی ہیں، ان سب کا تعلق بھی انسان کے اعضاء و جوارح سے نہیں بلکہ دل سے اور باطن سے ہے۔

اس آیت میں ہدایت کی گئی ہے کہ جس طرح اعمالِ ظاہرہ کا حساب قیامت میں لیا جائے گا اسی طرح اعمالِ باطنہ کا بھی حساب ہوگا، اور خطا پر بھی مواخذہ ہوگا، یہ آیت سورۂ بقرہ کے اخیر میں لائی گئی، اس میں بڑی حکمت ہے، کیونکہ سورۂ بقرہ قرآن کریم کی ایسی بڑی اور مہم سورۃ

ہے جس میں احکامِ الٰہیہ کا بہت بڑا حصّہ آگیا ہے، اس سورۃ میں اصولی اور فروعی معاش و معاد کے متعلق اہم ہدایات، نماز، زکوٰۃ، روزہ، قصاص، حج، جہاد، طہارت، طلاق، عدت، خلع، رضاعت، حرمتِ شراب، ربا اور قرض، لین دین کے جائز وناجائز طریقوں کا تفصیلی بیان آگیا ہے، اسی لئے حدیث میں اس سورت کا نام "سنام القرآن" بھی آیا ہے، یعنی قرآن کا سب سے بلند حصہ، اور ان تمام احکام کی تعمیل میں سب کی روح اخلاص ہے، یعنی کسی کام کو کرنا یا اس سے بچنا دونوں خالص اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لئے ہوں، ان میں نام و نمود یا دوسری نفسانی اغراض شامل نہ ہوں، اور یہ ظاہر ہے کہ اخلاص کا تعلق انسان کے باطن اور قلب سے ہے، سب کی درستی اسی پر موقوف ہے، اس لئے سورت کے آخر میں اس آیت کے ذریعہ انسان کو تنبیہ کردی گئی کہ فرائض کی ادائیگی یا محرمات سے پرہیز کے معاملہ میں مخلوق کے سامنے توحیلہ جوئی کے ذریعہ بھی راہِ فرار اختیار کی جاسکتی ہے، مگر حق تعالیٰ علیم و خبیر ہے، اس سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں، اس لئے جو کچھ کرے یہ سمجھ کر کرے کہ رقیبِ حفیظ میرے سب ظاہری اور باطنی حالات کو لکھ رہا ہے، اور سب کا حساب قیامت کے روز دینا ہے، یہی وہ روح ہے جو قرآن کریم انسانوں میں پیدا کرتا ہے کہ ہر قانون کے اوّل یا آخر میں خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کا ایسا محافظ ان کے قلوب پر بٹھاتا ہے کہ وہ رات کی اندھیری میں اور خلوتوں میں بھی کسی حکم کی خلاف ورزی کرتا ہوا ڈرتا ہے۔

آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ

مان لیا رسول نے جو کچھ اُترا اس پر اس کے رب کی طرف سے اور مسلمانوں نے بھی سب نے مانا

بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ

اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو اور اسکی کتابوں کو اور اسکے رسولوں کو کہتے ہیں کہ ہم جُدا نہیں کرتے

رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۣ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿٢٨٥﴾

کسی کو اس کے پیغمبروں میں سے اور کہہ اٹھے کہ ہم نے سنا اور قبول کیا تیری بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے رب اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ

اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہے، اسی کو ملتا ہے جو اس نے کمایا اور اسی پر پڑتا ہے جو اس نے کیا

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ

اے ہمارے رب نہ پکڑ ہم کو اگر ہم بھولیں یا چوکیں، اے رب ہمارے اور نہ رکھ ہم پر بوجھ

اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ
بھاری جیسا رکھا تھا ہم سے اگلے لوگوں پر اے رب ہمارے اور نہ اُٹھوا ہم سے وہ بوجھ کہ جس
لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۫ وَاغْفِرْ لَنَا ۫ وَارْحَمْنَا ۫ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا
کی ہمکو طاقت نہیں اور درگذر کر ہم سے اور بخش ہمکو اور رحم کر ہم پر تو ہی ہمارا رب ہے مدد کر ہماری
عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾ ع
کافروں پر

ع ۴۰ ۸

خلاصۂ تفسیر

اعتقاد رکھتے ہیں رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اس چیز (کے حق ہونے) کا جو اُنکے پاس انکے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور (دوسرے) مؤمنین بھی (اس کا اعتقاد رکھتے ہیں، آگے قرآن پر اعتقاد رکھنے کی تفصیل ہے کہ کس کس چیز کے عقیدہ رکھنے کو قرآن پر اعتقاد رکھنا کہا جائے گا) سب کے سب (رسولؐ بھی اور دوسرے مؤمنین بھی) عقیدہ رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ (کہ وہ موجود ہے اور واحد ہے اور ذات وصفات میں کامل ہے) اور اس کے فرشتوں کے ساتھ کہ وہ موجود ہیں اور گناہوں سے پاک ہیں اور مختلف کاموں پر مقرر ہیں) اور اس کی کتابوں کے ساتھ (کہ اصل میں سب سچی ہیں) اور اس کے سب پیغمبروں کے ساتھ (کہ وہ پیغمبر ہیں اور سچے ہیں اور پیغمبروں پر عقیدہ رکھنا اُن کا اس طور پر ہے کہ یہ کہتے ہیں) کہ ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں (عقیدہ رکھنے میں) تفریق نہیں کرتے (کہ کسی کو پیغمبر سمجھیں کسی کو نہ سمجھیں) اور اُن سب نے یوں کہا کہ ہم نے (آپ کا ارشاد) سُنا اور (اس کو) خوشی سے مانا ہم آپ سے بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے پروردگار اور آپ ہی کی طرف (ہم سب کو) لوٹنا ہے، (یعنی ہم نے جو پہلی آیت میں کہا ہے کہ نفوس کی پوشیدہ باتوں پر بھی محاسبہ ہوگا اس سے مراد امور غیر اختیاری نہیں بلکہ صرف امورِ اختیاریہ ہیں، کیونکہ) اللہ تعالیٰ کسی کو (احکام شرعیہ میں) مکلف نہیں بناتا (یعنی ان امور کو واجب یا حرام نہیں فرماتا) مگر اسی کا جو اس کی طاقت (اور اختیار) میں ہو اس کو ثواب بھی اسی کا ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے اور اس پر عذاب بھی اسی کا ہوگا جو ارادہ کرے (اور جو وسعت سے باہر ہے اس کا مکلف نہیں کیا گیا اور جس کے ساتھ قصد اور ارادہ متعلق نہیں اس کا نہ ثواب ہے نہ عذاب اور وساوس طاقت سے خارج ہیں تو اُن کے آنے کو حرام اور اُن کے نہ آنے دینے کو واجب نہیں کیا، اور نہ اُن پر عذاب رکھا) اے ہمارے رب ہم پر دار وگیر نہ فرمایئے اگر ہم بھول جاویں یا چوک جاویں، اے ہمارے رب (ہماری یہ بھی درخواست

ہے کہ) ہم پر کوئی سخت حکم نہ بھیجئے جیسے ہم سے پہلے لوگوں پر آپ نے بھیجے تھے، اے ہمارے رب اور (ہم یہ بھی درخواست کرتے ہیں کہ) ہم پر کوئی ایسا بار (تکلیف کا دنیا یا آخرت میں) نہ ڈالئے جس کی ہم کو سہار نہ ہو اور درگذر کیجئے ہم سے اور بخش دیجئے ہم کو اور رحم کیجئے ہم پر آپ ہمارے کارساز ہیں (اور کارساز طرفدار ہوتا ہے) سو آپ ہم کو کافر لوگوں پر غالب کیجئے۔

معارف و مسائل

ان دو آیتوں کے خاص فضائل یہ سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں ہیں، احادیث صحیحہ معتبرہ میں ان دو آیتوں کے بڑے بڑے فضائل مذکور ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے رات کو یہ دو آیتیں پڑھ لیں تو یہ اس کے لئے کافی ہیں۔

اور ابن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے دو آیتیں جنت کے خزائن میں سے نازل فرمائی ہیں جس کو تمام مخلوق کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے خود رحمٰن نے اپنے ہاتھ سے لکھ دیا تھا، جو شخص ان کو عشاء کی نماز کے بعد پڑھ لے تو وہ اس کے لئے قیام اللیل یعنی تہجد کے قائم مقام ہو جاتی ہیں، اور مستدرک حاکم اور بیہقی کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے سورۂ بقرہ کو ان دو آیتوں پر ختم فرمایا ہے جو مجھے اس خزانۂ خاص سے عطا فرمائی ہیں جو عرش کے نیچے ہے، اس لئے تم خاص طور پر ان آیتوں کو سیکھو، اور اپنی عورتوں اور بچوں کو سکھاؤ، اسی لئے حضرت فاروق اعظم اور علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ ہمارا خیال یہ ہے کہ کوئی آدمی جس کو کچھ بھی عقل ہو وہ سورۂ بقرہ کی ان دونوں آیتوں کو پڑھے بغیر نہ سوئے گا، ان دونوں آیتوں کی معنوی خصوصیات تو بہت ہیں، لیکن ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ سورۂ بقرہ میں اکثر احکامِ شرعیہ اجمالاً و تفصیلاً ذکر کر دیئے گئے ہیں، اعتقادات، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت وغیرہ آخری دو آیتوں میں سے پہلی آیت میں اطاعت شعار مؤمنین کی مدح کی گئی ہے، جنھوں نے اللہ جل شانہٗ کے تمام احکام پر لبیک کہا، اور تعمیل کے لئے تیار ہو گئے، اور دوسری آیت میں ایک شبہ کا جواب دیا گیا جو ان دو آیتوں سے پہلی آیت میں صحابۂ کرامؓ کو پیدا ہو گیا تھا، اور ساتھ ہی اپنے فضل و رحمت بے حساب کا ذکر فرمایا گیا، وہ یہ تھا کہ جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ؛ جو کہ تمھارے دلوں میں ہے تم اس کو ظاہر کرو یا چھپاؤ ہر حال میں اللہ تعالیٰ تم سے اس کا حساب لیں گے، آیت کی اصل مراد تو یہ تھی کہ اپنے اختیار و ارادہ سے جو کوئی عمل اپنے دل میں کرو گے اس کا

حساب ہوگا، غیر اختیاری وسوسہ اور بھول چوک اس میں داخل ہی نہ تھی، لیکن الفاظِ قرآن بظاہر عام تھے ان کے عموم سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ انسان کے دل میں غیر اختیاری طور پر کوئی خیال آجائے گا تو اس کا بھی حساب ہوگا، صحابہ کرامؓ یہ سُنکر گھبرا اٹھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی یا رسول اللہ اب تک تو ہم یہ سمجھتے تھے کہ ہم جو کام اپنے ارادہ و اختیار سے کرتے ہیں، حساب اُن ہی اعمال کا ہوگا، غیر اختیاری خیالات جو دل میں آجاتے ہیں ان کا حساب نہ ہوگا، مگر اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر خیال پر جو دل میں آئے حساب ہوگا، اس میں تو عذاب سے نجات پانا سخت دشوار ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ آیت کی صحیح مراد معلوم تھی، مگر الفاظ کے عموم کے پیش نظر آپؐ نے اپنی طرف سے کچھ کہنا پسند نہ فرمایا بلکہ وحی کا انتظار کیا، اور صحابہ کرامؓ کو یہ تلقین فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم آئے خواہ آسان ہو یا دشوار، مومن کا کام یہ نہیں کہ اس کے ماننے میں ذرا بھی تامل کرے تم کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام احکام سُن کر یہ کہو سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ یعنی "اے ہمارے پروردگار ہم نے آپ کا حکم سُنا اور اس کی اطاعت کی، اے ہمارے پروردگار اگر حکم کی تعمیل میں ہم سے کوئی کوتاہی یا فروگذاشت ہوئی ہو تو اس کو معاف فرما دے کیونکہ ہمارا سب کا آپ ہی کی طرف لوٹنا ہے"، صحابہ کرامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق ایسا ہی کیا اگرچہ اُن کے ذہن میں یہ خیال کھٹک رہا تھا کہ بے اختیار دل میں آنے والے خیالات اور وساوس سے بچنا تو سخت دشوار ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں نازل فرمائیں، جن میں سے پہلی آیت میں مسلمانوں کی مدح، اور دوسری میں اس آیت کی اصلی تفسیر بتلائی گئی جس میں صحابہ کرامؓ کو اشتباہ پیش آیا تھا، اب پہلی آیت کے الفاظ دیکھئے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ "یعنی ایمان رکھتے ہیں رسول اس چیز پر جو ان کے پاس نازل ہوئی اُن کے رب کی طرف سے، اس میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح فرمائی اور اس میں بجائے آپؐ کا نام مبارک لینے کے لفظ رسول فرما کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و تشریف کو واضح کر دیا، اس کے بعد فرمایا: وَالْمُؤْمِنُوْنَ، یعنی جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی وحی پر ایمان و اعتقاد ہے، اس طرح عام مومنین کا بھی اعتقاد ہے، اور جو طرزِ بیان اس جملہ میں اختیار فرمایا کہ پہلے پورا جملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان

کے ذکر میں لایا گیا، اس کے بعد مؤمنین کے ایمان کا علیحدہ تذکرہ کیا گیا اس میں اشارہ ہے کہ اگرچہ نفس ایمان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمان شریک ہیں، لیکن درجاتِ ایمان کے اعتبار سے ان دونوں میں بڑا فرق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم مشاہدہ اور سماع کی بناء پر ہے، اور دوسرے مسلمانوں کا علم ایمان بالغیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رُویت کی بناء پر۔

اس کے بعد اُس ایمان مجمل کی تفصیل بتلائی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مومنین میں شریک تھا، کہ وہ ایمان تھا اللہ تعالیٰ کے موجود اور ایک ہونے پر اور تمام صفات کاملہ کے ساتھ متصف ہونے پر، اور فرشتوں کے موجود ہونے پر، اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور سب رسولوں کے سچے ہونے پر۔

اس کے بعد اس کی وضاحت فرمائی کہ اس امت کے مؤمنین پچھلی امتوں کی طرح ایسا نہ کریں گے کہ اللہ کے رسولوں میں باہمی تفرقہ ڈالیں کہ بعض کو نبی مانیں اور بعض کو نہ مانیں، جیسے یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی مانا مگر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی نہ مانا، اس امت کی یہ مدح فرمائی کہ یہ اللہ کے کسی رسول کا انکار نہیں کرتے اور پھر صحابۂ کرامؓ کے اس جملہ پر ان کی تعریف کی گئی، جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے موافق زبان سے کہا تھا، سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ۔

اس کے بعد دوسری آیت میں ایک خاص انداز سے وہ شبہ دُور کیا گیا جو پچھلی آیت کے بعض جملوں سے پیدا ہو سکتا تھا، کہ دل میں چھپے ہوئے خیالات پر حساب ہوا تو عذاب سے کیسے بچیں گے، ارشاد فرمایا لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا، یعنی "اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زائد کام کا حکم نہیں دیتے" اس لئے غیر اختیاری طور پر جو خیالات و وسوسے دل میں آجائیں، اور پھر ان پر کوئی عمل نہ ہو تو وہ سب اللہ تعالیٰ کے نزدیک معاف ہیں، حساب اور مؤاخذہ صرف ان افعال پر ہوگا جو اختیار اور ارادہ سے کئے جائیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ جس طرح انسان کے اعمال و افعال جو ہاتھ، پیر، آنکھ اور زبان وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں، جن کو اعمالِ ظاہرہ کہا جاتا ہے، ان کی دو قسمیں ہیں ایک اختیاری جو ارادہ اور اختیار سے کئے جائیں، جیسے ارادہ سے بولنا، ارادہ سے کسی کو مارنا، دوسرے غیر اختیاری، جو بلا ارادہ سرزد ہو جائیں، جیسے زبان سے کہنا چاہتا تھا کچھ اور نکل گیا کچھ، یا رعشہ سے بلا اختیار ہاتھ کی حرکت ہوئی، اس سے کسی کو تکلیف پہونچ گئی، ان میں سب کو معلوم

ہے کہ حساب و کتاب اور جزاء و سزا افعال اختیاریہ کے ساتھ مخصوص ہیں افعال غیر اختیاریہ کا نہ انسان مکلّف ہے نہ اُن پر اس کو ثواب یا عذاب ہوتا ہے۔

اسی طرح وہ افعال جن کا تعلق باطن یعنی دل کے ساتھ ہے ان کی بھی دو قسمیں ہیں ایک اختیاری جیسے کفر و شرک کا عقیدہ جس کو قصد و اختیار کے ساتھ دل میں جمایا ہے، یا سوچ سمجھ کر ارادہ کے ساتھ اپنے آپ کو بڑا سمجھنا جس کو تکبر کہا جاتا ہے یا پختہ ارادہ کرنا کہ شراب پیوں گا، اور دوسرے غیر اختیاری، مثلاً بغیر قصد و ارادہ کے دل میں کسی بُرے خیال کا آجانا، ان میں بھی حساب و کتاب اور مؤاخذہ صرف اختیاری افعال پر ہی، غیر اختیاری پر نہیں۔

اس تفسیر سے جو خود قرآن نے بیان کر دی صحابہ کرامؓ کو اطمینان ہوگیا کہ غیر اختیاری وساوس و خیالات کا حساب و کتاب اور ان پر عذاب و ثواب نہ ہوگا، اسی مضمون کو آخر میں اور زیادہ واضح کرنے کے لئے فرمایا ہے، لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ، یعنی انسان کو ثواب بھی اس کام کا ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے اور عذاب بھی اس کام پر ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے۔

اور مراد یہ ہے کہ ابتداءً بلا واسطہ اس عمل کا ثواب یا عذاب ہوگا جو قصد و ارادہ سے کرے، کسی ایسے عمل کا ثواب و عذاب بالواسطہ ہو جانا جس کا اس نے ارادہ نہیں کیا اس کے منافی نہیں، اس سے اس شبہ کا جواب ہو گیا کہ بعض اوقات آدمی کو بلا قصد و ارادہ بھی ثواب یا عذاب ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن شریف کی دوسری آیات اور بہت سی روایاتِ حدیث سے ثابت ہے کہ جو آدمی کوئی ایسا نیک کام کرے جس سے دوسرے لوگوں کو بھی اس نیکی کی توفیق ہو جائے تو جب تک لوگ یہ نیک کام کرتے رہیں گے اس کا ثواب اس پہلے والے کو بھی ملتا رہے گا، اسی طرح اگر کسی شخص نے کوئی طریقہ گناہ کا جاری کیا تو آئندہ جتنے لوگ اس گناہ میں مبتلا ہوں گے اس کا وبال اس شخص کو بھی پہنچیگا جس نے اوّل یہ بُرا طریقہ جاری کیا تھا، اسی طرح روایاتِ حدیث سے ثابت ہے کہ کوئی شخص اپنے عمل کا ثواب دوسرے آدمی کو دینا چاہے تو اس کو یہ ثواب پہنچتا ہے، ان سب صورتوں میں بغیر قصد و ارادہ کے انسان کو ثواب یا عذاب ہو رہا ہے۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ ظاہر ہے کہ یہ ثواب و عذاب بلا واسطہ اس کو نہیں پہونچا، بلکہ دوسرے کے واسطے سے پہنچا ہے، اس کے علاوہ جو واسطہ بنا ہے اس میں اس کے اپنے عمل اور اختیار کو بھی دخل ضرور ہے، کیونکہ جس شخص نے کسی کا ایجاد کیا ہوا اچھا یا بُرا طریقہ اختیار کیا اس میں پہلے شخص کے عمل اختیاری کا دخل ضرور ہے اگرچہ اس نے اس خاص اثر کا ارادہ نہ کیا ہو، اس طرح کوئی کسی کو ایصالِ ثواب جبھی کرتا ہے جب اس نے اس پر کوئی احسان کیا ہو، اس لحاظ سے یہ دوسرے کے

عمل کا ثواب و عذاب بھی درحقیقت اپنے ہی عمل کا ثواب یا عذاب ہے۔

بالکل اخیر میں قرآن کریم نے مسلمانوں کو ایک خاص دعا کی تلقین فرمائی جس میں بھول چوک اور بلاواسطہ خطاء کسی فعل کے سرزد ہونے کی معافی طلب کیگئی، فرمایا، رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا "اے ہمارے پروردگار بھول چوک اور خطاء پر ہم سے مؤاخذہ نہ فرما" پھر فرمایا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ "یعنی اے ہمارے پروردگار ہم پر بھاری اور سخت اعمال کا بوجھ نہ ڈالئے جیسا ہم سے پہلے لوگوں (بنی اسرائیل) پر ڈالا گیا ہے، اور ہم پر ایسے فرائض عائد نہ فرمایئے جن کی ہم طاقت نہیں رکھتے"

اس سے مراد وہ سخت اعمال ہیں جو بنی اسرائیل پر عائد تھے کہ کپڑا پانی سے پاک نہ ہو، بلکہ کاٹنا یا جلانا پڑے، اور قتل کے بغیر توبہ قبول نہ ہو، یا مراد یہ ہے کہ دنیا میں ہم پر عذاب نازل نہ کیا جائے جیسا کہ بنی اسرائیل کے اعمال بد پر کیا گیا، اور یہ سب دُعائیں حق تعالیٰ نے قبول فرمانے کا اظہار بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ کر دیا ۔

سورۂ بقرہ تمام ہوئی و للہ الحمد اوّلہٗ وآخرہٗ وظاہرہٗ وباطنہٗ وہو المستعان

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۲۵ ر ذیقعدہ ۱۳۸۸ھ